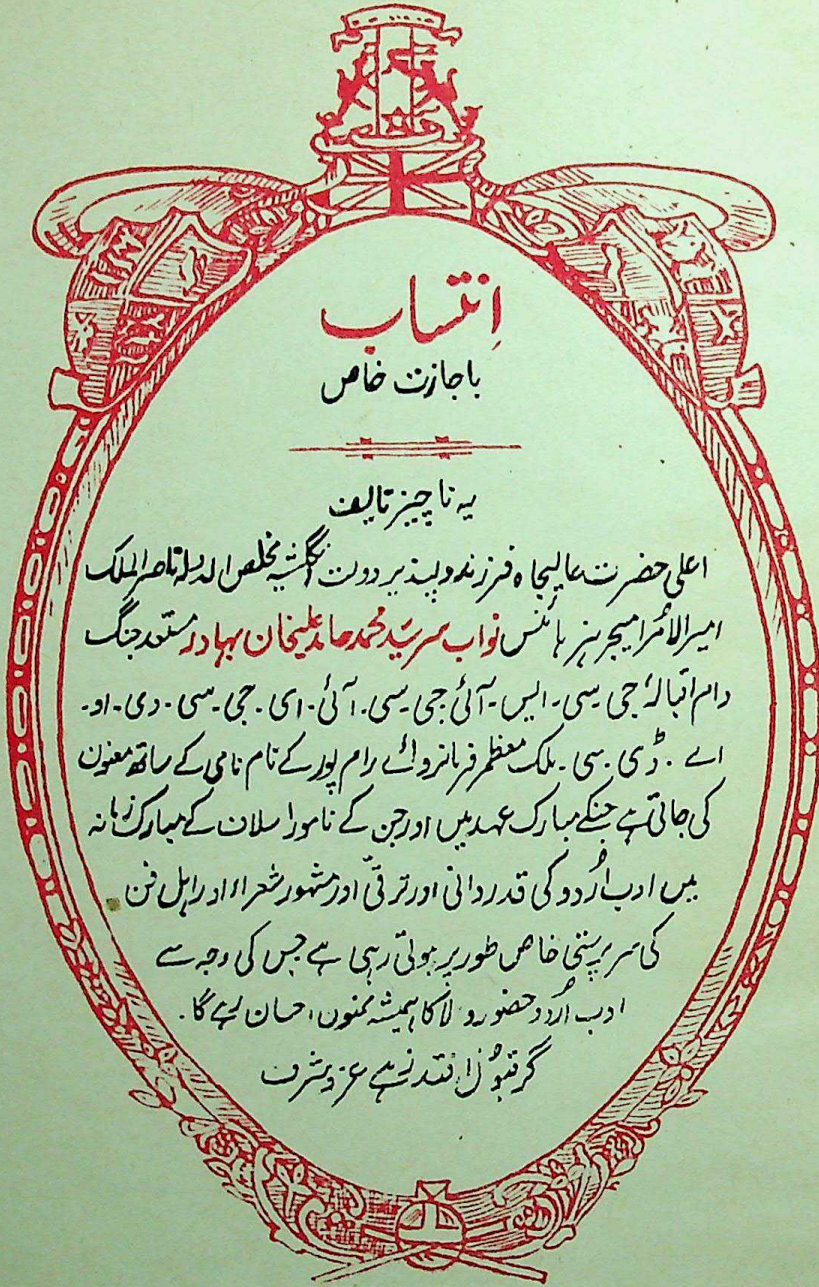


105/-

تاریخ ۱۵ ذی قعدہ ۱۲۸۵

دستخط صاحب خانہ

۱۲۸۵



یہ نایضرتالیف

اعلیٰ حضرت عالیجاہ فرزند ولیہ پردہ نگشتہ نخلصلہ لہ تاحر الملک
امیرالامرا میجر ہر ہائس **نواب سرید محمد حامد علی خان بہادر مستند جنگ**
دام اقبالہ جی سی۔ ایس۔ آئی جی سی۔ آئی۔ ای۔ جی سی۔ دی۔ او۔
اے۔ ڈی سی۔ ملک معظم فرزند والے رام پور کے نام نامی کے ساتھ معنون
کی جاتی ہے جنکے مبارک عہد میں اور جن کے نامور سلاطین کے مبارک زمانہ
میں ادب اردو کی قدردانی اور ترقی اور مشور شعرا و ادراہل فن
کی سرپرستی خاص طور پر ہوئی رہی ہے جس کی وجہ سے
ادب اردو حضور لاکا ہمیشہ ممنون احسان لیے گا۔

مگر قبول افتد ہے عز و شرف

(مصور)

سایح ادب اردو

(یعنی)

ہسٹری آف اردو لٹریچر

مُصَنَّف

رام بابو صاحب سکینہ - ایم - اے - ایل - ایل - بی
ایف - آر - ایس - اے (لندن) ایم - آر - اے - ایس ایم لے
ایس - بی - ممبر ہندوستانی اکیڈمی یو پی - کلکٹر
مُصَنَّف اردو شعرا زمانہ حال و ادوارق پریشاں وغیرہ

مُترجمہ

مرزا محمد عسکری صاحب - بی - اے
سابق ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ آف انڈیا

بانتام
ڈاکٹر کٹہرچک راجا گرو

مطبع فنیسی میچ کیا رپورٹ میچ کرنا میچ کرنا میچ کرنا

فہرست مضامین

مضامین	نمبر صفحہ	مضامین	نمبر صفحہ
فہرست مضامین	۱ - ۱۶	یورپ کی زبانوں کا اردو پر اثر	۷
فہرست تصاویر حصہ نظم	۱۷	نثر اور نظم کی زبان	۹
تہذیب مصنف	۱۸	ادبی اردو	۱۰
تقریظ سر بیچ بہادر سپرو	۲۱	زبان اردو کے قدیم نام	۱۱
التماس مترجم	۲۲-۲۵	اردو کا دسم الخط	۱۲
		نظم اردو	۱۱
باب		باب	
زبان اردو اور اس کی اصل		ادب اردو کی ترقی کے ابتدائی دور	۱۳
اردو سے کیا مراد ہے	۱	نظم کا تقدم نثر پر اس کے وجوہ	۱۴
اردو اور ہندی کا تعلق	۲	اور اس کا تعلق خاص ادب	۱۵
زبان اور ادب اردو فارسی کا	۳	اردو کے ساتھ	۱۵
احسان مند ہے۔		سب سے پہلا اردو شاعر	۱۶
اردو میں فارسی الفاظ اور		امیر خسرو دہلوی	۱۷
فارسی ترکیبوں کی کثرت کے		اردو کی پختگی کا زمانہ	۱۸
اسباب			

مضامین	نمبر صفحہ	مضامین	نمبر صفحہ
زریں عہد اکبری	۱۸	جدید رنگ۔ آزاد اور حاکمی کا زمانہ اُن	۲۰
قدیم شعرائے دکن اور دربار	۱۹	کی خدمات زبان کے ساتھ	۳۱
شاہان گولکنڈہ و بیجا پور۔	۲۰	نثر اردو فورٹ ولیم کالج کلکتہ	۳۲
وکی دکنی ۱۶۶۸ء تا ۱۷۴۴ء	۲۱	نثر متفقا۔ رجب علی بیگ سرود	۳۳
قدیم شعرائے دہلی رهاقم، آبرو، آرزو	۲۲	”دریائے لطافت“	۳۴
میر و سودا کا زمانہ۔ اُس زمانہ کی	۲۳	”اُردوئے معلیٰ“ اور ”عود ہندی“	۳۵
ترقیات۔ زبان اور شاعری میں	۲۴	عیسائی پادریوں کی تحریر و کلام	۳۶
اصلاحیں۔	۲۵	سر سید اور ان کے رفقاء کے کار کا	۳۷
انشا اور مصحفی کا دور۔ ان کی خدمات	۲۶	زریں عہد۔	۳۸
زبان اور شاعری کے ساتھ	۲۷	تعلیم انگریزی کا اثر اُردو پر۔	۳۹
ریختی۔	۲۸	پچاپہ کی ابتدا۔ اُردو سرکاری	۴۰
غالب اور ذوق کا زمانہ اور اُس	۲۹	زبان قرار دی گئی۔	۴۱
کی خصوصیات۔	۳۰	ناول نویسی کی ابتدا	۴۲
شعرا لکھنؤ کا نیا دور اور اس کی	۳۱	اُردو ڈراما۔	۴۳
خصوصیات۔ تاریخ اور آتش کا	۳۲		۴۴
زمانہ۔ اُن کی خدمات زبان کے	۳۳		۴۵
ساتھ مراشی اور اُن کا تعلق زبان	۳۴		۴۶
کے ساتھ۔	۳۵		۴۷
مابعد کے شعرا۔ امیر و دلغ کا زمانہ	۳۶		۴۸

صفحہ نمبر	مضمون	صفحہ نمبر	مضمون
۴۹	تخلص	۳۶	تخلیہ کے بڑے نتائج
"	اردو شاعری کی خصوصیات	۳۷	اردو شاعری محض نقالی ہے۔
	باب	۳۸	اردو شاعری صرف رسمی رہ گئی
		"	تانیہ پیمائی۔
	قدیم شعرا کے دکن	۳۹	خلافت نیچر مضامین
		۴۱	اصناف سخن
۵۰	دکھنی کیا چیز ہے۔	"	غزل اور اس کا رنگ
۵۱	زبان دکھنی کی ابتداء	"	نصیحت
	دکن میں اردو شاعری کی ابتداء	۴۲	عاشقانہ
۵۱	کے اسباب	۴۳	اہل دربار کا اثر اردو شاعری پر
	شاہان بہمنی کا زمانہ	۴۴	دیہاتی اور قدرتی مناظر کی اردو
۵۲	۱۶۳۲ لغایت ۱۶۳۲	"	شاعری میں کمی
۵۳	قطب شاہیوں کا عہد	۴۵	اردو شاعری حزن و یاس کی شاعری ہے
۵۵	۱۶۱۶ء تا ۱۶۹۸ء	۴۷	قصائد
	سلطان محمد قلی قطب شاہ	"	مثنوی
"	۱۵۸۰ء تا ۱۶۱۱ء عیسوی	۴۸	مراثی
	سلطان محمد قطب شاہ	۴۹	قطعہ اور رباعی
۵۸	۱۶۱۱ء لغایت ۱۶۳۵ء	"	استاد و شاگرد کا تعلق
۵۹	سلطان عبداللہ قطب شاہ	"	شاعر

نمبر صفحہ	مضمون	نمبر صفحہ	مضمون
۶۵	رسمی	۱۲۵	غایت شاہ ۱۶۶۲ء ابن
۶۶	نصرتی	۵۹	نشاظی
۶۷	ہاشمی	۶۰	غواصی کا نقشہ "مہینہ الملوک"
۶۸	دولت	۶۱	سیرس مصنفہ مولانا دجہی
"	شاہ ملک	۶۱	تعمین الدین
"	شاہ این	۶۲	ملاقطبی
"	دکن میں مرثیہ کی ابتداء	"	جعیدی
۶۹	شعراے دکن مغلوں کے عہد حکومت میں	"	طبعی
"	عاجز	"	ابوالحسن تانا شاہ ۱۶۷۷ء
"	بھری	۶۲	غایت شاہ ۱۶۸۷ء عیسوی
"	امین	۶۳	نوری
۷۰	دلی دکنی	"	فائزہ
"	وجہی	"	شاہی
۷۱	آزاد	"	مرزا
	شعراے اورنگ آباد		عادل شاہیوں کا زمانہ ۱۶۹۵ء
۷۱	دلی ۱۶۶۸ء تا ۱۶۸۷ء	۶۳	غایت شاہ ۱۰۹۷ء
۷۱	نام کے متعلق اختلافات		ابراہیم عادل شاہ ثانی ۱۵۸۸ء
	مقام پیدائش اور خاندان کے	۶۴	غایت شاہ ۱۶۲۷ء
۷۲	متعلق اختلافات	۶۵	علی عادل شاہ ثانی ۱۶۵۶ء تا ۱۶۸۷ء غایت شاہ

مضمون	نمبر صفحہ	مضمون	نمبر صفحہ
حالات زندگی	۷۲	دلی کے پڑانے شاعر	۸۲
دلی کے دو سفر	۷۳	زبان کے ساتھ ان کی خدمات	"
" وہ مجلس	۷۴، ۷۳	صنعت ایہام	۸۲
وفات	۷۴	تصوف	۸۳
کلام پر رائے	۷۵	سپاہی پیشہ شعراء	"
داؤد	۷۶	کلام میں گیرنگی کی کمی اور سبک	"
سراج	"	و بتدل الفاظ	۸۴
دیگر شعرا اس دور کے	۷۸	اس عہد کے شعراء کا	"
احاطہ مدراس دارکٹ	"	طرز بیان اور ان کے	"
کے شعرا۔	۷۹	کلام کی خامیاں	"
باب ۵		عربی و فارسی الفاظ	"
		و خیالات کا داخلہ اور	"
آساندہ دہلی حصہ اول طبقہ متقدمین حاتم و آبرو کا زمانہ		سنگت و بھاشا و قدیم	"
		دکنی الفاظ کا استخراج	۸۴
دہلی میں اردو زبان کی ابتدا و ترقی۔		شاہ مبارک آبرو متوفی ۱۷۵۵ء	۸۵
		خان آرزو شاہ ۱۷۸۹ء تا ۱۸۵۶ء	۸۶
اردو لغات کی ترتیب		شاہ حاتم ۱۷۹۶ء تا ۱۸۹۱ء	۸۷
		میاں مضمون متوفی ۱۸۴۵ء	۸۹
	۸۱	مرزا مظہر جانجاناں ۱۷۹۸ء	۹۰

مضمون	نمبر صفحہ	مضمون	نمبر صفحہ
لغایت شاعر	۹۰	خواجہ میر دردؒ ۱۱۳۳ تا ۱۱۹۹ھ	۱۰۰
ناجی	۹۳	تصانیف	۱۰۲
تاباں		شاگرد	۱۰۵
یک رنگ	۹۴	میر سوزؒ ۱۱۳۳ تا ۱۲۱۳ھ	۱۰۶
نقشائے متونیؒ ۱۷۷۲ء	۹۵	طرز کلام	"
باقی اور شعرا	۹۶	سوز کا مرتبہ شاعری میں	۱۰۸
باب ۶		سوداؒ ۱۱۲۵ تا ۱۱۹۵ھ	"
		تصانیف	۱۱۱
اساتذہ دہلی حصہ دوم طبقہ متوسطین میر و سودا کا زمانہ		سودا کا مرتبہ شاعری میں	۱۱۲
		اُن کی خدمات زبان کے ساتھ	"
		اُن کی خدمات شاعری کیساتھ	۱۱۴
		تقصیدہ اور مرثیہ	"
		بچو	۱۱۵
اُردو شاعری کا نثر میں عہد	۹۶	کلام پر رائے	۱۱۸
زبان میں فارسی کا غلبہ	۹۷	سودا کا اثر بعد کے شعرا پر	"
الفاظ میں تذکیر و تانیث	۵۸	مرزا کے کلام پر شعرا کی مائیں	۱۲۰
شعرا پر دہلی چھوڑ کر لکھنؤ آتے ہیں	۹۹	کلام میں کمی	۱۲۲
کلام کی خصوصیت	"	میر حسن متونیؒ ۱۲۰۱ء	"
تذکرے	۹۹	تعلیم و شاگردی	۱۲۳

نمبر صفحہ	مضمون	نمبر صفحہ	مضمون
۱۶۲	تصانیف	۱۲۴	طرز کلام
۱۶۳	میر صاحب کی ایجادیں	"	میر حسن کے صاحبزادے
	میر صاحب کی خدمات زبان		تصانیف
۱۶۵	اور شاعری کے ساتھ		اختصار ثنوی میر حسن مسلسل
۱۶۶	میر تحسین شاعر کے	۱۲۵	بصورت افسانہ
۱۶۸	میر اور سودا کا مقابلہ	۱۲۶	مراثی
۱۶۳	اس عہد کے دیگر شعراء	"	تذکرۃ الشعراء
	باب	۱۲۲	نمونہ ثنوی گلزار ارم
	اساتذہ دہلی	۱۲۳	رباعی اور سہجو اور قصائد کے
	طبقہ متاخرین	۱۲۵	نمونے
	انشاء اور مصحفی کا زمانہ	۱۲۹	میر تقی میر
	طبقات کی ترتیب اس دور		روانگی لکھنؤ
۱۴۵	کی ترقیاں۔	۱۵۱	میر صاحب کی عمر
"	شاعری دربار سے وابستہ ہوگی	۱۵۱	ذکر میر
۱۴۶	اس وابستگی کے خراب نتائج	۱۵۲	سیادت میں اختلاف
۱۴۷	ریختی	۱۵۳	نسکات الشعراء
۱۴۸	ہزل گو بیان آورد	۱۵۷	میر صاحب کا کیرکٹر
		"	نازک دماغی
		۱۶۰	کلام میں مایوسی و درد

نمبر صفحہ	مضمون	نمبر صفحہ	مضمون
۲۰۲	رنگین ۱۱۹۹ تا ۱۲۵۱ھ		انشاء دہلوی ۱۲۳۳ تا ۱۲۵۱ھ
۲۰۳	تصانیف	۱۷۹	مطابق ۱۸۱۳ء (علیوی)
۲۰۴	نیچتی سے کیا مطلب ہے اور		انشاء کی تفسیر نواب
	اس کی ایجاد کے اسباب	۱۸۰	سعادت علی خاں کے دربار میں
۲۰۶	شاعر شاہان دہلی شاہ عالم	۱۸۲	ان کے کلام کی خصوصیات
	ثانی ۱۷۴۱ء تا ۱۸۰۶ء	۱۸۵	تصانیف
۲۰۷	مرزا اسلم شاہ شکرہ متخلص بہ یلم	۱۸۷	کہانی ٹھیکہ ہندی میں
۲۰۸	اکبر شاہ ثانی ۱۸۰۶ء تا ۱۸۳۷ء	۱۸۹	درائے لطافت
۲۰۸	بہادر شاہ ثانی متخلص بہ ظفر	۱۹۲	جرات (متوفی ۱۲۲۵ھ)
۲۰۹	قائم چاند پوری	۱۹۳	تصانیف
۲۱۰	مست		جرات کی خصوصیات اور
۲۱۱	ممنون	۱۹۴	ان کا مقابلہ میر کے ساتھ
"	حسرت (دہلوی)	۱۹۵	جرات اور داغ
۲۱۳	قدرت	۱۹۶	مصطفیٰ (۱۷۴۲ء تا ۱۲۳۳ھ)
۲۱۴	بیدار	"	تصانیف
۲۱۵	ہدایت	۱۹۷	تذکرہ شغرائے اردو
"	فراق		مصنف ۱۷۹۳ء
۲۱۶	ضیا		خصوصیات کلام
"	بقا	۱۹۹	مصطفیٰ اور سید انشا کے معرکے

مضمون	نمبر صفحہ	مضمون	نمبر صفحہ
حزین	۲۱۷	قصیدہ نہیں کہا	۲۱۱
بیان	۲۱۸	نقائص کلام	۲۱۲
رائع	۲۱۹	ناتخ کے کارنامے	"
باب		شاگرد	۲۳۳
اساتذہ لکھنؤ		برق	"
ناتخ و آتش کا زمانہ		بحر	۲۳۴
مرکز شاعری لکھنؤ میں منتقل ہوتا ہے		آباد	۲۳۵
لکھنؤ کا طرز شاعری		خواجہ درزیر	۲۳۶
طرز دہلی اور طرز لکھنؤ کا فرق اور		رشک	۲۳۷
ان کا تقابل		قہر	۲۳۹
تحقیق الفاظ اور رعایت لفظی زمانہ		تصانیف	۲۴۰
شیخ امام بخش ناتخ متوفی ۱۲۵۲ھ		منیر	"
مطابق ۱۲۵۳ھ		تصانیف	۲۴۲
تصانیف		آتش متوفی ۱۲۶۳ھ	"
ناتخ کا اثر شاعری اور زبان پر		طرز کلام	۲۴۴
ناتخ کی غزلیں		تصانیف	۲۴۵
تاریخیں		نقائص کلام	"
		ناتخ اور آتش کا مقابلہ	"
		شاگرد	۲۴۷

مضمون	نمبر صفحہ	مضمون	نمبر صفحہ
رند	۲۴۸	طرز کلام	۲۵۹
خلیل	۲۴۹	استیر	۲۶۰
نسیم	"	امانت	۲۶۱
صبا	۲۵۰	آفتاب الدولہ قلن	۲۶۲
آغا جوشرف	۲۵۱	فکی	۲۶۳
اس دور میں زبان میں کیا	"	درختاں	"
تغیرات ہو گئے	"	انتر	۲۶۴
باب ۹		باب ۱۰	
دربار لکھنؤ اور اس کے شعرا		مرثیہ اور مرثیہ گو	
واجد علی شاہ اختر کا عہد		مرثیہ کی تعریف	۲۶۵
آصف الدولہ آصف	۲۵۲	مرثیہ کی قدامت	۲۶۶
نواب وزیر علی خاں وزیر	۲۵۴	آردو مرثیہ کی ابتدا	۲۶۷
نواب سعادت علی خاں سعادت	"	بزرگان انیس اور ان کی خدمات	
غازی الدین حیدر	"	مرثیہ کے ساتھ	۲۶۸
نصیر الدین حیدر	۲۵۵	خلیق	"
اختر (واجد علی شاہ)	۲۵۶	میر انیس	۲۷۰
تصانیف	۲۵۷	میر انیس کی حیثیت شاعر	۲۷۲

مضمون	نمبر صفحہ	مضمون	نمبر صفحہ
تصانیف	۲۷۲	عشق	۲۸۶
انیس کی خدمت زبان کے		نقش	"
ساتھ	۲۷۳	احمد میرزا صاحب	"
مرقع نگاری	۲۷۴	پیارے صاحب رشید	۲۸۷
اظہار جذبات	۲۷۵	خاندان دبیر مرزا ادج	۲۸۸
میر انیس کا طرز	۲۷۶	نصف	"
دبیر	۲۷۷	باب	
دبیر بحیثیت مرثیہ گو	۲۷۹		
انیس و دبیر کا مقابلہ		نظیر اکبر آبادی اور شاہ نصیر دہلوی	
مرثیہ کی مقبولیت کے اسباب	۲۸۱		
مرثیہ سے کیا کیا فائدے پہنچے	"	نظیر اکبر آبادی	۲۸۸
دیگر مرثیہ نویس	۲۸۳	نظیر بحیثیت واعظ و ناصح	۲۹۱
خاندان انیس	"	نظیر بحیثیت حقیقی ہندوستانی	
میر مونس	۲۸۴	شاعر کے۔	۲۹۲
میر نفیس	"	ان کی خدمت زبان کے ساتھ	۲۹۴
عارف	"	نظیر حمید رنگ کے پیشرو تھے	۲۹۵
جلیس	۲۸۵	نظیر کا طریقہ رنگ ان کا	
سید میرزا انیس کا خاندان	"	مقابلہ انشا کے ساتھ	۲۹۶
سید میرزا انیس	"	نظیر بحیثیت مصور کے	۲۹۷

نمبر صفحہ	مضمون	نمبر صفحہ	مضمون
۳۲۵	ٹیپا برج کلکتہ میں شعرا کا مجمع	۳۳۵	تیسری خصوصیت ذاتی
	شعرا کے دہلی اپنا وطن چھوڑ کر	"	جذبات کا ادا کرتا
۳۲۶	نکلتے ہیں۔	"	چوتھی خصوصیت فلسفیت
۳۲۷	نرخ آباد		اور حقیقت طرازی
"	عظیم آباد	۳۳۷	پانچویں خصوصیت جذبات نگاری
"	مرشد آباد	۳۳۸	کلام میں ظرافت و شوخی
"	ٹانڈہ		غالب کا مقابلہ اپنے معاصرین
۳۲۸	حیدر آباد	۳۳۹	شعرا سے
"	فیض آباد و لکھنؤ	۳۴۰	غالب کے شاگرد
	شعرا کے دہلی و لکھنؤ کا دوسرا	"	میر جہادی مجروح متوفی ۱۹۰۲ء
۳۲۹	مقامات پر منتشر ہو جانا	۳۴۱	سالک متوفی ۱۸۹۳ء
۳۵۰	ٹونک	۳۴۲	زکی متوفی ۱۹۰۳ء
۳۵۱	منگرو دل	۳۴۳	رخشاں متوفی ۱۸۸۳ء
"	بھوپال	۳۴۴	آرزوہ متوفی ۱۸۸۵ء لغایت ۱۸۸۵ء
۳۵۲	رام پور		باب ۱۳
۳۵۳	نواب یوسف علی خاں		
"	نواب کلب علی خاں ۱۸۵۲ء تا ۱۸۵۳ء	۳۴۵	دربار رام پور و حیدر آباد
۲۵۷	موجودہ فرما زدا کے رام پور		امیر و داغ کا زمانہ
"	امیرینا کی ۱۸۵۳ء تا ۱۸۵۴ء		

مضمون	نمبر صفحہ	مضمون	نمبر صفحہ
نصائیف	۳۶۰	آرزو	۳۸۱
شاگرد	۳۶۲	احسان	۳۸۲
امیر کی شاعری	"	تسلیم ۱۸۲۰ء تا ۱۹۱۱ء	"
اخلاق و عادات	۳۶۳	نصائیف	۳۸۳
چند اشعار بطور نمونہ	۳۶۴	انداز کلام	"
داغ دہلوی ۱۸۳۱ء عیسوی		عرش	۳۸۶
نفاہیت ۱۹۰۵ء	۳۶۶	دربار حیدر آباد	"
عام عادات و اخلاق	۳۶۸	نظام الملک آصف جاہ اول	۳۸۷
داغ کی شاعری	۳۶۹	میر محبوب علی خاں متخلص آصف	"
نصائیف	"	موجودہ سرنامہ داکٹر دکن	۳۸۹
طرز کلام	۳۷۰	ہمارا راجہ چند دلال	
کلام پر اعتراض	۳۷۱	شادان ۱۷۶۶ء تا ۱۸۳۵ء	۳۹۰
شاگرد	۳۷۳	راجہ گردھاری پر شاد	
امیر و داغ کا مقابلہ	"	باقی ۱۸۳۵ء تا ۱۹۰۵ء	"
جلال لکھنوی ۱۲۵۰ء تا ۱۳۲۵ء	۳۷۷	ہمارا راجہ سرکشن پر شاد متخلص بہ	
نصائیف	۳۷۹	شاد	۳۹۱
زواج کی کیفیت	۳۸۰	انجن ترقی اُردو	۳۹۲
خصوصیات کلام		عثمانیہ یونیورسٹی	۳۹۴
شاگرد	۳۸۱	دارالترجمہ	"

نمبر صفحہ	مضمون	نمبر صفحہ	مضمون
			باب ۱۴
۲۰۹	تصانیف		اردو شاعری کا جدید رنگ
۲۱۰	عنوانیاں		آزاد اور حالی کا زمانہ
"	مسدس حالی	۳۹۴	جدید طرز کے پیشرو
۲۱۲	شکوہ ہند	"	انقلاب کا اثر
	مراثی	۳۹۷	انگریزی تعلیم کا اثر
۲۱۳	مناجات بیوہ	۳۹۸	جدید رنگ کے خصوصیات
"	چپ کی داد	۳۹۹	احسان سخن میں جدتیں
۲۱۴	دلبران حالی	۴۰۰	جدید رنگ کے اثرات
"	مقدمہ شعر و شاعری	۴۰۱	جدید ادب اردو کے تین طرز
۲۱۶	اولیات حالی	"	پہلا طبقہ
۲۱۷	نقائص حالی	۴۰۲	دوسرا طبقہ
"	مولانا محمد حسین آزاد	۴۰۳	تیسرا طبقہ
۲۱۸	آزاد کی شاعری -	"	خواجہ حالی
۲۱۹	تصانیف منظوم	"	حالی کی شاعری اور اس پر
۲۲۰	آزاد کا قدیم و جدید رنگ	۴۰۷	غالب اور شیفہ کا اثر
۲۲۳	آزاد و حالی کا فرق	"	سریہ کا اثر
"	مولوی محمد اسماعیل میرٹھی		
۲۲۵	سرور جہاں آبادی	۴۰۸	
۲۲۶	ان کی شاعری کی خصوصیات		

صفحہ نمبر	مضمون	صفحہ نمبر	مضمون
۴۳۳	رنگ قدیم	۴۲۷	انگریزی نظموں کے ترجمے
۴۳۴	رنگ متوسط	۴۲۹	اکبر الہ آبادی
۴۳۵	رنگ آخو	"	اخلاق مسادات
۴۳۶	اکبر کی خوش طبعی و ظرافت	۴۳۰	اکبر کی شاعری
۴۳۹	اقسام ظرافت	"	پہلا دور ابتدا سے ۱۵۶۶ء تک
۴۴۳	اکبر کی سیاسی نظمیں	۴۳۱	دوسرا دور ۱۵۶۶ء سے ۱۵۸۵ء تک
	اکبر بحیثیت نکتہ چین	"	تیسرا دور ۱۵۸۵ء سے ۱۶۰۵ء تک
۴۴۶	سوسائٹی	"	چوتھا دور ۱۶۰۵ء سے ۱۶۱۲ء تک
۴۸۰	اکبر کے مذہبی عقائد	۴۳۱	پانچواں دور ۱۶۱۲ء سے ۱۶۲۷ء تک
۴۵۱	نادر کا کردی	۴۴۲	اکبر کی غزلیات



سب تصنیف

از مصنف

تہذیب

(از مصنف)

اس کتاب کی تصنیف کی اصلی غرض یہ ہے کہ ادب اردو کی تدریجی ترقی کا خاکہ زمانہ قدیم سے لیکر زمانہ حال تک کا مع مشہور شعراء اور نثرکاروں کے مختصر حالات زندگی اور ان کے کلام اور تصانیف پر ایک مختصر تنقید کے کھینچا جائے۔ یہ بھی کوشش کی گئی ہے کہ ایک طبقہ کے تعلقات دوسرے طبقہ کے ساتھ اور ایک فرد کے تعلقات دوسرے فرد کے ساتھ اس میں وضاحت سے بیان کیے جائیں اور نیز مختلف تحریکوں اور طرزو کی ابتدا اور ترقی اور زوال کے اسباب بتائے جائیں اور اُس دور کے تاریخی حالات و واقعات بھی نظر انداز نہ کیے جائیں جس میں کہ وہ شعراء اور نثرکار گذرے۔ یہ کتاب محض کسی زمانے کے واقعات کا ایک ذخیرہ نہیں بلکہ اُن خیالات اور خصوصیات کے دکھانے کی اس میں پوری کوشش کی گئی ہے جن کا اثر اُس زمانہ پر تھا۔ اسکی تصنیف میں میرے پیش نظر یہ رہا ہے کہ یہ زمانہ حال کے تنقیدی اصولوں کے مطابق بطور ٹکسٹ بک تیار کی جائے تاکہ انگریزی دان جماعت بھی ادب اردو سے کما حقہ واقف ہو جائے۔

مصنف اپنی خامیوں سے بخوبی واقف ہے تقریباً چار برس کا عرصہ گزرا کہ اُس نے باوجود اپنی سرکاری مشغولیوں کے اس کتاب کو ختم کر دیا تھا مگر بعد کو کچھ ابواب میں رد و بدل کرنا پڑا تاکہ وہ زمانہ موجودہ کی تحقیق و تنقید کے مطابق ہو جائیں۔ یہی وجہ اس ناہمواری کی ہے جو کتاب کے مختلف حصوں میں پائی جاتی ہے۔

ابتدائی قصیدہ تو یہ تھا کہ ادب اُردو کی ایک پُر اثر ابتدائی کتاب، کالج کے طلباء اور عام پبلک کے فائدے کے لیے تیار کیا جائے اسی وجہ سے فٹ نوٹ اور حوالوں سے کتاب کو وزنی کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ مگر چند کہ حسب ضرورت اصل کتابوں کا بخوبی مطالعہ کر لیا تھا مگر بالآخر یہ اپنے مقررہ حجم سے بڑھ گئی جس قدر میں آگے بڑھتا گیا اور اس کی غرض بدلتی گئی حوالے دینے کی ضرورت بھی محسوس ہوتی گئی مگر بعد کو عملاً یہ کام مشکل معلوم ہوا۔ میں امید کرتا ہوں کہ یہ نقص آئندہ ایڈیشن میں دور کر دیا جائے گا۔ اس بات کی بھی شکایت کا موقع ہو سکتا ہے کہ پیشی اقتباسات دوسری کتابوں سے نہیں دیے گئے۔ میں نے یہ فروگزاشت جان بوجھ کر کی ہے اور سند میں پروفیسر سنٹیپیری کی کتاب "مختصر تاریخ انگریزی علم ادب" کی مثال پیش کر سکتا ہوں جس کے طرز پر میں نے یہ کتاب ترتیب دی ہے۔ وجہ یہ تھی کہ مختصر اقتباسات میرے مفید مطلب نہ ہوتے اور طویل اقتباسات سے کتاب کا حجم بڑھ جاتا۔ اس کمی کے رفع کرنے کی یہ تدبیر مناسب معلوم ہوتی ہے کہ آئندہ کسی موقع پر ایک علیحدہ کتاب بطور ضمیمے کے مرتب کی جائے جس میں ہر دور کے خاص خاص مصنفین کی کتابوں کے اقتباس مع ان کے انگریزی ترجمہ کے اور اگر ممکن ہو تو منظوم ترجمے کے بالتفصیل دیے جائیں یہ نقص بھی ضرور رہ گیا ہے کہ ماخذ کے نام نہیں دیے جاسکے۔ اس کی تلافی انشاء اللہ یوں ہو جائے گی کہ ایک علیحدہ رسالہ تنقیدی نوٹوں کے ساتھ جس کا نام "ماخذ ادب اردو" ہو گا شائع کیا جائے گا۔ ایک اور اہم فروگزاشت قابل ذکر یہ ہے کہ دور موجودہ کے اُردو شعرا کا اس کتاب میں ذکر نہیں ہے وجہ یہ ہے کہ ان کا حال ایک علیحدہ کتاب میں قلمبند کیا گیا ہے جو عنقریب شائع ہونے والی ہے۔

اس کتاب کے متعلق میں پروفیسر سنٹیپیری کا یہ مذاقہ مگر نہایت صحیح قول ضرور نقل کروں گا "اگر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ میں نے ایسی کتاب لکھی ہے جس میں کوئی غلطی

نہیں ہے تو وہ مسخرہ چھوٹا ہے اور جو شخص کسی دوسرے سے ایسی کتاب لکھنے کی امید رکھے جس میں کوئی غلطی نہ ہو وہ اس سے بڑھ کر لغو ہے" مجھ کو اس کتاب میں بہت سی فروگزاشتوں کا اعتراف ہے جن کی اصلاح افسوس ہے کہ نہیں کی جاسکتی۔

اب میں اپنی اس مختصر تالیف کو پبلک کے سامنے پیش کرتا ہوں مجھ کو اپنی محنت اور کاوش کی پوری داد مل جائے گی۔ اگر میں اس کے ذریعہ سے لوگوں کے دلوں میں اس ادب شریف یعنی ادب اُردو کا صحیح ذوق پیدا کروں جو میری رائے میں ہندو مسلم اتحاد کا بہترین ذریعہ ہے اور ان کو بشوق دلائل کہ وہ اس قصہ عالی کو جس کی میں نے صرت بنیاد ڈالی ہے تکمیل تک پہنچادیں۔

میں تیرہ دل سے ممنون ہوں (۱) ان تمام مصنفین کا جن کی کتابوں کو میں نے نہایت شوق سے پڑھا اور ان سے فائدہ اٹھایا مگر اس کا اعتراف متن میں نہ کر سکا (۲) ان تمام اصحاب کا جنہوں نے مجھ کو کتابیں بطور تحفے کے لیے مرحمت فرمائیں اور میرے استفسارات کا جواب نہایت فراخ دلی سے دیا (۳) ان حضرات کا جنہوں نے مسودہ کتاب پڑھا اور تصحیح پر مدد دی میری مدد کی (۴) ان کا جنہوں نے میرا دل بڑھایا اور نیک صلاح سے اپنی ہمدردی کا ثبوت دیا مگر چونکہ میرے محضوں کی فہرست طویل ہے اور ان میں سے بعض کا انتخاب کرنا ایک گود دوسرے پر سچا ترجیح دینا ہے لہذا میں ان کا سب کا مجموعی حیثیت سے تیرہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں

رام بابو سکسینہ

از بمبئی (یو۔ پی)

نقیرط

(از عالییناب فضیلت انشابل سر تیج بہادر سپرد صاحب ایم۔ اے۔ ال ال۔ ڈی۔ کے۔ سی۔ ایس لکئی)

لکھنؤ یونیورسٹی کے جلسہ کانوکیشن کی تقریر میں میں نے اس بات پر انھار افسوس کیا تھا کہ ہم لوگ زبان اردو سے بے توجہی اور غفلت کر رہے ہیں بہارے صوبے کے اکثر تعلیم یافتہ نوجوان اپنی اُس ذمہ داری کو محسوس نہیں کرتے جو کہ اُن پران کی زبان اور ادب کی ترقی کی نسبت عائد ہوتی ہے۔ افسوس ہے مگر صفائی سے کہنا پڑتا ہے کہ شمالی ہند کی دیسی زبانوں کو جس قدر ہمارے نام نہاد مشنلزم (قوم پرستی) کے غلط مفہوم نے جو دھل کیونلزم (فرقہ بندی) کا مراد ہے، نقصان پہونچایا اتنا اور کسی ہیر نے نہیں پہونچایا۔ ہمارے صوبے کے اکثر مقامات پر ایسے ہندو گریجویٹوں اور انڈرگریجویٹوں کو دیکھ کر سخت افسوس آتا ہے جن کا یہ خیال ہے کہ ہندی کی ترقی کے لازمی طور پر یہ معنی ہیں کہ دلوں سے اُس زبان اور ادب کی محبت اور خیال بالکل بحال دیا جائے جس میں خود انکے بزرگ ابھی دہری ایک نسل کا زمانہ گذرا کہ کمال رکھتے تھے۔ اسی طرح ایسے

مسلمانوں سے مل کر بھی نہایت صدمہ پہنچتا ہے جو ہندوؤں کی زبان اُردو سے بے
توجہی اور بے پروائی کی شکایت سے تو بے خبر نہیں لیکن اپنا کوئی قابل تعریف کارنامہ
اُس میدان ادب میں نہیں پیش کر سکتے جس کا محافظ خاص وہ اپنے تئیں سمجھتے
ہیں تعلیم و تربیت اور علمی مذاقوں کے اختلاف نے جو گذشتہ بیس کچیس سال کے عرصہ
میں بہت بڑھ گیا ہے، فرقہ بندی کے مضر اثرات کو اور قومی کر دیا ہے جس سے سر
چشمہ اتحاد مسموم اور ایک دوسرے کے خیالات کو صحیح طور پر سمجھنا معدوم ہوتا جاتا ہے۔
میں اس سے بے خبر نہیں ہوں کہ زمانہ حال میں لوگوں کو ایک قسم کا ادبی اشتغال
ضرور ہے مگر ہمارے اس قسم کے کاموں سے ہماری زندگی کتنی مالا مال ہوگی یا کہ وہ کام
کتنے دیر پا ہوں گے یہ ایسے سوالات ہیں کہ جن کا جواب صرف مَرورِ ایام سے ملے گا۔
جس قدر نظمیں فی زمانہ لکھی جاتی ہیں اُن کا زیادہ تر حصہ ایک منظوم نثر سے زیادہ
دقت نہیں رکھتا اُن میں کوئی الہامی اثر مطلق نہیں پایا جاتا اور نہ کوئی اعلیٰ اُٹیل ہوتا
ہے بلکہ بعض نظمیں تو میں نے ایسی دیکھیں جن پر ”بدنام کتہہ“ لکھنا چاہیے چند ”کی مثال پوری
طرح صادق آتی تھی اور اُن کو ایک اعلیٰ درجے کی بد مذاتی کا نمونہ پایا۔ ہماری نثر کی بھی یہی
حالت سمجھنا چاہیے چلتی ہوئی کتابیں اس صنف میں ہرگز ایسی نہیں ہوتیں جن سے ہمارے
خیالات میں بلندی یا ہماری دھچکیوں میں کوئی اضافہ ہو بلکہ وہی کمبخت پُرانے عشق و
عاشقی کے قصے ہیں جن میں یا تو کسی عورت کی یوفانی اور متکاری اور یا ادنیٰ درجہ کی
رکیک سازشوں اور چالاکیوں کا ذکر ہوتا ہے۔ میرے اس خیال میں تمام ادباء اُردو
بالکل غفل نہیں ہیں لہذا میں اس بات کا اعتراف کرنے کو تیار ہوں کہ الحمد للہ ہم میں چند
افراد ایسے ضرور ہیں جنکے ادبی کارنامے گو مقدار میں کم سہی مگر بلا شک نہایت اعلیٰ درجہ کے
ہوتے ہیں شعر اور دو کی پوری تعداد کا حال تو خدا ہی کو معلوم ہے مگر وہ جو اپنا نام صنفِ ہستی
پر چھوڑ جائیو لے ہیں اُنکی تعداد فی الحقیقت بہت کم ہے میرا ذاتی خیال ہے کہ اگر ہندوستان

میں کسی مقام پر ادب اُردو کی قرار واقعی دیر پا اور مفید خدمت انجام دی جاتی ہے تو وہ حیدر آباد دکن ہے۔

انہیں اسباب سے یہ میرے لیے خاص طور پر قابل مسرت ہے کہ ہمارے اسی صوبہ کے ایک گزٹ بکسٹ کی یہ بڑی خوش قسمتی تھی کہ اُن کو اتنا وقت ملا کہ باوجود اپنی کٹری مصروفیتوں کے انہوں نے ایک کتاب زبان انگریزی میں زبان اور ادب اُردو کی تاریخ پر تیار کر دی۔ مولانا آزاد کی مشہور و معروف کتاب "آب حیات" سے کون واقف نہیں لیکن وہ ضروریات زمانہ حال کے مطابق نہیں ہے۔ اس کے علاوہ بعض اور کتابیں زمانہ موجودہ میں بھی اسی بحث پر بہت عمدہ تصنیف ہوئیں مگر اُن کے مصنفین مجھے معاف فرمائیں اگر میں یہ کہوں کہ اُن میں قوت امتیاز اور روشن حیاتی کے ساتھ تنقید کی بھی کمی ہے اس کتاب کے مسودہ کو میں نے بڑی خوشی کے ساتھ پڑھا تھا اور ہر چند کہ بعض باتوں میں مصنف کی تجاویز سے اختلاف کیا جاسکتا ہے مگر قابل مصنف کی اس بارے میں ضرور داد دینا پڑتی ہے کہ کیسے مسلسل اور مربوط طریق سے انہوں نے زبان اور ادب اُردو کی عمرتی اور نشوونما کا حال قدیم زمانہ سے لے کر زمانہ حال تک کا لکھا ہے۔ ممکن ہے کہ اس کتاب کے آئندہ ایڈیشنوں میں وہ خود اس بات کی ضرورت محسوس کریں کہ اپنی تجاویز پر نظر ثانی کریں مگر جو بات مجھے اُن میں نہایت امید افزا معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ اپنی رائے قائم کرنے میں کڑا اور اپنے اظہار خیال میں بیباک ہیں مثلاً میں اس کتاب کے باب کو پیش کرتا ہوں اور بھی بہت سی مثالیں دیگر مقامات سے پیش کی جاسکتی ہیں مگر میں اسی پر اکتفا کروں گا۔ مختصر یہ کہ کتاب نہایت اعلیٰ درجہ کی ہے جس کے واسطے تمام ہی خواہان اُردو کو لائق مصنف یعنی رام بابو سکسینہ صاحب کا احسان مند ہونا چاہیے۔ یہ کتاب یقیناً اُن تمام اصحاب کو پسند آئے گی، اور میری رائے میں ضرور آنا چاہئے جو اس بات کی

تحقیق چاہتے ہیں کہ زبان اردو کس طرح عالم وجود میں آئی مختلف استادوں کے ہاتھ سے اُس میں کیا کیا تبدیلیاں واقعی ہوئیں اور ترقی کے مختلف اُردوار نے اس پر کیا کیا اثرات کیے۔ آخر میں یہ ضرور کہوں گا کہ سول سروس صوبہ کے حکام اتنے خوش نصیب نہیں ہیں کہ ان کو اپنے فرائض منصبی کی انجام دہی میں اتنا وقت مل جائے کہ وہ اُس کو کسی ادبی خدمت میں صرف کر سکیں مگر رام بابو صاحب نے اس گلہ کو توڑ دیا اور دنیا کو دکھلایا کہ ڈپٹی کلکٹر ایک مصنف بھی ہو سکتا ہے اور قانون و انتظام کے فرائض کے ساتھ ساتھ ادبی فرائض کو بھی بخوبی انجام دے سکتا ہے۔

دکٹر مسرتیج بہادر سپرو

التکسیر

ادب اردو تشنه تھا کہ اس کی قدیم تاریخ یعنی اُس کی نشو و نما اُس کی تدریجی ترقیاں اور وہ تغیرات جو اُس میں وقتاً فوقتاً ہوتے رہے ہیں ان سب چیزوں کے حالات کسی ایسے شخص کی بھی زبان سے سُنے جائیں جو اُن لوگوں سے بالکل مختلف ہو جنہوں نے اب سے پہلے اس قسم کے حالات و واقعات پر بہت کافی روشنی ڈالی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس مضمون پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور بہت خوب لکھا جا چکا ہے صد ہا نہیں تو بیسیوں تذکرے ایسے موجود ہیں جن سے مذکورہ امور بہت وضاحت سے معلوم ہو جاتے ہیں۔ اگر ہم تذکرہ نویسی کو تین دوروں پر تقسیم کریں تو قدما میں میر تقی اور میر حسن کے تذکرے ہمارے واسطے شمع ہدایت کا کام دیتے ہیں۔ متاخرین میں آپ حیات اور جلوہ خضر کو ہم لے سکتے ہیں جن سے ہم کو بہت کچھ معلومات حاصل ہوتی ہیں اور ہو سکتی ہیں۔ اور اول الذکر تو باوجود سخت تنقیدات کے جو اُس کی نسبت وقتاً فوقتاً ہوتی رہتی ہیں جن سے بعض واقعات فی الحقیقت معرض شک میں ضرور پڑ گئے ہیں پھر بھی اپنی صنف میں ایک لاجواب اور انتخاب کتاب ہے جس کا نظیر علی الخصوص اس زمانہ میں جبکہ ہم اپنی زبان کی طرف سے اتنی بے پروائی کرتے ہیں محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ قدیم تذکرہ نویسوں نے بس اسی پر اکتفا کی ہے کہ اپنے معاصرین اور بعض قدیم شاعروں کے وہ حالات جو اُن کو بے آسانی معلوم ہو سکے قلب بند کر دیے اور کچھ نمونے اُن کے کلام کے پیش کر دیے اور مختصر طور پر اپنی رائے اُن کے کلام کی نسبت ظاہر کر دی اور بس۔ زبان کی تدریجی ترقیوں کا حال اور وہ تغیرات جو اُن کے عہد تک زبان میں ہوئے تھے اس کے بیان کرنے کے زندہ شائق تھے اور نہ اس کو وہ ضروری سمجھتے تھے میری رائے میں اس کا سہرا مولانا آزاد کے سر ہے کہ

انہوں نے اُردو زبان کی ابتدا و ارتقاء اور اُس کے مختلف ادوار کی تاریخ زمانہ حال کی روش کے مطابق سب سے پہلے قلمبند کی مگر میری ناچیز رائے میں اتنی بات اُن سے ضرور رہ گئی کہ اس قسم کی کتاب میں اپنی عبارت کا طرز ادب بجائے سادہ اور سائنٹیفک رکھنے کے انہوں نے نہایت رنگین اور پُر نقشہ رکھا جیسا کہ اُن کی دیگر تصانیف کا ہے اور اس کا خیال نہیں رکھا کہ یہ تصنیف ایک خاص انداز کی اور ان کی دیگر تصانیف سے مختلف ہے۔ اس سے اتنا فائدہ تو ضرور ہوا کہ ان کی کتاب اس قدر دلچسپ ہو گئی کہ اگر ایک مرتبہ اُس کو شروع کیجے تو پھر ہاتھ سے رکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ اور ایک دفعہ کے پڑھ لینے کے بعد طبیعت اُس سے اکتاتی نہیں۔ اور یہ بات گلستانِ سعدی کے سوا کسی دوسری کتاب میں نہیں پائی جاتی۔ مگر حق یہ ہے کہ جو اعتراضات فی زمانہ اس پر بیدردی سے کئے جا رہے ہیں یہ بھی اسی عبارت کی رنگینی کا نتیجہ ہے کہ کتاب کو پُر لطف بنانے کی غرض سے اور دل کو خوش کرنے کے لیے اظہارِ واقعات میں ایک مؤرخ کی نہیں بلکہ ایک افسانہ گو کی حیثیت اختیار کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر ایسے واقعات خلط ملط ہو گئے جن کا سرے سے وجود ہی نہیں ہے۔ یا ایسے پُر زور اور رنگین الفاظ استعمال کئے گئے جو اس موقع کے حسبِ حال نہ تھے۔ تنقید کی گہری نگاہیں جو اس کتاب پر بالفعل پڑ رہی ہیں اور اعتراضات کی بوچھاڑ جو اُس پر ہو رہی ہے میری رائے میں ایک نتیجہ لازمی بلکہ خمیازہ اس غلطی کا سمجھنا چاہیے جو مصنف سرور نے اپنی عبارت اور طرزِ ادا کے اختیار کرنے میں شروع میں کی تھی۔

تذکرہ نویسی کا تیسرا اور ہم کو اپنے ہی زمانے میں ملتا ہے جس میں لالہ سرایم صاحب کی مشہور و معروف تصنیف ختمِ انوار جاوید ہے جس میں سلاستِ عبارت، روانی بیان اور متانت کے ساتھ سجدہ کوشش کی گئی ہے کہ ہندوستان کے نامی گرامی شعرا کے ساتھ ان لوگوں کا بھی تذکرہ کیا جائے جو گوشتِ ملگنائی میں زندگی گزار رہے ہیں مگر افسوس ہے کہ اس تذکرہ

کی اب تک صرف چار جلدیں چھپی ہیں اور شین منقوطہ سے آگے نہیں بڑھا۔ اس کے ساتھ ہی تذکرہ گل رعنائی مولوی حکیم عبدالحی صاحب مرحوم کا اور شعر الہند مولوی عبد السلام صاحب ندوی اور سیر المصنفین جناب تنہا (نثاروں کا تذکرہ) بھی ہرگز نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہیں بلکہ ان تذکروں کے شائع ہونے سے بہت سیادہ یاقین جواب تک پردہ خفایں تھیں معرض ظہور میں آگئیں۔

مگر غالباً غلط نہ ہوگا اگر ہم یہ کہیں کہ ان سب میں کوئی نہ کوئی مخصوص انداز رکھا گیا ہو اور انھیں وجوہات سے ان تذکروں کو مکمل کہنا ایک حد تک غیر ذمہ دارانہ حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ تذکرہ خجائے جاوید میں صرف اس بات کا التزام کیا گیا ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ شاعر بھی چھوٹ نہ جائے۔ اسی طرح تذکرہ گل رعنائی بنیاد آزاد کی غلط بیانیوں کے ایراد پر ہے اس کے ساتھ ہی یہ کسی طرح سے مکمل نہیں اور بہت سی باتوں اور بہت سے بالکالوں کو اس میں نظر انداز کر دیا گیا ہے یا نظر انداز ہو گئے ہیں شعر الہند بحیثیت مجموعی شعرا رد کی ایک تاریخ ہے مگر ذلیدہ بیانی نے اس کو بھی حدود معین سے نکال دیا ہے۔ سیر المصنفین یا نثر نگاروں کا تذکرہ یہ مخصوص شر کے لیے ہے۔ اگرچہ یہ بھی ادب اردو کے واسطے نہایت قابل قدر اور گرانہا اضافے ہیں مگر سب میں ایک نہ ایک انفرادی خصوصیت موجود ہے۔

”ہشتری آن اردو لٹریچر“ جناب ”رام بابو صاحب سکینہ کے دل و دماغ کا نتیجہ ہے جو انھوں نے انگریزی میں تصنیف فرمائی ہے اور اس سے زیادہ تر یہ غرض تھی کہ انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ اس سے مستفیض ہو مگر اول سے آخر تک اس کتاب کے دیکھنے والے جانتے ہیں کہ مصنف موصوف نے جس کاوش جس کوشش زور مطالعہ اور وسعت نظر سے اس میں کام لیا ہے اور اسلوب بیان و تنقید وغیرہ میں جو صفائی مد نظر رکھی ہے شعرا اور نثاروں کے کلام کا توازن کر کے ان پر حبیبی صحیح میا کا نہ اور بے لاگ رائیں قائم کی ہیں وہ اس کتاب کو ہر حیثیت سے منفرد صورت میں پیش کرتی ہیں۔ تلاش و تجسس کا یہ

عالم ہے کہ اُن واقعات کو اظہر من الشمس کر دیا ہے جن سے ابھی تک لوگ نا آشنا تھے ایک ایک لفظ سے ایک ضخیم دفتر کا فائدہ اٹھایا ہے اس کے ساتھ کہیں توازن و انصاف کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ قدما اور متاخرین کو تو بالکل نظر انداز کیجئے زمانہ حال میں جس قدر کتابیں زبان اُردو کی تحقیق یا اس کی نظم و نشر کے متعلق یا بطور تذکرہ وغیرہ کے نکلتی ہیں ان کے مصنفین زبان انگریزی سے کما حقہ واقفیت تقریباً پندرہ بیس فیصدی سے زیادہ نہیں رکھتے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو طریقہ تحقیق و تدقیق (ریسرچ) اور علی الخصوص ترتیب مضامین کا مطبوعاتِ یورپ میں اختیار کیا جاتا ہے اس سے ہماری اکثر ادبی تصانیف بالکل خالی ہوتی ہیں۔ اور شاید اسی وجہ سے وہ پُرانے رنگ کی کتابیں جن میں فہرست مضامین و انڈکس تک کا پتہ نہیں ہوتا۔ موجودہ انگریزی داں طبقہ کو مطلق پسند نہیں آتیں اور اُن کی آنکھیں انھیں باتوں کو ڈھونڈھتی ہیں جو زبان انگریزی اور دیگر یورپین زبانوں میں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ اور جن سے اور کچھ نہیں تو کتاب کی سہولت اور دلچسپی میں ضرورت رتی ہو جاتی ہے اور پڑھنے والے کا بہت سا ضروری وقت فضول اور غیر ضروری باتوں سے بچ جاتا ہے۔ فاضل مصنف نے اصل کتاب کی ترتیب میں اُسی روش کا خیال رکھا ہے جو ادب انگریزی کے مشہور مورخین پر فیسیسٹس بری اور گاس وغیرہ نے اپنی تصانیف میں اختیار کی ہے جس سے علاوہ جدت ترتیب اور مخصوص اسلوب بیان کے یہ فائدہ بھی ضرور ہوا کہ کتاب اُن اصحاب کے واسطے بہت مفید ہو گئی جنہوں نے بی اے یا ایم اے کی ڈگری یا آئی، سی، ایس کے واسطے ادب اُردو لیا ہو جس قدر سوالات کے امتحان مذکور میں پوچھے جاسکتے ہیں وہ سب اس کتاب کے مطالعہ سے بخوبی اور آسانی حل ہو سکتے ہیں اور ترتیب مضامین خود سوالات بنانے میں بھی بہت مُعین ہوگی۔ مگر چونکہ اردو داں طبقہ اس سے محروم تھا۔ نیز یہ کہ ایسی کتاب کو عام ہونا چاہیئے اور اس سے ہر شخص کو مستفیض ہونا چاہیئے اور موجود صورت میں وہ محض ایک فرقہ کے لیے مخصوص تھی اس وجہ سے

ضرورت محسوس ہوئی کہ اس کا ترجمہ کر دیا جائے۔ مگر ترجمہ جس کو حقیقی ترجمہ کہہ سکیں اُس کے لیے میرے نزدیک اُسی مطالعہ اُسی تحقیق نظر اُسی وسعت معلومات کی ضرورت ہے جو مصنف کی نظر اور عبارت میں ہے۔ دوسرے یہ کہ ایک زبان کے خیالات کو دوسری زبان میں لانا اور پھر اُن کی وہی خوبیاں قائم رکھنا محال نہیں تو دشوار ضرور ہے مگر چونکہ اصل خیالات کا ماخذ اُردو ہے اور اُردو ہی کے جامہ میں اُس کو پھر منتقل کرنا تھا اس لیے بہت ممکن ہے کہ باوجود ان مشکلات کے میں کچھ اس فرض سے عہدہ برآ ہوا ہوں۔ اس موقع پر میں اپنے قدیم عنایت فرما اور مخلص دوست رائے بہادر کنوریم بہادر شاہ صاحب بالقابہ کا ممنون ہوں کہ انھیں کے اصرار سے مجھ کو موقع ملا کہ اس کتاب کے ذریعہ سے کچھ ادب اُردو کی خدمت کر سکوں۔

ترجمہ کی مشکلات کے علاوہ بعض دوسری مشکلوں سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ بعض باتیں ایسی تھیں کہ وہ اگرچہ اول اُردو ہی میں تھیں مگر قدیمی تذکرہ نویسوں نے اُس کو فارسی میں بیان کیا ہے پھر انھیں کو اردو میں بیان کیا اور پھر اردو سے انگریزی میں بیان کی گئیں اس لیے ان میں کچھ نہ کچھ تباہی ہو گیا۔ اس میں مصنف ایک حد تک معذور تھے مگر اُن کو اُردو میں دوبارہ پھر اُسی حیثیت سے لانا مشکل تر تھا جس کی زیادہ سے زیادہ کوشش کی گئی ہے۔ اور جہاں انھیں مضامین مانوڑہ کا اعادہ کرنا پڑا ہے تو اُن کے الفاظ کو نیا جامہ پہنا دیا گیا ہے بعض واقعات ایسے تھے جنھیں شاید مصلحتاً اصل کتاب میں مجمل بیان کیا گیا تھا۔ مگر اردو میں اُن کی کسی قدر تفصیل ضروری تھی۔ اُن کو بھی اس میں بیان کیا گیا اور اس میں تحقیق و تنقیح کا مینغی کی گئی۔

چونکہ انگریزی میں نمونہ کلام دینا کچھ زیادہ ضروری اور دقیق نہ تھا اس لیے اصل کتاب میں اس طرف توجہ نہیں کی گئی لیکن اس میں سب کا نہیں مگر اکثر کائنات کلام دیا گیا ہے۔ کسی دوسری زبان میں اگر یہ بات ضروری نہ بھی ہو تب بھی اُردو کے لیے نقد و تبصرہ

میں سماعت اور ملائمت کی ضرورت ہے اسی لیے اکثر اس بات کو نظر انداز نہیں کیا گیا اور نہ ظاہر ہے کہ گلشن بیجار میں نظیر اکبر آبادی پر کوئی بڑا اعتراض نہیں کیا گیا تھا بلکہ مصنف نے اپنی رائے کو بے لوث ظاہر کر دیا تھا۔ اسی پر قطب الدین باطن کا پورا تذکرہ لکھا گیا جس میں وہ سب اساتذہ دہلی معرض تحقیق میں لائے گئے جنہیں مصنف گلشن بیجار (یعنی نواب مصطفیٰ خاں شیفہ) سے برائے نام بھی تعلق تھا۔ اسی طرح سے برہان قاطع ٹھنی اور قاطع برہان مرزا غالب نے اپنے زمانہ میں جو بے پایاں طوفان برپا کیا تھا اس کی مہیب آوازیں آج تک کانوں میں آرہی ہیں۔

اکثر جگہ ترجمہ میں کوہ کندن و کاہ بر آوردن کا معاملہ پیش آیا ہے یعنی بعض معمولی اور ادنی باتوں کے لیے پوری پوری کتابیں اور تاریخیں پڑھنی پڑی ہیں جس کے بعد کوئی صحیح نتیجہ نکالا جاسکا ہے یا کوئی رائے قائم کی ہے۔ اصل کتاب کے علاوہ مصنف صاحب بھی اکثر جگہ حذف و اضافہ کرتے رہے اس لیے اس میں وہ بہت سی باتیں دوسری شکل میں نظر آئیں گی جو اصل کتاب میں تھیں۔ کہیں کہیں مترجم اور مصنف کی رائے میں اختلاف تھا جسکو فٹ نوٹ کے تحت میں ظاہر کر دیا گیا ہے۔ غرض کہ یہ ایک کوشش و کاوش ہے جو ارباب نظر کی خدمت میں ہدیہ ناز بنا کر پیش کی جاتی ہے اور نگاہ منتظر طفرائے قبول کی مستحق ہے۔

مجموعی حیثیت سے آج جب اس کتاب کو دیکھا جاتا ہے تو تنہا اس کے اندر وہ تمام چیزیں نظر آتی ہیں جو ایک ادیب کی معلومات کے لیے سرمایہ ناز ہیں یعنی زبان اردو کی پیدائش ہندی بھاشا اور دوسری زبانوں سے اُس کا ارتباط و اتحاد۔ دوسری زبانوں کا اُس سے سرنگوں ہونا اور ملت جانا۔ نظم کے ادوار مختلفہ اُن کے مشہور و معروف افراد۔ اُن پر تنقیدیں موجودہ اساتذہ کے حال۔ تمام اصنافِ نظم پر روشنی۔ اُن کی ابتدا و انتہا کے تاریخی نقطہ نظر سے انکشافات و تشریحات اردو کے مشہور مصنفین۔ اُس کی عہدِ بعہد کی ترقیاں۔ اُن کی تصانیف پر نقد و تبصرہ مشہور نثریوں کا ذکر اور نثر کے اصناف وغیرہ پر بسیط رائیں

غرض کہ سبھی کچھ ان اوراق پریشال میں موجود ہے۔ اردو کے جدید کی جو روش بعض ناواقبت اندیشوں نے نکالی ہے۔ اسولی طریقہ پر خواہ اُس کا کوئی بھی موجود ذمہ دار ہو مگر موجودہ صورت اس بات کی معین معلوم ہوتی ہے کہ وہ سلاست، شیرینی، روانی بیان کا خاتمہ کر کے چند ہی روز میں زبان کو ایک خارزار بنا دے گی میں نے اس بات کی خصوصیت سے کوشش کی ہے کہ نہ تو استعارات و تشبیہات اغراق و غلو سے مطلب کا خاتمہ ہو جائے اور نہ وہ اس قدر دشوار ہو جائے کہ قدم قدم پر لغت دیکھنا پڑے۔ بلکہ عبارت سلیس اور سادہ رہے اور کہیں سے گنجلک نہ ہو۔

کتاب کا فائدہ اور دلچسپی بڑھانے کے لیے اس کے آخر میں ایک مفصل انڈکس شامل کیا گیا ہے تاکہ ہر اُس چیز کو جس میں اس کا ذکر ہے یہ آسانی ڈھونڈ سکیں۔

ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں بعض مشہور شعرا و نثر نویسوں کی تصاویر بھی دیدی گئی ہیں جس سے کتاب کی دلچسپی بڑھ گئی ہے ہر چند کہ یہ ضروری نہیں کہ تصاویر کے شمول سے کسی کتاب کی اصلی قدر و قیمت میں کوئی متدبیہ اضافہ ہو مگر جبکہ فی زمانہ دوسری کتابوں کے ادبی تذکرے اور انسائیکلو پیڈیا اپنے شاہسیر کی تصویروں سے خالی نہیں ہوتے تو ہم کو بھی مناسب معلوم ہوا کہ جس طرح ہم اپنے ادبی پیشواؤں کے روحانی اور باطنی فیوض سے اپنے دل و دماغ کو مسرور و متور کرتے ہیں اسی طرح ان کے خد و خال اور ظاہری جمال سے اپنی آنکھوں کو بھی روشن کریں۔ جی چاہتا تھا کہ تمام مشہور شہسبازوں کی تصاویر دی جاتیں مگر افسوس ہے کہ قدما کی تصویریں دستیاب نہیں ہوئیں اور جو ایک آدھ ملی بھی اُس کا بھی اعتبار نہیں علی الخصوص سودا کی تصویر جو ابھی تھوڑا عرصہ ہو اُزما نے میں شائع ہوئی تھی اور اس کتاب میں بھی اُسی سے لی گئی ہے۔ نہایت بھٹی اور بھونڈی تصویر ہے اور ہرگز دل نہیں مانتا کہ یہ مرزا بیچ سودا کی تشبیہ ہوگی بہر طور جس قدر عمدہ اور معتبر تصاویر بہم پہنچ سکیں اس کتاب میں دی گئیں۔ اور اُس کے واسطے ہم اپنے مکرم و محترم دوست

منشی دیانرائن صاحب نگم کے ممنون ہیں کہ انھوں نے بعض تصاویر کے بلاک فراہم کیے اور خود مصنف صاحب اور مولوی عبدالباری صاحب آتشی کے بھی شکر گزار ہیں جن کی کوشش سے بعض دیگر تصاویر دستیاب ہوئیں۔ اول الذکر نے ایک بہت بڑا ذخیرہ تصاویر کا بھیج دیا جس میں سے اکثر کام آئیں۔

آخر میں بہت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ میں بعض حضرات کا جن سے اس کتاب کی تیاری میں بہت کچھ مدد ملی دلی شکریہ ادا کروں سب سے پہلے میں اپنے مدگار اور دوست مولوی عبدالباری آتشی کا نام اس فہرست میں لینا ضروری سمجھتا ہوں کہ جنھوں نے مجھ کو اس کی تکمیل و تیاری میں بڑی مدد دی۔ مجھ میں ایک صحت عیب ہے کہ اپنے ہاتھ سے لکھنے سے قاصر ہوں بلکہ اپنے ڈکٹیشن سے کسی دوسرے شخص سے لکھواتا جاتا ہوں۔ یہ کتاب تمام و کمال مولوی صاحب موصوف کی اس اعانت قلبی کا نتیجہ ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر ان کا سا کاتب مجھے نہ ملتا تو اس کا اتمام و اختتام دشوار تھا مولوی جعفر علی صاحب مصرع مطبع کا بھی شکر ہوں کہ انھوں نے نہایت مستعدی و رہبر شکاری سے میرے ساتھ پردون پٹر سے اور سپرنٹنڈنٹ مطبع یعنی بابو کیسری و اس صاحب سیٹھ کا بھی شکر یہ میں نہیں بھول سکتا جنھوں نے اس کتاب کی طباعت و اشاعت میں دلچسپی لے کر کافی مدد دی۔

مرزا محمد سکری لکھنؤ ۱۵ فروری ۱۹۲۹ء

باب

زبان اردو اور اُس کی اصل

اردو سے کیا مراد ہے | عام طور پر لوگ اردو کو فارسی کی ایک شاخ خیال کرتے ہیں اس وجہ سے کہ اس کی ابتدا مسلمان حملہ آوروں کی فوج میں اور مسلمان سلاطین ہند کی دارالسلطنتوں میں پڑتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اردو کے فارسی اثرات ہونیکے غلطی عام لوگوں کو تو اس وجہ سے بھی محسوس ہوتی ہے کہ اُس میں فارسی لفظ بکثرت ہیں اور اُسکی شاعری کی بحرین اور اُس کا رسم الخط بھی مثل فارسی کے ہے۔ اسی غلطی کی بناء پر عام لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے بمقابلہ ہندی کے جو ہندوؤں کی مخصوص زبان سمجھی جاتی ہے اور اسی غلط فہمی سے ایک عرصہ دراز سوخت مقابلہ اور مباحثہ درمیان معاونین اردو اور طرفداران ہندی کے ان دونوں زبانوں کی عمدگی اور خوبی اور نیز ان کی استعداد قبولیت عامہ کی نسبت چلا آتا ہے اور اس بحث میں لوگ ایک معمولی بات یعنی زبان اردو کی اصل کو نظر انداز کر جاتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ زبان اردو اُس ہندی یا بھاشا کی ایک شاخ ہے جو صدیوں تک ہلی اور میرٹھ کے اطراف میں بولی جاتی تھی اور جس کا تعلق شوریسی پراکرت سے بلا واسطہ تھا یہ بھاشا جس کو مغربی ہندی کہنا بجا ہے زبان اردو کی اصل اور ماں سمجھی جاسکتی ہے

گو کہ "اُردو" کا نام اس زبان کو ایک عرصہ دراز کے بعد دیا گیا۔ زبان اردو کی طرف
 دیکھو، محاورات اور کثرت سے ہندی الفاظ کا اُس میں استعمال ہونا اس بات کی بکثرت دلیل ہے
 کہ اُسکی ابتدا ہندی سے ہوئی اور یہ محض اتفاق تھا کہ وہ ہندوستان کی زبان عام بن گئی جس
 کی وجہ یہ ہوئی کہ دہلی جو اس زبان کا ابتدائی مرکز تھا مسلمان حملہ آوروں اور بادشاہوں کی
 بجائے درود اور اُن کا دارالسلطنت بنا ہوا تھا۔ پس یہ خیال کرنا جیسا کہ میراثن اور بعض اور
 قدیم اردو نشانوں کا خیال معلوم ہوتا ہے کہ اردو ایک مخلوط زبان ہے جس میں وہ سب
 زبانیں داخل ہیں جو کسی زمانے میں دلی کے بازاروں میں بولی جاتی تھیں صحیح نہیں ہے
 یہ ضرور یہ ہے کہ لشکر یا بازار سے اس زبان کی نشوونما اور ترقی کو اس قدر تعلق ضرور تھا
 کہ اس کا نام ہی "اُردو" ہو گیا جس کو زبان ترکی میں "لشکر" کہتے ہیں۔ زبان میں ہنوز
 پختگی نہیں آئی تھی اور وہ بحالت تشکیل تھی اور اجنبی الفاظ اور جملوں کے قبول کر لینے
 کا مادہ اُس میں بہت تھا جیسا کہ اب بھی ہے۔

اس زمانے میں انگریزی تقلید میں اردو کو "ہندوستانی" کہتے ہیں، مگر یہ لفظ
 ہماری رائے میں گویا اعتبار لفظ صحیح ہو مگر حقیقت میں صحیح نہیں ہے کیونکہ اس لفظ میں
 مشرقی ہندی اور مغربی ہندی اور راجستانی سب شامل ہیں۔ اسی طرح ہمارے خیال
 میں برج بھاشا کو اردو کا ماخذ قرار دینا جو کہ مغربی ہندی کی ایک شاخ ہے، اور جیسا کہ
 مولانا محمد حسین آزاد نے بھی سمجھا ہے صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اس وجہ سے کہ برج بھاشا جو
 متھرا اور اُس کے جوار میں بولی جاتی تھی۔ گو اُس بھاشا سے جو اطراف دہلی میں بولی
 جاتی تھی بہت مشابہت رکھتی ہے مگر پراگرت کی ایک علیحدہ شاخ ہے اور یہی شاخ
 یعنی دلی بھاشا ہمارے خیال میں زبان اردو کی اصل سمجھی جاسکتی ہے۔

اردو اور ہندی کا تعلق جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا اردو کا اصلی ماخذ وہ زبان ہے جو
 دلی اور میرٹھ کے اطراف میں بولی جاتی تھی جس کو مغربی ہندی کی ایک شاخ سمجھنا چاہیے اور

منزلی ہندی اپنی جگہ پرتو سنی پر اُکرت سے پیدا ہوئی اور مندرجہ ذیل زبانیں اُس کی شاخیں ہیں یعنی بنگارو ہرج بھاشا، تنوچی، اور وہ زبان جو دہلی کے اطراف میں مروج تھی مگر زمانہ حال کی اعلیٰ ہندی اُردو سے پیدا ہوئی اس طرح کہ فارسی الفاظ نکال کر انکی جگہ سنسکرت لفظ رکھ دیے گئے۔ اسی اعلیٰ ہندی میں شکر کی کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں کہ مصنفین نے سنسکرت کے بڑے بڑے الفاظ استعمال کیے ہیں مگر یہ سچ پوچھیے تو اُردو اور ہندی اپنے ماخذ اور نیز اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک ہی زبان ہیں اور ان دونوں میں کچھ فرق نہیں ہے۔ اگر کچھ ہے بھی تو نشوونما اور ترقی کے طریقے میں ہے۔ اُردو چونکہ مسلمانوں کے سایہ عاطفت میں پلّی اس لیے انہیں فارسی الفاظ کی کثرت ہو گئی برخلاف ہندی کے کہ جولینے اصل ماخذ یعنی سنسکرت کی طرف عود کر گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ موجودہ زمانے کی ادبی اُردو اور ادبی ہندی میں زمین آسمان کا فرق ہو گیا یعنی اول الذکر میں فارسی اور عربی الفاظ کی کثرت ہے اور آخر الذکر غیر انوس سنسکرت الفاظ سے بھری ہوئی ہے۔

زبان اور ادب اُردو شروع میں زبان نہایت سادہ اور بے تکلف تھی اور عوام الناس فارسی کا احسان مند ہے | کی معمولی ضروریات کے پورا کرنے کے واسطے بالکل کافی تھی۔

جوں جوں اُس میں ترقی ہوتی گئی اور وہ ایک ادبی زبان بنی گئی اُسی قدر اُس میں فارسی اور عربی اور ترکی الفاظ شامل ہوتے گئے فارسی الفاظ سننے میں بہت بھلے معلوم ہوتے تھے اس وجہ سے مصنفین نے اپنی کتابوں میں جدت کی چاشنی دینے کیلئے ان کو بے تکلف استعمال کرنا شروع کیا اور اس طرح فارسی ترکیبیں جو اصلی زبان سے بالکل اجنبی تھیں اور اُس کے ساتھ میل نہیں کھاتی تھیں زبان میں داخل ہونے لگیں۔ اسی کے ساتھ فارسی رسم الخط بھی کچھ تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ ہندی کی جگہ پر رائج ہو چلا اس وجہ سے کہ فارسی الفاظ فارسی خط میں بہ نسبت ہندی کے زیادہ آسانی سے اور صحت کے ساتھ لکھے جاسکتے تھے اُردو شاعری پر بھی فارسی کا بڑا اثر پڑا اور وہ بھی فارسی شاعری کے قدم بقدم چلنے لگی

فارسی بکریں استعمال ہونے لگیں۔ ان کے علاوہ مضامین، طرز بیان، تخیلیات، تلمیحات خاص خاص محاورے اور مثلیں یہ سب کچھ زبان فارسی سے لیا گیا۔ اُردو کا علم عروض بھی فارسی عروض کے تابع اور زیر اثر ہو گیا۔ نشر کا بھی یہی حال تھا وہی عبارت کی رنگینی، الفاظ کا توازن اور قافیہ بندی جو قدیم فارسی نشر کی جان تھی اُردو میں ان کی پوری نقل کی جاتی تھی۔ الغرض زبان فارسی اُردو پر اس قدر حاوی اور غالب ہو گئی کہ دونوں ایک ہو گئیں، انہما خیالات، مضامین اور طرز ادا میں فارسی اُردو پر اتنی غالب ہو گئی کہ اُردو کی ابتدائی شان اُس سے بالکل غائب ہو گئی یہاں تک کہ اکثر لوگوں نے اُردو کی صرف و نحو کی کتابیں تک فارسی کے طرز پر لکھنا شروع کر دیں۔

اردو میں فارسی الفاظ اور فارسی ترکیبوں کی کثرت کے اسباب

مسلمان بحیثیت فاتح ہندوستان میں آئے اور قدرتا زبان فارسی جو ان کی مادری زبان تھی ہندوستان کی ”شاہی“ زبان بن گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیسی زبان مثل خادمہ کے دب کر اور مغلوب ہو کر اپنی مالکہ زبان فارسی کی خدمت کرنے لگی اور اسی کے طرز ادا اور محاورات وغیرہ کی تتبع اور نقل ہو گئی لوگوں کو نئی زبان سیکھنے کا شوق ہوا کرتا ہے اسی وجہ سے اُس وقت کے لوگ بھی پرانا طرز چھوڑنے اور نئے الفاظ اور جدید محاورات اختیار کرنے لگے۔ دیسی زبان میں جواب شرف اور معزز شہری لوگوں سے چھوٹی جاتی تھی اور اطراف شہر دیہات میں محدود ہوتی جاتی تھی اب لوگوں کو کوئی مزا نہیں آتا تھا لہذا جدت پسند طبیعتوں نے نئی زبان کی طرف رخ کیا اور اُس کو نہایت شوق و ذوق اور انہماک سے سیکھنے لگے۔ اسی وجہ سے قدیم ہندی شعر کی تصانیف میں فارسی الفاظ کی کثرت تعجب خیز معلوم ہوتی ہو مثلاً چند اکوی کی، پرتھوی راج راسو کو دیکھئے جو فارسی الفاظ سے بھری ہوئی ہے دیسی زبان کی تنگی اور کم وسعتی بھی اس کا باعث ہوئی کہ نئے نئے الفاظ اور خیالات کے اظہار کے لیے اس کو اصلی لفظ اور طرز ادا جذب کر لینا پڑا۔ شروع میں دیسی زبان میں ایسے الفاظ بکثرت شامل تھے

جیوا تو سنکرت کے لفظ تھے یا انھیں سے بگڑ کر کسی دوسری صورت میں زبان پر چڑھ گئے تھے جب مسلمان آئے تو زبان میں بھی ایک بڑا انقلاب ہوا۔ مسلمان حملہ آور بادشاہ بن گئے اور دہلی اُن کا پایہ تخت ہو گیا۔ اب وہ یہاں بسے اور آباد ہونے کے لیے آئے نہ کہ جس طرح سابق میں وہ سال بسا لے آتے تھے اور مال غنیمت لے کر واپس چلے جاتے تھے۔

جب دہلی پایہ تخت ہو گیا اور بادشاہ مع لاؤشکر کے وہاں رہنے لگا تو باشندوں اور غیر ملکی سپاہیوں میں میل جول اور ربط و ضبط بڑھنے لگا۔ ایک دوسرے کی زبان اور خیالات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہوا کہ ایک گروہ دوسرے گروہ کے الفاظ سیکھے اور اُن کو اپنے طرز پر استعمال کرے اور ظاہر ہے کہ فاتح کا اثر مفتوح پر زیادہ ہوا کرتا ہے پس مفتوح قوم کی وہی زبان یعنی ہندی پر فارسی کا بہت بڑا اثر پڑنے لگا۔ اسی وجہ سے اردو میں فارسی الفاظ اور ترکیبیں کثرت شامل ہو گئیں مگر ہندی نے اپنا اثر فارسی پر کم ڈالا کیونکہ فارسی کے زبان ان اپنی زبان کو اس قسم کی آمیزش سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ یہ تفسیر گو کہ بہت دیرینہ ہے غیر محسوس طریقے سے شروع ہوا تھا مگر جوں جوں مسلمانوں کی بڑھتی مضبوط ہوتی گئی اور وہ اس ملک میں آباد ہوتے گئے یہ زبانی تغیر برابر ترقی کرتا گیا اور یہ ترقی کی رفتار برابر قائم رہی یہاں تک کہ اکبر کے زمانہ میں ایک ہندو وزیر مال کی تاکید سے ایک حکم جاری کیا گیا کہ ہر سرکاری ملازم کو فارسی سیکھنا ضروری ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زبان کی جس طرح مضبوط ہو گئی اور اس کی عظمت و اہمیت بڑھ گئی۔ لوگ فارسی، عربی، ترکی الفاظ بڑے شوق سے بولنے لگے کیونکہ وہ سننے میں اچھے معلوم ہوتے تھے اور زور دار تھے اور ان کے بولنے والے خواہ مخواہ تعلیم یافتہ سمجھے جاتے تھے، اس کے علاوہ فارسی دانی سے سرکاری ملازمین بھی آسانی سے ملتیں اور تقریب شاہی کا بھی یہ ایک اچھا ذریعہ تھا۔ ایسی حالتوں میں تسلیم ہر زبان کا یہی حال ہوا کرتا ہے جب قدیم اہل انگلستان کو نارمن لوگوں نے فتح کیا تو انگریزوں کی قدیم زبان "انگلو سکسن" کی بھی "نارمن فرینچ" کے ہاتھوں یہی حالت ہوئی تھی جس طرح زبان

انگریزی میں دو طرح کی زبانیں یا بولیاں پائی جاتی ہیں وہی صورت اردو کی بھی سمجھنا چاہئے۔
 اردو میں فارسی الفاظ کی کثرت کے کئی اسباب ہیں۔ مسلمان جب بحیثیت فاتح اس
 ملک میں آئے تو اپنے ساتھ بہت سی نئی چیزوں کے نام لائے جن کے مرادف سنسکرت یا دوسری
 بھاشا میں نہیں مل سکتے تھے، چونکہ ایسے نام کسی شرح یا گھوم پھیر سے بتائے نہیں جاسکتے
 تھے اس لیے مجباً وہی فارسی الفاظ جن سے وہ چیز ظاہر ہوتی تھی زبان میں داخل کرنا پڑے
 مثلاً ایسے نام جو لباس طعام مذہب اور بعض اسی قسم کی دوسری چیزوں سے تعلق رکھتے
 ہیں پھر چونکہ فارسی فاتح قوم کی زبان تھی اور ایک ایسی زبان تھی جو رزم بزم حسن و عشق کے
 افسانوں کے لیے نہایت موزوں تھی اس لیے لوگ ایسے موقعوں پر فارسی الفاظ ہی بولنا
 پسند کرتے تھے اسوجہ سے کہ وہ نہایت شیریں اور شاندار معلوم ہوتے تھے، ایسے پر زور
 لفظوں کے سامنے پرانے دیسی الفاظ اور محاورے اور نگو خواہ محواہ پیچھے ہٹنا پڑا اس لیے کہ زمانہ
 آنکوپ نہ ہی نہیں کرتا تھا زبان انگریزی کی بھی یہی داستان ہے جب یونانی اور لاطینی علوم
 کا احیا اور دوبارہ ترقی ہوئی تو اُس زمانہ میں بھی موٹے موٹے عالمانہ لفظ بولنے کا فیشن
 ہو گیا تھا بہر حال جب فاتح اور مفتوح دونوں قوموں کا میل جول بڑھا تو ایک ایسی مخلوط
 زبان یا بولی کی سخت ضرورت محسوس ہوئی کہ جو دونوں قوموں کے اچھی طرح سمجھ میں آ سکے اور
 چونکہ مفتوح اپنے مالکوں کو زیادہ خوش رکھنا چاہتے تھے لہذا انھوں نے اُن کو خوش کرنے کے لیے
 انکی زبان سے زیادہ اخذ کیا بہ نسبت اسکے کہ ان کے مالکوں نے انکی زبان سے فائدہ اٹھایا۔
 اظہار قابلیت کے لیے بھی عربی فارسی الفاظ کثرت سے بولے جانے لگے۔ اردو ادب کی
 ابتدا شاعری سے ہوئی اور شاعری فارسی داں لوگوں کے ہاتھ میں گویا ایک کھلونا تھی جس
 کو وہ فارسی الفاظ و محاورات ہی کے لباس میں آراستہ کرنا چاہتے تھے۔ یہ لوگ
 زبان ہندی بہت کم جانتے تھے اور سنسکرت سے بالکل ناواقف تھے۔ اسی وجہ سے یہ
 ہونہار بچے اپنے حقیقی والدین سے جدا ہو کر اپنے مصنوعی والدین کی آغوشِ محبت میں تربیت پاتا رہا

جنہوں نے بلاشبک اُس کے ساتھ بہت کچھ کیا، انکی آغوش تربیت میں رہ کر اُردو کا نشوونما بالکل فارسی کی روش پر ہوتا رہا۔ نہ صرف فارسی الفاظ کا ایک کافی ذخیرہ زبان میں جمع ہو گیا بلکہ فارسی ترکیبیں بھی کثرت سے شامل ہونے لگیں مثلاً جار مجرور، صفت موصوف کی ترتیب بدل گئی ایسے سیکڑوں فقرے جو حرف ربط "یہ" سے معمولاً شروع ہوتے ہیں اُردو میں بے تکلف استعمال ہونے لگے جو دیسی مروجہ قواعد صرف و نحو سے بالکل خلاف تھا آج بھی ہماری ادبی دیسی زبان میں اسی قسم کی فارسی ترکیبیں کثرت سے موجود ہیں یہ ضرور ہو کہ فارسی کے اثر سے اُردو ایک مستقل زبان کی شکل میں آج ہمارے سامنے موجود ہے لیکن اس کا افسوس بھی ہوتا ہے کہ اصل زبان کی خوبیاں جن سے اُردو کی ابتدا ہوئی تھی بہت کچھ فنا ہو گئیں۔

یورپ کی زبانوں کا اُردو پر اثر | فارسی زبان اور فارسی ادب کا تو اُردو پر بہت گہرا اثر پڑا ہی تھا لیکن پرتگالی اور انگریزی کا بھی کچھ کم اثر نہیں پڑا البتہ زبانِ ڈچ اور فرینچ کے جہاں سے ہوئے نقوش یا تو مٹ گئے یا ہیں بھی تو اس قدر دھندلے کہ معلوم نہیں ہوتے پرتگالی اور انگریزی دونوں نے اُردو لغات میں متدبیرہ اضافہ کیا۔ شاہجہانؒ میں ہندوستان کے مشہور بندہ گاہوں پر اہل پرتگال قابض تھے اور ممالکِ مشرق میں گویا تجارت انھیں کے ہاتھ میں تھی۔ اُن کی آبادیاں ہندوستان کے سوا اہل پر اور اندرون ملک میں بھی تھیں، اُن کا تعلق ہندوستان سے عارضی نہ تھا بلکہ وہ ہمیشہ تاجروں و حاکم اور مبلغ کے یہاں رہتے تھے، انھوں نے بہت ترقی کی تھی اور سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں انکی زبان ہندوستان کے ایک بڑے حصے کی زبان عام ہو گئی تھی جو محض ہندوستانیوں اور اہل یورپ کے درمیان تبادلہ خیالات کا ذریعہ ہی نہ تھی بلکہ خود یورپ کے یہ سوداگر بھی آپس میں اسی زبان میں گفتگو کرتے تھے۔ ہمیں عیسائی پادری اپنے مذہب کی اشاعت اور تبلیغ کرتے تھے چنانچہ اسی وجہ سے اُسکو بہت ایسے موقع ملے کہ وہ اپنا اثر یہاں کی دیسی زبانوں پر ڈال سکی سب سے زیادہ اثر

بھلے زبان پر پڑا۔ اسی طرح دروازے کی زبانیں مثلاً مرہٹی، اسمی، اور اڑیا بھی اس سے بہت کچھ متاثر ہوئیں۔ اُردو بھی اُس کے لغات سے بہت متمتع ہوئی۔ یہ اثر اتفاق سے شمالی ہندوستان میں اُس وقت پڑ رہا تھا جب دکنی زبان جو پرتگالی کے اثر سے بسبب قربت کے بہت کچھ متاثر ہو چکی تھی اور نیز اسی طرح کی دوسری زبانیں اُردو پر اپنا اثر اچھی طرح ڈال رہی تھیں پرتگالی الفاظ دیسی زبانوں میں اصلی حالت پر باقی نہیں رہے بلکہ جس بگڑی ہوئی شکل میں وہ ہندوستان میں بولے جاتے تھے اور ہندوستانی زبانیں اُنکو قبول کر سکتی تھیں اُسی سبب سے پروہ اب بھی بکثرت موجود ہیں۔ اہل پرتگال نے محض اپنی زبان کے الفاظ ہندوستانی زبانوں میں داخل نہیں کئے بلکہ بہت سے عربی، فارسی، اور ہندی الفاظ بھی اکثر یورپی زبانوں میں پہنچا دیے۔ اس کے علاوہ اکثر عربی اور فارسی لفظ پرتگالی سے نسخ ہو کر داخل ہوئے مثلاً وہ الفاظ جو عربوں کے فتح اندلس کے زمانے میں اُن ممالک میں رائج ہو گئے تھے، پرتگالی الفاظ ہماری زبان میں بکثرت بولے جاتے ہیں مثلاً از قسم میوہ جات و اشیائے طعام، اچار، انناس، افس (قسم انبہ)، بسکٹ، کاجو، پیفرے، (قسم پھلی) پیٹیا، تباکو، ترنج، چار، ساگو، گو بھی وغیرہ۔ از قسم سامان آرائش و آلات و اسلحہ۔ البین، الماری، ارغنون، بکرا، بالٹی، بوتل، پیما، پستول، پرگ، چامی، صابون، کوچ، کپتان، کاربن، کارتوس، میسنر، تولیہ، گارڈ وغیرہ۔

مذہبی الفاظ۔ پادری، گرجا، کراس وغیرہ۔

لباس میں۔ سایہ، قمیض، کاج، اسپیٹ وغیرہ۔

مسترق الفاظ۔ مثلاً انگریز، آیا، بابا، پاگر (متخواہ) پاؤروٹی، پھاپنیلیم، مستری، کمرہ،

روپیہ وغیرہ

اہل پرتگال ہی نے سب سے پہلے یورپ کی اکثر چیزوں کی اشاعت ہندوستان

میں کی لہذا ان کے نام بھی اسی طرح رائج ہو گئے جس طرح کہ وہ لوگ اپنی زبان میں بولتے تھے مرزا غالب "شراب پرتنگالی" کا اکثر ذکر کرتے ہیں۔ زبان انگریزی ایک زندہ اور حاکموں کی زبان ہے اس نے اپنا اثر بہت کچھ ڈالا ہے اور ڈالتی رہے گی انگریزی علم ادب نے اردو نظم و شعر کو بہت کچھ فائدہ پہنچایا جس کا ذکر مفصل طور پر آئندہ کسی باب میں کیا جائے گا۔ لیکن اتنا اس موقع پر ضرورتاً دینا چاہیے کہ زبان انگریزی نے وہ الفاظ اردو میں داخل کئے جن کی جگہ پر کوئی دوسرا لفظ موجود نہ تھا اور وہ الفاظ اب زبان زد ہو گئے۔ ترجمہ کا بھی یہ نتیجہ ہوا کہ اکثر انگریزی الفاظ اسکی بدولت اردو میں شامل ہو گئے۔ اردو میں انگریزی الفاظ بکثرت داخل کرنے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے اسی طرح وہ انگریزی الفاظ جو بضرورت اردو میں داخل اور مستحکم ہو گئے ہیں خارج کرنا بھی اندیشہ سے خالی نہیں ہے۔ اردو کو مالدار ہونا چاہیے اور ہر طرح کے الفاظ جو اس کی اصل سے میل کھاتے ہوں اس میں ضرور داخل ہونے چاہئیں خواہ وہ انگریزی ہوں یا فارسی ہوں یا سنسکرت صرف یہی ایک طریقہ زبان اردو کی تکمیل اور اس کی ترقی کا ہے اور اسی طرح وہ ایک اعلیٰ درجہ کی زبان اور ہندستان کی عام زبان بن سکے گی۔

نثر اور نظم کی زبان | ہر زبان میں نظم و نثر کی عبارت میں فرق ہوتا ہے۔ عبارت میں متانت اور سنجیدگی پیدا کرنے کے لیے اور نثر اس خیال سے کہ نثر اور نظم میں فرق معلوم ہو نظم کی عبارت نسبت نثر کے زیادہ شاندار ہوتی ہے اسی وجہ سے وہ معمولی اور سادہ الفاظ اور معمولی بول چال کی ترکیبیں جو نثر میں عام طور پر پائی جاتی ہیں نظم میں لچاؤ سمجھی جاتی ہیں وجہ اسی تھی کہ فارسی محاورات اردو نظم میں بکثرت شامل کر دیے گئے۔ اگر اردو نثر کی ابتدائی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ شروع میں مقفے عبارت بہت پسند کی جاتی تھی جس میں سید کلف اور تصنع ہوتا تھا۔ بہترین طرز وہ تھا جس میں ظہوری اور بیدل کی عرض نگاری کی تقلید کی جاتی تھی۔ ہماری پرانی نثر نگاری کی مثال باعتبار عبارت کی رنگینی اور قافیہ بندی

کے بعینہ وہی ہے جو انگلستان میں ملکہ الزبتھ کے زمانہ میں انگریزی نشر کی تھی۔

مرزا غالب بلکہ سر سید احمد خاں کے زمانے سے ایک نیا دور شروع ہوا جبکہ مغربی تعلیم کے اثر سے وہ پرانا رنگ بدل گیا اور محققانہ عبارت اور فارسی کی رنگینیت کی جگہ اب تکلف اور سادہ عبارت پسند کی جانے لگی۔ دور جدید میں نشر نگاری کی وہ شان باقی بھی نہیں رہ سکتی تھی کیونکہ علمی دنیا میں سیدھے سادے صاف اور زوردار الفاظ کی ضرورت ہے اب بھی فارسی الفاظ کی کثرت ضرور ہے لیکن اس سے عبارت کی خرابی پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور نہ کسی قسم کا نقص پیدا ہوتا ہے۔ ہندی محاورات خوبصورتی کے ساتھ استعمال کئے جاتے ہیں اور پیچیدہ بندشوں سے گریز کیا جاتا ہے لیکن گلستانِ نظم کی آپاشی اب بھی چشمہٴ فارسی ہی سے ہوتی ہے اور اس کا چمن اب بھی انھیں صنعتوں سے آراستہ کیا جاتا ہے۔ ہندی الفاظ و محاورات استعمال ہوتے ہیں مگر کمی کے ساتھ اور صرف اسی وقت جب وہ فارسی الفاظ کے ساتھ میل کھاتے ہیں۔

نثر کی طرح نظم میں بھی کچھ تغیر ہو چلا ہے اور موجودہ رنگ میں بجائے پرانی لفظی اور تصنع کے سادگی اور بے تکلفی بہت پسند کی جاتی ہے لیکن باوجود اس کے اکثر اہل ادب اب بھی فارسی الفاظ اور ترکیبوں کے دلدادہ ہیں مگر ان کی کثرت اور جاوید استعمال کو جہاں تک ممکن ہو کم کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ ہماری رائے میں نظم اور نثر کی عبارت اور انشا پردازی میں کوئی اصولی اور اہم اختلاف نہیں ہے۔

ادبی اردو | تقریری زبان تحریری زبان سے بالکل علیحدہ ہے۔ سادہ اور روزمرہ کے جملے جو ہر وقت زبان پر چڑھتے ہوتے ہیں تحریر میں آتے وقت فارسی الفاظ سے بدل جاتے ہیں جس کی وجہ ان کی جدت و عظمت اور شاندار سی ہے۔ ابتدا میں بیشک زبان کا دائرہ بہت تنگ اور الفاظ کا ذخیرہ کم تھا اور وہ ایک مستقل زبان کہلانے کی مستحق نہ تھی کیونکہ اُس وقت تک اس میں بھونڈا پن تھا نہ اُس پر جلا ہوئی تھی اور نہ اتنی صلاحیت اس میں تھی کہ

اس کے ذریعہ سے باریک اور نازک خیالات ادا ہو سکیں یا مختلف خیالات کا اظہار اچھی طرح کیا جاسکے۔ اُس میں ایک قسم کا لوچ اور الفاظ اور بندشوں کے جذب کرنے کا مادہ ضرور تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو الفاظ اور بندشیں اسکو ملتی گئیں وہ سب اس میں شامل ہوتی رہیں۔ رفتہ رفتہ زبان میں تختگی اور صفائی آتی گئی۔ دورِ اوّل کے شاعر ایسی زبان میں لکھتے تھے جس میں آدھی اُردو اور آدھی فارسی ہوتی تھی رفتہ رفتہ اُردو کا عنصر غالب ہو گیا اور غالب نے مخلوب کو جذب کر لیا فارسی الفاظ اور غیر مانوس فارسی ترکیبیں اس طرح اُردو میں مل گئیں کہ اب وہ ہماری زبان کا جزو بن گئیں جن کو اب ہم نکال نہیں سکتے۔ بعض حضرات جو اس زمانہ میں سنسکرت الفاظ کے دلدادہ ہیں وہ فارسی الفاظ اور ترکیبوں کو زبان سے نکالنے کی کوشش میں ہیں۔ ہماری رائے میں یہ ایک فضول اور عبث کوشش ہے کیونکہ یہی کثرت الفاظ جو اُردو کا مایہ ناز ہیں اس کو اتنا لوچ دار اور مضبوط بنائے ہوئے ہیں کہ ہر ادبی کام اس کے ذریعہ سے نکل سکتا ہے۔

زبان اُردو کے قدیم نام | قدیم انگریز مورخ جنھوں نے ہندوستان کے حالات لکھے ہیں اُردو کو لفظ "اندوستان" سے تعبیر کرتے تھے۔ شروع اٹھارھویں صدی کے مصنفوں نے زبانِ لاطینی میں اُسکو "لنگوا اندوستانی" کا لکھا ہے۔ اس سے بھی پہلے کے انگریزوں میں اُس کو "مورز" کہتے تھے۔ جان گلکرسٹ نے ۱۷۷۸ء میں سب سے پہلے لفظ "ہندوستانی" زبان اُردو کے واسطے استعمال کیا اور چھٹی سے یہ لفظ مروج ہو گیا۔ گو کہ اس کا پتہ بعض قدیم کتابوں میں ۱۶۱۶ء تک ملتا ہے جبکہ مٹر پول نے سب سے پہلے اس کو استعمال کیا تھا۔ اُردو کے معنی کا معزز خطاب شاہجہاں نے اس کو دیا جب کہ زبان ادبی خدمات انجام دینے کے قابل اچھی طرح ہو گئی تھی۔

لفظ "ریختہ" (یعنی وہ زبان جس میں دیسی الفاظ کے ساتھ فارسی الفاظ بھی بکثرت استعمال ہوں) بعد کے مصنفین نے اس غرض سے استعمال کیا کہ ادبی زبان درختہ

اور بول چال کی زبان (اُردو) میں جو باز اردو اور بجاہل فوجی سپاہیوں میں مروج تھی، فرق ہو جائے۔ لفظ ریختہ زبان کے متعلق اب بہت کم استعمال ہوتا ہے۔ ابتدا میں نظم کے واسطے ہی لفظ استعمال کیا جاتا تھا اس وجہ سے کہ نثر کا رواج اُس زمانے میں بہت کم تھا میرا در مصحفی تک کے زمانے میں اُردو کو بمقابلہ فارسی کے "ہندی" کہتے تھے جس سے ملک کی دیسی زبان مراد تھی۔

اُردو کا رسم الخط | اُردو کے حروف تہجی بالکل وہی ہیں جو فارسی اور عربی کے ہیں البتہ بعض مخصوص حروف جن سے ہندوستانی زبان کی خاص خاصاوازیں ظاہر ہوتی ہیں جو فارسی اور عربی میں نہیں پائی جاتیں اضافہ کر دیے گئے ہیں مثلاً ط۔ ٹھ۔ ڈ۔ ڈھ۔ ژ۔ رھ۔ ان حروف کے لکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ ت۔ و۔ ر۔ پر یا تو چھوٹی سی (ط) بنا دیتے ہیں یا چار نقطے دیدیتے ہیں۔

نظم اُردو | نظم اُردو کا عروض فارسی اور عربی کے عروض کا تابع ہے لفظ کے کسی جز پر زور دے کے بڑھنا جس کو انگریزی میں "ایکسٹ" کہتے ہیں اردو میں نہیں ہے البتہ قدیم یونانی اور رومی شاعری کی طرح اُردو میں بھی حروفِ عدلت کی آوازیں کھینچ کر پڑھی جاتی ہیں اور اُس کو اشباع کہتے ہیں۔ نظم اُردو میں ردیف اور قافیہ بہت ضروری چیز ہے مروجہ بحر میں آئینہ ہیں جن میں سے بعض عربی کے لیے مخصوص ہیں اور بعض میں اتنی ترسیم ہو گئی ہے اور اُن کی صورت ایسی بدل گئی ہے کہ وہ بالکل نئی معلوم ہوتی ہیں۔ وزن شعر کے لیے خاص ارکان جو قدامت مقرر کر دیے تھے اُن کی تکرار یا تغیر و تبدل سے مختلف بحرین قائم ہو گئی ہیں۔ یہ الفاظ عموماً عربی افعال کے مادے ہوتے ہیں اور انھیں سے اشعار کی تقطیع کی جاتی ہے اور بڑی یا چھوٹی بحر میں انھیں سے قائم ہیں تقطیع کا طریقہ یہ ہے کہ یا تو وہی رکن بار بار دہرایا جاتا ہے مثلاً فعولن فعولن فعولن فعولن ہم بار بار کنول میں رد و بدل ہوتا ہے جیسے مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن۔ تقطیع کے خاص قواعد مقرر

ہیں تحریر شدہ حروف کے ساتھ اُن حروف کا بھی شمار ہوتا ہے جو پڑھے جاتے ہیں گو تحریر میں نہیں آتے۔ وہ حروف جو پڑھے نہیں جاتے بلکہ محض تحریر میں آتے ہیں تقطیع میں شمار نہیں کیے جاتے۔ الف حمد وہ شعر لفظ میں جب آتا ہے دو حرف کے برابر اور اضافت جو کھینچ کے پڑھی جائے ایک حرف کے برابر سمجھی جاتی ہے۔ اُن الفاظ کو جن سے تقطیع کی جاتی ہے "رکن" کہتے ہیں جس کے معنی ستون کے ہیں جس پر عمارت یا خیمہ قائم ہوتا ہے۔ پورے شعر کو "بیت" اور نصف شعر کو "مصرع" کہتے ہیں۔ مصرع کے لغوی معنی "دروازے کا ایک پٹ" ہیں۔ نظم کی مختلف قسمیں جو فارسی میں متداول ہیں اور جو اردو میں اختیار کی گئی ہیں حسب ذیل ہیں۔

غزل اور قصیدہ ایہ سب سے زیادہ مشہور اصناف نظم ہیں۔ ان دونوں میں فرق مضمون اور طول کا ہوتا ہے مگر مجرور اور ردیف و قافیہ کی پابندی دونوں میں یکساں طور پر ہوتی ہے۔ غزل کا رنگ عموماً عاشقانہ یا صوفیانہ ہوتا ہے اور تعداد اشعار عموماً ۱۰ سے ۱۲ تک گو کہ اس کی پابندی بہت کم کی جاتی ہے۔ قصیدہ میں عموماً کسی کی مدح یا بھجو ہوتی ہے اور نصیحت آمیز فلسفیانہ رنگ کا بھی ہو سکتا ہے۔ تعداد اشعار عموماً کم از کم ۲۵ اور زیادہ سے زیادہ ۷۰ تک مگر اس کی بھی پابندی کون کر سکتا ہے۔

قطع جس کے لغوی معنی ٹکڑے کے ہیں اور اُس کو قصیدے یا غزل کا ایک حصہ سمجھنا چاہیے۔ تعداد اشعار کم سے کم دو اور زیادہ کی کوئی حد مقرر نہیں پہلے دو مصرعوں کے لیے ہم قافیہ ہونا ضروری نہیں لیکن اشعار میں قافیہ کی پابندی لازمی ہے۔ قطعات میں اکثر پند و نصائح کے اکثر مضمون بیان کئے جاتے ہیں اور مطلب پورا ہو جاتا ہے۔

رباعی اس میں دو شعر یا بیت ہوتے ہیں اسی وجہ سے اس کو دو بیت بھی کہتے ہیں پہلا "دوسرا" اور چوتھا مصرع ہم قافیہ ہوتے ہیں اور زیادہ تر ایک ہی سی بحر و دل میں کہی جاتی ہے۔ رباعی کے لیے خاص کسی مضمون کی تخصیص نہیں لیکن چوتھے مصرعہ کو

عموماً مؤخرہ معنی خیر اور زور دار ہونا چاہیئے۔

مثنوی | یہ صنف رزم و بزم حسن و عشق، قصے اور افسانہ نگاری کے لیے مخصوص ہے اس میں ہر شعر کے دونوں مصرعوں کو ہم قافیہ ہونا چاہیئے۔ ردیف ہو یا نہ ہو تعداد محدود نہیں ہے۔ مثنوی کے لیے عموماً پانچ بحر میں مروج ہیں مگر بعض کے نزدیک ساٹھ ہیں۔ مستزاد انکو کہتے ہیں کہ جب ہر مصرع کے آخر میں کچھ زائد لفظ بڑھائے جائیں یہ زائد لفظ اُسی بحر میں پڑے ہیں جو اصلی مصرع کے دو آخری رکعوں کی ہوتی ہے۔ مگر ان کا قافیہ کہیں علیحدہ بھی ہوتا ہے۔ ترجیع بند اور ترکیب بند یہ بھی نظم کی قسمیں ہیں ان میں بہت سے بند ہوتے ہیں اور ہر بند میں برابر یا بعض وقت مختلف تعداد ابیات کی ہوتی ہے جو ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ ہر بند کے آخر میں ایک بیت ہوتا ہے جو اوپر کے بند کو نیچے کے بند سے جدا کرتا ہے اور قافیہ میں بھی اُن سے علیحدہ ہوتا ہے اگر ہر بند کے بعد ایک ہی بیت بار بار آئے تو ایسی نظم کو ترجیع بند کہتے ہیں، ورنہ اگر بیت بدلنا جائے تو ترکیب بند کہلاتی ہے۔ ترجیع بند یا ترکیب بند میں تمام اشعار ایک ہی بحر میں ہوتے ہیں۔ مربع جو مصرعی نظم کو کہتے ہیں۔ جس میں سب مصرع ہم قافیہ ہوں محش میں سبجائے چار کے پانچ مصرع ہوتے ہیں پانچویں مصرع کا قافیہ بدلا ہوتا ہے اور باقی صورت مربع کی مسمیٰ ہے مستزاد کی شکل بھی قریب قریب ایسی ہی ہے فرق اتنا ہے کہ پہلے چار مصرع یا دو بیت ہم قافیہ اور باقی دو مصرع علیحدہ ہوتے ہیں ان کے علاوہ دیگر اصناف سخن مستع و غیرہ بھی اسی طرز کے ہیں۔

واسوخت | نظم کی وہ قسم ہے جس میں عاشق اپنے معشوق کی بے وفائی، ظلم و ستم و رقیب کے ساتھ بجا محبت اور جدائی کی مصیبت و تکلیف کی شکایتیں کرتا ہے۔ گویا معشوق کو دھمکاتا ہے کہ اگر اُس کا طرز تغافل اور ستم شکاریاں اسی طرح باقی رہیں تو پھر اُس کے ہاتھ سے عنان صبر چھوٹ جائے گی اور وہ معشوق سے علیحدگی اختیار کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔

تایخ | نظم کی وہ قسم ہے جس میں کسی واقعہ کے اعداد و سنہ حروف ابجد کے حساب سے

نکالے جاتے ہیں۔

فردا کسی تمام یا نام تمام غزل کے کسی ایک شعر کو کہہ سکتے ہیں جو کبھی مثلاً پیش کیا جاتا ہے قصیدہ اور غزل کا پہلا شعر مطلع اور آخری شعر مقطع کہلاتا ہے جس میں شاعر اپنا تخلص نظم کرتا ہے۔ نظم کی کتابوں میں اکثر پہلے حمد و نعت پھر بادشاہ یا ممدوح کی تعریف اس کے بعد سبب تالیف اور کچھ فخریہ اشعار آخر میں مناجات و خاتمہ ہوتا ہے مجموعہ نظم کو کلیات کہتے ہیں جس کی ترتیب عموماً اس طور پر ہوتی ہے۔ قصائد۔ غزلیات قطعات۔ رباعیات۔ مثنویات وغیرہ۔

نثر کی تین قسمیں ہیں (۱) عاری جو بالکل سادہ اور بے کلف ہوتی ہے (۲) بحر جس میں بحر ہوتی ہے مگر قافیہ نہیں ہوتا۔ (۳) مسجع جس میں بحر نہیں ہوتی مگر قافیہ کی پابندی ہوتی ہے نثر مسجع کی بھی تین قسمیں ہیں (۱) متوازی (۲) مطوف (۳) متوازن نثر متوازی میں دو فقروں کے آخری الفاظ ہوزن اور ہم قافیہ ہونے چاہئیں مطوف میں آخری الفاظ کے ہوزن اور ہم قافیہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ متوازن میں ہوزن ہوتے ہیں مگر ہم قافیہ نہیں ہوتے۔ یہ تمام قسمیں اب متروک ہیں کیونکہ انیسویں صدی کے آخر میں اس قسم کی مصنوعی عبارت اور قافیہ پیائی کا بالکل خاتمہ ہو گیا "تذکرہ" میں شعراء کے سوانح و حالات مختصر بیان کیے جاتے ہیں اور "گلدستہ" مجموعہ نظم کا نام ہے۔

باب ۲

ادب اردو کی ترقی کے ابتدائی دور

نظم کا تقدم نثر پر۔ اس کے وجہ اور دنیا کے تمام ادبوں کی ابتدا اشاعری سے ہوئی نثر اس کا تعلق خاص ادب اردو کے ساتھ ایک زندہ قوت ہے جس کا وجود نثر سے بہت پیشتر

معلوم ہوتا ہے۔ تافیر بیانی اور تک بندی انسان میں ایک فطری چیز ہے۔ انسان کو پہلے جذبات کا جس ہوتا ہے پھر وہ دماغ کو کام میں لاتا ہے اور سوچتا ہے اسی وجہ سے ارتقائے تہذیب انسانی میں جو مظهر جذبات ہے نثر پر مقدم ہے جو فکر دماغی کا نتیجہ ہے سب سے پہلے جب کہ فن تحریر کی ایجاد نہیں ہوئی تھی شعری اپنے زبردست اثر سے دماغ میں محفوظ رہ سکتے تھے اور قوت حافظہ کی مدد سے مجمع میں سنانے (انشاد) کے قابل بھی شعری ہو سکتے تھے گو کہ ظاہر اثر ہمارے اظہار خیالات اور گفتگو کا آسان ترین اور فطری ذریعہ معلوم ہوتی ہے مگر غور کرنے کے بعد اور تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف ضبط خیالات اور رسمی تحریروں کے واسطے موزوں ہے۔

زبان اردو کی دیوی اپنے ساز و طرب سے آراستہ و پیراستہ اس طرح نمودار ہوئی کہ ادب اردو جو دراصل فارسی کا متبع اور ناقل ہے اُس کو اپنے پیشرو کی تقلید بہ نسبت نثر کے نظم میں زیادہ آسان اور دلچسپ معلوم ہوئی کیونکہ نقل و ترجمہ ایک زبان سے دوسری زبان میں نثر میں اتنا آسان نہیں ہوتا جتنا کہ فی الحقیقت نظم میں ہوتا ہے، اور چونکہ اردو اپنی ارتقائی منزلوں میں جبکہ اُس کا ادب ہنوز عالم طفلی میں تھا قوت تخیل اور اظہار جذبات کے واسطے ایک زبردست سرمایہ الفاظ کا اپنے پاس محفوظ رکھتی تھی لہذا جب اُس کی پالیسٹک کا دقت آیا تو وہ اپنے استادوں کے دماغوں سے منروا کی طرح دفعہ نکل آئی اور اظہار خیالات جذبات کے لیے چونکہ نثر عام طور پر نہیں پسند کی جاتی ہے۔ لہذا مستقیدین اردو نگار بھی اس صنف کے استعمال سے شروع میں پرہیز کرتے رہے۔

سب سے پہلا اردو شاعر زبان اردو کی ترقی کا ابتدائی زمانہ اتنا دھندلا نظر آتا ہے کہ
ایمر خسرو دہلوی اُس کے خط و خال صاف طور پر نمایاں نہیں مگر اس میں کوئی

یونانی دیو بانی کی طرف اشارہ ہے جس میں روم ہے کہ سروراجیو بنانیوں میں عقل و علم اور جنگ کی دیوی مانی جاتی تھی حیو پٹر کے سر سے نہایت مکمل اور آراستہ دفعہ پیدا ہوئی تھی۔

شک نہیں کہ سب سے پہلا شاعر زبان اردو کا اس دھندلے میں جو صاف طور پر نمایاں
نظر آتا ہے وہ حضرت امیر خسرو دہلوی ہیں جن کی شہرت بحیثیت ایک فارسی شاعر کے
کسی تعریف و توصیف کی محتاج نہیں۔ ان کا لقب اسی شاعری کی مناسبت سے "طوطی ہند"
ہے انھوں نے سب سے پہلے اردو الفاظ ادبی اغراض سے استعمال کیے اور سب سے پہلے
اردو میں شعر کہا سب سے پہلی غزل اردو بھی امیر خسرو ہی کی طرف منسوب ہے مگر اس کی
ترکیب اس طرح ہے کہ اس کا ایک مصرع فارسی اور ایک اردو ہے اور پھر فارسی ہے اسکے
علاوہ اکثر پہیلیاں، مکریاں، انلیاں۔ دو سٹخنے دوہرے وغیرہ جو آج تک مشہور ہیں
ان کی طرف منسوب ہیں۔ بعض شعر ایسے بھی ہیں جس میں ٹھیکہ ہندی الفاظ جو مشکل اردو
کہے جاسکتے ہیں سنسکرت بحروں میں بندھے ہیں گو فارسی الفاظ بھی کہیں کہیں استعمال
ہوئے ہیں۔ حضرت امیر خسرو تیسرے صدی عیسوی میں ضلع ایڑ (مالک متحدہ آگرہ
دادھ) میں پیدا ہوئے اور متعدد مشابان دہلی مثلاً غیاث الدین بلبن و معز الدین کیعباد
وغیرہ کے درباروں میں مختلف عہدوں پر مناز رہے۔ وہ مشہور صوفی و مرشد حضرت
نظام الدین اولیاء کے مرید و محبوب خاص تھے جن سے ان کو اتنی محبت و عقیدت
تھی کہ جب پیر کے انتقال کا حال سنا تو اسی غم میں چند روز کے بعد ۷۲۵ھ
میں سفر آخرت اختیار کیا۔ بلبن ان کی بڑی قدر کرتا تھا اور ان کے کلام کا دلدادہ
تھا۔ امیر خسرو فن موسیقی میں بھی کمال رکھتے تھے۔ انھوں نے سب سے پہلے
فارسی بحور اردو میں استعمال کیں اور ان کی کتاب "خائق باری" جس کے مطلع کے
ابتدائی الفاظ یہی دو لفظ "خائق" اور "باری" ہیں اب تک ہمارے یہاں ایک مشہور
اس فارسی میں ایک نہی صنعت ایجاد کی ہے جس کا نام ترجمۃ اللفظ رکھا ہے یعنی فارسی لفظ کا ترجمہ
اردو میں کر دیا ہے مثلاً "مموداے رخ تو گشت مارا۔ کت کے معنی اردو میں مارا کے ہیں
اس مقام ولادت بٹیالی ضلع ایڑ ہے اور سنہ ولادت ۷۲۵ھ ہے۔

درسی کتاب سمجھی جاتی ہے جس کو بچے بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ امیر خسرو کی شہرت زبان اردو کے شاعر یا ادیب ہی کی حیثیت سے نہیں ہے بلکہ وہ اُس کے موجد و مخترع کے جاسکتے ہیں۔ اُن کے زمانے میں زبان میں روانی پیدا ہو چلی تھی مگر سختگی ہنوز نہیں آئی تھی اور متانت الفاظ بھی بہت محدود تھی۔ مختصر یہ کہ اُن کا دور ابتدائی دور ہے اور گو اُس وقت تک زبان میں کوئی ترقی نہیں ہوئی مگر آئندہ ترقیوں کی داغ بیل اسی زمانہ میں پڑ گئی تھی۔ اردو کی سختگی کا زمانہ ^{۱۵۱۵} امیر خسرو کے زمانہ سے لے کر دکن کے شعراء اردو کے عہد تک بڑا فصل ہے مگر زبان نے گو اس طویل عرصہ میں چوتین صدیوں سے کم نہ تھا کوئی نمایاں ترقی نہیں کی پھر بھی یہی مدت اُس کے حقیقی نشو و نما اور مضبوطی کی کہی جاسکتی ہے۔ زبان اب تک غیر منظم حالت میں تھی اور قوت، لوح، اور وسعت کی اس کو سخت ضرورت تھی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ بلند انشا پردازی کی اغراض کے لئے اُس کے لغات میں مستحبہ اضافہ ہونا چاہیے تھا اسی وجہ سے مناسب فارسی الفاظ کو اس نے اپنے آغوش محبت میں بے تکلف اور بڑے شوق سے جگہ دی۔ چنانچہ ملک محمد جالسی (سنہ ۸۵۲ھ) کی پیدمات جو فارسی حروف میں تحریر ہوئی تھی کبیر ^{۱۵۱۲} لغات ^{۱۵۱۸} کے بھین اور بابا سی ^{۱۵۵۵} لغات ^{۱۶۲۳} کی تصانیف میں ایسے الفاظ کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔

زیریں عہد اکبری زبان اردو کی توسیع کے جو لوگ شائق تھے انھیں اس زبان کو مختلف طبقوں کے لوگوں تک پہنچانے اور اُس کو پھیلانے کے لیے دونوں قسموں کے الفاظ یعنی ملکی اور غیر ملکی دونوں کے استعمال کرنے کی ضرورت تھی۔ اس کوشش کی رفتار عہد اکبری میں بہت تیز تھی۔ شہنشاہ اکبر کا دل چاہتا تھا کہ ملک کی مفتوح رعایا اور بیاہر کے فارغ زبان کے ذریعہ سے شہر و شکر ہو جائیں۔ چنانچہ وہ خود بھی کبھی کبھی دیسی زبان یعنی ہندی میں شعر کہتا تھا اور اُس کے اہل دربار بھی اُس کی تتبع میں ہندی میں کہتے تھے اور ہندی شاعروں کی بڑی قدر کرتے تھے۔ اُس کے درباری شاعر سنسکرت

سے فارسی میں ترجمہ کرتے تھے فیضی نے اکثر ہندی دواہرے کہے اور عبدالرحیم خاں
 خانخاناں دربار اکبری کا رکن اعظم اور فارسی کا مشہور شاعر ہندی کا بھی اچھا خاصہ
 شاعر تھا۔ چونکہ فاتح اور مفتوح دونوں قوموں میں دلی سمجھتی اور اتحاد تھا اس وجہ سے
 زبانوں میں بھی اتحاد پیدا ہوا اور کئی زبانوں سے مل کر ایک نئی زبان پیدا ہو گئی۔ اسی زمانہ میں
 راجہ ٹوڈرمل نے ایک بڑا کام کیا جو اردو کی اشاعت کے لیے بہت مفید ثابت ہوا۔
 ملک کے مالی حسابات پہلے دیسی زبان میں لکھے جاتے تھے جن کو مسلمان افسران صغیر
 مال اچھی طرح نہیں سمجھتے تھے اور حساب کی بجائے پرتال میں ان کو مجبوراً مترجم سے مدد
 لینا پڑتی تھی اور اس طرح دیسی حساب نویسوں اور غیر ملکی حساب فہموں میں ایک بعد
 رہتا تھا جس کو راجہ ٹوڈرمل نے اس طرح رفع کیا کہ مسلمان افسران کو ہندی زبان اور
 ہندو محاسبوں کو زبان فارسی سیکھنے کی سخت تاکید کی اور اس کا حکم دیدیا جس کا نتیجہ یہ ہوا
 کہ زبان فارسی کی تعلیم حصول ملازمت اور ترقی کی منزلیں طے کرنے کے واسطے بہت
 ضروری قرار پا گئی کسی قسم کی ترقی اور دربار رسی بغیر بادشاہ کی زبان جانے ہوئے
 ممکن نہ تھی۔ ٹوڈرمل نے حکم دیدیا کہ صیغہ مال میں جو لوگ ملازمت کرنا چاہیں ان کے
 لئے زبان فارسی کی تحصیل لازمی ہے پس جس چیز کی ابتدا اکبر کے زمانہ میں شروع ہوئی
 تھی وہ شاہجہاں کے عہد میں درجہ تکمیل کو پہنچی اور اب زبان اس قابل ہو گئی کہ وہ
 ادبی اغراض میں کام آسکے۔ خرقی اور درستی اور اصلاح کا کام بیشک زبان میں جاری
 جاری رہا بلکہ ہمارے نزدیک اب تک جاری ہے۔

قدیم شعرائے دکن اور دربار امیر خسرو کے زمانہ کو زبان اردو کی نمود کے واسطے صحیح
 شاہان گول کنڈہ بیجا پور۔ کاذب کہنا بجا ہے جس کی صبح صادق ہمارے نزدیک ملک
 دکن کے مطلع پر مسلمان شاہان بیجا پور گول کنڈہ کے عہد میں نمودار ہوئی جس کے اسباب
 ہم نے اس کتاب میں آگے چل کے وضاحت سے لکھا ہے۔ بادشاہان مذکور خود

صاحبان علم و فضل اور اہل علم کے بڑے قدردان تھے۔ محمد قلی قطب شاہ (۱۵۸۱-۱۶۶۱) سلطان محمد قطب شاہ (۱۶۱۱-۱۶۲۵) - عبداللہ قطب شاہ (۱۶۲۵-۱۶۴۲) - ابوالحسن قطب شاہ (۱۶۴۲-۱۶۸۲) جو سلسلہ میں قید میں مرا۔ یہ سب خود بھی شاعر اور شاعروں کے بڑے مرثی اور قدردان تھے۔ محمد قطب شاہ - عبداللہ قطب شاہ اور ابوالحسن زبان دکنی میں شعر کہتے تھے جو اردو ہی کی ایک شاخ ہے جس کی تفصیل آگے آئے گی ان سب نے غزل، رباعی، مثنوی، قصیدے اور مرثیے لکھے جو اس زمانہ میں موجود مگر بہت کمیاب ہیں۔ اسی طرح بیجاپور کے ابراہیم عادل شاہ ثانی (۱۵۸۰-۱۶۲۶) اور علی عادل شاہ اول (۱۵۵۸-۱۶۱۵) خود بھی قابل بادشاہ تھے اور اہل فن کے بڑے قدردان تھے۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی نے فن ہندو کی زبان ہندی میں ایک مشہور کتاب لکھی ہے جس کا دیباچہ زبان فارسی اس کے دربار کے مشہور شاعر و نثار ملاظہوری مرثیہ متوفی ۱۶۱۶ء کا لکھا ہوا زبان فارسی کی ایک بے مثال تحریر سمجھا جاتا ہے اور آگے چل کر اکثر اردو نثاروں نے اس کی نقل کی بڑی کوشش کی ہے۔ اسی طرح علی عادل شاہ اول بھی بڑا قابل بادشاہ تھا جس نے دربار کے مشہور شاعر نصرتی کی اکثر تصانیف موجود ہیں جن میں مثنوی گلشن عشق اور علی نامہ زیادہ مشہور ہیں ان میں کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں ہے بلکہ کثرت سے زبان دکنی کے الفاظ اور قدیم متروک الفاظ کے خلط ملط سے اکثر جگہ مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔ ان کتابوں کی قیمت اس قدر ضرور ہے کہ وہ زبان و ادب اردو کی تدریجی ترقی کی قابل قدر مثالیں ہیں۔

دلی دکنی سلسلہ تا ۱۶۳۲ء جب دلی کا شیر اقبال چکا تو چھوٹے چھوٹے نازے جو افق شاعری اس وقت ضیا ملکن تھے سب ماند پڑ گئے۔ دلی کو رنجیتہ کا موجد۔ گویا اردو کا چاسرہ

۱۶۳۲ء چاسرہ زبان انگریزی کا بہت قدیم شاعر سلسلہ تا ۱۶۳۲ء اس کی مشہور تصنیف کنٹری ٹیلیس رکنٹری کے قصبہ کا زبان قدیم ہے اور مروجہ زبان سے بہت مختلف ہے۔

خیال کرنا چاہیے۔ اسی زمانہ میں اردو شاعری کا سنگ بنیاد باقاعدہ طور سے رکھا گیا۔ دلی کا کلام شمالی ہند کے تمام نظم نگاروں کے واسطے نمونہ بن گیا اور اسی کو دیکھ کر اور اپنے سامنے رکھ کر اس وقت کے تمام شعرا نے دلی نے ترقی کرنا شروع کی۔ دلی کا کلام نہایت صاف، سادہ، فصیح اور سچیدہ استعارات اور دراز کا تشبیہوں سے پاک ہے تصوف کا بھی رنگ جھلکتا ہے۔ فارسی الفاظ اور خیالات کی کثرت ضرور ہے مگر غلبہ نہیں ہے۔ ہندی لفظ بھی فارسی الفاظ کے ساتھ جا بجا ملے جلے ہیں جو بعد کو متروک ہو گئے۔

قدیم شعرا کے دہلی دیوان دلی کی اشاعت کے ساتھ ہی مرکز شاعری گویا دکھن سے حاتم، آبرو، آرزو، منتقل ہو کر دہلی میں آگیا اسوجہ سے کہ یہاں کے لوگوں کو ایک خاص دلچسپی شعرو شاعری کے ساتھ پیدا ہو گئی۔ سیکڑوں فصیح دلی کے پیدا ہو گئے جو ان کے کلام کی بڑی قدر کرتے تھے اور اسی طرز پر کہتے تھے اب اردو شاعری فارسی کے دوشن بدوش ترقی کرنے لگی گویا اسکی مد مقابل اور حریف بن گئی گویا ابھی تک اس میں وہ کنگھی اور پنگھی نہیں پیدا ہوئی تھی جس سے اسکی حریف زبان فارسی کو کوئی اندیشہ ہوتا۔ نظم اردو اب تک ایک کھلونا سمجھی جاتی تھی جس کو لوگ پسند ضرور کرتے تھے اور فارسی کلام کی محنت و دماغ سوزی کے بعد اسی سے دل بہلاتے تھے سلطنت مغلیہ گو بہت کمزور ہو گئی تھی مگر اب تک اس میں جان باقی تھی اور دیباری زبان اب تک فارسی ہی تھی۔ اردو کے کمزور اور فو خیز بچہ کو اتنی قوت کہاں تھی کہ فارسی کے شہزادہ تختہ کار پہلوان سے مقابلہ کر سکے۔ اس لیے اسے مقابلہ کی جرات نہ ہوتی تھی۔ قدیم شعرا کے اردو دب بڑے بڑے فارسی داں اور فارسی کے کہنے مشق شاعر تھے۔

دلی کے فصیح ظہور الدین حاتم (۱۶۹۹ء تا ۱۷۹۲ء) خان آرزو (۱۷۸۹ء تا ۱۷۹۵ء) حاجی مضمون آبرو اور بہت سے اور شعرا پیدا ہوئے جن کو اردو شاعری کے آبا بھنا چلیے۔ ان کا کلام تصوف کے رنگ میں ڈوبا ہوا بہت صاف و سادہ اور تصنیع و تکلف سے بہت کچھ

ایک وصف ہے نشست الفاظ میں بہت زور طبع دکھایا گیا ہے اور فارسی الفاظ اور ترکیبیں بکثرت ملتی ہیں۔ دلی کے یہاں جو ہندی الفاظ تھے وہ ان لوگوں کے یہاں نہیں یا بہت کم ہیں ان کی جگہ فارسی لفظوں نے لے لی ہے۔ فارسی بحر میں اردو نظم میں بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں اور بہت خوبی سے بندھی ہیں۔ ان کے زور طبیعت اور قدرت کلام میں کسی کو کلام نہیں اور ان کی مشاطی سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا اور نقش اول سے نقش ثانی یقیناً بہتر ہے گو فارسیت کا رنگ اور تصنع بہ نسبت دھنی شعرا کے ان میں زیادہ ہے مقامی رنگ گویا لکل غائب نہیں مگر رفتہ رفتہ کم ہوتا جاتا ہے ہندی دہروں کا بھی کچھ اثر اشعار میں پایا جاتا ہے۔ قدیم شعرا لے دہلی کا کلام اردو کی تدریجی ترقیوں کی منزل میں ایک نمایاں نشان ہے۔

میر سودا کا زمانہ	یہ زمانہ اردو شاعری کی سب سے بڑی ترقی کا زمانہ ہے اس
اس زمانہ کی ترقیاں	میں محبوبہ شاعری مع اپنی تمام کرشمہ سازئیوں کے زینت الفاظ
زبان اور شاعری	اور جدت خیال سے آراستہ و پیراستہ ہو کر دنیا کے سامنے نمودار
میں اصلاحیں	ہوئی۔ یہ میر اور سودا کا زمانہ ہے جو اردو شاعری کے رکن کین

اور استاد اعظم مانے جاتے ہیں یہ دونوں بزرگ اپنے حسن ادا حلاوت زبان قدرت الفاظ اور نزاکت زبان کی وجہ سے اپنے تمام ہم عصر اور نیز سابق حریفوں پر گوشت بھخت لگے ان کے مبارک زمانہ میں غزل اور قصیدہ دونوں معراج ترقی پر پہنچ گئے

مرزا مظہر جانجاناں، میر درد، سوز، قائم، یقین، بیان، ہدایت، قدرت اور ضیاء ان کے ہم عصر ہیں جو سب علاوہ اردو کے نظم فارسی کے بھی استاد تھے۔ چونکہ ان سب پر فارسی کا رنگ غالب تھا لہذا وہ قدرتا ہندی الفاظ پر فارسی کو ترجیح دیتے تھے کیونکہ وہی ان کو اچھے معلوم ہوتے تھے۔ اسی زمانہ میں زبان بہت کچھ ایسے الفاظ اور بندشوں سے پاک ہو گئی جو دلی اور ان کے ہم عصر شعرا نے دہلی کے

یہاں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ انھوں نے نہ صرف زبان کو صاف کیا بلکہ بہت سے خوبصورت اور مناسب فارسی لفظ اور محاورے خواہ بجنہ یا بصورت ترجمہ زبان میں داخل کر لیے۔ ان کا کلام اُردو اور فارسی کی آمیزش سے گنگا جمنی ہے جس و عشق کے معاملات جس خوبصورتی اور مؤثر طریقہ سے ان حضرات نے باندھے اس سے پیشتر کسی نے نہیں باندھے تھے۔ ان کے کلام کو دیکھ کے تعجب ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ فارسی لغات کا خزانہ انھوں نے کھنگال ڈالا جس میں سے صد ہا جواہر ریزے منتخب کر کے زبان میں داخل کیے گئے ہیں۔ گل و بلبل اور غری و شمشاد کے عشق کے افسانے جبکہ فارسی شعرا مدت سے باندھتے چلے آتے تھے اب اُردو میں بھی داخل ہوئے اور جدید خیالات اور نئی ترکیبوں کے ساتھ بڑے حسن و خوبی سے برتے گئے۔۔۔ فن شعریں بھی ایک نمایاں ترقی ہوئی نقائص اور معائب سے کلام پاک ہونے لگا۔ غزلیں ایسی بحر و میں کہی جانے لگیں جو اس سے پیشتر مروج و تھیں اور کانوں کو بہت اچھی معلوم ہوتی تھیں نئی نئی تشبیہیں اور استعارے اور صنائع بدائع جن کو اب تک کلام میں جگہ نہیں ملی تھی بکثرت استعمال ہونے لگے مگر اُسی حد تک کہ اُن سے شعر کے حسن اور ادائے مطلب میں کوئی فرق نہیں آتا تھا۔ وہ کلام میں گھل مل جاتے تھے اور بدنام نہیں معلوم ہوتے تھے۔ نئے نئے اصناف شعر بھی اسی عہد میں رائج ہوئے۔ مثلاً آسونخت، مثنوی، محسن، پنجو، مثلث، مربع اور مستزاد وغیرہ اور یہ سب فارسی سے لیے گئے اور خوب خوب کے گئے کہ جو اصناف سخن پیشتر سے مروج تھے ان میں بھی ترقی ہوئی صنعت ہام جو قدما میں جاری تھی اس زمانہ میں کم ہو گئی گو بعد کو پھر رائج ہو گئی مگر یہ صنعت کم پسند تھی لیکن اگر بلا تکلف اور کسی دوسری صنعت کے ساتھ بندھتی اور کلام کا حسن بڑھاتا تو مضائقہ بھی نہ تھا مگر اُدراں کے اکثر معاصرین اور متبعین نے بھی اس معاملہ میں ترقی کا سلاک اختیار کیا۔ اس زمانہ کے شعرا بعض اصناف سخن کے محض موجد ہی نہ تھے بلکہ

انہوں نے اس میں بڑی ترقیاں کیں اور آئندہ ترقی کی راہ بتا گئے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی ایجادیں فارسی ترکیبوں سے ماخوذ تھیں اور انھیں پر مبنی تھیں اس عہد میں زبان اردو نے علی الغوم زبردست ترقی کی اس میں قوت و وسعت اور لوح با حسن و جود پیدا ہوا اور نئے نئے لفظ اور محاورے اور ترکیبیں زبان میں داخل ہوئیں جن سے آئندہ ترقی کا دروازہ کھل گیا

انشا اور مصحفی کا دور ایک دوسرا دور بعد کے شعراء دہلی سے شروع ہوا جس میں ان کی خدمات زبان اور شاعری کے ساتھ آخر میر حسن، میر آدات، انشا، مصحفی، ناسخ، بقا، حسرت، رنگین، فراق مشور زمانہ ہوئے اس زمانہ میں بھی وہی پرانی ترکیب ہندی الفاظ خارج کرنے اور انکی جگہ فارسی اور ادبی الفاظ داخل کرنے کی برابری رہی۔ اس میں شک نہیں کہ بعض ہندی اور بھاشا لفظ جو خارج کیے گئے بد نما اور ثقیل ضرور تھے اور نظم کی صنف نازک ان کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی مگر ان کے یک قلم نکال دیے جانے سے دیسی زبان کی ترقیوں کو سخت نقصان پہونچا ایسے حواہر ریزے جو سنسکرت اور پراکرت کے خزانوں سے زبان اردو کے قبضے میں ایک عرصہ دراز سے چلے آتے تھے فارسی کے غلبہ سے اب خارج ہو گئے قدیم اردو شاعر سنسکرت اور ہندی سے ناواقف تھے اسی لیے انہوں نے ہندی الفاظ کی کوئی قدر نہیں کی انکو زبان سے خارج کر دیا اور انکی جگہ پر فارسی اور عربی الفاظ رکھ دیے اس کا رد الی کو وہ لوگ اور نثر اس زمانے کے مسلمان مصنفین جو فارسی کا ذوق رکھتے تھے زبان کی اصلاح اور نچنگی سے تعبیر کرتے ہیں اسی عہد میں ایک اور ترقی یہ بھی ہوئی کہ پرانے متروکات جو تیر و سودا کے زمانہ میں باقی رہ گئے تھے نکال دیے گئے اور ان کی جگہ جدید و بصورت لفظ اور ترکیبیں داخل کی گئیں۔ ہندی اور فارسی محاورے اور ترکیبیں باہم ملا دی گئیں۔ طرز عبارت میں کچھ فرق نہیں ہوا مضامین میں بھی کوئی خاص جدت نہیں ہوئی البتہ ابتداء اور شہوت پرستی کا رنگ پیدا ہو گیا

اس دور کی شاعری اُس زمانہ کی اخلاقی حالت اور دہلی کی بگڑی ہوئی سوسائٹی کا پورا نمونہ ہے۔ معشوق کے محسن ظاہری کی تو عام طور پر تعریف کی جاتی تھی مگر بعض شعرا نے کلم کھلا ایک اور رنگ اختیار کیا جس کو اصطلاح میں "معاملات" یا معاملہ بندی کہتے ہیں۔ جرأت، انشا اور رنگین اس خاص رنگ کے بادشاہ تھے۔

ریختی | یہ حسن پرستی اور شہوت پرستی بعد کو ایک خاص طرز میں ظاہر ہوئی جس کا نام "ریختی" یعنی عورتوں کی زبان رکھا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ ریختہ سے نکلا ہے اور اُس کا نمونہ ہے عورتوں کی زبان بالذات کوئی مذہم بات نہیں مگر خرابی یہ ہوئی کہ اس قسم کے اشعار جذبات نفسانی بزرگیختہ کرنے کی عرض سے کہے جاتے تھے اور اسی وجہ سے وہ نہایت فحش اور مخرب اخلاق اور شرفاء کے کانوں تک کونا گوار ہوتے تھے۔ ایسی کل چیزیں جو عورتوں کے پڑھنے کے قابل نہیں ہوتیں غیر محذب اور فحش ہوتی ہیں عورتوں کی تعلیمی ترقی ہر ملک اور قوم میں زبان کی اصلاح اور ترقی کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہوتی ہے۔ ریختی کی مثالیں پرانے شعرا کے کلام میں بھی کہیں کہیں ملتی ہیں۔ مثلاً مولانا ہاشمی بیجا پوری اور سید محمد قادری، معصرونی کے کلام میں بھی اس رنگ کا کچھ پتہ چلتا ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ بعد کو یہ بالکل منور ہو گیا تھا۔ اس کو دوبارہ سعادت یار خاں رنگین اور اُن کے دوست انشانے زندہ کیا سب سے بڑے ریختی گو میر یار علی خاں متخلص بہ جان صاحب سمجھے جاتے ہیں انشا مختلف طرز کے شعر کہتے تھے کبھی ریختی بھی کہہ جاتے تھے مگر جان صاحب نے اس کو ایک فن قرار دیا اور سوائے اس رنگ کے کچھ نہیں کہا خدا کا شکر ہے کہ یہ صنف شاعری زمانہ کے ساتھ بہت کچھ بدل گئی ہے اور اب تقریباً مٹ چکا ہے۔

اس دور کے شاعر غزل کے استاد تھے اور شنوی اور قصیدہ بھی خوب کہتے تھے لوگوں میں شعر و شاعری کا چرچا تھا۔ بزم شاعرہ اکثر گرم ہوتی تھی۔ اس عہد کے اکثر شاعر

اچھا وطن مالوف دہلی چھوڑ کر ادھر ادھر نکل گئے اکثر لکھنؤ پہنچے جہاں دربار شاہی میں شہر
کی بڑی قدر کی جاتی تھی۔ اس زمانہ کی مشہور یادگاریں میر حسن اور خواجہ میر درد کے بھائی
میر انور کی مثنویاں ہیں۔ علی الخصوص میر حسن کی مشہور آفاق مثنوی "سحر البیان" جس کی
ردائی سادگی، شیرینی اور رنگینی کا جواب نہیں۔

غالب اور ذوق کا زمانہ | اس دور کی ابتدا شاہ نصیر، ذوق، غالب، مومن اور ظفر سے
اور اس کے خصوصیات | ہوئی ہے۔ اس میں وہ رہے سب سے ہندی الفاظ بھی جوت ما
سے باقی رہ گئے تھے نکل گئے اور فارسیت کو اور ترقی ہوئی۔ غالب اور مومن فارسی
میں بھی خوب کہتے تھے چنانچہ ان کی اکثر تصانیف اس زبان میں موجود ہیں۔ غالب
یہی وجہ ہوگی کہ اس زمانہ میں زبان میں فارسی الفاظ کی بھرمار ہو گئی جس کا نتیجہ اچھا
نہیں ہوا۔ شاہ نصیر کو دور سابق (مصحفی و انشا) اور درد حال (ذوق و غالب) کے
پنچ کی کڑی سمجھنا چاہیے یہی زمانہ نظیر اکبر آبادی کا بھی ہے جن کا رنگ سب سے علیحدہ
ہے اور دب اردو میں ایک نہایت نمایاں اور خاص رنگ ہے۔ غالب و مومن کے
یہاں ہم کو ان مشکل اور دقیق فارسی ترکیبوں اور محاوروں کی ابتدا ملتی ہے جو استادوں
کے قلم سے توڑے نہیں معلوم ہوتے مگر معمولی قابلیت والوں کے ہاتھ میں وہ بالکل غارت
ہو جاتے ہیں۔ اچھا ہوا کہ اس قسم کی زبان جس پر فارسی کا اتنا رنگ غالب تھا زیادہ رواج
پذیر نہیں ہوئی۔ ورنہ پھر اردو اور فارسی میں فرق ہی کیا رہ جاتا۔ اسی فارسیت کے
غلبہ کی وجہ سے مومن اور غالب کا اکثر کلام سمجھ میں نہیں آتا۔ ذوق گو بلیغ شاعری غالب
سے ذہانت و طباعی میں کم ہیں مگر زبان پر ان کی قدرت مسلم اور محاورات و امثال میں تو
ضرب المثل ہیں۔ ان کا کلام نہایت صاف اور بہت مزے کا ہوتا ہے۔ ظفر کے یہاں کچھ
خاص خوبیاں ہیں وہ غالب و ذوق کے ہم پلہ نہیں بلکہ ان سے اصلاح لیتے تھے۔
ظفر اور ذوق کے کلام میں بہت مشابہت ہے جس سے بعض لوگوں کو شبہ

ہوتا ہے کہ یہ ظفر کا کلام ہی نہیں بلکہ اُن کے استاد ذوق کا کہا ہوا ہے۔ اس زمانے میں غزل اور قصیدے میں بڑی ترقی ہوئی۔ چنانچہ ذوق اور غالب کی غزلیں اور قصیدے اردو شاعری میں اپنا جواب نہیں رکھتے سنگدھار زمینوں میں اشعار کے گئے اور جدید اور مشکل بحر میں جواب تک رائج نہیں ہوئی تھیں استعمال ہونے لگیں شعر اپنا کمال فن دکھانے کے لیے مشکل قالب میں اور ردیفیں باندھتے اور غیر معمولی بحر میں اختیار کرتے اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ مگر اس قسم کا کلام حقیقی شاعری کی لطافت و معنویت سے خالی ہوتا تھا۔ القرض اس زمانہ میں ہندی الفاظ زبان سے اکثر نکل گئے فارسی ترکیبیں بکثرت داخل ہو گئیں، خیالات میں جدت اور مضامین میں ندرت پیدا ہوئی جس کا بہترین نمونہ غالب کے کلام کو سمجھنا چاہیئے۔

شعراے لکھنؤ کا نیا دور اور اُس کے	ناسخ اور آتش کے زمانہ سے لکھنؤ میں ایک جدید
خصوصیات ناسخ اور آتش کا زمانہ	دور شروع ہوتا ہے۔ دہلی پر جب زوال آیا تو وہاں کے
اُن کی خدمت زبان کے ساتھ	اکثر اہل کمال نے لکھنؤ کا رخ کیا اور یہاں آکر پناہ لی

دہلی کی شمع سخن سے لکھنؤ کی شاعری کا چراغ جلا اور وہاں بھی بکثرت شاعر پیدا ہونے لگے۔ ناسخ اور آتش کا تعلق بالکل لکھنؤ سے تھا وہاں کے شاہی دربار میں شاعری کی اتنی عزت اور ایسی قدر ہوئی کہ اس سے پیشتر کبھی نہ ہوئی تھی۔ لوگ شاعری کے پیچھے دیوانے ہو رہے تھے شاعرے گھر گھر ہوا کرتے تھے۔ قدر دانوں کی تعریفیں دل بڑھاتی اور نئی انگلیں پیدا کرتی تھیں۔ شاعرے ماہوار و ہفتہ وار کیا بلکہ اکثر روزمرہ ہوتے تھے۔ اسی کثرت اور شائق نے شاعری کو درجہ کمال تک پہنچا دیا اور اُس میں طرح طرح کی جدتیں اور رنگینیاں پیدا کیں مختلف اصناف سخن پر قدرت حاصل ہو گئی شاعری کے ساتھ ظاہر ہے کہ زبان بھی صاف ہوتی گئی اور ترقی کرتی گئی جو ہندی الفاظ پیشتر کی تراش خراش اور قطع و برید سے بچ گئے تھے وہ بھی اب نکل گئے اور ان کی جگہ فارسی و عربی

الفاظ نے لی۔ اسی طرح پرانی بندشیں اور ترکیبیں بھی جو زبانوں پر جاری تھیں ان کی گہلیں
 ناسخ کوید فخر حاصل ہے کہ تکمیل زبان کے آخری مدارج انھیں کے مبارک ہاتھوں سے
 پورے ہوئے واقعی اُن کو متر و کات کا ناسخ کرنا بالکل بجا ہے۔ اُن کے زمانہ سے ایک
 نیا رنگ شاعری شروع ہوا جس کی خصوصیات یہ ہیں۔ الفاظ شان دار عبارت میں تعقید و
 تکلف صنائع و بدائع اور دراز کار تشبیہوں اور استعاروں کی کثرت فضول میالغے فرسودہ
 تشبیہیں جذبات اور اثر کی بہت کمی۔ مگر باوجود اس کے اسی رنگ کے بھی بعض شعر مزے کے ہوتے ہیں
 یہ رنگ بھی اپنے زمانہ میں بہت مقبول ہوا۔ علاوہ ناسخ کے تجر اور ذریعہ صبا، سحر رشک وغیرہ
 اپنے زمانہ کے استاد مانے جاتے تھے قبولیت کا سہرا اسی رنگ کے سر پر رہا یہاں تک
 کہ یہ رنگ ایک مرتبہ پھر بدلا اور اشعار میں بے تکلفی سادگی نیچر کی جھلک سوز و گداز
 اور اثر پسند کئے جانے لگے۔

ناسخ ہی کے معاصر آتش بھی تھے جن کا رنگ بالکل علیحدہ تھا۔ وہ غزل کے مسلم البشوت
 استاد مانے جاتے ہیں۔ ہر چند اُن کی درسی تعلیم اور وسعت معلومات ناسخ سے کم کہی جاتی
 ہے مگر اُن کا کلام ناسخ کے کلام سے کہیں زیادہ شیریں اور موثر ہے۔ وہ اپنے خاص رنگ
 یعنی شستگی الفاظ چستی بندش، بلندی مضامین میں قدامت کے متبع کہے جاسکتے ہیں
 اُن کے اشعار سوز و گداز اور اثر سے مملو ہیں بلحاظ علمیت وہ ناسخ سے کم ہوں مگر شاید یہ
 کمی علم ہی زیادتی اثر و کیفیت کا باعث ہے۔ صفائی زبان پر اُن کا بھی بہت بڑا احسان
 ہے مگر حق یہ ہے کہ اس معاملہ میں ہم کو ناسخ کا زیادہ ممنون احسان ہونا چاہیئے۔ ان دونوں
 پہلوؤں ان سخن کے شاگردوں اور پیروں میں بھی اکثر اور زور آزمائیاں اور مقلدے ہوا
 کرتے تھے جو ترقی زبان کے حق میں نہایت مفید ثابت ہوئے۔

مراثی اور اُن کا تعلق مرثیہ ایک قدیم صنف شاعری ہے۔ اردو مرثیہ گوئی کو قدامت نے
 زبان کے ساتھ نظر احسان سے نہیں دیکھا اس وجہ سے وہ عرصہ تک ایک

کس پرسی کی حالت میں پڑی رہی یہاں تک کہ میر خلیق اور اُن کے لائق فرزند سیرانیس اور
 انیس کے معاصر دیر کے زمانہ میں وہ از سر نو زندہ ہوئی اور اُن کے بعد سے تو مرثیہ گو
 بکثرت پیدا ہونے لگے۔ مرثیہ بہت پرانی چیز ہے عربوں میں یہ پیشتر سے موجود تھی وہاں سے
 یہ اہل فارس میں آئی اور فارسی سے اردو میں اُس نے رواج پایا۔ قدیم شعراء کے دکن
 نے بھی اردو میں مرثیے کہے مگر اُن کی زبان کچی اور ابتدائی حالت میں تھی۔ مرثیہ گوئی کی
 اصلی ترقی لکھنؤ میں ہوئی جہاں اُس میں ایک نئی روح پھونکی گئی۔ لکھنؤ کے اکثر اہل ادب و
 شیعہ مذہب سمجھتے تھے جو اعتقاد اُشہدائے کریم کے مصائب پر گریہ دیکھا اور اظہار غم و اہم
 کرنا اپنا مذہبی فرض سمجھتے تھے۔ زمانہ عزاداری اب بجائے دس دن (عشرہ) کے چالیس
 دن (اربعین) ہو گیا تھا اور اس زمانہ میں پورا لکھنؤ سوخ و غم اور حسرت و ماتم کی ایک زندہ
 تصویر بن جاتا تھا۔ اس غم و اہم اور حسرت و ماتم کے اظہار کا بہترین ذریعہ شعر اے پر زور
 اور درد انگیز مراثی کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔ اسی وجہ سے فن مرثیہ گوئی نے جو ترقی اس
 دور میں کی وہ اس سے پیشتر کبھی نہیں ہوئی تھی خود بادشاہ بھی مرثیے کہتے تھے اور مجلسوں میں
 اپنا پڑا اور وقت خیز کلام سناتے تھے۔ فلک مرثیہ گوئی کے سب سے درخشاں تارے ملیح مرثیہ گو
 مرزا دیر تھے جن کا کلام نہایت موثر اور قدرتی شاعری کا پر تو ہے۔ ان دنوں بزرگواروں
 کا کلام اردو شاعری کے سر کا تاج ہے اس کی چند خصوصیتیں یہ ہیں۔ کلام میں اخلاقی تعلیم کوٹ
 کوٹ کے بھری ہے۔ ناسخ اور اُن کے زمانہ کی بد اخلاقیوں سے بالکل پاک ہے۔ قصائد کی
 سی بیکار لفاظی اور دور از کار مبالغہ اس میں مطلق نہیں۔ مناظر قدرت (جس کو سماں بانہذا
 کہتے ہیں) اور جذبات قلبی کے سچے فوٹو موثر الفاظ میں کھینچے گئے ہیں حقیقت یہ ہے کہ
 مرثیہ نگاری کو اردو شاعری کا ایک نیا دور سمجھنا چاہیے۔

مابعد کے شعر اتپر دم معزولی سلطان عالم و اجد علی شاہ اور زمانہ غدر کے بعد اکثر نامور شاعر
 دماغ کا زمانہ مثل امیر داغ، جلال اور تسلیم وغیرہ کے اپنا وطن چھوڑ چھوڑ کر اسلامی

ریاستوں میں چلے گئے بعض نے رامپور اور حیدر آباد کا رخ کیا۔ اس وجہ سے کہ وہ زبان اُردو کے قدرداں سمجھے جاتے تھے۔ اس زمانہ کے شعرا کا کوئی خاص رنگ نہیں بلکہ قدامت کے متبع تھے۔ دربار میں اُردو دُسا کے گھروں پر مشاعرے بکثرت ہوتے تھے غزلیں، رباعیاں، قصیدے قطعات اس زمانہ میں اکثر کہے گئے۔ امیر مینائی اپنے پیش روؤں کے مقلد تھے اُن کا کلام ناسخ کے زمانہ کی اکثر بے اعتدالیوں سے پاک ہے دُعا کے یہاں طباعی، بیباختگی اور روزمرہ بہت ہے مگر متانت اور پختگی مضامین کم ہے جلال کا کوئی خاص رنگ نہیں مگر وہ فن عروض کے استاد اور صحت الفاظ کا بہت خیال رکھتے تھے اور قدامت کے پیرو تھے۔ اس دور میں اُردو شاعری نے بحیثیت شاعری کوئی نمایاں ترقی نہیں کی۔

جدید رنگ	زمانہ حال میں نظم اُردو نے ایک نیا رنگ اختیار کیا۔ اس کے
آزاد اور حالی کا زمانہ۔ اُن کی	رُکن رکیں آزاد، سرور اور حالی ہیں۔ نئے مضامین اور نیا
خدمات زبان کے ساتھ	طرز انشا زبان میں داخل ہوا۔ قومی نظمیں، خیالی نظمیں اور

بیانیہ نظمیں لکھی گئیں جو پرانی قیود اور قواعد کی جکڑ بند یوں سے آزاد ہیں۔ نظم کا دائرہ وسیع ہوا۔ میدان شاعری کو وسعت دی گئی۔ سادگی بے تکلفی اثر اور جذبات اس رنگ کی نظموں کے خاص جوہر ہیں۔ نئی چیزوں پر طبع آزمائی کی جانے لگی۔ ہمارے نزدیک اس تغیر کا بڑا سبب انگریزی تعلیم اور انگریزی علم ادب کا شوقِ نقل ہے۔ حالی قومی شاعر ہیں۔ آزاد نچل شاعری کے موجد ہیں۔ سرور کا تخیل اور طرز بیان بہت اعلیٰ درجہ کا ہے۔ اگر کارنگ خاص ہے جس کو انھوں نے شروع کیا اور انہی پر ختم ہو گیا۔ اقبال کے کلام میں فلسفہ اور نچل مضامین کا لطف ہے۔ حسرت میں زمانہ حال کی بہت سی خوبیاں ہیں اس جدید دور میں غزل کوئی میں بھی بہت کچھ اصلاح ہوئی مختصر یہ کہ اس رنگ نے نظم اُردو کو پرانی قیدوں اور پابندیوں سے بہت کچھ آزاد کر دیا اور آئندہ ترقی کے واسطے نئے راستے کھول دیے۔

نثر اردو

جدید نثر اردو کی ابتدا انیسویں صدی عیسوی سے شروع ہوتی ہے

نورث ولیم کالج کلکتہ اس نئی تعمیر کا سنگ بنیاد ڈاکٹر جان گلکرسٹ کے اہتمام سے نورث ولیم کالج کلکتہ میں رکھا گیا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف اُس وقت نورث ولیم کالج کے افسر اعلیٰ تھے۔ انھوں نے شمالی ہند سے قابل قابل لوگوں کو اس غرض سے اپنے یہاں جمع کیا تھا کہ انگریزی افسروں کے واسطے جو تازہ وارد ہوتے تھے ایسی کتابیں تیار کی جائیں جن سے انتظام ملکی اور ہندوستانیوں کے ساتھ میل جول اور ربط و ضبط برپا رہے۔ اس مشہور کالج کے قیام کے پیشتر بھی نثر اردو کی بعض کتابیں موجود تھیں مگر وہ مذہبی رنگ کی یا قصے کہانیاں تھیں اور چلتی اور ابتدائی زبان میں فارسی سے ترجمہ کی گئی تھیں۔ عبارت کی درستی اور قواعد صرف و نحو کا ان میں کچھ خیال نہ تھا۔ وہ مجلس اور نو طرز مرصع اسی عہد کی یاد گاریں ہیں۔ وہ خاص لوگ جو انگریزوں کے واسطے سنسکرت اور فارسی سے ترجمہ کرنے یا نئی کتابیں سادہ اور بے تکلف زبان میں لکھنے کی غرض سے جمع کئے گئے تھے یہ محمد حیدر بخش حیدری، بہادر علی حسینی، میر امن، حفیظ الدین احمد ظہر علی ولا، اکرام علی، اور مرزا علی لطف وغیرہ جن کی تصانیف نہایت صاف و سادہ اور دلکش عبارت میں ہیں۔ ان کتابوں سے اکثر ثقیل اور غیر مانوس فارسی اور سنسکرت الفاظ نکال دیے گئے ہیں یہی کتابیں نصف صدی تک نثر اردو کا بہترین نمونہ سمجھی جاتی تھیں اور زمانہ حال کی جو ترتیاں زبان میں ہو رہی ہیں ان کا بھی زیادہ تر دار و مدار انھیں پر ہے۔ ڈاکٹر گلکرسٹ ہی کی کوششوں کا یہ نتیجہ ہے کہ دیسی زبان (اردو) سرکاری زبان ہو گئی اور یہ استعداد اس کو حاصل ہو گئی کہ بجائے مروجہ فارسی کے وہ عدالتوں اور گورنمنٹ کی زبان قرار دی جائے۔ ڈاکٹر گلکرسٹ کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ اردو لغات اور صرف و نحو کی کتابیں بھی ان کے زمانہ میں تیار ہوئیں۔

نثر مقفہ
رجب علی بیگ سرور | سادہ نثر کے مقابلہ میں جس کی ابتدا کلکتہ کے نورث ولیم کالج سے

ہوئی تھی وہ شریف مقفے ہے جو طور ری اور پیدل کی فارسی نثر کے طرز پر لکھی جاتی تھی۔ اس کی عبارت مقفے اور جملے بالکل پنے تلے ہوتے تھے۔ صنائع بدائع استعاروں اور تشبیہوں سے بہت کچھ کام لیا جاتا تھا۔ جملے طولانی پیچیدہ اور قافیہ بندی کی رعایت کی وجہ سے اکثر جگہ مطلب سمجھنے میں دقت واقع ہوتی تھی، اسی وجہ سے پوری عبارت کے پڑھنے اور مطلب سمجھنے میں بھی دقت ہوتی تھی۔ عرصہ تک اسی قسم کی رنگین اور مقفے عبارت لکھنؤ اور دہلی میں مقبول عام رہی خطوط تک اسی قسم کے مرصع اور بالکلف عبارت میں لکھے جاتے تھے۔ کتابوں کے دیباچے اتھمیدیں تقریظیں، خواہ زبان فارسی یا اردو سب اسی قسم کی رنگین عبارت میں لکھنے کا دستور تھا۔ اس عبارت کے بہترین نمونے مرزا رجب علی بیگ سرور کے یہاں ملتے ہیں۔ ان کی مشہور تصنیف ”قنائے عجائب“ جس طرح اپنی انشا پردازی میں مشہور ہے۔ اسی طرح لکھنؤ کی اُس زمانہ کی معاشرت کی بھی ہو تصویر ہے۔

دریائے لطافت | انشا اور قلیل کی ”دریائے لطافت“ کو گویا فارسی اور اردو کا مجموعہ کہنا چاہیے۔ وہ ایک تاریخی اہمیت رکھتی ہے۔ کیونکہ وہ نہ صرف صرف و نحو اردو کی پہلی کتاب ہے، جو ایک ہندوستانی کے قلم سے نکلی ہے بلکہ اس میں یہ بھی خوبی ہے کہ مختلف قسم کی زبانیں اور بولیاں جو اُس وقت ملک میں رائج تھیں اور جن کا اثر زبان اردو پر پڑ رہا تھا اور نیز وہ محاورے اور اصطلاحیں جو بعض مخصوص طبقوں اور جماعتوں میں مروج تھیں ان سب کے نمونے بھی اُس میں بکثرت موجود ہیں۔

اردوئے معلیٰ اور عود ہندی | ایک بہت بڑی شخصیت نثر اردو کی تاریخ میں مرزا غالب کی ہے۔ ان کی مشہور تصانیف ”اردوئے معلیٰ“ اور ”عود ہندی“ ایک دلچسپ مجموعہ اردو خطوط کا ہیں جس کی عبارت نہایت سادہ سلیس، بے تکلف اور نہایت دلآویز ہو گئیں۔ ایک خاص قسم کی پُر لطف ظرافت اور عبارت میں گفتگو کی ہے دونوں کتابیں نثر اردو کی سادگی

وسلاست کا بہترین نمونہ ہیں مصنف کے ذاتی حالات کی طرف جا بجا ہوا اشارے
ہیں انکو شہر دل بہت غمخوڑ ہوتا ہے غالب کے طرز نے اردو کی شرنکاری میں ایک
انقلاب عظیم پیدا کیا اور ایک نئی روح پھونکی جس کا اثر زمانہ مابعد کے شرنکاروں پر بھی
بہت کچھ پڑا۔ غالب بھی اپنے زمانہ کے مروجہ رنگ سے نہ بچ سکے کیونکہ انکی اکثر تحریروں
میں وہی پرانے رنگ کی مقفہ اور مستحق عبارت پائی جاتی ہے جو ان کے زمانہ میں عام تھی
عیسائی پادریوں کی عیسائی پادریوں کی تصانیف نے بھی شرا اردو پر ایک خاص اثر
تحریروں کا اثر ڈالا ان لوگوں نے عموماً اور خاص کر ان پادریوں نے جو میرام پورہ
واقع بنگال میں قیام گزیریں نئے بائبل کا ترجمہ ملک کی دیسی زبانوں میں کر کے اُس کی
شاعت عوام اناس میں بکثرت کی۔ اس کے علاوہ صد ہا مذہبی چھوٹے چھوٹے رسالے
اور کتابیں اردو میں شائع کیں۔ ہمارا خیال ہے کہ دیسی زبان میں اخبار نویسی کی ابتدا بھی
اسی زمانہ سے ہوئی۔ سب سے قدیم ترجمہ بائبل کے جو ۸۰۵ء سے ۱۸۱۲ء تک شائع
ہوئے وہ زیادہ تر اردو ہی میں ہوئے تھے۔

سر سید اور ان کے نقلے کار شرا اردو کی ترقی کا زریں عہد انیسویں صدی عیسوی کے
نصف آخر کو سمجھنا چاہیے جس میں سر سید اور ان کی چاہت
کازریں عہد کے لوگوں نے اردو شرنکاری میں ایک خاص رنگ پیدا کیا۔ اس زمانے میں جس قدر
مذہبی مناظرے خواہ مسلمانوں کے آپس میں یا مسلمانوں اور عیسائیوں اور ہندوؤں کے
درمیان ہوتے تھے اُن سے بھی اردو کو ترقی اور ایک جملہ قسم کی تقویت حاصل ہوئی
ایسی جملہ کتابیں اور رسائل علی العموم نہایت سادہ اور پُر زور عبارت میں لکھے جاتے تھے
اور گوکہ وہ ایک عارضی اور وقتی اثر اور دلچسپی رکھتے تھے مگر پھر بھی اُس سے یہ فائدہ ضرور
ہوا کہ اردو شرنکاری میں سادگی اور پختگی پیدا ہو گئی۔ مولوی سید احمد شہید بریلوی کی مذہبی
اصلاحیں ۱۸۵۲ء لغایت ۱۸۵۳ء اور وہ مختلف فیہ مسائل جن کو وہ ملک میں پھیلانا

چاہتے تھے اُن کے اوپر متعدد درسائے اور کتابیں لکھی گئیں قرآن مجید کا سب سے پہلا ترجمہ زبان اردو میں ۱۸۰۳ء میں شائع ہوا جو اصلاحیوں کے مولوی سید احمد شہید بریلوی کے زمانہ سے شروع ہوئی تھیں اُن کی ترقی نمایاں طور پر سید احمد خاں کے ہاتھوں ہوئی جن کی متعدد تصانیف سے جو تعلیمی، اخلاقی، معاشرتی، فلسفیانہ، مذہبی، سیاسی جریدہ نگاری، غرض کہ ہر صنف و قسم کی تحریر سے تعلق رکھتی تھیں زبان اردو کو اتنا فائدہ پہنچا اور وہ اس قدر بالا مال ہوئی کہ اور کسی چیز سے نہیں ہوئی تھی۔ سر سید مرحوم ایک ایسے طرزِ تحریر کے موجد ہوئے جو جامع تھا اور جمیع اقسام مذکورہ بالا کے بخوبی کام آسکتا تھا۔ ان کی تمام تصانیف اور علی الخصوص وہ بیش بہا مضامین جو تہذیب الاخلاق اور اُس وقت کے دیگر مشہور جرائد میں چھپے ہیں ہزار ہا تعریف و توصیف کے مستحق ہیں۔

سر سید مرحوم کے رفقاء کے کار نے جن کو زبان اردو کا نور تن سمجھنا چاہیے زبان اور ادب اردو کے ساتھ احسانِ عظیم کئے اور بیش بہا خدمتیں انجام دیں مولانا حالی کی قومی نظمیں اور تنقیدی مضامین، علامہ شبلی اور مولوی ذکا اللہ کی تاریخی تصانیف، مولوی چراغ علی اور نواب محسن الملک کے اخلاقی اور پولیٹیکل مضامین، ولیمز، مولانا نذیر احمد کے اخلاقی ناول اور دیگر تصانیف جن میں ادبِ آموزی کے ساتھ ایک لطیف ظرافت کا بھی رنگ ہے، ان سب سے نہ صرف لائقِ مصنفین کے اہل قوم و مذہب ہی کو فائدہ پہونچا بلکہ وہ تمام ملک کے واسطے یکساں طور پر مفید ثابت ہوئے۔ اسی طرح مولانا محمد حسین آزاد کی جادو نگاری (جس کا ان سب سے مجید اور ایک خاص رنگ ہے) درحقیقت نہایت ہی لطیف اور دل آویز ہے۔ ان کی تصانیف کو خزانہ اردو کے بیش بہا جواہر سمجھنا چاہیے۔

تعلیم نگیزی کا اثر اردو پر انیسویں صدی کے نصفِ آخر سے انگریزی تعلیم کا نمایاں اثر چھاپنے کی ابتدا۔ اردو زبان اردو پر پڑنے لگا۔ اس سے ادبِ اردو کی وسعت اور سرکاری زبان قرار دی گئی مسلمات اور بڑھ گئی اور مختلف اصنافِ سخن اس میں داخل

ہونے لگے چھاپہ کی وجہ سے اشاعت کتب کو بہت مدد ملی، قدیم و جدید ہر قسم کی کتابیں چھپنے لگیں اور ان کی نشر و اشاعت آسان ہو گئی۔ ۱۸۳۲ء میں بجائے فارسی کے اردو کٹاری دفاتر کی زبان قرار دی گئی جس سے اس کا پائے اعتبار اور بلند ہوا اور عدالتی دفاتر کی نئی نئی اصطلاحات کے شمول سے اس کے لغات اور معلومات میں بہت کچھ اضافہ ہوا۔

ناول نویسی کی ابتدا افسانہ نویسی تاہم نئی ناول اور اخبار و جرائد کو تعلیم انگریزی کا لازمی نتیجہ سمجھنا چاہیے۔ یہ مضمون ضروری اور اہم ہے چنانچہ اس کی تفصیل آئندہ ابواب میں مناسب مقامات پر کی گئی ہے۔ زمانہ حال میں عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد جس نے زبان اردو کو فدیہ تعلیم قرار دیا ہے اور مولانا شبلی مرحوم کے دارالعلوم ندوہ کا قیام اس امر کی بین مثالیں ہیں کہ زبان کس قدر ترقی کر رہی ہے۔ نیز یہ کہ اردو کو ہندوستان کی ادبی زبان بننے کا خیر با حسن وجوہ حاصل ہو گیا۔

اردو ڈراما | یہ بالکل نئی اور مقامی چیز ہے اس وجہ سے کہ فارسی میں اس کا وجود ہی نہ تھا۔ اس صنف جدید کا ابھی بچپن ہے۔ ہنوز اس کو نچنگی اور کمال حاصل نہیں ہوا۔ ہمارے ملکی ڈراما نگاروں میں ابھی بچہ کاری نہیں آئی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے کیرکٹر نامکمل ان کے پلاٹ اکثر قص اور ناتمام ہوتے ہیں، ان کی تحریروں میں صحت لفاظی اور سطحی باتیں ہوتی ہیں شکیبہ اور دیگر یورپی جادو نگاروں کے ڈراما البتہ ترجمہ ہو گئے ہیں اور ہندوستانی اسٹیج کے حسب حال ان میں تغیر و تبدل بھی ہو گیا ہے۔ اردو ڈراما نویسی کے سامنے ایک درختان مستقبل ضرور ہے۔

— — — — —

باب ۳

اردو شاعری کی عام خصوصیات

اردو شاعری فارسی | اردو شاعری ویسی پیداوار نہیں ہے وہ فارسی سے پیدا ہوئی اور فارسی کی مقلد ہے | فارسی کے نمونے اس کے پیش نظر تھے۔ فارسی علم عروض نے جو عربوں کی ایجاد تھا۔ اردو شاعری پر بہت بڑا اثر کیا۔ اسی طرح فارسی بحور اور قواعد عروض میں بھی فارسی کا اتباع کیا گیا۔ رفتہ رفتہ یہ غیر ملکی پودھا چڑھ کر پکڑ گیا اور اس کو اس ملک کی آب و ہوا اس آئی۔ بحروں کے علاوہ شعرائے اردو نے فارسی ہی کی تشبیہیں اور وہی مضامین اخذ کئے اور یہ سب چیزیں بلا لحاظ ملکی ضروریات کے اور بلا امتیاز اس کے کہ اردو زبان کی اصل کیا تھی اور اس میں استعداد کس قدر تھی داخل زبان ہو گئیں اور ہمارے شعرائے اردو کا نایہ بساط بن گئیں۔ اس نتیجے میں فائدہ اور نقصان دونوں مضمر تھے نقصان یہ کہ اردو شاعری کو وہ مدارج ارتقا طے کرنا نہیں پڑے جن کی رفتار تو ضرور سست تھی مگر ایک نئی زبان کی ترقی کے واسطے وہ از بس ضروری تھے۔ مثال کے لیے انگریزی شاعری کو دیکھو کہ جس نے یہ منازل ارتقا بتدریج طے کر کے معراج ترقی حاصل کی اردو میں اسی کمی کی وجہ سے وہی پرانی فرسودہ باتیں اور وہی مضامین جو فارسی شاعری میں بکثرت پائے جلتے تھے اور جن کو کوئی تعلق اس ملک سے نہ تھا دفعتاً نگ بنیاد بن گئے شروع میں تو اکثر اردو اشعار فارسی اشعار کا فظی ترجمہ ہوتے تھے اور اب بھی ہمارے شعرا صائب حلق نظیری اور سیدل وغیرہ کی تقلید کو اپنا فخر سمجھتے ہیں۔ تقلید کے برے نتائج | اس جرعیانہ جذب اور گویا نہ تقلید سے یہ بڑا نتیجہ پیدا ہوا کہ اردو شاعری سے اصیلت مفقود ہو گئی اور بے اوقات ابتذال پیدا ہو گیا۔ سر زمین

ہندوستان ان مضامین سے نا آشنا ہے۔ لیلیٰ مجنوں کا عشق، شیریں فرہاد کی محبت، رستم
 و اسفندیار کی بہادری، مانی و بہزاد کی نقاشی، جیمون و سیحون کی طغیانی، بستیون اور الوند
 کی بلندی وغیرہ یا جانوروں میں بلبل، درختوں میں سنبل وغیرہ سب غیر ملکی چیزیں ہیں
 جن کو یہاں کے لوگوں نے کبھی دیکھا بھی نہیں۔ اسی تتبع کی وجہ سے شاعری واقفیت سے
 اردو شاعری محض نقالی ہے | بہت گرصرت نقالی رہ گئی۔ ہندوستانی بادشاہوں کے عدل
 کی جب تعریف کی جاتی ہے تو ان کا مقابلہ نو شیراں سے کیا جاتا ہے سخاوت میں حاتم
 بتائے جاتے ہیں حراماں نصیب عاشقوں کی مثال کے واسطے سوائے مجنوں کے کوئی
 نہیں ملتا اور ان کی مشوقہ ہمیشہ لیلیٰ ہوتی ہے ایک حسین آدمی کی تعریف یہی ہو سکتی ہے
 کہ وہ یوسف کی طرح ماہ کنعاں ہو۔ اور معشوق کے سخت احکام کی تعمیل کرنے والا کو لیکن
 خطاب پاتا ہے۔ قد کی تشبیہ کے لیے سرو و شمشاد آنکھوں کے واسطے زگس، زلف کے
 لیے سنبل۔ سیرجی اور سفاکی کے لیے ترک، گل کی عاشق بلبل، سرو کی دلدادہ فاخستہ
 باد صبا کی اٹھیلیاں، چاند کو دیکھ کر کتاں کا پارہ پارہ ہونا یہ سب فارسی سرمایہ اردو کے
 واسطے مخصوص بلکہ اسکی ملک ہو گیا اور انکی وہ بھر مار ہوئی کہ شاعری اپنی اصلیت کو بھول گئی
 اُسکو اپنے ملک کی تشبیہات سے نفرت پیدا ہو گئی اور اپنے وطن کی حسین سے حسین
 چیزوں کی قدر کرنے کا احساس تک اُس سے فنا ہو گیا۔ مثلاً ہندوستان کی بہار اس کا
 موسم برسات ہے مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہماری اردو شاعری میں اس کے
 صحیح اور دلکش مناظر کا کہیں پتہ نہیں، ایسہ ہی..... ہندوستان کا موسم گرا، موسم بہار
 ہمالیہ کی سر بفلک برف زار چوٹیاں، گنگا اور جمنہ کے خوبصورت گھاٹ، ان کا ہمارے
 قدیم شاعروں نے کوئی خیال نہیں کیا۔ زبان بھاشا کی خوبصورتی اور شیرینی کو دوسری
 زبان کی دلفریبیوں پر قربان کر دیا۔ مختصر یہ کہ اردو شاعری نے فارسی شاعری کی تقلید
 آنکھ بند کر کے جزیات تک میں کی سرچارلس لائل اسی تقلید کی نسبت لکھتے ہیں

اُردو شاعری فارسی شاعری کا کامل اتباع کرتی ہے اور وہی مضمون بار بار دہراتی ہے جن کو خود اساتذہ فارس نے بار بار یا مال کیا ہے مضامین اور الفاظ دونوں ابتدا سے آج تک جیسے تھے ویسے ہیں۔ اُن میں کوئی جدت یا اصلیت نہیں پائی جاتی اور اسی کمی کی وجہ سے انکو ایک نہایت محترم با نشان اور مستقل علم معنی و بیان کی بنیاد رکھنا پڑی۔ جبکہ کوئی چیز جو کسی شاعر کو کہنا ہو اور اُس کو اُس سے پیشتر سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں کہ گئے ہوں تو ظاہر ہے کہ اُس کے واسطے یہ بہت ضروری ہے کہ اُس چیز کے کہنے کا اپنے واسطے ایک خاص اسلوب مقرر کرے۔ پس یہی اسلوب یا بہ الفاظ دیگر علم معنی و بیان نہ کہ جذبات شعر اُردو شاعری کا مایہ ناز ہو گئے۔ اسی وجہ سے نہایت دلچسپ دلچسپ مبالغے نئی نئی بندشیں اور ترکیبیں، صنعت تضاد اور اسی قبیل سے دیگر صنائع و بدائع اُردو شاعری کی روح رواں بن گئیں۔

اُردو شاعری صرف رسمی رہ گئی | اُردو شاعری میں نہ صرف تکلفات ظاہری ہی کی کثرت ہے بلکہ وہ محض رسمی اور لکیر کی فقیر ہے۔ وہی استعارے وہی تشبیہیں جو بار بار لکھی جا چکی ہیں پھر دہرائی جاتی ہیں۔ آئینہ نظرت کے مشاہدہ کا اس میں کہیں پتہ نہیں اسید وجہ سے مضامین میں کسی قسم کی تازگی نہیں اور نہ کوئی نیا پیغام ہوتا ہے پرانے شعر کی کشاکشیں مضامین کی تلاش میں بار بار ڈھونڈھی جاتی ہیں۔ اور مقررہ قواعد کے بموجب پھر انھیں باتوں کا اعادہ کیا جاتا ہے، شاعری محض نئی تلی چیز ہو گئی نہ کبھی کم ہوتی ہے نہ زیادہ ہر شاعر اپنے کلام میں اُسی آموختہ کو رٹتا ہے اور اسی وجہ سے اُردو شاعری کا بازار تصنیفات اور بے مزگی سے بھر ا ہوا ہے۔

قافیہ بیانی | فارسی کی تتبع میں اُردو میں بھی لکیر قافیہ اور بعض اوقات دو قافیوں کی پابندی لازمی ہے۔ قافیہ گو کہ کانوں کو اچھا معلوم ہوتا ہے مگر اظہار خیال میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ اسی وجہ سے مدت ہوئی کیلورپ کی شاعری اس بارگراں سے سبکدوشی

حاصل کر کے آزاد ہو گئی۔ بسا اوقات یہ ہوتا ہے کہ قافیہ پہلے ذہن میں آتا ہے جو مضمون کی طرف رہبری کرتا ہے حالانکہ ہونا یہ چاہیے کہ مضمون خود قافیہ پیدا کرے غرضکہ انھیں قیود سے اردو شعرا کے تمام دواویں بھرے پڑے ہیں اب اس بدزنگی کا احساس خود ہمارے شعرا کو پیدا ہو چلا ہے۔

خلافت نیچر مضامین | علاوہ نقائص مذکورہ بالا کے سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اردو شاعری میں اکثر مضامین فطرت کے خلاف ہاندھے جاتے ہیں مثلاً مرد عاشق مرد کے ساتھ جس کے لیے کوئی معقول وجہ یا عذر بھی نہیں پیش کیا جاتا۔ ایک لڑکے کو معشوق تصور کر کے اُس کے گھونگروالے بال اس کی زلفیں اس کا سبزہ خط اس کی بھیگی سیس اُس کے خدو خال اس لطف سے بیان کیے جاتے ہیں کہ جس کی تہذیب حال کبھی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اس رنگ کو ہمارے قدیم شعرا نے شروع کیا جس کا نتیجہ آج تک کیا جاتا ہے۔ ہمارے خیال میں تہذیب اور متانت کے اعتبار سے بھاشا کو اردو پر اس معاملہ میں فوقیت حاصل ہے۔ بھاشا میں شاعر اپنے کلام میں عشق اس طرح ظاہر کرتا ہے جیسے ایک عورت اپنے شوہر یا عاشق کے فراق میں گریہ کرتی ہے یا جیسے اُس کا خیالی معشوق اُس کے جذبات کا احترام نہیں کرتا۔ برخلاف اُس کے ہمارے اردو شعرا بسا اوقات عشق کا اظہار اپنے ہمجنس کے لیے کرتے ہیں سی اختلاف کی وجہ سے بھاشا کی شاعری حقیقی اور موافق فطرت ہے اور دل میں گھر کرتی ہے اور خیالات میں بلندی اور رفعت پیدا کرتی ہے۔ بخلاف اس کے اردو کے اکثر عاشقانہ اشعار میں زنانہ بازی کے محسن و دلفریبی کا ذکر ہوتا ہے جس سے خیالات میں پستی اور عبارت میں ابتذال پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہی ایک چیز اس امر کے ثبوت کیلئے کافی ہے کہ اردو شاعری فارسی کی سراسر پیروی ہے یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری اور زبان کو پھیلنے اور ترقی کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ یہ وجہ بھی ہوئی کہ لوگوں نے

اُردو شاعری کو محض تفنن طبع سمجھا اور جب کبھی فارسی شعر گوئی سے اُن کو فرصت ہوئی تو
تھوڑا سا وقت دل بہلانے کے لیے اس میں بھی صرف کر دیا۔ بڑی قباحت یہ ہوئی کہ
وہ لوگ عموماً ہندی اور سنسکرت سے ناواقف تھے جس کی وجہ سے وہ ان دونوں زبانوں
کی برکتوں سے مفتاح نہ ہو سکے۔ فارسی چونکہ سرکاری اور دیوباری زبان تھی اور اُس وقت
کے بڑے بڑے رئیس و امیر و عالم و فاضل اور شاعر سب اسی کو پسند کرتے تھے اور یہی
زبان رائج تھی لہذا قدرتی طور پر ہندی الفاظ اس کے مقابلہ میں اُن کو بھتے سے اور اجنبی
معلوم ہوئے اور اسی وجہ سے وہ ترک کر دیے گئے۔ ہمارے ذہن میں فارسی شمع کی
بڑی وہمیں صرف دو ہو سکتی ہیں ایک یہ کہ زبان فارسی کا بازار اُس وقت گرم تھا دوسرے یہ
کہ وہ لوگ سنسکرت اور بھاشا سے ناواقف تھے انھیں وجہ سے زمانہ قدیم میں اُردو کی
بے قدری تھی چنانچہ متقدمین اساتذہ اُردو سب فارسی گو شاعر تھے یہاں تک کہ مرزا غالب
بھی فارسی کے مقابلہ میں اپنے اُردو کلام کو بیچ سمجھتے ہیں اور فرماتے ہیں ۵

فارسی ہیں تابستنی نقشہاے رنگ رنگ | بگذرانہ مجموعہ اُردو کہ بیرنگ من است

گزشتہ زمانہ کے عربوں میں یہ دستور تھا کہ عاشق اپنی معشوقہ کو بنت العم کے خطاب
سے یاد کرتا تھا اور اپنے عشقیہ اشعار اُس کی شان میں نظم کرتا تھا اور بالآخر اسی کے ساتھ اس
کا عقد ہو جاتا تھا۔ اس رسم کا ایک بڑا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض اوقات معشوقہ کا نام ظاہر ہو جانے
سے جھگڑا اور فساد برپا ہوا اور کبھی کبھی سخت دھن تک نوبت پہنچی، لہذا اس خرابی کے دور
کرنے کے لیے محض فرضی اور خیالی عورتوں کے نام تجویز کیے گئے۔ پردہ کے ردائے
عورتوں کے کلم کھلا نام لینے کو ممنوع قرار دیا۔ جس کی وجہ سے یا تو اُن کے واسطے کسی مشہور
معشوقہ سلف کا نام لیا جانے لگا اور یا وہ صیغہ تذکر کے ساتھ یاد کی جانے لگیں۔ فارسی
میں صیغہ تذکر و تانیث میں غرق نہ تھا اسی وجہ سے شاید یہ صورت اختیار ہوئی۔ یہ
عذر بار و فارسی میں جہاں تذکر و تانیث کا کوئی امتیاز نہیں ہے مقبول ہو سکتا ہے

مگر اردو میں جس میں کہ افعال و اسما سب میں تذکیر و تانیث کی تفریق موجود ہے اور پورا لحاظ رکھا جاتا ہے یہ عندئنگ قبول نہیں کیا جاسکتا۔ دنیا کے ہر ملک کا ادب وہاں کی سوسائٹی کے اخلاق کا آئینہ ہوتا ہے۔ یعنی سوسائٹی کی اخلاقی خرابیاں کسی ملک کے ادب سے بخوبی ظاہر ہوتی ہیں۔ ان سب باتوں کے جواب میں عند پیش کیا جاسکتا ہے کہ اگرچہ بظاہر تذکیر کے صیغے استعمال کیے جاتے ہیں مگر حقیقتاً ان سے مراد وہی فرستہ اناث ہوتا ہے جس میں حقیقی مشوقہ بننے کی قابلیت موجود ہے مگر سچ پوچھے تو تہذیبی و اخلاقی نقطہ نظر سے یہ جو لب بھی ٹھیک نہیں ہے اس لیے کہ پردہ کی وجہ سے شریف عورتیں سامنے نہیں آسکتیں پس لامحالہ جس جن کا ذکر ہو گا وہ بازاری عورتوں کا شمار کیا جائے گا۔

اصناف سخن | اردو شاعری میں اصناف ذیل پر طبع انسانی کی جلتی ہے :-

غزل، قصیدہ، رباعی، قطعہ، مثنوی، مرثیہ وغیرہ۔

غزل اور اس کا رنگ | ان میں سب سے مشہور صنف شاعری غزل ہے جس کا رنگ زیادہ تر عاشقانہ یا صوفیانہ ہوتا ہے۔ اساتذہ متقدمین کے کلام میں تصوف کا رنگ سب رنگوں پر غالب تھا قرون وسطیٰ میں مذہبی بیداری کی ایک تمام ہندوستان میں دوڑ لگی تھی۔ بھگتی کا عقیدہ اور رام و کرشن کے دیویات جنہوں نے ادب ہندی پر بہت بڑا اثر ڈالا اسی مذہبی بیداری کے علامات ہیں۔

تصوف | تمام قدیمی شعرائے اردو صوفی تھے اور ان بزرگوں کی اولاد میں نئے جو مجاہدین اسلام کی فوجوں کے ہمراہ خود آئے تھے یا اس زمانہ کے چند روز بعد ہندوستان میں داخل ہوئے۔ ان میں مذاق تصوف اُن کے اسلاف سے ورثاً چلا آتا تھا۔ اور لوگ ان کی تعظیم و تکریم کرتے تھے چنانچہ اردو کا سب سے پہلا شاعر ملی دکنی ایک بہت بڑا صوفی تھا اور دکنی کے ایک مشہور بزرگ شاہ سعد اللہ گلشن کے حلقہ ارادت میں داخل تھا اسی طرح شاہ مبارک آبرو شاہ محمد غوث گوالیاری کی اولاد میں تھے جو ہندوستان میں

ایک بہت مقدس بزرگ گزہ سے ہیں۔ شیخ شرف الدین مضمون گو ایک سپاہی پیشہ شخص تھے مگر آخر میں دنیا چھوڑ کر فقیر ہو گئے تھے۔ شاہ حاتم اور مرزا مظہر جان جاناں بھی مشہور صوفیائے کرلم تھے گزہ سے ہیں خواجہ میر درد جو کہ خواجہ بہاؤ الدین نقشبند کی اولاد میں تھے علاوہ شاعری کے دولت فقر سے بھی بالمال تھے۔ ان کے علاوہ مشہور پہلوانان سخن تیسرے۔ سودا اور اسی طرح ان کے محصوروں کے کلام میں بھی تصوف کا رنگ نمایاں ہے۔ فارسی شاعری چونکہ مضامین تصوف سے ملو تھی لہذا یہ بہت قدرتی بات تھی کہ اردو نے بنجملہ مادہ چیزوں کے اس میں بھی اُس کی پیروی کی۔ تفتیس، ریاضت نفس ترک ماسوی اللہ دنیاوی نمائش اور یہاں گدھی سے اجتناب، تعیش اور حصول دولت و اقتدار سے بیزاری کہ ان چیزوں کے لیے اہل دنیا ساعی رہتے ہیں عزت گزینی اور اپنی ہستی کو عبادت الہی کے لیے وقف کر دینا۔ ان کو تصوف کا بنیادی اصول سمجھنا چاہیے شعرائے صوفیہ حسن مجازی کی تشریف اس لئے کرتے ہیں کہ وہ اُس کو حسن حقیقی کا زمینہ سمجھتے ہیں اور عشق حقیقی کا ذوق لوگوں کے دلوں میں پیدا کرنے کے واسطے انھیں ظاہری نقوش و علامات سے کام لیتے ہیں۔ اُن کا مقولہ ہے۔

متاب از عشق دو گر چہ مجازی است | کہ آں بہر حقیقت کا مسازی است

ایران اور ہندوستان کی عاشقانہ شاعری میں روحانی اور شہوانی جذبات کی عجیب آمیزش انھیں نکات تصوف کی بدولت ہے۔

عاشقانہ اغزل میں عاشقانہ رنگ کی بنیاد تصوف اور اہل دربار کی عیش پرستی اور فارسی شاعری کے تہ پر پڑی۔ غزل اردو شاعری کی جان ہے۔ انگریزی میں اگر اُس کے مقابل کوئی چیز ہے تو سائنٹس ہے۔ غزل کے لغوی معنی عورتوں سے باتیں کرنا ہیں غزل میں چند اشعار ہوتے ہیں اور ہر شعر بہ اعتبار مطلب کے مکمل ہوتا ہے یہی چیز غزل اور سائنٹس میں بابہ الاتیاز ہے یعنی غزل میں ہر شعر بجائے خود مکمل اور ایک دوسرے سے

بے نیاز چھٹا ہے اور سائنٹ میں سب اشعار مرطوط و مسلسل کسی ایک مضمون پر مرتب ہیں۔
 اصناف شاعری میں سب سے سہل اور اسی وجہ سے سب سے زیادہ برتے جانے والی
 چیز غزل ہے۔ غزل میں تسلسل کا لحاظ کم رکھا جاتا ہے۔ مضامین غزل محدود ہیں اور اسی وجہ
 سے شاعر کو ایک شعر پر اپنی پوری قوت صرف کر کے طبع آزمائی کا موقع ملتا ہے اگرچہ لحاظ
 مضامین تنوع بھی ہوتا ہے۔ جن مضامین میں غزلیں عام طور پر کہی جاتی ہیں وہ
 حسب ذیل ہیں:۔ عاشق کی حرمیاں، نصیبی، وصل کی جستجو، معشوق کے جور و جفا، گل و بلبل کے
 راز و نیاز، وحشت و جنون، عشق کی بلا، انگیزی، معشوق کے سراپا کی تعریف، باغ و بہار
 کے مناظر، بادہ کفہام کی تعریف و طلب، رقیبوں کے شکوے، عاشقانہ شاعری دنیا
 کی تمام ادبی تصانیف میں موجود ہے کیونکہ عشق ایک فطری جذبہ ہے جس کا اظہار ہر زبان
 سے ہوتا ہے قصوف حسن مجازی کو عشق حقیقی کی اول منزل سمجھتا ہے جیسا کہ چند سطر میں
 پیشتر بیان کیا گیا۔

اہل دربار کا اثر اردو شاعری اہل دربار میں ہمیشہ مرغوب اور ہر دلعزیز رہی اور اہل
 اردو شاعری پر اور رؤسا کے درباروں میں اسکی ترقی اور نشو و نما ہوئی۔ دلی، جیندا
 گھنٹو اور دام پور شاعری کے مرکز رہے ہیں اور یہیں کے فرمانرواؤں نے اردو شاعری
 کو پروان چڑھایا۔ گو درباری اثر شاعری پر دو حیثیت یعنی نفع اور نقصان کی صورت
 میں مترتب ہوا۔ نفع اس معنی میں کہ شعرا کو ان کی جانکاحی کے صلہ میں نعام
 و اکرام خوب دیا گیا اور ان کی محنت ٹھکانے لگی۔ نقصان اس صورت میں کہ مضامین
 شاعری محدود ہو کر رہ گئے کیونکہ شعر گو رئیس و اہل دربار کے مذاق کی پیروی کو ناپٹری۔ دلی
 اور کھنڈ کی سلطنت کا وسط جاننا اردو شاعری کے زوال یا کم از کم اس کے ضعف کا خاص باعث
 ہوا۔ عاشقانہ رنگ فرما کر وایان اودھ کے دربار میں خصوصیت کے ساتھ مقبول
 تھا۔ اس وجہ سے کہ ان لوگوں کے دلوں میں خود تعیش کے جذبات موجود تھے۔

اس لئے کوئی تعجب نہیں اگر اس زمانہ کے شاعروں کے کلام کا بیشتر حصہ اس رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ قہائد اور غزل دونوں بکثرت کہے جاتے تھے ایک میں کسی نواب یا وزیر کی تعریف تو دوسرے میں کسی اصلی یا فرضی معشوق کا ذکر ہوتا تھا۔ چونکہ ان لوگوں کو خوش کر کے شعراء کو اپنی کار بر آوری کرنا ہوتی تھی اسی لیے وہ ان دونوں رنگوں میں مشغول رہتے تھے۔ انگریزی شاعر اسکات کے یہ دونوں شعر اسی حالت کا ایک نقشہ پیش کرتے ہیں ۵

اپنے رنگ عیش و عشرت کے لیے سب بادشاہ	شاعران نکتہ رس سے لیتے ہیں محنت دمام
تھوڑی سی آنکھ کے لالچ میں یہ کرتے ہیں مدح	لیکن اپنی روح کو کر لیتے ہیں پابند دمام

اسی درباری وابستگی اور ہم آہنگی کا یہ برا نتیجہ ہوا کہ ہماری اردو شاعری سے وہ تنوع و پُرکاری و وسعت، اور جدت مفقود ہو گئی جو دنیا کے شاعری کی جان ہے۔

دیباچہ اور قدرتی مناظر کی	اردو شاعری کا دائرہ محدود ہے قدرتی مناظر جو شعراء مغرب
اردو شاعری میں کمی	کے دلوں میں عجب عجب امنگیں پیدا کرتے ہیں ہمارے اردو

شاعروں پر وہ اثر نہیں کرتا۔ اردو میں برائے نام، بوٹیرہ اور ٹامس کی طرح کے شعراء کا پتہ نہیں اور نہ در دسور تھ کا ایسا کوئی نیچر کا عاشق ہے۔ اردو شاعری میں اصلی قدرتی

۱۵۔ سمرالٹر اسکات گزشتہ صدی کا نہایت نامور انگریزی شاعر اور نامست گزرا ہے اس کے اکثر ناول اور نظمیں داخل دوس ہیں اور ان کا ترجمہ بھی مختلف زبانوں میں ہو گیا ہے۔ اسکی نیچرل بیانیہ شاعری فہمان اگر فرم میں بہت پسند کی جاتی ہے۔ اسکے وطن اہلی یعنی اسکات لینڈ میں اسکی قدر شہرت اور قدر ہے کہ وہاں کے بڑے بڑے شہروں میں اس کے کسی ناول یا کیریکٹر کے نام سے کوئی چیز بطور یادگار منسوب ہے ۱۶۔ ٹیوٹ امریکہ کا شاعر اخبار نویس تھا اکثر مشہور اخباروں اور رسالوں کا ایڈیٹر رہا جو امریکی ایڈیٹر اور ایڈیسی کا منظوم ترجمہ اس نے کیلئے ۱۷۔ بوٹیرہ بھی امریکن شاعر اور جریدہ نگار ہے اس کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اپنی پسند و نفیوں کے ذریعہ سے اعلیٰ و غلامی میں بڑی مدد کی چنانچہ اسکو دہاں اعلیٰ و غلامی کا ملک الشعراء کہتے ہیں۔ ۱۸۔ اس (۱۸۰۲ء) (بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۵)

مناظر مثلاً ہوتا ہو اور یا الہاماتے کھیت۔ گاتی ہوئی چڑیاں۔ اس قسم کی چیزوں کا ذکر بہت کم ہوتا ہے گو کہ مصنوعی اور فرضی مناظر باغوں چشموں بلبل و گل، قمری دسرو وغیرہ کا ذکر کثرت سے ہے۔ شعرا کے اردو کے سرود میں صرف ایک ہی تار ہے اور وہی بار بار بجایا جاتا ہے یہاں تک کہ بے سُر ہو جاتا ہے۔ سمند کی نظیں آزادی کے راگ، حسن کی صبح تصویریں، اردو شاعری میں نہیں ہیں یا مال مضامین جن کو بادشاہ اور اہل دیار پسند کرتے تھے مثلاً شراب و گباب رقیبوں کے شکوہ و شکایات، عاشقوں کی حراماں نصیبی فلک کے جو رستم، تقدیر کی گردنیں بکثرت ہیں۔ البتہ تھوڑے دنوں سے جب سے کہ انگریزی تہذیب و تعلیم کا چرچا پھیلا نیچرل مضامین پر بھی طبع آزمائی کی جانے لگی اور

انگلستان کا خوشو نیچرل شاعر ہے اس کا مجموعہ نظم موسوم بیزنس (بوسم) مشہور ہے جس میں رستان تبتان ہمارے خزاں چاروں فصلوں کا حال نہایت شاعرانہ پیرایہ میں دکھایا ہے۔ چند ڈرامے بھی لکھے مگر وہ مقبول نہیں ہوئے اس کی دیگر تصانیف میں رول بر طائرہ اد کیسل آف انڈولینس بہت مشہور ہیں۔ ۱۸۵۷ء ویم درڈسور تھ (۱۸۵۷ء) نہایت مقبول انگریزی شاعر ہے اس کا اُن لوگوں میں شمار ہے جن کو زبان انگریزی میں "لیک پولیٹ" یعنی پھیل کے شعرا کہتے ہیں اس وجہ سے کہ وہ ڈسور تھ اور اس کی بہن ڈارڈسور تھ اور کورج وغیرہ ایک ایسے مقام پر رہتے تھے جس کا نام گوامیر ہے اور جو اپنے نام کی ایک جھیل کے پاس واقع ہے۔ درڈسور تھ کو انقلاب فرانس کے زمانہ میں آزادی پسند جماعت سے جو تباہی اُنڈسٹ کلاتے تھے بہت بھردی تھی مگر جب نپولین نے اصول جمہوریت کو توڑ کر جبر و استبداد شروع کیا تو اس کی بھردی اُس جماعت سے بالکل منقطع ہو گئی۔ درڈسور تھ کی تصانیف کثرت سے ہیں منجملہ جن کے اُس کی فلسفیانہ نظم رکلوں (راہب) بڑی اعلیٰ پیمانہ کی ہے اُس کے علاوہ امیکرشن (گلشن) اوڈ ٹو ڈیوٹی و غزل برفرائض انسانی، وڈ آئنڈی ٹیمپشن آف آمارٹلی (ازل کی یاد) وغیرہ حال کی انگریزی شاعری میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔ کورج کا قول ہے کہ درڈسور تھ نے خاص کام یہ کیا کہ دنیا کی معمولی چیزوں کو ایک فلسفی شاعر کی نظر سے دیکھا اور اُن میں وہ وہ باتیں پیدا کیں جو ہر شخص کو نہیں سوجھتیں، دوسری بڑی خصوصیت اس کی یہ ہے کہ وہ عالم نباتات میں ایک روح کا قائل تھا اور ان کو ذی حیات تصور کرتا تھا۔ درڈسور تھ علاوہ شاعری کے فن تنقید کا بھی اُستاد تھا۔ سو دے کے بعد خطاب ملک الشعرا اسی کو ملتا تھا۔

اُن کی مقبولیت سے اُمید ہے کہ اس صنف جدید میں بہت جلد ترقی ہوگی۔

اُردو شاعری حزن ریاس | کل مشرقی شاعری جس میں اُردو کی شاعری بھی داخل ہے حزن و
کی شاعری ہے | یاس کے مضامین سے ملو ہے ایک یوہین نقاد کی رائے ہے

کہ اہل مشرق اپنی طبیعت کی اقتاد سے افسردہ خاطر پر اسرار سوچ، پچار میں وقت
گزراہ نے والے اور تقدیر کے قابل واقع ہوئے ہیں۔ دنیا ئے عمل میں وہ بہت کم حصہ لیتے
ہیں ان کی زندگی میں زیادہ تر حزن و یاس درماندگی و پچار کی زندگی سے تنفر و نیا کی
بے ثباتی کا ہر دم تصور دنیاوی ترقی اور مرفہ الحالی سے اجتناب شامل ہے اسی دنیا کی
بیزاری کی وجہ سے وہ اکثر اوقات باوجود اپنے ارادوں کے بھی مذہب اور تصوف کی
طرف کھینچ جاتے ہیں۔ بارگاہ ایزدی میں گمراہی اگر دعائیں مانگنا تقدیر سے مقابلہ
کرنے کو بیکار سمجھنا انسانی قوت ارادی کو بالکل معطل دیکھنا زمانہ اور آسمان کی شکوہ
و شکایات یہ سب باتیں اہل مشرق کے دگ و پے میں سراپت کیے ہوئے ہیں۔ علاوہ
مذکورہ بالا باتوں کے جو تمام مشرقی مصنفین کے یہاں بالعموم پائی جاتی ہیں، ہندوستان میں
اس پابندی قسمت اور مجبوری کا ایک اور بھی سبب ہے جو ان کی فطری حزن و یاس
کے رنگ کو اور گہرا کر دیتا ہے اور وہ یہ ہے کہ انیسویں صدی کے شروع میں مسلمانوں کا
اختر سعادت و اقبال غروب ہو گیا اور ان کی گزشتہ عظمت و جبروت کے واقعات
خواب و خیال ہو گئے اُردو میں خوشی اور مسرت کے نغمہ سرائی کرنے والے مثل براؤننگ

لے رابرٹ براؤننگ (۱۸۱۲ء تا ۱۸۸۹ء) اُردو و گورکھ کا نہایت نامور شاعر تھا۔ انیسویں صدی کے کون
و کٹھیر کے عہد میں جس کو انگریزی شاعری کا دورِ متاخرین بلکہ آخری دور کہنا چاہیے تین نامور شاعر گزرے
ہیں اور دوسرے تین ادر براؤننگ اور ان تینوں کا انداز بیان ایک دوسرے سے الگ ہے
براؤننگ کے یہاں روحانیت کا عنصر غالب ہے مضامین نہایت بلند خیالات نہایت پاکیزہ گو عبارت
میں کسی تقدیر سچیدگی ہوتی ہے جیسے فارسی میں نرزا بیدل کے کلام میں ایک قابل ذکر بات اس میں یہ تھی کہ
(بقیہ صفحہ ۴۷ پر)

بہت کم ہیں مگر کہا جاسکتا ہے کہ اسی یا یوسی اور عبوری کی وجہ سے شرتی شعراء کے کلام میں ایک خاص قسم کا رد و اثر پیدا ہو گیا ہے جس کی وجہ سے ان کا کلام مقبول خاص و عام ہے۔
قصائد اقصائد نویسی میں بڑے بڑے اساتذہ فارس مثلاً انوری و خاقانی، عرقی و قاتانی اور خطیر فارابی وغیرہ کی پیروی کی گئی۔ اردو کے مشہور قصیدہ گو سودا و ذوق اور امیر غفر ہیں قصیدہ کے انداز میں بھی فارسی کا تتبع کیا جاتا ہے چنانچہ اسی وجہ سے اُس میں شکوہ الفاظ اور غلو و مضامین کا زیادہ خیال کیا جاتا ہے۔ وہی فارسی ترکیبیں اور استعارے تشبیہیں، مبالغہ وغیرہ عام طریقہ سے برتے جاتے ہیں چونکہ قصیدہ کسی خاص شخص کی تعریف میں کہا جاتا ہے لہذا مدوح کی صفات کو نہایت مبالغہ کے ساتھ ہر ممکن طریقہ سے بیان کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض قصائد بہ لحاظ مضمون و زبان اپنا جواب نہیں رکھتے۔ مشکل بکھرے سخت قوافی قصیدہ گو کی قابلیت پر دال ہوتے ہیں۔ اکثر قصائد صنائع و بدائع سے بھرے ہوئے ہیں۔

ثنوی شعراء اردو میں یہ صنف بہت مقبول رہی ہے اس میں بھی بحروں اور فارسی قواعد و قوافی وغیرہ کی پابندی کی جاتی ہے کہا جاتا ہے کہ انگریزی شاعری میں جو دو مشہور صنفیں معروف ہیں ایک اور ڈراما ہیں اردو میں صنف ثنوی ان کا جواب ہے مگر ہماری رائے میں ثنوی اور اصناف مذکورہ میں فرق ہے اردو کے مشہور ثنوی نویس میر میر حسن۔ مومن خاں نسیم۔ قلیق نواب مرزا شوق اور شوق قدوائی ہیں اور سب کے زیادہ

اس کی میری بھی نہایت مشہور اور صاحب تصنیف شاعرہ تھی۔ تمام قوموں میں دستور ہے کہ ہر شعر ایک دوسرے کے کلام کے متعلق مذاق و طنز آمیز باتیں کرتے ہیں چنانچہ براہ و رنگ کی مشہور کتاب سارڈو جب نکلی تو اُس کے دوست ٹھہر گئے دیکھ کر کہا کہ میں اُس کے صرف دو شعر سب کا بھول لیٹی پہلا اور آخری اور وہ بھی صحیح نہیں ہیں اور کادلائل نے جب یہ کتاب اپنی بیوی کی زبان سے سنی تو کہا کہ کچھ میں نہیں آتا کہ سارڈو کسی آدمی کا نام ہے یا کسی شہر کا یا کتاب کا ۱۲

مشہور مثنویاں سحر البیان اور گلزار نسیم سمجھی جاتی ہیں۔ وہی یورپین نقاد مثنوی کے بارہ میں یوں رقمطراز ہے۔ "مثنوی یا بیانہ نظموں میں بھی نفس قصہ دوسرے درجہ پر اور الفاظ کے ماتحت ہوتا ہے اکثر صورتوں میں قصہ کی روش ایک ہی ہوتی ہے اور پڑھنے والا اسکے جزئیات تک سے واقف ہوتا ہے ہر چند کہ اشخاص کے نام بدل دیے جاتے ہیں مگر اصل قصہ پُرانا ہوتا ہے۔ جدت صرف وہیں ہوتی ہے جہاں ختم قصہ کے قریب قشائے راز ہوتا ہے۔ واقعات جو ایک محدود دائرہ میں بیان کیے جاتے ہیں بد مزگی کے ساتھ بار بار دہرائے جاتے ہیں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اردو میں ڈراما کی کمی کو مثنوی پورا کرتی ہے مگر حق یہ ہے کہ جو لوگ ڈراما کے فن سے واقف ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ مثنوی اور ڈراما میں زمین آسمان کا فرق ہے اسوجہ سے مثنوی میں نہ تو کٹر ٹوہنیسی ہے نہ پلاٹ قائم کیا جاتا ہے عمدہ مواقع جو ڈراما میں پیدا کیے جاتے ہیں ان کا مثنوی میں کہیں پتہ نہیں اور نہ وہ دلچسپ مکالمے ہیں جو ڈراما کی جان ہیں۔ واقعات کی حرکت نہایت آہستہ اور عمل معدوم ہوتا ہے اردو مثنویاں محض رسمی اور قواعد قدیمہ کی پابند ہیں۔ شاہنازہ فریدی اور مسکنہ زنا نے نظامی کی ان کو ہوا بھی نہیں لگی۔ البتہ جیسا کہ بیان کیا گیا مثنوی میر حسن اور گلزار نسیم بہ اعتبار فصاحت و بلاغت روانی اور سلاست چستی بندش وغیرہ کے بے نظیر ہیں۔

مراثی امراتی ادب اردو کی ایک نمایاں صنف ہے ان میں مناظر خوب خوب کھلے جاتے ہیں۔ ہر چند کہ پیردی فطرت پوری طرح نہیں کی جاتی پھر بھی مرکز کارزار مبارزین کی جانبازی صبح اور شام کا سماں جنگلوں اور میدانوں کے منظر و صوب اور گرمی کی شدت وغیرہ کے مکمل نقشے، الفاظ میں بے مثل طریقہ سے کھینچ دیے گئے ہیں پند در اور بھیج بیانہ نظموں کی یہ بہترین صنف ہے اس کا حال کسی قدر تفصیل کے ساتھ ایک آئندہ باب میں بیان کیا جائے گا۔

قطعہ اور رباعی ان اصنافِ سخن کی طرف لوگوں کی توجہ کم ہے ان میں نصیحت آمیز خیالات اور عمدہ عمدہ مضامین نظم کیے جاتے ہیں۔ تمام بڑے بڑے شاعروں نے رباعیاں کہی ہیں جن میں انیس اور دبیر اور حاکی کی رباعیاں بہت مشہور ہیں۔

استاد و شاگرد کا تعلق استاد اور شاگرد کا تعلق ادبِ اردو میں ایک خاص درجہ رکھتا ہے ابتدائی کلام استاد کو دکھایا جاتا ہے اور شعرا سے اس فن میں ایک باقاعدہ قواعد لی جاتی ہے چنانچہ شعرا کے اردو ایک بڑے سلسلہ میں وابستہ ہیں۔ شاگرد عموماً اپنے استاد کا تتبع کرتے ہیں استاد سے انحراف کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے اس اتباع کی وجہ سے قدرتی ذہانت اور طباعی کا خون ناحق ہوتا ہے اور شاعری وہی رہی رہ جاتی ہے کبھی کبھی البتہ کوئی خاص آدمی اس دائرہ اتباع سے علیحدہ ہو کر شہرت حاصل کر لیتا ہے شاعرے شاعرے میں سخن گو اور سخن سنج سب جمع ہوتے ہیں اور کسی طرح پر طبع آزمائی کی جاتی ہے اس میں شک نہیں کہ اس سے اردو شاعری کو بہت ترقی ہوتی ہے اس قسم کی کوئی چیز یورپ میں نہیں ہے۔

تخلص شاعر اپنے کلام میں اپنے واسطے اپنے نام کے علاوہ ایک خاص نام اختیار کر لیتا ہے جس کو تخلص کہتے ہیں۔ بعض اوقات استاد شاگرد کے واسطے تخلص کا انتخاب کرتا ہے کبھی کبھی اپنے محض نام سے تخلص کا کام لیا جاتا ہے۔

اردو شاعری کے خصوصیات آباد و اُن نقصان کے جو اوپر بیان ہوئے اردو شاعری جذباتی شاعری ہے اور ہمارے فطری جذبات میں کشش پیدا کرتی ہے۔ ماسوا اس کے شیریں اور لطیف اور اپنے طرز خاص میں بے مثل ہے وہ عشق میں شرابور ہے ننہائے غم عشق کی ناکامیاں حسرت و اربابِ ہجر کا قلق یہ اور اس قسم کے میوے مضامین جو اردو شاعری کی جان ہیں ہمارے قلب پر ایک خاص اثر کرتے ہیں۔ اس میں ایسے جو اہر بے بہا شامل ہیں جو اپنی آب و تاب سے انگریزی کی بلکہ دنیا کے علم ادب کے علو خیال

نثر اکت الفاظ، موسیقیت، حسن تخیل، محویت وغیرہ میں بے تکلف مقابلہ کر سکتے ہیں۔
 اس میں بھی کوئی کلام نہیں کہ بہت سا کلام ناقص اور بے مزہ ہے مگر یہی حال دنیا بھر
 کی شاعری کا ہے اُردو کی نظم و نثر کو وجود میں آئے ہوئے ابھی بہت عرصہ نہیں گزرا
 مگر زمانہ حال کی تہذیب و تعلیم کا اثر اس پر اچھا پڑ رہا ہے اس وجہ سے کہ اب اس میں
 قومی ترانے اور جوشیلی اور نیچرل نظمیں اور انگریزی نظموں کے ترجمے بہ کثرت ہونے لگے ہیں
 جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب طبائع پرانی لکیر کے فقیر رہنے کو پسند نہیں کرتیں اور جدید
 راہیں نکالتی ہیں۔ بہر حال اُردو کا مستقبل بہت درخشاں نظر آتا ہے کیونکہ مشرق و
 مغرب دونوں کے قابل اور با اثر لوگ اُس کی فلاح و ترقی میں دل سے کوشاں ہیں۔

۴ قدیم شعرائے دکن

یہ امر حیرت انگیز ہے کہ اُردو شاعری کی ابتدا مسلمان فرمانروایان دکن کے دربار
 میں دکھنی زبان میں ہوئی۔ اس معاملہ کو زیادہ تفصیل سے لکھنے سے پہلے بہتر ہو گا کہ یہ دریافت
 کیا جائے کہ دکھنی سے کیا مراد ہے اور اُس میں اور زبان اُردو میں کیا فرق ہے۔
 دکھنی کیا چیز ہے | دکھنی زبان ہندوستانی کی ایک شاخ ہے جس کو مسلمانان دکن بولتے
 ہیں۔ اُردو کے مانند وہ بھی فارسی نستعلیق خط میں لکھی جاتی ہے مگر اس میں فارسی الفاظ
 کی کثرت نہیں ہے اُس میں بعض خصوصیتیں ہیں جب مسلمان فوجیں اپنے ساتھ اپنی
 زبان کو ملک دکن میں لے گئیں اُس وقت اس میں بہت سے ایسے محاورے
 داخل ہو گئے جو اب اُردو سے متروک ہو گئے ہیں جب اس نئی زبان کا میل
 اطراف و جوانب کی زبانوں میں یعنی برہٹی، تامل اور لنگی سے ہوا تو اُس کے محاورے اور ساخت

میں کسی قدر فرق آگیا۔ مثلاً حالت فاعلیت میں اسم یا ضمیر کے مابعد اور فعل یا ضی کے قبل حرف (نے) استعمال نہیں کیا جاتا جیسے کہ مغربی ہندی کی شاخوں میں قاعدہ ہے اسی طرح بجائے ”مجھ کو“ کے ”میرے کو“ بولتے ہیں یہ اور اسی قسم کی چند خصوصیتیں شمالی ہندوستان میں بھی پہنچیں جہاں صفائی زبان کی تدریجی رفتار میں ان میں سے اکثر متروک ہو گئیں۔ نظر برائیں دکنی کو ایک خراب قسم کی ادبی اور خیال کرنا صحیح نہیں ہے بلکہ اُس کو اُردو کی ایک شاخ سمجھنا چاہیے جس نے بیجاپور اور گولکنڈہ کے درباروں میں نشوونما پائی اور دلی اور اُس زمانہ کے مشہور شعراء کی کوشش سے اُس کو ایک ادبی زبان کی حیثیت حاصل ہوئی۔

زبان دکنی کی ابتدا ملک دکن کی فتحِ خلیجوں کے زمانہ سے شروع ہوئی۔ سب سے پہلا مسلمان بادشاہ جس نے ملک دکن پر حملہ کیا اور اُس کو فتح کر کے سلطنت دہلی کا ماتحت بنایا سلطان علاء الدین خلجی ہے۔ اس کے بعد سلطان محمد تغلق کا درمیانہ دکن جانا بھی اہمیت سے خالی نہیں۔ کیونکہ سلطانی حکم کے بموجب اکثر باشندگان دہلی کو اپنا وطن چھوڑنا پڑا بڑے بڑے علماء کبار اور صوفیائے عظام معمولی لوگوں کے ساتھ بادشاہ کے ہمراہ تھے۔ اس کے بعد بھی سلسلہ آمد و رفت جاری رہا۔ مگر اس سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ دہلی تباہ ہو گئی چنانچہ تاریخ فرشتہ میں لکھا ہوا ہے کہ اٹھارہ لاکھ افراد کے در و دولت آباد بہ تکلیف ساکن شدہ ہوئے پندرہ لاکھ گشتہ پادشاہ مدت دو سال در انجا ماندہ ہمت بر تعمیر دولت آباد گماشتہ و مادر خود مخدومہ جہاں را با سائر حرم ہائے امر و سپاہی روانہ دولت آباد گردانید۔ واحدے از مردم دہلی را کہ یہ آب و ہوائے آنجا خوشتر بودند بکمال خود نگراشتہ طرأبد دولت آباد فرستاد و دہلی بنوعی ویران گشت کہ آواز پیچ متفننے بجز شغال و روباہ و جانوران صحرائی بگوش نمی رسید۔ مختصر یہ کہ دہلی کے باشندے اب دکن کے باشندے ہو گئے۔ اور دلی کا نقصان دولت آباد کا فائدہ ہوا۔ امتداد زمانہ کے باعث اب دہلی کے

اثرات، زبانوں کے اختلاط اور مقامی باشندوں کے ساتھ ربط و ضبط نے یہ نتیجہ پیدا کیا کہ جو زبان دہلی والے اپنے ساتھ لے گئے تھے اس میں نمایاں تغیر ہو گیا۔ اور آخر ان دونوں زبانوں میں معتد بہ فرق معلوم ہونے لگا۔

دکن میں اردو شاعری | اس امر کی تحقیقات کہ دکن میں اردو شاعری کی ابتدا کے کیا

کی ابتدا کے اسباب | اسباب ہوئے بہت دلچسپ ہے قرین قیاس یہ تھا کہ اُسکی

نشوونما دہلی میں ہوتی جو اس کا اصلی گھر تھا۔ مگر بجائے اس کے ہم دیکھتے ہیں کہ قلم

شعر اردو کا گوارہ دہلی سے اتنا دور دراز مقام یعنی دکن ہے اس کی کیا وجہ ہے۔ اس

ضروری سوال کا جواب دینے کی بہت کم کوشش کی گئی ہے اس کے صحیح جواب کے

لیے ایک اہم واقعہ تاریخی کی طرف حوالہ دینا ضروری ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ مشہور خاندان

بہمنی کا بانی ایک برہمن گنگو نامی کا ایک چلیا تھا جب کہ انقلاب زمانہ سے وہ تخت

نشین ہوا تو اُس نے نہ صرف شکون نیک کیواسطے اپنے گرد کا نام تعظیماً اپنے خاندان

کے نام میں شامل کیا بلکہ اُس کو اپنا وزیر مال بھی مقرر کیا تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے

کہ یہ عام طور پر یقین کیا جاتا ہے کہ گنگو پہلا برہمن ہے جس نے ایک مسلمان بادشاہ کی

ملازمت اختیار کی اُس سے قبل برہمن لوگ معاملات ملکی میں کوئی حصہ نہیں لیتے تھے بلکہ

اُن کی زندگی امور مذہبی کی خدمت کے واسطے وقف تھی۔ گنگو کے زمانہ سے یہ رسم

نکل آیا کہ وزارت مال تمام فرمانروایان دکن کی مملکت میں برہمنوں کو تفویض ہوتی ہے

ہندوؤں کے صیغہ مال میں تقرر سے یہ نتیجہ ہوا کہ زبان ہندی نے جلد ترقی کرنا شروع

کی اور نیز ان دو بڑی جماعتوں یعنی ہندو اور مسلمانوں کے درمیان ارتباط بڑھ گیا۔ ابراہیم

عادل شاہ نے بجائے دوسرے ممالک کے لوگوں کے دھکیوں کو اپنی ملازمت میں رکھنا

شروع کیا اور اس کے حکم سے ملکی حسابات جواب تک فارسی میں لکھے جاتے تھے

وہ برہمنوں کے زیر نگرانی ہندوی یعنی ہندی میں لکھے جانے لگے۔ اس سے دیسی زبان کو بڑی تقویت پہنچی۔ کیونکہ اب وہ سرکاری اور درباری زبان ہو گئی اور اُس نے بڑی ترقی شروع کی۔ ہندوؤں کی تعداد ملک دکن میں کم نہ تھی یہ جماعت اپنی کثرت تعداد ہی کی بدولت مسلمان بادشاہوں کی خانہ جنگیوں میں فاتح اور برسرِ اقتدار شخص کو بہت مدد دیتی تھی۔ کبھی ایک مسلمان حاکم اُن سے میل کرنا چاہتا تھا اور کبھی اُس کا حریف۔ بعض اوقات چند مسلمان حکمران کسی ہندو راجہ کے خلاف بھی آپس میں میل کر لیتے تھے مگر اس ارتباط اور میل جول کا یہ نتیجہ ضرور ہوا کہ باہمی معاملات سے زبان فائدہ اُٹھاتی رہی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس تین سو برس کے عرصہ میں جب تک بیجاپور اور گولکنڈہ خود مختار سلطنتیں رہیں ان دونوں قوموں یعنی ہندو اور مسلمانوں میں اتنا میل جول تھا کہ ہندوستان میں کسی دوسری جگہ نہیں پایا جاتا تھا۔ ہندو اور مسلمانوں کے درمیان محض معمولی برتاؤ اور رواداری نہ تھی بلکہ ہندو رعایا اپنے مسلمان بادشاہوں کے ساتھ دلی محبت اور خلوص سے پیش آتی تھی اور یہ حالت برقرار رہی یہاں تک کہ زوالِ سلطنتِ بیجاپور کے بعد مرہٹوں کے ساتھ ظلم و تعدی نے اُس کا خاتمہ کر دیا۔ باہمی ارتباط اور محبت دیکھا نکلت کی حد یہ تھی کہ مسلمان بادشاہ اور امرا ہندو عورتوں سے شادی کرتے تھے اور اسی طرح ہندوؤں کو بھی مسلمان عورتوں سے شادی کرنے میں کوئی باک نہ تھا۔ انتظامِ ملکی میں کثرتِ ہندوؤں کا ذخیل ہونا رواداری کی پالیسی کا بہت بڑا ثبوت تھا۔ گو کہ باہمی خانہ جنگیاں کبھی کبھی ہوتی تھیں مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ سلاطینِ گجرات اور ہمنی بادشاہوں کو امن و امان سے سلطنت کرنے اور انتظامِ ملکی کو قائم رکھنے کے لیے سلاطینِ دہلی کی نسبت زیادہ موقع حاصل تھے جہاں کہ شمال سے برابر حملے ہوا کرتے تھے اور رعایا کی ظلمت

۱۰ تاریخ فرشتہ جلد ۳ صفحہ ۸۰

۱۱ دیکھو تاریخ دکن مصنفہ مسٹر گرینیل جلد ۱ صفحہ ۲۹۰۔

اور بہبود مفقود تھی پس مختصر ہندو مسلمانوں کا باہمی ارتباط، مسلمان فرمانروایان دکن کی سلطنت میں ہندوؤں کا عروج، حساب کتاب کا زبان ملکی میں تبدیل کر دیا جانا یہ سب اسباب مل کر اس کا باعث ہوئے کہ دیسی زبان جو دھکنی کے نام سے مشہور تھی وہ ترقی کر کے ایک ادبی زبان بننے کے قابل ہو گئی۔ اس کے علاوہ ملک دکن میں اکثر بزرگان دین اور اولیاء اللہ بھی رہتے تھے جو ہندو اور مسلمانوں کی زبان اور مذہب میں کوئی فرق نہیں کرتے تھے۔ یہ لوگ عوام الناس کے ساتھ میل جول کے خیال سے دیسی ہی زبان کو پسند کرتے تھے چنانچہ اکثر قدماے اردو صوفی فنش اشخاص تھے اور اُن سب کے اشعار بہت صاف اور عام فہم زبان میں ہوتے تھے۔ اس مختصر بیان سے اردو شاعری کی نشوونما کچھ حال تو معلوم ہو گیا مگر اُس زمانہ کے شعرا کے حالات مکمل اور یکجا کسی معاصر تذکرہ میں نہیں دیکھے گئے تذکروں میں صرف بعض شعرا کے نام ملتے ہیں اور اُن کے کلام کا بھی کچھ نہ کچھ نمونہ موجود ہے مگر یہ تذکرے بہت بعد کی تصنیف ہیں غنیمت ہے کہ اس زمانہ میں اس سلسلہ خاص میں کافی دلچسپی لی جا رہی ہے۔ اور ہم کو امید ہے کہ قابل لوگوں کی توجہ سے اس پر کافی روشنی پڑے گی۔

شاہانِ بہمنی کا زمانہ | آٹھویں صدی ہجری سے دکن میں علم و ادب کی ابتدا ہوتی ہے
 ۹۳۸ء لغایت ۱۳۲۷ء | اُس زمانہ کی تصانیف کے جو نمونے اس وقت موجود ہیں وہ زیادہ تر

مذہبی کتابوں کی صورت میں ہیں۔ اور اُن کے مولف اُس وقت کے صوفی مشرب لوگ تھے جن میں سے بعض مشہور لوگوں کے نام حسب ذیل ہیں گنج الاسلام شیخ عین الدین (متوفی ۹۵۷ھ) خواجہ شید گیسو دراز شاہ میرانجی، مولانا وحشی اور شید شاہ میر وغیرہ۔ یہ لوگ زیادہ تر نثر تھے۔ ان کا کچھ مختصر حال اس کتاب کے حصہ نثر میں بیان کریں گے۔

قطب شاہیوں کا عہد ۹۱۶ھ تا ۱۰۹۸ھ | سلطنتِ بہمنی کے زوال کے بعد بیجا پور گوکنڈہ

اور احمد نگر کی چھوٹی چھوٹی سلطنتیں قائم ہوئیں اس زمانہ میں دکنی زبان کو بہت ترقی ہوئی ہندوستانیوں کی وجہ سے جو شاہی محلوں میں تھیں ویسی زبان کو اور بھی تقویت پہنچی یوسف عادل شاہ کی بیوی جو بولوچی کے نام سے مشہور تھیں۔ مکنڈاؤمر بیٹہ کی بہن تھیں۔ بھاگ متی سلطان محمد قلی شاہ کی محبوب بیوی تھیں۔ احمد نظام شاہ دانی احمد نگر کی ماں بھی ہندو تھیں۔

شاہان گوکنڈہ و بیجا پور نہایت قدردان فن مہذب اور قابل بادشاہ تھے شعرا کی قدردانی کے ساتھ خود بھی فارسی اور دکنی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اُردو کو دکن میں دکنی کہتے ہیں اُن کے دربار میں ایسے لوگوں کا جمع تھا جو فارسی اور عربی کے عالم تھے۔ اس نئی زبان کے اطراف و جوانب میں تالنگی مرہٹی اور کٹری زبانیں بولی جاتی تھیں مگر بے میل ہونے کی وجہ سے اُن سے اُردو کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس کے علاوہ نئی زبان کے ترویج و اشاعت کا انحصار ایسے لوگوں پر تھا جو فارسی کے علاوہ دیگر زبانوں سے ناواقف تھے اسی وجہ سے اس نئی زبان یعنی دکنی کی ترکیب زبان فارسی کے مطابق ہوئی دربار گوکنڈہ اُس وقت کے شعرا اور اُدبا کا جمع تھا جن میں مندرجہ ذیل شعرا کے نام مذکور ہیں ملتے ہیں مگر حالات دستیاب نہیں ہوتے۔ غواصی، ملا قطبلی، ابن نشاطی، جنیدی، طبعی، نورسی، فائز شاہی، مرزا شعور، بیچارہ، طالب، سومن۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ ۱۵۵۷ء میں قائم ہوئی اور ترقی کی معراج پر پہنچا ۱۵۷۷ء لغایت ۱۵۸۷ء گئی سلطان قلی قطب شاہ اپنے والد ابراہیم قطب شاہ کی وفات پر جو ۱۵۷۷ء میں واقع ہوئی بارہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ ۱۵۸۷ء میں سلطان مذکور نے ابراہیم عادل شاہ فرما کر دے بیجا پور کے ساتھ صلح کی اور اپنی بہن کا نکاح اُنکے ساتھ کر دیا۔ وہ شہنشاہ اکبر اور شاہ عباس صفوی کا محاصرہ تھا۔ گوکنڈہ سے کچھ فاصلہ پر اپنی معشوقہ بھاگ متی کے نام سے ایک شہر بھاگ نگر آباد کیا۔ مگر تھوڑے عرصے

کے بعد اس نسبت کو بدل کر اسی شہر کو حیدر آباد کے نام سے موسوم کیا جو موجودہ فرماڑو
دکن کا مشہور دار السلطنت ہے۔ قطب شاہ کو علاوہ شعر و شاعری کے دیگر فنون
لطیفہ کا بھی بہت شوق تھا چنانچہ فن تعمیر سے بھی انکو دلچسپی تھی دو مشہور عمارتیں مشہور بہ
خداداد محل اور بارگاہ خسروی تعمیر کرائیں۔ ان کے دربار میں بڑے بڑے صاحب کمال
اور استادان فن عرب و ایران سے اُن کی داد و دہش اور قد و دانی کا حال سن کر آتے
تھے اور ان کی فیاضی سے مستفیض ہوتے تھے۔ بادشاہ نے ایک خاص وقت مقرر کیا تھا
جبکہ علما و شعراء میں مناظرے اور مشاعرے ہوتے تھے۔ خوشنویسی کا بھی اُن کو بہت ذوق
تھا چنانچہ مشہور خطاط ایران و عراق کے اُن کے دربار میں جمع ہو گئے تھے علاوہ دیگر ہاکمالوں
کے دو مشہور عالم اُن کے دربار میں میر محمد مومن استر آبادی اور میر جملہ تھے۔ قطب شاہ کا
مذہب شیعہ تھا اور وہ اکثر مناظرے اپنے مذہب کی حمایت میں اہل دربار میں منعقد کراتے
تھے۔ اسی مذہبی شوق کی وجہ سے بہت سے مرثیے اس عہد میں کہے گئے علاوہ قدردانِ فن
ہونے کے خود بھی ایک اچھے شاعر تھے چنانچہ انکا کلام بربان دکھنی و تلنگی و فارسی ایک
ضخیم کلیات کی صورت میں جس کے اٹھارہ سو صفحے ہیں موجود اور محفوظ ہے۔ اشعار فارسی
میں قطب شاہ اور دکھنی میں معانی تخلص کرتے تھے۔ انکی کلیات میں حسب ذیل
اصناف سخن موجود ہیں۔ مثنویاں۔ قصیدے۔ ترجیع بند مرثیاتی بربان فارسی و دکھنی اور
رباعیات و سباجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے پچاس ہزار سے زیادہ شعر کہے تھے یادگی
اور شیرینی ان کے کلام کا جوہر ہے۔ تصوف اور عاشقانہ رنگ بھی ان کے اشعار میں پایا جاتا
ہے۔ مرقع نگاری اور مناظر قدرت کی بنیاد انھیں کی رکھی ہوئی ہے جو سودا اور نظیر اکبر آبادی
کے زمانہ میں تکمیل کو پہنچی اکثر مثنویاں خاص ہندوستانی پھلوں اور ایک ہندوستانی
ترکاریوں اور ایک شکاری چڑیوں کے متعلق ہے بعض نظموں میں شادی بیاہ اور ولادت
کے رسم و رواج ہندو اور مسلمانوں کے مذہبی تہوار مثلاً ہولی دوالی عید بقرعید ہست وغیرہ

بعض میں ہندوستان کے موسم برسات کا ذکر نہایت دلچسپی سے کیا گیا ہے۔ اسی طرح ایک دلچسپ مکالمہ صراحی و ساغر کا منظم کیا ہے۔ ایک قصیدہ بارغ محمد شاہی کی تعریف میں اور اکثر تصانیف حمد و نعت اور منقبت میں ہیں معرکہ کر بلا کے موثر مرثی بھی لکھے ہیں قلی قطب شاہ پہلے شخص ہیں جن کا کلام اردو مجموعی صورت میں موجود ہے۔ ان کی زبان میں کافی پختگی اور ترقی پائی جاتی ہے۔ مگر ان سے بھی پیشتر کچھ لوگ گزرے ہوں جنہوں نے شعر کہا ہو مگر ان کے کلام کا اس وقت تک کہیں پتہ نہیں ملا۔ کچھ مذہبی شہوایاں قطب شاہ سے پیشتر کی موجود ہیں مگر وہ کسی معنی میں ادبی تصنیفات نہیں کہی جاسکتیں۔ قطب شاہ ہی کا کلام اب تک ایسا کلام کہا جاسکتا ہے کہ جس میں ایک ادبی شان موجود ہے۔ انہوں نے سب سے پیشتر فارسی کے تنبیغ میں شعر کہے اور ایک دیوان بہ ترتیب حروف تہجی جمع کیا اور یہ سہرا اب تک عدم تحقیق کی وجہ سے ولی کے سر تھا۔ علاوہ متعارف مضامین کے ان کے کلام میں قابل تعریف بات یہ ہے کہ اصلیت اور جدت ہے اور بعض مقامی دلچسپیوں کو بھی انہوں نے قلمبند کیا ہے۔ فارسی کے وہ پورے منبع نہیں ہیں کیونکہ ان کے کلام میں ہندی کا بھی بہت بڑا اثر پایا جاتا ہے ہندی الفاظ اور ترکیبیں ہندی استعمال اور شبہیں، ہند فارسی الفاظ خدا کی تعریف ٹھیٹ بھاشا میں ہندو سوراؤں اور بہادروں اور ہندوستان کی روایات کا ذکر انہما عشق عورت کی جانب سے عرو کے واسطے جو ہندی شاعری کے لیے مخصوص ہے۔ یہ سب باتیں ان کے کلام کی خصوصیات ہیں متفق سے طریقہ خطاب جو بعد میں اُلٹ گیا ان کے یہاں صحیح طریق پر پایا جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ فارسی کا اتباع بھی نظر انداز نہیں کیا گیا، کیونکہ قواعد نظم الفاظ، محاورات، ترکیبیں مضامین تشبیہات اکثر ان کے کلام میں موجود ہیں۔ وہ اپنی قابلیت کا اظہار نہیں کرتے اور فارسی عربی الفاظ کو اسی طرح استعمال کرتے ہیں جیسے روزمرہ میں مشہور ہیں۔ عام اس سے کہ وہ لغوی طریق پر صحیح ہوں یا غلط۔ فی الحال چونکہ وہ قدیم زبان متروک ہو گئی ہے اور لوگوں کو

اُس میں کوئی لطف نہیں آتا اس لیے اُن کلام دیکھی سے نہیں پڑھا جاتا مگر جب نظر تحقیق وسیع ہوگی تو اُن کے کلام کی قدر کی جائے گی۔ مختصر یہ کہ قلی قطب شاہ ان لوگوں میں ہیں جنہوں نے سب سے پہلے اپنے کلام کی تدوین کی اور اردو کو ایسا وسیع کیا کہ آئندہ وہ ایک ادبی زبان بننے کے قابل ہو گئی۔ انہوں نے ایک ایسے ادب شعر کی بنیاد رکھی جس کے بیروادِ مختتم میر و سودا انیس و دبیر ذوق و غالب و غیسرہ ہوئے۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

دلِ نازکِ خدا کن کہ خدا کامِ دوے گا کرتے ہیں دعوے شعر کا سب اپنی طبعِ سوں	مثنیٰ کی مراد ان کے بھرے جام و دیگا بخشا نفعِ شعر معانی کے تئیں خدا
------------------------------------------------------------------------------	------------------------------------------------------------------------

سلطان محمد قطب شاہ ۱۶۲۵ء لغایت ۱۶۲۵ء	سلطان محمد قطب شاہ سلطان قلی قطب شاہ کے بھتیجے اور جانشین تھے اُن کی ولادت گوکنڈہ میں ۱۵۹۱ء میں ہوئی اور
-----------------------------------------	----------------------------------------------------------------------------------------------------------

انکی شادی اپنی چچا زاد بہن یعنی سلطان قلی قطب شاہ کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ نہایت فطرتاً اور پابند مذہب سخی اور فنِ تعمیر کے دلدادہ تھے ہنملہ دیگر تعمیرات کے اتنی محل جامع مسجد حروف بہ کہ مسجد محمدی محل دال محل مشہور ہیں نظم و نثر فارسی و اردو دونوں خوب لکھتے تھے۔ اُن کے دو دیوان ہیں ایک فارسی اور ایک دکنی جن میں اکثر اصنافِ سخن موجود ہیں۔ فارسی میں ظل الشہ اور اردو میں قطب شاہ تخلص کرتے ہیں۔ اسی توافقِ تخلص کی وجہ سے ان دونوں بادشاہوں کے کلام میں خلط ملط ہو گیا ہے۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اُن کا تخلص اردو کلام کے واسطے اور سلطان قلی قطب شاہ کا فارسی کے واسطے مخصوص تھا۔ ان کے دونوں دیوان حیدر آباد میں نواب سرسار جنگ کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔ ان کے کلام میں بھی شیرینیِ صفائی لطافت پائی جاتی ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے

سکھی تو ہر گھڑی مجھ پر نہ کر غیظ	محبت پر نظر رکھ کر بسرِ غیظ
----------------------------------	-----------------------------

دو لب ترے رنگیے یا قوت کو دیے رنگ

رے بھیک رنگ عقیقاں رنگیں ہوئے میں ہیں

سلطان عبداللہ قطب شاہ	عبداللہ قطب شاہ سلطان محمد قطب شاہ کے بیٹے اور
۱۶۲۵ء لغایت ۱۶۵۲ء	سلطین قطب شاہی میں چھٹے بادشاہ تھے ۱۶۱۷ء میں

پیدا ہوئے اور اپنے باپ کی وفات کے بعد ۱۶۲۵ء میں تخت نشین ہوئے
 انھوں نے شاہ جہاں کے سامنے گروں اطاعت خم کی اور ایک سالانہ رستم بطور
 خراج کے دینا منظور کیا ۱۶۵۲ء میں جب شاہ جہاں ان سے ناراض ہوئے تو شاہزادہ
 اورنگ زیب نے جو اس وقت مالک محروسہ دکن کے صوبہ دار تھے حیدر آباد پر
 چڑھائی کر کے اس شہر کو تہ و بالا کر دیا۔ عبداللہ نے اپنی شکست قبول کر کے تمام شرائط
 صلح منظور کر لیے اور اس وقت سے وہ سلطنت مغلیہ کے ایک باجگزار کی حیثیت سے
 ہو گئے۔ یہ بھی مثل اپنے باپ کے شعر و شاعری کے دلدادہ تھے اور انھیں کی طرح انکو
 بھی فن تعمیر کا بڑا شوق تھا ان کا دربار بھی فارس اور عرب کے عالموں فاضلوں سے
 بھرا رہتا تھا اور وہ سب ان کی فیاضی سے بہرہ یاب ہوتے تھے۔ اکثر کتابیں اس عہد
 میں ان کے نام سے لکھی گئیں مثلاً برہان قاطع اور ایک لغت موسوم بہ لغات فارسی یہ فارسی اور کھنہ
 دونوں میں شعر کہتے تھے اور تخلص عبداللہ تھا۔ ان کے دیوان فارسی اردو دونوں میں
 موجود ہیں۔ ان کے اشعار بہت صاف اور شیریں ہوتے ہیں آصفی ملکا پوری نے اپنے
 تذکرہ شعراء دکن میں ان کے اکثر اردو اشعار بطور نمونہ پیش کیے ہیں کلام کا نمونہ یہ ہے

تری پیشانی پر ٹیکا جھمکتا	تاما شاہے اُجالے میں اُجالا
آب حیات سے ہے زیادہ یہ لب ترا	کرتے ہیں مجھ سے خضر علیہ السلام بحث
جو کچھ راز پردہ میں ہیں غیب کے	سو مخفی نہیں اس پہ ہیں آشکار

ابن ناشلی | اس زمانہ کے شعراء دکن میں ابن ناشلی بہت مشہور ہوئے ہیں

یہ جو لکندہ کے رہنے والے اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کے درباری شاعر تھے ان کے حالات زندگی کچھ معلوم نہیں۔ بجز اس کے کہ وہ ایک شہنوی موسوم بہ "پھول بن" کے مصنف ہیں جو زبان دکنی میں ہے اور عشق و عاشقی کا قصہ ہے اس کا نام اس کی ہیروئن کے نام پر رکھا گیا ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ یہ ایک فارسی کتاب بسا تین کا ترجمہ ہے اس میں سکندر اور لقمان وغیرہ کی حکایات بھی ہیں اور ایک فرضی شہر شہرہ پونچن پاتن کا حال ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ تقریباً ۱۲۰ صفحہ کا ایسٹ انڈیا ہاؤس کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ معمولاً حمد و نعت و مقبت سے ابتدا ہوتی ہے۔ اس کے بعد سلطان عبداللہ قطب شاہ کی تعریف ہے پھر اصل قصہ شروع ہوتا ہے۔ قصہ میں انسانوں کے قالب بدلنے اور جانوروں کے قالب میں آجانے کا ذکر ہے۔ کوئی تعجب نہیں کہ سرور نے اسی کے مطالعہ کے بعد سائنہ عجائب لکھی ہو۔ اس کی تصنیف ۱۰۸۰ھ میں ہوئی۔

غواصی کا قصہ "سیف الملوک" غواصی نے زبان دکنی ایک شہنوی لکھی ہے جس میں سیف الملوک شاہزادہ مصر اور بدیع الجہاں شاہزادی چین کے عشق کا حال ہے۔ اس کا سن تصنیف ۱۰۳۵ھ ہے۔ غواصی مذہب کا شیعہ تھا۔ اور عبداللہ قطب شاہ کے دربار کا شاعر تھا۔ قصہ سیف الملوک غالباً الف لیلہ سے ماخوذ ہے۔ شروع میں حمد و نعت اور مقبت کے بعد بادشاہ کی تعریف ہے جس کا ذکر کتاب کے اٹھارہویں شعر میں ہے۔ انھوں نے ایک اور شہنوی بھی لکھی ہے جس کا نام طوطی نامہ ہے اور یہ ۱۰۶۹ھ میں تمام ہوئی اور جس کو سرچارلس لائل غلطی سے ابن نشاطی کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ دراصل یہ قصہ ضیاء فارسی طوطی نامہ سے سلطان عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں اردو میں ترجمہ ہوا تھا اس وجہ سے کہ دیباچہ میں انھیں کی بہت زیادہ تعریف ہے۔ اس کا ماخذ اصلی سنکرت کی کتاب "سوغا شبتی" بتایا جاتا ہے۔ غواصی کے اس قصہ سے مولوی حیدر بخش نے جو

نورث ولیم کالج کلکتہ کے مدرس تھے اپنا مشہور طوطی نامہ سنہ ۱۸۸۷ء میں تیار کیا۔ غواصی نے اپنا تخلص ایک ترجیع بند میں ظاہر کیا ہے۔ اور تصنیف دیباچہ سے ۱۶۳۹ء (مطابق یکم جب سنہ ۱۸۵۹ء پایا جاتا ہے۔ ملا غواصی گو لکنتے کے باشندے اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کے معاصر ہیں۔ نصرتی نے گلشن عشق میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔

پڑی کچھ غواصی تھی کر خیال | کیا تازہ باغ بدیع الجہال

میر حسن اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں۔ "غواصی تخلص در وقت جہانگیر سنہ ۱۰۱۴ھ ۱۶۰۳ء بود طوطی نامہ بخشی را نظم نموده است، بزبان قدیم نصف فارسی نصف ہندی بطور بکٹ کہانی سرسری دیدہ بودم شعر اس نظم یاد نیست۔"

سرسر نصف مولانا دجہی | ایک ضروری کتاب موسم بہار کا ذکر بھی یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے جس کو نثر دکنی میں مولانا دجہی نے تصنیف کیا تھا۔ مولانا موصوف سلطان عبداللہ قطب شاہ کے درباری شاعر اور غواصی کے معاصر تھے۔ یہ کتاب سلطان عبداللہ قطب شاہ کے حکم سے سنہ ۱۰۴۵ھ یا ۱۰۴۷ھ میں تصنیف ہوئی۔ قدیم نثر دکنی کے نمونے سیرس سے پیشتر کے بھی موجود ہیں مگر وہ سب مذہبی رنگ یا تصوف میں ہیں۔ سب سے بڑی خوبی اس کتاب کی جیسا کہ مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اردو نے بتلایا ہے کہ جن کی کوششوں سے یہ کتاب پبلک کی نظروں میں آئی یہ ہے کہ ایک مسلسل قصہ ہے نیز یہ کہ اس کی عبارت ادبی شان رکھتی ہے اور نثر مقفے ہے جیسا کہ فارسی میں ظہوری کا رنگ ہے۔ زبان بہت صاف اور سادہ ہے اور قصہ میں روانی پائی جاتی ہے نفس قصہ مختصر ہے جس میں جا بجا اشعار حسب موقع عشق، عقل، شجاعت، حرص وغیرہ کے موضوع پر لائے گئے ہیں۔ اسکی زبان بھی ویسی ہی ہے جیسی کہ قطب شاہیوں کے کلیات کی ہے تحسین الدین | ممکن ہے کہ یہ نام ہوا کوئی خطاب۔ غرض کہ ان بزرگ نے ایک نثری لکھی جس کا نام "کامروپ کلا" ہے کلا شاہ لکھا کی بیٹی قصہ کی ہیروئن ہے اور کامروپ

شاہ اودھ کا بیٹا بیروہے قصہ یہ ہے کہ یہ دونوں خواب میں ایک دوسرے پر عاشق ہو گئے جیسا کہ الف لیلہ میں چین والی شہزادی کی نسبت لکھا ہے۔ کامروپ اپنی نادیدہ بلکہ خواب دیدہ معشوقہ کی تلاش میں ملکوں ملکوں پھرتا ہے جہاں اسکو عجیب و غریب واقعات پیش آتے ہیں اور بالآخر اس کی شادی کلا کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ اس میں قابل غور بات یہ ہے کہ مصنف مسلمان ہے اور اشخاص قصہ سب ہندو ہیں۔ اسی شنوی کو گارن ڈیٹا سی نے ۱۸۶۲ء میں قصہ کامروپ کے نام سے شائع کیا تھا۔ یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ مشہور جرمن شاعر گئٹے نے اس نظم کو ترجمہ کر کے سنا اور اس سے بہت محظوظ ہوا۔ ملاقطبی انھوں نے ۱۸۶۶ء میں تحفۃ النصائح کا ترجمہ زبان فارسی سے دکنی میں کیا۔ یہ کتاب شیخ یوسف دہلوی نے ۱۸۹۵ء میں اپنے بیٹے کی تعلیم کے واسطے تصنیف کی تھی یہ ۱۸۹۶ء بند کا ایک قصیدہ ہے جسے ملاقطبی نے اُسی بحر اور اسی ردیف و قافیہ میں ترجمہ کیا ہے۔

جنیدی ان کی نسبت کچھ اور سلام نہیں سوائے اس کے کہ وہ ایک شنوی ماہ پیکر کے مولف ہیں جس کا سنہ تصنیف ۱۸۶۳ء ہے۔

طبعی گو لکندہ کے رہنے والے سلطان عبداللہ قطب شاہ کے معاصر تھے۔ ان کی ایک شنوی ”بہرام دگل اندام“ ہے جس کا مضمون ہفت پیکر نظامی سے ماخوذ ہے۔ سنہ تصنیف ۱۸۸۰ء ہے۔ دیباچہ راجو جیسنی کے نام سے ہے جو گو لکندہ کے ایک بہت بڑے بزرگ اور ادیب اور اللہ سے تھے اور خاتمہ پر ابو الحسن تانا شاہ کی تعریف ہے یہ تقریباً تیرہ چودہ سو شعر کی شنوی ہے۔

ابو الحسن قطب شاہ ۱۶۷۳ء | ابو الحسن قطب شاہ مشہور بہ تانا شاہ گو لکندہ کا سب سے
نفاہت ۱۶۸۵ء متوفی ۱۶۸۵ء | آخری تاجدار نہایت عیش پسند اور نازک دماغ تھا یہ خود
بھی نہایت قابل اور قابلوں کا قدر دان تھا ایک شعر تذکرہ گلشن ہند میں اسکی طرف

منوب ہے۔ یہ عبداللہ قطب شاہ کا داماد تھا اور اسکی وفات پر تخت نشین ہوا جب
گوکنڈہ سات ماہ کے محاصرہ کے بعد ۱۶۸۷ء میں فتح ہو گیا اور سلطنت مغلیہ کا ایک صوبہ
قرار پایا تو ابوالحسن قید کر لیا گیا اور اسکی باقی عمر قید میں گزری۔ مشہور ہے کہ اُسکو جھٹکا
بہت شوق تھا۔ چنانچہ اُس نے حقہ پینے کی اجازت قید خانہ میں بھی طلب کی تھی شعرائے
ذیل ابوالحسن تانا شاہ کے زمانہ میں یا اُن کے دربار کے شاعر تھے۔

نوری | سید شجاع الدین نوری گجرات کے معزز خاندان سادات سے تھے وہ سلطان
ابوالحسن تانا شاہ کے وزیر کے بیٹے کو پڑھاتے تھے میر حسن نے اپنے تذکرہ میں اُن کا
ذکر کیا ہے۔ ان کو ان ملا نوری سے نہ ملانا چاہیے جو فیضی کے دوست تھے اور جن کا ایک
شعر قائم نے اپنے تذکرہ میں نقل کیا ہے۔ گارسن ڈیٹاسی اور سر چارلس لائل نے نام
کے التباس کی وجہ سے دھوکہ کھایا ہے اور دونوں کو ایک سمجھا ہے۔

فائز | یہ گوکنڈہ کے رہنے والے تانا شاہ کے عہد کے شاعر تھے ۱۶۹۷ء میں انھوں نے
قصہ رضوان شاہ روح افزا کا ترجمہ نثر فارسی سے نظم دکنی میں کیا۔ یہ مثنوی قصہ رضوان شاہ
کے نام سے مشہور ہے مگر کتب خانہ آصفیہ میں مثنوی روح افزا کے نام
سے ہے۔

شاہی | شاہ قلی خان نام اور بھاگ نگر (موجودہ حیدر آباد دکن) کے رہنے والے
تھے شاہی ملازمت کرتے تھے رفتہ رفتہ تانا شاہ کے ندیم خاص ہو گئے۔ شمالی ہند
کی بھی سیر کی تھی تذکرہ میر حسن میں ان کا ذکر ہے۔

مرزا | ابوالقاسم متخلص بمرزا حیدر آباد کے رہنے والے تانا شاہ کے مصاحب تھے
تانا شاہ کے انتزاع سلطنت کے بعد یہ فقیر ہو گئے اور حیدر آباد میں بقیہ عمر بسر کی
اور وہیں انتقال کیا۔ تذکرہ میر حسن میں ان کا ذکر ہے۔

عادل | شاہیوں کا زمانہ ۱۶۹۵ء تا ۱۶۹۷ء | سلطنت عادل شاہی کی بنیاد پڑنے سے

مدتوں پیشتر بیجا پور میں اردو زبان عام ہو گئی تھی امیر غریب ادنیٰ اعلیٰ سب اسی زبان میں بات چیت کرتے تھے سلاطین ہمنیہ نے یہاں کے شاہی دفتر کو بھی اسی زبان میں کر دیا تھا۔ لیکن یوسف عادل شاہ اور اُس کے فرزند معیمل عادل شاہ نے اپنے زمانے میں شاہی دفتر کو فارسی میں منتقل کر دیا۔ کم و بیش پچاس سال فارسی عروج پر رہی۔ ابراہیم عادل شاہ اول نے جب تلج و تخت حاصل کیا تو اس نے حسب سابق فارسی کے عوض شاہی دفاتر میں زبان اردو کو رواج دیا اور یہ زبان سلطنت کی زبان قرار پائی۔ مورخ خانی خان نے بھی اس واقعہ کو بیان کیا ہے۔ علی عادل شاہ اول نے اپنے زمانے میں فارسی زبان کو مروج کیا لیکن جب ابراہیم عادل شاہ ثانی حکمران ہوا تو شاہی دفاتر میں پھر اردو زبان جاری ہو گئی اور سلطنت عادل شاہیہ کی تباہی تک برابر جاری رہی۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی | مثل بادشاہان گو لکندہ کے سلاطین بیجا پور بھی نہایت تعلیم یافتہ
۱۶۲۶ء نہایت ۱۶۲۶ء | روشن خیال علم دوست بادشاہ تھے چنانچہ ابراہیم عادل شاہ کو

بھی شعر و شاعری اور فن تعمیر سے بڑا شوق تھا۔ فارسی کا مستند شاعر ظہوری جو ۱۶۲۵ء میں ہندوستان آیا اور ۱۶۱۶ء میں وفات پائی اسی دربار کا بڑا مشہور شاعر تھا۔ ظہوری کی دو کتابیں "خوان خلیل" اور "گلزار ابراہیم" اسی ابراہیم عادل شاہ کے نام پر ہیں اور اس کی تین مشہور فارسی شریں جو روضہ شہر ظہوری کے نام سے مشہور ہیں ابراہیم عادل شاہ کی تصنیف نورس کا دیباچہ ہیں جو ہندی نظم میں فن موسیقی کی ایک مشہور کتاب ہے میرسنجر اور ملک قمی بھی اسی دربار کے بڑے شاعر تھے۔ سید شمس اللہ صاحب قادری لکھتے ہیں "ابراہیم عادل شاہ کو موسیقی میں بے حد مہارت حاصل تھی خاص کر سرود ہندی میں ایسا کمال پیدا کیا تھا کہ اُس عہد کے تمام گویے اسے جگت گرد کہا کرتے تھے۔ اُس نے علم موسیقی پر (دھرید) ایک کتاب لکھی تھی جس میں سرود ہندی کے قواعد و ضوابط قلبند کہے تھے اور اُس کا نام نورس نامہ رکھا تھا۔ یہ کتاب ہم دکنی میں سے ملا ظہوری نے

اس پر دیباچہ لکھا تھا جو اس وقت نہ نشر ظہوری کے نام سے مشہور ہے۔ مصنف
کل رعنا رقط از ہیں کہ موسیقی کا شوق ایسا بڑھا کہ اطراف ہندوستان سے بلا کر تین چار
ہزار گویے بیجا پور میں جمع کئے اور شہ میں بیجا پور کے قریب نور پور کے نام سے ایک
بڑا شہر آباد کیا جس میں گرو اور جلیوں کے لیے بڑی بڑی مجلسیں بن کر تیار ہو گئیں شاہی
مجلس کا نام نورس محل۔ شاہی ٹہر پر نورسی سکے پر نورس۔ علم و نشان کے نام نورسی
بعض شاعروں نے اپنا تخلص بدل کر نورسی قرار دیا۔

علی عادل شاہ ثانی | اس بادشاہ کے دربار میں بھی مشہور شاعر اور ادیب جمع تھے بلکہ
۱۶۵۱ء الفایہ ^{۱۶۵۱} کا امن و سکون شیواجی مشہور سردار مرہٹہ کے متواتر حملوں سے دہم
درہم ہو گیا تھا۔ شیواجی نے اکثر قلعے فتح کر لیے اور افضل خاں کو جو بیجا پور کا سردار تھا
قتل کر دیا۔ اسی علی عادل شاہ کے زمانہ کا مشہور شاعر نصرتی جس کا نام محمد نصرت اور
فرمانروائے کرناٹک کا رشتہ دار تھا۔ کرناٹک سے بیجا پور آیا جہاں علی عادل شاہ نے
اسکو عہدہ منصب داری عطا کیا اور اپنا رفیق اور مصاحب بنایا علی عادل شاہ کو دھنی
سے نہایت پسند تھی اور وہ دھنی شعر کی نہایت قدر کرتا تھا بقول خانی خان بادشاہ بود
باہوش سپاہ دوست دور سخاوت و شجاعت و دست خلق مشہور۔ در حق شاعران ہندی زیادہ
مراعاتی فرمود۔ در عہدہ ترجمہ یوسف زلیخا تالیف ملا جامی و ترجمہ روضۃ الشہداء و قصۃ
منہر و مدالت کہ عاقل خاں خوانی بہ نظم در آورده ملا نصرتی بود دیگر شاعران بیجا پور بہ زبان
دکنی تالیف نموده از نقد و جنس صا داد فروز خور سلاطین یاقتند۔ اس عہد کے مشہور شعرا
یہ ہیں :- رسمی نصرتی۔ شاہ ملک آئین۔ سیوا۔ مومن ہاشم مرزا۔

رسمی | رسمی کا نام کمال خاں ولد اسماعیل خاں۔ دربار بیجا پور سے اس کا تعلق تھا رسمی
نے خدیجہ سلطانہ شہر مانو بیگم کی فرمائش سے ۱۶۵۹ء میں خاور نامہ کا فارسی سے نظم دکنی
میں ترجمہ کیا۔ خاور نامہ میں جناب امیر علیہ السلام کے محاورات مذکور ہیں اور فردوسی

کے شاہنامہ کے طرز پر لکھا ہے۔ شہر بانو بیگم کا عقد سلطان محمد بن ابراہیم عادل شاہ کے ساتھ ہوا تھا۔

نصرتی | اس کے حالات تحقیق سے معلوم نہیں ہیں بقول سید شمس اللہ قادری "نصرتی کا نام شیخ نصرت اور وطن بیجاپور ہے۔ ان کے آباؤ اجداد بیجاپور میں فوجی ملازم اور والدہ رکاب شاہی کے سلع دار تھے چنانچہ خود نصرتی نے اس کا ذکر کیا ہے نصرتی کے بھائی شیخ منصور ایک اہل دل اور خدا رسیدہ بزرگ تھے بیجاپور کے مشاہیر فقرا میں ان کا شمار ہوتا ہے گلشن عشق کے دیباچے سے ظاہر ہوتا ہے کہ نصرتی نے محمد عادل شاہ کے زمانہ میں دربار میں رسائی حاصل کی اور علی عادل شاہ کے دور میں عروج پایا اور ملک الشعرا کا خطاب حاصل کیا "عبد الجبار خاں ملکا پوری نے اپنے تذکرہ شعرائے دکن میں نصرتی کا اس طرح ذکر کیا ہے: "نصرتی تخلص محمد نصرت نام دکنی المولد ہے حاکم کرناٹک کے قرابت داروں سے تھا۔ آپ کی گزراوقات توکل و قناعت پر تھی۔ مدت تک کرناٹک میں رہا۔ پھر سر کرتا ہوا بیجاپور میں آیا ۱۰۷۶ھ عیسوی میں دکنی میں علی نامہ لکھا۔ اس پر ملک الشعرا کی کا خطاب عطا ہوا ۱۰۹۵ھ میں فوت ہوا نصرتی سنی المذہب تھا۔ بندہ نواز گیسو دراز کے خاندان کا مرید و معتقد تھا جیسا کہ شعر سے عیاں ہے۔ یہ نہیں معلوم کہ مولف تذکرہ شعرائے دکن نے یہ مواد کہاں سے فراہم کیا نصرتی کی تصنیفات حسب ذیل ہیں۔

مثنویاں

۱) علی نامہ۔ ۱۰۷۶ھ مطابق ۱۶۶۵ء میں نصرتی نے ایک طویل مثنوی لکھی جس کا نام علی نامہ ہے جس میں اپنے محسن علی عادل شاہ کے اکثر واقعات نظم کئے ہیں۔ اس میں علی عادل شاہ کے سوانح و فتوحات اور مجالس عیش و طرب کے واقعات کا بھی ذکر

۱۰ ماہ و از اردو کے قدیم ۱۲

ہے لکے ضمن میں مختلف مواقع پر تصائد مدحیہ بھی درج ہیں اس کتاب کو زبان دکنی میں
 سب سے پہلی کتاب سمجھا جا رہے جو ایک بادشاہ کی تعریف میں بصورت قصیدہ لکھی گئی
 (۲) گلشن عشق۔ دوسری شنوی کا نام گلشن عشق ہے اور یہ ۶۸۰ ہجری مطابق ۱۶۵۷ء
 میں تحریر ہوئی تھی۔ اس میں ایک شخص مسمیٰ بہ کنور منوہر پسر سورج بھان اور مدد مالتی
 کے عشق کا ذکر ہے۔ اس قصہ کو مختلف لوگوں نے مختلف انداز سے لکھا ہے عاقل خاں
 رازی نے اسی قصہ کو فارسی میں نظم کیا ہے اور شیخ پروانہ اس کا نام رکھا ہے۔ یہ شنوی
 اپنی رنگین تشبیہوں اور استعارات کے لحاظ سے آپ اپنی نظر ہے۔ گلشن عشق کے
 اشعار بعض تو نہایت صاف ہیں اور بعض نہایت اوق۔ کہیں عربی و فارسی کی آمیزش
 نظر آتی ہے تو کہیں بھاشا کی بات ہے۔ اس کے دیباچہ میں حسب معمول اپنے
 محسن علی عادل شاہ کی تعریف کی ہے۔

(۳) گلدرہ عشق مصنفہ | بقول سید شمس اللہ صاحب قادری یہ تیسری شنوی ہے مگر بقول
 ۱۶۵۷ء لغایت ۱۶۷۷ء | ڈیٹا سی یہ عاشقانہ غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے۔ نصرتی کا
 ایک تصائد کا مجموعہ اور ایک غزلیات کا دیوان ہے۔ سولف گل رعنا نے نصرتی کا
 معراج نامہ بھی دیکھا ہے یہ زمانہ محمد عادل شاہ لکھا گیا تھا۔ ایک سوا کتیس شعر اس میں
 ہیں بحر ایسی ہے جو فارسی اور ہندی میں مشترک ہے ابراہیم زبیری نے نصرتی کے کلام
 کی بڑی تعریف کی ہے اور ان کی مضمون آفرینی زود طبع اور ادب و تخیل کو خاقانی کے
 ہم پایہ قرار دیا ہے۔ سر پارلس لائل کا خیال ہے کہ یہ برہن تھے مگر یہ صحیح نہیں ہے
 ہاشمی | سید میران نام اور بی پوران کا وطن تھا۔ ہاشمی تخلص تھا۔ سید شاہ ہاشم
 عطوی کے مرید تھے اور اسی مناسبت سے ہاشمی تخلص کرتے تھے۔ ہاشمی مادر زاد انداز
 تھے مگر نہایت طباع اور ذہین آدمی تھے۔ ہندی اشعار مزے کے کہتے تھے۔ اپنے مرشد
 کی فرمائش سے یوسف زلیخا نام ایک شنوی دکنی میں لکھی اور یہ ۱۰۶۹ھ میں تمام ہوئی

اس میں چھ ہزار سے زیادہ ابیات ہیں اور دکنی شکرچر میں ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے شمس اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ "ہاشمی نے اپنا دیوان بھی مرتب کیا تھا جس میں قصائد و غزلیات کے علاوہ مرثیے اور قطعات اور رباعیات بھی تھے۔ یہ مجموعہ اس وقت نایاب ہے لیکن جن لوگوں نے اسے دیکھا ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ اس میں جس قدر غزلیات ہیں ان کا بیشتر حصہ رنجیت کے بجائے رنجیت میں ہے۔" قدیم بھاشا کا رنگ ان کے کلام میں بہت ہے اکثر جگہ صنعت ایہام سے کام لیتے ہیں اور ہندی شاعری کی متابعت میں عورت کا عشق مرد کے ساتھ ظاہر کرتے ہیں۔ ہاشمی نے بقول قادری ^{۱۶۴۲} ^{۱۶۴۳} میں انتقال کیا۔

دولت | یہ بھی ایک دکنی شاعر ہیں۔ انھوں نے ^{۱۶۴۲} ^{۱۶۴۳} میں ایک قصہ موسوم بہ شاہ بہرام و بانو سے حسن تصنیف کیا۔ جس میں بہرام گور اور ایک پری موسوم بہ بانو سے حسن کے عشق کا ذکر ہے اور شہر دیو سپید میں بہرام گور کو جو عجیب واقعات پیش آئے تھے ان کا بھی ذکر ہے۔

شاہ ملک | ان کا ذکر اردو سے قدیم میں ہے۔ شاہ ملک بیجاپور کے باشندے اور علی عادل شاہ کے معاصر تھے انھوں نے ایک رسالہ احکام الصلوٰۃ کے نام سے نظم دکنی میں لکھا ہے اور اس میں نماز کے فرائض و احکام بیان کیے ہیں یہ رسالہ کسی فارسی کتاب کا ترجمہ ہے اور ^{۱۶۴۲} ^{۱۶۴۳} میں تمام ہوا۔

شاہ امین | شیخ امین الدین اعلیٰ کا تخلص ہے۔ آپ بیجاپور کے ادیبائے کبار سے ہیں اور علی عادل شاہ کے زمانہ میں تھے۔ ^{۱۶۴۲} ^{۱۶۴۳} میں آپ کا انتقال ہوا آپ پر شب و روز محویت و استغراق کی کیفیت طاری رہتی تھی اور اسی حالت میں آپ نظم ارشاد فرماتے تھے۔ مریدوں نے ان کے عرفان حقائق کو جمع کیا اور اس مجموعہ کا نام جو اہل لاسر رکھا۔

دور بالے ان سے اور یادگار ہیں رسالہ ^{۱۶۴۲} ^{۱۶۴۳} ^{۱۶۴۴} ^{۱۶۴۵} ^{۱۶۴۶} ^{۱۶۴۷} ^{۱۶۴۸} ^{۱۶۴۹} ^{۱۶۵۰} ^{۱۶۵۱} ^{۱۶۵۲} ^{۱۶۵۳} ^{۱۶۵۴} ^{۱۶۵۵} ^{۱۶۵۶} ^{۱۶۵۷} ^{۱۶۵۸} ^{۱۶۵۹} ^{۱۶۶۰} ^{۱۶۶۱} ^{۱۶۶۲} ^{۱۶۶۳} ^{۱۶۶۴} ^{۱۶۶۵} ^{۱۶۶۶} ^{۱۶۶۷} ^{۱۶۶۸} ^{۱۶۶۹} ^{۱۶۷۰} ^{۱۶۷۱} ^{۱۶۷۲} ^{۱۶۷۳} ^{۱۶۷۴} ^{۱۶۷۵} ^{۱۶۷۶} ^{۱۶۷۷} ^{۱۶۷۸} ^{۱۶۷۹} ^{۱۶۸۰} ^{۱۶۸۱} ^{۱۶۸۲} ^{۱۶۸۳} ^{۱۶۸۴} ^{۱۶۸۵} ^{۱۶۸۶} ^{۱۶۸۷} ^{۱۶۸۸} ^{۱۶۸۹} ^{۱۶۹۰} ^{۱۶۹۱} ^{۱۶۹۲} ^{۱۶۹۳} ^{۱۶۹۴} ^{۱۶۹۵} ^{۱۶۹۶} ^{۱۶۹۷} ^{۱۶۹۸} ^{۱۶۹۹} ^{۱۷۰۰} ^{۱۷۰۱} ^{۱۷۰۲} ^{۱۷۰۳} ^{۱۷۰۴} ^{۱۷۰۵} ^{۱۷۰۶} ^{۱۷۰۷} ^{۱۷۰۸} ^{۱۷۰۹} ^{۱۷۱۰} ^{۱۷۱۱} ^{۱۷۱۲} ^{۱۷۱۳} ^{۱۷۱۴} ^{۱۷۱۵} ^{۱۷۱۶} ^{۱۷۱۷} ^{۱۷۱۸} ^{۱۷۱۹} ^{۱۷۲۰} ^{۱۷۲۱} ^{۱۷۲۲} ^{۱۷۲۳} ^{۱۷۲۴} ^{۱۷۲۵} ^{۱۷۲۶} ^{۱۷۲۷} ^{۱۷۲۸} ^{۱۷۲۹} ^{۱۷۳۰} ^{۱۷۳۱} ^{۱۷۳۲} ^{۱۷۳۳} ^{۱۷۳۴} ^{۱۷۳۵} ^{۱۷۳۶} ^{۱۷۳۷} ^{۱۷۳۸} ^{۱۷۳۹} ^{۱۷۴۰} ^{۱۷۴۱} ^{۱۷۴۲} ^{۱۷۴۳} ^{۱۷۴۴} ^{۱۷۴۵} ^{۱۷۴۶} ^{۱۷۴۷} ^{۱۷۴۸} ^{۱۷۴۹} ^{۱۷۵۰} ^{۱۷۵۱} ^{۱۷۵۲} ^{۱۷۵۳} ^{۱۷۵۴} ^{۱۷۵۵} ^{۱۷۵۶} ^{۱۷۵۷} ^{۱۷۵۸} ^{۱۷۵۹} ^{۱۷۶۰} ^{۱۷۶۱} ^{۱۷۶۲} ^{۱۷۶۳} ^{۱۷۶۴} ^{۱۷۶۵} ^{۱۷۶۶} ^{۱۷۶۷} ^{۱۷۶۸} ^{۱۷۶۹} ^{۱۷۷۰} ^{۱۷۷۱} ^{۱۷۷۲} ^{۱۷۷۳} ^{۱۷۷۴} ^{۱۷۷۵} ^{۱۷۷۶} ^{۱۷۷۷} ^{۱۷۷۸} ^{۱۷۷۹} ^{۱۷۸۰} ^{۱۷۸۱} ^{۱۷۸۲} ^{۱۷۸۳} ^{۱۷۸۴} ^{۱۷۸۵} ^{۱۷۸۶} ^{۱۷۸۷} ^{۱۷۸۸} ^{۱۷۸۹} ^{۱۷۹۰} ^{۱۷۹۱} ^{۱۷۹۲} ^{۱۷۹۳} ^{۱۷۹۴} ^{۱۷۹۵} ^{۱۷۹۶} ^{۱۷۹۷} ^{۱۷۹۸} ^{۱۷۹۹} ^{۱۸۰۰} ^{۱۸۰۱} ^{۱۸۰۲} ^{۱۸۰۳} ^{۱۸۰۴} ^{۱۸۰۵} ^{۱۸۰۶} ^{۱۸۰۷} ^{۱۸۰۸} ^{۱۸۰۹} ^{۱۸۱۰} ^{۱۸۱۱} ^{۱۸۱۲} ^{۱۸۱۳} ^{۱۸۱۴} ^{۱۸۱۵} ^{۱۸۱۶} ^{۱۸۱۷} ^{۱۸۱۸} ^{۱۸۱۹} ^{۱۸۲۰} ^{۱۸۲۱} ^{۱۸۲۲} ^{۱۸۲۳} ^{۱۸۲۴} ^{۱۸۲۵} ^{۱۸۲۶} ^{۱۸۲۷} ^{۱۸۲۸} ^{۱۸۲۹} ^{۱۸۳۰} ^{۱۸۳۱} ^{۱۸۳۲} ^{۱۸۳۳} ^{۱۸۳۴} ^{۱۸۳۵} ^{۱۸۳۶} ^{۱۸۳۷} ^{۱۸۳۸} ^{۱۸۳۹} ^{۱۸۴۰} ^{۱۸۴۱} ^{۱۸۴۲} ^{۱۸۴۳} ^{۱۸۴۴} ^{۱۸۴۵} ^{۱۸۴۶} ^{۱۸۴۷} ^{۱۸۴۸} ^{۱۸۴۹} ^{۱۸۵۰} ^{۱۸۵۱} ^{۱۸۵۲} ^{۱۸۵۳} ^{۱۸۵۴} ^{۱۸۵۵} ^{۱۸۵۶} ^{۱۸۵۷} ^{۱۸۵۸} ^{۱۸۵۹} ^{۱۸۶۰} ^{۱۸۶۱} ^{۱۸۶۲} ^{۱۸۶۳} ^{۱۸۶۴} ^{۱۸۶۵} ^{۱۸۶۶} ^{۱۸۶۷} ^{۱۸۶۸} ^{۱۸۶۹} ^{۱۸۷۰} ^{۱۸۷۱} ^{۱۸۷۲} ^{۱۸۷۳} ^{۱۸۷۴} ^{۱۸۷۵} ^{۱۸۷۶} ^{۱۸۷۷} ^{۱۸۷۸} ^{۱۸۷۹} ^{۱۸۸۰} ^{۱۸۸۱} ^{۱۸۸۲} ^{۱۸۸۳} ^{۱۸۸۴} ^{۱۸۸۵} ^{۱۸۸۶} ^{۱۸۸۷} ^{۱۸۸۸} ^{۱۸۸۹} ^{۱۸۹۰} ^{۱۸۹۱} ^{۱۸۹۲} ^{۱۸۹۳} ^{۱۸۹۴} ^{۱۸۹۵} ^{۱۸۹۶} ^{۱۸۹۷} ^{۱۸۹۸} ^{۱۸۹۹} ^{۱۹۰۰} ^{۱۹۰۱} ^{۱۹۰۲} ^{۱۹۰۳} ^{۱۹۰۴} ^{۱۹۰۵} ^{۱۹۰۶} ^{۱۹۰۷} ^{۱۹۰۸} ^{۱۹۰۹} ^{۱۹۱۰} ^{۱۹۱۱} ^{۱۹۱۲} ^{۱۹۱۳} ^{۱۹۱۴} ^{۱۹۱۵} ^{۱۹۱۶} ^{۱۹۱۷} ^{۱۹۱۸} ^{۱۹۱۹} ^{۱۹۲۰} ^{۱۹۲۱} ^{۱۹۲۲} ^{۱۹۲۳} ^{۱۹۲۴} ^{۱۹۲۵} ^{۱۹۲۶} ^{۱۹۲۷} ^{۱۹۲۸} ^{۱۹۲۹} ^{۱۹۳۰} ^{۱۹۳۱} ^{۱۹۳۲} ^{۱۹۳۳} ^{۱۹۳۴} ^{۱۹۳۵} ^{۱۹۳۶} ^{۱۹۳۷} ^{۱۹۳۸} ^{۱۹۳۹} ^{۱۹۴۰} ^{۱۹۴۱} ^{۱۹۴۲} ^{۱۹۴۳} ^{۱۹۴۴} ^{۱۹۴۵} ^{۱۹۴۶} ^{۱۹۴۷} ^{۱۹۴۸} ^{۱۹۴۹} ^{۱۹۵۰} ^{۱۹۵۱} ^{۱۹۵۲} ^{۱۹۵۳} ^{۱۹۵۴} ^{۱۹۵۵} ^{۱۹۵۶} ^{۱۹۵۷} ^{۱۹۵۸} ^{۱۹۵۹} ^{۱۹۶۰} ^{۱۹۶۱} ^{۱۹۶۲} ^{۱۹۶۳} ^{۱۹۶۴} ^{۱۹۶۵} ^{۱۹۶۶} ^{۱۹۶۷} ^{۱۹۶۸} ^{۱۹۶۹} ^{۱۹۷۰} ^{۱۹۷۱} ^{۱۹۷۲} ^{۱۹۷۳} ^{۱۹۷۴} ^{۱۹۷۵} ^{۱۹۷۶} ^{۱۹۷۷} ^{۱۹۷۸} ^{۱۹۷۹} ^{۱۹۸۰} ^{۱۹۸۱} ^{۱۹۸۲} ^{۱۹۸۳} ^{۱۹۸۴} ^{۱۹۸۵} ^{۱۹۸۶} ^{۱۹۸۷} ^{۱۹۸۸} ^{۱۹۸۹} ^{۱۹۹۰} ^{۱۹۹۱} ^{۱۹۹۲} ^{۱۹۹۳} ^{۱۹۹۴} ^{۱۹۹۵} ^{۱۹۹۶} ^{۱۹۹۷} ^{۱۹۹۸} ^{۱۹۹۹} ^{۲۰۰۰} ^{۲۰۰۱} ^{۲۰۰۲} ^{۲۰۰۳} ^{۲۰۰۴} ^{۲۰۰۵} ^{۲۰۰۶} ^{۲۰۰۷} ^{۲۰۰۸} ^{۲۰۰۹} ^{۲۰۱۰} ^{۲۰۱۱} ^{۲۰۱۲} ^{۲۰۱۳} ^{۲۰۱۴} ^{۲۰۱۵} ^{۲۰۱۶} ^{۲۰۱۷} ^{۲۰۱۸} ^{۲۰۱۹} ^{۲۰۲۰} ^{۲۰۲۱} ^{۲۰۲۲} ^{۲۰۲۳} ^{۲۰۲۴} ^{۲۰۲۵} ^{۲۰۲۶} ^{۲۰۲۷} ^{۲۰۲۸} ^{۲۰۲۹} ^{۲۰۳۰} ^{۲۰۳۱} ^{۲۰۳۲} ^{۲۰۳۳} ^{۲۰۳۴} ^{۲۰۳۵} ^{۲۰۳۶} ^{۲۰۳۷} ^{۲۰۳۸} ^{۲۰۳۹} ^{۲۰۴۰} ^{۲۰۴۱} ^{۲۰۴۲} ^{۲۰۴۳} ^{۲۰۴۴} ^{۲۰۴۵} ^{۲۰۴۶} ^{۲۰۴۷} ^{۲۰۴۸} ^{۲۰۴۹} ^{۲۰۵۰} ^{۲۰۵۱} ^{۲۰۵۲} ^{۲۰۵۳} ^{۲۰۵۴} ^{۲۰۵۵} ^{۲۰۵۶} ^{۲۰۵۷} ^{۲۰۵۸} ^{۲۰۵۹} ^{۲۰۶۰} ^{۲۰۶۱} ^{۲۰۶۲} ^{۲۰۶۳} ^{۲۰۶۴} ^{۲۰۶۵} ^{۲۰۶۶} ^{۲۰۶۷} ^{۲۰۶۸} ^{۲۰۶۹} ^{۲۰۷۰} ^{۲۰۷۱} ^{۲۰۷۲} ^{۲۰۷۳} ^{۲۰۷۴} ^{۲۰۷۵} ^{۲۰۷۶} ^{۲۰۷۷} ^{۲۰۷۸} ^{۲۰۷۹} ^{۲۰۸۰} ^{۲۰۸۱} ^{۲۰۸۲} ^{۲۰۸۳} ^{۲۰۸۴} ^{۲۰۸۵} ^{۲۰۸۶} ^{۲۰۸۷} ^{۲۰۸۸} ^{۲۰۸۹} ^{۲۰۹۰} ^{۲۰۹۱} ^{۲۰۹۲} ^{۲۰۹۳} ^{۲۰۹۴} ^{۲۰۹۵} ^{۲۰۹۶} ^{۲۰۹۷} ^{۲۰۹۸} ^{۲۰۹۹} ^{۲۱۰۰} ^{۲۱۰۱} ^{۲۱۰۲} ^{۲۱۰۳} ^{۲۱۰۴} ^{۲۱۰۵} ^{۲۱۰۶} ^{۲۱۰۷} ^{۲۱۰۸} ^{۲۱۰۹} ^{۲۱۱۰} ^{۲۱۱۱} ^{۲۱۱۲} ^{۲۱۱۳} ^{۲۱۱۴} ^{۲۱۱۵} ^{۲۱۱۶} ^{۲۱۱۷} ^{۲۱۱۸} ^{۲۱۱۹} ^{۲۱۲۰} ^{۲۱۲۱} ^{۲۱۲۲} ^{۲۱۲۳} ^{۲۱۲۴} ^{۲۱۲۵} ^{۲۱۲۶} ^{۲۱۲۷} ^{۲۱۲۸} ^{۲۱۲۹} ^{۲۱۳۰} ^{۲۱۳۱} ^{۲۱۳۲} ^{۲۱۳۳} ^{۲۱۳۴} ^{۲۱۳۵} ^{۲۱۳۶} ^{۲۱۳۷} ^{۲۱۳۸} ^{۲۱۳۹} ^{۲۱۴۰} ^{۲۱۴۱} ^{۲۱۴۲} ^{۲۱۴۳} ^{۲۱۴۴} ^{۲۱۴۵} ^{۲۱۴۶} ^{۲۱۴۷} ^{۲۱۴۸} ^{۲۱۴۹} ^{۲۱۵۰} ^{۲۱۵۱} ^{۲۱۵۲} ^{۲۱۵۳} ^{۲۱۵۴} ^{۲۱۵۵} ^{۲۱۵۶} ^{۲۱۵۷} ^{۲۱۵۸} ^{۲۱۵۹} ^{۲۱۶۰} ^{۲۱۶۱} ^{۲۱۶۲} ^{۲۱۶۳} ^{۲۱۶۴} ^{۲۱۶۵} ^{۲۱۶۶} ^{۲۱۶۷} ^{۲۱۶۸} ^{۲۱۶۹} ^{۲۱۷۰} ^{۲۱۷۱} ^{۲۱۷۲} ^{۲۱۷۳} ^{۲۱۷۴} ^{۲۱۷۵} ^{۲۱۷۶} ^{۲۱۷۷} ^{۲۱۷۸} ^{۲۱۷۹} ^{۲۱۸۰} ^{۲۱۸۱} ^{۲۱۸۲} ^{۲۱۸۳} ^{۲۱۸۴} ^{۲۱۸۵} ^{۲۱۸۶} ^{۲۱۸۷} ^{۲۱۸۸} ^{۲۱۸۹} ^{۲۱۹۰} ^{۲۱۹۱} ^{۲۱۹۲} ^{۲۱۹۳} ^{۲۱۹۴} ^{۲۱۹۵} ^{۲۱۹۶} ^{۲۱۹۷} ^{۲۱۹۸} ^{۲۱۹۹} ^{۲۲۰۰} ^{۲۲۰۱} ^{۲۲۰۲} ^{۲۲۰۳} ^{۲۲۰۴} ^{۲۲۰۵} ^{۲۲۰۶} ^{۲۲۰۷} ^{۲۲۰۸} ^{۲۲۰۹} ^{۲۲۱۰} ^{۲۲۱۱} ^{۲۲۱۲} ^{۲۲۱۳} ^{۲۲۱۴} ^{۲۲۱۵} ^{۲۲۱۶} ^{۲۲۱۷} ^{۲۲۱۸} ^{۲۲۱۹} ^{۲۲۲۰} ^{۲۲۲۱} ^{۲۲۲۲} ^{۲۲۲۳} ^{۲۲۲۴} ^{۲۲۲۵} ^{۲۲۲۶} ^{۲۲۲۷} ^{۲۲۲۸} ^{۲۲۲۹} ^{۲۲۳۰} ^{۲۲۳۱} ^{۲۲۳۲} ^{۲۲۳۳} ^{۲۲۳۴} ^{۲۲۳۵} ^{۲۲۳۶} ^{۲۲۳۷} ^{۲۲۳۸} ^{۲۲۳۹} ^{۲۲۴۰} ^{۲۲۴۱} ^{۲۲۴۲} ^{۲۲۴۳} ^{۲۲۴۴} ^{۲۲۴۵} ^{۲۲۴۶} ^{۲۲۴۷} ^{۲۲۴۸} ^{۲۲۴۹} ^{۲۲۵۰} ^{۲۲۵۱} ^{۲۲۵۲} ^{۲۲۵۳} ^{۲۲۵۴} ^{۲۲۵۵} ^{۲۲۵۶} ^{۲۲۵۷} ^{۲۲۵۸} ^{۲۲۵۹} ^{۲۲۶۰} ^{۲۲۶۱} ^{۲۲۶۲} ^{۲۲۶۳} ^{۲۲۶۴} ^{۲۲۶۵} ^{۲۲۶۶} ^{۲۲۶۷} ^{۲۲۶۸} ^{۲۲۶۹} ^{۲۲۷۰} ^{۲۲۷۱} ^{۲۲۷۲} ^{۲۲۷۳} ^{۲۲۷۴} ^{۲۲۷۵} ^{۲۲۷۶} ^{۲۲۷۷} ^{۲۲۷۸} ^{۲۲۷۹} ^{۲۲۸۰} ^{۲۲۸۱} ^{۲۲۸۲} ^{۲۲۸۳} ^{۲۲۸۴} ^{۲۲۸۵} ^{۲۲۸۶} ^{۲۲۸۷} ^{۲۲۸۸} ^{۲۲۸۹} ^{۲۲۹۰} ^{۲۲۹۱} ^{۲۲۹۲} ^{۲۲۹۳} ^{۲۲۹۴} ^{۲۲۹۵} ^{۲۲۹۶} ^{۲۲۹۷} ^{۲۲۹۸} ^{۲۲۹۹} ^{۲۳۰۰} ^{۲۳۰۱} ^{۲۳۰۲} ^{۲۳۰۳} ^{۲۳۰۴} ^{۲۳۰۵} ^{۲۳۰۶} ^{۲۳۰۷} ^{۲۳۰۸} ^{۲۳۰۹} ^{۲۳۱۰} ^{۲۳۱۱} ^{۲۳۱۲} ^{۲۳۱۳} ^{۲۳۱۴} ^{۲۳۱۵} ^{۲۳۱۶} ^{۲۳۱۷} ^{۲۳۱۸} ^{۲۳۱۹} ^{۲۳۲۰} ^{۲۳۲۱} ^{۲۳۲۲} ^{۲۳۲۳} ^{۲۳۲۴} ^{۲۳۲۵} ^{۲۳۲۶} ^{۲۳۲۷} ^{۲۳۲۸} ^{۲۳۲۹} ^{۲۳۳۰} ^{۲۳۳۱} ^{۲۳۳۲} ^{۲۳۳۳} ^{۲۳۳۴} ^{۲۳۳۵} ^{۲۳۳۶} ^{۲۳۳۷} ^{۲۳۳۸} ^{۲۳۳۹} ^{۲۳۴۰} ^{۲۳۴۱} ^{۲۳۴۲} ^{۲۳۴۳} ^{۲۳۴۴} ^{۲۳۴۵} ^{۲۳۴۶} ^{۲۳۴۷} ^{۲۳۴۸} ^{۲۳۴۹} ^{۲۳۵۰} ^{۲۳۵۱} ^{۲۳۵۲} ^{۲۳۵۳} ^{۲۳۵۴} ^{۲۳۵۵} ^{۲۳۵۶} ^{۲۳۵۷} ^{۲۳۵۸} ^{۲۳۵۹} ^{۲۳۶۰} ^{۲۳۶۱} ^{۲۳۶۲} ^{۲۳۶۳} ^{۲۳۶۴} ^{۲۳۶۵} ^{۲۳۶۶} ^{۲۳۶۷} ^{۲۳۶۸} ^{۲۳۶۹} ^{۲۳۷۰} ^{۲۳۷۱} ^{۲۳۷۲} ^{۲۳۷۳} ^{۲۳۷۴} ^{۲۳۷۵} ^{۲۳۷۶} ^{۲۳۷۷} ^{۲۳۷۸} ^{۲۳۷۹} ^{۲۳۸۰} ^{۲۳۸۱} ^{۲۳۸۲} ^{۲۳۸۳} ^{۲۳۸۴} ^{۲۳۸۵} ^{۲۳۸۶} ^{۲۳۸۷} ^{۲۳۸۸} ^{۲۳۸۹} ^{۲۳۹۰} ^{۲۳۹۱} ^{۲۳۹۲} ^{۲۳۹۳} ^{۲۳۹۴} ^{۲۳۹۵} ^{۲۳۹۶} ^{۲۳۹۷} ^{۲۳۹۸} ^{۲۳۹۹} ^{۲۴۰۰} ^{۲۴۰۱} ^{۲۴۰۲} ^{۲۴۰۳} ^{۲۴۰۴} ^{۲۴۰۵} ^{۲۴۰۶} ^{۲۴۰۷} ^{۲۴۰۸} ^{۲۴۰۹} ^{۲۴۱۰} ^{۲۴۱۱} ^{۲۴۱۲} ^{۲۴۱۳} ^{۲۴۱۴} ^{۲۴۱۵} ^{۲۴۱۶} ^{۲۴۱۷} ^{۲۴۱۸} ^{۲۴۱۹} ^{۲۴۲۰} ^{۲۴۲۱} ^{۲۴۲۲} ^{۲۴۲۳} ^{۲۴۲۴} ^{۲۴۲۵} ^{۲۴۲۶} ^{۲۴۲۷} ^{۲۴۲۸} ^{۲۴۲۹} ^{۲۴۳۰} ^{۲۴۳۱} ^{۲۴۳۲} ^{۲۴۳۳} ^{۲۴۳۴} ^{۲۴۳۵} ^{۲۴۳۶} ^{۲۴۳۷} ^{۲۴۳۸} ^{۲۴۳۹} ^{۲۴۴۰} ^{۲۴۴۱} ^{۲۴۴۲} ^{۲۴۴۳} ^{۲۴۴۴} ^{۲۴۴۵} ^{۲۴۴۶} ^{۲۴۴۷} ^{۲۴۴۸} ^{۲۴۴۹} ^{۲۴۵۰} ^{۲۴۵۱} ^{۲۴۵۲} ^{۲۴۵۳} ^{۲۴۵۴} ^{۲۴۵۵} ^{۲۴۵۶} ^{۲۴۵۷} ^{۲۴۵۸} ^{۲۴۵۹} ^{۲۴۶۰} ^{۲۴۶۱} ^{۲۴۶۲} ^{۲۴۶۳} ^{۲۴۶۴} ^{۲۴۶۵} ^{۲۴۶۶}

شعراے دکن
مغلوں کے عہد حکومت میں
بیجا پور و گولکنڈہ کو مغل بادشاہوں نے فتح کر لیا اور ان سلطنتوں کا خاتمہ ہو گیا لیکن شعراے اردو کی قدر و مراعات میں کوئی فرق نہیں ہوا۔ زبان اردو کے عام ہونے کی وجہ سے تمام ملک میں اردو شعرو شاعری پھیل گئی۔ اس زمانہ کے مشہور اردو شعرا ذیل میں درج ہیں۔

عاجز | محمد علی تخلص عاجز اور نگ زیب کی فتوحات دکن کے زمانہ میں موجود تھے
ان کی تصنیفات سے قصہ فیروز شاہ ہے جو اردو میں محبوب القلوب کا ترجمہ ہے دوسری
تصنیف قصہ لعل و گوہر ہے اس میں لعل از مراد بادشاہ بنگال کے فرزند اور گوہر جو اہر
شاہ بنگال کی دختر کے عشق و محبت کا افسانہ مذکور ہے قصہ ملکہ مصر بھی عاجز نے فارسی سے
دکنی میں نظم کیا۔ عاجز کا ذکر شرح طور پر اردو کے قدیم و تاریخ شعرائے دکن میں درج ہے۔
بحری | قاضی محمود تخلص بہ بحری دلد بحر الدین دکن کے ایک صوفی مشرب بزرگ تھے
۹۵۰ھ کے قریب اپنے وطن سے بیجا پور چلے گئے اور وہاں سکندر عادل شاہ کے
دربار میں دو سال رہے اور جب ۱۰۰۰ھ میں سلطنت تباہ ہو گئی تو حیدر آباد چلے آئے
فارسی اور دکنی زبانوں میںثنویات، غزلیات، رباعیات اور قصائد لکھے جن کے
اشعار کی تعداد پچاس ہزار کے قریب تھی مگر یہ سب ذخیرہ راستہ میں تلف ہو گیا۔ آپ
کی تصنیف ”من لکن“ تصوف میں ایکثنوی ہے اور یہ زبان دکنی ۱۱۱۲ھ بحری
میں تمام ہوئی زبان اُس کی شکل اور الفاظ سخت ہیں۔

ایں شیخ محمد امین متخلص بہ امین عہد اور نگ زیب میں گزولہ انھوں نے یوسف زینب

کے فائدہ کو دکنی میں ۱۱۹۰ھ میں منظم کیا۔

دلی دکنی | سید محمد فیاض نام۔ ملا محمد باقر آگاہ نے مرآۃ الجنان کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ دیو ران کا وطن تھا۔ عالمگیری کے زمانہ میں گزرے ہیں۔ دکن میں سات گراہیک تاریخی مقام ہے وہاں حراست خاں نام ایک امیر رہتا تھا۔ دلی عرصہ تک اُسکی رفاقت میں رہے پھر وہاں سے نکل کر کرتاپہ میں چلے آئے۔ یہ واقعات دلی نے ”رتن پدم“ کے دیباچہ میں بیان کیے ہیں اس کو دلی نے سدھوٹ میں لکھا تھا۔ یہ مثنوی ضخیم ہے دوسری تصنیف ”روضۃ الشہداء“ ہے اس میں کر بلا کے واقعات منظم کیے ہیں اور یہ ۱۱۹۰ھ میں لکھی گئی تھی۔ ان کے علاوہ ایک مناجات بھی لکھی ہے۔

جدی | بقول نصیر الدین ہاشمی مؤلف اردوے دکن ”اس تخلص کے دکن میں دو شاعر ہوئے ہیں ایک جدی سلطان محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں تھا جس نے تحفۂ عاشقاں ۱۰۱۵ھ میں لکھی اور دوسرے جدی جنھوں نے بارہویں صدی میں کئی ایک مثنویاں لکھیں اس میں سے ایک پنجی نامہ ہے جو شیخ فرید الدین عطار کے منطق الطیر کا ترجمہ ہے جس کو جدی نے ۱۱۵۵ھ میں ترتیب دیا۔ بقول مؤلف اردوے قدیم مثنوی تحفۂ عاشقاں شیخ فرید الدین عطار کی مثنوی گل دہر مز کا ترجمہ ہے جو خسرو نامہ یا خسرو گل بھی کہلاتی ہے یہ مثنوی ۱۱۵۳ھ میں ختم ہوئی اور خاتمہ میں اس کی تعریف اس طرح مذکور ہے۔

پہچانوا سے تحفۂ عاشقاں

دسے اسکی تارخ بھکوں عیاں

غالباً مؤلف اردوے قدیم کا قول صحیح معلوم ہوتا ہے ان سے ایک اور ضخیم مثنوی یادگار ہے۔ اس کا نام مثنوی باغ جاغزا ہے۔ ۱۱۵۵ھ میں تصنیف ہوئی اور ”باغ جاغزا“ سے اس کی تاریخ نکالی ہے۔

۱۱۵۵ھ خاوند اردوے قدیم ۱۲

آزاد فقیر اللہ تخلص بہ آزاد حیدر آباد کے باشندے اور ولی اورنگ آبادی کے
معاصر تھے ان کا ذکر تذکرہ شعرا میر حسن و نکات الشعرا میں درج ہے
شعراے اورنگ آباد اورنگ زیب جب دکن کا صوبہ دار مقرر ہوا تو اس نے کمر کی کو
اپنا صدر مقام قرار دیا اور اس کا نام اورنگ آباد رکھا۔ اس کے بعد اورنگ زیب
کی عمر کا بیشتر حصہ اسی شہر میں بسر ہوا اور ایک عرصہ تک یہ شہر سلطنتِ خلیہ کا مرکز رہا
اس تقریب سے ہندوستان اور دہلی کے بڑے بڑے امراء علماء دانشمندان جن کو شاہی
دربار سے کسی قسم کا بھی واسطہ تھا اورنگ آباد چلے آئے اور حیدر آباد دہلی پور کی
تباهی کے بعد یہاں کے باشندے بھی اورنگ آباد کی جانب متوجہ ہوئے۔ اس درمیان
بہت سے شاعر گزرے جن کے حالات یہ عبدالولی عزت کی بیاض لکھی زائن شفیق
بحمدستان شعرا۔ میر بہار الدین عروج کے بہارِ دُخزان۔ اور محمد افضل کے شفقۃ الشعراء
تذکرہ موسوی خاں میں تحریر ہیں میر حسن نے بھی اپنے تذکرہ میں لکھا ہے۔

دلی ۱۶۶۵ء عیسوی | دلی کو اردو شاعری کے ساتھ وہی نسبت ہے جو چاسر کو انگریزی
لغایت ۱۴۴۲ء کے ساتھ اور رد کی کو فارسی شاعری کے ساتھ ہے یہی وہ بزرگ
ہستی ہیں جن سے موجودہ اردو شاعری کی بنیاد پڑی۔ آزاد مرحوم کے دعوے کے مطابق
اب تک سب کا یہی خیال تھا کہ سب سے پہلے اردو میں دیوان جمع کرنے والے آئی
ہیں مگر جب سے کہ قطب شاہیوں کے دوا دین دستیاب ہو گئے اس وقت سے اس
خیال کی تردید ہو گئی مگر اس واقعہ سے دلی کے کمال میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اردو شاعری
کو ان کی وجہ سے جو تقویت پہنچی وہ کبھی زائل نہیں ہو سکتی ان کو ان کے معاصرین
اور مابعد کے قریب العہد شعرا مثلاً شاہ حاتم وغیرہ سب نے استاد مانا ہے اور ان
کے کلام کی بڑی قدر کی ہے۔

نام کے متعلق اختلاف | دلی کے نام میں اختلاف ہے بعضوں کے نزدیک انکا نام

شمس الدین اور تخلص دلی ہے اور بعض محمد دلی نام شمس الدین لقب اور دلی تخلص بتاتے ہیں میر حسن دہلوی۔ مرزا علی لطف و نسخ و بلوم ہارٹ کے نزدیک شاہ دلی اللہ نام ہے اور نواب علی ابراہیم اور یوسف علی و آزاد شمس دلی اللہ کہتے ہیں ہمارے نزدیک اس اختلاف کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اسی عہد میں شمس دلی اللہ نام ایک صوفی احمد آباد میں رہتے تھے جن کے توافق نام کی وجہ سے یہ خلط ملط واقع ہو گیا۔

معام پیدائش اور خاندان | گارس ڈیٹاسی۔ بلوم ہارٹ۔ اور میر حسن کا یہ خیال ہے
کے متعلق اختلاف | کہ دلی احمد آباد میں پیدا ہوئے مگر یہ صحیح نہیں ہے اُن کی

ولادت اورنگ آباد میں ۱۰۶۹ھ مطابق ۱۶۶۱ء میں ہوئی جس کی تصدیق میر تقی میر کے تذکرہ نکات الشعراء سے بھی ہوتی ہے دلی کا تعلق خاندان شاہ وجیہ الدین علوی کے ساتھ صحیح نہیں معلوم ہوتا بلکہ وہ اورنگ آباد کے شیوخ قادریہ میں سے تھے۔ البتہ وہ شاہ وجیہ الدین کے خاندان میں بیعت رکھتے تھے۔ کیونکہ جو قصائد اور ترجیع بند وغیرہ انھوں نے ان بزرگ کی شان میں لکھے ہیں اُن سے اُن کے حسن عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔ مگر شجرہ اولاد شاہ وجیہ الدین علوی میں اُنکا نام کہیں نہیں پایا جاتا۔ اُن کے کلام سے پایا جاتا ہے کہ وہ گجراتی نہ تھے بلکہ دکنی تھے اور دکنی الفاظ بھی یہ کثرت استعمال کیے ہیں۔ جو لوگ اُن کے گجراتی ہونے کے مدعی ہیں وہ اپنے دعوے کی تائید میں ان کا ایک قصہ پیش کرتے ہیں جس میں اُنھوں نے گجرات سے مفارقت پر اظہار ملال کیا ہے مگر ہماری رائے میں یہ کافی ثبوت اس امر کا نہیں ہو سکتا کہ گجرات ان کا مولد مسکن تھا اسی طرح اس مثنوی سے جو شہر سورت کی تعریف میں لکھی ہے ان کا گجراتی الاصل ہونا پایا نہیں جاتا۔

حالات زندگی | اورنگ آباد میں پیدا ہوئے جہاں بیس برس تک تحصیل علوم کرتے رہے
بعد ازاں احمد آباد گئے جو اس زمانہ میں علوم و فنون کا مرکز تھا۔ اور شاہ وجیہ الدین

علوی کے مدرسہ میں جہاں لوگ مختلف مقامات دور دراز سے تحصیل علوم کے لئے آتے تھے داخل ہوئے اور تھوڑے عرصہ کے بعد اس خاندان کے مرید ہو گئے کچھ دنوں بعد اپنے وطن آکر شعرو شاعری شروع کی اور اُس میں انھیں پورا انہماک ہو گیا۔ ان کا کلام تقریباً سب اصناف سخن میں موجود ہے یعنی غزل، قصیدہ، مثنوی، مستزاد، رباعیات، ترجیع بند وغیرہ پھر احمد آباد گئے۔ جہاں انھوں نے اپنے احباب کو اپنا کلام سنایا اور انھوں نے اُسکو بہت پسند کیا۔

دلی کے دو سفر تذکرہ دلی میں ہے کہ دلی دو مرتبہ دئی آئے ایک مرتبہ شہنشاہ اورنگ زیب کے عہد یعنی سن ۱۰۷۰ میں اس مرتبہ شاہ سعد اللہ گلشن سے ملاقات ہوئی جنھوں نے فرمایا کہ "یہ سب مضامین جو بیکار فارسی میں بھرے پڑے ہیں ان کو زبان ریختہ میں کام میں لاؤ تم سے کون محاسبہ کرے گا" اس واقعہ سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ دلی میاں گلشن کے شاگرد ہوئے تھے البتہ اُن سے عقیدت رکھتے تھے اور مذاق تصوف بھی انھیں کی محبت میں حاصل کیا تھا۔ دوسری مرتبہ سید ابو المعالی کے ساتھ سفر کیا جس میں دلی اور سرہند کے منارات کی زیارت کی۔ سید ابو المعالی سے ان کو کمال محبت تھی جو دینیہ عشق کو پہونچ گئی تھی دلی کا یہ دوسرا سفر محمد شاہ کے عہد سلطنت میں ۱۱۳۳ھ مطابق ۱۷۲۰ء میں ہوا اس سفر میں دلی اپنے ساتھ اپنا دیوان ریختہ لائے تھے جس کی نہایت قدر دانی کی گئی اور جو بہت مقبول اور ہر دلعزیز ہوا۔ اور یہاں تک اس کی شہرت ہوئی کہ امریکی محفلوں اور جلسوں اور کوچہ بازار میں اُس کے اشعار لوگوں کی زبان پر تھے اُن کے اشعار کو سن کر لوگوں کو شعر گوئی کا شوق پیدا ہو گیا۔

وہ مجلس ۱۱۳۵ھ میں دلی سے اورنگ آباد واپس آئے جہاں شہدائے کربلا کی شان میں ایک مثنوی موسوم بہ وہ مجلس تصنیف کی جس کے بیان دو آخری شعروں سے اس کا سنہ تصنیف اور اُس کی زبان کا حال معلوم ہو جاتا ہے:-

تھا گیارہ سو پہ اکتالیس سال
دلی کا ہے سخن حق پاس مقبول

ہوا ہے ختم جیب یو درد کا حال
کہا ہاتھ نے تو تائیں مقبول

اس مثنوی کو فضلی نے نثر کے قالب میں ڈھالا جو اصل کتاب سے بھی زیادہ مقبول ہے صاحب گلشن ہند لکھتے ہیں کہ دلی کا ایک ہندی دیوان بھی ہے مولانا آزاد اور مصنف گل رعنا کا بیان ہے کہ دلی نے دیوان کے علاوہ تصوف میں بھی ایک رسالہ نور المعرف لکھا ہے لیکن وہ ناپید ہو گیا ہے۔

وفات | دلی کو گجرات سے ایسی دلچسپی ہو گئی تھی کہ اورنگ آباد میں کچھ دنوں رہ کر پھر احمد آباد چلے گئے جہاں بقول تذکرہ شعرائے دکن ۱۱۵۵ھ مطابق ۱۷۴۲ء میں انتقال کیا اور وہیں مدفون ہوئے۔

دلی کے بہت سے دوست تھے جن سے ان کو خاص محبت اور خلوص تھا مثلاً لالہ کھیم داس اورنگ آبادی امرت لال گوہر لال اور محمد یار خاں دہلوی وغیرہ ان سب کا ذکر مناسب مقام پر ان کے اشعار میں موجود ہے۔ وہ گو کہ حنفی المذہب تھے جیسا کہ صحابہ کبار کی تعریف سے ظاہر ہے جو ان کے اشعار میں موجود ہے۔ مگر ساتھ ہی کسی مذہب و ملت سے انکو کوئی تعصب نہ تھا کیونکہ وہ ایک صوفی منش فقیر مشرب شخص تھے انھوں نے بہت سی دیوانت کی تھی اور اکثر مقامات دور دراز کو دیکھا تھا بنگال میں ان کا جانا پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتا مگر گارسن ڈیٹاسی نے کسی شعر سے جس میں حسن بنگال کی تعریف ہے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ وہ بنگال بھی گئے تھے البتہ تارا۔ دلی اور سورت کا سفر یقینی ہے اس وجہ سے کہ ان تمام مقامات کی تعریف ان کے اشعار میں موجود ہے۔ مثلاً سورت کی تعریف میں ایک مثنوی میں کہتے ہیں۔

عجب شہروں میں ہے پر نور اک شہر | بلا شک ہے وہ جگ میں مقصد دہر

کہ ہے مشہور اس کا نام صورت	کہ جادے جس کے دیکھے سب کدورت
بھری ہے میرت و صورت سوں صورت	ہر اک صورت ہے واں انمول صورت

دہلی نے کسی امیر یا بادشاہ کی تعریف میں اشعار نہیں کہے مگر فارسی کے قانع میں اپنی شان میں اکثر فخریہ اشعار کہے ہیں جن میں جا بجا معاصرین پرچو میں ہیں۔

کلام پر اسے ان کی تصانیف باعتبار قدامت اور نیز بہ اعتبار زبان بہت پسند ہیں عبادت آسان اور سہل ہے شعر اے مابعد نے ان کا تتبع کیا ہے اور انھیں کی شاعری سے شمالی ہند میں شعر کی بنیاد مضبوط ہوئی۔ سادگی، سلاست اور ترنم ان کے کلام کے جوہر ہیں۔ اشعار میں ردائی بے تکلفی اور آہستہ اور صنائع بدائع بکثرت نہیں ہیں۔ بعض شعر تو ایسے صاف ہیں کہ بالکل زمانہ حال کے معلوم ہوتے ہیں مثلاً:-

دل چھوڑ کے یا رکھو نہ جاوے	زخمی ہے شکار کیونکہ جادے
دشمن دیں کا دین دشمن ہے	راہزن کا چراغ دہن ہے

آغوش میں آنے کی کہاں تاب ہے مہر کو
عجب کچھ لطف رکھتا ہے شب غلوت میں لہر سے
گناہوں کی سیہ نامی سے کیا غم اُس پریشاں کو
کرتی ہے نگہ جس قدنازک یہ گروانی
سوال آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ
جسے وہ زلف دستاویز ہو ورنیامت میں

نخوب رو خوب کام کرتے ہیں	اک جگہ میں غلام کرتے ہیں
دل ہوا ہے مرا خراب سخن	دیکھ کر حسن بے حجاب سخن
بزم معنی میں سرخوشی ہے سے	جس کو ہے نشہ شراب سخن
راہ مضمون تازہ بند نہیں	تا قیامت کھلا ہے باب سخن
گو ہر اُس کی نظر میں جانہ کرے	جس نے دیکھا ہے آپ و تاب سخن
ہے سخن جگ منے عیدم امثل	جز سخن نہیں درجا جواب سخن

دل ہوا ہے مرا کبابِ سخن
بھگو دیتے ہیں سب کبابِ سخن

شعر منوں کی دیکھ کر گرمی
عرفی و انوری و خاقانی

اے دلی درد سر کھونہ رہے
جب ملے صندل و گلابِ سخن

داؤد | مرزا داؤد نام داؤد تخلص وطن اردنگ آباد دلی کے معاصر تھے اور ۱۱۷۷ھ میں انتقال کیا۔ ایک چھوٹا سا دیوان ان سے یادگار ہے۔

سراج | سید سراج الدین نام آپ سادات حسینی خاندان مشائخ سے تھے۔ اردنگ آباد کے رہنے والے تھے اور وہیں تربیت و تعلیم پائی۔ غالباً آپ ۱۱۷۷ھ میں پیدا ہوئے آپ نے اپنا حال منتخب و دادین کے دیباچے میں لکھا ہے۔ اس منتخب کا تاریخی نام ”منتخب دیوانہ“ ۱۱۷۹ھ ہجری ہے۔ سراج نے اس میں متقدمین و معاصرین شعرا کے فارسی کلام کا انتخاب کیا ہے مجموعہ ضخیم ہے۔ اور اس میں کئی ہزار اشعار ہیں۔ دادین فارسی کا اس طور پر انتخاب کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نقاد سخن تھے سراج خود کہتے ہیں ”یہ فقیر بارہ برس کی عمر میں جوش جذبہ و غلبہ شوق سے سات برس تک برہنہ تن و برہنہ سر رہا۔ اکثر اوقات عالم بھودی میں حضرت شاہ بہان الدین غریب دولت آبادی کے روضہ کے اطراف میں گھومتا تھا۔ اسی حالتِ مستی میں اکثر اشعار فارسی زبان سے برآمد ہوتے۔ مگر تجرید کے دائرہ میں نہیں آئے اور اگر وہ تمام اشعار موجود ہوتے تو ایک ضخیم و بزرگ دیوان مرتب ہو جاتا۔ پھر مدت مذکورہ کے بعد حضرت خواجہ سید شاہ عبدالرحمن حسینی التونی ۱۱۷۹ھ کی خدمت میں پہنچا جس نے ارادت سے مرید ہوا۔ ان دنوں میں پاس خاطر عزیز علی عبدالرسول خاں جو فقیر کے برادرِ طریقت تھے۔ اکثر اشعارِ نختہ زبان میں لکھے گئے خاں صاحب نے جو اہر متفرق کو جو تخمیناً پانچ ہزار اشعار تھے

۱۔ ماخوذ از اردو سے قدیم ۲

حرف تہجی میں ترتیب دیا اور کامل دیوان شائقین کی خدمت میں بھیجا۔ پھر فقیری اختیار
کی اور مرشد کے حکم سے شعر گوئی ترک کی۔ سراج ایک درویش منش پاکباز بزرگ تھے۔
مسافر دست و غریب نواز گوشت نشین و پاکیزہ دل بیہفتہ میں ایک روز محفل سماع
منتقد فرماتے تھے اُس میں شہر کے اکثر عمائد و مشائخ جمع ہوتے تھے تو ال دگوئے اُچھی لیں
سناتے تھے مجلس میں آپ کا وہ رعب وہ اب تھا۔ کہ اہل مجلس باادب عالم سکوت میں ہوتے
تھے اُس وقت دکن میں آپ کے معاصرین میں بے میر غلام علی آزاد بلگرامی عبد الوہاب
انتخار دولت آبادی۔ ظفر بیگ ظفر اور نگ آبادی۔ محمد فقیہ دردمند مرزا محمد باقر شہید
وجان مرزا رسامو سوی خاں جرأت اور نگ آبادی و عبد القادر سامی اور نگ آبادی
عارف الدین خاں عاجر۔ موسوی خاں فطرت۔ خانی خاں۔ لکھی نرائن شفیق اور نگ
آبادی اور میر اولاد محمد ذکا بلگرامی وغیرہ شعراء علماد مشائخ تھے خوب شاعر ہوتے تھے
اور سراج باوجود گوشت نشینی مشاعروں میں شریک ہوتے اور کبھی کبھی اصرار سے شعر کہتے۔
میر نے نکات الشعرا میں اور حسن نے اپنے تذکرہ میں تحریر کیا ہے کہ سراج کو سید حمزہ
دکنی سے غلذہ حاصل تھا مگر دکن میں کسی شاعر کا نام سید حمزہ پایہ حزنہ علی نہیں تھا لہذا غالب
میر ہے کہ سراج نے کسی کی شاگردی نہیں کی۔ سراج نے ایک دیوان فارسی کا اور
ایک ریختہ کا جس میں پانچ ہزار اشعار ہیں اپنی یادگار چھوڑے منتخب دیوانہا
کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ ایک شہسوی بوستان خیال بھی لکھی جس میں ایک ہزار سات ابیات
ہیں اور گل و بلبل کے انساں میں جذبات معرفت کی ترجمانی کی ہے۔ یہ شہسوی ^{۱۱۷۳} ۱۱۷۳
میں تمام ہوئی۔

آپ کا کلام بھی دلی کی طرح ایہام و ذوق معانی الفاظ سے پاک و صاف ہے۔
سیدھا سادہ بیان ہے بے تکلف و بناوٹ کا نشان نہیں۔ اکثر غزلوں میں حسن و عشق کے
کرتے بغض اشعار میں توحید و معرفت کا نقشہ مضامین میں شگفتگی خیالات میں بلندی اور پھر کلام

میں صفائی اور سادگی موجود ہے۔ ریختہ گوئی میں دلی کے قائم مقام تھے۔ دکن میں استاد
 کے رتبہ کو پہنچے۔ دلی نے اس زمین میں جو کچھ پودے جمائے تھے اور جو کچھ
 سبزے لگائے تھے سراج نے اُن کو اپنی توجہ کے پانی سے سیراب و شاداب کیا
 آپ نے جو تھی شمالِ روم جمعہ ۱۱۷۷ء میں انتقال فرمایا یہ غزل سراج کی بہت شہور ہے
 خبرِ تیرِ عشق سن نہ جنوں رہا نہ پوری رہی
 نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی
 شہِ بخود نے عطا کیا مجھے اب لباسِ برہنگی
 نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ درسی رہی
 چلی سمتِ غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
 مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے دل کہیں سنبھری رہی
 نظرِ تغافلِ یار کا لگے کس زبانِ سینِ بیاں کروں
 کہ شرابِ صدِ قدحِ آرزوِ ختمِ دل میں تھی سو بھری رہی
 وہ عجب گھڑی تھی کہ میں گھڑی لیا، دس نسخہِ عشق کا
 کہ کتابِ عقل کی طاقِ برہیوں دھری تھی۔ یونہی دھری رہی
 ترے جوشِ حیرتِ حُسن کا اثر اس قدر سینِ عیاں ہوا
 کہ نہ آئینہ میں جلا رہی نہ پری کی جسلوہ گری رہی
 کیا خاکِ آتشِ عشق نے دلِ بینوئے سراج کوں
 نہ خطر رہا نہ حذر رہا مگر ایک بے خطری رہی
 دیگر شعرا اس دور میں بہت سے شاعر گزرے ہیں جن کا ذکر وجہِ طوالت نظر انداز
 اس دور کے کیا جاتا ہے۔ ان کے نام و حالات تذکرہ لکھی نرائن و تذکرہ موسوی خاں
 و حکمت الشعرا میں تذکرہ شعرائے اردو میں حسی تذکرہ شعرائے دکن مؤلف عبد الجبار خاں

لکھا پوری۔ دکن میں اردو مولفہ نصیر الدین ہاشمی سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ بعض مشہور شعرا اس زمانہ کے حسب ذیل ہیں :- عارف الدین عاجز۔ سید عبدالولی عزالت۔ بار محرم۔ ایما۔ داغ۔ نگین۔ ہمدی۔ عزیز۔ صائم۔ تھر۔ پناہ۔ رضا۔ عراقی۔ ہمتاب۔ شرافت۔ شہید۔ ضیا۔ کاکم۔ بتلا۔ نجم۔ ہدم۔ درد۔ حشمت۔ حاجی۔ ستار۔ فخر۔ فتوت۔ قدر۔ ان میں عزالت اور عاجز زیادہ مشہور و نام آور ہیں اور جو حالات کہ مصنف گلِ رعنا نے ان شعرا کے درج کیے ہیں وہ زیادہ تر تذکرہ شعرائے دکن سے ماخوذ ہیں۔

احاطہ مدراس | مولوی محمد باقر متخلص بہ آگاہ دیلور میں پیدا ہوئے اور انھوں نے دارکھٹ کے شعرا | اردو زبان میں سیر۔ عقاید۔ فقہ کی متعدد کتابیں لکھیں ۱۰۵ھ سے انھوں نے تصنیف کا کام شروع کیا۔ ۱۲۲ھ میں انتقال فرمایا۔ ان کے بزرگان مہلف و طنائیجا پوری تھے مولف شمع انجمن لکھتے ہیں کہ درخیابان کرناٹک سمجھو انہاں سر بالا نکرده داز گل زمین مدراس مثل او گل خوش رنگ نہ و میدہ اردو تصنیفات کی فہرست حسب ذیل ہے۔ بہشت بہشت۔ تحفۃ الاحباب۔ تحفۃ الزا۔ فرائد در عقائد۔ ریاض الجنان محبوب القلوب۔ روضۃ السلام۔ گلزار عشق۔ قصہ رضوان شاہ۔ روح افزا۔ خمہ متجرہ۔ مثنوی روپ سنگار۔ ارکاٹ کے دربار کے مدارالمہام شرف الملک مولانا محمد غوث۔ اور ان کے خلات مولانا قاضی بدرالدولہ نے بھی کئی کتابیں اردو میں لکھیں اس وقت کے شعراء کے نام ذیل میں رقم ہیں۔ محمود۔ صبا فی احمد۔ اعظم

باب

اساتذہ دہلی

حصہ اول طبقہ متقدمین

حاکم و آبرو کا زمانہ

دہلی میں اردو زبان کی ابتدا ترقی کر چکی تھی اور اُس میں اُس زمانہ سے تصنیف و تالیف کا آغاز

ہو گیا تھا بر خلاف اس کے جہاں تک معلوم ہوا ہندوستان میں بارہویں صدی کے آغاز تک یہ زبان محض بات چیت اور لین دین تک محدود رہی۔ مولانا جمال جو شہنشاہ بابر کے معاصر تھے اور ۹۷۲ھ ہجری میں فوت ہوئے ملانوری جو اعظم پور کے باشندے تھے اکبر کے زمانہ میں گزرے ملا فیضی سے نہایت اتحاد رکھتے تھے اُن کا ذکر میر حسن نے اپنے تذکرہ میں کیا ہے اور شیخ سعدی نے اگرچہ ایسے اشعار کہے ہیں جو آدھے فارسی اور آدھے اردو ہیں لیکن یہ باتاعودہ اور علی شاعری نہ تھی بابر اکبر و جہانگیر شاہ جہاں اور اورنگ زیب کی اور اُن کے عہد کی تحریرات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ہندوؤں کی زبان بد عربی فارسی کے الفاظ چڑھ رہے تھے اور اسی طرح مسلمانوں کی زبانیں بھی ملکی زبانوں کے زیر اثر تھیں۔ اس کے نمونے اردو سے قدیم اور تذکرہ گل رعنا میں موجود ہیں شاہجہان کا اردو میں شوق لکھا اور اورنگ زیب کا اپنے رقعات میں اردو الفاظ استعمال کرنا اس بات کی بین دلیل ہے کہ اردو زبان اس زمانہ میں ملک کی عام زبان ہو گئی تھی۔ بازار سے

شاہی محلات تک خاص و عام اس کو بوتے اور سمجھتے تھے یہ

عالمگیر کے زمانے سے دلی میں اردو شعر گوئی نے رواج پایا اور اس جانب سب سے پہلے فارسی شعر نے توجہ کی موسوی خاں فطرت۔ مرزا عبد القادر بیدل۔ مرزا عبد الغنی قبول وغیرہ فارسی کے نامور شاعر تھے لیکن تفریح خاطر کے لیے اردو میں بھی دوچار شعر کہہ لیا کرتے تھے۔ محمد شاہ کے عہد سے پہلے لوگ خانہ جنگیوں میں مبتلا اور مرہٹوں کے حملوں سے پریشان تھے۔ محمد شاہ کے زمانے میں سلالات کی قوت ٹوٹ جانے پر کچھ عافیت نصیب ہوئی اس وقت ادھر ادھر سے سمٹ کر دلی میں سب لوگ مجتمع ہو گئے۔ محمد شاہ کی رنگیل طبیعت نے رنگ دکھایا۔ قزلباش خاں اُبتد۔ سلیمان قلی خاں و داد۔ علی قلی خاں ندیم۔ شیخ سعداۃ گاشن۔ مرتضیٰ قلی خاں فراق۔ میر شمس الدین فقیر۔ مرزا عبد القادر بیدل۔ سراج الدین علی خاں آرزو ایسے بڑے بڑے صاحب فضل و کمال دلی میں جمع تھے شمس دلی اللہ دکن سے آگئے۔ فراق، فخری۔ آرزو وغیرہ بھی دکن سے آئے دلی کچھ دنوں کو رہ گئے اور ان کا رنگ دلی میں خوب چمکا ہر طرف سے قدر دانی کی گئی جو شعرا صرف فارسی میں اظہار کمال کرتے تھے ان کو اردو میں بھی شعر کہنے کا شوق ہوا۔ اُبتد۔ بیدل۔ فراق۔ آرزو نے اردو میں طبع آزمائی کی اور یہ زبان دلی سے اردوئے معلیٰ کا خطاب پا کر ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئی

اردو لغات کی ترتیب | قریب قریب عالمگیر کے زمانے میں اہل ہندوستان کو اردو لغات کی ترتیب و تدوین کا خیال پیدا ہوا۔ ملا عبد الباقی بانسوی نے (جن کی قواعد فارسی اور گلستان ہوتاں کی شرحیں نہایت مشہور ہیں) عالمگیر کے زمانے میں اردو ہندی الفاظ کا ایک لغت مدون کیا اور اس کا نام ”غرائب اللغات“ رکھا اردو الفاظ کے معنی فارسی میں لکھے ایک عرصہ کے بعد سراج الدین علی خاں آرزو نے اس کی نظر ثانی

۱۰ اردو ۱۱ دکن ۱۲ گلی رشتا ۱۳

کی بہت سے الفاظ اور معنی اضافہ کئے غلطیاں درست کیں اور اسے "نوادرا لفاظ" کے نام سے موسوم کیا۔

دلی کے پرانے شاعر جو شاہراہ ولی نے دکھلائی تھی اس کے پیروہلی میں بہت پیدا ہو گئے۔ آبرو۔ حاتم۔ ناجی۔ مضمون۔ مرزا منظر جان جاناں کو جو دلی کے محضر تھے اور فارسی میں خوب کہتے تھے، رنجیتہ کا آبا سے قدیم سمجھنا چاہئے یہی مدد بزرگ ہستیاں ہیں جن کی آغوش تربیت میں نونہال اردو نے پرورش پائی اس مبارک عہد میں زبان نے بہت کچھ پختگی حاصل کی۔ شاعری کے واسطے کوئی خاص طرز اب تک مقرر نہیں ہوا تھا۔ اور نہ اغراض شاعری کے واسطے کوئی خاص مناسبت زبان میں پیدا ہوئی تھی بہت سے سخت اور بھتے دکنی لفظ و محاورات جو دیوان ولی کی بدولت زبان زبان کے ساتھ ان کی خدمات میں داخل ہو گئے تھے چھانٹا اور نکالنا پڑے۔ اسی وجہ سے ان حضرات کی خدمات تصفیہ زبان کے متعلق بہت لائق تحسین ہیں۔ انھوں نے یہ شکل کام بہت حسن و خوبی اور بڑی محنت و جانفشانی سے انجام دیا اسی لیے ان کی قابلیت اور خوش مذاقی کی داد دینا چاہیے۔ یہ سچ ہے کہ بھاشا الفاظ کی خوبصورتی ان کی نظر میں نہ تھی۔ اپنے ملک کے دیسی الفاظ کے بدلے غیر ملکی الفاظ کم لیے جاتے مگر اس میں شک نہیں کہ ان لوگوں نے اس کاٹ چھانٹ اور متروکات کے خارج کرنے میں بڑی قابلیت اور وقت نظر سے کام لیا اور بھتے نا تراشیدہ محاورات اور تراکیب کی جگہ خوشنما محاورے اور دلکش ترکیبیں داخل کیں جو کہ عموماً فارسی سے لی گئیں کیونکہ اسی کے وہ مشاق تھے۔ زبان میں چونکہ لوح اور قوت جذب پہلے ہی سے موجود تھی اس لیے یہ سب جدید تصرفات اس نے آسانی سے قبول کر لیے۔

صنعت اسامی | ولی کے معاصرین صنعت ایہام کے بہت شائق تھے جس کا ذکر

پیشتر کیا گیا یہ صنعت بھاشا کی شاعری میں بہت مقبول ہوئی اور دہروں کی جان ہے
قدما کے کلام میں ایسے ذو معنی اشعار بہ کثرت ہوتے ہیں۔ یہ محمد شاہی دور کی خصوصیت
ہے۔ شاہ مبارک آباد ایک رنگ شاعر تاجی و شاہ حاتم وغیرہ نے اس رنگ کو خوب
برتا اور اس کو اپنا مستقل فن بنالیا تھا۔ مگر شاہ عالم کے زمانہ میں اس میں ترمیم و اصلاح
ہوئی اور منظر سودا۔ میر تقی میر نے اس کا رواج بہت کم کر دیا اور میر درد۔ فقیر دہلوی اور
کے عہد میں یہ رنگ قریب قریب خارج ہو گیا میر فرماتے ہیں ۷

کیا جانے دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر تیرے	کچھ طرز ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں
سودا فرماتے ہیں ۷	
یہ رنگ ہوں آتی نہیں خوش بھگود رنگی	منکر سخن و شعر میں ایہام کا ہوں میں
قائم چاند پوری ۷	
ہو دم روم مرا کیوں نہ خوش کہ وہ بت حسین	یہ کہہ گیا ہے کہ آؤں گا آج میں سرشام
بطور ہزل ہے قائم یہ کفست گودرنہ	تلاش ہے یہ مجھے ہو نہ شعر میں ایہام

تصوف ایک دوسری خصوصیت اس زمانے کی یہ تھی کہ شاعری پر تصوف کا
رنگ بہت غالب تھا۔ یہ رنگ اس زمانے میں عالمگیر تھا۔ وجہ یہ تھی کہ شعراء اکثر صوفی
مشبہ ہوتے۔ یا کم از کم آخر عمر میں ہو جایا کرتے تھے پیری مریدی کا بازار کم تھا۔
فارسی شاعری متاخرین کے کلام میں تصوف میں ڈوبی ہوئی تھی اور اردو شاعری
اُسی کی نازل تھی۔ دکن میں شاعری کی ابتدا مذہب سے ہوئی اور تصوف شاعری کا
جزو اعظم تھا۔ انجیس اباب سے اردو شاعری پر بھی تصوف کا رنگ اچھا خامہ چڑھ گیا۔
سپاہی پیشہ شعراء اس زمانہ کے شعراء اکثر سپاہی پیشہ ہوتے اس وجہ سے کہ زمانہ
بہت پر آشوب تھا۔ بے دردی حملوں کی کثرت۔ ملک میں بد امنی۔ سلطنت کی کمزوری
ان سب وجوہ سے کسی کا جان و مال محفوظ نہ تھا۔ اور پھر سپہگروی کا پیشہ نہایت عزت

اور منفعت کا پیشہ خیال کیا جاتا تھا۔

کلام میں یک رنگی کی کمی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس عہد کے اکثر شعرا کا کلام یک رنگ نہیں اور بہت مبتلا الفاظ مثلاً کسی غزل کو لیجئے تو اُس کے بعض شعر تو بہت اچھے ہوں گے مگر بعض شعر نہایت معمولی اور اعلیٰ مذاق سے گرے ہوئے۔ اس زمانہ میں معمولی اور سوتیانہ الفاظ لکھنے میں مطلق عار نہ تھا۔ جس کی وجہ شاید یہ ہو کہ ریختہ اُس وقت تک تفتیق طبع اور تبدیل ذائقہ کے طور پر لکھی جاتی تھی نہ کہ اس میں مزا دلالت اور شوق مد نظر تھی اسی نقطہ نظر سے اگر دیکھا جائے تو آبر و حاتم۔ ناجی۔ منظر کے یہاں عہدہ کلام کے ساتھ ساتھ بہت سے اشعار ایسے بھی ملیں گے جو ذوق صحیح اور طبع سلیم پر ناگوار ہیں۔ تیر اور سودا نے بھی کبھی کبھی ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں خاص کر جہاں شیخ اور زاہد وغیرہ کا خاکہ اڑایا گیا ہے جواب کسی مہذب صحبت میں شاید ہی استعمال کئے جائیں۔

اس عہد کے شعرا کا طرز بیان نظم ابھی نچنگی اور کمال کے درجہ پر نہیں پہنچی تھی۔ قواعد اور ان کے کلام کی خامیاں عروض کی پابندی بھی مشکل سے ہوتی تھی۔ قافیہ ایسی ضروری چیز اور ردیف تک کے قواعد پوری طرح برتے نہیں جاتے تھے۔ اشعار کی بندش ڈھیلی۔ زوائد کی کثرت جن سے آج کل ہمارے کانوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ البتہ زبان میں سادگی اور شیرینی غضب کی ہے۔

عربی و فارسی الفاظ و خیالات اس دور میں سنکرت و بھاشا و قدیم دکنی الفاظ کا کا داخلہ اور سنکرت و بھاشا و قدیم دکنی الفاظ کا اخراج ان کو مصلحین زبان کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بہت سے بھونڈے الفاظ خارج کر دیے گئے مگر اُس کے ساتھ ہی بھاشا کے بہت سے شیریں خوبصورت اور خوش آہنگ الفاظ بھی نکال دیے گئے۔ عربی و فارسی کے مترادف قبول کیے گئے

اس کے ساتھ ہی ساتھ عربی و فارسی الفاظ میں صحبت کا خیال ہونے لگا قدیم عادات و الفاظ جو دلی کے زمانے میں متعل تھے اُن میں تغیرات پیدا ہونا شروع ہوئے اور جدید محاورے بنانے کی کوشش کی گئی تاریخ شعرا کے اردو میں درج ہے کہ ”مگر استعمال الفاظ مکروہ کا اور نہ پروا کرنا باریک باتوں کا یعنی جائز رکھنا قافیہ سین اور صاد کا اُس کے کلام سے دریافت ہوتا ہے نہ صرف اُسی کے کلام میں بلکہ اُس کے ہم عصروں کے کلام میں اُس سے زیادہ ہے۔ شاہ حاتم نے اس طرف توجہ کی اور بہت سے الفاظ کی اصلاح کی جیسا کہ اُن کے ”دیوان زادہ“ کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے۔“

شاہ مبارک آبرو شاہ نجم الدین دہلوی عرف شاہ مبارک متخلص بہ آبرو محمد شاہ کے زمانہ میں تھے پیدائش کی تاریخ معلوم نہیں مشہور صوفی شیخ محمد غوث متوفی ۷۵۵ھ

گوالیاری کی اولاد میں تھے۔ گوالیار میں پیدا ہوئے اور بچپن ہی میں دہلی آئے جہاں شعر کہنا سیکھا۔ سراج الدین علی خاں آرزو کے رشتہ دار تھے اور انھیں سے مشورہ سنان کرتے تھے صاحب دیوان ہیں مگر افسوس کہ دیوان زمانہ غدر میں تلف ہو گیا اور اب نایاب ہے ایک مثنوی موسوم بہ ”آرائش معشوق“ بھی لکھی ہے تھوڑے عرصہ تک نانول میں بھی رہے۔ نہایت خلیق اور متواضع آدمی تھے۔ ایک آنکھ کی مینائی جاتی رہی تھی جس کی وجہ سے مرزا جان جاناں ظہر سے اکثر چٹک چلتی تھی۔ شاہ آبرو ایک شخص پیر مکھن خلف شاہ کمال الدین بخاری سے جو خود بھی شاعر تھے بہت محبت رکھتے تھے جس کا حال اکثر تذکرہ شعروں میں ہے۔ اکثر تذکرہ نویس مثلاً میر حسن مصحفی فتح علی اور لطف وغیرہ ان کے مداح ہیں اور ان کے کلام کی تعریفوں سے اُن کی آبرو بڑھاتے ہیں۔ شاہ آبرو متقدمین شعرا میں ہیں اور استعارات و ایہام کے بادشاہ ہیں۔ اسی وجہ سے کبھی کبھی کلام سبک اور مبتذل ہو جاتا ہے۔ جو دعتِ علومات محدود ہے مگر درسیات سے فارغ معلوم ہوتے ہیں ۱۰۷۵ھ مطابق ۱۶۶۵ء میں پچاس برس کی عمر سے متجاوز ہو کر وفات پائی

خان آرزو شاہ

۱۰۵۵ھ

سراج الدین علی خان متخلص بہ آرزو معروف بہ خان آرزو شیخ
 حسام الدین حسام کے صاحبزادے ہندوستان کے مشہور شعراء
 اور ناقدان فن میں سے تھے۔ میر تقی میر کا قول ہے کہ "ان کے زمانہ میں ان سے
 بڑھ کر کوئی محقق اور شاعر شیریں زباں نہ تھا۔" میر حسن کو انیس خسرو دہلوی کے بعد سب
 سے بڑا شاعر ہندوستان کا خیال کرتے ہیں۔ لطف بھی ان پر اپنی لوح سرائی سے لطف
 کرتے ہیں اور فتح علی ان کو ان کے نام کی مناسبت سے چرائی محفل فصاحت کے معزز
 لقب سے یاد کرتے ہیں۔ مولانا آزاد ان کی نسبت لکھتے ہیں کہ ان کو زبان اردو کے ساتھ
 وہی مناسبت ہے جو ارسطو کو فلسفہ کے ساتھ ہے۔ میر تقی میر ان کا ذکر نہایت ادب
 سے کرتے ہیں اور اپنا اور اس زمانہ کے شعراء کا جکت استاد مانتے ہیں۔ خان آرزو
 اردو اور فارسی دونوں کے استاد تھے۔ گو اردو کم کہتے تھے مگر ان کے استاد الا سائنہ ہونے
 میں کسی کو کیا کلام ہو سکتا ہے۔ اس وجہ سے کہ تیر۔ سودا۔ منظر۔ درد۔ ایسے قادر الکلام
 انکو استاد مانتے تھے۔ اگر مکے رہنے والے شاہ محمد غوث گویا رسی کی اولاد میں سے تھے
 شعر کہنا ابتداء سے عمر میں شروع کیا۔ اور مختلف علوم و فنون میں بصیرت کا ملہ حاصل
 کی جوانی میں مقام گویا ر منصب دار مقرر ہوئے۔ مگر فرخ میر کے عہد میں ۱۲۳۵ھ
 میں دہلی واپس آئے۔ ۱۲۴۵ھ مطابق ۱۲۳۵ھ میں شیخ علی حزمین ایران سے ہندوستان
 آئے جہاں ان کے کمال کی بے انتہا شہرت ہوئی ہر شخص ایسے صاحب کمال سے
 ملنے کا مشتاق تھا۔ مگر آرزو کو کمال فن اور استغنا اس کی اجازت نہ دیتا تھا۔ اتفاقاً
 کسی موقع پر ان دونوں بالکالوں کا سامنا ہو گیا۔ شیخ کی متکبرانہ باتیں انکو بری معلوم
 ہوئیں جس سے متاثر ہو کر انھوں نے شیخ کے کلام پر اعتراض وارد کرنا شروع کئے
 اور ان کا ایک رسالہ سخی بہ تنبیہ الغافلین کی صورت میں شائع کیا۔ نادر شاہ کے حملہ دہلی اور
 لہ اسی نام کا ایک رسالہ سودا کا بھی ہے جس میں فاخر کمین کا خاکہ اڑایا گیا ہے۔

تباہی شہر کے بعد نواب سالار جنگ کے مشورہ سے وطن چھوڑ کر گھنوا آئے جہاں ۱۱۶۹ء مطابق ۱۷۵۶ء میں انتقال کیا۔ مگر لاش کو حسب وصیت نواب موصوف دہلی لے گئے اور وہیں پوتہ زین کیا۔ خان آرزو بڑے صاحب کمال اور شاعر شیریں مقال تھے ان کی قابلیت طباعی، ذہانت، قوت اختراع، فصاحت، بلاغت سب کو سلم ہے تصانیف بکثرت ہیں منجملہ ان کے کتب ذیل موجود ہیں ایک فارسی دیوان تقریباً تیس ہزار شعر کا شروع سکندر نامہ و تصائد عرفی۔ و گلستان سعدی لغت فارسی موسوم بہ ”سراج اللغات“ لغت اردو موسوم بہ ”غرائب اللغات“ جو اصطلاحات صوفیہ کی ایک لغت ہے یہ نوادر الالفاظ کی شرح ہے۔

رسائل ”سہبت عظمیٰ“ اور ”عطیہ کبریٰ“ فن بلاغت و معانی و بیان میں تذکرہ ”جمع النفائس“ جس کو تذکرہ آرزو بھی کہتے ہیں جس میں ان ہندوستانی اور دکنی شعرا کا ذکر ہے جنہوں نے زبان فارسی شعر کہے ہیں۔ اس میں سے میر تقی میر نے اپنے تذکرہ نکات الشعراء میں کچھ نقل کیا ہے تقریباً پندرہ تصانیف خان آرزو کی کہی جاتی ہیں مشہور استاد تھے۔ اور بعض شاگرد اپنے سے بھی زیادہ نامور چھوڑ گئے۔ زبان اردو ایسے محقق کاہل اور ناقد فاضل کے احسانات سے کبھی عمدہ برآ نہیں ہو سکتی۔

شاہ حاتم عظیمیہ | شاہ حاتم شاہیر قدما میں ہیں۔ ان کو مہلی کے رنگ کا سوجھ خیال کرنا چاہیئے۔ ریختہ بہ طرز ولی و مضمون و ناجی و آب و کھتے تھے۔ ظہور الدین نام۔ حاتم تخلص۔ شیخ فتح الدین کے بیٹے تھے۔ دہلی میں پیدا ہوئے سال ۱۱۶۹ء ولادت الہیہ لفظ ظہور سے نکلتی ہے۔ جو ۱۱۶۹ء کے مطابق ہے یہاں ہمیشہ تھے تھوڑے عرصے تک نواب امیر خاں صوبہ آباد کی رفاقت میں رہے ۱۱۷۲ء میں جب دیوان ملی دہلی میں آیا اور اُس کے اشعار کو لوگوں نے بہت پسند کیا تو حاتم نے بھی طبع آزمائی کی اور ریختہ میں شعر کہنا شروع کیا۔ رفتہ رفتہ کمال کو

پہونچ کے خواجہ میر درد میر تقی میر اور بعد کو مصحفی کے مشاعروں میں بھی شریک ہوتے
 تھے۔ اپنے زمانہ میں ریختہ کے استاد مانے گئے ہیں۔ دردیوان ان کی طرف منسوب ہیں۔
 ایک قدیم رنگ میں جس میں صنعت ایہام بہت ہے اور اکثر کلام فحش ہے۔ دوسرا جدید
 رنگ میں۔ پہلے رمز تخلص کرتے تھے۔ عالمگیر ثانی کے زمانے میں ایک دیوان کلیات سے
 منتخب کر کے مرتب کیا۔ اُس کا نام دیوان زادہ رکھا۔ کلیات کی نسبت جو آبرو و ناجی کے
 طرز میں لکھا تھا تا کہ قدرت میں لکھا ہے کہ فنا زعم شاعری بیار دار دیوان قدیم
 اور از نظر ایں مولف گذشتہ بطرز آبرو و ناجی حرف می زند اکثر اشعارش از لطف
 خالی یافتہ محمد شاہ بادشاہ کے حکم سے ایک مثنوی محقق پر لکھی جو زیادہ دلچسپ نہیں۔ ان کے
 علاوہ ایک دیوان فارسی بھی ہے۔ نہایت متین و مہذب بزرگ تھے اپنے دیوان کے
 دیباچہ میں ۴۵ شاگردوں کے نام دیے ہیں جس میں سب سے پہلے مرزا رفیع سودا کا
 نام نامی ہے۔ یہ ایسے شاگرد تھے جن پر استاد کو بھی فخر تھا۔ اور شہور شاگردوں میں۔ رنگین
 نثار۔ تاباں۔ فارغ بھی ہیں شاہ صاحب کے مزاج میں ظرافت اور بذلہ سخی بہت تھی۔
 تصنیف زبان کی طرف بھی متوجہ ہوئے اور بہت سے غیر مانوس اور غیر فصیح الفاظ ترک
 کر دیے۔ درستی زبان کے لحاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کام ذوق اور آتش و ناسخ کے
 زمانہ میں ایک سو برس بعد پورا ہوا اُس کی داغ بیل شاہ حاتم نے ڈال دی تھی۔ افسوس
 ہے اُن کے معاصرین نے اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی ورنہ اُسی زمانہ میں بہت
 کچھ تکمیل ہو جاتی شاہ صاحب اس کے متعلق خود فرماتے ہیں۔ "خوش چین خرم سخنوران
 عالم۔ بصورت محتاج و معنی حاکم کہ از ۱۲۱۵ تا ۱۲۶۵ھ کہ چهل سال با شد
 عمر دریں فن صرف کردہ در شعر فارسی پیر و مرزا صاحب و در ریختہ ملی را استاد می داند
 اول کسے کہ دریں فن دیوان ترتیب نموده ابوود و معاصرین فقیر شاہ مبارک آبرو
 و شرف الدین مضمون مرزا جان جاناں مظہر دیشخ احسن اللہ احسن۔ و مرزا شاہ ناجی۔ و

غلام مصطفیٰ یک رنگ ست۔ ولفظ درو برد از د الفاظ و افعال دیگر کہ در دیوان قدیم خود قیید دارد۔ و میں ولا از دہ دہ و از دہ سال اکثر الفاظ را از نظر انداختہ و الفاظ عربی و فارسی کہ قریب الفہم و کثیر الاستعمال باشند در دمرہ دہلی کہ میرزایان ہند فصیحان رند در محاورہ آرنند منظور دارد زبان ہندی بجا کارامقوت کردہ محض رذرترہ کہ عام فہم و خاص پسند باشد اختیار نمود۔۔۔۔۔ مختصر کہ لفظ غیر فصیح انشاء اللہ نخواہد بود۔ اس کے پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ درستی اور اصلاح زبان کا خیال سب سے پہلے شاہ حاتم کے دل میں پیدا ہوا تھا۔ کلام صاف عاشقانہ اور کہیں کہیں عارفانہ ہے۔ شعر میں آپس کی باتیں۔ زبان سلیس۔ البتہ زبان کی ابتدائی حالت ہونے کی وجہ سے اکثر زائد الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ دہلی میں ۱۷۹۱ء یا ۱۷۹۲ء میں انتقال کیا۔ مگر مصحفی کا قول ہے کہ ۸۳ برس کی عمر میں ۱۷۹۶ء میں فوت ہوئے۔ میر تقی کو شاہ حاتم کے ساتھ حسن عقیدت نہیں ہے۔ اپنے تذکرہ میں "مرہ جاہل و متمکن" ان کی نسبت لکھا ہے مگر میر حسن اُنکو صاحب کمال و پسندیدہ افعال۔ عالی فطرت و بلند ہمت کے معزز القاب سے یاد کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اُن کی غزلوں کو نغمہ سرا یان ہند محفلوں میں گاتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ شاہ حاتم کا مرتبہ ادب اُردو میں منفرد اور ممتاز ہے وہ سودا اور دوسرے بڑے بڑے شاعروں کے استاد تھے۔ اور اصلاح شعر اور درستی زبان میں اُنھوں نے بہت نمایاں حصہ لیا۔

میاں مضمون متونی ۱۷۴۵ء | شیخ شرف الدین تخلص بہ مضمون حضرت شیخ فرید الدین

شکر گنج کی اولاد میں تھے جیسا کہ خود کہتے ہیں ۷

کریں کیوں نہ شکر لبوں کو مرید کہ دادا ہمارا ہے بابا فرید

۱۷ مصنف مخزنہ جابریہ کی تحقیق کے موافق ۹۶ برس کی عمر میں ۱۲ سہری میں انتقال کیا ۱۲

جارج موصوفہ اکبر آباد کے رہنے والے سپاہی پیشہ تھے پھر تلوار کو قلم سے بدل لیا۔ بچپن میں دلی گئے اور زینتہ المساجد میں قیام کیا۔ وردیشانہ زندگی بسر کرتے تھے مگر بڑے ظریف باندہ اور بذلہ سنج تھے۔ میراُن کو ”ہنگامہ گرم کن مجلسها“ لکھتے ہیں۔ اپنے زمانہ کے استاد فن اور اُسی زمانہ کی روش کے مطابق خوب کہتے تھے۔ ایک دیوان دم سو ابیات کا چھوڑا۔ کلام پاکیزہ اور پر لطف ہے مگر اکثر جگہ فحش اور استعارات و ایہام وغیرہ سے جو زمانہ کا رنگ ہے ملوے گو کہ سن میں آرزو سے بڑے تھے مگر شعر میں اُن سے شورہ کر لیتے۔ میراُن کو خوش فکر اور تلاش الفاظ تازہ کا بہت شائق لکھتے ہیں۔ سودا اور میر حسن بھی اُن کے بہت معترف ہیں۔ خان آرزو اُن کو ”شاعر بیدار“ کہتے تھے اس وجہ سے کہ نزلہ کے سبب سے سب دانت اُن کے گر گئے تھے۔ ۱۲۵۵ھ مطابق ۱۸۴۵ء میں انتقال کیا۔

مرزا منظر جان جاناں | شمس الدین نام جان جاناں عرف منظر تخلص۔ والد کا نام مرزا جان
۱۶۹۵ء تا ۱۷۷۵ء | تھا۔ جو عالمگیر کے دربار میں صاحب منصب تھے۔ نسب ان کا
باپ کی طرف سے محمد بن حنفیہ سے ملتا ہے۔ ماں بیجا پور کے شریف گھرانے سے تھیں۔
دادا بھی دربار شاہی میں صاحب منصب تھے۔ پردادا سے اکبر شاہ کی بیٹی منوب
ہوئی تھی ان رشتہوں سے نیمپوری خاندان کے نواسے تھے۔ صوفی با صفا اور شاعر مکیثا تھے۔
کلام میں جس قدر متانت اور تاثیر ہے اُسی قدر توجید اور روحانیت بھی جلوہ گر ہے۔
مشرقی اور فرانسیسی محقق گارسن ڈیٹاسی کی تحریر کے موافق بمقام آگرہ ۱۲۵۵ھ مطابق
۱۶۹۵ء میں مگر مولانا آزاد کی تحقیق کے بموجب ۱۲۵۵ھ بمقام کالا باغ صوبہ مالوہ
میں پیدا ہوئے آپ کے والد ماجد عہد عالمگیری میں منصب داردار نسائعلوی تھے اور خاندان شاہی
سے بھی دور کا پیوند تھا جب آپ کی عمر سولہ برس کی ہوئی تو سائے پدری سر سے اٹھ گیا مرزا صاحب
کو صوفیائے کرام اور اہل دل کی صحبت کا بچپن سے شوق تھا شیخ محمد افضل یا لکھوٹی سے

باقاعدہ حدیث پڑھی اور تین برس تک مشائخ نقشبندیہ سے کمال حاصل کیا۔ خود بھی وہ درویش کامل اور صوفی صاحب دل تھے یکاڑوں ہندو اور مسلمان آپ سے بیعت اور حسن عقیدت رکھتے تھے۔ میر تقی میر اپنے تذکرہ میں آپ کا ذکر ادب و احترام کے ساتھ کرتے ہیں فرماتے ہیں "مردیست، مقدس، مہر درویش، عالم، صاحب کمال شہرہ عالم بنظیر، معزز، مکرم، اکثر اوقات دریا دالہی صرف می کند خوش تقریر بمنزلہ ایست کہ در تحریر نمی گنجد" حسن صوری و معنوی دونوں سے عشق کامل رکھتے تھے۔ میر عبدالحی تاباں سے جو اُس زمانہ کے شہرہ آفاق حسین و خوبرو شاعر تھے۔ بہت محبت اور اختلاط تھا۔ عالم متبحر، فقیہ کامل، حنفی المذہب اور نقشبندی طریقت تھے۔ عالم باعمل احکام قرآن کے پیروں اکثر وقت اور ادو وظائف یاد لچپ علمی گفتگو اور شعر و شاعری میں صرف کرتے تھے۔ آپ کی تہذیب و مسانت و قناعت اور پابندی وضع ضرب المثل تھی۔ استغناء بے تعلقی کی حکایات گل رعنائیں درج ہیں محمد شاہ نے ایک دفعہ کہلا بھیجا کہ ملک میں سے جو حصہ چاہیے قبول فرمائیے۔ انکار کر دیا۔ نواب فیروز جنگ نے گاؤں پیشکش کیے قبول نہ ہوئے۔ آصف جاہ نے تین ہزار روپیہ نذر کیا۔ منظور نہ ہوا۔ استغناء کی یہ شان تھی کہ کھانا تک بازار سے منگواتے تھے۔ نذر و نیاز شاید ہی لیتے ہوں۔ علم و فضل اور شعر و شاعری کے ساتھ آپ کا اخلاق شگفتہ رومی اور لطافت مزاج بھی مشہور تھی۔ حسن معنی کے ساتھ حسن صورت بھی اللہ تعالیٰ نے بدرجہ اتم عنایت فرمایا تھا۔ اکثر کرامات بھی آپ کی طرف منسوب کی جاتی ہیں۔

آپ کا کلام زبان اردو کی تاریخ ارتقا میں ایک خاص درجہ اور اہمیت رکھتا ہے۔ اس وجہ سے کہ آپ نے نہ صرف زبان کو صاف کیا بلکہ اُس میں فارسی کی نئی نئی ترکیبیں اور خیالات پیدا کیے اور قدیم طرز ایہام گوئی کو ترک کیا زبان میں یہ جدید رنگ آپ ہی کا پیدا کیا ہوا ہے مگر افسوس ہے کہ بہت کم لوگوں نے اس کا اعتراف

کیا ہے۔ مصحفی اور شوق اپنے اپنے تذکروں میں اس خدمت کا ضرور اعتراف کرتے ہیں۔
 آپ کا کلام نظم و نثر دونوں میں نہایت سادہ سلیس اور فصیح ہوتا ہے اور جیسا ہم اوپر
 لکھ آئے ہیں جذبات اور تاثیر کے ساتھ تصویف کے خیالات سے بھی مالا مال ہے۔ اکثر
 اشعار کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ مضمون خیالی نہیں بلکہ واردات قلبیہ کا صحیح اور من عین
 اظہار ہے۔ ایک دیوان فارسی ایک ہزار ابیات کا جو سنہ ۱۱۰۰ھ میں مرتب کیا اور
 ایک قدیم دیوان کا انتخاب ہے جس میں بیس ہزار شعر تھے۔ ایک ناتمام دیوان اردو اور
 ایک بیاض "خریطہ جواہر" فارسی شعرا کے منتخب کلام کی آپ کی تصانیف سے
 یادگار ہیں وفات نہایت افسوسناک طریقہ سے ہوئی۔ اس طرح کہ عشرہ محرم تھا
 تعزیرے نکل رہے تھے مرزا صاحب اپنے کوٹھے پر بیٹھے اُن کی سیر کر رہے تھے۔ مشہور
 ہے کہ اُنکی زبان سے نکلا کہ بالامو برس بعد اس قدر شور و غل اور ماتم کرنا اور کاغذ اور بانس
 کے ڈھانچوں کا استقدار اب و احترام کرنا خلاف عقل ہے یہ جملہ تعزیر لے جانے والوں نے سن لیا
 اور برسر پر خاشخس ہو گئے۔ نویں تاریخ کی رات کو دو آدمی مرزا صاحب کے مکان پر وارد

۱۱۰۰ھ مصحفی اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں "ابتداء شوق شکر کہ ہو از میر و مرزا کے در عصر نیامد بود و دور دور ایہام گویاں
 بود اول کیکہ شعر ریختہ بہ تیغ فارسی گفتہ دست در تمام دیوانش فصاحت و بلاغت زبان استاد جلوتہ نمودی
 و ہدی الحقیقت نقاش اول زبان ریختہ بافتقاد فقیر مرزا دست بعدہ متعیش بدیگراں رسیدہ ۱۲ قدرت اللہ
 شوق لکھتے ہیں "سیکینہ اول کیکہ طراہیام گوئی ترک نمودہ و ریختہ در زبان اردو سے معلی شاہماں آباد کہ الحال
 پسند خاطر عوام و خواص رفت گردیدہ و در دج ساختہ زبندہ العارفین قدوۃ الاولیاء واقف روز جناب اکبر کا شرف کنوز
 طریقہ بغیر مرزا جانان متخلص مظهر رویت فرشتہ صفت ۱۳ انشا اللہ شاں دریا س لطافت میں لکھتے ہیں۔ از بسکہ
 آوازہ فصاحت و بلاغت جناب فیضاب مرزا جانان مظهر علیہ الرحمہ گوش را تم را قفر خود میداشت دل بایدہ مستغنیہ
 شد کہ چرا ز دیدار مرزا صاحب خود را این محرم محرم کی پندی در از لذت عباد دانی و عیش روحانی کہ در کلام معجز نظام آں
 حضرت مست باز میباری ۱۴ میر صاحب لکھتے ہیں "دیوان مختصر فارسی او بنظر فقیر مولف آمدہ است از سلیم و کلیم پاشا
 کی داد ۱۲ میرسن کہتے ہیں از نصحاے زمان و بلحاے دمدال ۱۲۔"

ہوے اور آواز دی۔ مرزا صاحب کو کچھ خیال نہ ہوا باہر نکل آئے۔ ایک آدمی نے دیکھتے ہی فوراً قرابین ماری مرزا صاحب زخمی ہوئے اور یہی ہلاکت کا سبب ہوا یہ واقعہ ۹۴ھ مطابق ۱۷۷۱ء کا ہے۔ آپ کے شاگردوں میں انعام اللہ خاں یقین۔ میر محمد باقر حمزہ۔ خواجہ احسان اللہ خاں بیان۔ مصطفیٰ خاں بکنگ۔ بسا دن لال بیدار اور محمد فقیہ درد مند۔ مشہور شاعر صاحب دیوان ہوئے ہیں۔

ناجی | سید محمد شاہ کرنام ناجی تخلص۔ مردپاہی پیشہ نواب امیر خاں کے نعمت حسانہ کے داروغہ تھے۔ شاہ آبرو حاتم اور دلی کے معاصر عہد محمد شاہی کے شعرا میں ہیں۔ جب تاجدار شاہ نے دلی پر حملہ کیا ہے تو یہ موجود تھے۔ شہر کی تباہی و بربادی اپنی آنکھ سے دیکھی جس کے پروردہ حالات ایک محسن میں بیان کیے ہیں۔ عفو ان شباب میں انتقال کیا۔ آرزو ان کے کمال کے قائل اور اپنے برابر بلکہ اپنے سے بہتر سمجھتے ہیں۔ نہایت تیز سوخ طبع ظریف اور ہر شخص کے کلام میں عیب نکالا کرتے تھے۔ میر صاحب کا قول ہے کہ ”مزاج میں ہزل بہت تھا۔ اپنے مذاق آمیز کلام سے لوگوں کو ہنساتے اور خود منہ بنائے رہتے۔“

ان کا کلام بصورت دیوان موجود ہے اور سلاست زبان اور نزاکت خیالات کی وجہ سے اہل دہلی میں مقبول ہے۔ اشعار میں استعارات و ایہام کی کثرت ہے بعض اشعار فحش بھی ہیں جو اس زبان کا رنگ ہے

تاباں | امیر عبدالحی تاباں تخلص۔ نہایت خوبصورت خوش رو جوان تھے۔ ان کے غیر معمولی حسن کا شہرہ لوگوں کے زباں زد تھا یوسف ثانی کہلاتے تھے ان کے حسن کی تعریف میں شعر کہے جاتے تھے۔ اسی حسن کو دوبالا کرنے کے لئے وہ عموماً سیاح کپڑے پہنتے تھے۔ ان کے حسن کا شہرہ یہاں تک پھیلا کہ ایک مرتبہ شاہ عالم ان کے روئے صبح کی زیارت کے لیے خود گئے۔ عورتوں کی طرف ان کو زیادہ توجہ نہ تھی مگر

ایک شخص پر جن کا نام شاہ سلیمان تھا عاشق تھے۔ مرزا منظر جان جانان کو ان کے ساتھ ایک خاص محبت اور ارتباط تھا۔ جیسا کہ اُن کے حال میں لکھا گیا ہے۔ اکثر تذکرہ نویسوں کا قول ہے کہ جوانی میں مرے اور موت کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ مے نوشی کثرت سے کرتے تھے جس کی وجہ سے استقامت ہو گیا تھا۔ مگر صاحب تذکرہ گلشن ہند کا بیان ہے کہ انھوں نے انکو ۱۲ سالہ میں لکھنؤ میں دیکھا تھا اور جب بھی وہ نہایت حسین و جمیل تھے فیملن صاحب لکھتے ہیں کہ ۹۷ء یعنی ۱۲ سالہ تک وہ زندہ تھے۔ میر صاحب اپنے تذکرہ میں اُن کا ذکر غیر معمولی تعریفوں کے ساتھ کرتے ہیں فرماتے ہیں "نوجوان بامزہ بود۔ سید مخیب الطرفین مولد او شاہجہاں آباد است بسیار خوش فکر و خوب صورت خوش خلق و پاکیزہ سیرت معشوق عاشق مزاج تا حال در فرقہ شعراء ہیچوں ادشاع خوش ظاہر ادکن بطون عدم بعصرہ ظہور جلوہ گر شدہ بود" آگے اُن کی مے نوشی کی نسبت لکھتے ہیں کہ "آخر آخر کلام دائل جوانی ادبود۔ ایں قدر مداومت شراب کردہ کہ ملاقات ہمہ یاراں موقوف شد اکثرے از دودت انش کہ بہ خانہ اومی رفتند اور امت طالع می یافتند" اسی شراب کی کثرت سے دوستوں نے ملنا جلنا چھوڑ دیا تھا انھوں نے بھی مجبور ہو کر آخر کار شراب سے کنارہ کشی کی مگر چند ہی دن کے بعد سفر آخرت اختیار کیا۔ ان کا کلام عاشقانہ شیرین و دلکین ہے خیالات نہایت نازک۔ زبان بہت سلیس۔ شاگردی میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ حاتم اور بعض کے نزدیک محمد علی حشمت سے اصلاح لیتے تھے لطف کا قول ہے کہ سودا کو اپنا کلام دکھلاتے تھے۔ مگر میر صاحب نے اپنے تذکرہ میں حشمت ہی کو اُن کا استاد مانا ہے اور یہی صحیح ہے۔

بکرینگ | مصطفیٰ خاں بکرینگ خاں جہاں لودی کے احفاد سے تھے۔ امرائے محمد شاہی میں تھے اور بڑی عزت و آبرو سے زندگی بسر کرتے تھے۔ بالکمال سمجھدارانِ دہلی میں شمار کیے گئے ہیں۔ کلام بلند اور استعارات سے مملو۔ شاہ مبارک آبرو اور

میاں مضمون کے طرز کا ہے بعض لوگ اُن کو شاہ آبرو کا اور بعض خان آرزو کا شاگرد بتاتے ہیں مگر خود اُن کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا منظر کے شاگرد تھے ایک دیوان یادگار ہے جو قد کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے اور عاشقانہ اور عارفانہ دونوں رنگ میں ہے اکثر اشعار کو دنیا دار عشق مجازی کا مگر عرفان کو عشق حقیقی کا پر تو سمجھتے ہیں تاریخ پیدائش و وفات کا پتہ نہ چلا۔ ایک مرثیہ بھی امام حسین علیہ السلام کی شان میں لکھا ہے جس کے کچھ اشعار میر صاحب نے اپنے تذکرہ میں نقل کیے ہیں۔

فتاں متونی ^{۱۷۷۲ء} | اشرف علی خاں متخلص بہ فنان خلف مرزا علی خاں نکتہ۔ احمد شاہ بادشاہ دہلی کے کوکہ یعنی رضاعی بھائی تھے نہایت ظریف الطبع اور بندہ سنج تھے۔ اسی وجہ سے ظریف الملک کو کہ خان بہادر کا خطاب دربار دہلی سے عنایت ہوا تھا۔ باتوں میں مزاح اور ظرافت بہت تھی۔ پھبتی کہنے کے مشاق تھے جب احمد شاہ ابدالی نے دہلی کو تباہ کیا تو فغان مرشد آباد چلے گئے جہاں اُن کے چچا ایرج خاں برسرِ اقتدار تھے۔ مرشد آباد سے نواب شجاع الدولہ بہادر کے پاس فیض آباد آئے۔ اور نواب نے اُن کی بڑی خاطر و مدارات کی چونکہ نازک مزاج واقع ہوئے تھے کوئی بات ناگوار گزری یہاں سے پٹنہ چلے گئے (بقول مصنف) نواب نے خوش اخلاط میں گرم پیسے سے انکا ہاتھ داغ دیا تھا) جہاں مہاراج شتاب رائے نے انکی بڑی قدر و منزلت کی یہاں کی صحبت سے بھی دل بھر گیا اور بالآخر گوشہ نشینی اختیار کی ^{۱۷۷۵ء} مطابق ۱۱۷۵ھ میں پٹنہ میں انتقال کیا اور وہیں دفن ہوئے۔ ایک عمدہ دیوان ریختہ یادگار چھوڑا جس میں تقریباً دو ہزار اشعار ہوں گے۔ میر تقی اور میر حسن کی تحقیق کے بموجب ایک دیوان فارسی کا بھی ہے۔ سودا اور میر دونوں باکمال ان کے مستشرق ہیں سودا نے ان کے بعض اشعار کی تضمین بھی کی ہے

۱۔ میر اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ ایک درباری امیر ناکرمل گو "گلی کی منڈی کا سانڈ" اور ایک شخص مسکمی بہ حکیم معصوم کو کاڈ گجراتی "لکھا کرتے تھے"۔

میر صاحب ان کو قزلباش خاں امید کا شاگرد بتاتے ہیں مگر مصحفی علی قلی ندیم سے نسبت دیتے ہیں نفاں فارسی اور ہندی کے محاورات خوبی کے ساتھ ایک ساتھ نظم کرتے ہیں کلام نہایت پاکیزہ خیالات نازک اور بلند ایہام گوئی ترک کر دی تھی۔ مبتذل اور فحش الفاظ و خیالات سے احتراز تھا۔ کلام میں صفائی اور روانی بہت ہے قطعات سلسل خوب لکھتے ہیں۔ میر صاحب ان کو "جوان قابل و ہنگامہ آرا" کہتے ہیں۔ دیوان میں غزلیات قصائد قطعات رباعیات غمس بھی کچھ ہیں۔

باقی اور شعرا | اس عہد میں شاعری کا رواج بہت پھیل گیا تھا۔ اس وجہ سے شعرا بھی کثرت سے پیدا ہوئے۔ قدیم تذکروں میں مثلاً میر تقی اور میر حسن کے تذکروں میں چھوٹے بڑے مشہور و غیر مشہور ہر قسم کے شاعروں کے نام اور ان کے کلام کے نمونے بہ کثرت دیے ہوئے ہیں۔ ہم اس مختصر کتاب میں ان سب کا ذکر بالاستیعاب کرنے سے قاصر ہیں۔ میر محمد حسین کلیم جو دلی کے رہنے والے تھے وہ قابل ذکر ہیں۔ میر حسن کا بیان ہے کہ نصوص کا انھوں نے عربی سے اردو میں ترجمہ کیا تھا اور ایک رسالہ عروض و قافیہ میں بھی لکھا تھا میر صاحب کے رشتہ دار تھے اور صاحب کمال تھے۔

باب

اساتذہ دہلی
حصہ دوم طبقہ متوسطین
میر اور سودا کا زمانہ

آر دو شاعری کا زربن محمد | یہ دور اردو شاعری کی سب سے بڑی ترقی کا دور ہے۔ اسی میں

شاعری کو معراج ترقی حاصل ہوئی۔ اسی میں میر حسن، درد، سودا اور میر ایسے صاحب کمال پیدا ہوئے جن کے نام اس وقت تک روشن ہیں۔ بلکہ جب تک زبان اردو دنیا میں رہے گی وہ کبھی نہیں مٹ سکتے۔ تمام اصناف سخن اس عہد میں انتہائے کمال پر پہنچے مثنوی میں میر حسن کی مثنوی سحر البیان "قصیدہ میں سودا کے قصائد غزل میں میر اور درد کی غزلیں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ یہ کامل استاد اپنے فن میں منظم اور بے مثال گزرے ہیں اور اپنا کلام آئندہ نسلوں کے واسطے ایک بے مثل کسوٹی چھوڑ گئے ہیں۔ یہی وہ بزرگ ہستیاں ہیں جن کا ادب و احترام مردِ ایم سے کم نہیں ہو سکتا۔ تمام اساتذہ مابعد مثلاً ذوق، غالب، ناسخ، آتش، سب ان کا لوہا مانتے تھے۔ اور ان کی اُستادی اور قادر الکلامی کے دل سے قائل تھے۔ ۵

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں
ریختہ کے تہیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانہ میں کوئی میر بھی تھا
کب ہماری فکر سے ہوتا ہے سودا کا جواب
ہاں تتبع کرتے ہیں ناسخ ہم اُس مخفوق کا

زبان میں فارسی کا غلبہ اس عہد میں فارسی کا بہت غلبہ تھا۔ میر، سودا اور دیگر اُستاد ان فن اپنے پیش روؤں کی نقل کرتے رہے۔ شاہ حاتم کے ساتھ خواجہ میر درد میر جانا مکیں نے اپنے کلام سے ہندی کے الفاظ نکال ڈالے۔ ان تغیرات کی فہرست صغیر بلگرامی نے تذکرہ جلوہ خضر کی جلد اول میں درج کی ہے جس کو شعر الہندی نقل کیا ہے۔ مولوی عبدالسلام صاحب لکھتے ہیں کہ "ان اصلاحات کے بعد اردو

شاعری بالکل فارسی کے قالب میں ڈھل گئی اور ہمارے شعرا نے بالکل ایرانی شعرا کے طرز میں کہنا شروع کیا چنانچہ میر صاحب فرماتے ہیں ۷

تبجیت سے جو فارسی کے میں نے ہندی شعر کے
سارے ترک نیچے ظالم اب پڑھتے ہیں ایران کے بیچ

سودا و میر نے سعدی و حافظ سے استفادہ کیا اور ان کے اشعار کا ترجمہ بھی کیا۔ اس زمانہ میں کچھ لوگوں نے متاخرین شعراے فارسی ناصر علی، جلال، امیر، کلیم اور بیدل کے رنگ میں کہنا شروع کیا لیکن خوش مذاق شعرا نے طالب آملی اور شقائق وغیرہ کی روش اختیار کی۔ ان تھریکات کے علاوہ خود ان شعرا کے کلام کی اندرونی شہادت سے ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے متاخرین شعرا فارسی کے کلام کو پیش نظر رکھ کر شاعری شروع کی ہے چنانچہ سودا و میر و درد وغیرہ نے اس دور کے متعدد شعرا کے فارسی مثل صائب بیدل، نظیری، عرفی، کی غزلوں پر غزلیں لکھیں اور ان کے عمدہ اشعار کا ترجمہ کیا۔ اور اس دور کے شعرا کے کلام میں فارسی ترکیبوں اور فارسی محاوروں کے ترجمہ کی جو بہتات ہے وہ اسی تقلید و تتبع کا اثر ہے۔ سودا نے علی الخصوص ایسی نئی نئی ترکیبیں اور محاورے زبان میں داخل کیے جو مستقل طور پر اُسی کے ہو گئے۔ میر نے بھی خزانہ فارسی سے زبان کو بہت کچھ مالا مال کیا۔ البتہ میر حسن نے متاع موجودہ پر قناعت کی۔ الفاظ میں تذکر و تانیث | الفاظ میں تذکر و تانیث کی پابندی نہ تھی مصنف کی خواہش اور خوشی کے موافق الفاظ مذکر اور مؤنث لکھے جاتے تھے۔ نئی بکریں جو اس سے پیشتر نہیں کہی گئی تھیں اب داخل شعر ہوئیں۔ نئے اصناف سخن بھی اسی زمانہ میں داخل ہوئے مثلاً میر صاحب نے واسوخت، مثلث، مربع کی ایجاد کی۔ فارسی میں المیہ واسوخت کی ابتداء غنائی اور وحشی نے کی تھی۔ قصائد اور اہاجی کی تکمیل سودا کے ہاتھوں ہوئی اور قصائد تو یقیناً اسی وقت درجہ کمال کو پہنچ گئے تھے مشکل مشکل بکریں اور

قافیہ۔ اور دوسرے قافیوں کا رواج ہوتا کہ زبان پر قدرت ثابت ہو۔ زوائد اور بھرتی کے الفاظ جن کا رواج عہد سابق میں بہت تھا اب کم ہو گئے۔

شعر ادبلی چھوڑ کر | افغانوں کے پیہم جلوں اور مرہٹوں کی لوٹ مار کے خوف سے اکثر لکھنؤ آتے ہیں | نامور شعرائے دہلی نے ترک وطن اختیار کیا۔ چنانچہ میر، سودا

میر حسن، سوز وغیرہ اس پر آشوب زمانہ میں اپنے وطن کو خیر باد کہہ کے لکھنؤ چلے آئے جو اُس وقت شعر اوکلا کا ملجا و ماہی تھا اور ہر فن کے استاد وہاں ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے تھے صرف میر و دہی ایک ایسے قانع اور وطن پرست بزرگ تھے جنہوں نے خاک وطن کی محبت نہ چھوڑی اور وہیں جیسے رہے۔

کلام کی خصوصیت | اس عہد کے شعرا کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اُن کے کلام میں پست خیالات کے ساتھ بلند خیال اور سخیف الفاظ کے ساتھ شان دار فصیح الفاظ ملے جھلے ہیں۔ غزلوں میں شتر گری و ناہمواری۔ میر تقی میر کی نسبت ایک قدیم تذکرہ نویس کا قول ہے کہ اُن کے معمولی اشعار نہایت معمولی اور اعلیٰ اشعار نہایت اعلیٰ ہوتے ہیں انگریزی میں یہی حالت ورد سورتھ شاعر کی ہے۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفٹہ اپنے تذکرہ گلشن بختار میں یہی اعتراض مرزا سودا پر بھی وارد کرتے ہیں۔ حقیقت میں یہ ناہمواری کلام ایک معقول سزا ہے جو ان لوگوں کو ملتی ہے جن کا کلام موقع بموقع اور بکثرت ہوتا ہے۔ سودا اور میر سے زیادہ پرگو کوں ہو گا پس اُن کے تمام اشعار یکساں کیسے ہو سکتے ہیں خواجہ میر درد چونکہ کم کہتے تھے یعنی اُسی وقت کہتے تھے جب طبیعت ملہم ہوتی تھی اسی وجہ سے اُن کا بیشتر کلام اس عیب سے پاک ہے۔

تذکرے | متعدد تذکرے یعنی شعرا کے مختصر حالات اور اُن کے کلام کا انتخاب بھی اسی عہد میں قلمبند کیا گیا۔ یہ کام بہت مفید ہوا۔ کیونکہ اس سے اس زمانہ کے

لے دیکھو فٹ نوٹ ۴۵

حالات پر بہت کافی روشنی پڑتی ہے۔ میر تقی میر کا تذکرہ ”نکات الشعرا“ اور میر حسن کا تذکرہ ”شعراے اردو“ اب چھپ گئے ہیں اور ہر جگہ ملتے ہیں ان میں گو کہ حالات بہت مختصر لکھے ہیں۔ مگر پھر بھی شعر اردو کے مورخ کے لیے بہت مفید چیز ہیں اور نہایت دلچسپ باتیں ان میں ملتی ہیں۔

خواجہ میر درد ^{۲۳} سالہ تھے
سید خواجہ میر نام در تخلص خواجہ محمد ناصر عندلیب کے
خلف الصدق تھے۔ ان کے پدر بزرگوار کا بھی ایک ضخیم

دیوان ”نالہ عندلیب“ کے نام سے مشہور ہے۔ سلسلہ نسب خواجہ بہا الدین نقشبند سے ملتا ہے اور مال کی طرف سے حضرت غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچتا ہے ان کے نانا میر سید محمد حسنی نواب میر احمد علی خاں کے صاحبزادہ تھے جن کی تعریف میں سودا نے قصیدہ لکھا ہے۔ اور جو جنگ پانی پت میں شہید ہوئے تھے۔ خواجہ صاحب کے جد امجد بخارا سے ہندوستان آئے مگر ان کے والد خواجہ ناصر کی ولادت ہندوستان ہی میں ہوئی خواجہ ناصر جب جوان ہوئے تو شاہی منصب دار مقرر ہوئے۔ مگر تھوڑے دنوں میں تعلقات دنیاوی ترک کر کے گوشہ نشین اور حضرت شاہ خواجہ محمد زبیر کے مرید ہو گئے۔ اسی عرصہ میں مشہور صوفی شاہ گلشن کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے خواجہ صاحب نے اپنے پدر بزرگوار کے علم و فضل اور کمالات ظاہری و باطنی کے حالات نہایت پر اثر طریقہ سے بیان کیے ہیں خواجہ صاحب کا سن ولادت ^{۲۳} سالہ ہے۔ انھوں نے اپنے والد ہی کی آغوش تربیت میں تحصیل علوم سے فراغت حاصل کی۔ قرآن حدیث تفسیر فقہ اور تصوف میں کامل دستگاہ رکھتے تھے جوانی میں دنیاوی معاملات میں حصہ لیتے اور اپنی جاگیر کے کاموں کو بھی دیکھتے تھے۔ مصحفی اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ سپاہی پیشہ تھے۔ مگر والد کے حکم سے نوکری چھوڑ کر فقر اختیار کیا۔ اٹھائیس برس کی عمر میں دنیا چھوڑ کر گوشہ نشین ہو گئے۔ اور جب باپ نے سفر آخرت اختیار کیا تو اٹھائیس برس کے

سن میں ان کے سجادہ نشین اور قائم مقام ہوئے۔ خواجہ صاحب کا خاندانی اثر اور نواب
ظفر خاں رئیس عہد جمہانگیری سے ان کا انتساب اور سلسلہ انقشبندیہ میں ان کا شیخ وقت
ہونا۔ یہ سب باتیں ان کو مرجع خاص و عام بنائے ہوئے تھیں۔ پھر ان کے ذاتی تقدس
اور مراتب عرفان و قصوف سے کما حقہ واقف ہونے کی وجہ سے لوگ ان کے دل
سے گرویدہ تھے۔ غریب سے لے کر امیر اور بادشاہ سے لے کر فقیر تک ان کی بے انتہا عظمت
کرتے اور ان کے ساتھ دلی عقیدت رکھتے تھے۔ معاصر تذکرہ نویس ان کے اس خاص امتیاز
اور ان کی بزرگی اور خداری کی شہادت نہایت زوردار الفاظ میں دیتے ہیں اور لکھتے ہیں
کہ وہ حجم تعذیب و متانت اور پیکر آداب و اخلاق تھے جو اولیاء اللہ کا نشان امتیاز ہے
قناعت و توکل اور رضا و تسلیم ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئے تھے۔ جب دہلی پر
احمد شاہ ابدالی کا حملہ ہوا اور اس کے بعد مڑھوں کی لوٹ مار شروع ہوئی تو ہر شخص جو اپنی
ناموس و آبرو کا تحفظ چاہتا تھا شہر چھوڑ کر نکل کھڑا ہوا۔ بڑے بڑے نامی شاعر دلی
سے نکل کر لکھنؤ پہنچے مگر اس موراہ خدا کو جنبش بھی نہ ہوئی۔ وہ اللہ پر توکل کیے اپنے بزرگوں
کے سجادہ پر بیٹھا رہا۔ اور اس کی قناعت و استقلال اور توکل علی اللہ میں ذرہ بھر فرق
نہ آیا طبیعت میں آزادی۔ خود داری اور استغنا اس درجہ تھا کہ کسی کی مدح و ثنا سے اپنے
قلم کو آلودہ نہیں کیا۔ ایسی خود دار طبیعت بھلا خوشامد اور بھٹی کیونکر گوارا کر سکتی تھی
دنیا داروں کے سامنے زانوئے ادب نہ کرنا ان کو سید شاق تھا۔ استغنا کا یہ حال تھا
کہ بادشاہ دفت تک سے ملنے میں عار تھا۔ ایک مرتبہ شاہ عالم ان کی بزم سماع میں چلے
آئے جس کی شرکت کو وہ اپنا فخر جانتے تھے اتفاق سے پانوں پھیلا دیے خواجہ صاحب
کو نہایت ناگوار ہوا۔ بادشاہ ان کے چشم و ابرو سے سمجھ گئے۔ فوراً عذر کیا کہ مجبور ہوں
پانوں میں درد ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ اگر تکلیف تھی تو تکلیف کیوں کی حضرت کو موسیقی
سے بھی بڑا ذوق تھا خود اس میں صاحب کمال تھے۔ بڑے بڑے کلامت اور

گوئیے حاضر خدمت ہوتے اور متاع کمال پیش کرتے۔ آپ کے دولت خانہ پر ہر مہینہ کی دوسری اور چوبیسویں کو محفل سماع منعقد ہوتی۔ جس میں بڑے بڑے قوال اور ماہران فن جمع ہوتے۔ اور اپنا کمال دکھلاتے۔ میاں فیروز جو اس زمانہ کا مشہور قوال تھا اکثر حاضر خدمت ہوتا اور اپنے کمال سے حضرت کو محظوظ کرتا۔ محرم میں مجالس منعقد ہوتیں جس میں سوز خوانی اور مرثیہ خوانی کے جوہر دکھائے جاتے۔ اسی طرح ارباب تصوف اور اصحاب سلوک کے بھی جلسے دولت کہہ پر اکثر منعقد ہوتے جن کی شرکت کو بڑے بڑے رئیس امیر اپنی سعادت و فخر سمجھتے۔

تصانیف | خواجہ صاحب کو تصنیف و تالیف کا شوق بچپن ہی سے تھا کتب ذیل جو چھپ چکی ہیں انکی تصنیفات سے ہیں:-

- (۱) رسالہ اسرار الصلوٰۃ جو پندرہ برس کے سن میں بہ حالت اعتکاف لکھا۔
- (۲) واردات در انتیس برس کی عمر میں لکھی اور اُس کی شرح میں (۳) علم الکتاب ایک بڑا نسخہ تحریر کیا جس میں ایک سو گیارہ رسالے ہیں۔ (۴) نالہ درد۔
- (۵) آہ سرد (۶) درد دل (۷) شمع محفل (۸) واقعات درد و غمیرہ۔
- (۹) حرمت غنا (۱۰) دیوان فارسی (۱۱) دیوان اردو۔

رسالہ اسرار الصلوٰۃ اسم باسنی ہے اس میں نماز کی فضیلتوں اور پوشیدہ اسرار کا بیان ہے۔ رسالہ واردات انتیس برس کی عمر میں ۱۰۲۰ھ میں تصنیف فرمایا۔ اس میں مسائل تصوف نظم و نثر میں بیان کیے گئے ہیں۔ علم الکتاب اسی رسالہ واردات کی شرح ہے جس کو اپنے عزیز بھائی اور شاگرد خواجہ میر اثر کی فرمائش سے تصنیف کیا۔ اس میں مسائل تصوف کو زبردست دلائل کے ساتھ آیات قرآنی۔ احادیث نبوی اور اقوال اہل سنت سے ثابت کیا ہے۔ اپنی زندگی کے بھی اکثر واقعات کا اس میں بیان ہے نالہ درد ۹۰۰ھ میں اور آہ سرد ۹۳۰ھ میں تصنیف ہوئیں یہ رسالے بھی روحانیات

اور مسائل تصوف پر ہیں۔ شمع محفل، اور صحیفہ واردات، یہ دونوں کبر سنی کی تصنیفات
میں جبکہ آپ کی عمر باسٹھ برس کی تھی حرمت غنا اور واقعات درد میں بھی دقیق مسائل
تصوف کا ذکر ہے۔ اول الذکر میں غنا کی حلت و حرمت سے بحث کی ہے۔ دیوان
فارسی فارسی کلام کا ایک مختصر دیوان ہے جس میں غزلوں کے علاوہ رباعیات اور مختصات
وغیرہ بھی ہیں۔ آخری چیز دیوان اردو ہے جس کو اردو شاعری کے تاج کا سب سے بڑا ہیرا
سمجھنا چاہیے دیوان اردو کے علاوہ جملہ تصانیف مذکورہ بالا فارسی میں ہیں۔ دیوان کا
ایک نہایت صحیح اور عمدہ نسخہ مطبع نظامی نے چھاپا ہے جس پر محترم نواب حبیب الرحمن خاں
صاحب شروانی نے نہایت قابلیت سے ایک دیباچہ لکھا ہے۔ خواجہ صاحب کی
تبیان اور طرز ادواہی ہے جو میر کی ہے عبارت صاف سلیس فصیح ہر شخص کی سمجھ میں
آسانی سے آتی ہے۔ درد و اثر کوٹ کوٹ کر بکھرا ہوا ہے۔ تصوف کو ان سے بہتر کسی
نے نہیں کہا عرفان اور تصوف کے پیچیدہ اور مشکل مضامین اس خوبصورتی اور
صفائی سے بیان کیے ہیں کہ دل وجد کرتا ہے غزلین زبان کی سادگی اور صفائی میں میر کے
کلام کا مزادیتی میں اور تصوف کی چاشنی اور درد و اثر کے اعتبار سے ان سے بڑھتی ہوئی
ہیں۔ مثل میر صاحب کے خواجہ صاحب کی بھی وہ غزلیں جو چھوٹی بچروں میں ہیں اپنا جواب
نہیں کھتیں بقول مصنف: "آب حیات" تلواروں کی آبداری فشتروں میں بھردی ہے۔ یا
بقول امیر مینائی مرحوم کیسی ہوئی بجلیاں معلوم ہوتی ہیں۔ یہودہ مذاق اور ہجو سے کبھی زبان کو
آلودہ نہیں کیا۔ کہیں کہیں پرانے الفاظ اور محاورے بھی استعمال کرتے ہیں مگر اس
خوبصورتی سے کہ ان سے شعر کی خوبی بڑھ جاتی ہے۔ عاشقانہ رنگ نہایت اعلیٰ
اور بلند ہے۔ اس زمانہ کا عشق مجازی جس کو وہ بوالہوس سے تعبیر کرتے تھے ان کے
کلام میں نہیں پایا جاتا مثل خواجہ حافظ اور اساتذہ سلف کے ان کا معشوق بھی کوئی
مازاری اور ہرجائی نہیں بلکہ اُس سے معشوق حقیقی یا مرشد مراد ہے۔ ایسے بزرگوں کی

نظروں میں شاعری کا پایہ نہایت بلند اور اس کا مقصد نہایت اعلیٰ ہوتا ہے۔ وہ لوگ کسب مال و جاہ کی غرض سے شعر کہنا گناہ سمجھتے تھے۔ اسی وجہ سے اُن کا کلام سوز و گداز اور تاثیر سے محروم ہوتا ہے۔ زبان اور ادب اُردو کے لحاظ سے خواجہ صاحب ایک نہایت نمایاں اور ممتاز درجہ رکھتے ہیں بقول مصنف آب حیات چار رکنوں سے ایک رکن یہ ہیں باقی رکن ہیرہ سودا اور منظر ہیں حقیقت میں انھیں عناصر رابعہ کی ترکیب سے زبان کا قوام درست ہوا۔ قدیم ایہام گوئی اور ہندی دھروں کی تقلید گئی۔ زبان صاف ہوئی اور سنجی۔ اور بالآخر ترقی کی معراج تک پہنچی خواجہ صاحب کے کلام نے یہ ارضافہ کیا کہ تصوف اور روحانیت کی چاشنی سے اُس میں چار چاند لگا دیے خواجہ صاحب کا یہ اثر اُن کے معاصرین اور بعد کے آئیوالوں پر بھی بہت تھا۔ اُن کے معاصر شعرا اُن کا بہت ادب و احترام کرتے تھے۔ خدائے سخن میر تقی میر اپنے تذکرہ میں کس رنگینی اور جوش کے ساتھ اُن کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں "جوش بہار گلستان سخن۔ عندلیب خوشنویں چمن این فن زبان گفتگویش گرہ کشائے زلف شام مدعا مصرعہ نوشتہ اش بر صفحہ کاغذ از کاگل صبح خوشنما۔۔۔ خلیق متواضع آشنا سے درست شعر فارسی ہم میگید یا بیشتر رباعی گرمی بازار وسعت مشرب اوست غرض از آشنائی مطلب است توطن شاہجہاں آباد بزرگ و بزرگ زادہ جوان صالح از درویشی بہرہ دانی دار و فقیر را بخدمت او بندگی حاصل است۔ اگرچہ حسن سلوک عام حسن سلوک بیائے خود گرفتہ اعتزاز را از گوشہ دل نہادہ خلف الصدق حضرت خواجہ ناصر صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ است کہ مقتداے عالم است ایامی کہ فقیر بخدمت آں بزرگوار شرف اندوزی شد از زبان مبارکش میفرمود کہ میر محمد تقی تو میر مجلس خواہی شد۔۔۔ مجلس ریختہ کہ بخانہ بندہ بتایک پانزدہم ہر ماہ مقرر است واللہ بذات ہمیں بزرگ است۔ زیرا کہ پیش از میں مجلس بخانہ اش مقرر بود۔ از گردش روزگار بیدار ہوں غور و انداز لبکہ بایں احقر اخلاص دلی داشت گفت کہ میں مجمع را شا اگر بخانہ

خود معین بکنید بہترست۔ نظر بر اخلاص آن مشفق عمل کردہ آمد۔ خداش ابد الابد سلامت دارد
میر صاحب خواجہ صاحب کا ذکر ایسے الفاظ میں کرتے ہیں کہ لوگوں کو دھوکا ہوتا ہے کہ
اُنکے شاگرد تھے چنانچہ فریخ مستشرق اور زبان اردو کے دلدادہ گارسن ڈیٹاسی کو بھی
یہی دھوکا ہوا کہ وہ میر کو درد کا شاگرد بتاتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ میر صاحب اُن کے تقدس
اور کمال عرفان اور نیران کی ذاتی قابلیت کے دل سے قائل تھے اور یہی حال میر حسن کا بھی
ہے۔ وہ بھی ان کی نیرگی کے قائل اور اُن کے کلام کے معرفت اور دلدادہ تھے۔ کلام کی
نسبت لکھتے ہیں کہ "اگرچہ مختصر مگر مثل کلام حافظ شیرازی انتخاب ہے۔ یہ ہماری رائے
میں میر انیس کے کلام میں جو سادگی اور اثر پایا جاتا ہے وہ بواسطہ میر حسن خواجہ صاحب
کے کلام کا ایک نمایاں اثر ہے۔

شاگرد خواجہ صاحب کے بہت سے شاگرد تھے جن میں قائم۔ ہدایت۔ فراق
اور اثر مشہور ہیں علی الخصوص قائم اور اثر اعلیٰ درجہ کے شاعر اور صاحب دیوان ہیں
خواجہ صاحب کے صاحبزادہ کا نام صاحب میر اور الم تخلص تھا۔ سنہ وفات اور عمر کے متعلق
اختلاف ہے۔ میل صاحب لکھتے ہیں کہ ۱۱۹۹ھ مطابق ۱۷۸۵ء میں وفات پائی۔
مرزا علی لطف ۱۲۰۲ھ اور مصحفی ۱۲۰۹ھ لکھتے ہیں جو ۱۷۶۴ء کے مطابق ہے یہی وہ
سن ہے جس میں مصحفی نے اپنا تذکرہ لکھا تھا۔ گارسن ڈیٹاسی اور لائل صاحب مصحفی
کی پیروی کرتے ہیں۔ مصنف آب حیات لکھتے ہیں ۱۱۹۹ھ میں بمقام دہلی چھاسٹھ برس
کی عمر میں انتقال کیا۔ علامہ شردانی اپنے مقدمہ میں ایک معاصر شاعر بیدار
کی تاریخ لکھی ہے۔ رع حیف دنیا سے سدھارا وہ خدا کا محبوب جس سے سن وفات
۱۱۹۹ھ اور عمر اسٹھ کی نکلتی ہے خود خواجہ صاحب شمع محفل میں فرماتے ہیں کہ کشف
کے طور پر مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ میری عمر چھاسٹھ کی ہوگی سب کا خلاصہ یہ ہے اور
صحیح بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ عمر چھاسٹھ سال اور سنہ وفات ۱۱۹۹ھ ہے۔

درد کی شخصیت اردو شاعری میں ایک خاص شخصیت ہے اپنے معاصرین پر اور نیز
بعد کی نسلوں پر ان کی شاعری کا ایک گہرا اثر پڑا تصوف کے رنگ میں وہ بنظر اور بمثال ہیں۔
سید محمد میر نام میر ضیاء الدین کے صاحبزادہ شاہ قطب عالم گجراتی
کی اولاد میں تھے آباد اجداد بخارا کے رہنے والے تھے۔ مگر خود

۳۳۱-۳۳۲ھ

میر سوز کی ولادت دہلی میں ہوئی تیر اندازی اور شہسوارسی میں مشاق۔ شہزور اور درزش
کے بڑے شائق فنون سپہ گری کے علاوہ خوشنویسی میں بھی یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ نسخ
نستعلیق شفیعا وغیرہ تمام خطوط مروجہ خوب لکھتے تھے۔ جوانی میں رنگین طبع اور عاشقِ کراج
تھے۔ شاہ عالم کے زمانہ میں جب دہلی پر تباہی آئی اور لوگ بچال تھے تو یہ دولت فقروں
مالا مال صوفی باکمال تھے۔ دہلی کی تباہی و بربادی سے افسردہ خاطر ہو کر نکل کھڑے ہوئے
پہلے فرخ آباد گئے جہاں نواب ہریان خاں زند دیوان نواب احمد خاں غالب جنگ
کی چند دن ملازمت و رفاقت کی۔ اُس کے بعد لکھنؤ آئے۔ یہ نواب آصف الدولہ کا زمانہ
تھا۔ نواب بڑی مہربانی سے پیش آئے۔ مگر ان کا جی نہ لگا چند دن ٹھہر کر مرشد آباد کا رخ
کیا۔ جہاں نوابان بنگالہ کا در در دورہ تھا وہاں سے بھی جی گھبرایا تو آخر کار اُسی سال پھر
لکھنؤ واپس آئے اور اب کی مرتبہ آصف الدولہ ان کے شاگرد ہوئے مگر تھوڑے ہی عرصہ
کے بعد استاد نے انتقال کیا۔ بیل صاحب لکھتے ہیں کہ ۱۲۱۲ھ میں بعمر ۶۰ سال رحلت کی
مگر لطف سنہ ۱۲۱۳ھ بتاتے ہیں اور بعضی بوقت وفات ستر برس کا سن لکھتے
ہیں رنارخ اپنے تذکرہ سخن شعرا میں عمر اسی سال اور مقام وفات ظہر بتاتے ہیں۔ فیروز
تذکرۃ الشعرا میں ۱۲۱۳ھ وفات اور عمر ۶۰ سال لکھتے ہیں۔ بہارے خیال میں بعمر ۶۰ سال
اور ۱۲۱۳ھ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ میر سوز نہایت خوش طبع ظریف شیریں زبان خلیقِ بلند
اور بڑے پابند وضع تھے۔

طرز کلام | کلام میں ایک دیوان یادگار چھوڑا ہے جس میں غزلوں کے علاوہ غنوی

رباعیاں اور مخمس بھی ہیں۔ انداز کلام نہایت صاف سادہ اور بے تکلف۔ زبان مٹھی غزل کے واسطے نہایت موزوں ہے۔ لطف زبان صفائی محاورہ اور بیاضتہ پن میں انکا کلام اپنا آپ نظیر ہے تکلف و آدر و فضول مبالغے تشبیہات اور استعاروں سے پاک و صاف۔ لفظی صنائع بدائع بھی بہت کم پائے جاتے ہیں۔ ان کا شاہد کلام حسن طبعی سے آراستہ کسی مصنوعی زیب و زینت کا محتاج نہیں۔ سادگی اور صفائی میں میر تقی میر البتہ ان کے مقابل پر مگر سودا بہت پیچھے ہیں۔ مگر میر صاحب کے یہاں لطف زبان کے ساتھ جو لطف مضامین اور جذبات کا ہے وہ سوز کے یہاں بہت کم ہے۔ اُن کے کلام میں میر اور سودا کی طرح فارسی الفاظ اور فارسی ترکیبوں کی بھی کثرت نہیں سیدھے سادھے ہندی لفظ بیاضی سے باندھے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ باتیں کر رہے ہیں شعر کو اتنا ہلکا پھلکا کر دیتے ہیں کہ اکثر اس پر ردیف کا بھی بوجھ نہیں ڈالتے اسی سادگی کی وجہ سے ایک دور پہلے کے شاعر معلوم ہوتے ہیں زبان کی اصلاح یا توسیع کی کوئی خدمت اُن سے انجام نہ ہو سکی بلکہ سچ پوچھو تو غزل کے سوا اور کچھ نہیں کہا۔ ان کے اشعار کی سادگی اور بے تکلفی سے معلوم ہوتا ہے کہ جو طرزِ بیتی کے نام سے بعد کو سعادت یا رفاہ رنگیں نے ایجاد کیا۔ اس کی ابتدا سوز ہی کے زمانہ میں ہو گئی تھی شعر پڑھنے کا طریقہ بھی اُن کا سب سے علیحدہ تھا۔ ترخم اور خاص درد و اثر کے ساتھ شعر پڑھتے اور اظہارِ مطلب میں آنکھ ناک ہاتھ گردن غرض ہر عضو سے کام لیتے اور خود مضمون کی صورت بن جاتے۔ آبجیات میں لکھا ہے کہ جب یہ قطعہ پڑھا ہے

سلام اللہ خاں صاحب کے ڈیرے

گئے گھر سے جو ہم اپنے سویرے

ارے رے رے رے رے رے رے رے

وہاں دیکھے کئی طفلِ پیری رُو

تو چو تھا مصرعہ پڑھتے پڑھتے زمین پر گر پڑے۔ گویا پر زادن کو دیکھ کر دل بے قابو ہو گیا۔ میر حسن اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں ”در عہد خود از جملہ ادا داران ممتاز طرزاں ایسہ ملک دست

دخواندن اشعارش از زبان ادنیکو از خواندنش چنان خوب می نماید که در گفتن نمی آید
مرزا علی لطف بکته می که عاشقانه رنگ کے بادشاہ میر سوز کا کلام سوز و گداز میں ڈوبا ہوا ہے۔
نام کی مناسبت سے پہلے میر تخلص کرتے تھے پھر سوز اختیار کیا۔ چنانچہ اس شعر
میں دونوں تخلصوں کی طرف اشارہ ہے ۵

کہتے تھے پہلے میر تیر تب نہ موے ہر ارحیف
اب جو کہیں ہیں سوز سوز یعنی سدا جلا کرو

میر تقی میر اسی اشتراک تخلص کی وجہ سے اُن سے کچھ ناراض ہیں۔ فرماتے ہیں
”ہر چند طرز علیحدہ دارد لیکن از خوش کردن تخلص من نصف دلم از خوش است۔“
سوز کا مرتبہ شاعری میں | سوز کا مرتبہ اردو شاعری میں بہت بلند ہے گو وہ میر و سودا
کے مقابل نہیں سمجھے جاسکتے مگر پھر بھی غزل گوئی کے اُستاد اور صفائی کلام، محاورہ بندی
اور سوز و گداز کے بادشاہ تھے، کلام نہایت صاف، سلیس، پُر اثر، تکلف اور بناوٹ
سے بالکل خالی ہوتا ہے۔

مرزا محمد رفیع متخلص بہ سودا، اقلیم مغنوری کے شہنشاہ۔ اردو
کے خاقانی و انوری۔ سپہر شاعری کے درخشندہ تارے بلکہ
آفتاب۔ اور بقول اپنے حریف اور معاصر خدائے سخن
میر کے ریختہ گوئیوں کے انتخاب تھے۔

ان کے آبا و اجداد معزز خاندان کے لوگ کابل کے شہندے تھے۔ مرزا صاحب
کے والد مرزا محمد شفیع ایک تجارت پیشہ بزرگ تھے جو کابل سے ہندوستان آئے اور
دہلی میں قیام کیا۔ خاک دہلی ہی کو یہ فخر حاصل ہے کہ سرآمد شعراے ہندوستان مرزا
رفیع السودا وہاں پیدا ہوئے۔ آزاد ذکرہ آب حیات میں تاریخ ولادت ۱۲۵۰ھ لکھتے
ہیں۔ مگر یقین کے ساتھ اسکی صحت کا اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ اسوجہ سے کہ نہ تو معاصرین

نے لکھا ہے اور نہ مابعد کے تذکروں میں مرزا صاحب کی عمر یا سنہ ولادت کی تصریح ہے
تخلص کے انتخاب کی وجہ بھی آبجیات میں دلچسپ لکھی ہے۔ فرماتے ہیں کہ تخلص سودا
اس واسطے رکھا گیا کہ سودا یا جنون تنغائے عشق ہے جس پر ایشیائی شاعری کا دار و مدار ہے۔
اور یا پھر باپ کی سوداگری کی رعایت سے رکھا گیا کہ اُس کے جزو اول میں لفظ سودا داخل
ہے۔ اور آخر میں یہ خوب فرمایا کہ سوداگری کی بدولت ایہام بی صنعت گھاتے میں آئی۔
مرزا صاحب کی پرورش اور تعلیم دہلی میں ہوئی۔ پہلے سلیمان قلی خاں و داد کے پھر
شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے۔ شاہ صاحب نے جو فہرست اپنے شاگردوں کی اپنے دیوان
کے دیباچہ میں لکھی ہے اُس سے مرزا کی اُستادی پر فخر و مباہات ثابت ہوتا ہے۔ لائق
شاگرد کا نام نہایت محبت اور عزت کے ساتھ لیتے ہیں۔

مرزا کو خان آرزو کے ساتھ شرفِ تلذذ تھا مگر اُن کی صحبت سے بہت فیضیاب
ہوئے اور شعر گوئی میں بہت کچھ فائدہ اُٹھایا۔ انھیں کی ہدایت کے موافق فارسی کو ترک
کیا اور ریختہ کمناس شروع کیا۔ مگر فارسی کا شوق ان میں اس قدر سراپت کیے ہوئے تھا
کہ اُس سے بالکل علیحدگی محال تھی۔ کچھ نہ کچھ ضرور کہتے تھے۔ چنانچہ ان کا مکمل دیوان
فارسی دیوان ریختہ کے شروع میں موجود ہے۔ مرزا کا کلام اس قدر مقبول اور ہر دل عزیز
ہوا کہ گھر گھر اور کوچہ و بازار تک میں پھیل گیا۔ مرزا کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ اُن کا کلام
اُن کی زندگی ہی میں مشہور ہو گیا تھا۔ اور وہ مسلم الثبوت شاعر اُسی وقت مائے جاتے تھے
اُن کی اُستادی کا چرچا اس قدر پھیلا کہ بادشاہ وقت شاہ عالم کو بھی اُن کی شاگردی کا شوق
ہوا وہ اُردو اور فارسی خوب کہتے تھے اور آفتاب تخلص کرتے تھے۔ آخر کار مرزا کے
شاگرد ہوئے اور اپنا کلام اصلاح کے لیے دکھانے لگے کچھ عرصہ کے بعد مرزا کو اُن سے کسی
خاص بات پر بحث ہو گئی اور دربار آنا جانا چھوڑ دیا۔ مگر دہلی میں بہت ایسے قردان ہیں اور
موجود تھے جنہوں نے استاد زمانہ کی دلجوئی اور خدمت کو اپنا فخر سمجھا اور اُن کے ساتھ

بڑی مہربانی اور عالی حوصلگی سے پیش آتے تھے۔ ایسے قدر شناسوں کی دریا دلی اور قدردانی نے مرزا کو ایسا مستغنی اور فارغ البال کر دیا تھا کہ جب نواب شجاع الدولہ نے مرزا کے کمال کا شہرہ سن کر اُن کو نہایت شفقت و محبت سے بلاوے کا خط لکھا اور زاد راہ بھی بھیجا تو مرزا نے مثال دیا اور کمال استغنا سے یہ رباعی جواب میں لکھ بھیجی۔

سودا پئے دنیا تو بہر سو کب تک	آدارہ ازیں کوچہ پاں کو کب تک
حاصل ہی اس سے نہ کہ دنیا ہووے	بالفرض ہوا یوں بھی تو پھر تو کب تک

تھوڑے دنوں کے بعد زمانہ نے پلٹا کھایا دلی کی حالت بدل گئی۔ وہ پرانا وقت نہ رہا پُرانے قدر دان یکے بعد دیگرے مرتے گئے پُرانے شرفا کے گھرانے آئے دن کے بیرونی حملوں اور مرٹھوں کی قتل و غارت سے برخاستہ خاطر اور پریشان ہو گئے اسی کے ساتھ لوگوں کی جان و مال اور عزت و آبرو بھی خطہ میں تھی اور وہ قدر دان اور فن کے جوہری بھی باقی نہیں رہے تھے اس وجہ سے شعرائے باکمال نے دلی کو خیر باد کہا مرزا بھی اسی نازک وقت میں اُس تباہ قافلے کے ساتھ دہلی سے نکلے۔ اُس وقت اُن کی عمر تقریباً ساٹھ برس کی تھی فرخ آباد پہنچے۔ نواب احمد خاں بنگش غالب جنگ برسر حکومت تھے۔ مہربان خاں رند اُن کے دیوان تھے جو اہل علم و کمال کے قدر دان خود بھی شاعر تھے اور بقول میرسن میر سوزد میرزا سودا سے تلمذ تھا چند سال تک مرزا فرخ آباد رہے۔ اُنھوں نے مہربان خاں کی تعریف میں قصیدے لکھے ہیں۔ اللہ میں نواب احمد خاں مر گئے تو سودا بھی فیض آباد چلے گئے اور نواب شجاع الدولہ کے زمرہ ملازمین میں داخل ہو گئے جب سلطنت کا مرکز لکھنؤ قرار پایا تو سودا بھی لکھنؤ آ گئے۔

تھوڑے دنوں کے بعد نواب شجاع الدولہ کا انتقال ہو گیا اور نواب آصف الدولہ سربراہ آئے سلطنت ہوئے تو اس زمانہ میں مرزا سے اور ایک فارسی شاعر فاخر مکیں سے شعر و شاعری کے معاملہ میں کچھ نزاع ہو گئی جس نے طول پکڑ کر ایک

سخت جھگڑے اور باہمی جنگ کی صورت اختیار کی اُس کا تصفیہ نواب سعادۃ علی خاں نے جو اُس وقت ولایت سلطنت تھے نواب کے رد و بر و مرزہ کی موافقت میں کرادیا۔ سابق کی شکر رنجی جاتی رہی خطاب ملک الشرائی اور چھ ہزار سالانہ کا وظیفہ عطا ہوا پھر تو نواب آصف الدولہ مرزا پر نہایت شفقت اور عنایت کی نظر فرمانے لگے اور اتنا ارتباط بڑھ گیا کہ اکثر اوقات مرزا کی پُر لطف صحبت اور اُن کی بذلہ سمجیوں کو جملہ کاموں پر یہاں تک کہ بسا اوقات محل کے عیش و آرام پر ترجیح دیتے تھے مرزا کا انتقال لکھنؤ میں ۱۱۹۵ھ مطابق ۱۸۸۰ء میں ہوا۔ بہت سے معاصرین اور نیز مابعد کے شاعروں نے وفات کی تاریخیں کہی ہیں۔ مصحفی، منت، ناسخ، نساخ کی تاریخیں مشہور ہیں۔

تصانیف | مرزا کی تصانیف جمیع اقسام سخن میں بکثرت حسب ذیل ہیں:-

(۱) ایک مختصر دیوان فارسی جس میں ردیف و ارغزیں ہیں۔

(۲) چند فارسی قصائد۔

(۳) دیوان اُردو مکمل جس میں علاوہ غزلوں کے رباعیات، قطعے، تالیخیں، مخمس، ترجیع بند، داسوخت، رستزاد، تظہیں، غرض ہر قسم کا کلام ہے۔

(۴) چوبیس مثنویاں یعنی مختلف منظوم حکایتیں اور لطائف جن میں اُن کی دلچسپ

اور مشہور ہجویں اور پہیلیاں ہیں۔

(۵) تظہیں بر کلام میر۔ اور دو خط بنام میر ایک نظم اور ایک نثریں (اُن کے کلیات

میں نہیں ہیں)۔

(۶) قصائد امرائے دہلی و لکھنؤ وغیرہ اور نواب آصف الدولہ کی تعریف میں۔

(۷) سلام اور مرثیہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی شان میں۔

۱۰ ایک تاریخ یہ ہے ۷۰ خلد کو جب حضرت سودا گئے پھر میں تاریخ کی ماہر ہوا بولے مصنف دور کر

پائے عناد: شاعران ہند کا سرور گیا۔

(۸) تصانیف معصومین علیہم السلام کی منقبت میں۔

(۹) ایک رسالہ نثر میں مرسوم بعیرۃ الغافلین۔ مرزا فاخر مکیں کے اعتراضوں کا جواب ہے جو انھوں نے فارسی کے شعرا کے سلف پر کیے تھے۔

(۱۰) میر تقی میر کی مشہور شذی شعلہ عشق کا ترجمہ نثر میں (ان کے کلیات میں نہیں ہے)۔

(۱۱) ایک تذکرہ شعرا کے اردو کا۔ جواب نہیں ملتا۔

سودا کا مرتبہ شاعری میں | سودا اپنے زمانہ کے بہت بڑے استاد مانے گئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ میر اور سودا دونوں زبان اردو کے سب سے بڑے شاعر گزے ہیں۔ اپنے زمانہ میں بھی بے نظیر اور بے عدیل تھے اور ان کے بعد بھی ان کا ایسا کوئی نہیں ہوا۔ ان کی خدمات زبان اور شاعری اور فن نظم کے ساتھ بہت قابل قدر ہیں ان کی اصلاح زبان کا اثر بہت گہرا اور دیر پا ہے۔

ان کی خدمات زبان کے ساتھ | مرزا نے اکثر ہندی الفاظ کی درستی کو دور کر کے فارسی کی آمیزش سے زبان میں شیرینی اور حلاوت پیدا کی۔ میر اور سودا ہی نے زبان کو ادبی زبان بنایا اس کو درخت کا مرتبہ بخشا چنانچہ خود فرماتے ہیں ۵

کہے تھے درخت کہنے کو عیب ناداں بھی	سویوں کہا میں کہ دانا ہنر لگا کہنے
لسان مہر یہ روشن ہے سارے عالم پر	جہاں میں جیسے کہ میں شعر تر لگا کہنے

ولہ

سخن کو ریختے کے پوچھے تھا کوئی سودا	پسند خاطر دلہا ہوا یہ فن مجھ سے
کب لگو گوش کرے تھا جہاں میں اہل کمال	یہ سنگریزہ ہوا ہے دُرعدن مجھ سے

شاعری کی صنایعوں سے اس میں طرح طرح کی لطافتیں اور نزاکتیں پیدا کیں فارسی سے بکثرت الفاظ و محاورات استعارے تشبیہیں، طرز تخیل، اور تلمیحات زبان اردو میں داخل کیے اور اس استاد سے داخل کیے کہ اس کے جزو ہو گئے

اور اُس کی وسعت اور لوچداری اتنی بڑھ گئی اور وہ اس قابل ہو گئی کہ ہر ادبی کام اُس سے لیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ نئی نئی ترکیبیں اور محاورے فارسی کی روش پر ایجاد کیے جس میں سے بعض تو مقبول ہوئے اور بعض کو آئندہ نسلوں نے ناپسند اور متروک کیا کیا اچھا ہوتا اور ہماری زبان کی کتنی خوش نصیبی ہوتی اگر ان خدا یا ان سخن کو وہی توجہ جو فارسی کے ساتھ تھی بھاشا کے ساتھ بھی رہی ہوتی جس کا نتیجہ لازمی یہ ہوتا کہ دہی زبان کے لفظ بجائے اجنبی الفاظ کے کثرت سے داخل ہوئے ہوتے، اس میں کوئی شک نہیں کہ مرزا کی قوت ایجاد و انتخاب اور قابلیت اس اعلیٰ درجہ کی تھی کہ جو چیزیں داخل کیں اُن پر طفرائے قبول فوراً اُشت ہو گیا اور اب وہ ہماری زبان کا جزو لا ینفک بن گئیں۔

یہ بات بھی قابلِ داد ہے کہ فارسی روایات اور تمبیحات کے ساتھ ہندوستان کی قدیم روایات و الفاظ بھی بھلائے نہیں گئے مثلاً الفاظ بھجل۔ پرست۔ رائی وغیرہ درہندی علم الا صنم میں ارجن کی بہادری کھنیا کا عشق وغیرہ جو اُن کے کلام میں بڑا لطف دیتے ہیں۔ یہ سب اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ کم سے کم اس زمانہ میں مادرِ وطن کے ساتھ تعلقات کو پختہ کرنے کا خیال ہمارے شعراء کے دل میں بہت کچھ تھا جو افسوس ہے کہ متاخرین نے حقارت کے ساتھ دل سے فراموش کر دیا۔ مرزا کو اکثر مناسب ہندی الفاظ بھی ہندی خیالات کے اظہار کے لیے اختراع کرنا پڑے اور اس کوشش میں ان کو اپنے معاصرین سے سخت مخالفتیں اور دقتیں اٹھانا پڑیں مرزا کے عہد میں قدیم ایہام گوئی اور دواہروں کا رواج جو متقدمین کی یادگار میں سے

ستم پرست ہوتا اُس کو اُٹھالیتا ہے جوں رانی
کھنیا سے نہیں کچھ کم صنم میرا ہے بھجانی
مرزا کاں نے تیرے پیارے ارجن کا بان مارا

بھجوتے کے کروں بھجیل کی میں تعریف کیا یار
نہیں ہے گھر کوئی ایسا جہاں اس کو نہ دیکھا ہو
ترکش الینڈ سینہ عالم کا چھان مارا

کچھ باقی رہ گیا تھا وہ بالکل متروک ہو گیا تھا چنانچہ سودا خود فرماتے ہیں :-

ایک رنگ ہوں آتی نہیں خوش مجھ کو دورنگی
منگر سخن و شعر میں ایہ سام کا ہوں میں

اور اُن کے ہمعصر میر کہتے ہیں :-

کیا جانوں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میر کے
کچھ طرز ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں

مگر فارسی اور ہندی الفاظ کو ملانے کی دقت رفع نہیں ہوئی تھی۔ اور آخری منازل
رتقی اُردو شاعری کے واسطے ہنوز باقی تھے۔ مرزا کے کلام کو اس نقطہ نظر سے جاسنجا بہت
ضروری بات ہے۔ جو خدمات زبان کے ساتھ اُنھوں نے انجام دیں اور جو قوت زبان
پر انھیں حاصل تھی اُس کا اعتراف اُن کے معاصرین مثلاً میر جو میر حسن، مصطفیٰ وغیرہ
نے بخوبی کیا ہے اور ان کی قابلیت و کمال کی دل سے داد دی ہے۔

اُن کی خدمات شاعری کے ساتھ جو بنیادیں دلی اور شاہ حاتم نے قائم کی تھیں انھیں پر
سودا نے اپنا رفیع اور شاندار ایوان شاعری تیار کیا۔ علاوہ کمال فن کے وہ دو چیزیں
کے موجب بھی تھے۔ یعنی قصیدہ اور ہجو۔ ہر چند کہ یہ دونوں صنعتیں فارسی میں نہایت
کمال اور باقاعدہ صورت میں اُردو میں بھی ایک ابتدائی اور نامکمل حالت میں
موجود تھیں مگر اُنھوں نے یہ کمال کیا کہ اُن کو اُردو میں درجہ کمال تک پہنچا دیا۔ اور
ایسا کر دیا کہ اُنکی برابری اور ہمہ پرسی کا خیال تک بعد کے شاعروں کے لیے محال ہو گیا۔
ہر چند کہ اکثر شعرا نے اُن کی پیروی کی اور اُن کے قدم بقدم چلنا چاہا مگر کلیاب نہ
ہو سکے اور مرزا دونوں اصناف سخن میں متفرد ہی رہے۔

قصیدہ و مرثیہ اُن کے اُردو قصائد بڑے بڑے فارسی استادوں کے قصائد کے
کر کے ہیں اور بعض تو عرفی و خاقانی کے معرکہ آرا قصیدوں کو بھلا دیتے ہیں نثر کا خیال

اور طر فکی مضامین میں وہ اکثر اہل عجم سے کوئے سبقت لے گئے ہیں۔ یہی حالت اُن کے مراشی کی بھی سمجھنی چاہیے۔ مرزا سے پہلے گو مرثیہ کو اردو میں بہت گزرے ہیں مگر اُن کے کلام میں سوائے مذہبیت کے کوئی شاعرانہ رنگ، کوئی جدت اسلوب، کوئی نئی بات نہ تھی جو زمانہ موجودہ کے ترقی یافتہ مذاق کو بھی معلوم ہو۔ مرزا ہی وہ صاحب ایجاد ہیں جنہوں نے اس فن خاص میں بھی اپنے زمانہ کے اعتبار سے کمال حاصل کر لیا۔ بلکہ سچ پوچھو تو اپنے بعد آنے والوں کے واسطے ترقی کی راہیں کھول گئے۔

جو | مرزا صاحب نے ہجڑوں کے دفتر کے دفتر لکھ کر رکھ دیے ہیں۔ اُن لوگوں پر تو ضرور افسوس ہوتا ہے جن کے دلوں پر یہ آریے چلے ہوں گے مگر ہمارے واسطے وہ ایک زعفران زار چھوڑ گئے ہیں جو ابد الابد تک شاداب و سرسبز رہے گا۔ اُن کے اہاجی میں وہ گرمی کلام اور تیزی ہے جس سے وہ ظرافت و مذاق کا ایک دائمی ذخیرہ بن گئی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے اس صنف سے اُن کو خلقی مناسبت بلکہ قدتی خصوصیت تھی جیسا کہ اُن کے خود ایک شاگرد نے اس طرف اشارہ کیا ہے۔

کی ہجو ہر اک شخص کی ہر چند کہ اُس نے	پر اُس سے طوطا اُس کے نہ عائد ہوتی نقیصہ
ہے ایک سبب یہ کہ وہ خود آپ مغل تھا	اور جتنے بزرگ اس کے تھے مغلوں کے تھے وہ پیر

بڑھاپے میں بھی اُن کی زندہ دلی اور مزاج کی شگفتگی ایسی تھی کہ جو بات دل میں آجاتی تھی اُس کے اظہار سے کبھی نہ چوکتے تھے۔ کسی انعام کا لالچ یا انتقام کا خوف اُن کو اپنے دل کی بھڑاس نکالنے سے روک نہ سکتا تھا۔ جہاں کسی سے اُن بن ہوئی فوراً اُن کا غلام "غنیچہ" قلمدان دکاند کا سامان گل تراشی لیے ہر وقت موجود تھا اور پھر وہ وہ گل بوٹے تراشے جاتے تھے کہ جن کو دیکھ کر لوگ اپنی آنکھیں اور سن کر اپنے کان بسند کر لیتے تھے۔ اُنہوں نے اپنی تحریروں سے اس مبتذل صنف کو بھی ایک باقاعدہ اور مکمل فن بنا دیا۔ وہ زمانے کی خرابی اور گمراہیوں کی پردہ وری میں کوئی دقیقہ اٹھانے

رکھتے۔ ایک انگریز نقاد کا قول ہے کہ ”جس طرح رومۃ الکبریٰ کے زوال کی تصویروں کے واسطے ہم جو دنیا کے ایسے مرقع نگاروں کی صفحہ گردانی کرتے ہیں اسی طرح ہم کو اگر زوال دولت مغلیہ کی سچی تصویریں دیکھنا ہیں تو ہم کو چاہیے کہ سودا کی ان پُر آشوب نظموں کا مطالعہ کریں جس میں انھوں نے مرہٹہ سواروں کی عین قلعہ دہلی کی دیواروں کے نیچے قتل و غارتگری کا سچا فوٹو اتارا ہے یا جس میں زمانہ کی پُر آشوب حالت اور امرائے دہلی کی تباہی و بربادی اور کس پیرسی کا بیان نہایت پر زور اور دردناک طریقہ سے کیا ہے۔ یا مثلاً وہ نظم جو ہجو شیدی فولاد خاں کو تو ال شاہجاں آباد کے نام سے مشہور ہے جس میں چوری کی کثرت شہر کی بدامنی اور کوتوال شہر کی کمزوری کس پر مذاق اور موثر طریقہ سے بیان کی ہے۔ یہ سچ ہے کہ مرزا سے پہلے بھی بعضوں نے ہجوئیں کہی ہیں مگر بہت کم اور بے قاعدہ۔ میرزا کے میاں وہ ایک صنف کلام اور مقابلہ کا ایک زبردست ہتھیار بن گئی۔ میر حسن کے پدربزرگوار میرضا حاک، ہمدی پنجابی، مرزا فائز ملکین، بقا، اور ان کے علاوہ اور لوگ بھی باری باری سب مرزا کی زد میں آئے اور ان بچاروں نے حرکت مذہبی میں کچھ ہاتھ پانوں ہلائے اور اپنی بساط کے موافق کہا مگر ان کا کہا کسی نے نہ سنا مرزا کا کہا بچے بچے کی زبان پر ہے۔ کثرتِ اہاجی سے پتہ چلتا ہے کہ مرزا کو اس چیز سے خاص اُنس تھا اور اس میں اُن کو بڑا مزہ آتا تھا۔ ان کی ہجوئیں کچھ معمولی نظمیں نہیں ہیں بلکہ ان سے ان کی قوت بیان قدرتِ زبان اور معاملاتِ دنیاوی میں ان کی وسیع معلومات کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ وہ جب کسی کی ہجو لکھتے ہیں تو اُس چیز کی جزئیات کو کبھی نظر انداز نہیں کرتے۔ اور حیرت ہوتی ہے کہ دو متضاد چیزیں درودِ اثر اور دشمنی کو یکجا کر دیتے ہیں اور سننے والے پر غضب کا اثر پڑتا ہے جس چیز کا خاکہ اڑاتے ہیں اُس میں فارسی وغیرہ کی تقلید نہیں

ہوتی۔ مضمون اچھوتے اور پھڑکا دینے والے ہوتے ہیں۔ مرزا میں جو دنیا لاء والی لٹریچر اور سویفٹ تینوں کا مرزا ہے۔ ایڈیٹنگ کی متانت اُن میں مطلق نہیں۔ اُن کی سچوئیں پھلکڑپن کے ساتھ طعن و تشنیع بھی بہت ہے۔ اُن کے الفاظ میں دل لگی اور مذاق کی

۱۲۸ "جولیس جو دنیا لاء" روما کا مشہور ہجو نگار شاعر تھا۔ نہ پیدائش تقریباً عیسوی اور سنہ وفات ۱۲۸ عیسوی ایک امیر آدمی کا لڑکا فن شعر اور انشاد میں کمال رکھتا تھا اس کی سولہ کتابیں مختلف مضامین پر موجود ہیں جن میں ہجو کا نمبر سب سے بڑھا ہوا ہے۔ زمانہ کی سوسائٹی کی بد اخلاقی اور خرابی پر شہر آشوب کی صورت پر جو مضمون لکھے ہیں وہ نہایت مسخت اور زرد دراز زبان میں ہیں جس کے بعض جملے ضرب المثل ہو گئے ہیں۔

۱۲۹ "پورانام" فرانسے ماری والیٹر فرانس کا مشہور شاعر ڈراما نویس اور ناقد گزرا ہے۔ ۱۶۹۷ء میں ولادت اور ۱۷۷۸ء سنہ وفات۔ فن شعر اور تنقید میں یکتاے زمانہ تھا۔ مرزا غالب کی طرح اُس کے کبھی خطوط نہایت دلچسپ اور انشا پر دازی کے بہترین نمونے ہیں اس کے کلام میں ذہانت و طباعی اور انتہا درجہ کی طعن آمیزی شوخی اور ظرافت پائی جاتی ہے نہایت آزاد خیال واقع ہوا تھا مذہب کے ساتھ اسکی بے پروائی، شوخی اور طعن آمیز جملے مشہور ہیں۔ اس کا ڈراما موسوم "بہ محمد" ایک مشہور کتاب ہے۔

۱۳۰ "جانٹن سویفٹ" والیٹر کا معاصر ہے۔ مشہور آئرس افسانہ نویس اور ہجو نگار تھا۔ برخلاف والیٹر کے یہ مذہب کا پابند بلکہ پادری تھا۔ "بیل آف دی گبس" (کتابوں کی جنگ) اور "گلیور کے سفر اُس کی مشہور تصانیف ہیں۔ ملکی یا بیات میں بھی بہت حصہ لیتا تھا اس کی تصانیف میں بے انتہا شوخی، مذاق اور طنز ہے مثلاً جب آئر لینڈ کے تصابوں کا جھگڑا پارلیمنٹ میں پیش ہوا تو اُس نے ایک رسالہ لکھا جس کا نام معقول تجویز رکھا جس میں تجویز تھا کہ آئر لینڈ کی مصیبت دور کرنے کی سب سے بہتر ترکیب یہ ہے کہ اس ملک کے بچے حلال کر کے ان کا گوشت بازار میں بیچا جائے یہ مضمون نہایت پُر مذاق اور طنز آمیز ہے۔ عبارت نہایت صاف سادہ بلا کسی تصنع کے لکھا تھا جس کی وجہ سے اس کی تمام تصانیف مقبول عام ہیں۔

۱۳۱ جوزف ایڈیسن انگلستان کا سب سے بڑا مشہور مضمون نگار اور نثر نگار ہے اُسکی مشہور کتاب "ایپیکسٹریٹر" بہترین ذخیرہ اخلاقی سیاسی اور معاشرتی مضامین کا ہے جن کی سلاست اور شیرینی زبان انگریزی میں مشہور ہے وہ بھی اپنے کلام میں ایک خاص قسم کی ظرافت اور مذاق سے کام لیتا ہے مگر اس سے کسی کا دل نہیں دکھتا اُس کے کلام میں نہایت متانت اور سنجیدگی ہے جو طعن و تشنیع کے جس کے یہاں طعن و تشنیع بہت ہے

تہ میں ایسی کاٹ اور برش ہے جو دل کے اندر اتر جاتی ہے۔ آزاد نے سچ کہا ہے کہ
”جس کے پیچھے پڑتے تھے اُس کو پیچھا چھڑانا مشکل ہوتا تھا۔“

کلام پر رائے | مرزا کو زبان پر پوری قدرت اور شعر پر پوری حکومت حاصل تھی۔
مشکل سے مشکل زمینیں اُن کے سامنے پانی اور اوق مضامین اُن کے سامنے ہاتھ
باندھے کھڑے رہتے تھے۔ اشعار سب کیل کا نٹے سے درست بندش چست، زرد اند
و بھرتی کا نام نہیں۔ کلام سانچے میں ڈھلا معلوم ہوتا ہے الفاظ کو اپنے مقام پر ایسا
رکھتے تھے جیسے انگوٹھی میں نگینے جڑے جاتے ہیں اگر کوئی لفظ بھول جاؤ تو دوسرا لفظ
اسکی جگہ پر نہیں رکھ سکتے۔ اگر لفظ ادھر سے ادھر رکھ دو تو شعر کا لطف اور مرزا جانا رہ گیا۔
کلام ٹھوس اور زور فصاحت سے بھرا ہوا ہے۔ نئی نئی بحر میں اور شگفتہ زمینیں نئے نئے
ردیف اور قافیہ ایسے کہ گئے ہیں کہ اب تک دل مزے لیتا ہے۔ سنگلاخ زمینوں میں
بھی ایسے ایسے شعر نکالے ہیں جس طرح پتھر سے چستہ نکلتا ہے۔

سودا کا اثر بعد کے شعرا پر | مرزا کا اثر اپنے زمانے کے اور نیز بعد کے شعرا پر بہت کچھ
پڑا۔ اُن کے اشعار پڑھ کر بہت سی منجلی طبعیتوں میں شعر گوئی کا شوق اور مادہ پیدا ہو گیا۔
اس خاص صفت کے اعتبار سے اُن کو اردو شاعری میں وہی مرتبہ حاصل ہے جو سپنر
کو انگریزی میں ہے جو شاعروں کا شاعر کہلاتا ہے۔ معاصرین سے قطع نظر غالب اور
ذوق وغیرہ بھی سب اُن کو مانتے تھے اور ان کے کلام سے مستفیض ہوتے تھے۔ ناسخ کا قول
ادب پر نقل ہو چکا ہے۔ غالب ایسا جادو نگار سودا کا قائل ہے اور استاد ذوق کا تو پورا
کلام مرزا کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے علی الخصوص اُن کے قصائد میں معلوم ہوتا ہے کہ
مرزا کے قصائد سامنے رکھ کر کہے گئے تھے مرزا کے کلام میں بسبب تنوع کے اس قدر

۱۔ اٹھ سو پندرہویں صدی عیسوی کا نامور انگریزی صاحب تصنیف شاعر ہے اسکی کتاب نثری کوئین (پری ملکہ)
ایک شہر نظم ہے۔ اس نے قدیم لاطینی ادبی زبان بحر نظم نگاری میں رواج دے کر انگریزی شاعری کا پارہ بلند کیا۔

مقبولیت اور دلچسپی ہے کہ ہر شخص خواہ وہ شاعر ہو یا غیر شاعر اس کو پڑھتا ہے اور اس پر وجد کرتا ہے۔ بعض اشعار میں تو حقیقی شاعری کے ایسے سچے جذبات دکھائے ہیں جو دیگر شعرائے اردو کے کلام میں کمیاب ہیں۔ البتہ انگریزی میں شیلی اور کیٹس کے یہاں بہت کچھ ہیں غرض کہ میر و مرزا دونوں ایسے صاحب کمال تھے جن کا کلام بعض اس زمانہ کے الفاظ و محاورات کو چھوڑ کر زبان کی صفائی اور شیرینی اور خیالات کی بلندی اور پاکیزگی دونوں اعتبار سے اردو شاعری کا بہترین نمونہ کہا جاسکتا ہے اور اس زمانہ میں بھی کسی شعر کی سب سے بڑی تعریف یہی ہو سکتی ہے کہ ان قادر الکلاموں کے کسی شعر کے قریب پہنچ جائے سودا کی اُتادی اور ملک سخنوری کی بادشاہت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے وہ قدرتی شاعر تھے اور جذبات شاعری اُن کے خمیر میں پڑے تھے میرا لیا نازک دماغ اور دنیا کو بے حقیقت سمجھنے والا شخص ان کو پورا شاعر مانتا ہے اور ان کو ملک الشعرائی کا مستحق قرار دیتا ہے۔ مرزا کے کلام سے ظاہر و باہر ہے کہ اُن کا دل جذبات سے کس درجہ متاثر ہوتا ہے اُن کے اشعار میں ترشے ہوئے نگیںوں کی سی آبداری اور انعکاس اور اُن کا دماغ اعلیٰ تخیل سے روشن ہے۔ مرزا میں چند خاص باتیں ہیں جو اُن کے کلام کو جملہ شعرائے ماضی و حال سے ممتاز کر دیتی ہیں۔

(۱) زبان پر کامل قدرت جس سے کلام کا زور مضمون کی لطافت اور نزاکت

لے سو برس ادھ کا ایک مشہور رنگین طبیعت اور عاشق مزاج انگریزی شاعر تھا۔ تیس برس کے سن میں جوانا مرگ مرا، نہایت آشفتنہ مزاج اور آزاد خیال آدمی تھا جو اس کی بدنامی کا بھی باعث ہوا۔ اس کی تصانیف میں گوئن میب (ملکہ میب) الاسر (کنج تنہائی) اور دیوولٹ آف اسلام مشہور ہیں اس کے خیالات نہایت شاعرانہ اور بلند ہوتے تھے ۱۲۔

۱۳ شیلی کا مدام امر تھا اور مثل اُسی کے نوجوان مرا۔ اس کی کتاب، انڈیمن، نہایت دلچسپ ہے نازک خیال اور رنگین طبیعت شاعر تھا وہ خود نہایت حسین اور حسن کا عاشق تھا۔ ۱۲۔

سہل کر عجب لطف و اثر پیدا کر دیتا ہے۔

(۲) بندش کی حیثی اور الفاظ کی نشست و ترکیب جس سے شعر میں ڈھیلا پن اور شستی مطلق باقی نہیں رہتی بلکہ اُس میں تلوار صفا بانی کی سی آبداری پیدا ہو جاتی ہے نشست الفاظ کی یہ صفت ہے کہ اگر کوئی لفظ ادھر ادھر ہو جائے تو شعر بے مزہ بلکہ مہمل ہو جائے گا صنعت کی خوبی سے صنایع کی قابلیت کا پتہ چلتا ہے۔

(۳) خیالات کی بلندی اور نزاکت ہے۔ البتہ کچھ استعاروں اور تشبیہوں سے کام لیتے ہیں مگر صرف اسی قدر کہ شعر کا حسن بڑھ جائے اور سامع کو مطلب ٹٹولنا نہ پڑے اُن کا سامان زینت شعر کے حقیقی کو کبھی نہیں چھپاتا ان کی طبیعت ایک رنگ کی پابند نہ تھی رجوبات اور لوگوں کو سخت کاوش اور محنت سے میر ہوتی تھی وہ اُن کو ایک جنتش قلم سے حاصل ہو جاتی تھی۔ یہ تخیل اور قدرت زبان کا اثر تھا۔

(۴) چوتھی چیز اُن میں تصفیہ زبان ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ جن لوگوں نے زبان کو پاک صاف اور نیر و سیح کیا اُن سب میں مرزا کا نمبر اول ہے۔ بقول مصنف آب حیات جس طرح کیمیادان دواؤں سے تیار کردہ تیار کرتے ہیں انھوں نے فارسی اور ہندی کے امتزاج سے ایک تیسری زبان پیدا کی جسے مقبولیت عام حاصل ہوئی۔

مرزا کے کلام پر
شعر کی رائیں
اب بے موقع نہ ہو گا کہ مرزا صاحب کے متعلق ان کی اور نیز ان کے بعد کے شعراء اور تذکرہ نویسوں کی بھی قیمتی اور قابل قدر رائیں بلکہ اُن کا اقتباس یہاں تحریر کیا جائے۔ میر تقی میر اپنے تذکرہ نکات الشعراء میں انکی نسبت فرماتے ہیں خود انھیں کی زبان سے سنئے مرزا رفیع مخلص بہ ستودا جو انے است خوش خلق و خوش خو گرم جوش یار باش، شگفتہ رو..... غزل و قصیدہ وثنوی و قطع و مخمس و رباعی ہمہ را خوب می گوید سرآمد شعرا کے ہندی ادب است۔ بسیار خوش گوشت بہ شعرش طرف لطف رستر رستر در حین ہندی الفاظ گل معنی دستہ دستہ۔

ہر مصرعہ برجستہ اش را سرو آزاد بندہ پیش طبع عالیش فکر عالی شرمندہ۔ شاعر ریختہ
چنانچہ ملک الشعرائی ریختہ اور شاید قصیدہ در ہجو اسپ گفتمہ موسوم بہ تنضیک و زکار
دور از حد مقدور و در صنعتها بکار بردہ۔ اکثر اتفاق طرح غزل با ہم می افتد غرض
از مختصات روزگارست حق تعالی سلاطینش دارد۔

اسی طرح مرزا قیقل چار شربت میں مرزا کے قصائد کی نسبت لکھتے ہیں کہ ”سودا کا
مرتبہ قصائد میں ظہور می کے برابر ہے۔ سوائے اس کے کہ دونوں کا طرز الگ الگ
ہے اور کوئی فرق نہیں ہے“ اس تنقید پر مصنف آب حیات کی رائے ہے کہ ”مرزا
قیقل جو چاہیں کہیں مجھ بے کمال نے ظہور می کی غزلیں اور قصائد تھوڑے بہت
پر سے ہیں دونوں استعاروں اور تشبیہوں کے پھندوں سے الجھا ہوا ریشم معلوم
ہوتے ہیں۔ مرزا کی مشابہت ہے تو انور می سے ہے جو قصائد اور ہجو اور نیز محاورے
اور زبان دونوں کا بادشاہ ہے۔“ اسی طرح صاحب طبقات الشعراء مرزا کے قصائد کو
عرفی اور خاقانی کے قصائد سے اور ان کی غزلوں کو سلیم و کلیم کی غزلوں سے بڑھ کر سمجھتے
ہیں رکھتے ہیں کہ وہ پُر گو بھی تھے اور خوش گو بھی تھے۔ میر حسن اپنے تذکرہ میں تحریر فرماتے
ہیں کہ ”مرزا سودا کے مقابلہ میں اب تک کوئی شخص ہندوستان سے نہیں اٹھا اور
وہ موسیقی کے بھی ماہر تھے اور فقیران کی خدمت میں اکثر حاضر ہوتا ہے اور وہ میرے
ادب پر کرم فرماتے ہیں۔“ حکیم قدرت اللہ خاں بقا اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں۔ ”مرزا
محمد رفیع سرآمد شعرائے فصاحت ہیں بعض کے نزدیک وہ غزل گوئی میں میر تقی میر
کو نہیں پہنچتے۔ سچ یہ ہے کہ ہر گلے مار رنگ دبوئے دیگر است۔ مرزا ایک بے کنار
سمندر اور میر ایک عظیم الشان دریا ہیں۔ قواعد کی معلومات میں میر صاحب کو مرزا صاحب
پر برتری ہے اور قوت شاعری میں مرزا صاحب کو میر صاحب پر فوقیت ہے۔“
تذکرہ گلشن بیجار میں ہے کہ ”فقیر کی دانست میں ان کی غزلیں ان کے قصیدوں سے

اور اُن کے قصیدے اُن کی غزلوں سے بہتر ہیں۔ اگر کوئی یہ کہے کہ غزلوں میں بھرتی کے اشعار ہیں اور قصائد ان سے خالی ہیں تو میں کہوں گا کہ اُن کے دیوان کو سمجھ کر پڑھنے والوں پر اس رائے کی قباحت ظاہر ہو جائے گی، پروفیسر شہباز شمس العلماء انوارِ بدایاں صاحب اثر کا قول نقل کرتے ہیں کہ سودا اور دکن کے شکیں پیر تھے۔ اسی طرح سرفراز لائل سودا کو زبان اور دو کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کرتے ہیں۔

کلام میں کمی | مرزا میں دو تین کیاں بھی ہیں (۱) اُن کا کلام کم و بیش تصوف کی چاشنی سے خالی ہو جس کا اُن کے اکثر مضمونوں میں بہت زور تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مطالعہ اور ذوق معاملات دنیاوی تک محدود ہے (۲) دوسرے لطیف غزل ان میں کم ہے یعنی ان کی غزلوں میں وہ سوز و گداز اور سبکی اور سادگی نہیں جو غزل کی جان ہے۔ اس کا مفصل ذکر انشاء اللہ میر تقی میر کے حالات میں آئے گا جہاں ان دونوں کی شاعری کا مقابلہ کیا گیا ہے۔

میر حسن متولی ^{۱۷۸۷ء} مطابق ۱۷۸۷ء | میر غلام حسن متخلص بہ جن معروف بہ میر حسن میر غلام حسین ضاحک کے وہ بلند اقبال صابن زادے تھے جن کے بیٹے خلیق اور پوتے میر انیس ہوئے جو فلک شاعری پر آفتاب بن کے چمکے۔ ان کے اجداد شہر ہرات کے مشہور خانوادہ سادات سے تھے۔ جد اعلیٰ میر امامی نام ہندوستان آئے اور یہیں مستقل حکومت اختیار کی۔

میر حسن اپنے زمانہ نے نامی گرامی شاعر مجید فاضل اور مشہور خوشنویس تھے۔ اور ان کمالات کی وجہ سے اپنے ہمچشموں اور معصروں میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے ان کے والد میر ضاحک نہایت زندہ دل ظریف اور باغ و بہار آدمی تھے۔ جیسا کہ اُن کے تخلص سے ظاہر ہے۔ میر حسن کی ولادت پُرانی دلی کے سید واڑہ میں ۱۷۸۷ء میں ہوئی اور بچپن میں درسی تعلیم اپنے والد ہی سے حاصل کی۔ اور

کلام بھی انھیں کو دکھایا اُس کے بعد خواجہ میر درد کے شاگرد ہوئے۔ دہلی کی تباہی کے بعد اپنے والد کے ہمراہ فیض آباد آئے۔ راستہ میں تھوڑے عرصہ تک ڈیگ میں قیام کیا ایک مرتبہ شاہ مدار کی چھڑیوں کے ساتھ سفر کیا جس کا فصل سال اپنی شہنوی گلزار ارام میں قلمبند کیا ہے۔

فیض آباد میں پہونچ کر نواب سالار جنگ بہادر برادر بہو بیگم صاحبہ کی ملازمت اختیار کی اور اُن کے پیٹے مرزا نوازش علی خاں کی مصاحبت میں بھی چند دن رہے جب نواب آصف الدولہ ۱۷۵۷ء میں تخت سلطنت پر بیٹھے۔ اور فیض آباد بدل کر لکھنؤ دارالسلطنت ہو گیا تو میر حسن بھی لکھنؤ چلے آئے اور تھوڑے دن قیام کر کے یہیں ماہ محرم ۱۲۰۵ء میں انتقال کیا۔ بروقت وفات عمر پچاس سال سے متجاوز تھی مصحفی نے تاریخ کہی "شاعر شیریں بیاں" جس سے تاریخ ۱۲۰۱ء تکلتی ہے۔ مرزا علی لطف ۱۲۰۵ء لکھتے ہیں جو زیادہ قابل اعتبار نہیں ہے۔

تعلیم اور شاگردی | میر حسن عربی کم جانتے تھے مگر فارسی میں کمال حاصل تھا۔ اور اس زبان میں کمال بے تکلفی اور سادگی سے لکھتے تھے چنانچہ ان کا تذکرہ شعرائے اردو جو نہایت اعلیٰ درجہ کی فارسی میں ہے اس کا شاہد ہے۔ شاگردی کی نسبت تذکرہ نویسوں میں اختلاف ہے مصنف آجیات لکھتے ہیں کہ سودا کے شاگرد تھے میر تقی لکھتے ہیں جو ان اہل است نوکر پیشہ اکثر در بندہ خانہ در تقریب مجلس تشریف می آرد وضع مرد آدمیانہ می دار و مشق شعرا مرزا رفیع می کند "میر حسن خود اپنی نسبت لکھتے ہیں اصل صلیح سخن از میخیا سلمہ اللہ گرفتہ ام۔ لیکن طرز اوشان از من کما حقہ سر انجام نیافت۔ بر قدم دیگر بزرگان مثل

۱۷ گلزار ارام میں لکھنوی ہجو اور فیض آباد کی بہت تعریف ہے۔ اس شہنوی کا ایک نہایت صحیح اور خوشخط نسخہ کتب خانہ ندوہ میں موجود ہے (تذکرہ گل رعنا)۔

۱۸ عقب باغ نواب قاسم علی خاں ملہ مفتی گنج (لکھنؤ) میں مدفون ہیں (تذکرہ خاندان جاوید جلد ۲)

خواجہ میر درد، مرزا رفیع سودا و میر تقی میر کی نودہ ام "اس سے ظاہر ہے کہ وہ رسمی طور پر میر ضیاء الدین ضیا کے شاگرد تھے اور تینوں اصحاب مذکورہ بالا کی پیروی کرتے تھے اور ممکن ہے مشورہ سخن بھی کرتے ہوں۔ فطرتاً نہایت خوش مزاج ہشاش بشاش ظریف اور بذلہ سنج تھے۔ ہزل اور فحش سے کبھی زبان کو آلودہ نہیں کیا۔ نہایت شیریں زبان، خلیق اور قابل تھے۔ کسی شخص کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ اور نہ کسی تذکرہ نویس نے ایک حرف ان کے خلاف لکھا ہے۔

طرز کلام | کلام نہایت سلیس اور صاف ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے مثنیٰ سے پھول چھڑتے ہیں غزل۔ رباعی۔ مثنوی۔ مرثیہ سب کہتے تھے۔ البتہ قصیدہ زوردار نہ تھا۔ مثنوی میں کمال حاصل تھا۔ چنانچہ ان کی مشہور مثنوی "سحر البیان" معروف بہ "مثنوی حسن" اردو میں اپنا جواب نہیں رکھتی ان کی غزلیں میر سوز اور میر تقی میر کی غزلوں کا لطف دیتی ہیں۔ وہی عاشقانہ رنگ، وہی سادگی، وہی دلفریبی۔

میر حسن کے صاحبزادے | میر حسن کے چار بیٹے تھے جن میں سے تین شاعر تھے۔ میر مستحسن خلیق جو مصحفی کے شاگرد تھے۔ میر محسن۔ یہ دونوں نواب آصف الدولہ کی والدہ نواب بہو بیگم صاحبہ کے داماد مرزا محمد تقی کی سرکار سے تعلق رکھتے تھے۔ تیسرے بیٹے میر احسن خلیق نواب ناظر داراب علی خاں کی خدمت میں رہتے تھے۔ یہ سب اچھے شاعر تھے اور اپنے پدر بزرگوار کے رنگ میں کتے تھے۔ خلیق اور خلاق کے دیوان بھی ہیں۔

تصانیف حسب ذیل ہیں

- (۱) ایک دیوان غزلوں کا مشتمل بر جملہ اقسام سخن۔ ترکیب بند۔ مخمس۔ و اسوخت۔ مثلث وغیرہ جس میں فارسی شعر پر تیسرے مصرع خواہ فارسی میں یا اردو میں لگایا ہے۔
- (۲) گیارہ مثنویاں جس میں سے حسب ذیل نہایت مشہور ہیں۔
- (۳) مثنوی سحر البیان یا قصہ بنیظیر و بدر منیر۔ لا جواب اور بے عدیل و بنیظیر

مثنوی ہے۔ ۹۹۰ھ مطابق ۱۵۸۲ء میں تحریر ہوئی جیسا کہ قلیل اور مصحفی کی تاریخوں سے ثابت ہوتا ہے۔ اور نواب آصف الدولہ بہادر کے نام نامی سے مکتون ہوئی۔ اس میں شاہزادہ بیظیر اور شاہزادی بدرینہ کے عشق کا افسانہ ہے جس میں ضمناً نہایت دلچسپ جزئیات مثلاً قدیم زمانہ کا لباس، زیور شادی، بیاہ کے رسوم، ہرات کا سامان وغیرہ نہایت خوبی سے بیان کیے ہیں۔ عبارت اس قدر صاف اور با محاورہ ہے کہ صد ہاشمہ محاورہ کی صورت میں زبانوں پر چڑھ گئے ہیں۔ اس کا ہر مصرع لاجواب اور ہر شعر انتساب ہے صفائی بیان، لطف محاورہ، شوخی مضمون قابل دید ہے سوال جواب کی نوک ہونک پر لطف مذاق کی باتیں ایسی ہیں جن کو پڑھ کر دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ اور ان سب پر طرہ یہ کہ کتاب کو لکھے ڈیڑھ سو برس ہو گئے۔ زبان وہی ہے جو ہم آپ بولتے ہیں۔ مولانا آزاد حیرت سے پوچھتے ہیں "کیا اُسے سو برس آگے والوں کی باتیں سنائی دیتی تھیں کہ جو کچھ کہا صاف وہی محاورہ اور وہی گفت کو ہے جواب ہم تم بول رہے ہیں" قصہ پرانے رنگ کا ہے۔ اس کا ترجمہ نشر میں ایک شخص مسس میر بہادر علی نے ۱۲۱۰ھ میں کیا تھا جس کا نام نشر بیظیر رکھا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر ہم اصل مثنوی سے ایسے اشعار منتخب کر کے لکھیں جس سے قصہ کی تمام کڑیاں مل جائیں اور پورا قصہ آسانی سمجھ میں آجائے۔

اختصار مثنوی میر حسن مسلسل بصورت افسانہ

کہ تھا وہ شہنشاہ گیتی پناہ
مگر ایک اولاد کا تھا الم
جو کچھ دل کا احوال تھا سو کہا
فقیری کا ہے میرے دل کو خیال

کسی شہر میں تھا کوئی بادشاہ
کسی طرح کا وہ نہ رکھتا تھا غم
وزیروں کو اک روز اُس نے بلا
کہ میں کیا کروں گا یہ مال و منال

وزیروں نے کی عرض اسے آفتاب
 یہ دنیا جو ہے مزرعِ آخرت
 مکرہاں جو اولاد کا ہے یہ غم
 بلاتے ہیں ہم اہل تجنیس کو
 بلا کر انھیں مٹہ کنے لے گئے
 کہا رام جی کی ہے تجھ پر دیا
 یہ لڑکا تو ہو گا و لے کیا کہیں
 نہ آئے یہ خورشید بالائے بام
 نہ نکلے یہ بارہ برس رشک مہ
 گئے تو مہینے جب اُس پر گذر
 ہوا وہ جو اس شکل سے دلپذیر
 پڑی جب گرہ بارہویں سال کی
 کہا مشہ نے بلوا نقیبوں کو شام
 رعیت کے خوش ہوں صغیر و کبیر
 کہا شاہ نے اپنے فرزند کو
 نہادھو کے نکلا وہ گل اس طرح
 غرض ہو کے اس طرح آراستہ
 گھڑی چار تک خوب سی سیر کر
 اسی کثرتِ فوج سے ہو سوار
 قضا مادہ شب تھی شب چارہ
 کچھ آئی جو اُس مہ کبھی میں ترنگ

نہ ہو ذرہ تجھ کو کبھی اضطراب
 فقیری میں ضائع کرو اُس کو مت
 سو اس کا تردد بھی کرتے ہیں ہم
 نصیبوں کو اپنے ذرا دیکھ لو
 جو نہی رو برو سب وہ شے کے کئے
 چند رماں سا بالک ترے ہوئے گا
 خطر ہے اسے بارہویں سال میں
 بلندی سے خطرہ ہے اس کو تمام
 رہے برج میں یہ مہ چارہ
 ہوا گھر میں شہ کے تو گد پسر
 رکھا نام اُس کا شہ بنظیر
 کھلی کچھڑی غم کے جنجال کی
 کہ ہوں صبح حاضر بھی خاصِ عام
 کہ نکلے گا کل شہر میں بے نظیر
 کہ بابا نہا دھو کے تیار ہو
 کہ بدلی سے نکلے ہے جس طرح
 خراماں ہوا سرد نو خاستہ
 رعیت کو دکھلا کے اپنا پسر
 پھر اشہر کی طرف وہ شہ یار
 پڑا جلوہ لیتا تھا ہر طرف مہ
 کہا آج کو ٹھے پہ پچھتے پلنگ

خواصوں نے جاشاہ سے عرض کی
 ارادہ ہے کوٹھے پہ آرام کا
 کہاشتہ نے اب تو گئے دن نکل
 قضا را وہ دن تھا اسی سال کا
 زبس نیند میں تھا جو وہ ہو رہا
 قضا را ہوا اک پری کا گزر
 ہوئی لاکھ جی سے وہ اُس پرشار
 محبت کی آئی جو دل میں ہوا
 قضا را کھلی آنکھ اُس کل کی جو
 نہ وہ لوگ دیکھے نہ وہ اپنی جا
 اچنبھے کا یہ خواب دیکھا جو اداں
 سر ہانے جو دیکھی مہ چار وہ
 کہا کون ہے تو یہ کس کا ہے گھر
 پھر امنہ کو لے اور ادھر سے نقاب
 خدا جانے تو کون میں ہوں کہاں
 یہ گھر گو کہ میرا ہے تیرا نہیں
 چھڑا کر ترا تجھ سے شہر دیار
 پری ہوں میں اور یہ پرستان ہے
 غرض دل کو جوں توں لگایا وہاں
 ولیکن نہ عقل و نہ ہوش و نہ اس
 وہ تھی ناز میں بھی بہت عقلمند

اک شہزادے کی آج یوں ہے خوشی
 کہ بھایا ہے عالم لب بام کا
 اگر یوں ہے مرضی تو کیا ہے خلل
 غلط دہم ماضی میں تھا حال کا
 بچھونے پہ آتے ہی وہ سو رہا
 پڑی شاہزادے پہ اُسکی نظر
 وہ تخت اپنا لائی ہوا سے اُتار
 وہاں سے اُسے لے اُڑی دلربا
 نہ پائی وہاں شہر کی اپنے بُو
 تعجب سے اک اک کو تکتا رہا
 لگا کہنے یارب میں آیا کہاں
 کہ ہے اجنبی سی وہ اک شک مہ
 لے آیا مجھے کون گھر سے ادھر
 دیا اُس پری نے یہ ہنس کر جواب
 تجھے بھی تعجب ہے میں ہوں جاں
 پر اب گھر یہ تیرا ہے میرا نہیں
 یہ بندی ہی لائی ہے تقصیر دار
 یہاں سب یہ قوم بنی جان ہے
 کہا اُس نے جو کچھ کہا اُس کو ہاں
 رہے وحشیوں کی طرح وہ اُداس
 نہ کھنے سے کچھ اُس کے ہوتی تھی بند

غرض ماہِ رُخ اُس پری کا تھا نام
 کہا ایک دن اُس نے اے نظیر
 توڑک ٹوک کے کراہنے جی کو بند
 یہ گھوڑا تو کل دوں گی کل کا تجھے
 کہ گزشتہ کی طرف جائے کہیں
 تو پھر حال ہو جو گہنگار کا
 کہا کیونکہ میں تم کو جاؤں گا بھول
 یہ گھوڑا جو اُس کل کے تھا بخش کا
 سرِ شام وہ بے نظیر جہاں
 ہر اک طرف سے ہو گزرتا تھا وہ
 یہ جبکہ بچتا تو پھر تاشتاب
 سوا ایک دن کی یہ تم واردات
 ہوا ناگہاں اُس کا اک جاگزر
 سفید ایک دیکھی عمارت بلند
 یہ عالم جو بھایا تو کوٹھے پہ آ
 لگا بھانکنے اس مکان کے تنیں
 جو دیکھا تو ایسا کچھ آیا نظر
 کہا جی سے اب تو جو کچھ ہو سو ہو
 یہ کہ نیچے اُترادے پاؤں وہ
 انگ کھول ہاتھوں سے داں کو اوڑھ
 تھے اک طرف گنجان باہم خست

پدر سے کیا تھا یہ پوشیدہ کام
 مرے دام میں تو ہوا ہے اسیر
 نہ پہنچے کہیں تیرے جی کو گزند
 لیکن یہ دے تو چلکا ہے مجھے
 دیا دل کسی سے لگائے کہیں
 وہی حال ہو تجھ سے دلدار کا
 مجھے جو کہا تم نے سب سے قبول
 فلک سیر تھا نام اُس رخس کا
 اسی رخس پر ہو کے جلوہ کناں
 وہی اک پہر سیر کرتا تھا وہ
 کہ پھر قہر تھا ماہِ رخ کا عتاب
 اٹھا سیر کو بے نظیر ایک رات
 سہانا سا اک باغ آیا نظر
 کہ تھی نور میں چاندنی سے در چند
 اُتر اپنے گھوڑے سے اور سر جھکا
 کہ دیکھوں یہاں کوئی ہے یا نہیں
 کہ سب کچھ گیا اس کے جی سے اُتر
 ذرا چل کے اس سیر کو دیکھ لو
 نظر سے بچائے ہوئے چھانوں وہ
 چلا سائے سائے درختوں کی آڑ
 کہ پیٹھوں جس طرح مشتاق سخت

لگاواں سے چھپ چھپ کے کرے نظر
 جو دیکھی تو صحبت عجب بود ہاں
 ملی جنس کی اپنے جو اُس کو بڑو
 عجب صورتیں اور طرزہ محل
 گئی اُس کے عالم پہ جسم نگاہ
 برس پندرہ ایک کا سن و سال
 دیے کہنی تیکے پہ اک نانہ سے
 خواہیں کھڑی ایدھر اودھر تمام
 قد و قامت آفت کا ٹکڑا تمام
 یہ قدرت کا دیکھا جو اُس نے کمال
 درختوں سے وہ دیکھتا تھا نہاں
 جو دیکھے تو ہے اک جوان حسین
 کسی نے کہا ہے پری یا کہ جن
 یہ آپس میں باتیں جو ہونے لگیں
 گئے بات پر شاہزادی کے گوش
 کہا میں تو دیکھوں یہ کہہ کر اٹھی
 خواہوں گے کا ندھے پہ رکھ اپنا ہاتھ
 جو دیکھیں تو ہے اک جوان حسین
 برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن
 دے عشق کی تیغ کھائے ہوئے
 گئی اُس جگہ جب کہ بدرِ مینر

درختوں سے جوں ماہ ہو جلوہ گر
 عجب چاندنی ہے عجب ہے سماں
 لگا تگنے حیرت سے ہر ایک نٹو
 چلا دیکھتے ہی دل اُس کا نکل
 اور آئی نظر اُس میں اک شک ماہ
 نہایت حسین اور صاحب جمال
 سر نہر بیٹھی تھی انداز سے
 ستاروں کا جوں ماہ پر اثر دہام
 قیامت کرے جس کو تھک کر سلام
 کہا شاہزادے نے یا ذوالجلال
 کسی کی نظر جا پڑی ناگماں
 درختوں کی ہے ادھ میں حسین
 کسی نے کہا ہے قیامت کا دن
 اشاروں سے گھاتیں جو ہونے لگیں
 یہ سنتے ہی جاتا رہا اُس کا ہوش
 گیا سننا جی تو رہ کر اٹھی
 عجب اک اداس چلی ساتھ ساتھ
 کھڑا ہے وہ آئینہ ساں مجھ میں
 جوانی کی راتیں مرا دوں کے دن
 کڑا دل کسی پر لگائے ہوئے
 اور اُس نے جو دیکھا شہ بنظر

گئے دیکھتے ہی سب آپس میں مل
 غرض بنظیر اور بدر منیر
 تھی ہمراہ اک اُس کی دخت وزیر
 شتابی سے لا اُس نے چھر کا گلاب
 وہ اٹھنے تو اٹھی یہ حیران سی
 چلی اُس کے کنگے سے منہ موڑ کر
 غضب منہ پہ ظاہر نہاں دل میں چاہ
 یہ ہے کون کم بخت آیا یہاں
 یہ کہتی ہوئی آن کی آن میں
 کہ اتنے میں آئی وہ دخت وزیر
 مری طرٹ ٹک دیکھ تو لے لے
 ترے گھر میں آیا ہے مہماں غریب
 شتابی سے مجلس کو تیار کر
 بلا لائی جا اُس جواں کے تئیں

نظر سے نظر جی سے جی دل سے دل
 گرے دونوں آپس میں ہو کر لبر
 نہایت حسین اور قیامت شیر
 تب آئی تنوں میں ذرا ان کے تاب
 گل شبنم آلودہ گریان سی
 وہیں نیم بسمل اُس سے چھوڑ کر
 نہاں آہ آہ اور عیاں واہ واہ
 میں اب چھوڑ گھر اپنا جاؤں کہاں
 چھپی اپنے جا کر وہ دالان میں
 لگی ہنس کے کہنے کہ بدر منیر
 مثل ہے کہ من بھائے سنڈیا ہلائے
 یہ ہے واردات غریب و عجیب
 تو اس گل سے گھر رشک گلزار کر
 کیا میزباں یہماں کے تئیں

بلا اک مکاں میں بٹھایا اُسے
 کھلا بند جس دم در گفتگو
 پری کا بھی احوال ظاہر کیا
 کہا آگ پر کی ہے رخصت تجھے
 رہی دل ہی دل میں غرض دلکی بات
 خبر رات کی سن اٹھا بنظیر

محل کا سماں سب دکھایا اُسے
 جواں نے حقیقت کہی موہو
 چھپے راز سے اُسکو ماہر کیا
 زیادہ نہیں اس سے فرصت تجھے
 پہر بھر گئی اتنے عرصے میں رات
 کہا اب میں جاتا ہوں بدر منیر

اگر تیر سے چھوٹے پاؤں گا
 بندھا پھر تو معمول اس کا ملام
 سر رات تک ہینا اور بولنا
 کبھی ہجر سے اُن کو ہونا ملول
 کسی دیو نے دی پری کو خبر
 یہ سن کر وہ شعلہ بھسوکا ہوئی
 قسم تجھ کو حضرت سلیمان کی
 کہا دیو سے تو مجھے دے پتا
 کوئی نازنین ہی تھی اک اُس کے ساتھ
 قضا ارٹا میں جو ہر کر اُدھر
 یہ اڑتی سی سن کر خبر دہ پری
 غضب ناک بیٹھی تھی یہ تو اُدھر
 بلا سی دہ دیکھ اُس کے پیچھے پری
 تجھے سیر کو میں نے گھوڑا دیا
 مزا چاہ کا دیکھ اپنی ذرا
 یہ کہہ اور بلا اک پر زراد کو
 اے کھینچتیاں سے لے جاشاب
 کناں اُس میں جو ہے مصیبت بھرا
 اسے جا کے اُس چاہ میں بند کر
 سیر شام کھانا کھلانا اُسے
 نہ دیجو سوا اس کے گر کچھ کہے

تو پھر آج کے وقت کل آؤں گا
 کہ ہر روز آتا اُدھر وقتِ شام
 درِ عشق اور حُسن کو گھولنا
 کبھی وصل میں بیٹھنا پھول پھول
 کہ معشوق عاشق ہوا اور پری
 لگی کہتے ہیں یہ بلا کیا ہوئی
 ہوئی دشمن اب اس کی میں جان کی
 کہا وہ کسی باغ میں تھا کھڑا
 کھڑی تھی دیے ہاتھ میں اسکے ہاتھ
 یہ دونوں مجھے داں پڑے تھے نظر
 کہا دیکھنے پاؤں اُس کو زری
 کہ اتنے میں آیا وہ رشکِ مہر
 کہا سن تو اے موزی و مدعی
 کہ اُس مالِ زادی کو جوڑا دیا
 جھٹکاتی ہوں کیسے کنویں نہ بھلا
 کہا سنا اس کی نہ فریاد کو
 وہ صحرا جو ہے دردِ محنت کا باب
 کئی سن کا پتھر ہے داں پر دھرا
 وہی سنگ پھر اُس کے ثنہ پر تو دھر
 اور اک جامِ پانی پلانا اُسے
 یہی اُس کا معمول دائم رہے

کیا بند پھر جا کے اُس چاہ میں
 پھنسا اس طرح سے جو وہ منظر
 کئی دن نہ آیا جو وہ رشک ماہ
 لگی کہنے بنجم النساء سے ہوا
 کہا اُس نے بی تم کو سودا ہے کچھ
 خدا جانے کس شغل میں لگ گیا
 لگی کہنے تب اُس کو بدرِ مینر
 مجھے رات دن اس کا رہتا ہے در
 نہ ماندھا ہو اُس کو کسی شید میں
 گئی تڑگری مار آخر کو لیٹ
 ذرا آنکھ لگ گئی جو اس حال میں
 فضا نے دکھایا عجب اُس کو خواب
 جو دیکھے تو صحرا ہے اک لقمہ دوق
 نہ انسان ہے واں نہ حیوان ہے
 مگر بیچ میں اُس کے ہے اک کنواں
 کنویں کا ہے منہ بند اُس سے اڑی
 صدا داں سے آتی ہے بدرِ مینر
 میں بھولا نہیں تجھ کو اے میری جاں
 بیکایک گئی آنکھ اتنے میں کھل
 مناجب کہ نجم النساء نے یہ حال
 لگی کہنے وہ یوں نہ آفسو بہا

کنواں وہ جو تھا قاف کی راہ میں
 پُری بے قراری میں بدرِ مینر
 نظر میں ہوا اُس کے عالم سیاہ
 خدا جانے اس شخص کو کیا ہوا
 وہ معشوق ہے اُس کو پردا ہو کچھ
 مری چڑ ہے اتنا بھی ہونا خدا
 کہ سنتی ہے اے میری دختِ وزیر
 پری نے سنی ہو نہ یاں کی خبر
 کیا ہو نہ اُس کے تیس قید میں
 پھر کھٹ کے کوئے میں مرنے کو لیٹ
 تو دیکھا بہت اُس کو حبیال میں
 کہ دشمن نہ دیکھے یہ حال خراب
 کہ رستم جسے دیکھ ہو جائے فوق
 فقط اک کف دست میدان ہے
 کہ اٹھتا ہے آہوں کاں سے دھواں
 کئی لاکھ من کی سل اُس پر پُری
 ترے چاہ غم میں ہوا ہوں اسیر
 کروں کیا کہ ہے مجھ کو قید گمراں
 پڑے اشکِ خسار پر اُس کے ٹھہل
 ہوئی بقراری تب اُس کو کمال
 ترے واسطے میں نے یہ دکھ سہا

بس اب سر بصر نکلتی ہوں میں
 کہا شہزادی نے سن اے رفیق
 بھلی جنگی اپنی نہ کھو جان تو
 کہا اُس نے کیا کیجئے اب بھلا
 تجھے دیکھنا یوں گوارا نہیں
 یہ کہہ اُس نے رُوز و اتار سنگار
 پھر آئے جو کچھ اُس کے ہوش جو اس
 چلی بن کے جو گن رہ باہر کے تئیں
 جدا ہو کے القصدہ رد توں کو چھوڑ
 نہ سُدھ بدھ کی لی اور نہ منگل کی لی
 لئے بین پھرتی تھی صحرا نورد
 قضا را شہانا سا اک دشت کھٹھا
 وہ تھی اتفاقاً شب چارہ وہ
 چھا مرگ چھالے کو اور لے کے ہیں
 کدرا بجانے لگی شوق میں
 بندھا اس جگہ اس طرح کا سماں
 یہاں تو یہ عالم تھا اور طور یہ
 کہ تھا اک پری زاد فرخ سیر
 ہو اپر اڑائے ہوئے اپنا تخت
 وہ جاتا تھا کرتا ہوا سیر ماہ
 یکایک سُنی بین کی جو صدہا

اسے ڈھونڈھ لانے کو چلتی ہوں میں
 ہوئی میں تو اس چاہ غم میں غریق
 کہ وہ ہے پری اور انسان تو
 پری اب تو ہے اپنے سر پر بلا
 اس اندوہ کا بھکو یار انہیں
 کیا اپنی پشتوازہ کو تار تار
 سجاتن پہ جو گن کا اُس نے لباس
 دکھاتی ہوئی چال ہر ہر کے تئیں
 چلی اپنے گھر بار سے منہ کو موڑ
 نکل شہر سے راہ جنگل کی لی
 تن چاک چاک درلخ زرد زرد
 کہ اک شب ہوا اس کا داں بسترا
 ادا سے وہ بیٹھی تھی واں رشک
 دوزانو سنبھل کر وہ زہرہ جبین
 لگی دست و پامار نے ذوق میں
 صبا بھی لگی رقص کرنے وہاں
 نس اوپر مزا تم سنو اور یہ
 جنوں کے وہ تھا بادشہ کا پسر
 کسی طرف جاتا تھا نیرزد بخت
 اُسے لوگ کہتے تھے فیروز شاہ
 وہاں تخت لا اپنا اُس نے رکھا

جو دیکھے تو جو گن ہے اک رشکِ حور
 نظر کر کے حسن اس کا غش کر گیا
 یہ سمجھا بناوے کا کچھ بھیس ہے
 پڑا تم پہ ایسا کہو کیا بجو گ
 وہ سمجھی کہ دل اُس کا آیا ادھر
 کہا ہنس کے جو گن نے ہر بول ہر
 گیا بیٹھ آ سائے ریت میں
 بجاتی رہی بین وہ صبح تک
 دھری اپنے کا ندھے پہ جب اس نے بین
 پر یزاد نے تب پکڑ اُس کا ہاتھ
 زمین سے اڑا آسماں کے تئیں
 نہ مانا اور اس نے اٹھایا اُسے
 یہ مژدہ گیا باپ پاس اپنے لے
 یہ جو گن جو ہے ایک صاحبِ کمال
 بہت آپ اُس سے اٹھا دیں گے حظ
 کہا اُس نے بابا بہت خوب ہے
 کہا اُد جوگی جی بیٹھو ادھر
 بہت اُس کی تعظیم و تکریم کی
 غرض اس طرح اس کا معمول تھا
 بجائیں سب کو رجھاتی تھی وہ
 دے کیا کہوں حال فیروز شاہ

کہ چشمِ فلک نے نہ دیکھا یہ نور
 تعشق کے عالم میں بس مر گیا
 لگا کہنے جوگی جی آدیس ہے
 لیا واسطے جس کے تم نے یہ جوگ
 کہ دل بھی تو رکھتا ہے دل کی خبر
 جہاں سے تو آیا چلا جا ادھر
 ہوا کھیت یہ تو اسی کھیت میں
 یہ رو یا کیا سانسے دھڑک
 اٹھی لے کے انگڑائی زہرہ جیس
 شابی بٹھا تخت پر اپنے ساتھ
 وہ کتنی کہا کی نہیں رہے نہیں
 پرستان میں لا بٹھایا اُسے
 کہا عرض رکھتا ہوں میں آپ سے
 ذرا بین سینے اور اُسکے خیال
 بہت بین میں اُس کی پاویں گے حظ
 ہمیشہ سے راگ اپنے مرغوب ہے
 کہ درویش اپنے قدم سے یہ گھر
 جگہ ایک پاکیزہ رہنے کو دی
 کہ اُس شاہ پریوں کی خدمت میں جا
 پیر کے بچے گھر کو آتی تھی وہ
 کہ تھی دن بدن اُس کی حالت تباہ

نہ دنیا کی اُس کو نہ دیں کی خبر
غرض ایک دن بات یہ جان کر
نہ تھا اُس گھڑی کوئی ایدھ اُدھر
اکیلے اُسے دیکھ ہوئے قرار
گرا اس طرح سے قدم پر جو وہ
کہ ہے آج کیا یہ خلاف قیاس
لگا کہنے رور و کے فیروز شاہ
تھار ہی سمجھ نے تو مارا ہمیں
کہا اُس نے کہ تو شتاب اپنا حال
کہا تب پر زادن میری جاں
بھلا بھر میں کب تک ہوں ملول
لگی ہنس کے کہنے کہ اک طور سے
مطالب اگر میرے بر لائے تو
کہا اُس نے پھر جلد فریائے
کہا اُس نے یہ ہے مری داستان
بلک اک وہاں کا ہے مسعود شاہ
جہاں میں ہے بدر مینیر اُس کا نام
بنایا ہے اس نے الگ ایک باغ
جدا باب سے تھی وہ اُس جا مقیم
میں نجم النساء اُس کی دخت وزیر
ہوئی ایک دن یہ عجب واردات

اُسی کے تصور میں آنکھوں پر
لگا گھات پر اپنی وہ آن کر
اکیلی پڑی جو گن اُس کو نظر
گرا یادوں پر اُس کے بے اختیار
تو کہنے لگی مسکرا اُس کو وہ
گرا اتنا کیوں ہو کے تو بے حواس
کہ بس بس یہی تو کہو گی نہ راہ
یہ باتیں نہیں ہیں گہارا ہیں
کہ تو کیوں گرا سر کو پاؤں پڑاں
کہاں تک کروں راز اپنا نہاں
غلامی میں اپنی مجھے ک قبول
جو میری کہانی سے غور سے
تو شاید مراد اپنی بھی پائے تو
جو کچھ آپ سے ہو بجا لائے
کہ شہر سرانند پ ہے اک مکان
کہ بیٹی ہے اک اُس کی ماں تہ ماہ
میں رہتی تھی خدمت میں اُس کی دام
کہ فردوس کا ہے وہ چشم و چراغ
سدا سیر کرتی تھی بے خوف و بیم
ہمیشہ سے ہمراز تھی اور شیر
کہ اک شخص وارد ہوا ایک رات

کہاں تک کہوں اس کا قصہ ہے وہ
گیا اُس پہ اس شاہزادی کا دل
دے اُس پہ عاشق ہوئی تھی پری
کس اسکے آنے کی سن کر خبر
دیاقید میں اُس کو ڈالا کہیں
سو میں گھوج میں اُس کے جو گن ہوئی
پر یزاد آپس میں تم ایک ہو
تو شاید مدد سے نکھاری ملے
دل آباد ہو جی کو آرام ہو
کہا تب پر یزاد نے ہاتھ لا
یہ سن قوم کو اُس نے اپنی بلا
کہ جاؤ تو ڈھونڈو کر دمت کمی
جو تم میں سے لاوے گا اس کی خبر
ہو انا کہاں ایک کا داں گزرو
وہ روتا جو تھا نالہ و آہ سے
وہ چوکی پہ جو دیو تھے جا بجا
کہا ماہ رخ کا ہے قیدی یہاں
وہ تحقیق کر ادر لے اُس کا بھید
کیا جا کے فیر دز مشہ کو سلام
یہ بھیجا پھر اُس ماہ رخ کو پیام
بنی آدموں کو تو چوری سے لا

نہ تھا آدمی نور کا تھا ظہور
گئے کچھ دنوں میں رہ آپس میں مل
محبت میں تھی اُس کے وہ بھی بھری
خدا جانے پھینکا ہے اُس کو کدھر
کہ مدت سے اُس کی خبر کچھ نہیں
یہاں تک تو پہونچی بر و گن ہوئی
اگر تم ذرا اکھوج اس کا کرو
تو پھر آرزو بھی ہماری ملے
تھارا اسی کام میں کام ہو
انگوٹھا دکھایا کہ اترانہ جا
تقیّد سے سب کو سنا کر کہا
کہ ہے اک پرستان میں آدمی
جو اہر کے دوں گا لگا اُس کو پر
جہاں قید میں تھا وہ خستہ جگر
تو کچھ اُس کو آئی صدا چاہ سے
لگا پو پھنے کس کی ہے یہ صدا
کنویں میں ترپتا ہے اک نوجواں
اڑا شہر کو اپنے دیو سفید
سُن آیا جو کچھ تھا سنا یا تمام
کہ کیوں زبست کرتی ہو اپنی حرام
بٹھاتی ہے گھر میں نقش جتنا

بھلا چاہتی ہے تو اُس کو نکال
 گیا ماہر رخ کو یہ پیغام جب
 کہا مجھ سے تقصیر اب تو ہوئی
 پر اتنا یہ احسان مجھ پر کرو
 یہ سن کر جواب اُس کا فیروز شاہ
 الگ یوں لے آیا کنویں سے نکال
 وہ جیتا تو نکلا دے اس طرح
 یہ دیکھا جو احوال اُس کا تباہ
 بٹھا تخت پر اپنے اُس کو وہاں
 رکھا تخت اک جا پہ اس کا چھپا
 چل اب تو کہ میں اس کو لایا یہاں
 کہا چل کہاں ہے بتا تو مجھے
 کہا رہ کے چلیو ذرا تھم رہو
 یہ کہہ اور لے ہاتھ میں اس کا ہاتھ
 گیا آپ اُس تخت پر بیٹھ اور
 جسے ڈھونڈتی تھی سو یہ ہمیں ہی
 یہ اُس تخت کے گرد پھر نے لگی
 وہ دیکھے جو ملک آنکھ اٹھا بے نظیر
 کہا تو کہاں اور کس کا یہ جوگ
 کہا تیرے غم نے دوانا کیا
 کسی سرگزشت اُس نے اس ملک

کنویں میں جسے تو نے رکھا ہے ڈال
 ہوئی خوف سے وہ پریشان تب
 کہو اُس کو لے جائے یاں سے کوئی
 کہ اُس کا پرستان میں چرچا ہو
 چلا اپنے گھر سے جہاں تھا وہ چاہ
 کہ فوارہ جوں آب کو دے اُچھال
 کہ بیمار پونہ نزع میں جس طرح
 تو روتا ہوا جلد فیروز شاہ
 لے آیا وہ بیٹھی تھی جو گن جہاں
 کہا پھر یہ جا کر کہ جسم النساء
 یہ سنتے ہی گھبرا کے بولی کہاں
 ذرا اس کی صورت دکھا تو مجھے
 کہ شادی بڑی ہے کہیں غم نہ ہو
 لے آیا وہ جو گن کو داں ساتھ ساتھ
 دکھایا اُسے اور کہا کہ تو غور
 کہاں رہے ہاں یہ وہی ہے وہی
 بلا اس کی لے لے کے گرنے لگی
 تو بخم النساء ہے یہ دخت و زہر
 کہاں یہ لباس اور کہاں تم یہ لوگ
 کہ عالم سے اپنے بگنا کیا
 کہ اس طرح پہونچے ہو تم ہلک

کیا ایک دن تو انھوں نے مقام
 وہ جو گن وہ فیروز شاہ اور وہ ماہ
 مرتب نشیں تھی جو بدر منیر
 بلائیں لگی لیسے نجم النساء
 گئی جب کہ خلوت میں بدر منیر
 کہا کیونکہ لائی کہا اس طرح
 ترا قیدی جا کر چھڑا لائی ہوں
 کہا پھر وہ دونوں کہاں ہیں کہا
 سوا ب ایک کو جا کے لاتی ہوں میں
 یہ سن شاہزادی ہنسی کھل کھلا
 ہم سن کر شتابی گئی وہ نگار
 چھپائے ہوئے لا بٹھایا وہاں
 غرض دیر تک مل کے رہتے رہے
 کہا شاہزادے نے احوال سب
 اگرچہ ہر اک وصل سے شاد تھا
 یہ ٹھہرا کے نکلے وہ دُور ماہر و
 وہ نجم النساء اور وہ بدر منیر
 ہیں گھوٹیں پھر جلے ماں باپ کے
 نکل بے نظیر اور وہ فیروز شاہ
 کہ اسباب سب سلطنت کا درست
 وہاں کا جو تھا شاہ انجم سپاہ

چلے دوسرے دن وہ نزدیک شام
 چلے تخت پر بیٹھ ادھر کی راہ
 وہاں اُس کو لائی وہ دختِ وزیر
 لگی گرد پھر نے برنگ صبا
 کہا میں لے آئی تیرا بے نظیر
 وہ سب کہہ دیا حال تھا جس طرح
 اور اک اور بندھوا اڑا لائی ہوں
 درختوں میں اُن کو رکھا ہے چھپا
 ہوا دوسرے کو بتاتی ہوں میں
 کہا کیوں اڑاتی ہے نجم النساء
 لیا جا کے آہستہ اُن کو پکار
 وہ خلوت کا جو تھا قدیمی مکان
 جدائی کے داغوں کو دھوتے رہے
 کنویں میں جو گذرا تھا اُس پر تعب
 دے پھر کاغذ انھیں یاد تھا
 کہ اس بات کو کیجئے ایک سو
 کچھ اک کہ بہانہ وہ دونوں شہر
 کہ دیکھیں گے اب ہم قدم آپ کے
 کسی شہر میں رکھ کے فوج و سپاہ
 پھر آئے اسی جا پہ چالاک دھپت
 جسے لوگ کہتے تھے مسعود شاہ

کیا نامہ یوں ایک اُس کو رقم
فریدوں مثال ہو سکندرنژاد
میں وارد ہوں یا ایک مہاں غریب
نوازش سے اپنی کرم کیجئے
گیا یہ جو مسعود شہ کو پیام
لکھا نامہ اُس کے یہ اک در جواب
کہ نامہ تمہارا جو سر بستہ تھا
اگر ہم کہیں اپنے دعوے پہ آئیں
دے ہم کو ہے پاس شرع رسول
سنی یہ جو نامہ کی گفت و شنید
بلا سنتوں کو بتا سال دسن
بڑی خواہشوں سے چپ آیا وہ روز
ہو واجب نکاح اور بٹے ہار پان
اٹھا پھر تو نوشاہ بعد از نکاح
ہوا لیکن اس وقت دونامزا
غرض اس طرح جب وہ دھن کو بیاہ
وہ نجم النسا تھی جو دخت وزیر
کہا باپ کو اس کے اے خیر خواہ
سو میں تجھ سے رکھتا ہوں اک التجا
غرض ہر طرح کر رضامند اُسے
پر نژاد تھا وہ جو فیروز شاہ

کہ اے شاہ شاہاں دے فخر جم
مرا دجہان و جہان مراد
لے آئے ہیں مجھ کو مرے یاں نصیب
غلامی میں اپنی مجھے کیجئے
سنا اور پڑھا خط کا مضمون تمام
کہ عاقل کو نکتہ لگے ہے کتاب
وہ راز نہاں اپنے ہاتھوں کھلا
تمہارے فلک کو نہ خاطر میں لائیں
سو اس واسطے کرتے ہیں ہم قبول
ہوئی شاہزادہ کو گویا کہ عید
مقرر کیا نیک ساعت کا دن
پڑھا بیاہنے وہ مہ دلفروز
پلاسب کو شہوت دیے خاصان
محل میں بلانے کی کھری صلاح
کہ دو لہا دھن جب ہوئے ایک جا
لے آیا جہاں اُس کی تھی عیش گاہ
گیا اُس کے والد کنے بے نظیر
مرا بھائی ہے ایک فیروز شاہ
کہ تو اُس کو فرزند ی میں اپنی لا
کیا حاکم اپنے پابند اُسے
دیا اُس کو نجم النسا سے بیاہ

وہ آشفۃ بلبیل چمن کو پھرے
چلے شہر کو اپنے وہ حال حال
دوبارہ انھوں نے کیا ان کا بیاہ
تو پھر یہ کہانی نہ ہو دے تمام
وہی شاہزادہ وہی شہریار
کہ ہیں شاہراہ سخن کے دیل
یہ تاریخ کی فارسی میں رقم
یرین مثنوی باد ہر دل وندا
انھوں نے بھی کی فکر از را و غور
یہ بتخانہ چین ہے بے بدل

پھرے دن تو اپنے وطن کو پھرے
خوشی سے لیے حرمت و جان و مال
ز بس باپ ماں کو تھی سرے کی چاہ
لکھوں گر میں اس بیاہ کی دھوم علم
ہوا شہر پر فضل پر وردگار
مرے ایک مشفق ہیں مرزا قلیل
انھوں نے شتابی اٹھا کر قلم
بگو شمع زہائف رسید این ندا
میاں مصحفی کو جو بھایا یہ طور
کسی اُس کی تاریخ یوں بر محل

(۲) دوسری مثنوی گلزار ارم ہے جس کو گارسن ڈیٹاسی اور بلو ہمار ڈونے
غلطی سے مثنوی سحر البیان کے ساتھ خلط ملط کر دیا ہے یہ بالکل دوسری چیز ہے
اور ۹۲ء مطابق ۱۷۷۷ء میں تصنیف ہوئی اس میں جیسا کہ اوپر لکھا گیا شاہ مدار
کے میلہ کی چھڑیوں کا مفصل حال لکھا ہے اور مثل مثنوی سحر البیان کے اس میں بھی اُس
زمانہ کے مختلف رسم و رواج زنانہ لباس شادی بیاہ ناچ رنگ وغیرہ کے لحاظ
حالات موجود ہیں اس میں لکھنؤ کی بچو اور فیض آباد کی بہت تعریف کی ہے مثنوی آخر
میں موجود ہے۔

(۳) رموز العارفین اس کا ذکر کسی تذکرہ نویس نے نہیں کیا مگر خود میر حسن
نے اپنے تذکرۃ الشعراء میں کیا ہے۔

ان کے علاوہ اور بھی بعض مثنویاں بتائی جاتی ہیں جو اب ناپید ہیں انھوں نے

۱۲ گلزار ارم تاریخی نام ہے ۱۲

کئی ہجو میں بھی لکھیں مثلاً ہجو عظیم کشمیری، ہجو قصاب، نقل کلاؤنت، ہجو مکان وغیرہ
یہ سب ہجو میں نہایت پُر لطف اور مہذب زبان میں لکھی گئی ہیں۔

میر حسن نے مختلف اشخاص کی تعریف میں قصائد بھی لکھے جن میں سے سات قصیدے
موجود ہیں میر صاحب موصوف قصیدہ کے مروج میدان نہ تھے مگر پھر بھی کچھ قصائد ملتے ہیں۔
مراثی | چند مراثی اور سلام بھی انھوں نے تحریر فرمائے جیسا کہ اُن کے تذکرہ سے
پایا جاتا ہے۔ اس صنف کی تکمیل و ترقی اُن کے پوتے کے زمانہ میں بخوبی ہوئی۔

تذکرۃ الشعراء | یہ تذکرہ فارسی میں ہے اور اس میں تقریباً تین سو شاعروں کا ذکر ہے
اس کا سال تصنیف کمیں مذکور نہیں مگر اُن تاریخوں سے جو خود تذکرہ میں موجود ہیں
۹۲۲ھ بہت قرین قیاس معلوم ہوتا ہے اور یہ وہ سن تھا جبکہ مرزا رفیع سودا کی
عمر بے برس کی تھی مصنف نے اس کو تین دوروں پر تقسیم کیا ہے۔ پہلا دور اُن شعرا کا
جو فرخ سیر سے پیشتر گزرے۔ دوسرا اُن کا جو فرخ سیر کے بعد محمد شاہ کے زمانہ تک
ہوئے اور تیسرا خود اپنے معاصروں کا بڑی خوبی اس تذکرہ کی یہی ہے کہ اکثر ہمعصر شعراء
کا اس میں حال ملتا ہے جو گو کہ بہت مفصل نہیں مگر پھر بھی نہایت دلچسپ اور کارآمد
ہے مختصر یہ کہ میر حسن ایک شاعر شیریں بیان تھے اُن کا کلام نہایت سادہ فصیح اور
عاشقانہ ہوتا تھا اور اُن کی مثنوی سحر البیان تو ایک معرکہ الہا را اور منبظیر تصنیف
ہے جس سے اُن کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

آخر میں کچھ اشعار مثنوی گلزار ارم سے اور کچھ متفرق اشعار قصائد و ہجو وغیرہ
کے بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں۔

۱۵ مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب مشردانی تذکرۃ شعرائے اردو کے فاضلانہ مقدمہ میں لکھتے
ہیں کہ واضح رہے کہ یہ فکرہ ۸۸ھ اور ۹۲ھ کے مابین لکھا گیا۔

مشہوری گلزارِ ارم سے

لکھنؤ کی مذمت

نہ دیکھا کچھ ہمارے لکھنؤ میں
لگا اس جا پہ ہرگز دل نہ میرا
وے جاگہ جو بد ہو تو کریں کیا
کہیں اونچا کہیں نیچا ہے رستا
کسی کا جھوٹا تخت الشریٰ میں
زمانے پر عبث رکھنا ہسانا
کے بستی ہے اور گاہے بلندی
سماکتا نہیں یاں غیر کا دم
ہوا کا بھی بہ مشکل یاں گزر رہے

جب آیا میں دیار لکھنؤ میں
کیا تھا غم نے از بس دل پہ ڈیرا
بہت ہیں گرچہ اہل اللہ اس جا
ز بس یہ ملک ہے بیٹھ پر بستا
کسی کا آساں پر گھر ہوا میں
نہیں ہے لکھنؤ یہ ہے زمانا
عجب ہے یاں کی رسم و راہ گندی
ز بس گنجان ہے یہ شہر باہم
ہراک کو چہ یہاں کا تنگ تر ہے

فیض آباد کی تعریف

مرے اک روز جی میں آئی یوں لہر
چلا میں یاں سے اپنا دل اٹھا کر
کھلا جنت کا دروازہ نظر میں
مثال گل ہراک دل شاد پایا

یہ دیکھی میں نے جب کیفیت شہر
کہ کیجئے سیر فیض آباد جا کر
جونہی داخل ہوا میں اُس نگر میں
عجب معمورہ آباد پایا

فیض آباد سے مراجعت پر نہایت افسوس ظاہر کرتے ہیں۔

قضا پھر لکھنؤ میں مجھ کو لائی
مجھے جنت سے جوں آدم نکالا
کہ کھردکھوں وہی روئے دل افروز

نہ تھی معلوم مجھ کو یہ جدائی
ہرا دن سر سے قسمت نے نہ ٹالا
وہ غامیری یہی ہے اب شب و روز

وہی صحبت ہو اد وہ ساتھ کے یار
غزل خوانی کروں جا اس مکاں میں
رجب بیگ و حبیب اللہ فاضل

وہی ہو شہر اور وہ باغ و گلزار
پھروں میں چھپے کرتا جہاں میں
رہیں میری غزل خوانی میں شامل

رباعی کا نمونہ

مستی بھی تو ہے اور بیاں بھی تو ہے
یاں بھی تو ہے اور داں بھی تو ہے

ظاہر بھی تو ہے اور نہاں بھی تو ہے
دو دنوں عالم میں تجھ سوا کوئی نہیں

ولہ

جو ہیں سو حسن روتے ہیں وہ اس علم میں
جلتے ہیں یہ دل حسدیں کے ماتم میں

کیا خوش و طیور دالنس و جاں عالم میں
روشن نہ سمجھ سہرے بچ پرتند میں

ہجو کا نمونہ

اپنے گھر کی حالت

دور و پیہ کے تئیں کرائے پر
گھر نہیں ہے وہ ایک جان کا روگ
آتے ہی گھر میں مجھ کو تپ آئی
پہلے ہی مجھ پہ گھر نے منہ مارا
پہلے منہ چومتے ہی کاٹا گال
ایک دو تین چار پائی دار
ساتھ سایہ کے دھوپ آٹھ پیر
تیسراک ٹوٹے جھوٹے کی شان

ہم نے جب سے لیا ہے یاں اک گھر
جان سے ہیں بتنگ اس میں لوگ
پہلے اس گھر کی خوبی یہ پائی
کلمہ آماس کر گیا سارا
وہ مثل ٹھیک ہے یہاں فی الحال
صحن اُس کا بتاؤں کس مقدار
پانچ بلی کا کہنے سا چھپر
نو کا یا دس کڑی کا اک دالان

سیڑھی اک بانس کی پرانی سی
 نہ تو مطبخ نہ داں مکان ضرور
 ایک چوکی دھری ہے صحن کے پنج
 تپ دو ٹٹیاں برائے اوٹ
 دیوڑھی کا بند کبھی جب در
 آنے والا جو کوئی آجا دے
 یعنی در جو کھلا نہیں پایا
 گھر میں ہیں دھوپ سے کباب بھی
 ٹوٹا پھوٹا جلا بھنا سارا
 چیز آبی و بادی اس میں کم
 یاں کنواں بھی نہیں مزا ہے یہ
 خوب یاں کا کھلا جو ہم پر بھید
 دن کو آنکھوں میں بھرتے ہیں پانی
 گرد میں صورتیں اٹی ہیں سب
 کپڑے ہم چھارتے ہیں لیل و نهار
 تکیے رہتے ہیں اس طرح میلے
 طاق پر تھے جہاں جہاں جزدان
 خاک بھر بھر کے یوں ہوئی ہے دوات
 تھے دھرے وہ جو خاص عام قلم
 جھاڑتے جھاڑتے بیاض و کتاب
 صاف آٹا نہ کوئی مسانے گا

آنے جانے کے واسطے ہے دھری
 دونوں باتوں کا داں نہیں دستور
 صحن میں ساری جا ضرور کی کچ
 وہ کہ جاویں ہوا سے خاک میں لوٹ
 بیٹھے جا ضرور تب جا کر
 دیکھ دروازہ بند پا جا دے
 کوئی ہے جا ضرور کو آیا
 گھر سے نکلے نہ آفتاب کبھی
 دھوپ سے گرم جیسے انگارا
 نور خاکی و ناری کا یہم
 کس کا یہ گھر ہے کیا بلا ہے یہ
 چاہ کی جا ہے چہرہ خورشید
 رات پلکوں سے قطرہ افشانی
 مائی کی مورتیں بنی ہیں سب
 دھوبی دھوتے ہیں جیسے دے دے مار
 جوں نیم کی خاک کے تھیلے
 ہو گئے کھل دہ کوہ ریگستان
 جیسے آندھی میں ہو اندھیری رات
 ریگ ماہی ہوئے تمام قلم
 حرف مٹ مٹ کے ہو گئے ہیں خراب
 خوب جب تک نہ خاک چھانے گا

کیا کہیں کس طرح سے جیتے ہیں خاک کھاتے ہیں کچ پیتے ہیں

فقیدہ کا رنگ یہ ہے :-

کون ہرست گل انعام چمن میں ہے مقیم
خوش ادا کون یہ متانہ پھرے ہے جکے
عرق شبنم گل کس پہ چھڑکتا ہے گلاب
کون انگڑایاں لیتا ہے چمن میں مخمور
شاید اس باغ میں ہے آصفِ دران کا گزر
آصف الدولہ بہادر ہے وزیر اعظم

جس کی بودوش پہ اپنے لے پھرتی ہے نیم
نقش پا سے گل زگس کو کرے دام نسیم
عندلیوں کا ہوا رشک سے دل کس کے دویم
غنیہ بھر بھر کے گلابی کرے ہے کیوں تقسیم
کہ ہے وہ ابن کریم ابن کریم ابن کریم
نائب نعل اکہ صاحب تاج و دہیم

میر تقی میر | میر محمد تقی نام میر تخلص۔ رنجینہ گویان ہند کے استاد اعظم شاعران اردو
کے رہبر مسلم۔ ادب و زباں دانی کے ماہر فن خوش گو۔ خوش بیاں۔ شیریں سخن
تذکروں میں والد کا نام میر عبد اللہ لکھا ہے مگر ذکر میر میں میر صاحب نے کوئی نام نہیں لکھا
البتہ یہ تحریر کیا ہے "کہ میرے والد نے جو میرے دادا کے چھوٹے بیٹے تھے درویشی اختیار
کی اور ترک دنیا کر کے بیٹھ رہے شاہ کلیم اللہ اکبر آبادی سے علم ظاہری و معنوی کا
استفادہ کیا جو ان صالح و عاشق پیشہ تھے اس لیے علی تقی کے عرف سے مشہور ہوئے"
چونکہ ان کا نام تحریر نہیں لکھا لہذا ممکن ہے کہ نام میر عبد اللہ ہی ہو۔ اپنے بزرگوں کی نسبت
میر صاحب تحریر فرماتے ہیں "میرے بزرگ زمانے کی نامساعدت سے اپنی قوم قبیلہ
کے ساتھ حجاز سے روانہ ہو کر سرحد دکن میں پہنچے وہاں سے وہ احمد آباد گجرات
میں وارد ہوئے بعض تو ان میں سے وہیں رہ گئے اور بعض تلاش معاش کے
لئے نکل کھڑے ہوئے چنانچہ میرے جد کلاں نے اکبر آباد میں توطن اختیار کیا مگر
ناسازگاری آب و ہوا سے راہی عدم ہوئے۔ ایک فرزند چھوڑا جو میرے دادا تھے
وہ اکبر آباد کی فوجداری پر سرفراز ہوئے پچاس سال کی عمر میں علیل ہوئے اور ابھی پوری

صحت نہ ہوئی تھی کہ گویا رگے اور چند ہی روز کے بعد اس دنیا سے ہمیشہ کے لیے
 رخصت ہو گئے اُن کے دو بیٹے تھے۔ بڑے بیٹے کو کچھ خلل دماغ تھا اور وہ جوان مر گیا۔
 چھوٹے بیٹے میرے والد تھے جو علی متقی کے نام سے مشہور تھے۔ میرے صاحب نے ان کے
 چند قصے بیان فرمائے ہیں۔ درویش صفت تھے ایک دفعہ لاہور چلے گئے اور وہاں
 ایک فقیر جس نے مکر و فریب کا جال پھیلارکھا تھا اُس سے لوگوں کو آگاہ کیا۔ پھر وہ
 دلی آئے وہاں ان کی بڑی قدر ہوئی۔ وہاں سے بیان پہنچے ایک نوجوان سید پرانکی
 نظر پڑی جو خلوص کے ساتھ اُن کا معتقد ہو گیا وہاں سے آگے آئے اور خانہ نشین
 ہو گئے وہ نوجوان سید بھی اُن کی تلاش میں آگرہ پہنچا اور وہیں زد پڑا۔ ان کا نام
 سید امان اللہ تھا اور میر تقی اُن کی عزت کرتے تھے۔ میر صاحب کی تربیت میں اُنکو
 بڑا دخل تھا میر صاحب اُن کو اچھے کہتے تھے اور ذکر میر میں ہمیشہ عم بزگوار کہہ کر یاد
 کرتے ہیں دن رات انھیں کے پاس رہتے اور ان کی تمام تربیت سید صاحب کے
 زیر نظر ہوئی۔ سید امان اللہ کا جب انتقال ہوا تو میر صاحب دس برس کے تھے۔
 میر صاحب اور ان کے والد کو ان کے مرنے کا سخت صدمہ ہوا۔ چنانچہ اُن کے والد
 بھی بخار میں مبتلا ہو کر مر گئے۔ بڑے بھائی حافظ محمد حسن نے میر صاحب سے بڑی
 بے مروتی کی اور باپ کے کل ترک پر قبضہ کر لیا۔ اس صفر سنی میں میر صاحب اپنے
 چھوٹے بھائی محمد رضی کو اپنی جگہ چھوڑ کر خود تلاش معاش میں مصروف ہوئے۔
 لیکن کوئی صورت نظر نہیں آئی۔ ناچار وطن کو خیر باد کہہ کر شاہماں آباد دہلی پہنچے
 خواجہ محمد باسطا جو صمصام الدولہ امیر الہ آباد کے بھتیجے تھے ان کو نواب کے پاس
 لے گئے اور میر صاحب وہاں ملازم ہو گئے۔ نواب صاحب نادر شاہ کی جنگ میں
 مارے گئے اور میر صاحب کی ملازمت جانی رہی۔ میر صاحب کی تحریر سے
 معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد آگرہ واپس آ گئے مگر جب گذر اوقات کی کوئی معقول

صورت نظر نہ آئی تو پھر دلی کا رخ کیا اور اپنے بڑے بھائی کے خاؤ سراج الدین علی خاں
 آرزو کے یہاں جا کر ٹھہرے اور کچھ دنوں اُن کے پاس رہے۔ مگر بڑے بھائی کی
 تحریک پر خان آرزو نے میر صاحب کو تکلیف پہنچانے کی کوشش کی۔ اس سے
 میر صاحب کو اس قدر صدمہ ہوا کہ مکان کے دروازے بند کیے پڑے رہتے
 اسی وجہ سے اُن کی حالت جنون کی سی ہو گئی۔ حکیم فخر الدین خاں نے علاج کیا اور
 رفتہ رفتہ وہ حالت جاتی رہی۔ بعدہ ایک بزرگ میر جعفر نامے سے کچھ تعلیم حاصل
 کی اور سید سعادت علی خاں نے اُن کو رنجستہ میں شعر موزوں کرنے کی ترغیب دی۔
 اُدھر خان آرزو درپے آزار تھے۔ ایک روز محبوباً میر صاحب اُن کے مکان سے
 نکل گئے مگر خوبی قسمت سے ایک رئیس رعایت خاں نامے نے اُن کو اپنا مصاحب بنایا
 اور اس طرح تنگدستی سے گونہ نجات ملی جب احمد شاہ درانی کو سرہند میں شکست ہوئی
 تو میر صاحب بھی رعایت خاں کے ساتھ شریک تھے اور جو خدمت اُن کے لائق ہوئی اُسکو
 انجام دیا۔ رعایت خاں کے ساتھ میر صاحب نے قصبہ سانہر کی سیر کی جو اجمیر کے قریب
 واقع ہے اور جب رعایت خاں اور راجہ رنجیت سنگھ میں شکر رنجی ہو گئی تو میر صاحب نے
 صفائی کی کوشش کی۔ ذرا سی بات پر رعایت خاں کی ملازمت ترک کر دی مگر اس
 نے ان کی دوستی کا حق خوب نباہا اور محمد رضی میر صاحب کے چھوٹے بھائی کو اپنے
 یہاں نوکر رکھ لیا چند دنوں کے بعد میر صاحب نواب بہادر کے یہاں ملازم ہو گئے
 اور روہیلوں کی جنگ میں اُس اطراف کی سیر کی جب صفدر جنگ نے نواب بہادر
 کو دغا سے قتل کر ڈالا تو میر صاحب بیکار ہو گئے لیکن چند ہی روز بعد ہما نرائن دیوان
 کی سرکار سے متوسل ہو گئے۔ اسی زمانے میں میر صاحب نے خان آرزو اپنے خاؤ کی
 ہمسایگی چھوڑ دی اور امیر خاں کی جوہلی میں رہنے لگے۔ سکندر آباد کی لڑائی میں
 میر صاحب احمد شاہ کے ساتھ تھے۔ راجہ جگن کشور کے توسل سے ہمارا راجہ ناگر مل

سے ملے اور پھر کچھ دنوں بعد اُن کے بیٹے نے اُن کی کچھ تنخواہ مقرر کر دی میر صاحب اُنکے
 خانہ باغ میں دوپہر رات تک موجود رہتے مشاہرہ مقول ہونے سے کسی قدر فارغ البالی
 سے بسر ہوتی تھی خانہ جنگیوں سے دلی کی حالت ابتر ہو رہی تھی اسی میں میر صاحب کا
 مکان بھی خاک میں مل گیا اور سب مال و اسباب لٹ گیا۔ اس لوٹ مار کے بعد میر صاحب
 معہ دو احقین کے دہلی سے نکل کھڑے ہوئے اور کچھ دنوں برساتی ضلع منٹھرا میں قیام کر کے
 کہیر پونچے جو سورج مل جاٹ کا قلعہ تھا اور بہادر سنگھ یہاں اُن سے بُری مدارات سے
 پیش آئے اور سورج مل کے طویلیے میں جو خانہ خرابان دلی کا مامن بن گیا تھا اعظم خاں سے
 ملاقات ہوئی میر صاحب کے بیٹے میر فیض علی بھی یہاں اُن کے ہمراہ تھے۔ راجہ
 سورج مل کے چھوٹے بیٹے نے میر صاحب کے واسطے کچھ ساز و سامان ہیا کر دیا اور خود
 سورج مل نے روزینہ مقرر کر دیا چند دنوں بعد میر صاحب پھر دلی واپس آئے مگر
 گھروں کو خراب اور شہر کو دیران پایا۔ سورج مل کے ساتھ تیس سال کے بعد میر صاحب
 اکبر آباد پہنچے اور اپنے والد اور بزرگوار کی قبروں کی زیارت کی۔ اُن کے شعرو سخن کا شہرہ
 اب عالمگیر ہو چکا تھا چار مہینے دکن میں رہ کر سورج مل کے قلعہ میں آگئے۔ کچھ دنوں
 بعد پھر اکبر آباد آئے اور چند روز رہ کر واپس چلے گئے۔ جاٹوں کی لوٹ مار سے راجہ
 ناگر مل سے اپنے ہمراہیوں کے کاماں چلے گئے جو راجہ پر تھی سنگھ پسر مادھو سنگھ کا سرحدی
 مقام تھا میر صاحب بھی اُن کی معیت میں تھے اور بوجہ ملازمت اسی شہر میں چند دن
 اقامت گزریں ہوئے مگر تھوڑے عرصہ کے بعد ملازمت سے کنارہ کش ہو گئے۔ راجہ نے
 میر صاحب کو حسام الدین کے پاس بھیجا اور میر صاحب نے ان کی طرف سے سب
 عہد و پیمان کئے مگر راجہ بادشاہ کے لشکر میں جو فرخ آباد میں تھا نہیں گیا۔ اور
 شہر کی طرف روانہ ہو گیا ناچار میر صاحب بھی اُس کے ہمراہ ہو گئے اور دہلی پہنچے
 اہل و عیال کو عرب سرائے میں چھوڑا اور راجہ سے جدا ہو گئے۔ سرداروں کے

اغوا سے بادشاہ نے مجبور ہو کر ضابطہ خاں پر حملہ کیا میر صاحب اس حملہ میں بادشاہ کے ہمراہ تھے ضابطہ خاں بے لڑے بھاگ گیا میر صاحب چونکہ بے روزگار تھے تلاش معاش میں نکلے۔ وجیہ الدین خاں برادر خور و خرام الدولہ سے ملے اور اُس نے کچھ مقرر کر دیا۔ میر صاحب ان دنوں خانہ نشین تھے۔ بادشاہ عالمگیر ثانی ان کو کوشہ طلب فرماتے۔ مگر وہ کبھی نہ گئے۔ ابوالقاسم خاں اور عبدالاحد خاں کا چچا زاد بھائی میر صاحب کے ساتھ اس زمانہ میں سلوک کرتے رہے کبھی کبھی وہ اُن سے ملاقات کو جاتے اور بادشاہ بھی کبھی کبھی کچھ بھیج دیتے تھے اور حسن رضا خاں بھی میر صاحب کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتے تھے۔

ردانگی لکھنؤ | لکھنؤ کی روانگی کے حالات میر صاحب یوں تحریر فرماتے ہیں "فقیر خانہ نشین تھا اور چاہتا تھا کہ شہر سے نکل جائے۔ لیکن بے سامانی سے مجبور تھا۔ میری عزت و اُرد کی حفاظت کے خیال سے نواب وزیر الممالک آصف الدولہ بہادر آصف الملک نے چاہا کہ میر میرے پاس آجائے تو اچھا ہو۔ چنانچہ میری طلبی کے لئے نواب سالار جنگ پسر اسحاق خاں موتمن الدولہ نے جو وزیر اعظم کے خالو ہوتے تھے، اُن قدیم تعلقات کی وجہ سے جو میرے خالو تھے کہا کہ اگر نواب صاحب ازراہ عنایت کچھ زاد راہ عنایت فرمائیں تو البتہ میر صاحب یہاں آ سکتے ہیں نواب صاحب نے حکم دیا اور انھوں نے کرا سے زاد راہ لیکر مجھے خط لکھا کہ نواب والا جناب آپ کو یاد کرتے ہیں جس طرح ہو سکے آپ یہاں آجائیے۔ میں پہلے ہی دل برداشتہ بیٹھا تھا خط کے آتے ہی لکھنؤ روانہ ہو گیا چونکہ خدا کی سی مرضی تھی میں بے یار مددگار بغیر قافلہ اور رہسبر کے فرخ آباد کے رستے سے گذرا وہاں کے رئیس مظفر جنگ تھے انھوں نے ہر چند چاہا کہ کچھ روز وہاں ٹھہر جاؤں مگر میرے دل نے قبول نہیں کیا۔ دو ایک روز بعد روانہ ہو کر منزل مقصود پر پہنچ گیا۔ اول سالار جنگ کے یہاں گیا انھوں نے میری بڑی عزت کی اور جو کچھ مناسب تھا

بندگان عالی کی جناب میں کھلا بھیجا چار پانچ روز بعد اتفاقاً نواب مرغوں کی لڑائی دیکھنے کے لیے تشریف لائے میں بھی وہاں حاضر تھا ملازمت حاصل کی محض فراست سے دریافت فرمایا کہ کیا تم میری تفتی ہو؟ اور نہایت لطف و عنایت سے بغل گیر ہوئے اور اپنے ساتھ نشست کے مقام پر لے گئے اپنے شعر مجھے مخاطب کر کے سائے سبحان اللہ کلام الملوک ملک الکلام۔ اس کے بعد فرط مہربانی سے مجھ سے کچھ پڑھنے کی فرمائش کی اس روز میں نے اپنی غزل کے صرف چند شعر عرض کیے رخصت کے وقت نواب سالار جنگ نے کہا کہ اب میرا صاحب حسب الطلب حاضر ہو گئے ہیں۔ بندگان عالی ممتاز ہیں انھیں کوئی جگہ عنایت فرمادی جائے جب مرضی مبارک ہو یا فرمائیں۔ فرمایا کہ میں کچھ مقرر کر کے آپ کو اطلاع دوں گا دو تین روز بعد یا فرمایا حاضر ہو اور جو قصیدہ مرح میں کہا تھا پڑھا۔ سماعت فرمایا اور کمال لطف کے ساتھ اپنے ملازموں کے سلسلے میں داخل فرمایا اور ہمیشہ میرے حال پر عنایت و مہربانی فرماتے رہے۔

میر صاحب نے لکھنؤ میں زندگی آرام کے ساتھ بسر کی نواب آصف الدار جب شکار کے لیے بہرائچ تک گئے تو میر صاحب بھی ہمراہ تھے اس کی یادگار میں شکار نامہ موزوں کیا دوسری دفعہ نواب کوہ شمالی کے دامن تک گئے۔ انھوں نے دوسرا شکار نامہ لکھ کر حضور میں پیش کیا اس شکار نامہ کی دو غزلوں کی نواب نے بطور تحفہ بخشیں فرمائی آخر میں تحریر فرماتے ہیں کہ ”اس زمانے میں میرا مزاج ناساز رہتا ہے۔ یاروں کی ملاقات ترک کر دی ہے بڑھاپا آپونچا اور عمر عزیز ساٹھ سال کی ہو گئی۔ اکثر اوقات بیمار رہتا ہوں کچھ دنوں آنکھ کے درد کی تکلیف آٹھائی ضعف بصر کی وجہ سے عینک لکائی دانتوں کے درد کا کیا ذکر کروں۔ آخر دل کڑا کر کے ایک ایک کو جڑ سے اکھڑا دیا۔ غرض کہ ضعف قوی بے دماغی ناتوانی۔ دل شکستگی۔ اور آرزوہ خاطر می سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ زندہ نہ رہوں گا اور زمانہ بھی رہنے کے قابل نہیں رہا ہے

بس آرزو اتنی ہے کہ خاتمہ بخیر ہو۔ ۱۰

میر صاحب کی عمر | میر صاحب کی عمر میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے۔ آزاد لکھتے ہیں کہ سو برس کی عمر پائی۔ اُن کی وفات کا سال تحقیق سے معلوم ہے ناسخ کے مشہور مصرعہ تاریخ ع "واو یلا مرد شہ شاعران" سے سنہ وفات بارہ سو پچیس ہجری نکلتا ہے تذکرہ جہاں میں میر صاحب کی عمر ۸۰ سال تحریر ہے مصحفی نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ ۱۲۰۰ھ میں جبکہ وہ اپنا تذکرہ قلمبند کر رہے تھے میر صاحب کا سن اسی سے متجاوز ہو چکا تھا مگر یہ قیاس پر زیادہ تر مبنی ہے کتاب ذکر میر کی تاریخ جو ایک قطعہ سے نکالی ہے ۱۲۰۰ھ ہوتی ہے کتاب کے اختتام پر میر صاحب نے اپنی عمر ۶۰ سال بتائی ہے۔ ان کی پیدائش کی تاریخ تقریباً ۱۱۳۰ھ ہجری ہوئی نادر شاہ کا حملہ ۱۱۵۰ھ میں ہوا تھا اُس وقت اُن کی عمر صرف ۲۰ یا ۱۵ سال کی ہوگی۔ اگر پیدائش کا سن ۱۱۳۰ھ ہو تو میر صاحب کی ۸۰ یا ۸۹ سال کی ہوتی ہے۔

ذکر میر

میر صاحب کی زندگی کے متعلق ابھی تک صحیح حالات بہت کم معلوم ہوئے۔ ۱۱۹۰ھ ہجری | ڈاکٹر اسپرنگر لکھتے ہیں کہ "جب میں ۱۸۴۰ء لغایت ۱۸۵۰ء میں شاہان اودھ کے کتب خانوں کی فہرست مرتب کر رہا تھا تو میں نے موتی محل میں ایک قلمی نسخہ میر صاحب کی خود نوشتہ سوانح عمری موسوم بہ ذکر میر کا دیکھا جو زبان فارسی میں ہے اور صفحات ۱۵۲ صفحات کی ہے۔" یہ کتاب ابھی تک نایاب تھی مگر اب دستیاب ہو گئی ہے امدانمن ترقی اردو حیدرآباد کی طرف سے چھپ گئی ہے لکھنؤ میں بھی ایک قلمی نسخہ سید مسعود حسن رضوی کے پاس موجود ہے۔ اس کی وجہ سے بہت سی نئی باتیں میر صاحب کے حالات زندگی کے متعلق دریافت ہو گئیں اور اکثر بے بنیاد فرضی انسانوں کا جو میر صاحب کے متعلق بعد کے تذکرہ نویسوں نے لکھے ہیں خاتمہ ہو گیا۔

۱۰ شخص از ذکر میر مرثیہ مولوی عبدالحی صاحب (رسالہ اردو اورنگ آباد دکن اپریل ۱۹۲۶ء)۔

اکثر ظنی اور بے بنیاد باتیں جو عوام الناس میں مشہور تھیں معاشرہ تذکرہ نویسوں نے بغیر تحقیق کے قلمبند کر دیں اور ان کو بعد کے لوگوں نے مستند تسلیم کر کے اور زیادہ چمکایا افسوس ہے کہ ذکر میر میر کی ادبی زندگی پر زیادہ روشنی نہیں ڈالتی اور نکات شعرا میں میر نے اپنے متعلق سوائے اس کے اور کچھ نہیں لکھا "مولف اس نسخہ متوطن اکبر آباد بسبب گردش یل و نہار از چندے در شاہجاں آباد است" یہ تذکرہ تقریباً ۱۶۵۰ء میں مرتب ہوا ذکر میر میں میر صاحب نے اپنی زندگی کے حالات قلمبند فرمائے ہیں اپنے زمانے کے واقعات بھی لکھے ہیں تاریخی لحاظ سے بھی کتاب خاص وقعت رکھتی ہے نادر شاہ کی جنگ سے لے کر ضابطہ خاں کے قتل تک کے واقعات موجود ہیں یعنی ۱۱۵۰ھ ہجری سے لے کر ۱۱۹۰ھ تک کی تاریخ ہے اور اس زمانے کے واقعات پر روشنی ڈالتی ہے ابھی تک مورخین کو اس کتاب کا پتہ نہ تھا اور یہ کتاب تاریخی لحاظ سے قابل قدر ہے۔ دہلی کی خانہ جنگیاں، مرہٹوں، جاٹوں، روہیلوں و افغانوں کی لڑائیاں نوابان اودھ کے معرکے انگریزوں کے مورچے، عمائدین شہر کی سازشیں اہل ہندو اور مسلمانوں کے خوشگوار تعلقات سب کا ذکر اس کتاب میں موجود ہے چونکہ اس زمانے کی بہت سی تاریخیں ہیں لہذا واقعات کی تصدیق یا تردید ہو سکتی ہے میر صاحب خود بہت سی محفلوں میں شریک تھے۔ افسوس ہے کہ میر صاحب نے اس زمانے کے لٹریچر پر بہت کم روشنی ڈالی ہے شعرا کا ذکر بالکل نہیں ہے۔ ادبی زندگی کے حالات مفقود ہیں۔

یادت میں اختلاف | تذکرہ شورش میں ہے (جس کا سنہ تالیف گیارہ سو ترانوے ہے جبکہ میر صاحب حیات تھے اور دہلی میں مقیم تھے) کہ میر صاحب فی الحقیقت مید نہ تھے بلکہ میر تخلص ہونے کی وجہ سے مید خیال کے جانے لگے۔ تذکرہ آب حیات میں ہے کہ کس سال بزرگوں سے یہ بھی سنا ہے کہ میر تخلص کیا تو ان کے والد

نے منع کیا کہ ایسا نہ کر دیک دن خواہ مخواہ سید ہو جاؤ گے اسوقت انھوں نے خیال نہ کیا
رفتہ رفتہ ہو ہی گئے۔ پھر سودا کے ایک قطعہ کا حوالہ دیتے ہیں جس کا آخری شعر یہ ہے۔
میری کے اب تو سارے سالے ہیں مستعد

بیٹا تو گت نہ بنے اور آپ کو تھمیر
مگر یہ بھی لکھتے ہیں کہ یہ قطعہ سودا کے کلیات میں نہیں ہے اور پھر آگے خود کہتے ہیں کہ
میر صاحب کی سیادت میں شبہ نہ کرنا چاہیے اگر وہ سید نہ ہوتے تو خود کیوں کہتے۔

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں | اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

حقیقت یہ ہے کہ میر صاحب کی سیادت کے متعلق کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا اس وجہ سے
کہ اپنی سیادت کا اشارہ انھوں نے اپنے اکثر اشعار میں کیا ہے۔ ذکر میر نے اس امر کا
قطعی طور پر فیصلہ کر دیا ہے میر صاحب اپنے والد کا ذکر ہر جگہ میر علی متقی کے نام سے کرتے ہیں۔

۱۔ مصنف آب حیات نے میر صاحب کی سیادت کے متعلق ایسے الفاظ میں لکھا ہے جن سے ان کے سید
ہونے میں شبہ بھی پایا جاتا ہے اور آگے چل کر اپنے اس شبہ کی خود ہی تردید بھی کر دی ہے۔ انہوں نے
انھوں نے ایک غیر معتبر روایت ”کن سال بزرگوں کی“ زبانی نقل کر دی کہ جب میر صاحب نے میر تخلص کیا تو
اُن کے والد نے منع کیا کہ ایسا نہ کر دیک دن خواہ مخواہ سید ہو جاؤ گے اس زبانی اور غیر موثق روایت کے
علاوہ سودا کا وہ قطعہ بھی پیش کرتے ہیں جس کے ایک شعر میں میر صاحب کی سیادت کے متعلق مذاق اڑایا گیا
ہے مگر خود ہی اس میں کردہ شہادت میں شبہ پیدا کرتے ہیں کہ یہ قطعہ سودا کے کلیات میں نہیں ہے اور آگے
چل کر اپنی رنگین عبارت میں میر صاحب کی مسکینی و غربت اور مبرد قناعت وغیرہ کا محض تیار کر کے اسے شہادت
کرتے ہیں کہ ان کی سیادت میں شبہ نہ کرنا چاہیے یہ منطقی سمجھ میں نہیں آئی اس وجہ سے کہ پہلے خود ہی شبہ کیا
پھر اس شبہ کی آپ ہی تردید کی اس کے علاوہ شروع مضمون میں جہاں میر صاحب کے خاندان کا ذکر
کیا ہے ان کو ”خلف میر عبد اللہ“ لکھتے ہیں یعنی ان کے والد کی بھی سیادت کے قائل ہیں۔ اسی طرح
مضمون کے آخر میں صاحب کے بیٹے کا نام ”میر عکری عرف میر گلو“ بتاتے ہیں ۱۲

اپنا نام اپنے والد و بزرگوں کی زبانی میر محمد تقی لکھا ہے اپنے بیٹے کا نام میر فیض علی لکھا ہے۔ یہ روایت غلط ہے کہ جب انھوں نے میر تخلص اختیار کیا تو ان کے والد نے منع کیا کیونکہ والد کی وفات کے وقت میر صاحب کی عمر دس گیارہ برس سے زیادہ کی نہ تھی اور اس وقت شعر نہیں کہتے تھے۔ میر صاحب کا مذہب شیعہ تھا مگر ایسا تنگ نہیں جو دوسروں کے لیے ناگواری کا باعث "آزاد نے اپنی نہایت قابل قدر مگر واقعات کے اعتبار سے کسی قدر غیر معتبر تصنیف (آب حیات) میں بعض غلط بیانیوں بھی کی ہیں۔ مثلاً بعض ایسے قصے اور اقوال میر صاحب کی طرف منسوب کیے ہیں جن سے ان کی بد و ماغی اور نازک مزاجی کا اظہار ہوتا ہے مثلاً وہ واقعہ جس میں میر صاحب کے سفر دلی کا ذکر کیا ہے۔ اور میر قمر الدین منت اور سعادت یار خاں رنگین کی شاگردی کے متعلق۔ افسوس ہے کہ ان واقعات کی تصدیق نہیں کر لی گئی اپنی کتاب کو دلچسپ بنانے کی غرض سے بہت سے بے بنیاد قصے اور سنسنائے واقعات بلا تحقیق (ممکن ہے بعض غلط تذکرہ نویسوں کی تقلید کے خیال سے) داخل کر دیے۔ الحمد للہ کہ نکات الشعراء کے شائع ہو جانے اور دیگر معاصرین میر کے تذکروں کے دستیاب ہونے سے اکثر مشکوک واقعات اب صاف ہو گئے نکات الشعراء کے متعلق آب حیات۔

نکات الشعراء | میں ہے "کہ نکات الشعراء شائق شعر کے لیے بہت مفید ہے۔ اس میں شعرائے اُردو کی بہت سی باتیں اس زمانہ کے لوگوں کے دیکھنے کے لائق ہیں مگر وہاں بھی اپنا انداز قائم ہے دیباچہ میں فرماتے ہیں کہ یہ اُردو کا پہلا تذکرہ ہے اس میں ایک ہزار شعراء کا حال لکھوں گا۔ ان ہزار میں ایک بیچارہ بھی طعنوں اور ملا متوں سے نہیں بچا۔ دلی کہہ رہی شعراء کا آدم ہے اُس کے حق میں فرماتے ہیں۔ دے شاعریت از شیطان مشہور تر، مگر واقعات ان سب باتوں کی تردید کرتے ہیں۔ نکات الشعراء اب شائع ہو گئی ہے اُس کے دیباچہ میں یہ سب باتیں کہیں نہیں ہیں اور نہ اُس میں ایک ہزار

شاعروں کا ذکر ہے بلکہ فی الحقیقت تقریباً سو شعر کا حال ہے نہ اُن کے کلام کی تنقید میں سختی اور بددماغی سے کام لیا گیا ہے۔ تعجب معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کی عبارت نہایت سلیس اور مبالغ اور استعارے وغیرہ سے پاک و صاف ہے تنقید بھی نہایت مختصر اور زور دار الفاظ میں اور نہایت منصفانہ ہے جہاں کہیں کسی شاعر کا حال زیادہ معلوم نہیں ہے تو صاف لکھ دیتے ہیں کہ فقیر کو اس کے حال سے آگاہی نہیں۔ یا اسی قسم کا کوئی اور جملہ۔ درشت اور طنزیہ جملے کہیں کہیں ہیں مگر بہت کم اور صرف اُسی صورت میں جب کوئی شخص اُس کا سختی فی الواقع ہے۔ ولی کی نسبت شیطان سے زیادہ مشہور فقرہ ہم کہیں نہیں ملتا بلکہ برعکس اُس کے اُن کی نسبت تو یہ لکھتے ہیں "از کمال شہرت احتیاج تعریف ندارد" پھر میر صاحب کے مذہب کے متعلق آب حیات میں ہے کہ "میر صاحب کے ماموں حنفی مذہب تھے اور میر صاحب شیعہ اس پر نازک مزاجی غضب غرض کسی مسئلہ پر لکھ کر الگ ہو گئے، یہ صحیح ہے کہ خان آرزو کے متعلق میر صاحب کی نازک مزاجی یا بددماغی کا تذکرہ نکات الشعراء میں کہیں پتہ نہیں چلتا بلکہ وہ تو اُن کو اپنا استاد پیر و مرشد اور رہنمائے فن وغیرہ ایسے معزز الفاظ سے یاد کرتے ہیں جس سے صاف ظاہر ہے کہ میر صاحب کو دینداری کے ساتھ تعصب اور ناز و اداری کا ہرگز خیال نہ تھا بلکہ وہ دیگر مذاہب کا بڑا ادب و احترام کرتے تھے وہ علیحدگی جس کا ذکر مولانا آزاد نے کیا ہے میر صاحب نے اُس کے متعلق ذکر میر میں تحریر کیا ہے۔ لیکن اُن کے کلام سے کہیں نہیں پایا جاتا کہ انھوں نے خان آرزو کے خلاف کوئی بد شعری کی۔ ذکر میر میں سراج الدین علی خاں آرزو کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ نادر شاہ کے حملے کے بعد پھر دہلی گیا اور پٹنہ بھائی کے خالو سراج الدین علی خاں آرزو کا منت پذیر ہوا اور وہیں کچھ دن رہا اور شہر کے بعض صاحبوں سے چند کتابیں پڑھیں جب میں کسی قابل ہوا تو بھائی صاحب (حافظ محمد حسن) کا خط پوسٹ کیا کہ میر محمد تقی فتنہ روزگار ہے ہرگز اس کی تربیت میں

سچی نہ کی جائے وہ عزیز (آرزو) واقعی دنیا دار شخص تھا اپنے بھانجے کے لکھنے پر
میرے درپے ہو گیا جب کبھی ملاقات ہوتی تو بلاوجہ بُرا بھلا کہنا شروع کر دیتے اور
طرح طرح سے مجھے تکلیف پہنچانے کی کوشش کرتے میرے ساتھ ان کا سلوک ایسا
تھا جیسا کسی دشمن سے ہوتا ہے "اس رنج و غم میں میرا صاحب کی حالت جنون کی سی
ہو گئی ایک روز خان آرزو نے میرا صاحب کو کھانا کھانے کے لیے بلایا اور ناگوار و تلخ
باتیں کرنا شروع کیں میرا صاحب بغیر کھانا کھائے اُٹھ آئے شام کو اُن کے گھر سے چلے گئے
اور پھر کچھ عرصے بعد اُن کی ہمالگی بھی ترک کر دی آرزو کے شجاع الدولہ کے پاس جانے کے
بابتہ لکھتے ہیں کہ میرے خالو بادیہ پیمائے طمع ہوئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرا صاحب
دوسری بیوی سے تھے اور پہلی بیوی سے حافظ محمد حسن جن کے آرزو خالو تھے اور میر
صاحب کے سوتیلے خالو ہوئے۔ انھوں نے میرا صاحب کی کچھ پرورش ضرور کی اور
تعلیم میں بھی کچھ حصہ لیا۔ نکات الشعرا میں خان آرزو کے کمالات کا اعتراف ہے اور ذکر
میر میں خانگی تعلقات کا بیان۔ پھر آزاد کے بیان سے ایک جگہ ترشح ہوتا ہے کہ میر صاحب
نے اپنا تخلص میر سوز سے لیا جو پہلے میر تخلص کرتے تھے یہ بھی ایک سبب بنیاد دعوے
ہے کیونکہ میر صاحب خود فرماتے ہیں کہ میں عرصہ سے یہ تخلص کرتا ہوں بلکہ حقیقت حال
یہ ہے کہ جب سوز نے یہ دیکھا ہو گا کہ ان کے اچھے اشعار اُن کے ہم تخلص کی طرف منسوب
کیے جائیں گے تو انھوں نے پہلا تخلص ترک کر کے سوز اختیار کیا ہو گا۔ خواجہ میر درد کی
نسبت بھی میر صاحب نہایت عمدہ الفاظ استعمال کرتے ہیں اور بہت ادب و عزت
سے اُن کا نام لیتے ہیں۔ مولانا آزاد یہ بھی لکھتے ہیں کہ میر صاحب اُن لوگوں کا ذکر جو
دلی کے رہنے والے نہ تھے اور زبان اُردو سے اسی وجہ سے ناواقف تھے بہت
حقارت کے ساتھ کرتے ہیں۔ مگر یہ بھی واقعہ کے خلاف ہے اسوجہ سے کہ میر صاحب نے
اکثر ایسے شعرا کی بہت کچھ تعریف کی ہے جو دلی کے رہنے والے نہ تھے۔ مثلاً میاں

شرف الدین مضمون کی نسبت یہ دلچسپ الفاظ لکھتے ہیں۔ متوطن چھاپچھو کہ قصہ است
متصل اکبر آباد حریف ظریف، ہشاش بشاش، ہنگامہ کرم کن مجلسہا، ہرچند کم گو بود لیکن
بسیار خوش فکر و تلاش لفظ تازہ زیادہ۔

میر صاحب کا کیریکٹر | اس میں کوئی شک نہیں کہ تمام ازل نے میر صاحب کو انتہا درجہ
کی تمکنت، خودداری، اور ایک حساس طبیعت دی تھی۔ وہ اکثر رؤسا اور امرا کے
ارتباط اور میل جول تک کو نظر حقارت سے دیکھتے تھے کہ مبادا اس سے ان کی خودداری
پر کوئی حرف نہ آئے۔ وہ سید ضابطہ کم گو، اور آزاد طبیعت واقع ہوئے تھے۔ افلاس
اور کم مائیگی نے ان کی عالی ظرفی کو اعلیٰ تر کر دیا۔

نازک دماغی | میر صاحب کی بد دماغی اور نازک مزاجی کو آزاد نے بڑے مبالغے سے
بیان کیا ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ نازک مزاج ضرور تھے۔ راجہ ناگر مل جو ان کا
بڑا قدر دان تھا اس کی رفاقت محض اسوجہ سے چھوڑ دی کہ جو معاہدہ وہ اُس کے ایما سے
بادشاہی امرا سے کر کے آئے تھے اُس پر اُس نے عمل نہیں کیا۔ ایک میر راجہ جنگل کشور
جو محمد شاہ کے عہد میں دیوان بنگالہ تھے اور بڑی ثروت سے بسر کرتے تھے میر صاحب کو
گھر سے اٹھائے گئے۔ اپنے کلام کی اصلاح کی خواہش کی میر صاحب نے اصلاح کی
قابلیت نہ دیکھی اور ان کی اکثر تصنیفات پر خط کھینچ دیا۔ مگر راجہ جنگل کشور نے کچھ خیال
نہ کیا اور راجہ ناگر مل سے ملاقات کرادی اور میر صاحب کی آنکھوں نے بہت کچھ قدر
کی رعایت خاں کی رفاقت میں چند روز رہے ایک روز انھوں نے میر صاحب سے
فرمائش کی کہ گویے کو ریختے کے اپنے دو تین شعر یاد کرادیجئے گا تو وہ گانے کے
قاعدے سے درست کر کے گائے گا۔ میر صاحب نے عذر کیا خان صاحب نے اصرار کیا مگر
میر صاحب خانہ نشین ہو گئے اور ان کی ملازمت چھوڑ دی عالمگیر ثانی بادشاہ نے بار بار بلایا مگر
میر صاحب نہیں گئے۔ اس کا ایک سبب تو طبیعت تھا اور دوسرے یہ کہ انھیں اپنی وضع کا

بڑا پاس تھا اور جب فقر و فاقہ درپے ہو تو دضعرداری نبھانے میں نازک مزاجی آہی جاتی ہے۔ اُن کی نازک دماغی دوسروں کی ہمدردی کی بھی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ سرسبز الغیظ اور جلد برسم ہو جانے والے تھے اور اپنی اس کمزوری سے خود بھی واقف تھے چنانچہ اپنے بعض اشعار میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے اور میر حسن و لطف وغیرہ نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔
حالت تو یہ ہے مجھ کو غموں سے نہیں فراغ

دل سوزشِ درونی سے جلتا ہے جوں چراغ
سینہ تمام چاک ہے سارا جگر ہے داغ
ہے نام مجلسوں میں مرا تیز بے دماغ
از بسکہ کم دماغی نے پایا ہے اشتہار

دلہ

ہر چند میر بستی کے لوگوں سے ہے فقور
پیر ہائے آدمی ہے وہ خانہ خراب کیا

دلہ

پیدا کہاں ہیں ایسے پر اگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

دلہ

ہم خستہ دل ہیں تجھ سے بھی نازک مزاج تر
تیوری چڑھائی تو نے کہ یاں جی نکل گیا

دلہ

نازک مزاج آپ قیامت ہیں میر جی!
جوں شیشہ میر سے نہ لگوئیں نشے میں ہوں

ہر چند کہ اپنی نسبت بعض اشعار میں اور تذکرہ میں حقیر اور منکسر نہ الفاظ استعمال کئے ہیں اور اپنے شاگردوں کو اپنا دوست بتایا ہے مگر یہ سب اُسی خلقی تمکنت کی ایک شان اور ایک ادا ہے۔ اُن کی مشہور مثنوی اجکنہ نامہ جس میں کہ اپنے آپ کو ایک اژدہ قرار دیا ہے اور باقی شاعر و نکو چھوٹے چھوٹے جانوروں سے تشبیہ دی ہے کوئی فرضی اور خیالی چیز نہ سمجھنا چاہئے۔ بلکہ وہ اُن کے فطری غرور اور بد دماغی کی ایک بین مثال سمجھی جاسکتی ہے۔ اپنے معاصر شاہ حاتم کو ان الفاظ میں یاد کرتے ہیں ”مردیت جاہل و سنگین مقطع وضع..... دریافتہ نمی شود کہ ایں رگ کہن بسبب شاعری ست یا وضع او بہین ست خوبست مارا بابا اینا چہ کار... با من ہم آشنایے یگانہ است“ مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ وہ ہر شخص کو اسی نار و اداری و کم بینی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اپنے دوسرے معاصر اور حریف مزار فیح سودا کی نسبت اس طرح رطب اللسان ہیں ”غزل و قصیدہ و مثنوی قطعہ و مخمس و رباعی ہمہ را خوب می گوید۔ سر آمد شعرائے ہندی اوست بسیار خوش گوشت... چنانچہ ملک الشعرائی ریختہ اور شاید“ اسی طرح بعض خود اپنے شاگردوں کی بھی بہت کچھ تعریف کرتے ہیں مگر مولانا آزاد نے اس قدر تکی کزوری پر اور گل بوٹے لگائے ہیں فرماتے ہیں ”اگر یہ غرور و بد دماغی فقط امرار کے ساتھ ہوتی تو معیوب نہ تھی افسوس یہ ہے کہ اردوں کے کمال بھی انھیں دکھائی نہ دیتے تھے اور یہ ہر ایسے شخص کے دامن پر نہایت بدنام دھبہ ہے جو کمال کے ساتھ صلاحیت اور انوکاری کا خلعت پہنے ہوئے ہو۔ گوں کی تحریری روایتیں اور تقریری حکایتیں ثابت کرتی ہیں کہ خواجہ حافظ شیرازی اور شیخ سعدی کی غزل پڑھی جائے تو وہ سر ہلانا گناہ سمجھتے تھے کسی اور کی کیا حقیقت ہے۔ اس سخت اور غیر منصفانہ تنقید سے صاف ظاہر ہے کہ ”نکات الشعرا“ مولانا آزاد کی نظر سے نہیں گزری بلکہ انھوں نے میر صاحب کے غرور اور بد مزاجی کی اکثر بے بنیاد روایتیں ضعیف اور غیر قابل اعتماد تذکروں سے

اعلیٰ الخصوص تذکرہ قاسم سے بغیر جانچے ہوئے لے لیں۔
 میر کے کلام میں مایوسی و درد
 میں سوائے رنج و الم کے کچھ اور نہیں دکھلائی دیتا تھا۔ چنانچہ میر صاحب
 خود لکھتے ہیں ۷

نہ درد مندی سے یہ راہ تم چلے ورنہ قدم قدم پہ تھی یاں جائے نالہ و فریاد
 پھر والد کی درویشانہ زندگی اور تلقین کہ "اے پسر عشق بوزر عشق است کہ دریں کارخانہ
 متصرف است۔ اگر عشق نمی بود نظم کل صورت غنی لبست۔ بے عشق زندگی و بال است
 دل باختہ عشق بودن کمال است عشق بسازد عشق بسوزد۔ در عالم ہر چہ ہست ظہور
 عشق است..... بے عشق نباید بود۔ بے عشق نباید زیست یہ چنانچہ میر صاحب فرماتے ہیں ۷

عشق ہی عشق ہے جہاں دیکھو سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق
 ۷

یارب کوئی تو واسطہ سرگشتگی کا ہے اک عشق بھر رہا ہے زمیں آسمان میں
 میر صاحب کی تربیت بھی سید امان اللہ کے زیر نظر ہوئی جو ایک صوفی منیش بزرگ
 تھے۔ زمانہ طفولیت ہی سے شان درویشی اور صبر و قناعت پیدا ہو گئی۔ یہ صاحب
 کی بدولت میر صاحب کو بہت سے درویشوں اور اہل دل سے ملنے کا اتفاق ہوا
 اور ان کی سوز و گداز بھری باتیں سُننے کا موقع ملا جو ان کے دل میں اُتر گئیں اور
 جن کا اثر انکی طبیعت اور کلام میں ہمیشہ باقی رہا۔ میر صاحب کی زندگی بھی دروے
 معمور ہے بچپن ہی سے مصیبت کا سامنا تھا۔ دس سال کی عمر میں باپ کا انتقال
 ہوا۔ تلاش معاش کے لیے باہر نکلے۔ بڑے بھائی نے بیرونی اختیار کی۔ دلی گئے وہاں
 بہت تکلیف سے کئی۔ خان آرزو بھی دروے آزار ہو گئے میر صاحب بہت ہی دل شکنہ

دل گرفتہ رہتے تھے۔ اس پر بے نوائی و بے بسی۔ اس غم و غصہ میں ایک جنون کی سی حالت ہو گئی اور انھیں چاند میں ایک عجیب صورت نظر آنے لگی جس سے ان کی وحشت و یوانگی اور بڑھ گئی۔ اس حالت کا ذکر ذکر میر میں موجود ہے اور ان کی شنوی خواہ خیال میں بھی اسی طرف اشارہ ہے۔ قلبی واردات کی تصویر نظر آتی ہے اُس کے حبسہ حبسہ اشعار ذیل میں درج ہیں:-

زمانے نے رکھا مجھے متصل	پراگندہ روزی پر اکندہ دل
-------------------------	--------------------------

چلا اکبر آباد سے جس گھڑی پس از قطع رہ لائے دلی میں نعت جگر جو گردوں سے خوں ہو گیا ہوا جھٹ سے مجھ کو ربط تمام کبھو کف بلب مست رہنے لگا نظر آئی اک شکل مہتاب میں	درد و بام پر چشم حسرت پڑی بہت کھینچے یاں میں نے آزار سخت مجھے رکتے رکتے جنوں ہو گیا لگی رہنے وحشت مجھے صبح و شام کبھو سنگ درد دست رہنے لگا کمی آئی جس سے غور و خواب میں
-------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------	----------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------

دلی میں جب تک کہ روزی کا مستقل ٹھکانہ تھا۔ آج گھر میں اناج تو کل نان شبینہ کے محتاج۔ کبھی کبھی فاقہ کی نوبت پہنچی۔ اس فقر و مسکینی میں زندگی بسر کی چنانچہ کلام میں بھی اس حالت کی جھلک موجود ہے۔

نامرادانہ زیست کرتا تھا بہت سہی کیجئے تو مر رہیے تیر نہ مل تیر اب کے ایردوں سے تو	میر کی وضع یاد ہے ہم کو بس اپنا تو اتنا ہی معتد رہے ہوے ہیں فقیر ان کی دولت سے ہم
-----------------------------------------------------------------------------------------	-----------------------------------------------------------------------------------------

پھر دلی کی بربادی۔ عزیزوں اور خاندانوں کی تباہی۔ آئے دن کے انقلاب مریٹوں۔ جاٹوں۔ درانیوں کی دستبرد غارت گری اپنی آنکھ سے دیکھیں اور قلم سے لکھیں۔

مکد میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انھیں
دل عشق کا ہمیشہ حریف نبرد تھا

تھا کل تلک دماغ جھپٹیں تاج و تخت کا
اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں پہلے درو تھا

مولوی عبدالسام ندوی نے بہارِ بجنڑاں کی روایت پر لکھا ہے کہ "میر صاحب بیخ عشق کے زخمِ خوردہ تھے اور ان کے دل پر ابتدائی سے یہ چرکہ لگ چکا تھا۔ عمر بھر ان کے دل میں یہ نشہ کھٹکتا رہا۔ اگرچہ یہ ایک راز ہے کہ عام طور پر تذکرہ نویسوں کو اس کی خبر نہیں ہے لیکن بعض تذکرہ نویس نے اس کو فاش کر دیا ہے چنانچہ بہارِ بجنڑاں میں ہے کہ "بہ شہر خوش ہا پری تمثالے کہ از عزیزانش بود پرودہ نقش طبع و میل خاطر داشت آخر عشق او خاصہ مشک پیدا کردہ می خواست کہ بخیمہ چار سوے رسوائی سے کند حسن ہے پرودہ بجلوہ گری در آید از رنگ افشای راز وطن و اقربا باد لے بغل پرودہ حسرت و حسان و با خاطر ناشاد دست و گریبان قطع رختہ حب وطن ساخته از اکبر آباد بعد از خانہ برآمد از یہاں بشہر گھنور سید ہمیں جا بصد حسرت جانکاه جلا وطنی و حرمیں نصیبی از دید اریارہ دیار جاں بہماں آفرس داد و تا بقید رشتہ حیات بود طوق محبت آہ گردن و سلسلہ دیوانگی بپاداشت از کلام عاشقانہ و درد انگیزش پیدا است کہ صد آرزو بجاک بُردہ ہ۔"

میر صاحب کے بعض اشعار سے بھی در پرودہ اس کی تصدیق ہوتی ہے

مرے سلیقہ سے میری بھی محبت میں	تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا
کیا تھا شعر کو پرودہ سخن کا	وہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا

لیکن ہمارے نزدیک یہ بات پایہ تحقیق کو نہیں پہنچی۔ اشعار سے اس بات کو ثابت کرنا ایک قیاسی دلیل ہے۔

تصانیف | میر صاحب کی تصانیف کثرت سے ہیں۔ چونکہ بہت بڑی عمر پائی تھی۔ لہذا تصنیف و تالیف کی تعداد بھی زیادہ ہے۔ ان کی تصانیف حسب ذیل ہیں:-

(۱) چھنیم دیوان غزلوں کے

(۲) ایک دیوان فارسی (جو ہنوز شائع نہیں ہوا ہے)۔

(۳) متعدد مثنویاں۔

(۴) ایک رسالہ بزبان فارسی موسوم بہ فیض تیر جس کے آخر میں چند لطیفہ و حکایات ہیں۔ اُن میں بعض بہت غش ہیں اُس سے اُس زملے کا مذاق معلوم ہوتا ہے۔

(۵) ایک تذکرہ بزبان فارسی شعرائے اُردو کا موسوم بہ نکات الشعراء دیوانوں میں نہ صرف غزلیں ہیں بلکہ رباعیاں، مستزاد، واسوخت، مخمس، سدس، ترجیع بند، ترکیب بند، مطلع، قصیدیں، غزلیات، غرض کہ جملہ اقسام سخن موجود ہیں۔ دیوانوں کے صد ہا صفحے ہیں۔ اور غزلیں ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔

میر صاحب نے چند قصیدے بھی لکھے مگر ادل تو اُن کی تعداد کم ہے۔ دوسرے بمقابلہ سورا کے قصائد کے وہ زیادہ زوردار نہیں اُن کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب کی طبیعت غزل گوئی کے واسطے مخصوص تھی۔ قصیدہ کی طرت مائل نہ تھی۔ السوجہ سے کہ وہ امیروں اور رئیسوں کی خوشامد اور بھٹی سے کوسوں بھاگتے تھے۔ اور نیز یہ کہ استغراق خود داری اور قدرتی کم سخن اُن کو بجائے فاضل کی طرت کسی طرح مائل نہ ہونے دیتی تھی۔ مخمسات بعض مناقب میں ہیں اور بعض شہر آشوب کی صورت میں ہیں جن میں شاہ عالم بادشاہ دہلی کے زمانہ کی شکایات ہیں۔ میر صاحب نے چند مریثے بھی کہے ہیں۔ غزلوں کے بعد اُن کی مثنویوں کا نمبر ہے جن کی تعداد بھی کثرت سے ہے مثنویاں کثر عاشقانہ اور بہت مقبول ہیں بعض متفرق مضامین پر ہیں۔ تعداد حسب ذیل ہے۔

(۱) مثنوی اجگر نامہ یا اژدر نامہ جس میں میر صاحب کے طبعی غرور اور دیگر

معاصرین شعراء کی حقارت کا ایک منظر ہے اُس میں اُنھوں نے اپنے آپ کو

ایک اژدہا تصور کیا ہے جو چھوٹے چھوٹے کیڑوں۔ سانپ بچھو وغیرہ کو کھا جاتا ہے اور ان حشرات الارض سے اُس زمانے کے کم مایہ شعرا کو مراد ہیں۔

(۲) شعلہ عشق (۳) جوش عشق (۴) دریاے عشق

(۵) اعجاز عشق (۶) خوابِ خیال (۷) معاملاتِ عشق

(۸) تنبیہ الجہال جس میں کہ فنِ نظم اور اُس کے مرتبے کا بیان ہے انکے

علاوہ تین مثنویاں شکارنامہ کی ہیں جن میں نواب آصف الدولہ کے سیر و شکار کا

حال ہے۔ کچھ اور چھوٹی چھوٹی نظمیں ایسی چیزوں کے متعلق بھی ہیں جن سے میر صاحب

کو بہت اُنس تھا۔ مثلاً کتا۔ بلی بکری وغیرہ۔ ایک مثنوی مرغبازاں۔ ایک میں موسم

برسات اور اُس کی تکلیفوں کا خاص کر اپنے گھر کا حال بیان کیا ہے جو بارش کی شدت

سے گر گیا تھا۔ اسی طرح ایک میں سفرِ برسات کا ذکر ہے ایک چھوٹی سی مثنوی

جھوٹ کی طرف سے خطاب کر کے لکھی ہے۔ کچھ مرثیے بھی لکھے ہیں مگر وہ چنداں

قابلِ ذکر نہیں۔ تاریخ گوئی کا اُن کو مطلق شوق نہ تھا۔ ایک ساقی نامہ بھی ہے۔

میر صاحب کی ایجادیں | میر صاحب اُردو و اسوخت کے موجد تسلیم کئے گئے ہیں

اسی طرح اُردو میں مثلث و مربع (یعنی تین اور چار مصرعوں کی نظمیں بھی انھیں

کی ایجاد ہیں۔ بعض فارسی کے شعروں کو تقنین کر کے کبھی مثلث کیا ہے اور کبھی

مربع مثلاً اہلی شیرازی کا شعر ہے۔

امروز یقین شد کہ نہ داری سراپائی | بیچارہ ز لطف تو غلط داشت گمانا

اس پر میر صاحب نے ایک مصرع لگا کے اس طرح مطلب پورا کیا۔

کل تک تو فریبندہ ملاقات تھی پسلی | امروز یقین شد کہ نداری سراپائی

بیچارہ ز لطف تو غلط داشت گمانا

میر صاحب کی شہرت خاص کر ان کی غزلوں اور مثنویوں پر مبنی ہے۔ عنبر نلوں

میں تو فی الحقیقت اُن کا جواب نہیں مگر مثنویاں میر حسن کی مثنوی سحرالبیان کو نہیں پہنچتیں پھر بھی اُن کی بیاضنگی اور فصیح البیان و سادگی قابلِ داد ہے۔ دیوان فارسی بقول مصحفی ایک سال میں تیار ہوا تھا جب کہ ریختہ کہنا موقوف کر دیا تھا۔

تذکرہ نکات الشعراء | یہ تذکرہ تقریباً ۱۰۵۰ھ مطابق ۱۶۴۲ء عیسوی میں لکھا گیا یہ حسبِ دعوے مصنف شعرائے اُردو کا سب سے پہلا تذکرہ ہے اور واقعی نہایت دلچسپ اور مفید ہے افسوس ہے اس میں حالات زیادہ تفصیل سے نہیں دیے گئے مگر پھر بھی جو باتیں معاصر شعراء کے متعلق اس میں ملتی ہیں وہ بہت کچھ قابلِ قدر ہیں جن شعرا کا ذکر ہے اُن کا کلام بھی بطور نمونہ کے دیا گیا ہے۔

میر صاحب کی خدمات | میر صاحب نے اکثر فارسی ترکیبیں یا اُن کے ترجمہ کو اُردو زبان اور شاعری کے ساتھ | میں داخل کر کے اُس کو رنجیت بنایا۔ آزاد نے آبجیات میں اس کی بہت سی مثالیں دی ہیں۔ مثلاً

ہنگامہ گرم کن جو دلِ نا صبور تھا	پیدا ہر ایک نالہ سے شورِ نشور تھا
دل کہ یک قطرہ خوں نہیں ہے بیش	ایک عالم کے سر بلا لایا
اے تو کہیاں سے عاقبت کا رجا لگا	یہ قافلہ رہے گا نہ زہار چای لگا

ترجمہ کی مثال۔

گل کو محبوب ہم قیاس کیا	فرق نکلا بہت جو باس کیا
-------------------------	-------------------------

باس کرنا یا بو کرنا فارسی بو کو دن کا ترجمہ ہے بمعنی سونگھنا۔

ان میں سے اکثر چیزیں پسند عام ہو کر منظور ہوئیں بہت سی ناپند ٹھہریں جو رفتہ رفتہ متروک ہو گئیں میر صاحب کے خیالات ریختہ کے متعلق جو نکات الشعر کے آخر میں دیے ہوئے ہیں خود انہی کی زبان سے سننے کے لائق ہیں فرماتے ہیں:

بدانکہ ریختہ برجیدیں قسم ست۔ از انجملہ انچہ معلوم فقیر ست نوشتہ می آید اول

آنکہ یک مصرعش فارسی و یک ہندی چنانچہ قطعہ حضرت امیر خسرو علیہ الرحمۃ کہ نوشتہ شد۔ دم آنکہ نصف مصرعش ہندی و نصف فارسی چنانچہ شعر مرزا معز کہ نوشتہ آمد سوم آنکہ حرف و فعل فارسی بکار می برند و اس قبیح است چہارم آنکہ ترکیبات فارسی مے آرند اکثر ترکیب کہ مناسب زبان ریختہ می اقتداں جائز است۔ و اس را غیر شاعر نمی داند و ترکیب کہ نملافوس ریختہ می باشد آن معیوب است و دانستن اس نیز موقوف سلیقہ شاعری است و مختار فقیر ہمہین است اگر ترکیب فارسی موافق گفتگو مے ریختہ بود مضائقہ ندارد و پنجم ایہام است کہ در شاعران سلف دریں فن رواج داشت اکنون طبعہا موقوف اس صنعت کم است مگر بسیار شبستگی بہتہ بشود۔ معنی ایہام اس است کہ لفظ کہ براد بنائے بیت بود آن دو معنی داشتہ باشد یکی قریب و یکی بعید و بعید منظور شاعر باشد و قریب متروک اور ششم انداز است کہ با اختیار کردہ ایم و آن محیط ہمہ صنعتہا است تخفیس تر صیغ تشبیہ، صفائی گفتگو، فصاحت، بلاغت، ادبندی، خیال و غیرہ۔ اس ہمہ در ضمن ہمین ست و فقیر ہم از ہمیں دتیرہ محظوظم۔ ہر کہ را دریں فن طرز خاصی است اس معنی را می فہم۔ با عوام کار ندارم۔

سیر حیثیت شاعر کے عام طور پر اردو شاعری اردو تغزل کی مراد ہے اور میر صاحب غزل گوئی میں مسلم الثبوت استاد مانے گئے ہیں۔ لہذا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ میر صاحب زبان اردو کے سب سے بڑے شاعر اور مسلم الثبوت استاد تھے۔ میر صاحب کا پایہ ثنوی نویسی میں بھی بہت بلند ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ غزل گوئی میں ان کا جواب نہیں اور اس ملک میں وہ منفرد اور تنہا حکماں ہیں۔ ان کے اشعار صاف سادہ۔ فصیح

لے	زر گر پیرے چو ماہ پارہ	کچھ گھڑے سنوارے پکارا
	نقد دل من گرفت و شکست	پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا

لے از زلف یارہ تو بدل دم پری سے درخشاں آئینہ ... گستاخوم پری ہے ۱۲

اور تیر و نثر کا کام دینے والے در دو اثر سے ملو ہوتے ہیں۔ ان میں دلکشی اور زور کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ اظہار جذبات جتنی بندش اور ترمیم میں وہ اپنی آپ نظیر ہیں انکے اکثر اشعار میں وہ ایک خاص کیفیت ہے جو سحر یا طلسم سے تعبیر کی جاسکتی ہے اور جو تمام زبانوں کی حقیقی اور سچی شاعری کا طغراے انبیاز ہے۔ میر صاحب کے بہتر نثر مشہور ہیں مگر سچ پوچھیے تو اُن کے صد ہا ایسے شعر نکلیں گے جن میں حقیقی شاعری کے اوصاف بدرجہ احسن موجود ہیں جب کوئی پھر کہتا ہوا شعر سنا جاتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ یہ نہیں بہتر نثر میں سے ہے۔ زبان سستہ کلام صاف بیان ایسا پاکیزہ اور دل آویز جیسے باتیں کرتے ہیں۔ وہ اردو کے شیخ سعدی ہیں۔ ان کا کلام اکیر شاعری ہے۔ علی الخصوص چھوٹی بچروں کے تو وہ بادشاہ ہیں اور ہمارے نزدیک تو بڑی بچروں میں بھی وہ اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اُن کے کلام میں جو حزن و ملال حسرت و مایوسی سے ملو ہے وہی اُن کی شاعری کی جان ہے یہی ناامیدی اور یاس اُن کی غمنزلوں کو زوردار اور موثر بناتی ہے۔ میر صاحب شاعری اور زبان دانی میں اپنا ثبانی نہیں رکھتے۔ عام طور پر لوگ اُن کو خدائے سخن کہتے ہیں۔ غالب ناسخ اور نیز تمام شاہیر جو اُن کے بعد ہوئے اُن کی عظمت اور اُستادی کے معترف تھے اور یہ بات خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ وہ اپنے ہی زمانے میں بہت بڑے شاعر مانے جاتے تھے۔ اُن کے معاصر اور نیز بعد کے تمام تذکرہ نویسوں نے اُن کی سجد تعریف کی ہے۔ اور نہایت رنگین عبارت اور مبالغہ آمیز کلمات اُن کی نسبت استعمال کیے ہیں۔ شاعر اور نثار دونوں ان کی تعریف کے معاملہ میں باہم مسابقت کرتے معلوم ہوتے ہیں اور آرٹ اور پیر و دنوں میں اُن کے کمال کی مدح سرائی کے الفاظ و اصطلاحات ڈھونڈتے ہیں۔ مثلاً میر حسن اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ سر آمد شعرائے ہند اور اپنے وقت کے انصاف فصیح اور بے نظیر و بے عدیل شاعر تھے۔ اسی طرح مرزا علی لطیف تذکرہ

گلشن ہند میں یوں رقمطراز ہیں کہ "جو شخص کہ نظارہ گاہ سخن میں چشم خوردہ میں رکھتا ہے اور چاشنی خرد سے امتیاز ذائقہ تلخ و شیریں رکھتا ہے تو وہ اس بات کو جانتا ہے اور اس رمز کو پہچانتا ہے کہ میر شیریں مقال ہیں اور رنجتہ گویان سابق و حال میں نسبت خورشید و ماہ ہے اور فرق سپید و سیاہ ہے صاحب طبقات الشعراء لکھتے ہیں "مجموعہ قابلیت و ہنر صاحب طبع خوش فکر سرآمد مشہوران عصر محاورہ داں و متین متلاشی مضامین نو و رنگین تجسس الفاظ چرب و شیریں در میدان غزل پر دازی گوئے نصاحت از معاصران مے برد و ہر چند سادہ گو است اما در سادہ گوئی پیر کا یہا دارد و حقیقت یہ ہے کہ میر و مرزا دونوں اپنے مابعد کے شعرا کے واسطے ایک صحیح نمونہ اور سرچشمہ فیض تھے۔ اُن کے کلام کی جلالت و دل آویزی اُن کے اشعار کا درد و اثر اور رنگینی آج تک مشہور ہیں بلکہ جب تک زبان اردو قائم ہے مشہور رہیں گی۔

میر اور سودا کا مقابلہ | میر صاحب کی شہرت اُن کی غزلوں اور ثنویوں پر مبنی ہے اور سودا قصیدہ اور سہجو کے استاد مانے جاتے ہیں خود سودا کے زمانے میں یہی خیال اکثر ارباب فن کا تھا۔ چنانچہ حکیم قدرت اللہ خاں قاسم اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں "زعم بعضے آنکہ سرآمد شعرا کے فصاحت مرزا محمد رفیع سودا در غزل گوئی بوی (میر تقی) زیدہ لاحق آنست کہ ہر گلے را رنگ دہوے دیگر است مرزا در یائست بیکران و میر نہر است عظیم الشان۔ در معلومات قواعد میر را بر میرزا برتر است و در قوت شاعری مرزا را بر میر سردری" اسی طرح ایک مشہور صاحبِ دل خواجہ باسط نے جو علاوہ کمالات عرفان و تصوف کے فنِ تقدیس بھی کامل دستگاہ۔ لکھتے تھے اس مشکل اور نازک مسئلہ یعنی میر و مرزا کی شاعری کے فرق کو نہایت مختصر الفاظ میں فیصلہ کر دیا اور فرمایا "کہ دونوں صاحب کمال ہیں۔ مگر فرق اتنا ہے کہ میر صاحب کا کلام آہ ہے اور مرزا کا کلام ماہ ہے" اسی فرق کو ایک نہایت لطیف پیرایہ میں امیر مینائی

نے بھی اپنے ایک شعر میں ظاہر کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ دونوں بڑے شاعر اور
 اپنے اپنے طرز کے استاد تھے۔ ہماری ناچیز رائے میں ان دونوں بزرگواروں کے
 طرز کلام کا فرق اُن کے مزاج اور طبیعت کے فرق پر بہت کچھ مبنی ہے۔ میر صاحب
 قدرتنا حزمیں اور عجبکس واقع ہوئے تھے ان کی زندگی حزن و یاس اور مصائب و اوبار
 کا غونہ تھی اس پر طرہ یہ کہ خود داری اور عزت کا اُن کو بید احساس تھا جس سے وہ
 مجبور ہو گئے تھے کہ عزت اور ننگائی کی زندگی بسر کریں۔ اسی وجہ سے عسمر بھر
 تلخا بہ حیات پیتے رہے بزم طرب اور محفل سرور کے وہ فطرتاً اہل نہ تھے۔ خوشی اور
 ہشاشی بھاشی کا حصہ تمام ازل نے اُن کو دیا ہی نہ تھا۔ برعکس اس کے سودا
 نہایت شگفتہ مزاج اور رنگین طبع واقع ہوئے تھے دار سگی اور آزادی ان کی طبیعت
 کا اصلی جوہر تھا۔ خوشی و خرمی زندہ دلی اور ظرافت سے اُبلے پڑتے تھے خوشی کے
 جمعوں اور ہنسی مذاق کے جلسوں کے روح رواں تھے جہاں ان کی قابلیت خدا داد
 کے جوہر کھلتے تھے۔ زندگی نہایت قاصغ البالی اور شاد کامی سے بسر کرتے تھے نظریں
 ان دونوں کی شاعری اُن کے خیالات اور اُن کے مزاج اور دنیا کے ساتھ اُن کے
 برتاؤ کا بہترین نمونہ کہی جاسکتی ہے اسی طرح اُن دونوں کے اپنی اپنی شاعری کی واسطے
 منتخب کئے ہوئے الفاظ بھی اُن کے حسب مزاج اور موافق حال ہیں۔ ظاہر ہے کہ
 درد و اثر کے لیے الفاظ نہایت نرم اور صاف و سادہ اور بندش نہایت سلیس اور
 بے تکلف ہونی چاہیئے اور یہی طرز غزل کے واسطے زیادہ موزوں ہے علی الخصوص
 چھوٹی چھوٹی بچروں کے لیے جس میں کہ میر صاحب کی شاعری اپنے عروج کمال پر
 رکھائی دیتی ہے۔ برعکس اس کے قصیدہ کے لیے شاندار الفاظ و مضامین، نادر
 تشبیہوں اور استعاروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ قصیدہ کتنا ایک پر مردہ اور دل گرفتہ
 آدمی کا کام نہیں۔ عاشقانہ خیالات مثلاً مصائب ہجر و فراق وغیرہ کے دردناک

حالات جن بے تکلف اور سادہ الفاظ سے ظاہر ہو سکتے ہیں وہ قصیدہ کے لئے کسی طرح موزوں نہیں ہیں۔ تیسرے درجہ اور سادگی کے مسلم الثبوت استاد ہیں ان کے وہ اشعار جو بہتر نثر کے فرضی نام سے مشہور ہیں سب خود انھیں کے سچے اور دلی جذبات کا پرتو ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے تخیل سے اُس میں نگاہ تیری مطلق نہیں کی ہے۔

تیسرے کی زندگی ایک دردِ عالم کی زندگی ہے اور انگریزی شاعر شیپلی کی یہ سطور اُن کے حسب حال ہیں۔ "حیران نصیب لوگ غلطی سے گوارہ شعر میں ڈال دیے جاتے ہیں جو مصیبت تو خود جھیلے ہیں مگر وہی مصیبت نظم میں دوسروں کو سناتے ہیں"۔ اسی وجہ سے تیسرے کے بہترین اور سب سے زیادہ مؤثر شعر یہی ہیں جن میں دردِ عالم کے جذبات کا اظہار کیا گیا ہے سودا کے کلام میں تیسرے کا سادہ نہیں۔ تیسرے کے اشعار غلبہ اور جو ٹیلے دلوں پر خاص اثر کرتے ہیں۔ اُن کا قصہ غم کا قصہ ہے۔ وہ زندگی کا وہ رخ جو ریاس اور غم سے بھرا ہوا ہے نہایت آب و تاب اور سچائی سے پیش کرتے ہیں۔ بر خلاف اس کے سودا اُس کا دوسرا رخ دکھاتے ہیں جو اُمید اور خوشی سے جلو ہے سودا کے اشعار پڑھنے والے کے لیے سامانِ طرب و نشاط مہیا کرتے ہیں۔ ان کی طبیعت کسی محدود دائرے میں مقید رہنا پسند نہیں کرتی۔ وہ جذبات کے تنگ عالم سے نکل جانا چاہتے ہیں اور ایک وسیع جولا نگاہ اپنے اظہارِ خیال کے لیے تلاش کر لیتے ہیں اسی وجہ سے انھوں نے نئی نئی راہیں نکالیں اور اُن کے اشعار ایک ایسے گلدستہ کا مزادیتے ہیں جو انواع و اقسام کے مختلف رنگ و بو کے پھولوں سے بسا ہوتا ہے۔ انھوں نے انقیاضی جذبات کو چھوڑ کر انبساطی جذبات کو بہت کچھ وسعت دی ہے تیسرے کی دنیا تاریکی اور غم سے بھری ہوئی ہے جس میں کہ امید کی جھلک تک نظر نہیں آتی۔ اُن کے تمام اشعار اس مقولہ کے تحت میں ہیں جو کوئی اس غمکدہ میں قدم رکھے

اسید کو بھیجے چھوڑ آئے۔ تیر کی سنی اور مذاق بناوٹی اور ان کی طعن و تشنیع مصنوعی ہے یہ کہنا صحیح نہیں کہ تیر نے ہجو اور قصیدہ نہیں لکھائی الحقیقت ان دونوں صنفوں میں انھوں نے طبع آزمائی کی مگر چونکہ طبیعت ان اصناف کے واسطے موزوں نہیں پائی تھی لہذا ناکام رہے۔ یہ بھی کہنا صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ وہ اپنے مزاج کی خود داری اور دولت و اقتدار کی بے پروائی کی وجہ سے ان اصناف سخن میں سرسبز نہ ہوئے انھوں نے اگر نادر ضرور لکھا ہے مگر وہ سودا کی ہجووں کا عشرِ شیر بھی نہیں۔ اسی طرح ان کے قصائد جو نواب آصف الدولہ کی تعریف میں ہیں، سودا کے قصائد کے سامنے بیچ ہیں۔

دونوں بزرگوار میر اور سودا، حقیقت اور اصلیت بیان کرنے کے بادشاہ ہیں۔ دونوں وہ کامل مصور ہیں جو خیالی تصاویر نظم میں ایسی خوبصورتی اور جزئیات کی تفصیل کے ساتھ کھینچتے ہیں کہ ان کے نظری مرتعے ہمارے دل کی آنکھوں کے سامنے جیتی جاگتی تصویریں معلوم ہوتے ہیں۔ یہ مرقع نگاری داخلی یا خارجی، یعنی جذبات انسانی یا مناظر قدرت دونوں کی ہو سکتی ہے پس جہاں تک کہ جذبات انسانی اور علی الخصوص درد و غم کے جذبات کا تعلق ہے ان کے اعلام و اظہار میں میر صاحب منفرد ہیں مگر ان کے سوا دیگر جذبات پر سودا کو کمال حاصل ہے۔ سودا کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ جن مضامین کی وہ اپنے اشعار میں تصویر کھینچنا چاہتے ہیں ان کے مالہ اور ماعلیہ کا ان کو بدرجہ کمال علم ہوتا ہے۔ میر صاحب اپنی افتاد طبیعت، اپنی نازک عادات اور اپنے استغراق خودی کی وجہ سے مجبوراً فطرت انسانی کا مطالعہ اس وسیع النظری سے نہیں کر سکتے انکی محدود نظر اسی استغراق اور خود بینی کا نتیجہ ہے۔ وہ اپنے رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے انکو اپنے کام میں اس قدر انہماک اور توغل تھا کہ سات برس تک اپنے کمرہ کے پائیں باغ کو نظر اٹھا کر دیکھنے کی فرصت نہ ملی۔ اس انہماک سے اتنا ضرور ہوا کہ

وہ اپنے خاص کام میں یکتا ہے زمانہ ہو گئے۔ وہ تنوع جو سودا کے کلام کی جان ہے
میر صاحب کے یہاں مفقود ہے۔ سودا کی تصاویر نہایت رنگین اور خوشنما ہوتی ہیں
بخلاف میر صاحب کے جن کی دنیا مایوسیوں سے تیرہ و تار جس کے پھول پیر مردہ و پژورہ
جن کی زمین تکلیفوں اور مصیبتوں کی قیام گاہ اور جس کا آسمان آلام و مصائب کی چابی پر ہے
ایسے عالم میں مفر کا بس یہی طریقہ ہوتا ہے کہ یا سکوت، مجموعیت اختیار کی جائے یا نالہ
زاری سے دل کی بھڑاس نکالی جائے یا عالم خواب کی سیر کی جائے۔ مگر وہ خواب بھی
قوت تخیلیہ ہی کے پیدا کئے ہوئے خواب پریشان ہوتے ہیں۔ برخلاف اس کے
سودا کی دنیا جیتی جاگتی دنیا ہے جس میں بجائے تاریکی کے امید کی روشنی جلوہ گر ہے
باغ سرسبز شاداب جس میں باد صبا بخوبی صورت کھولوں اور نازک نازک پتیوں کے
ساتھ ہر وقت اٹھیلیاں کرتی پھرتی ہے۔

تنبہیں اور استعارے ہر شاعری کے جزو اعظم مگر خصوصیت سے مشرتی
شاعری کی تو وہ جان ہیں۔ اگر استاد ہی کے ساتھ برتنے جائیں تو شعر کے حسن میں وہ چار
چاند لگا دیتے ہیں۔ سودا وہ استاد ہے جو ان کے صحیح استعمال پر قادر ہے۔ اُس کے
یہاں دلچسپ بہیں اور نادر استعارے سیر کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہیں وہ ان مختلف
علوم و فنون سے بھی جنکو وہ شعر میں استعمال کرتا ہے بہ نسبت سیر کے زیادہ واقف ہے۔
یہ بالکل صحیح ہے کہ سودا کی اکثر غزلوں میں قصیدہ کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔
اس کی کم و بیش یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ شاعر کا ذہن درست تخیل بعض وقت اُس کو ایسے
مضامین اور الفاظ سمجھاتا ہے جو غزلیت سے میل نہیں کھاتے وہ اپنی بلند پروازی
اور تخیل کی تیزی کو روک نہیں سکتا۔ میر صاحب کے یہاں ایسے عیوب نہیں ہیں۔
سودا کے اس قسم کے اشعار ان قواعد کے ضرر خلاف ہیں جو ترتیب غزل کے
واسطے مقرر ہو گئے ہیں مگر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اگر اسی قسم کے شعر

علحدہ علحدہ دیکھے اور جانچے جائیں تو اُن کی عمر کی اور کمال میں کسی کی کیا کلام ہو سکتا ہے۔ یہ بات بھی ضرور یاد رکھنا چاہیے کہ ترتیب غزل کے قواعد سے استغنا اور بے پروائی متاخرین شعراے فارسی کی منتجع میں ہے جن کے قدم یہ قدم اردو شعرا چلنا چاہتے ہیں نظم فارسی کی آخری منزل ارتقا میں غزل کا محدود دائرہ بہت وسیع ہو گیا تھا اور اُس میں بہت سی چیزیں مثلاً فلسفہ مذہب اخلاق تصوف اور دیگر علوم و فنون وغیرہ سب شامل کر لیے گئے تھے۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ عاشقانہ رنگ یا عشق مرتب اور منظم ہو کر سائنس کے درجہ پر پہنچ گیا تھا اور دشتاوری جو فارسی کی قطع تھی اس انقلاب سے اُس نے بھی بہت کچھ فائدہ اٹھایا۔ البتہ یہ ضرور یاد رکھنا کہ اخرا لہ کر مضامین سے بہرہ اندوزی بہ نسبت دل کے دماغ زیادہ کرتا ہے یعنی جس قدر ان مضامین کی کثرت ہوتی ہے اتنی ہی دردِ دائرہ کی کمی ہو جاتی ہے۔ تفصیل کی نشان اور غزل کے رنگ میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے اور یہ فرق ہمارے زمانہ کے نو آموز شعرا کے کلام میں جو سودا اور غالب وغیرہ ایسے استادوں کی تقلید کرنا چاہتے ہیں بخوبی نمایاں ہے۔

سودا اور تیر دونوں موسیقیت الفاظ کے استاد ہیں اُن کے شعر سناچے میں دھلے ہوئے۔ بندش نہایت چھٹ۔ اور زائد سے پاک ہوئے ہیں نشست الفاظ پر سودا کو زیادہ توجہ تھی۔ وہ ہر شعر کو اپنی جگہ پر مکمل بنانا چاہتے ہیں جو خود ایک بہت بڑا فن ہے۔ شاذ و نادر معنی میں گنگل بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ دونوں استاد درد و اذکار تعلیمات اور تشبیہات سے بچتے ہیں۔ اگرچہ سودا کے یہاں کبھی کبھی اس قسم کی غلطی ہو جاتی ہے۔ دونوں استادان فن کے کلام کا مقابلہ ایک کار آمد اور قیمتی چیز ہے اس وجہ سے کہ دونوں ہم عصر تھے اور متحدہ اصناف سخن پر طبع آزمائی کرتے تھے اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ہم طرح غزلیں کسی جاتی تھیں جن کا مقابلہ اس لئے بہت دلچسپ ہے

کہ اس سے دونوں کے مختلف مزاج اور طبیعت اور نیز انداز بیان کے فرق کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔ دونوں کے کلام میں اُس عہد کے بعض نقائص بھی کہیں کہیں پائے جاتے ہیں۔ دونوں کے یہاں کبھی کبھی متبدل اور فحش الفاظ استعمال ہوئے ہیں بعض اوقات مضمون شعر میں فحش ہوتا ہے کہیں اختلاف تذکیہ و تانیث اور شتر گربہ ہے اکثر اشعار معمولی بلکہ پھیکے اور بے مزہ بھی ہیں۔ میر صاحب کہیں کہیں ایہام بھی برتتے ہیں۔ امر پرستی جو اس زمانہ کی شاعری کا ایک قبیح موضوع ہے۔ دونوں کے کلام میں جا بجا پائی جاتی ہے۔

مختصر یہ کہ وسعت نظر، تنوع خیالات، جزئیات کے بیانات کی قدرت، دنیاوی معاملات کی واقفیت، اور سب سے بڑھ کے یہ کہ مذاق اور ظرافت میں سودا کو میر پر بڑی ہے۔ سلوکی الفاظ، سلاست زبان، عاشقانہ رنگ، درد و اثر، فصاحت و بلاغت اور تصوف میں میر صاحب کو سودا پر فضیلت ہے۔ کسی کا قول ہے اور سچ کہا ہے کہ دونوں کا کلام بیش بہا جواہر ہیں۔ میر صاحب کے یہاں صرف ہیسیرے ہیں سودا کے یہاں ہیسیروں کے علاوہ موتی، زرد اور یاقوت بھی بکثرت پائے جاتے ہیں سچی کسوٹی پر کھنے والے کا مزاج اور مذاق ہے " لے

اس عہد کے دیگر شعراء | اس عہد میں ان دو بزرگواروں کے علاوہ اور بھی بہت سے شاعر گزرے ہیں مگر چونکہ وہ کثرت سے ہیں اور ان کے کلام میں کوئی خصوصیت نہیں لہذا یہاں ان کا ذکر نظر انداز کیا جاتا ہے۔ ناظرین کو اگر ان کے کلام یا حال کے دریافت کرنے کا اشتیاق ہو تو اس عہد کے یا بعد کے تذکرے ملاحظہ کریں یہ

۱۔ میر و مرزا کے کلام کے مقابلہ کے لیے دیکھو بقا کے اشعار صفحہ ۲۵۸۔

۲۔ اس عہد کے بعض شعراء کا حال مختصر باب ۷ کے آخر میں بیان کیا گیا ہے دیکھو صفحہ ۲۰۹۔

باب

اساتذہ دہلی

طبقہ متاخرین
انشاء اور مصحفی کا زمانہ

طبقات کی ترتیب | شعرا کے طبقات کی ترتیب کوئی فرضی چیز نہیں جیسا کہ بادی النظر
اس دور کی ترقیاں | میں وہ معلوم ہوتی ہے۔ گویہ یہ سچ ہے کہ اکثر شعراء ایک دور
کے ماقبل کے دور کے بعض شعرا کے معاصر ہے ہیں مگر اس کا جواب یہ ہے کہ ایک
تو یہ کہ مابعد کے دور کے شاعر دور ماقبل میں نوجوان اور نواؤں سے تھے اور اُس وقت
انہوں نے کوئی شہرت نہیں حاصل کی تھی اور دور ماقبل کے شاعر کین سال، مشاق
اور مشہور ہو چکے تھے، اس کے علاوہ زبان کا فرق بھی بہت کچھ قابل لحاظ ہے۔ اس
دور میں بمقابلہ دور ماقبل کے زبان اور نیز بندش کے اعتبار سے شعر میں بہت کچھ
ترقی ہوئی بہت سے چھڑا نے الفاظ اور ترکیبیں متروک ہو گئیں اور ان کی جگہ نئے
الفاظ اور جدید ترکیبوں نے لی اس معاملہ میں زبان اُردو انشا کی بہت احسان
ہے جنہوں نے اس کی ترقی اور توسیع کے لیے بہت سے نئے نئے تجارب اختیار کیے
مصحفی البتہ قدما کے پیرو تھے جنہوں نے نظم کی قدیم روایات کو جاری رکھا۔ جرأت
بھی غزل میں میر کے پیرو تھے۔

شاعری دوبار سے دابت ہو گئی | اس دور کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس نے نظم اُردو کو

دربارہ کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ دور ماقبل کے شعرا کو اپنے سرپرستیوں سے انعام و اکرام اور وظیفے اور تنخواہیں پاتے تھے مگر اپنی آزادی اور خودداری کو ہمیشہ قائم رکھتے رہے وہ اپنی حیثیت ایک ملازم کی کبھی نہیں سمجھتے تھے۔ اس دور میں یہ خسروانی ہوئی کہ گو شعرا کی قدر دانی اور سرپرستی بڑھ گئی مگر ان کی خودداری اور عزت و آبرو کم ہو گئی۔ شاعری کا اب صرف یہ کام رہ گیا کہ اُس سے امیر و رئیس خوش کیے جائیں شاعر لوگ اپنے سرپرستوں کے چشم دابر و ہر وقت دیکھتے تھے اور چونکہ ان کا دل خوش کرنا مقصود تھا لہذا ایشوار بھی انھیں کے مزاج اور مذاق کے موافق کہہ جاتے تھے مختصر یہ کہ اس دور کے شعراء نقال اور مسخرے پہلے تھے اور شاعر بعد کو۔ اب شاعری حصول زر کا ایک کامیاب ذریعہ ہو گئی تھی اور شاعر اُمر اور رسد کے درباروں میں پہنچتا بلکہ اپنے مالکوں کے مزاج میں درخور حاصل کرنا بس یہی اپنا فخر سمجھتے تھے اس کا ایک بُرا نتیجہ یہ ہوا کہ خود آپس ہی میں سخت رقابت اور بد مزگی شہر ابیں پیدا ہو گئی۔ اس کے قبل بھی اس قسم کی بد مزگیاں ظہور میں آئی تھیں مگر وہ فن سے متعلق اور حدود شائستگی کے اندر رہتی تھیں۔ اب چونکہ شاعری امیر و سی کا ایک ذریعہ ہو گئی تھی لہذا شاعر ایک دوسرے سے سخت رقابت اور حدادت برتنے لگے اور اُن کے آپس کے شاعرانہ مقابلے اب تہذیب و شائستگی کی حد سے گزر کے گالی گلوچ اور لپٹا دینے کے درجہ تک پہنچ جاتے تھے۔ چنانچہ انشا اور مصحفی کے ہنگامے اس زمانہ کی نایح شاعری پر ایک نہایت بد نما دھبہ ہیں۔

اس وابستگی کے خراب نتائج | شاعری کی اس درباری وابستگی کا ایک خراب نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی متانت اور پاکیزگی اور علو خیال میں بہت فرق آگیا۔ درباری اثر سے اُسکی آئندہ ترقی کی راہیں سد ہو گئیں خیالات میں نفاست اور پاکیزگی کم ہو گئی۔ شعرا کی روحانیت اور بلند ہمدازی مفقود ہو گئی۔ معشوق سے اب تک عموماً معشوق حقیقی

مراد ہوتا تھا اب بچائے اس کے کوئی ٹوٹا یا رٹھی جن کی ایسے عیش پرست درباروں میں
 کمی نہ تھی سمجھا جانے لگا۔ شہوانی جذبات بے تکلفی کے ساتھ بکثرت نظم ہونے لگے۔ کیونکہ
 عیاش امر اور ان کے مصاحبین اسی قسم کے اشعار سے خوش ہوتے تھے اور اسی قسم
 کے فواحش پر انعام و اکرام دیتے تھے۔ دلی کی یہ حالت نہ تھی یہاں کے شعرا میں گو کہ
 وظائف اور تنخواہیں وہ بھی پاتے تھے، متانت اور سنجیدگی اور آزادی مزاج اب تک
 باقی تھی۔ بلکہ سچ پوچھیے تو یہاں عموماً شاعری تصوف و عرفان کی گود میں پلی۔ شعر گوئی
 ایک مقدس اور معزز مشغلہ سمجھی جاتی تھی۔ اہل اللہ کے دائروں اور خانقاہوں میں
 اُس کی نشو و نما ہوئی۔ شاہ گلشن، خواجہ میر درد، مرزا ظہر جاناں، یہ سب مشہور
 اہل دل بزرگ گزرے ہیں جنہوں نے شاعری کو بہت تحرک دے کر ترقی دی۔ لکھنؤ میں عکس
 اس کے شاعری کے سر پر سے روحانیت اور تصوف کا سایہ اٹھ گیا اور اب وہ
 دربار سے متعلق ہو گئی۔ اب شاعر دلی ہونے کی نہیں بلکہ دربار رس ہونے کی تمنا
 کرتے تھے۔ یہ سچ ہے کہ کچھ ایسے لوگ جو دلی چھوڑ کر لکھنؤ آ گئے تھے کچھ دنوں یہاں
 کی ہوا اور خراب صحبت سے پچھتے رہے مگر رفتہ رفتہ طبع اور شہرت پسندی اور سب سے
 زیادہ اس زمانہ کے بگڑے ہوئے مذاق نے ان کو اپنی راہ پر آخر لگا ہی لیا۔

رہنمائی | ایک جدید صنف شاعری یعنی ریختی جس کو ان خطاط مذاق کا بدترین نمونہ
 سمجھنا چاہیے اسی دور میں وجود میں آئی۔ اس کے موجد سعادت یا رخاں رکنین
 تھے جنہوں نے اپنے زمانہ کے مدرسہ تعلیم حاصل کر کے مدارج عیاشی
 آوارگی کو یکے بعد دیگرے بہ تمام و کمال طے کیا تھا۔ ان کا کلام عورتوں کی زبان میں
 ہونے کی وجہ سے ظاہر ہے کہ عیاش مزاج لوگوں کو بہت دلچسپ معلوم ہوتا تھا مگر
 حقیقت میں سوائے فحش اور ابتذال کے اُس میں اور کچھ نہ تھا۔ انشانے بھی بہت
 کچھ اُس میں حصہ لیا۔

اس عہد میں فن شعر گوئی کو بہت قوت حاصل ہوئی اور کثرت مزا دولت سے شعرا نے من حیث الفن طبری ترقی کی۔ اگرچہ شیریں کلامی اور بلند خیالی شعریں کم ہو گئی مگر تکمیل فن نے اس کمی کو پورا کر دیا۔ انہماق قابلیت کی غرض سے لوگ مشکل مشکل بحر اور سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی کرتے تھے اور پھر دو ایک نہیں بلکہ صد ہا اسی قسم کی غزلیں کہہ ڈالتے تھے جو ان کے کمال کا نمونہ تو ضرور ہیں مگر وہ قدما کا درد و اثر صحیح جذبات کا ان میں نام نہیں۔ اس عہد کے شعرا نے شعر کی ظاہری درستی کی طرف جو خاص توجہ کی تھی وہی آئندہ چل کر ناسخ وغیرہ کے زمانہ میں ایک طرز خاص بن گئی۔

فنی مباحث کو چھوڑ کر شعرا نے شاعری کو حصول زرا و کسب معاش کا ایک ذریعہ قرار دے لیا تھا۔ اور وہ مباحث اب درباری نزاعوں تک محدود ہو کر رہ گئے تھے میان مصحفی جو صاحب عالم مرزا سلیمان شکوہ کے استاد تھے انشا نے ان کو اس جلیل القدر درجہ سے ہٹانا چاہا اور یہ امر ایک عظیم الشان جنگ کا باعث ہوا جس کی تذکروں میں بالتفصیل ذکر ہے۔ اس کی ابتدا تو معمولی طریقہ سے ہوئی تھی مگر آخر کو وہ پھکڑ پی کہ خدا کی پناہ! ان کے مڑتی اس تھکا فضا جیتی کا دور سے تماشہ دیکھتے تھے اور ان کے مہملیات کی داد دے کر جانبین کی آتش حسد و نفاق کو اور پھکڑ کاتے تھے۔ بالآخر شاعروں نے قلم ہاتھ سے رکھ کر لاٹھی پونگے اٹھالے اور بے تکلف ایک دوسرے سے دست و گریبان بلکہ ایک دوسرے کی جان اور عزت و آبرو کے درپے ہو گئے سچ پوچھے تو اس قسم کی لغو اور بیودہ نظموں سے شاعری کی تہذیب و متانت میں فرق آگیا اور مصحفی اور انشا کی اس قسم کی نظمیں اب اس زمانہ کے پُر شور مذاق اور پھکڑ کا ایک نمونہ رہ گئی ہیں جن کو پڑھ کر سہنی آتی ہے مگر رنج بھی ضرور ہوتا ہے۔

ہزل گویان اُردو | اس موقع پر چند ہزل گویان اُردو کا بھی ذکر کر دینا ضروری ہے حسب ذیل نام قابل ذکر ہیں۔ میراٹل نارنوی۔ میر جعفر زٹل۔ زانی۔ چترکین

افس میر غلام حسین برہانپوری شاگرد زانی۔ یہ منشی کچھی زراٹن شفیق اور نگ آبادی کے سمعہ تھے اور شفیق نے افسق کا ذکر اپنے تذکرہ چمنستان شعرا میں کیا ہے۔

انشاء متوفی ۱۱۳۳ھ | سید انشا را شاعر خاں متخلص بہ انشا خلف حکیم میر بادشاہ الشاہاں مطابق ۱۱۸۱ھ عیسوی | ان کے بزرگ نجف سے آئے تھے اور دلی میں بس گئے تھے۔ رفتہ رفتہ

امراے شاہی میں داخل ہوئے۔ انشا کے والد شاہی طبیب تھے اور کچھ شعر بھی کہتے تھے اور مصدر متخلص کرتے تھے۔ زوال سلطنت کے زمانہ میں وہ مرشد آباد گئے جو نو آبادی برنگالہ کا دار الحکومت تھا اور یہیں سید انشا کی ولادت ہوئی۔ ابتدائے عمر میں علوم رسمہ اپنے والد ہی سے حاصل کئے شعر کہنے کا شوق انکو بچپن سے تھا۔ کبھی کبھی والد سے اصلاح لیتے تھے۔ مگر زیادہ تر اپنی طبیعت خداداد اور فطری ذہانت سے کام لیتے تھے انشا مرشد آباد چھوڑ کر شاہ عالم کے زمانہ میں دہلی آئے۔ شاہ عالم اب محض برائے نام بادشاہ رہ گئے تھے خود بھی شعر کہتے تھے اور شاعروں کے بڑے قدردان تھے انھوں نے انشا کی طبعی قدر کی۔ دربار اُس وقت بالکل لٹا پٹا تھا۔ مگر پھر بھی اُس قدر دان بادشاہ نے اس جوان بہت اور جوان طبیعت شاعر کو نظر شفقت و عنایت سے دیکھا اور اس کو انعام و اکرام سے مالا مال کیا۔ سید انشا اہل دربار میں داخل ہوئے اور انھوں نے بھی وہ وہ لطیفے اور چٹکے بادشاہ اور اہل دربار کو ننانا شروع کئے کہ پھر تو یہ عالم ہوا کہ ان کی تھوڑی دیر کی بھی جدائی بادشاہ کو بہت ناگوار ہوتی تھی۔ آخر کار دلی کی تباہی سے بد دل ہو کر اور نیز اس خیال سے کہ ان کی قابلیت کے موافق بہاں اُن کی قدر نہیں ہوتی تھی اور خاص کر مرزا اعظم بیگ کے مناقشہ کی وجہ سے انشا نے لکھنؤ کا رخ کیا جو اس زمانہ میں دہلی سے نکلے ہوئے شعرا اور دیگر بالکالوں کا ملجا و ماویٰ بنا ہوا تھا۔ یہاں پہنچ کر انھوں نے شاہزادہ مرزا سلیمان شکوہ متخلص بہ سلیمان کی ملازمت اختیار کر لی جو خود بھی صاحب دیوان اور شاعروں کے قدردان تھے۔ انشا نے

اپنی ظرافت اور بزرگ بینیوں سے اُن کے مزاج میں بڑا رسوخ حاصل کیا اور تھوڑے عرصے بعد اُن کے قدیمی استاد مصحفی کی جگہ لے لی۔ مگر اُن کی مچلی طبیعت جو ایک حال پر قائم رہنے والی نہ تھی ہمیشہ ترقی کے نئے راستے ڈھونڈھتی تھی۔

انشا کی تقریب نواب سعادت علی خاں کے دربار میں

تفضل حسین خاں علامہ جو اپنی قابلیت اور حسن تدبیر سے سرکار انگریزی کے معتمد اور نواب

سعادت علی خاں کے مشیر کار تھے۔ یہ آفتاب ان کی صحبت میں آیا جایا کرتے تھے خان علامہ انکی بڑی عزت کرتے تھے اور اس خیال میں تھے کہ کوئی مناسب حال صورت انکے لیے نکالیں۔ اتفاق سے ایک دن یہ انشا جو ش تقریر میں ایک ایسا لفظ بول گئے جو دو معینین تھا۔ اور اُردو میں اُس کے معنی قابل اظہار نہیں۔ کہنے کو تو کہہ گئے۔ مگر خاں علامہ کی نظر ناڑ کر بولے کہ زبان ماڈر اٹری میں ”بوقوت“ کو کہتے ہیں۔ انھوں نے کچھ سوچ کر کہا ”خیر خاں صاحب انداز معلوم ہو گیا جلد کچھ صورت ہو جائیگی۔“ دوسرے دن نواب سعادت علی سے ان کے خاندان کی بزرگی اور ان کے ذاتی کمالات کا ذکر کر کے کہا کہ آپ کی صحبت میں ان کا ہونا مشغل صغریٰ و کبریٰ سے بہتر ہو گا۔ وہ سُن کر مشتاق ہوئے۔ دوسرے دن خاں صاحب یہ انشا کو لے گئے انشانے اپنے لطیفوں اور چٹکوں اور مذاق و ظرافت سے نواب کو ایسا پرچایا کہ اُنکو انکی ایک دم کی جدائی بھی ناگوار تھی۔ اُن کی حاضر جوابیاں، اُنکے پُر مذاق لطیفے، اُنکی ظرافتیں نواب کو ایسی اچھی معلوم ہوتی تھیں کہ وہ اُن کو ایک دم بھی اپنے سے جدا رکھنا پسند نہ کرتے تھے مگر افسوس ہے کہ

سے وزیر علی خاں کی سند نشینی اور بعد کو اُن کا اخراج اور سعادت علی خاں کی مسند نشینی انھیں کے حسن تدبیر کا نتیجہ تھی۔ خان علامہ علاوہ ایک مستند عالم فاضل اور باکمال ہونے کے اپنے زمانہ کے مشہور سیاست داں تھے ان کو کئی زبانوں سے واقفیت تھی جن میں انگریزی اور لاطینی بھی شامل ہیں ۱۲ سرائیک نمون کے ڈفرنشل کلکیولس کا ترجمہ انھوں نے فارسی میں کیا ہے ۱۳ ماخوذ از آب حیات ۱۲

آخر میں رنگ میں بھنگ اور ہنسی سہنی میں مخالفت پیدا ہو گئی۔ انشا اپنے مذاق اور دل لگی کی باتوں میں بعض وقت حد سے گزر جاتے تھے اور جو منہ میں آتا تھا کہہ جاتے تھے ایسی باتیں اکثر موقعوں پر تو نواب کو موجب تفریح ہوتی تھیں مگر بعض دفعہ مکدر ہو جاتے تھے اور ناک بھوں چڑھاتے تھے نواب کے مزاج کا پارہ حرارت ناپنے کے واسطے یہ انشا با اوقات اچھے بیراٹر نہیں ثابت ہوتے تھے مزاج میں بھی اختلاف تھا انشا کی آزاد طبیعت یہ ہرگز گوارا نہیں کر سکتی تھی کہ موقع و بے موقع اور جا و بیجا نواب ہی کا کہنا مانا جائے اور اُن کی ہاں میں ہاں ملانی جائے۔ چنانچہ ایک روز یہ واقعہ ہوا کہ دربار میں شرفائے خاندانی کی شرافت و نجابت کا ذکر ہو رہا تھا نواب نے کہا "کیوں بھئی ہم بھی بنجیب الطرفین ہیں؟" انشا محض مذاق سے اور بغیر سمجھے بوجھے بول اٹھے "بلکہ انجب" (انجب عربی میں لونڈی بچہ کو کہتے ہیں) سعادت علی خاں فی الحقیقت حرم سے تھے اس بے ہنگام لفظ پر سارے دربار میں سناٹا چھا گیا مگر کمان سے نکلا ہوا تیر کو نوکر واپس کیا جاسکتا ہے۔ نواب کے دل کی کھٹک کبھی نہیں نکلی اور اب اس فکر میں رہنے لگے کہ کوئی موقع پائیں تو انشا کو زندہ دیں۔ انشا کی بات بات کی گرفت ہونے لگی اور سخت سزائیں اور تکلیفیں اُن کے واسطے تجویز کی جانے لگیں حکم ہو گیا کہ سوائے ہمارے کسی امیر کے یہاں ہرگز نہ جاؤ۔ یہ نظر بندی اُن کے واسطے قید بے زنجیر تھی۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ جو ان لڑکا تعالیٰ اللہ خاں مرگیا جس سے اُن کی کرٹوٹ گئی۔ آخر میں ایک تہواری کیفیت بھی پیدا ہو گئی تھی جس کی ایک عبرتناک کیفیت میاں رنگین کی زبانی آج حیات میں بیان کی گئی ہے۔ اسی انشا و میں تنخواہ بھی بند ہو گئی تھی جس سے فادہ کی نوبت پہنچ گئی

اے آزاد نے انشا کے متعلق خصوصاً اُن کے مجنون ہو جانے اور اڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کی بہت سی روایتیں بیان کی ہیں جو پائے تحقیق کو نہیں پہنچتیں اور بہت سی روایتیں مستند طور پر غلط قرار پائی ہیں۔ حیات دیر کے مصنف نے مرزا داؤد کی زبانی لکھا ہے، جو میر انشا، اللہ خاں کے (بقیہ حاشیہ پشت پر ہے)

تھی۔ وہ شخص جو کبھی چمکتا ہوا بلبل بادشاہ کی ناک کا بال اور اپنے دوستوں کی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور تھا بالآخر اسی خراب صحبت اور فقر و فاقہ کی حالت میں اس دار فانی سے چل بسا۔ یہ واقعہ ۱۲۳۳ھ کا ہے۔ جیسا کہ نسبت سنگھ نشاٹکی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے

خبر انتقال میر انشا	دل غمیدہ تا نشاٹ شغفت
سال تاریخ اوز جان اجل	» عمرنی وقت بود انشا « گفت

اُن کے کلام کی خصوصیات | انشا کو زبان پر بڑی قدرت حاصل تھی انھوں نے تو سب زبان کا کام جو مرزا رفیع سودا نے شروع کیا تھا جاری رکھا۔ انشا پہلے ہندوستانی شخص ہیں جنھوں نے زبان اردو کی صرف و نحو مدون کی اور جس تحقیق و تلاش اور محنت سے اپنی مشہور کتاب دریائے لطافت مرتب کی اُس سے اُن کا پایہ استاد بلند ہوتا ہے اس میں شک نہیں کہ ان کے کلام میں ہمواری اور استقامت نہیں ہے مگر اُن کا اچھا کلام یقیناً بہت قابل قدر بلکہ قابل استناد ہے اُن کے مختلف اصناف سخی سے پایا جاتا ہے کہ وہ زبان کو وسعت دینے کی غرض سے بہت سے تجربے کرنا چاہتے تھے اگر وہ اپنی طبیعت اور زبان پر قابور کھتے تو یقیناً وہ زبان اردو کے بڑے پیارے استاد سمجھے جاتے۔ انشا کی خاص خصوصیات یہ ہیں (۱) ظرافت۔ مذاق اور ظرافت میں ان کا ہم پایہ شعراے اردو میں سوائے سودا کے اور کوئی نہیں ہوا۔ ان کی روزمرہ کی گفتگو اور کلام نظم و نثر دونوں مذاق اور ظرافت سے بھرے ہوئے ہیں (۲) جامعیت ان کی طبیعت ایسی تھی جیسے ایک ترشا ہوا لکینہ

نوا سے تھے کہ سید انشا نہ مجنون ہوئے اور نہ اُن کی تنخواہ بند ہوئی صرف اتنا سمجھ ہے کہ نواب سعادت علی خاں نے حکم دیدیا تھا کہ وہ سودا کے اور کہیں نہ آئیں جائیں اور دربار میں بھی بغیر بلا سے حاضر نہ ہوں معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانہ میں انشا مصطفیٰ میں جھگڑا ہوا اور جو تک نوبت پہنچی تو نواب وزیر نے انشا کو لکھنؤ سے چلے جانے کا حکم دیدیا تھا۔ وہ حیدر آباد گئے چند دنوں کے بعد نواب وزیر نے پھر بلایا (تذکرہ خازن اشعار)

جس کے مختلف پہل ہوتے ہیں۔ ان میں خاص صفت یہ تھی کہ ہر قسم کے مضامین کو اپنے رنگ میں ڈھال لیتے تھے۔ (۳) علم و فضل معلوم ہوتا ہے کہ مشکل مشکل مضامین علمیہ اپنے دماغ کے چھپے ہوئے گوشوں سے ایک لمحہ میں حاضر کر سکتے تھے اور اپنے دعوے کے ثبوت میں کوئی ایسا پر لطف قصہ یا دلیل یا شعر یا کوئی دوسری سند اس خوبی سے پیش کرتے کہ حریف اُس کو فوراً تسلیم کر لیتا (۴) نہایت ذہین اور طب سارع تھے اور اُن کی قوت تخیل بجلی سے تیز تھی (۵) فارسی اور عربی کے فاضل زبردست تھے اور ان دونوں زبانوں میں اُن کے اشعار کا بہترین نمونہ موجود ہے۔ ان کے علاوہ ترکی۔ پشتو۔ پوربی۔ پنجابی۔ ماڑواڑی۔ مرہٹی۔ کشمیری اور ہندی بھی خوب جانتے تھے اور ان سب میں شعر کہہ سکتے تھے۔ غرض کہ ایک بہت زبردست اور قابل زبانہ انداز تھے تفہیم بھی خوب کرتے تھے۔ نہایت تیز و طرار طبیعت پائی تھی۔ اور مشکل اور نئی نئی چیزوں میں اُن کو بڑا لطف آتا تھا۔ ایک مختصر دیوان صنعت غیر منقوطہ میں لکھا ہے بعض نظموں میں دوسری صنعتیں بھی دکھائی ہیں مثلاً داسع الشفقتین یا دلسائین وغیرہ اُن کو اردو کا امیر خسرو کہنا بجا ہے ان کو مشکل بھریں اور مشکل زمینیں بہت پسند تھیں اور اس میں اپنی زبان دانی کی قوت دکھائی ہے۔ ان کے بعض توانی بہت غیر معمولی اور دشوار ہوتے ہیں اور گوکہ بہت ہوشیار می سے نظم کیے ہیں مگر پھر بھی کانوں کو ٹہرے معلوم ہوتے ہیں کیونکہ غزل کے واسطے وہ موزوں نہیں ہیں ظرافت اور مذاق جو ان کا خاصہ ہے بعض اوقات اُس کی اتنی کثرت ہو جاتی ہے کہ مہذب طبیعتوں پر گر ان گزرتا ہے اور شعروں میں ندرت اور خوبصورتی پیدا کرنے کے بجائے اُس کو مہمل اور بھونڈا کر دیتا ہے۔ ظرافت کی کثرت شاید اس وجہ سے کی گئی ہو کہ اُس زمانہ کے لوگوں کو جن کا مذاق بہت گر گیا تھا یہ رنگ بہت اچھا معلوم ہوتا تھا۔ اسی وجہ سے ان کا مذاق لطافت اور تہذیب سے خالی ہے اور اسی تعلق سے اس عہد میں ریختی کی بنا پڑی جس کا موجد اور مخترع انشاء

اور رنگین کو سمجھنا چاہیے۔ انشا کی بے ہنگام ظرافت نے تصوف ایسی مقدس اور پاک چیز کو نہ چھڑا چنانچہ اگر کسی کو تصوف اور مذاق کا بے جوڑ میل دیکھنا منظور ہو تو وہ اُن کی شنیعی شیر برنج دیکھ لے۔

انشا کی خاص صفیتیں یہ ہیں۔ زبان پر قدرت۔ ہمہ گیر طبیعت۔ ہر صفت شاعری میں مہارت۔ اعلیٰ قابلیت۔ قوت ایجاد و اختراع۔ وطن کی روایات قدیمہ سے محبت اور مذاق و ظرافت۔ انشا نے ستودا کی طرح مگر ان سے کسی قدر محدود درجہ پر ہندوستان کی تخیل اور تلمیح سے اپنی غزلوں میں بہت کام لیا ہے ان کا طبع اعیب یہ ہے کہ انھیں تناسب کا صحیح اندازہ نہیں ہے اور اسی وجہ سے وہ صاحب رائے قائم کرنے میں غلطی کر جاتے ہیں۔ ان کے کلام میں ہمواری نہیں ہے غزلوں میں خیالات کی قلت اور الفاظ کی کثرت پائی جاتی ہے جس کی وجہ شاید اُن کی مشکل زمینیں اور توانی ہوں قصیدہ اور غزل گوئی میں وہ معمولی قواعد شعر سے بے پروائی کرتے ہیں۔ اظہار ظرافت پر بھی قابو نہیں رکھتے نواب اور اُن کے عیش پرست درباریوں کے خوش کرنے کے لیے کبھی کبھی محسوس سے بھی اپنی زبان خراب کرتے ہیں یہ عیب ان کا خاص نہیں بلکہ اُس زمانہ کا عیب ہے یہی حال عہد رسیدو لہٹن کے انگریزی شعرا کا تھا۔ جن کا کلام اُس زمانہ کی خراب سوسائٹی کا آئینہ ہے۔ انشا نے شعر گو اپنے نواب کے خوشی کے ماتحت کر دیا تھا وہ شعر کے بلند درجہ پر کبھی فائز نہیں ہوئے۔ شاعری ان کے واسطے حصول غرض کا ایک ذریعہ تھی اُن کا کوئی اعلیٰ مطمح نظر نہ تھا اور نہ کوئی بینام اُن کو پہونچانا تھا۔ درباری شاعر بن کر اُن کو معقول سزا ملی جب کہ اُن کے مسخرے بن کی باتوں اور ہزل و ہجو پر انعام و اکرام ملتے تھے اور ان کی قدر ہوتی تھی تو پھر اعلیٰ شاعری کی کوئی وجہ بھی نہ تھی۔ وہ ایسے زبردست طبیعت کے پاک باطن بھی نہ تھے کہ اپنے زمانہ کے رنگ اور گرد و پیش کے حالات سے متاثر نہ ہوتے۔ بہر طور جو کچھ لکھا ہے وہ سب بیکار اور خراب بھی نہیں ہے

اُن کے کلام میں جا بجا نہایت بیش بہا جواہر بھی ملیں گے جو مرتبہ میں کسی سے کم نہیں
 اِن کا قصیدہ جو جامعِ سوم کی تعریف میں ہے وہ نہایت اعلیٰ درجہ کا ہے۔ یہ انشا
 اور ان کی شاعری کے متعلق میاں بیاب کا چھٹا ہوا جملہ یاد رکھنے کے قابل ہے
 اور وہ یہ ہے کہ انشا کے علم و فضل کو اُن کی شاعری نے کھویا اور ان کی شاعری کو نواب
 سعادت علی خاں کی دربار داری نے ڈبویا اگر کسی کو انشا کے مفصل حالات دلچسپ
 لطیفوں اور چٹکوں کے ساتھ دیکھنا منظور ہوں تو وہ آسمیات میں اُن کا حال پڑھے۔
 تصانیف | ان کی تصانیف حسب ذیل ہیں۔

کلیات جس میں مندرجہ ذیل چیزیں شامل ہیں :-

(۱) ایک دیوان اردو غزلوں کا جس سے زبان پر اُن کی پوری قدرت معلوم
 ہوتی ہے مگر سہواری نہیں ہے فصیح الفاظ، عمدہ محاوروں پرست ترکیبوں کے ساتھ
 یہ عیب بھی ہے کہ کہیں کہیں قواعد شعر کی خلاف ورزی ہو گئی ہے۔ بعض اشعار فی الواقع
 بہت اعلیٰ درجہ کے ہیں۔ اور نظم اردو کے بہترین نمونے کہے جاسکتے ہیں۔

(۲) دیوان ریختی جس کے آخر میں کچھ ستراد اور پہیلیاں اور طلسمات بھی ہیں۔

(۳) قصائد اردو و فارسی۔ جو حمد و ثناء اور منقبت ائمہ معصومین اور مختلف
 اشخاص کی تعریفوں میں ہیں اُن میں زبان پر قدرت اور الفاظ کی شان و شکوہ بہت
 پائی جاتی ہے مگر قواعد کا خیال کم کیا گیا ہے بعض جگہ مذاق اور ظرافت کے ساتھ
 نازک خیالی بھی خوب ہے اور عربی فارسی ترکی اور دیگر زبانوں کے شعر بھی شامل کئے
 گئے ہیں۔ کہیں کہیں ان کو پڑھ کر ہنسی آتی ہے جو قصیدہ کی شان کے خلاف ہے۔

(۴) دیوان فارسی کا بھی یہی حال ہے گویا زبان کا زور اور لطف بہت کچھ ہے
 مگر اکثر جگہ صرف مسخرائیں ہیں اور کچھ نہیں۔ اگر اپنے رفیقِ طبعی یعنی مسخر کو چھوڑ کر
 ٹھوڑی دیر کے لیے ضبط سے کام لیتے تو اُن کا پایہ شاعری بہت بلند ہوتا۔

(۵) ایک فارسی مثنوی موسوم بہ شیر و پریخ جرمولانا روم کی مشہور مثنوی کی بحر میں اور اسی طرز پر لکھی گئی ہے اور جس میں مسائل روحانیت و تصوف کو مذاق کے پیرایہ میں بیان کیا ہے مولانا آزاد نے خوب لکھا ہے کہ کھیر (شیر و پریخ) میں نمک ڈال کر تصور کو تنفر کر دیا ہے۔

(۶) ایک مثنوی بے نقط جس کی سرخیاں بھی بے نقط ہیں مثلاً "حمد" کے موقع پر لکھتے ہیں کہ "لوحہ در حمد مالک الملک" "نعت" کے واسطے "لوحہ در مدح سرور کل" "منقبت" کے واسطے "لوحہ در مدح سوار دل دل" بادشاہ کی تعریف کے لیے "لوحہ در مدح حاکم عصر" وغیرہ وغیرہ یہ سب سرخیاں بھی موزوں ہیں۔ اس سے ہم دو بے نقط شعر نقل کرتے ہیں جس سے نمونہ کلام کے علاوہ تاریخ تصنیف بھی معلوم ہو جاتی ہے۔

لوح سال کلام مسطور

دُر در سلک کلام کردم	گردِ کرمِ آتہ کردم
کردم سال و سال محشر	طور الا سیرار دہ سطر گوہر

(۷) مثنوی شکار نامہ جو نواب سعادت علی خاں کے حکم سے ان کے شکار دھڑہ کے بیان میں بقید تاریخ بطور روزنامہ کے لکھی گئی تھی اسکی نظم بہت چسپ اور ترکیبیں بہت چست ہیں تاریخ کے یہ دو اشعار بطور نمونہ دیے جاتے ہیں۔

قطعہ در تاریخ

موج ظفر موج بایں عز و جاہ	گردِ سانید چو بروجِ ماہ
شوکتش آتشا بخطِ زدنوشت	فقہہ تاریخِ مظفر نوشت

(۸) ہجوئیں۔ گرمی۔ بھڑوں۔ کھٹکوں۔ کھٹیوں۔ پھردوں وغیرہ کی شکایت میں اور متفرق اشخاص کی ہجوئیں بمنزلہ جن کے میاں مصحفی کی ہجو جو بحر طویل میں ہے بہت دلچسپ ہے۔

(۹) مثنوی موسوم بہ شکایت زمانہ۔

(۱۰) چند مثنویاں جو عاشقانہ رنگ میں ہیں۔ اور ایک میں ایک ہاتھی اور چنچل پیاری تھنی کی شادی کا دلچسپ فسانہ ہے۔

(۱۱) ایک مثنوی زبان ماڑی ڈاڑی جس میں گیان چند سا ہو کار کی ہجو ہے ایک دوسری مثنوی موسوم بہ مرغ نامہ جس میں مرغبازی کے قواعد مذاق اور تمسخر کے ساتھ بیان کئے ہیں۔

(۱۲) مائے عامل عربی زبان فارسی۔

(۱۳) متفرق اشعار معربے، رباعیاں، قطعے، تاریخیں، پہیلیاں، چیتائیں وغیرہ

(۱۴) دیوان بے نقط

کافی ٹیخت ہندی میں | اس مضمون کے نام سے ایک کتاب نثر اردو میں لکھی ہے جس میں ایک لفظ بھی عربی و فارسی کا نہیں آنے دیا اور نہ کوئی لفظ سنسکرت یا ٹیٹھ ہندی بھاشا کا ہے اور باوجود اس کے زبان نہایت سلیس اور بامحاورہ اردو ہے مقدار میں تقریباً ۵۰ صفحے ہوں گے۔ اس کے اکثر حصے ان کتابوں میں نکل چکے ہیں جو نورٹ ولیم کالج کلکتہ کی طرف سے شایع ہوئی تھیں۔ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال

نے ان مطبوعہ کتابوں کے علاوہ دو کتابیں قلمی ابھی دستیاب ہوئی ہیں۔ جن کو سید اٹھانے نواب سعادت علی خاں کے حکم سے ان کی دلچسپی کے واسطے لکھا تھا۔ ایک کا نام لطائف السعادت اور دوسری کا نام بحر السعادت ہے۔ آخر الذکر کا دریاے لطافت سے بھی کچھ تعلق معلوم ہوتا ہے لیکن ہے کہ اس کا نقش اول ہو۔

نے عرصہ ہوا اس کو کئی جلدوں میں شایع کیا تھا۔ قصہ کا خلاصہ یہ ہے:-
 ایک راجہ تھا جس کا نام سوچ بھان تھا اور اُس کی رانی کا نام کبھی باس
 تھا۔ ان کے ایک لڑکا تھا جو اودے بھان کے نام سے مشہور تھا اور وہ ہی اس
 قصہ کا ہیرو ہے۔ ایک دن وہ بغرض سیر و شکار جنگ کی طرف نکل گیا۔ ایک مرنے
 کے پیچھے گھوڑا ڈالارات ہو گئی اور راستہ بھول گیا۔ ایک بارغ میں اُس نے چند
 خوبصورت لڑکیوں کو بھولا جھوتے دیکھا جن میں راجہ جگ پرکاش اور رانی کام
 لتا کی خوبصورت لڑکی رانی کیتکی بھی تھی۔ دونوں ایک دوسرے پر عاشق ہو گئے
 دن بدن رانی کیتکی کی سہلی اور ہراز نھی۔ اُس کے کہنے سے ان دونوں نے
 اپنی اپنی انگوٹھی ایک دوسرے سے بدل لی۔ کنور اودے بھان واپس آیا تو
 اُس کی حالت کیتکی کے عشق میں خواب ہو گئی۔ آخر شہر پہ راجہ اودے بھان
 کے باپ برنہا ہر بھاؤ اُس نے خادی کا پیام راجہ جگ پرکاش کو بھیجا جسے اُس نے
 بڑی حقارت سے رد کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں راجاؤں میں جنگ چھڑ گئی۔ رانی
 کے دوران میں کنور اودے بھان نے ایک ہالین پھول کلی کے ہاتھ ایک
 رقعہ رانی کیتکی کے پاس بھیجا اور غصہ بھاگ چلنے کے لیے اصرار کیا۔ رانی کیتکی
 کی غیرت نے اس کو قبول نہ کیا۔ جگ پرکاش نے دیکھا کہ فتح نصیب نہیں ہوتی
 تو اس نے اپنے گرو مندر گرد کو جو کیلاس پر بت (کوہ ہمالیہ) پر رہتا تھا اپنی لگ
 پر بلایا۔ اُس نے اپنے علم کے زور سے سورج بھان کو شکست دی اور کنور اودے بھان
 اور سوچ بھان اور ہمارانی کبھی باس ہرن دھرنی بن گئے اور کئی برس تک یوں ہی
 رہے۔ طے وقت گرد نے راجہ جگ پرکاش اور اس کی رانی کو ایک شیر کی کھال اور
 بھوت دی اور یہ ہدایت کی کہ اگر سیری ضرورت ہو تو کھال میں سے ایک
 بال نکال کر جلا دینا پس فوراً پہونچ جائیں گا اور بھوت اس لیے ہے

کہ جو کوئی چاہے اس کا اجنا لگائے وہ سب کو دیکھے اور اسے کوئی نہ دیکھے
 رانی کیتکی کو اپنے عاشق کی جدائی شاق تھی اور وہ نہایت پریشان و مضطرب
 تھی ایک روز چالاکی سے آنگٹھ بھولی کھینے کے بہانے اس نے بھبھوت مانگا
 اور اس کو لگا کر رات کو نکل گئی۔ اس کی سہیلی مدن بان کو جب یہ معلوم ہوا تو وہ
 بھی کیتکی کی تلاش میں بھبھوت لگا کر نکلی ایک عرصہ بعد دونوں کی ملاقات ہوئی۔
 مدن بان واپس آگئی اور رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی محبت کا راز
 راجہ جگ پر کاشش مدانی کام لٹا پر ظاہر ہو گیا جب یہ معلوم ہوا تو اس نے
 کھال کے بال سے مسند گر دکو بلایا اور کئی حالات بیان کئے دانی کیتکی اور
 اس کے ماں باپ اپنے ملک کو چلے گئے اور مسند گر کو نے تلاش کر کے
 کنور اودے بھان اور اس کے ماں اور باپ کو ان کی اصلی صورت میں کر دیا
 راجہ اندر نے بھی اس کام میں اس کی مدد کی تھی اور آخرش رانی کیتکی کی شادی بڑی
 شان و شوکت و تزک و اختتام سے کنور اودے بھان کے ساتھ ہو گئی

نمونہ کلام یہ ہے : اب اس کہانی کا کہنے والا یہاں آپ کو جانتا ہے
 اور یہاں کچھ اُسے لوگ بکارتے ہیں کہہ سکتا ہے اپنا ہاتھ منہ پر پھیر کر سوچوں پر
 تاؤ دیتا ہوں اور آپ کو جانتا ہوں جو میرے داتا نے چاہا تو وہ تاؤ بھاؤ
 راؤ چاؤ اور کو دیکھتا اور لپٹ جھپٹ دکھاؤں کہ آپ کے دھیان کا گھوڑا جو
 سبکی سے بھی بہت سچیل اچیل ہٹ میں ہے دیکھتے ہی ہرن کے روپ
 اپنی چوڑی بھول جائے چوٹکا

گھوڑے پر اپنے چڑھ کے آتا ہوں میں	کرتب جو جو ہیں سب دکھاتا ہوں میں
اس چاہنے والے نے جو چاہا تو ابھی	کہتا جو کچھ ہوں کر دکھاتا ہوں میں

دریائے لطافت پہلی کتاب قواعد اردو کی ہے جو ہمارے اہل زبان نے اردو کے

متعلق لکھی ہے۔ اس کا سہ تصنیف ۱۲۲۲ھ مطابق سنہ ۱۸۰۷ء ہے۔ اس کی تصنیف میں مرزا قاتل بھی شریک تھے۔ انشانے اس کا پہلا حصہ لکھا جس میں زبان اردو کی صرف و نحو کا حال ہے اس میں اول اردو بولنے والوں کی مختلف زبانوں کے نمونے دکھائے ہیں اور پھر قواعد بیان کیے ہیں۔ طرز تحریر میں وہی ظرافت اور تمخریج جو ان کے دم کے ساتھ ہے۔ دوسرا حصہ مرزا قاتل کی تصنیف ہے۔ اس میں عروض و قافیہ، منطق، معانی، بیان وغیرہ کا ذکر ہے۔ مرزا قاتل نے بھی اپنے دوست کی پیروی میں مذاق اور ظرافت کو ہاتھ سے نہیں دیا۔ مگر ہر بھی حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ بے لطف سے خالی نہیں۔ مثلاً قطع میں بجائے مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن کے پری خانم پری خانم پری خانم پری خانم لکھا ہے اور مفعول مفاعیلن مفعول مفاعیلن کی جگہ بیجان پری خانم۔ بیجان پری خانم۔ درج ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ دوسرا حصہ اتنا دلچسپ نہیں جتنا پہلا ہے۔ یہ انشا پہلے شخص ہیں جنہوں نے زبان اردو کی اہمیت اور اس کے قواعد مرتب کرنے کی ضرورت کو محسوس کیا تھا۔ انہوں نے صحیح محاورات لفظوں کی اصل اور تلفظ کی تحقیق و تلاش میں اپنا بہت سادقت عزیز صرف کیا اور بیگماتی اور محلات کی جو زبان لکھی ہے وہ بھی ہمارے واسطے دلچسپی سے خالی نہیں۔ انہوں نے بڑی محنت اور قابلیت سے اُس اثر کا بھی ذکر کیا ہے جو مختلف قومیں اور جماعتیں مشترکہ زبان اردو کی ترقی پر ڈالتی ہیں قواعد کو نہایت صفائی کے ساتھ اور مکمل طریقہ پر بیان کیا ہے اردو کے حروف تہجی اور انکی آوازیں کو نظر ثمن سے دیکھا ہے انکی رائے میں مجموعی آوازیں کی تعداد ۸۵ ہے۔ زبان کے مختلف شعبوں مثلاً پوری، ماڑی، اڑی وغیرہ کے نمونے دیے ہیں اور دکھایا ہے کہ ان کا اثر اردو پر کس طرح پڑتا ہے۔ یہ کتاب سوجہ سے بھی دلچسپ ہے کہ اُس میں بہت سے متروکات و دیگر ان کی جگہ مروجہ الفاظ کو بیان

کیا ہے۔ پوری کتاب کا طرز تحریر مذاق و ظرافت سے بھرا ہوا ہے مگر باد صفا اس کے وہ قدیم اردو گرامر کی حیثیت سے نہایت قیمتی چیز ہے۔
 غرض کل تصنیفات کی حالت مجموعی دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ انشائین حیات الادیب اور نیز من حیث انشاء عربت بلند پایہ رکھتے تھے۔ اُن کی تصانیف میں اتنا تنوع ہے کہ کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں۔ تصوف اور ایجادوں کے حاکم علی الاطلاق اور ظرافت و لطافت میں طاق و مشاق تھے چنانچہ اُن کا ایک قطعہ خندانہ جاوید جلد اول سے نقل کر کے بطور نمونہ ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے۔ فائق تخلص ایک شاعر تھا جس نے اُن کی ہجو کہی اور خود لا کر سنائی تھی۔ انھوں نے بہت تعریف کی اور پانچ روپے دیے اور یہ قطعہ بھی کہہ کر روپیوں کے ساتھ ساتھ اُس کے حوالہ کیا۔

فائق بے حیا چو ہجوم گفت	دل من سوخت سوخت سوخت بہ
صلہ اش پنج روپیہ وادم	دہن سگ بہ لقمہ دوختہ بہ

اس شاعر نے لفظ ید کو مشدد باندھا تھا انشائے اُس کے جواب میں بطور تعریض کے جو قطعہ لکھا ہے درج ذیل ہے:-

چہ خوش گفت فائق شاعر ہنرا	کہ چوں ذہن او ذہن رتا نباشد
یہ شعر نادر کہ در چند وزن	شود خواندہ و شک بمعنا نباشد
در ان لفظ ید را بدل مشدد	نوشت ست و این غلط اصلا نباشد
شنید این سخن را چو گرد سخن	ز افشا کہ ہمسر ش اصلا نباشد
بگفتا کہ من شاعر خوش فکرم	چو من ہیج معقل گویا نباشد
تو این گستاخ را ندانی درست	ترا ہیج شعور و ذکا نباشد
سند یاد از استاد دست مارا	بکلام ما ہیج خطا نباشد

چوتھیں در شعر ضرورت افتد | تشدید صحیح چسرا نباشد

جرات (سنی ۱۲۲۵ء) | جرات مختص۔ مشہور نام شیخ قلندر بخش۔ اصلی نام محی امان

تھا۔ ان کے والد کا نام حافظ امان ہے اور سلسلہ خاندان راے امان سے ملتا ہے جو محمد شاہ بادشاہ دہلی کے زمانہ میں دربار شاہی میں خدمت درباری پر مامور تھے۔ دلی میں کوچہ رائے مان انھیں کی طرف منسوب ہے اور یہ نادر شاہی حملہ دہلی ۱۷۳۹ء میں مارے گئے جرات کا زمانہ بچپن فیض آباد میں گذرا جیسا کہ میر حسن کے تذکرہ سے معلوم ہوتا ہے۔ وطن سے بہت کمسنی میں نکلے تھے۔ شروع میں نواب محبت خاں پسر حافظ رحمت خاں کی رفاقت کی چنانچہ خود کہتے ہیں:-
بسک گلچیں تھے سدا عشق کے ہم بتاں کے

ہوے نوکر بھی تو نواب محبت خاں کے

اس کے بعد ۱۷۵۵ء میں صاحب عالم و عالمیاں مرزا سیماں شکوہ کے حاشیہ نشینوں میں داخل ہوئے اور آخر تک لکھنؤ ہی میں رہے اور وہیں وفات پائی ناسخ اور نسخ دونوں نے وفات کی تاریخیں کہی ہیں۔ ناسخ کی تاریخ ہے ۱۷۵۵ء

جب میاں جرات کا باغ دہر سے	گلشنِ منیر دوس کو جانا ہوا
مصرع تاریخ ناسخ نے کہا	ہاے ہندوستان کا شاعر نوا

جرات مرزا جعفر علی حسرت کے شاگرد تھے۔ علاوہ فن شاعری کے نجوم میں ماہر اور فن موسیقی کا بھی شوق رکھتے تھے اور ستار خوب بجاتے تھے یہ انوس ہے جوانی

۱۔ مکی کے سرے پر جو ہر ڈنگ ہے اُس پر کوچہ رحمن لکھا ہے ۱۱

۲۔ بعد تان بغیر او کے پڑنا چاہیے ۱۲

۳۔ مرزا علی لطف اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں: "علم موسیقی میں مشغلہ بھلا چکا رکھتا ہے اور ستار کے بجانے میں نہایت دست در سار رکھتا ہے۔ نجوم میں بھی اس شخص کو دخل تمام ہے ایسا کہ ایک عالم لکھنؤ کا اس کا منظر احکام ہے۔ ۱۳"

ہی میں آنکھوں کی بنیائی جاتی رہی۔ بعض کہتے ہیں یہ حادثہ چھپک سے ہوا، بعض
 کچھ دوسری وجہ بتاتے ہیں۔ مولانا آزاد نے آب حیات میں اس کو بہت طول
 دے کر لکھا ہے مختصر یہ ہے کہ ہمارا نوجوان عاشق تزلج شاعر جنس نازک کی پُر لطف
 محبتوں کا بہت دلدادہ تھا۔ مگر پردے کے سبب سے شرفا اور امرا کے گھروں میں گھسنے
 نہیں پاتا تھا۔ ایک مرتبہ آشوب چشم کے بعد مشہور کردیا کہ میری آنکھوں کی بنیائی جاتی رہی
 اور مجھ کو اب کچھ نہیں سمجھتا اس بہانے سے ریسوں اور امیروں کے گھروں میں اندھا
 بن کے جانے لگا اور خوبصورت عورتوں کو چپکے چپکے لگا آ کر کارا بہی۔ اس
 بکاری کی پاوش میں سچ بچ اندھا ہو گیا۔

جرات زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے زبان عربی اور معمولی علوم و فنون سے ناواقف
 تھے مگر طبیعت بلا کی پالی تھی۔ شعر کا شوق ان کو خلقی تھا، کبھی فکر شعر سے غافل نہیں
 رہتے تھے میر حسن اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں "دیوانہ سخن شہر است کہ گاہے بے فکر
 نمی ماند۔ بیار در دمنده گذار است"

تصانیف | ایک دیوان اور دوثنویاں یادگار چھوڑی ہیں، دیوان میں عنبریں
 غزلیات رباعیاں، جنس، مہر، ہفت بند، ترجیع بند، داوخت، تارکینیں، ہجو
 سلام سریشے، سب کچھ ہیں ایک فالنامہ بھی ہے۔ دو مثنویوں کے آخر میں تارکینیں
 دی ہوئی ہیں ان سے ۱۱۹۹ھ اور ۱۱۹۲ھ نکلتے ہیں مثنویوں میں ایک ۱۱۹۲ھ صفحہ ۲۲
 اور دوسری ۲۲ صفحات کی ہے ایک میں برسات کی ہجو اور سن تصنیف ۹۵ھ
 ہے۔ دوسری ثنوی کا سن تالیف ایک تاریخ سے ۱۲۲۵ھ معلوم ہوتا ہے۔ اس
 کا نام "حسن و عشق" اور اس میں ایک بزرگ خواجہ حسن نام اور لکھنؤ کی ایک حسین
 رندی بخشی کے عشق کا ذکر ہے۔ اس کی زبان نہایت فصیح و پُر لطف اور کلام نہایت
 نکین و بامزہ ہے۔

جرات کی خصوصیات اور
ان کا مقابلہ میر کے ساتھ

جرات نے قصیدہ یا کسی دوسری شکل اور متین صنف
نظم کو اختیار نہیں کیا فارسی میں بھی کچھ نہیں کہا جیسا کہ
اس زمانہ کے ذی استعداد شعرا کا دستور تھا۔ وہ علی الخصوص ایسی محفل کے شاعر تھے
جہاں شراب ناب کے دور چلتے ہوں اور حسن و عشق کے چرچے ہوتے ہوں عاشقانہ
رنگ بلکہ اس میں بھی معاملہ بندی، ان کا خاص رنگ ہے اور اس میں انکو درجہ
کمال حاصل ہے۔ یہی معاملہ بندی بعض وقت زیادہ تفصیل کے بعد بخش کی سرحد
سے مل جاتی ہے اور ان کے اشعار کو مہذب صحبتوں کے لائق نہیں رکھتی باعتبار
رنگ کے ان کا اور میر کا کلام ملتا جلتا ہے۔ کیونکہ دونوں غزال تھے ان دونوں کا
رنگ عاشقانہ ہے مگر میر کے جذبات اور درد و اثر جرات کے یہاں مفقود ہیں میر عشق
اور جرات سطحی شاعر ہیں۔ ان کے یہاں معاشیق علی الخصوص معاشیق بازاری
کے ناز و کرشمے، عشاق کی حرام فیسی، ہجر کی مصیبتیں اور باریوں کی ایک دوسرے
کے ساتھ رقابت اور بے پروائی وغیرہ وغیرہ جو کچھ ایک عیش پرست دربار
اور عشرت طلب سوسائٹی کا تقاضا تھا۔ بہت خوبی اور بڑی کامیابی سے بیان ہوا
ہے غزل کے لیے ان کی طبیعت بہت مناسب واقع ہوئی تھی میر کے رنگ کو انھوں
نے اختیار کیا اور اس کی شیرینی اور فصاحت و بلاغت میں ایک ایسی چاشنی اور
شوخی اضافہ کی جس سے ان کا طرز علیحدہ ہو کر مقبول عام ہو گیا مگر اس میں بھی شک نہیں کہ
میں اور ان میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ میر کا تخیل بلند اور ان کا عاشقانہ رنگ بہت
اعلیٰ اور ارفع قسم کا ہے جرات کا عشق مادی اور ادنیٰ درجہ کا ہے۔ میر کے قدردان
اہل دل سخن شناس اور جرات کے ولادہ عوام الناس ہیں۔ سچ پوچھئے تو اصلی فرق
دونوں کی طبیعتوں کا ہے۔ میر میں منانیت، خود داری، استغراق اور گوشہ نشینی تھی
اور وہ شاعری کو ایک نہایت معزز اور مقدس کام خیال کرتے تھے۔ برخلاف

اس کے جرات ایک حریف ظریف شہنشاہ بننا شروع ہوئے تھے ہمیشہ
 صحبت کے متلاشی اور شاعری کو ذریعہ معاش اور جلب زر کا ایک زبردست
 آلہ سمجھتے تھے اور شعر کے ذریعے سے اپنے تمیزیں اپنے مرتبوں اور سرپرستوں کا ایک
 دلچسپ کھلونا بنائے ہوئے تھے اور ان کے دل کو خوش کر کے ان سے کچھ اینٹھنا
 جانتے تھے۔ ان میں تیسرا اور انشا کا ایسا علم و فضل اور قواعد شعر سے دیسی واقفیت
 نہ تھی مگر پھر بھی ان کا ایک طرز خاص ہے اور ان کے کلام میں ایسی سادگی اور
 مزہ ہے جو عام دلوں کو بہت مرغوب ہے۔ میر نے جو رائے ان کی غزلوں کی نسبت
 ظاہر کی تھی وہ سننے کے قابل ہے اور بہت صحیح ہے۔ مرزا محمد تقی خاں ترقی کے مکان
 پر ایک مشاعرہ تھا جس میں شہر کے سب نامی رئیس اور شاعر جمع تھے تیسرا اور جرات
 بھی تھے۔ جرات نے جو غزل پڑھی اس پر بہت واہ واہ ہوئی اور بہت تعریفیں ہوئیں
 وہ ازراہ تجزیہ یا شوخی سے جو کچھ سمجھے، میر صاحب کے پاس آئے اور اپنے کلام
 کی داد چاہی، میر صاحب نے دو ایک مرتبہ تو ٹالا مگر جب انھوں نے زیادہ اصرار
 کیا تو تیوری چڑھا کر فرمایا: ”تم شعر کہنا کیا جانو اپنے چوما چائی کر لیا کرو“ مختصر یہ کہ
 جرات کا پایہ شاعری بہت بلند نہیں، دربار کے توسل نے انکو بھی مٹایا جیسا کہ
 انشا کو مٹایا تھا پھر بھی انشا کو ان کے علم و فضل نے بچا لیا۔ ان کا توبہ بھی سہارا نہ
 تھا۔ جرات نے زبان یا نظم اردو کی ترقی میں بھی کوئی حصہ نہیں لیا جو شاہراہ نقیضین
 قائم کر گئے تھے اسی پر آنکھیں بند کر کے چلے گئے۔ کہا جاتا ہے وہ عاشقانہ رنگ
 کے موجد ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ دعویٰ صرف اس حد تک صحیح ہو سکتا ہے
 کہ انھوں نے سب سے پہلے بگڑے ہوئے عام مذاق کی پیروی کی اور ایک ایسا
 رنگ اختیار کیا جس کی تکمیل متاخرین میں۔

جرات اور داغ | نواب مرزا خاں داغ کے ہاتھوں ہوئی۔ ان دونوں

شاعروں میں باعتبارالفاظ اور معنی دونوں کے فی الواقع بہت مماثلت اور مشابہت ہے
 مصحفی (۱۲۲۰ھ تا ۱۲۳۰ھ) شیخ غلام جہدانی نام۔ مصحفی تخلص۔ شیخ دلی محمد کے
 بیٹے امروہہ کے رہنے والے تھے آغاز جوانی میں وطن چھوڑ کر ۱۱۹۵ھ میں دلی آئے
 جہاں تکمیل علوم کی اور شعرو سخن کی طرف مائل ہوئے۔ ان کو پڑھنے کا اس قدر شوق
 اور کتب بینی سے اس قدر ذوق تھا کہ کتابیں عاریت لے لے کر پڑھتے تھے اور
 بطور خلاصہ اپنی یادداشت کے طریقہ پر لکھتے جاتے تھے انھوں نے ۱۱۹۵ھ
 ہی میں شعر گوئی میں شہرت حاصل کر لی تھی کیونکہ مذکورہ میر حسن میں ہکا ذکر عزت کے
 ساتھ کیا گیا ہے۔ خود شاعر بھی کرتے تھے جن میں معزز شعر ار مثل انشا اور میر حسن
 اور جرات وغیرہ کے جمع ہوتے تھے۔ بارہ برس دلی میں رہ کر مثل اور شعرا کے لکھنؤ
 آئے جب کہ نواب آصف الدولہ سرسارائے حکومت تھے۔ لکھنؤ میں انھوں نے مستقل
 قیام کیا اور شاہزادہ مرزا سلیمان شاہ کے ملازم ہو گئے۔ لکھنؤ آنے سے پہلے
 کچھ دنوں ٹانڈہ میں نواب محمد یار خاں کے پاس رہے تھے لکھنؤ تھوڑے دنوں رہ کر
 پھر دلی چلے گئے مگر کچھ دنوں کے بعد آب و دانہ کی کشش ان کو پھر لکھنؤ کھینچ لائی۔
 آزادی تحقیق کے موافق ۱۲۳۰ھ میں تقریباً اسی برس کی عمر میں انتقال کیا جبکہ
 آٹھواں دیوان ترتیب دے رہے تھے۔ شیفہ بھی اپنے گلشن بنیاریں، جو
 ۱۲۳۵ھ کی تصنیف ہے لکھتے ہیں کہ ان کو مرثیہ دس برس ہوئے۔ حسرت موہانی اپنے
 تذکرہ میں ان کا سن ولادت ۱۲۳۰ھ لکھتے ہیں۔ لہذا مرثیہ وقت انکی ۶۷ برس کی ہوگی
 تصانیف | مصحفی اردو اور فارسی دونوں کے پرگوشاعر تھے ۱۲۴۷ء کے پہلے
 انھوں نے دو دیوان فارسی مرتب کئے تھے ایک نظیری نیشاپوری کے جواب
 میں۔ اور دوسرا اپنی طبع اور غزلوں کا مجموعہ۔ ان کے علاوہ دو اور فارسی
 دیوان بھی لکھے ایک ناصر علی کے رنگ میں اور دوسرا جلال امیر کے انداز میں

یہ دونوں دیوان چوری گئے۔ اب ان کا صرف ایک دیوان فارسی مرقع ہے جس کا ذکر سب تذکرہ نویسوں نے کیا ہے۔ ایک تذکرہ فارسی شعرا کا اور ایک اردو شعرا کا فارسی زبان میں لکھا۔ شاہنامہ کا ایک حصہ بھی لکھا ہے جس میں شاہ عالم کے خاندان تک کے حالات درج ہیں۔

تذکرہ شعراء اردو مصنف کی شہرت زیادہ تر ان کے ضخیم اردو دیوانوں اور تذکرہ پر مصنف ۱۷۹۷ء یعنی ہے آٹھ اردو دیوان ان کی یادگار ہیں جن میں ہزار ہا غزلیں، قطعے، قصائد وغیرہ سب کچھ موجود ہیں۔ تذکرہ شعراء اردو و حوزہ زبان فارسی میں ہے ۲۰۹ صفحہ مطابق ۱۷۹۷ء میں ترتیب پایا۔ اور اب ملتا ہے۔ یہ نہایت مفید کتاب ہے اور اس میں تقریباً ساڑھے تین سو شعرا کا ذکر ہے جو محمد شاہ کے زمانہ سے لے کر مصنف کے زمانہ تک تھے انھوں نے اپنے معاصرین کا خصوصیت کے ساتھ مفصل ذکر کیا ہے اور کلام کے نمونے بھی دیے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ تذکرہ ان کے شاگرد میر حسن خلیق خلف میر حسن کی خاص فرمائش سے لکھا گیا تھا۔ یہ بھی مشہور ہے کہ مصنف کے آٹھوں دیوان اور دونوں تذکرے بھوپال میں کسی صاحب کے پاس موجود ہیں۔

خصوصیات کلام سب سے بڑی صفت مصنفی میں یہ تھی کہ وہ نہایت زود گو تھے جب وہ شعر کہتے تھے اور قلمبند کرتے جاتے تھے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی کتاب سے نقل کر رہے ہیں۔ مشاعروں کے لیے بکثرت غزلیں کہہ سکتے تھے معمولی غزلیں خریداروں کے ہاتھ بیچ ڈالتے اور منتخب اشعار اپنے لیے رکھ لیتے تھے کہا جاتا ہے کہ اسی زود گوئی یا پُر گوئی سے ان کے کلام میں ناسمجھاری پیدا ہو گئی کیونکہ پُر گوئی نے زیادہ جانکاہی اور غور و فکر کا موقع نہیں دیا۔ دوسری خصوصیت ان کی یہ ہے کہ وہ مسلم الثبوت جگت استاد تھے۔ اور بڑے بڑے استاد ان کے ہم

تلمذ سے وابستہ تھے مثلاً میر سخن خلیق ضمیر آتش شہیدی جیشی وغیرہ بلکہ اگر پرچ
 پو چھپے تو ان کے زمانہ کے بعد کے اکثر شعرا و بالواسطہ یا بلا واسطہ انھیں کے شاگرد تھے
 ناسخ کی نسبت مشہور ہے کہ انکو کسی سے فخر تلمذ حاصل نہ تھا مگر وہ بھی محمد جیسی تنہا
 کے ذریعہ سے جو مصحفی کے شاگرد و شید تھے، اسی مادہ سخن کے ریزہ چسپ ثابت
 ہوتے ہیں جیسا کہ خود مصحفی نے اپنے چھٹے دیوان کے دیباچہ میں ان کی نسبت لکھا
 ہے۔ اس سے بڑھ کر ثبوت مصحفی کے کمال فن کا کیا ہو سکتا ہے کہ جتنے استاد
 ان کے شاگردوں میں نکلے اتنے اور کسی کو نصیب نہیں ہوئے تیسری خصوصیت
 یہ ہے کہ قواعد نظم کے یہ نہایت سخت پابند رہے اور شتر گریہ کے عیب سے جو میر و
 سودا ایسے استادوں کے یہاں بھی پایا جاتا ہے، ان کا کلام پاک ہے۔ ناسخ نے اور
 بھی اس اصلاح کے آئین کو درجہ تکمیل پر پہنچایا۔ مگر ان کے کلام میں رطب و یابس
 شامل ہونے کی وجہ سے ہمواری نہیں ہے۔ کہیں میر تقی میر کا درد گداز ہے کہیں سودا
 کی بلند پروازی، کہیں فغاں کی رنگینی کہیں میر سون کی سادگی کسی میں جرأت کی شوخی
 اور کہیں کہیں انشا کا بھی رنگ ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کا کلام اعلیٰ درجہ کا
 قدما کے رنگ کا بھی بہت ہے مگر زیادہ تر غزلیں معمولی ہیں اور کسی خاص رنگ کی نہیں
 ہیں بعض غزلوں کی زمینیں سودا کے تشبیح میں نہایت سخت اور ردیف و قافیہ شکل
 رکھے گئے ہیں اور گولہ ان میں شاعری کا کمال دکھایا ہے مگر پھر بھی سودا کا ساز و دار
 استاد ہی نہیں پائی جاتی اگرچہ میر تقی اور میر سونہ کے تشبیح میں بہت سے اشعار سادہ
 اور فصیح اور دردناک لہجہ میں کے ہیں مگر پھر بھی مذکورہ بالا استادوں کی وہ بات کہاں
 مختصر یہ کہ غزل میں ان کا کوئی خاص رنگ نہیں اور بعض اشعار کی عمدگی کو من اولہ الی
 آخرہ نباہ نہیں سکتا یہی حال ان کے قصیدہ کا بھی ہے جن میں قواعد کی پابندی
 اور الفاظ و معانی کی بلندی تو ضرور ہے مگر مفہوم میں گانور اور شان و شکوہ پیدا

نہیں ہو سکا چند شنویاں بھی لکھی ہیں جن میں ایک ”بحر المحبت“ میر کی شنوی ”دیئے شوق“ کے رنگ میں بلکہ اُسی کی نقل ہے قصہ کا مضمون اور طرز عبارت وغیرہ سب اُسی ملتے جلتے ہیں۔

مختصر یہ کہ مصحفی کے کلام میں کوئی خاص بات نہیں، وہ متقدمین کے پیرو تھے اور نہایت زود گو اور پر گو تھے مختلف اصناف سخن پر انھیں کمال حاصل تھا لکھی خصوصیات انکی یہاں جرات سے زیادہ اور آتشا سے کم ہیں۔ نہ تخیل میں بلندی ہے نہ جذبات میں دلکشی ہے۔ الفاظ بھی بعض جگہ ایسے لکھ گئے ہیں جو اب متروک ہو گئے۔ زبان میں اکثر جگہ میر و سودا کی پیروی ہے گو کہ زمانہ انشا اور جرات کا پایا تھا مصحفی اور سید انشا کے معرکے | مصحفی اور سید انشا کے معرکے نہایت مشہور ہیں جن میں مختلف ہجوع اور مذاق و سحر سے، جو ب اوقات فحش کی حد تک پہنچ جاتا تھا۔ بہت کام لیا گیا ہے یہ واقعات نہایت تفصیل کے ساتھ آبجیات میں درج ہیں اگر کسی کو دیکھنا ہوں تو اس کتاب میں دیکھنا چاہیے یہاں بھی مختصر ابصاراق مشے نمونہ از خردارے لکھے جاتے ہیں۔ ابتدا اس واقعہ کی یوں ہوئی کہ میاں مصحفی پہلے شہزادہ سلیمان شکوہ کے کلام پر اصلاح دیتے تھے جب سید انشا پہنچے تو انکے سامنے ان کا رنگ کب جم سکتا تھا چنانچہ اب غزلیں ان کے پاس آنے لگیں جس سے مصحفی کو بڑا قلق ہوا اسی آشنا میں ان کی تنخواہ بھی کم کر دی گئی جس کے متعلق انھوں نے ایک قطعہ لکھ کر شہزادہ موصوف کو گزرا نا جس کے چند اشعار یہ ہیں۔

چالیس برس کا ہی ہے چالیس کے لائق	تھامر دینر کہیں دس بیس کے لائق
اے وائے کہ بچیں سے اب پانچ ہیں اپنے	ہم بھی تھے کسی روز دل میں بچیں کے لائق
اتلو کا کرتے ہیں امیر اب کے مقرر	ہوتا ہے جو دریا بہ کہ سامیں کے لائق

مشاعروں میں بھی ہم طرح غزلوں میں نوک جھونک ہوتی اور ایک دوسرے

کانذاق اڑایا جاتا مثلاً ایک جلسہ میں میاں مصحفی نے غزل پڑھی جس کا مقطع تھا:-	
تھا مصحفی یہ مائل گریہ کہیں از مرگ	تھی اُس کی دھری چشم پہ تابوت میں نگلی
اس شعر کو انشانے پا اُن کے یار دوستوں نے اُلٹ دیا اور کہا۔	
تھا مصحفی کا نا جو چھپانے کو یس از مرگ	رکھے ہوئے تھا آنکھ پہ تابوت میں نگلی
اسی زمانہ میں مصحفی نے ایک غزل کہی تھی جس کا یہ مطلع ہے :-	
سر مشک کا ہے تیرا تو کافور کی گردن	نے سوئے پری ایسے نہ یہ حور کی گردن
اس غزل پر سید انشانے بہت سے اعتراض وارد کیے اور ایک قطعہ بھی نظم کیا غزل کا مطلع ہے۔	
توڑوں گا ختم بادہ انگور کی گردن	رکھ دو گنا وہاں کاٹ کے اک حور کی گردن
اور قطعہ اس طرح شروع کیا۔	
سن لیجئے گوش دل سے مری شفقانہ غن	باند بید عفتہ سے مت پھر تھرا بیٹے
بلور گود رست ہو لیکن ضرور کیا	خدا ہی خواہی اُس کو غزل میں کھپائیے
دستور و طور و نور یہ ہیں قافیہ بہت	اس میں جو چاہئے تو قصیدہ سنا بیٹے
کیا لطف ہے کہ گردن کافور باندھ کر	مرے کی باس زندوں کو لا کر سنگھائیے
اسی قسم کے اور بہت سے اشعار ہیں جن میں مصحفی کے زبانداں ہونے پر اعتراض کیا ہے۔ مصحفی نے جواب جواب اپنی غزل کی طرح میں دیا۔ اور انشا کی غزل میں جو	
ان کے نزدیک قابل اعتراض باتیں تھیں ان پر اعتراض جھائے مثلاً	
اے آنکہ معارض ہو مری تیغ زباں سے	تو نے سپر عذر میں مستور کی گردن
بے آدم خاک کی کا بنا خاک کا پتلا	گر نور کا سر ہوئے تو ہو نور کی گردن
لنگور کو شاعر تو نہ باندھے گا غزل میں	کس واسطے باندھے کوئی لنگور کی گردن
گردن تو صراحی کے لیے وضع ہے ناواں	بچا ہے چشم بادہ انگور کی گردن

اس مباحثہ اور مناظرہ کے بعد پھر تودہ پھڑ شروع ہوا جو دونوں آدمیوں کی تہذیب و متانت سے بہت دور تھا۔ فریقین کے شاگردوں نے اپنے اپنے استادوں کی پیروی میں وہ وہ طوفان اٹھائے کہ خدا کی پناہ ایک دن میاں مصحفی کے سب شاگرد اکٹھا ہوئے شہدوں کا سوانگ بھرا اور ہجو کہہ کر اس کے اشعار پڑھتے ہوئے سید انشا کے مکان کی طرف روانہ ہوئے۔ اور آمادہ تھے کہ مار پیٹ بلکہ کشت و خون سے بھی دریغ نہ کریں۔ سید انشا کو اس کی پہلے سے خبر ہو گئی تھی وہ نہایت متحمل اور سمجھدار آدمی تھے۔ بجائے ان لوگوں پر غصہ کرنے یا ان کا مقابلہ کرنے کے انھوں نے ان کی بہت خاطر و مداخلت کی ان کو ٹھائیاں کھلائیں۔ گوریان اور ہار پھول ان کے سامنے پیش کیے۔ اور اپنی ہجویں اپنے سامنے پڑھوا کر خود بھی بہت خوش ہوئے اور ان کو نہایت عزت و احترام سے رخصت کیا۔ مگر دوسرے دن جو جواب سید انشا نے تیار کیا وہ غضب کا تھا۔ ایک پُر تکلف بارات کی نقل بتائی جس میں ایک مجمع کثیر شامل تھا اور لوگ ڈنڈوں پر کچھ اشعار پڑھتے ہوئے اور ایک گزاد اور ایک گڑیا ہاتھ میں ہلاتے ہوئے جاتے تھے جس کا ایک شعر یہ ہے

سوانگ نیا لایا ہے دیکھنا چرخ کہن | لڑتے ہوئے آئے ہیں مصحفی مصحفی

ان معرکوں میں نہ صرف معمولی لوگ بلکہ اُس زمانہ کے معزز شعرائے لکھنؤ سب شامل تھے اور اس پُر فتنہ مذاق سے لطف اٹھاتے تھے۔ اکثر امرانے اور خواہکر مرزا سلیمان شکوہ نے سید انشا کا ساتھ دیا تھا۔ جس سے مصحفی کو بہت رنج ہوا چنانچہ انھوں نے اسی افسردہ دلی میں ایک غزل کہی جس کا مطلع و مقطع یہ ہے۔

جاتا ہوں ترے در سے کہ توقیر نہیں یاں | کچھ اس کے سوا اب مری تدبیر نہیں یاں
اے مصحفی بے لطف ہے اس شہر میں رہنا | سچ ہے کہ کچھ انسان کی توقیر نہیں یاں

ادھر مرزا سلیمان شکوہ کو یہ شبہ پیدا ہوا تھا کہ اس شکوہ و شکایت میں ہر سہم پر بھی

چڑھیں گی ہیں اور وہ ناراض ہو گئے تھے۔ مہتممی نے اس کی معذرت میں ان کے حضور میں ایک قصیدہ پیش کیا جس کا مطلع ہے۔

قسم بذات خدا یکہ ہے سیمع و بصیر | کہ مجھ سے حضرت شہ میں نہیں ہونی تقصیر

اس میں ممدوح کی عزت و شان اور اپنی بے حقیقتی کا مقابلہ کر کے کہتے ہیں کہ یہ ناممکن ہے کہ یہ نیکو اور قدیم حضور کی نسبت کوئی بڑا لفظ کہے۔ یہ انفرادی بے انشاد کا بنا یا ہوا ہے جس نے حضور کے مزاج کو مجھ سے منحرف کر دیا ہے۔ اس قصیدہ میں اپنی اور اپنے ساتھیوں کی بریت اور بے انشاد کی خطا ثابت کی ہے۔ مختصر یہ کہ میر کے بھی بحیثیت شعرو شاعری ایک یادگار معرکہ ہے ہر چند اس میں خلافت تہذیب نظمیوں کی گئی مگر پھر بھی یہ بہت دلچسپ اور اس زمانہ کی ایک خاص یادگار ہے۔

رنگین ۶۹ | سعادۃ یار خاں رنگین طہاسپ بیگ خاں تورانی کے

فرزند ارجمند تھے۔ سرہند میں پیدا ہوئے ان کے والد توران سے اگر چند دنوں لاہور میں حصین الملک میر منور خاں کی سرکاری ملازم رہے۔ اس کے بعد دہلی آئے جہاں پیشگاہ سلطانی سے منصب ہفت ہزاری اور خطاب محکم الدولہ اعتقاد جنگ بہادر عنایت ہوا۔ رنگین نے شاہزادہ مرزا سلیمان شکوہ کی ملازمت اختیار کر لی تھی وہ بہت اچھے شہسوار اور فنون سپہگری سے خوب واقف تھے۔ وکن میں نظام حیدر آباد کی فوج میں افسر توپ خانہ رہے لیکن بعد کو نوکری چھوڑ کر گھوڑوں کی تجارت کرنے لگے۔ انشاد کے وہ بڑے دوست تھے اور اکثر ان سے لکھنؤ میں ملا کرتے تھے اور اہل عمر میں شعر کہنا شروع کیا۔ اور سب سے پہلے شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے۔ مشہور ہے کہ میر صاحب سے اصلاح لینا چاہتے تھے مگر انھوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا امیر آدمی کے لڑکے ہونے کو شاعری نہیں آسکتی تمھارے لیے شہسوار کی ورزش وغیرہ مناسب ہے تم کو اس سے کیا واسطہ حاتم کے بعد وہ محمد امان نثار کو اپنا

کلام دکھاتے تھے اور جرمن مستشرق بلوم ہارٹ کی تحقیق ہے کہ مصحفی سے بھی اصلاح لیتے تھے۔ رنگین کو سیر و یاحت کا بہت شوق تھا اور نہایت عاشق مزاج واقع ہوئے تھے چونکہ امیر آدمی تھے حسین بھی تھے لہذا زندگی نہایت عیش و عشرت سے پریشوں کے جھلسے میں گزارتے تھے۔ بے انتہا خلیق متواضع اور مہذب آدمی تھے۔ ڈاکٹر اسپرنگر اور کریم الدین کی تحقیقات کے بموجب یہ انسی برس کی عمر میں ۱۲۵۱ھ میں فوت ہوئے۔ مگر شیفتہ اور گارسن ڈیٹاسی اُن کی عمر کا کسی اور سن وفات بارسو پر کما س بتاتے ہیں۔

تصانیف | (۱) مثنوی دلپذیر جس میں تقریباً دو ہزار شعر ہوں گے اس میں شاہزادہ ماہ جہیں اور رانی سری نگر کا قصہ ہے اس کا نہ تصنیف ۱۲۱۳ھ ہے جیسا کہ جرات اور انشا وغیرہ کی تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے۔

(۲) ایجا و رنگین۔ یہ بھی ایک مثنوی ہے اس میں فحش قصے اور دلچسپ حکایات ہیں۔

(۳) چار دیوان جن کے علیحدہ علیحدہ نام "دیوان ریختہ" "دیوان بختہ" "دیوان آمیختہ" "دیوان انگیختہ" ہیں اور مجموعاً ان چار دیوانوں کا نام "چار عنصر رنگین" ہے۔ (۴) مثنوی "منظر العجائب یا غرائب المشہور" اس میں بھی حکایتیں ہیں۔ (۵) مجالس رنگین یہ ان کی بہت مفید تصنیف ہے اور اس میں اپنے زمانے کے شعرا کا حال لکھا ہے اور اُن کے کلام کی تنقید بھی کی ہے۔

(۶) فرسارہ مصنفہ ۱۲۱۵ھ اس میں گھوڑوں کی شناخت نیک و بد اور اُن کے علاج وغیرہ کا ذکر ہے۔ پہلا دیوان ۱۲۱۵ھ میں تیار ہوا تھا جیسا کہ ایک تاریخ سے معلوم ہوتا ہے۔ اس میں ۲۲ صفحہ غزلیات ۲۲ صفحہ رباعیات اور دو منظوم خط اور ایک قصیدہ ۶۰ شعروں کا ہے۔ دوسرا دیوان ۱۲۴۹ھ صفحہ کاغذیات اور رباعیات

پر مشتمل ہے۔ تیسرے دیوان میں ان کے ہزلیات شامل ہیں۔ اور اسی میں ایک قصیدہ شیطان کی تعریف میں ہے۔ چوتھا دیوان ریختی کا ہے۔ اس کے دیباچہ میں مصنف نے مستورات کے خاص خاص محاورات اور عورتوں کی اصطلاحیں بیان کی ہیں اور نیز بد چلن عورتوں کی جنکو وہ عروس شیطان لکھتا ہے، بول چال درج ہے۔

ریختی سے کیا مطلب ہے | ریختی کے طرز میں ایک قسم کی دلچسپی ضرور ہے۔ مگر خرابی اور اس کی ایجاد کے اباب یہ ہے کہ اس میں اکثر غیر مہذب اور فحش آمیز اشعار

ہوتے ہیں۔ فساد کی رائے ہے کہ اس طرز خاص کے موجد میاں رنگین تھے۔ اور رنگین نے خود بھی یہ دعویٰ اپنی نسبت اپنے دیوان کے دیباچہ میں کیا ہے مگر غور سے دیکھا جائے تو یہ طرز قدیم شعرا علی الخصوص شعراے دکن میں بھی موجود تھا مثلاً مولانا ہاشمی بیجا پوری جو دکن کے ایک مشہور شاعر تھے اور مولانا قادری جو دلی کے ہم عصر تھے اور جن کا تخلص خاکي تھا اور جن کا دیوان ۱۷۵۲ء میں مرتب ہوا ہے ان لوگوں کے یہاں بھی ریختی کا پتہ چلتا ہے۔ مگر اتنا فرق ضرور ہے کہ ان قدیم شاعروں کی ریختی ایک خاص قسم کی تھی جس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ ان کے کلام میں بھاشا کا زیادہ اثر ہے لہذا اسی کے تتبع میں اظہار عشق عورت کی جانب سے اور اسی کے الفاظ میں کرتے ہیں بخلاف معمولی اردو کے جس میں اظہار عشق عموماً مرد کی جانب سے ہوتا ہے اسی وجہ سے اس قسم کی ریختی میں فحش اور ابتذال مطلق نہیں ہوتا۔ برخلاف انشا اور رنگین کے طرز کے جن کا دار و مدار عیاشی اور شہوت پرستی پر ہے۔ ان کی غرض عموماً یہ ہوتی ہے کہ ایسا کلام پڑھ کر لوگوں کو ہنسی آئے یا ان کے نفسانی جذبات میں ہيجان پیدا ہو۔ اسی وجہ سے اس قسم کی نظموں میں خلوص اور بلند خیالی یہاں تک کہ بے ضرر سادہ مذاق بھی نہیں ہوتا۔

یہ بات ضرور قابل غور ہے کہ ہمارے ملک میں عورتوں اور مردوں کی علیحدہ علیحدہ

زبان ہونے کے اسباب کیا ہیں۔ ان دونوں کی زبانوں میں صرف الفاظ و محاورات کا فرق ہوتا ہے۔ بعض الفاظ و محاورے مستورات کے لیے مخصوص ہیں جنکو عام طور پر مرد نہیں استعمال کرتے۔ ہمارے نزدیک اس خصوصیت اور فرق کی بڑی وجہ پردہ ہے جس سے اس ملک کی شریف گھرانے کی عورتیں غیر مردوں کے سامنے نہیں آسکتیں اور ان کے ساتھ بے تکلفی سے نہیں مل سکتیں اکثر پرانے خیال کے لوگوں میں تو پردہ کے بارہ میں یہاں تک سختی ہے کہ عورتیں اپنے غیر محرم رشتہ داروں تک سے پردہ کرتی ہیں۔ پس ایسی قید کی صورت میں لازم ہوا کہ عورتیں اپنے واسطے کچھ خاص اصطلاحیں اور محاورے مخصوص کر لیں۔ مثلاً مرد چونکہ آزاد تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ ہوتے ہیں لہذا وہ دوسری زبان کے الفاظ بے تکلف بولنے لگتے ہیں۔ عورتیں برعکس اس کے اپنے پردہ اور عدم تعلیم کی وجہ سے اپنی خالص زبان کی پابند رہتی ہیں۔ اور اس کی سہت اور بے میل رہنے کی حفاظت کرتی رہتی ہیں پھر چونکہ عورتوں کے مزاج میں فطرتاً قدامت پسندی اور تغیر نا آشنائی ہوتی ہے اس وجہ سے دوسری زبان کے ثقیل اور کٹھن الفاظ ان کو پسند نہیں آسکتے۔ مزید برآں ان میں چونکہ قدر تا شرم و حیا اور ضعیف الاعتقادی ہوتی ہے ایسے الفاظ ان کو ایک رمز و کنایہ سے اور خاص طریقہ سے وضع کرنا پڑتے ہیں جن کے نام لینے میں ان کو شرم و حیا مانع ہو یا دہم و خوف دامنگیر ہو۔ یہ تخصیص اصطلاحات و محاورات ظاہر ہے کہ ان گھرانوں میں بہت زیادہ ہے جہاں پردہ کی زیادہ سختی سے پابندی ہوتی ہے اس فرق مذکورہ بالا سے آفتا اور رنگین نے اپنے خاص اغراض کے لیے فائدہ اٹھایا۔ اور اپنی نواہی و طرز کا دار و مدار اسی مخصوص عورتوں کی زبان اور نیز عیاشی اور بد اخلاقی پر رکھا۔

رہنمائی اس زمانہ کی بگڑی ہوئی سوسائٹی کا بہترین آئینہ ہے جیکہ لکھنؤ کے عیش پسند

فرمانزدادوں اور امرا کی محفلوں میں عیش و عشرت اور حسن پرستی کا بازار گرم تھا اور بازاری عورتوں کا عشق و داخل فیش ہو گیا تھا۔ شہر کے نوجوان اور اس قسم کی بے اعتدالیوں سے متنبہ ہونے کے بجائے ان کو کھلم کھلا اور بلا خوف و لوم لائے عمل میں لاتے تھے ظاہر ہے کہ اس زمانہ کی نظم بھی ان کے جذبات اور ان کے مذاق کا آئینہ ہونا چاہیے۔ مگر حقیقت میں اس قسم کی ناشائستہ اور غیر مہذب نظمیں نہایت ہی مخرب اخلاق اور نوجوانوں کے حق میں سم قاتل ہیں چنانچہ خود افشار نے بھی اس قسم کے فواحش کے بُرے اثر کا ذکر ایک جگہ اپنے دریا سے لطافت میں کیا ہے بہر طور یہ طرز اُس زمانہ میں بہت مقبول تھا اور اُس کی ترقی کی سراج میر سیار علی التخلص بہ جان صاحب کے زمانہ میں ہوئی۔ جان صاحب سیرس کے بیٹے اور نواب عاشور علیخان کے شاگرد تھے۔ وطن اصلی لکھنؤ تھا مگر آخر عمر میں بسبب ملازمت زیادہ تر رامپور میں رہے۔ جان صاحب نے اپنی تمام عمر اسی خاص صنف میں بسر کر دی اور اپنی خاص مشیت میں خوب کچھ تھے شاعر دیں میں زمانہ لباس سے شریک ہوتے اور بالکل عورتوں کے طریقہ سے پڑھتے جس سے سننے والے سنتے سنتے لوٹ جاتے تھے ۱۸۴۷ء میں دئی گئے تھے۔ اور وہاں سے بتلاش روزگار بھوپال آئے مگر ناکام رہے آخر کار رامپور میں نواب کلب علیخان کے دامن دولت سے وابستہ ہو گئے اور یہیں رامپور میں کچھ اور پُرشہر برس کے سن میں ۱۸۹۷ء میں انتقال کیا

غرض کہ یہ صنف شاعری اب مقبول نہیں ہے اور مہذب جلسوں میں اس کو کوئی پسند نہیں کرتا البتہ مذاق و ظرافت کے وہ اشعار جو دائرہ تہذیب سے خارج نہ ہوں عام طریقہ سے پسند کیے جاتے ہیں۔

شاعر شاہان دہلی | آخر زمانہ کے شاہان دہلی شعرا کے مرنے بھی تھے اور خود بھی اچھے شاعر عالم ثانی خاصے شاعر تھے۔ مثلاً شاہ عالم ثانی جو آفتاب تخلص کرتے تھے تا ۱۸۷۷ء

تھے ایک مثنوی موسوم "پہ مضمون باقدس" کے مصنف ہیں جس میں ایک فرضی افسانہ مظفر شاہ بادشاہ چین کا ہے یہ مثنوی کا تاریخی نام ہے جس سے ۱۲۰۱ نکلتے ہیں اس مثنوی کے علاوہ ان کا ایک دیوان غزلوں کا ۲۲۲ صفحات کا ہے وہ فارسی بھی سمجھتے تھے چنانچہ ان کا فارسی دیوان بھی موجود ہے اور وہ قصیدہ حبیب نیکو ام غلام قادر کے ظلم و ستم کا اور اپنی آنکھیں نکالے جلنے کا ذکر کیا ہے بہت ہی دردناک ہے۔ بڑے بڑے شاعر مثلاً سودا، میر، نصیر، اعظم، انشا، راز، مومن، احسان اور فراق وغیرہ یہ سب ان کی سرکار کے دعا گو تھے۔

مرزا سلیمان شکوہ | شاہ عالم ثانی کے تیسرے بیٹے تھے۔ غلام قادر کی بغاوت متخلص بہ سلیمان کے بعد دہلی سکونت چھوڑ کر لکھنؤ چلے گئے اور مثل اپنے برادر بزرگ مرزا جواں بخت بہادر ولی عہد کے وہیں رہنے لگے۔ نواب آصف الدولہ بہادر نے انہیں اجاڑت کے لیے چھ ہزار ماہوار مقرر کر دیے تھے۔ نواب سعادت علی خاں اور غازی الدین حیدر شاہ تک ان سے جھک کر ملتے تھے اور نذرین دیتے تھے جب غازی الدین حیدر نے تاج شاہی پہنا تو ملاقات بدرجہ سادات چاہی شاہزادہ نے باقتضائے مصلحت وقت مرزا نصیر الدین حیدر ولی عہد سلطنت کے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی کر دی جنھوں نے سلطان بہو کا خطاب پایا۔ مگر شوہر دیوبند میں ناموافقت رہی۔ ۳۸ سال لکھنؤ میں رہ کر کالج اپنے پرانے دوست کرنل گارڈن کے پاس چلے گئے بعد کو اکبر آباد میں سکونت اختیار کر لی۔ اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں کئی بار دہلی آئے ۱۸۳۷ء میں انتقال کیا اور سکندرہ میں مدفون ہوئے شعرا کے بہت بڑے سرپرست تھے خود بھی اچھے خالص شاعر صاحب دیوان ہیں۔ ابتدا میں شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے اس کے بعد مصحفی اور انشا کو کلام دکھایا۔ دہلی سے

۱۱۰۱ نکلتے ہیں ۱۲

جو بالکل لکھنؤ جاتا پہلے ان کے یہاں حاضر ہوتا اور صاحب عالم بھی الطاف امیر
سے پیش آتے۔ لکھنؤ میں مشاعرے کرتے مصحفی قیتل۔ انشا میر حسن سب اسی
سرکار کے دعاگو تھے۔ ان کا قلمی دیوان لالہ سری رام صاحب مصنف خمخانہ جاوید
کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

اکبر شاہ ثانی | ابوالنصر معین الدین اکبر شاہ ثانی بادشاہ دہلی حضرت شاہ عالم
ثانی کے دوسرے بیٹے تھے۔ ۱۵۹۷ء میں پیدا ہوئے۔
۱۶۰۶ء میں تخت سلطنت پر بیٹھے اور ۱۶۲۷ء میں انتقال کیا۔ ظفر نے
تاریخ کہی ہے

پے سال وفات گفت ظفر | عرش آرا مگاہ عالی قدر

ہوزوں طبع تھے۔ اپنے باپ کے تخلص "آفتاب" کی رعایت سے شعلہ تخلص
کرتے تھے فکر سخن کی طرف توجہ کم تھی لیکن شعرا کی بڑی قدر کرتے تھے۔ میر نظام الدین
ممتون۔ غالب علی خاں سید شاہ نصیر وغیرہ ان کے دربار کے شاعر تھے۔

بہادر شاہ ثانی | خاندان مغلیہ کے آخری تاجدار مرزا ابوالمظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ
تخلص بہ ظفر | اکبر شاہ ثانی کے بیٹے تھے۔ ولادت ۱۶۱۷ء میں ہوئی اور باپ کے

مرنے کے بعد ۱۶۲۷ء میں تخت پر بیٹھے اور غدر کے بعد ۱۶۵۷ء میں معزول ہو کر
ملک برہما میں جلاوطن کیے گئے جہاں ۱۶۶۲ء میں انتقال کیا۔ بہادر شاہ شاعری
کے بڑے ولادہ تھے اور اکثر اپنا وقت اُس میں صرف کرتے تھے۔ چونکہ سلطنت
کا کام کاج کچھ نہیں تھا زیادہ تر وقت شعر گوئی میں گزرتا تھا۔ اُستاد ذوق اور
مرزا غالب کو کلام دکھاتے تھے۔ مگر قبل اس کے شاہ نصیر سے استفادہ سُخن کیا تھا۔
شاعری کے علاوہ فن موسیقی میں بھی انکو اچھا دخل تھا ان کی اکثر ٹھمریاں شمالی
ہند میں بہت مقبول ہوئیں خوشنویس بھی بہت اچھے تھے اور اکثر اپنے ہاتھ

کے کلمے ہوئے قرآن شریف دلی کی بڑی مسجدوں میں بطور ہدیہ کے بھیجے تھے۔ انھوں نے ایک شرح گلستاں بھی لکھی جو ایک اچھی کتاب سمجھی جاتی ہے مگر ان کی شہرت کی اصلی بنیاد ان کے ضخیم کلیات پر ہے جو بہت مشہور ہے چار دیوان ان کے شائع ہو چکے ہیں ان کو لوگ بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ ان کی غزلیں اس قدر مقبول ہیں کہ اکثر نایاب رنگ کے جلسوں میں گائی جاتی ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان کے استاد ذوق اور غالب انکو غزلیں بہک کر دے دیتے تھے۔ اور ایسی شگ نہیں کہ ظفر کی بعض غزلوں میں ان دونوں استادوں کا رنگ پایا جاتا ہے مگر پھر بھی ظفر کے خود شاعر ہونے میں کوئی کلام نہیں کیونکہ ان کی بہت سی غزلیں ان کے خاص رنگ کی ہیں جو ذوق و غالب سے بالکل علیحدہ ہے معلوم نہیں کہ ظفر نے بحالت قید بھی مشغلہ شعری جاری رکھا تھا یا نہیں۔ غالب کے کہ یہ دلچسپ مشغلہ ان سے نہ چھوٹا ہوا اور کچھ ان کا اس زمانہ کا بھی کلام موجود ہو۔ کیا تعجب ہے کہ سعی و تلاش اس معاملہ میں آئندہ کامیاب ہو۔

ان کا طرز کلام بہت صاف اور سادہ ہے۔ کلام بہت مزیدار سلیس اور فصیح ہوتا ہے اور ایک خاص در و دائر رکھتا ہے جو ان کے مصائب کی اصلی تصویر ہے ظفر اکثر جگہ مشکل مشکل بحر میں اور سخت ردیف و قافیہ میں بھی غزلیں کہتے تھے۔ جو بہت کچھ قابل تعریف ہیں۔ ان کے خیالات بلند اور شہیں رنگین اور جذبات دلنشین ہوتے ہیں۔ اس دور میں مذکورہ بالا شعرا کے علاوہ اور بھی شعرا گزرے ہیں جو اگرچہ اس باب کے نہ تھے مگر پھر بھی مشاہیر میں ان کا شمار کیا جاتا ہے۔ مثلاً قائم قاسم حسرت منت ممتون وغیرہ۔ ان کے علاوہ بعض شعرا کے دور سابق کا بھی کچھ حال جو گذشتہ باب میں رہ گیا تھا مختصر اُبیان درج کیا جاتا ہے۔

قائم چاند پوری | شیخ قیام الدین نام تھا بڑے اعلیٰ درجہ کے شاعر خاص کر قطعات اور رباعیات میں ید طولی رکھتے تھے۔ چاند پور ضلع بجنور کے رہنے والے

مگر ملازمت کے تعلق سے زیادہ حصہ دہلی میں بسر ہوا جہاں وہ داروغہ تو پچانہ تھے شروع میں اپنا کلام خواجہ میر درد کو دکھاتے تھے بعد کو سودا کے شاگرد ہو گئے انھوں نے ایک تذکرہ بھی لکھا ہے جو کیاب ہے۔ دلی کی تباہی کے بعد وہ ٹانڈہ (قریب آنولہ) میں نواب محمد یار خاں کی رفاقت میں رہتے تھے۔ اس کے بعد رامپور گئے جہاں شمس الدین میں انتقال کیا۔ انکی نسبت مصحفی لکھتے ہیں۔ ”در پنجنگی کلام حسینی مصراع غزل دور و دید قصیدہ و مثنوی وغیرہ موافق رواج زمانہ دوش بدو مشن استاد راہی رفت در بعضی مقام رجحان می جست“ اور مرزا علی لطف اپنے تذکرہ گلشن ہند میں یوں رقمطراز ہیں ”مضمون تراشی اور معنی بندی میں معروف سیح تو یہ ہے کہ بعد سودا اور تیر کے کسی ریختہ گو کی نظم کا نہیں یہ اسلوب ہے۔ راقم آثم کو تو طور گویائی اس سخن آفریں کا نہایت مرغوب ہے۔

منت | میر تقی الدین منت دلی کے رہنے والے ننھیالی رشتے سے سید جلال بخاری کی اولاد سے تھے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے سایہ عاطفت میں دلی میں پرورش پائی۔ روحانی تعلیم مولانا محرز الدین رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کی اور مشورہ شعر و سخن میر نور الدین نوید اور میر شمس الدین فقیر سے کرتے تھے بہت پر گوشتاعر تھے۔ ایک کلیات تجنید ڈیڑھ لاکھ اشعار کا اپنی یادگار چھوڑا۔ متعدد مثنویاں تصنیف کیں جن میں سے ایک شکرستان ہے جو شیخ سعدی کی گلستاں کے جواب میں لکھی ہے پچانچہ فرماتے ہیں

دریں عمرہ مثنوی گفتہ ام	بہ آئین طرز نوی گفتہ ام
چو اشعار من در عدد میر سعد	شمار قصائد بصد میر سعد
بود شعر من در غزل سی ہزار	زبان صد رباعی گرفتہ شمار

دلی چھوڑ کر ۹۱۱ھ میں لکھنؤ آئے۔ یہاں مشر جانسن سے ملاقات ہوئی

جو اُن کو کلکتہ لے گئے اور مارکوٹس آف ہسٹنگز کے روبرو اُن کو پیش کیا۔ لارڈ ڈھون نے خطاب تک الشرائی اُن کو عنایت کیا۔ اُن کی مدح میں اُن کے کمرشہر قصائد ہیں۔ سن ۱۲۱۰ء میں گورنر جنرل نے ایک خاص سفارت پر انکو حیدر آباد بھیجا وہاں پہنچ کر حضور نظام کی مدح میں انھوں نے قصیدہ پیش کیا جس کے صلے میں بہت انعام و اکرام پایا۔ بعد واپسی حیدر آباد و عظیم آباد میں مہاراجہ ٹلیٹ رائے کی مصاحبت میں چند دنوں رہ کر پھر کلکتہ کا رخ کیا جہاں پہنچتے ہی سن ۱۲۰۸ء میں سفر آخرت اختیار کیا۔ نمونہ کلام یہ ہے

اس آنے کا کچھ ہے لطف پیارے	ہر دم جو کہو کہ جاسیں گے ہم
دلہ	
آہ اب کثرت داغ غم خریاں سے مدام	صفیہ سیدہ پُراز جلوہ طادسی ہے
دلہ	
گر اُس لب جاں بخش کی کچھ بات سناؤں	عیسیٰ بھی جو کچھ پوچھے تو صلوات سناؤں

نمونہ میر نظام الدین ممنون خلف میر قمر الدین مینت۔ اُن کے آباد اجداد سونی پرت کے رہنے والے تھے مگر اُن کی دلدادت دلی میں ہوئی۔ اور وہیں نشو و نما پایا۔ اکبر شاہ ثانی نے اُن کو نحر الشعر کا خطاب عطا کیا اور اکثر لوگ اُن کے سلسلہ کلمہ میں داخل ہو گئے

کچھ دنوں یہ اجیر میں بحیثیت صدر الصدور رہے تھے مگر پھر دلی آگئے جہاں سن ۱۲۶۰ء میں انتقال کیا خود بھی اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے اور شاگرد بھی نامی و گرامی چھوڑے مثلاً مفتی صدر الدین خاں آرزوہ وغیرہ اُن کا دیوان کیا اب ہے اسکے دیکھنے سے اُن کی قادر الکلامی کا پورا اندازہ ہوتا ہے۔

حسرت دہلوی | مرزا جعفر علی نام حسرت تخلص ابو الخیر عطار کے بیٹے تھے۔ دلی میں

پیدا ہوئے اور ابتداء عطاری کا پیشہ کرتے تھے شعر سے اُن کو قطری ذوق تھا اور اس فن میں انھوں نے کمال حاصل کیا جب شاہ عالم ثانی سرسید آراء سلطنت ہوئے تو حسرت بھی اور شعرا کے ساتھ دامن دولت سے وابستہ ہو گئے۔ جب نمکھام غلام قادر نے بد نصیب بادشاہ کی آنکھیں نکالیں اور اسی قسم کی دوسری زیادتیاں کر کے لوٹ مار و بیگیاں شاہی کی بھیمتی وغیرہ کا ہنگامہ برپا کیا تو اس عبرتناک منظر کو انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا چنانچہ اسی قیامت خیز واقعہ کی نسبت اُن کی ایک درد انگیز نظم ہے جسرت دلی چھوڑ کر فیض آباد آئے جو اس وقت اردو کا دار السلطنت تھا۔ اپنے سفر کے مصائب اور حالات کے بیان میں انھوں نے ایک لچپ نظم لکھی ہے جس میں سفر کی تکلیفیں، دھوپ کی شدت پانی کی قلت است و گاڑی کی مصیبت وغیرہ وغیرہ نہایت تفصیل سے بیان کی گئی ہیں فیض آباد پہنچ کر انھوں نے نواب کے سامنے اپنا قصیدہ پڑھا اور اس کے صلے میں کچھ وظیفہ مقرر ہو گیا جب شجاع الدولہ کے بعد آصف الدولہ نواب ہوئے تو حسرت نے ان کی ہمنیت میں ایک دوسرا قصیدہ کہہ کر ان کے سامنے پڑھا۔ ۱۹۵ھ میں جب لکھنؤ دار السلطنت ہوا تو حسرت بھی اپنے دوستوں کے اصرار سے لکھنؤ آ گئے اور یہاں گھنٹا بیگ کی گڑھی پر قیام تھا۔ شاہزادہ مرزا سلیمان شکوہ کے قیام لکھنؤ کے زمانہ میں حسرت کے شاگرد رشید میاں جرات بھی اپنے استاد کے پاس رہنے لگے اور یہ دونوں شاگرد استاد لکھنؤ کے شاعروں میں شریک ہو کر اپنی پرکیف غزلوں پر سامعین سے خراج تحسین وصول کرتے تھے۔ حسرت سب سے پہلے مرزا احسن علیخان بہادر کی رفاقت میں تھے اس کے بعد پرنس جہاندار شاہ کے ملازم ہو گئے مشہور ہے کہ یہ پالکی میں سوار ہوتے تھے جو امرا کے لیے مخصوص تھی اس سے ان کے ہم پیشہ ساتھیوں کو بہت رشک ہوا اور انھوں نے ان کے چڑھانے

کے لیے بہت سی ہجوئیں کہیں اور مستخر کے اشعار لکھے۔ سودا نے بھی اس میں حصہ لیا۔ خود حسرت نے ایک لکھنؤ کے حکیم کی ہجو لکھی ہے جس میں اُس کے پیشہ اور قابلیت پر حملہ کیا ہے اُن کو شاہزادہ سلیمان شاہ بھی کچھ درماہہ دیتے تھے۔ وہ راسے سر ہنگم دیوانہ کے شاگرد تھے اور خود ان کے بھی شاگرد بکثرت تھے چنانچہ میر حسن تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ کثرت شاگردانش چنان مست کہ در صورت شناسی خود ہم حیران مست ان سب میں جرات اور ثواب محبت خاں محبت بہت نامور شاعر ہوئے ہیں مشہور ہے کہ وفات ۱۲۱۵ء میں ہوئی اور لکھنؤ میں مدفون ہوئے۔ تصنیفات میں ایک کلیات ہے جس میں ساتی نامہ، مثنوی، واسوخت، از جمیع بند ترکیب بند، مسدس مخمس، قصیدے، رباعیاں، اور دو دیوان غزلوں کے ہیں۔ غرض کہ اصناف سخن میں سے ہر قسم کے نمونے اُس میں پائے جاتے ہیں۔ خاص انداز یہ بھی ہے کہ وہ غزل کو اکثر قطعہ پر ختم کرتے ہیں اور اکثر مسلسل غزل ایک ہی مضمون پر لکھتے ہیں۔

تذرت | شاہ قدرت اللہ قدرت میر شمس الدین فقیر کے برادر عزاوتھے اور کوئی عجب نہیں کہ اُن کے شاگرد بھی ہوں۔ نسخہ اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں کہ مرزا منظر جاجاناں اور جعفر علی حسرت کے شاگرد تھے۔ ۱۵۰۰ء میں مرشد آباد میں انتقال کیا۔ میر اُن کی نسبت کوئی اچھی رائے نہیں رکھتے اور اُن کو ”عاجز سخن“ لکھا ہے مگر میر حسن نے اُن کے کلام کی بہت تعریف کی ہے لکھتے ہیں ”سمندش در میدان فارسی دہندی چالاک دہشت و تصویر بینی معانی در استخوان بندی الفاظ درست بندہ دے ایک بار در مشاعرہ بہ لکھنؤ دیدہ ام۔“ اسی طرح مرزا علی لطف بھی اُن کے بہت مداح ہیں چند اشعار بطور نمونہ ہدیہ ناظرین ہیں۔

اے بادہ کشو مرثدہ کہ پھر ابر تر آیا
شاید مرزگان کوئی لخت جگر آیا

ہنگامہ پیمیز دور عاب بس آریا
کچھ دیر ہوئی اشک نہیں نکھوسے کرتے

دلہ

مجھ کو غفلت نے خبر ایام فرصت کی نہ دی
آہ جب جاتے رہے دن تب میں بچپانے لگا

دلہ

سیدہ اُس کا ہے دل اُس کا ہے جگر اُس کا ہے
تیر بیدار جدھر رُخ کرے گھر اُس کا ہے

دلہ

ایک ہی پردے کے گر سمجھو تو یہ سب ہیں الاپ
صبر و طاقت تو کبھی کے کو چریاں سے کر گئے
کل ہوں اس طرح سے ترغیب دیتی تھی مجھے
گر میسر ہو تو کس عشرت سے کیجئے زندگی
صبح سے تا شام چلتا ہوں گلگوں کا دور
سننے ہی عبرت یہ بولی اک تماشہ میں کچھ
لیکن اکیلا رگی گور غریباں کی طرف
مرقد میں دو تین دکھلا کر لگی کہنے مجھے
پوچھ تو ان سے کہ جاہ و تمکنت دنیا سے آج
کر صدائے جنگ ہے یا نغمہ نا قوس ہے
اب و دواعِ ننگ ہے اور رخصتِ مونس ہے
کیا ہی ملکِ روم ہے کیا سرزمینِ روس ہے
اس طرف آوازِ طبلِ ادھر صدائے کوس ہے
شب ہوئی تو ماہرِ دیو سے کنارِ بوس ہے
پہل دکھاؤں کیا تو اپنی آرز کا مجھوس ہے
جس جگہ جانِ تمنا سو طرح مایوس ہے
یہ سکندر ہے یہ دارا ہے یہ کیا دوس ہے
کچھ بھی ان کے ہاتھ غیر از حسرت و افسوس ہے

کل تو قدرتِ پاکے خم رکھتے تھے شمعِ ریا
آج رہن جام ہے یہ خرقہ سالوس ہے

بے سرا میر محمد علی عرف میر محمد سی متخلص بہ بیدار خواجہ میر درد کے دوست اور
شاگرد بھی تھے۔ فارسی میں رضیٰ قلی خاں فراق سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ کہا جاتا
ہے کہ شاہ حاتم کو بھی کلام دکھایا تھا مولانا فخر الدین علیہ الرحمۃ کے حریدوں میں تھے
آخر عمر میں دلی سے آگرہ چلے گئے جہاں ۱۲۰۹ھ مطابق ۱۷۹۴ء میں انتقال کیا
اور وہیں مدفون ہوئے۔ میر و مرزا کے معاصر تھے۔ دو دیوان اپنی یادگار چھوڑے

ان کے کلام میں صفائی کے ساتھ تصوف کا رنگ بھی اچھا خاصہ ہے۔ دو چار شعر نمونہ کے دیے جاتے ہیں۔

ہم خاک بھی ہو گئے و لیکن	جی سے نہ ترے غبار نکلا
دل	
بیرے رخسارِ قد و چشم کے بایں عاشقِ نزار	گلِ جدا، سروِ جدا، نرگسِ بیمارِ جدا
دل	
بیدار راہِ عشق کسی سے نہ طے ہوئی	صحرا میں قیس، کوہ میں فرہادر گیا
دل	
چھوڑ کر کوئے بتاں جاتا ہے تو کعبہ کو	جلد پھر پوچھے بیدارِ خدا کو سونپا
دل	
رابطہ جو چاہیے بیدار سو اس سے معلوم	مگر اتنا کہ ملاقات چلی جاتی ہے

ہدایت اللہ شاہ دہلوی خواجہ میر درد کے مریدوں اور شاگردوں میں تھے۔ شاہؒ میں انتقال کیا صاحب دیوان ہیں اور بقیہ مرزا علی لطف ایک مثنوی بنارس کی تعریف میں بھی خوب لکھی ہے۔ میر تقی میر اور میر حسن دونوں ان کے کلمات شاعری کے معرفت ہیں۔

فراقِ حکیم شہناز اللہ شاہ متخلص بہ فراقِ ہدایت اللہ شاہ مذکورہ بالا کے بھتیجے تھے۔ کسبِ سخن اور کسبِ باطن خواجہ میر درد سے کرتے تھے۔ شاہِ غیر میں سے تھے اور دلی کے بہت نامور حکیم سمجھے جاتے تھے مصحفی اور میر حسن نے اُن کا ذکر خیر بہت اچھے لفظوں میں کیا ہے۔ میر حسن اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ میرے سامنے انھوں نے تحصیلِ طب کی اور جب میں شاہجہاں آباد میں تھا تو مجھ سے اور اُن سے مراسمِ دوستی و محبت بہت تھے۔

منیا میرضیاء الدین ضیاء الدہوی سودا کے معاصر تھے دلی سے فیض آباد اور لکھنؤ آئے اور یہاں سے عظیم آباد گئے جہاں ہمارا راجہ شتاب رائے کے بیٹے راجہ بہادر متخلص بہ راجہ ان کے شاگرد ہو گئے بیٹے ہی میں انتقال کیا میر حسن اور مرزا علی لطف ان کے کلام کے معروف ہیں اور آخر الذکر اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں "اکثر شعر در زمین سنگلاخ گفتن و الفاظ نامقبول را مقبول دہا سازا سخت کار دوست" میر حسن ابتدا میں انھیں کے شاگرد تھے ان کو قصیدے اور مثنوی وغیرہ سے شوق نہ تھا صرف غزل کو پسند کرتے تھے جیسا کہ میر حسن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے۔ سنگلاخ زمینوں میں کہنے کا شوق تھا۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

رسوائیوں کی اپنے مجھے کچھ ہو س نہیں	ناصح پہ کیا کردں کہ مراد دل پہ پس نہیں
کسی دشمن کی بھی یار بن گئے شہبازی کی	کہ جیسے اُس سے میرے وصل کا اک دن گزرتا ہے
راز دل ہیں پوچھتے اور بولنے دیتے نہیں	بات منہ پر آرہی ہے لب ہلانا منع ہے
اے آہ بچ نکل نہ کہیں دل تھلک پڑے	یہ جام بھر رہا ہے مبادا چھلک پڑے
کون سے زخم کا کھلا ٹانگا	آج پھر دل میں درد ہوتا ہے

صاف تھا جب تک تو نام کو بھی جواب صاف تھا

اب جو خط آنے لگا شاید کہ خط آنے لگا

کل کی رسوائی تجھے کچھ کم نہ تھی اے سنگ خلق

اس کے کوچہ میں ضیا تو آج پھر جانے لگا

بغتہ شیخ بقاۃ اللہ اکبر آبادی حافظ لطف اللہ خوشنویس کے بیٹے تھے دلی میں پیدا ہوئے مگر لکھنؤ میں توطن اختیار کیا فارسی میں مرزا فخر مکیں اور اردو میں شاہ حاتم اور خواجہ میر درد کے شاگرد تھے فارسی میں تنزیں اور اردو میں بقا شتخلص

کرتے تھے۔ جو اپنے استاد شاہ حاتم کے کہنے سے رکھا تھا میر و سودا دونوں کفاح
میں نہ لاتے تھے اور ان دونوں سے اور ان سے اکثر چوس چلتی تھیں چنانچہ جب
ان کے مددگار کا مضمون میر صاحب نے بھی باندھا تو انھوں نے جل کر کہا ہے

میر نے گزرا مضمون دو آبے کا لیا	اے بقا تو بھی دعا ہے جو دعا دینی ہو
یا خدا میر کی آنکھوں کو دو آبے کر دے	اور بینی کا یہ عالم ہو کہ تر بینی ہو

اک اور موقع پر میر صاحب کی اس طرح خبر لیتے ہیں ہے

پگڑی اپنی سنبھالے گا میر	اور بستی نہیں یہ دلی ہے
--------------------------	-------------------------

ایک جگہ میر و مرزا کی شاعری کا فرق اپنے مذاق اور مضمون میں اس طرح
دکھایا ہے۔

میر و مرزا کی شعر خوانی نے	بلکہ عالم میں دھوم ڈالی تھی
کھول دیوان دونوں صاحب کے	اے بقا ہم نے جب زیارت کی
کچھ نہ پایا سولے اس کے سخن	ایک تو تو کے ہر اک ہی ایسی

یعنی ایک کے کلام میں روکھی پیمکی اخلاق آموزی ہے اور دوسرے کے یہاں محض
ظرافت و تشویرِ مفلسی سے سنگ مار تیغ کو اک کے اعمال کا شوق کیا تھا اس سے
ان کا دماغ خراب ہو گیا آخر کار ہر طرف سے مجبور ہو کر سن اللہ میں عقیباتِ عالیات
کی زیارت کو چلے گئے راستے ہی میں انتقال کیا۔ اپنے زمانہ کے مشہور شاعروں میں تھے
صاحبِ دیوان ہیں۔

حضرت میر محمد باقر حزیں مرزا سطر حاسنجان کے ممتاز شاگردوں میں تھے بزرگ
استاد سے بہت حسنِ عقیدت اور محبت رکھتے تھے چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں ہے

جس طرح جی چاہتا ہے ہو نہیں سکتی حزیں	حضرت استاد یعنی شاہ منظر کی ثنا
--------------------------------------	---------------------------------

صاحبِ ہندو گار سے تنگ اگر دلی سے پینہ عظیم آباد پہنچے وہاں نوہج صحت جنگ

نے ان کی بڑی قدر دانی کی ایک دیوان یادگار ہے جس میں قصائد اور غزلیں ردیف والے
موجود ہیں دو تین شعر بطور نمونہ کے یہاں دیے جاتے ہیں۔

کچھ کہا شاید اُس نے قاصد سے	دل میں میرے وہ اضطراب تھیں
حال اے قاصد مرا جو کچھ کہ تو جاتا ہے دیکھ	اس طرح سس اس سے مت کہو کہ وہ محبوب ہو
ہر نصیحت میں تری مانو گئے اے نا صم پر ایک	دہروں کے دیکھنے میں جی مرنانا چاہ رہے

بیان خواجہ احسن اللہ کشمیری النسل تھے اور دلی میں پیدا ہوئے۔ مرزا منظر
جانبانماں کے شاگرد اور مولانا فخر الدین کے مرید تھے۔ آخر عمر میں حیدر آباد گئے اور
نواب آصف جاہ ثانی کی ملازمت میں زندگی عزت سے بسر کی سلاطین میں وفات
پائی اور حیدر آباد ہی میں مدفون ہوئے ان کی وفات کی تاریخ ہے "اُستاد از جہاں رفت"
میر حسن اپنے تذکرہ میں ان کے بڑے معرف ہیں لکھتے ہیں "شاعر عذب البیان
از خوش گویان زمان خواجہ احسن اللہ المتخلص بہ بیان از تلامذہ مرزا منظر جانبانماں
زیچ نامہ از مشہور ست بسیار خوب گفتہ رباعیات و مہر دار و نمونہ کلام یہ ہے۔

کوئی کسی کا بیاں آشنائیں دیکھا	سوائے اسکے ان آنکھوں نے کیا نہیں دیکھا
مصلحت ترک عشق ہے نا صم	لیک یہ تم سے ہو نہیں سکتا
کتنا نہیں میں عرش پر اے نالہ جا پہنچ	کانوں تلک اس کے قوائے نارسا پہنچ

عرش تک جاتی تھی اب لب تک بھی آسکتی نہیں

رحم آتا ہے بیاں اب مجھ کو اپنی آہ پر

صاف منہ پر میں نہیں کتا کہ ہو گا اس کے پاس

در نہ کیا واقف نہیں میں دل ہے میرا جس کے پاس

کانوں کی زیادہ کچھ اس سے آرزو ہو	ایک تخیل رکاں چوبیس میں ہوں اور تو ہو
دھل کی شیک ماجر گیا کہوں تم سے نہیں	شام سے لیکے صبح تک وہ ہی نہیں نہیں ہی

بیان کون ہے اب تک پوچھتے ہو	تفاضل کے قرباں تجاہل کے صدمے
جاد دھنی کہ سحر تھی بلا تھی	ظالم یہ تری نگاہ کیا تھی

راجہ شیخ غلام علی داس شاگرد سیر سلسلہ ۱۶۲۰ء میں بیٹنہ عظیم آباد میں پیدا ہوئے شریعہ میں مرزا ندوی اور مرزا شریف کو کلام دکھاتے تھے مگر آخر میں باقاعدہ طور پر سیر تقی میر کے شاگرد ہو گئے تھے اور میر صاحب ان کا بڑا خیال کرتے تھے ۱۷۲۱ء تک کلکتہ، غازی پور، مولیٰ لکھنؤ کی سیاحت میں مصروف رہے۔ اس کے بعد اپنے وطن بالونہ کو واپس آئے اور شعر و شاعری کا شغلیہ دباں بہت زور شور سے شروع کر دیا چہتر برس کی عمر پر ۱۷۳۸ء یا ۱۷۳۹ء میں وفات پائی۔ زبان پاکیزہ اور طرز بیان صاف و سادہ ہے۔ سادہ اشعار کے ساتھ رنگین شعر بھی بہت ملتے ہیں۔ جب لکھنؤ میں تھے تو نواب آصف الدولہ اور غازی الدین حیدر کی تعریف میں قصیدے بھی کہے تھے۔

باب

اساتذہ لکھنؤ

ناسخ و انش کا زمانہ

مرکز شاعری لکھنؤ میں	شاعری کامرکز ترقی ملی سے ہٹ کر اب لکھنؤ میں آ گیا۔
منقل ہوتا ہے	اس کے اسباب مختصر ایہ تھے کہ سلطنت مغلیہ کے آخری فرمانروا بہت کمزور اور محض نام کے بادشاہ رہ گئے تھے۔ پہلا حملہ جس نے قصر سلطنت کو تشریز لزل کر دیا نادر شاہ کا تھا جسے شیرازہ حکومت بکمر گیا اور درخت اقبال کی جڑیں کمزور ہو گئیں۔ نادر شاہ کے حملے کی تباہی اور بربادی سے

ابھی سلطنت نہیں سنبھلی تھی کہ احمد شاہ درانی اور مرہٹوں کی قتل و غارت نے لوگوں کی جان و مال کو اور زیادہ غیر محفوظ کر دیا۔ شاہ عالم ثانی بد بخت اور نمک حرام غلام قادر کے مظالم کا نشانہ بنے جس نے ایسے نیک دل اور فرشتہ سیرت بادشاہ کی آنکھیں نکال ڈالیں اور ان کو قید کر لیا۔ شہید بادشاہ نے اپنی اس مصیبت و پریشانی کی حالت میں سینہ ہیا اور انگریزوں سے مدد چاہی۔ چنانچہ اس دردناک تصیدے کے جو اس مصیبت کے وقت میں کھا تھا چند اشعار یہ ہیں۔

شاہ تیمور کے دار و سر نسبت با من	زود ہاشد کہ بایاد بد کاری ما
ماد حوجی سینہ ہیا فرزند جگر بند من ست	ہست مصروف تلانی ستم کاری ما
راجہ دراد زیند ار د امیر و چہ فقیر	جیف ہاشد کہ نازند بہ غمخواری ما
اصف الدولہ و انگریز کہ دستور من اند	چہ عجب گر بنائیں مدد کاری ما

اس کے ساتھ ہی ساتھ ملک کے امرا سے دولت بھی اپنے باہمی رشک و حسد اور فساد و عناد سے باز نہیں آتے تھے۔ اس عام بد امنی کا یہ نتیجہ ہوا کہ لوگ اپنا وطن چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے وہ شاعر جو سلطنت کے دامن دولت سے وابستہ تھے مثلاً میر، سودا، میر حسن، انشا وغیرہ انھوں نے بھی دلی چھوڑ کر لکھنؤ کا رخ کیا جو اس وقت ان کا قد شناس ادا ان کے واسطے دولت خیز خطہ تھا اور علم کی قدروانی میں دربار دلی کے قدم بقدم چلنا چاہتا تھا۔ اس طور پر دلی کا نقصان لکھنؤ کا نفع ثابت ہوا شعرائے دلی کو اہل لکھنؤ نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور ان کے ساتھ نہایت اخلاق و محبت سے پیش آئے سلطنت کی طرف سے ان کے واسطے جاگیریں و وظائف و انعام و اکرام مرحمت ہوئے اور ان کی نازک مزاجیاں اور بددعاغیاں تک بہت کشادہ پیشانی سے برداشت کی جاتی تھیں بلکہ اکثر انھیں صفات کی تعریف کی جاتی تھی۔ سلسلہ روابط

شاہ تیمور شاہ دلی کا بل ان کے ہنسی تھے۔

کو اور زیادہ مضبوط کرنے کے لیے نوابان عہد اذامرا کے وقت نے اکثر شعراء کو اپنے دامن
دولت سے وابستہ کر لیا اور ان کو اپنا رفیق و صاحب بنایا۔ مگر یہ پوچھئے تو یہی
ربط و ضبط اور دربار کا تعلق بالآخر شاعری کے حق میں سم قاتل ثابت ہوا۔ شروع
میں جب کہ سرمایہ داران شعراء آزاد مزاج اور خوددار ہوتے تھے تو اس میل جول سے
کوئی نقصان نہیں ہوا بلکہ اس نے شاعری اور زبان کی ترقی میں بہت مدد دی۔ مگر اب بعد
کے زمانہ میں جبکہ شعراء اپنی عزت و مہر و کما بھی کچھ خیال نہیں کرتے تھے اور اپنے کلام کو اپنے
میش پرست مالکوں کے رنگ میں رنگنا چاہتے تھے اس سے بہت بُرے نتائج سرزد
ہوئے۔ مرتبہ شاعری پسٹ ہو گیا۔ شعراء نے اپنے ہاتھوں خود کو ذلیل کر لیا۔ مثال کے
لیے میر و سودا، امداد شاہ مصحفی کی حالت پر نظر کرو اور ان کے درون اصحاب گو کہ سلطنت
کے و خلیفہ خوار تھے مگر نہایت بلند اور آزاد طبیعت رکھتے تھے وہ بھی اپنے اشعار میں
کسی کی دست اندازی یا کسی خاص رنگ کی پیروی جو ان کی طبیعت کے خلاف ہوتی گوارا
نہیں کرتے تھے برعکس اس کے مؤخر الذکر دونوں بزرگ دربار داری کے اثر سے متاثر
ہو گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاعری بجائے الہامی ہونے کے محض رسمی اور تکلفات کی رہ گئی۔
لکھنؤ کا طرز شاعری اس میں کوئی شک نہیں کہ لکھنؤ میں چرخ شاعری دلی دالوں نے
روشن کیا۔ اور شاعری کا مذاق یہاں انھوں نے پھیلایا ان لوگوں کے کہنے سے پہلے
مشہور مقامی شاعر یہاں کوئی نہیں تھے۔ لکھنؤ کے مستقر اختلاف ہو جانے اور
شعراء دہلی کے یہاں بکثرت آ جانے سے یہاں مذاق شاعری بہت پھیل گیا اور
شاعری کو بہت ترقی ہوئی۔ بادشاہ بڑے ذوق و شوق سے شاعروں کو اپنی مصالحت
میں جگہ دیتے تھے سودا کے بلائے جانے کا دائمی مشہور ہے کہ نواب شجاع الدولہ
نے ان کو طلب کیا اور ایک خوبصورت جلد سے انھوں نے اس کو نال دیا۔ شعر کا

۱۱۱-۱۱۱-۱۱۱

اتنا چرچا پھیلنا کہ جا سجاتا شعرے ہونے لگے۔ اُمرا اور رؤسا اور تیز عوام ان اس بھی شاعری کے دیوانے تھے عمدہ اشعار پڑھ کر اور شن کر لوٹ جاتے تھے۔ مشاعروں کی محفلیں ماہوار اور ہفتہ وار سے ترقی کر کے اکثر جگہ روزانہ ہوتی تھیں جس میں شعر اپنی اپنی عمدہ غزلیں پڑھتے تھے اور سامعین کی تعریف سے اُن کے دل بڑھتے تھے۔ اس مقابلہ سے یہ فائدہ ضرور تھا کہ علاوہ کلام کی کثرت کے لوگ ایک دوسرے پر فوقیت لے جانے کی کوشش کرتے تھے اور یہی فوقیت اور سرسبزی کا خیال لوگوں کے لئے مایہ ناز تھا۔ اسی کثرت شوق نے ایک نئے اسکول کی بنیاد ڈالی جو بالکل بقای تھا۔ دونوں اسکولوں کی نوعیت میں کوئی اہم اور اصولی فرق نہیں ہے مگر مضامین منتخب میں پسند طبع کے نمونے جدا جدا ہیں اور اسلوب بیان میں بھی فرق ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو وحدت پسند طبائع نے قامت پرستی سے گھبرا کر اپنے نام و نمود اور قدرت کے خیال سے نئی نئی راہیں نکالیں اور شعرائے دہلی کی قدیم شاہراہ کو چھوڑ دیا۔ ناسخ اس طرز جدید کے پیشواے اعظم ہیں اور ان کے بعض مشہور شاگرد بھی اُن کے قدم بقدم چل کر کامیاب ہوئے یہاں تک کہ زمانہ موجودہ میں وہ طرز خاص نامقبول ٹھہری اور اب شاعری نے ایک جدید روش اختیار کی۔

طرز دہلی اور طرز لکھنؤ کا فرق
اور اُن کا تعاقب

طرز دہلی کی خصوصیت یہ ہے کہ اُس میں جذبات کی تصویر سادہ اور پُر اثر الفاظ میں کھینچی جاتی ہے۔ تعینیل اور جذبات پر رعایت لفظی کو مقدم سمجھتے ہیں۔ ناسخ۔ اور اُن کے متبعین نے برخلاف اس کے اپنی تمام تر توجہ شعر کے حسن ظاہری اور رعایت لفظی اور صنائع بدائع پر صرف کر دی۔ یعنی الفاظ کی مصوری ایک بُرے اسلوب سے کی۔ شکوہ الفاظ پر بلند خیالی اور مصوری جذبات کو قربان کر دیا۔ الفاظ میں صرف وہی لفظ منتخب کیے جو کسی پہلو سے مراعات النظر میں شامل ہو سکتے تھے۔ مثلاً اگر کسی باغ کا منظر

دکھاتا ہوتا تو باغ ہی کی رعایت کے الفاظ استعمال کیے جاتے۔ دوسرے الفاظ اگر
 کہتے ہی مناسب اور سوز دل ہوتے مگر ان کو جگہ نہ ملتی اور سختی کے ساتھ ان کو برطرف کر دیا
 جاتا۔ اس رعایت لفظی کی بے انتہا پاسداری کا یہ اثر ہوا کہ شعر سے سادگی اور بے تکلفی
 جاتی رہی اور تکلف اور تصنع کی بھرمار ہو گئی ایسے الفاظ ڈھونڈھے جانے لگے جو مضمون سے
 کسی نہ کسی جہت سے ظاہری تعلق رکھتے ہوں گو دیگر وجوہ سے وہ کیسے ہی نامناسب
 اور بے موقع ہوں۔ گویا محض رعایت لفظی شعر کی خوبی اور عمدگی کا دار مدار رہ گئی۔ اور
 الفاظ کے قریب نگاہ پر در دو اثر جذبات، سادگی، سلاست، فصاحت، بلاغت وغیرہ
 سب بھینٹ چڑھا دی گئیں اور اس کمی کو اغراق غلو۔ اور دور از کار تشبیہوں نے پورا کیا
 اس طرز میں کیفیات اور صحیح جذبات کی نازک تحلیل نہیں ہوتی۔ اور وہ روح کے ہمزاز
 کی پوری پوری ترجمانی نہیں کرتی۔ اس میں شعر الفاظ رنگین کا محض ایک خوشنما گم دندا
 ہوتا ہے جو نظروں کو اچھا معلوم ہوتا ہے مگر کبھی دلکش نہیں ہوتا۔ ایسے لوگوں کے پیش نظر
 صائب اور بیدل کا کلام تھا جس کا مطالعہ انھوں نے غور سے کیا تھا۔ صائب کی طرح
 مثال دوسرے مصرعے میں پیش ہوتی تھی اور دعوے پہلے میں کیا جاتا تھا یہ مثالیں کہیں
 کہیں تو عمدہ اور دلچسپ ہوتی ہیں مگر با اوقات بالکل معمولی اور بے مزہ۔ بیدل کے
 نتیجے میں نازک اور باریک تشبیہوں اور نازک خیالیوں سے کام لیا گیا مگر اردو میں اگر وہ
 محض نقل ہو گئیں اور گورکھ دھند ابن گئیں۔ اس قسم کی بے قابو تخیل پرانے شعرا کے
 یہاں نہیں پائی جاتی لکھنؤ کا طرز شاعری دماغ کو تو متوجہ کرتا ہے مگر دل پر کوئی اثر
 نہیں کرتا ایسے کلام کی صورت ظاہری بہت اچھی ہوتی ہے اور اس کا وہی حال
 ہے جیسا کہ انگریزی میں پوئٹ اور اس کے متبعین کی شاعری کا ہے جس میں اسر تکلف
 اور تصنع ہے اور اصلیت اور درد و اثر مطلق نہیں جس سے گو دماغ نطفہ اندر ہوتا ہے

۱۲۔ ایک مشہور انگریزی شاعر کا نام ہے

اگر دل کوئی فائدہ نہیں اٹھاتا شعر گوئی کی زحمت کے مقابلہ میں ایسے اشعار کا نتیجہ بالکل بے حقیقت ہوتا ہے پہلے پہلے تو تبدیل ذائقہ کے طور پر اس قسم کے اشعار اچھے معلوم ہوئے مگر حضرت پسند طبیعتیں اُن سے گھبرا گئیں کیونکہ معمولی کاریگروں کے ہاتھ میں شاعری محسوس انگیز ہو گئی بجز اشعار کی کثرت سے لوگوں کا دل بھر گیا اور اب وہ انیس و دہریہ کی جادو نگاری اور غالب و مومن کی مضمون آفرینی سے لطف اندوز ہونے لگے۔ بہرہ ور کی شاعری اُس وقت کا آئینہ ہوتی ہے یہی حال گفتگو کی بھی شاعری کا ہے ناسخ۔ اور اُن کے شاگردوں کا کلام اس زمانہ کی نسوانیت کا پتہ دیتا ہے۔ ان کی غزلوں سے اُس زمانہ کے زنانہ لباس اور زیور اور آرایش کی ایک مکمل فہرست مرتب ہو سکتی ہے کبھی کبھی اُن کے کلام سے زنانہ گفتگو مترشح ہوتی ہے جو دلی والوں کے یہاں نہیں ہے دلی والے فارسی کے انداز میں چھوٹی چھوٹی غزلیں کہتے اور پامال اور فرسودہ خیالات سے بہت بچتے تھے۔ بجز ان کے شعرائے گفتگو ایک ایک مذہب میں جو غزلے اور پنج غزلے کہتے تھے اور یہ خراب رسم محفلی اور جزائر کی لکالی ہوئی تھی۔ اسی کثرت کی وجہ سے اکثر اوقات شعر میں بد مزگی اور بے لطفی اور کبھی کبھی ابستہ ال پیدا ہو جاتا ہے۔

تحقیق الفاظ و رعایت لفظی کا زمانہ | اس زمانہ میں ادیبز اس کے بعد کے زمانہ میں تحقیق الفاظ و رعایت لفظی کا بہت خیال رکھا جاتا تھا جس کی ابتداء شیخ ناسخ نے کی اور اُن کے شاگردوں کی کوششوں سے یہ رنگ گفتگو اور رام پور میں پھیل گیا یہی لوگ اصطلاح میں زمانہ ان کہلاتے ہیں۔ رشک، ہجر، سحر، مہینہ، جلال، برق و اجداد علیہ السلام اخترا، اسیر و فیو یہ سب لوگ مناسب الفاظ کے انتخاب میں نہایت جانفشانی کرتے تھے اور ہمیشہ خیال رکھتے تھے کہ صحیح الفاظ و محاورے سے اشعار میں استعمال کئے جائیں یہی وہ الفاظ و محاورات کے صحیح استعمال میں بھی رہی لوگ سند سمجھ جاتے تھے اس

چھان بین اور دقت نظر کا یہ نتیجہ ہوا کہ بہت سے الفاظ خارج کر دیے گئے اور لغات شعریہ بہت کم رہ گئے۔ اسی وجہ سے زبان میں ایک کڑھکی پیدا ہو گئی کیونکہ جو الفاظ و محاورات منتخب شدہ تھے وہ صرف مقرر کردہ طریقہ پر استعمال کئے جاسکتے تھے اور مقرر کردہ قواعد کی خلاف ورزی میسر نہ سمجھی جاتی تھی۔

اس جدید طرز لکھنے نے زبان میں بھی بعض اختلافات پیدا کر دیے۔ لکھنے کے شعر اور عوام الناس نے بعض الفاظ و محاورات کو خاص خاص محل پر استعمال کرنا شروع کیا اور ان کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ استعمال دہلی کے طریقہ استعمال سے بہتر اور سوزن تر ہے۔ نیز یہ کہ ان کے پسند کردہ الفاظ و محاورات زیادہ تر لطیف و فصیح ہوتے ہیں۔ یہ اختلاف بڑھتے بڑھتے زبان کی صرف و نحو تک پہنچ گیا اور تذکیر و تانیث میں فرق کیا جانے لگا یعنی بعض الفاظ جو اہل لکھنؤ کے نزدیک مذکر ہیں وہ دہلی میں مؤنث بولے جاتے ہیں۔ اور بعض جو وہاں مؤنث ہیں وہ یہاں مذکر بولے جاتے ہیں۔ یہ اختلاف جو بہت زیادہ اہم نہیں ہے اور صرف چند الفاظ تک محدود ہے اس کی ابتدا میر علی اوسطا رشک شاگر و ناسخ نے کی تھی۔ ان کے بعد سے یہ قضیہ تینک چلا آتا ہے اور ان دونوں مقاموں کے شاعر اب بھی اس فرق کا بہت خیال رکھتے ہیں۔

شیخ امام بخش ناسخ
مثنوی ۱۲
مطابق ۱۳

شیخ امام بخش متخلص یہ ناسخ زبان اردو کے بہت بڑے شاعر اور طرز لکھنؤ کے موجد تھے۔ ان کے خاندانی حالات صحیح طور پر نہیں معلوم ہیں کہا جاتا ہے کہ ایک متخلص سہمی خدا بخش غیر دروازے جو لاہور کا ایک دو متمد سوداگر تھا اور کوئی اولاد نہیں رکھتا تھا ان کو متنبی کر لیا تھا اُس نے ان کو بہت اچھی تعلیم دی اور مثل اپنی اولاد کے ان سے محبت کرتا تھا اُس کے مرنے کے بعد اُس کے بھائیوں نے وراثت کا جھگڑا کیا اور ناسخ کی تثنیت کو غلط ٹھہرا کر ان کو اپنے بھائی کا غلام بتایا رفتہ رفتہ کچھ مصالحت کی صورت

پیدا ہوئی اور اسی اثنا میں ناسخ کو زبردستی کی تدبیر کی گئی مگر وہ کارگر نہ ہوئی یہ معاملہ بالآخر عدالت میں پہنچا جہاں سے ناسخ کے حق میں فیصلہ ہوا۔ ان کے دیوان کی چند رباعیوں میں ان واقعات کی طرف حوالہ ہے مثلاً

(۱)

مشہور ہے گر چہ افتراءِ اعمام	پر کرتے نہیں غور خواص ارجوام
دارت ہونا دلیلِ فرزندی ہے	میراث نہ پاس کا کہیں کوئی غلام

(۲)

کہتے رہے اعمامِ عدوت سے غلام	میراثِ پدر پائی مگر میں نے تمام
اس دعویٰ باطل سے ستمگاروں کو	حاصل یہ ہوا کہ گئے مجھ کو بدنام

فارسی اور عربی کی درسیات انھوں نے حافظ وارث علی اور علمائے فرائی محل سے پڑھیں جو کفنویں ایک بہت بڑا تعلیمی مرکز ہے۔ وثوق کے ساتھ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ شاعری میں ان کو کس سے تلمذ تھا۔ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ وہ تبرکے یاس بغرض شاگردی گئے تھے مگر انھوں نے انکار کر دیا۔ یہ بات کسی قدر اعتبار سے مصحفی کی سند سے کہی جاسکتی ہے کہ ناسخ تنہا سے اصلاح سخن لیتے تھے جو مصحفی کے شاگرد تھے مگر یہ تعلق زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہا وہ اپنی ہی طبیعت پر زور دیتے تھے اور مشاعرہ کی غزلوں سے جو جو مزاولت بڑھتی جاتی تھی اسی قدر ان کو کلام پر قدرت حاصل ہوتی جاتی تھی بالآخر استاد ملنے جانے لگے اور خود بیسیوں شاگردوں کی غزلوں پر اصلاح دینے لگے جن میں سے اکثر مرتبہ کلام میں ان سے کم نہیں ہیں۔ ناسخ کو ورزش کا بہت شوق تھا۔ بڑے تن و نوش کے اور قوی اسکل آدمی تھے اور کھاتے بہت تھے شادی نہیں کی تھی۔ دن میں صرف ایک مرتبہ کھاتے تھے مگر اس وقت تقریباً پانچ سیر غذا نوش جان کر لیتے تھے۔ رنگ بیاہ تھا اسی وجہ سے ان کے حریف اور با مذاق لوگ دم کے ہاتھ سے

کی بھینسی کہتے تھے۔ روزانہ معمول یہ تھا کہ صبح سویرے اٹھتے درزش سے فراغت کر کے نہاتے پھر اپنے شاگردوں اور درستوں سے ملتے۔ اُس کے بعد قریب بارہ بجے کے کھانا کھاتے اور تھوڑی دیر آرام کرتے۔ سپہر کو پھر وہی شاگرد اور احباب جمع ہوتے اور شہنشاہی کا چرچا ہوتا۔ رات کو فکر سن کرتے جس میں اپنی غزلیں بھی کہتے اور شاگردوں کی غزلوں پر اصلاح بھی دیتے۔ بہت بڑے صاحبِ وضع تھے اور اسی پاسداری وضع کو دوسرے بھی چاہتے تھے جو ان سے ملنے آتے تھے ان کی صحبت اور باتوں میں بڑی کشش تھی اس واسطے کہ باوجود شاعرانہ بددماغی اور آزاد مزاجی کے لوگ کثرت سے ملنے آتے تھے جن میں اکثر لکھنؤ کے بڑے امرا اور رئیس ہوتے تھے خود کبھی کسی کی ملازمت نہیں کی اور اپنے قدردانوں کی قدر شناسی اور فیاضی کی بدولت نہایت آرام سے زندگی بسر کرتے تھے مشہور ہے کہ ۱۸۳۱ء میں نواب آغا میر نے سوال لکھ روپیہ ان کو دیا تھا وہ انھوں نے کہیں رکھوا دیا تھا لوگوں نے جانا انہی کے یہاں ہے چور نے رات کو نقب لگائی مگر کچھ نہ پایا انھوں نے تاریخ کی سے

وزیر در خانہ ناسخ چوزدہ نقیب امین	نہ زرد سیم نہ بدیس نجل آمد بیروں
بہر تاریخ مسخی جو بریدم سر وزد	وزد از خانہ مفلس نجل آمد بیروں

اس سے ہم کے ترجمہ کے بعد ۱۸۳۱ء نکلتے ہیں۔
 ناسخ ایک مرتبہ غازی الدین حیدر کے عہد میں لکھنؤ سے چلے گئے تھے۔ وجہ یہ سلامتی جاتی ہے کہ بادشاہ موصوف ان کو اپنے دربار سے متعلق کرنا اور خطاب ملک الشعرائی دینا چاہتے تھے ناسخ کو یہ امر بہت ناگوار ہوا اور یہ کہ خطاب پس کر دیا کہ غازی الدین حیدر کو نہ تو شاہانِ دہلی کا مرتبہ حاصل ہے اور نہ سرکارِ انگریز کا ایسا اقتدار۔ پھر میں ایسے بادشاہ کا خطاب لے کے کیا کروں۔ اس حقارت آمیز جواب سے بادشاہ کو غصہ آیا اور ناسخ کو طعن چھوڑنا پڑا۔ لکھنؤ سے وہ الہ آباد گئے جہاں چند روز قیام کیا۔ یہاں راجہ چندو لال

دیوان سلطنت آصفیہ حیدر آباد دکن نے ان کو بارہ ہزار روپیہ بھیجے اور ایک خط لکھا کہ اگر آپ دکن آئیے تو وہاں حسب مراتب آپ کی قدر و منزلت کی جائے گی۔ وطن کی محبت سے انھوں نے اس قدر دراز جانے سے انکار کیا۔ مشہور ہے ایک مرتبہ اور انھوں نے اسی قسم کا پیغام بھیجا تھا جس کے ساتھ پندرہ ہزار روپیہ بھی ارسال کیے تھے غازی الدین حیدر کی وفات کے بعد وہ لکھنؤ واپس آئے مگر حکیم ہندی کی دشمنی کی وجہ سے جو ان کے سرپرست اور قدر دان آغا میر کے دشمن تھے ان کو پھر لکھنؤ چھوڑنا پڑا۔ ایک مرتبہ فیض آباد آکر آباد بنارس کا پور اور ٹپٹنہ میں تھوڑے تھوڑے دن قیام کیا مگر وطن کی محبت کبھی نہ بھولے آخر کار حکیم ہندی کے انتقال کے بعد ۱۲۴۸ء میں پھر لکھنؤ واپس آئے۔ جہاں چند سال رہ کر ۱۲۵۰ء ہجری میں انتقال کیا میر علی اوسط رشاک نے تاریخ کسی سے

دلا شعر گوئی اٹھئی لکھنؤ سے

تصانیف ان کے تین دیوان ہیں جن میں سے دو زیادہ مشہور ہیں ایک دیوان آکر آباد کے قیام میں مرتب کیا جس کا سنہ تصنیف ۱۲۳۲ ہجری ہے اس کا نام دفتر پریشاں رکھا اب اس غزلوں رباعیوں اور تالیخوں کے سوا اور قسم کی نظم نہیں دوسرے اور تیسرے دیوان کا سنہ تالیف علی الترتیب ۱۲۴۸ء اور ۱۲۵۰ء ہے۔ ان کے دیوانوں میں جو تاریکیں ہیں ایسے بہت قابل قدر ہیں کہ ان سے اکثر ندمی گرامی شعر اور دیگر مشاہیر کا سنہ وفات معلوم ہو جاتا ہے یہ عجیب بات ہے کہ ناسخ نے کوئی قصیدہ نہیں کہا۔ ان کے کلام میں

لے غیر مؤلف کے پاس جو نسخہ کلیات ہے اس کے آخر میں عبارت ہے ”محمد شکر بفرایش شاہزادہ والا جاہ مرزا فرخندہ بہادر دہم اقبال کلیات رئیس شعرائے زمانہ و دفتر بلغائے آداں و علم و کل ناسخ شیخ امام بخش متخلص بن ناسخ دیوان اولیٰ شمس بہ دیوان ناسخ و در تن و دیوان دوم سہمی بہ دفتر پریشاں بر حاشیہ و دیوان سوم مسما بہ دفتر شعر“ دہر ردیف ملتی بہ دفتر پریشاں بتایہ چہارم حمادی الاول ۱۲۶۲ء مطبع مولائی داتہ بازار راجہ ٹیکٹ رائے مطبع کوہین

قصائد کی جگہ اکثر قطعات نے لی ہے چہرہ اور مذاق کا بھی پتہ ان کے یہاں نہیں۔
ان کی ایک مثنوی بھی ہے جس کا نام ”نظم سراج“ ہے جو تاریخی نام ہے۔ اس سے
۱۲۵۴ نکلتے ہیں یعنی اس سال ان کے شاگرد رشک نے ان کی وفات کے بعد
اس کو شائع کیا تھا ایک مودود شریف بھی شیخ صاحب کی تصنیف ہے مگر
یہ دونوں کتابیں مصنف کے پایہ سے بہت گری ہوئی ہیں۔

نارس کا اثر شاعری اور زبان پر | شیخ ناسخ تین چیزوں کے واسطے مشہور ہیں۔ ایک انکی
قادر الکلامی جو ان کی غزلوں سے معلوم ہوتی ہے۔ دوسرے وہ طرز جدید جو
انہوں نے ایجاد کیا تھا تیسرے ایک بڑی جماعت مشہور شاگردوں کی جن کو اپنے
بعد وہ چھوڑ گئے اس میں کوئی شک نہیں کہ ناسخ ایک مسلم الثبوت استاد تھے جن کو
زبان اردو و فارسی پر قدرت حاصل تھی شعر کی آرائش ظاہری کا حقہ کرتے تھے
لکھنؤ کے حلقہ شعرا میں ان کا بہت بڑا اثر تھا اور اب تک کسی متنازع فیہ ادبی مسئلہ
میں مثلاً کسی محاورے یا لفظ کی صحت کے متعلق ان کا کلام سند میں پیش کیا جاتا ہے
الفاظ اپنی جگہ پر خوب صرف کرتے تھے اور ایسے الفاظ جو سودا و تیر کے زمانہ کی یادگار
رہ گئے تھے ان سے احتساب کرتے تھے برخلات ان کے مصحفی زمانہ قدیم کے بہت
بڑے قسَم تھے۔ ناسخ کے کلام میں یہ نقص ضرور ہے کہ انہوں نے الفاظ کی تلاش و
جستجو پر ضرورت سے زیادہ توجہ کی اور بد نصیبی سے کہیں کہیں ایسے مغلق اور ادق
الفاظ فارسی و عربی داخل کرنا چاہے جو غزل کے شایان شان نہیں ہیں اسی وجہ سے ان کا کلام

لے اب حیات میں ڈھوڑے کے ایک تاریخ ان کی نکالی ہے جس سے ان کی تفریح طبع اور مذاق کا حال
معلوم ہوتا ہے۔ میر گھیسٹا نام ایک شخص مر گئے تو شیخ صاحب نے فرمایا ہے

جب میر گھیسٹا مر گئے ہائے ہر ایک نے اپنے منہ کو پیٹا
نارس نے کسی یہ سن کے تاریخ انہوں کو موت نے گھیسٹا

حسنِ ظاہری سے تو آراستہ ہے مگر دلچسپی اور تاثیر سے خالی ہے۔ یہی حال انگریزی میں پوپ شاعر کا ہے۔ جس میں کوئی ظاہری سقم تو نہیں مگر ردِ اثر مطلق نہیں ہے ناسخ کی غزلیں | اُن کی غزلیں شاندار الفاظ اور طرح طرح کی تشبیہات کا مجموعہ ہوتی ہیں۔ مگر جذبات و اثرات سے خالی ہیں۔ نقصانِ ان کے کلام کا اصلی جوہر ہے تشبیہیں اکثر نئی تو ہیں مگر عجیب ہوتی ہیں حسنِ ظاہری بجائے غرضِ ثانوی کے ان کے یہاں غرضِ اصلی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ الفاظ کی مناسبت کی بہتات میں شعر کا مضمون غلط ہو جاتا ہے۔ ان کی غزلیں صائب اور مرزا بیتدل کے رنگ میں ہوتی ہیں یعنی اول الذکر کی تشبیہات اور آخر الذکر کی نازک خیالیاں کہیں کہیں اُن میں پائی جاتی ہیں ناسخ کے چند ایسے اشعار جن میں عربی و فارسی کے الفاظ زیادہ استعمال کیے ہیں بطور نمونہ درج کیے جاتے ہیں۔

غیر کوثر کسی دریا کا میں سبیل نہیں ظلم طولِ شبِ فرقت کے قطاؤں نے کیا	بیشتر شیرِ خدا بن کہیں سیاح نہیں دادِ رس کوئی بجز خالقِ الاصلح نہیں
بے خطر یوں ہاتھ دوڑاتا ہوں زلفِ یار پر دیکھو ناسخ سرِ شیخِ معمم کی طرف	دڑتا تھا جس طرح ثعبان ہو گئی مار پر کیا گلے سواک کا ہے گنبدِ دستار پر
کیونکر اے ناسخِ خوارِ عمل دشمنِ ہونہ خوار	کسے موسیٰ کا علی شیرِ خدا ہاروں ہوا
معمولی کلام کا انداز یہ ہے:-	

روئے جاناں کا تصور میں جو فظا را ہوا وہ مرخانہ نشیں گلیوں میں آوارا ہوا محلِ مے میں جو آیا تو بوائے میکشی چشمِ بدِ دور آج کیا آتے نظر ہی گلِ صاف شبِ ہوا سے بل گئی جو اسکی زلفِ عنبریں	دل میں تھا جو داغِ حسرتِ عرش کا تارا ہوا اے مخم دکھنا ثابت بھی سیاہ ہوا تھا جو شیشہ جوشِ مے سے ایک فوارا ہوا بنزہ خط کیا غزالِ چشم کا چارا ہوا دمِ ہوا سے سارا عنبر سارا ہوا
----------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------	------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------

پٹھ پٹھے میرے بد کہنے سے زامیہ ملا	بیٹھ پر بارگشتہ کا جمع پشٹارا ہوا
دور بھینکا ساقیا لیتے ہی تیرے بھر میں	ہاتھ میں جامے گل رنگ انگارا ہوا
جب نہلنے کو ہوا عریاں وہ پتلا نور کا	حوض میں روشن رنگ شمع فور ہوا

دوستو جلدی خبر لینا کہیں ناسخ نہ ہو
قتل آج اُس کی گلی میں ایک بیچارا ہوا

تاریخیں تاریخ گوئی میں اُن کو خاص ملکہ تھا بات بات پر تاریخ کہتے تھے بعض
تاریخیں امت عمدہ اور دیکھ پ ہیں مثلاً کسی نے اُن کے خط طچرا لے تو کہا ہے

سیاہ ہنچم تسلیم بادروئے حاسد من

پھر چار خط جاتے رہے تو کہا ہے

صد حیف تلف چار نامہ

پیارے شاگرد خواجہ وزیر کا بیاہ ہوا تو فرمایا ہے

شدہ نوشتہ وزیر من امروز

جب ان کے یہاں لڑکا پیدا ہوا تو صبح کا وقت تھا فرمایا ہے

صبح طالع شد برآمد آفتاب

جب حکیم ہمدانی عز دل ہو کر فرخ آباد گئے تو انھوں نے تاریخ لکھی ہے

تاریخ بطرز نور مستم کن
سہ مرتبہ نصف نصف لم کن

افتاد حکیم از در ارت
از حائے حکیم بہشت بر گیر

تضیہ نہیں کہا تعجب ہے کہ اس صنف خاص میں انھوں نے کوئی توجہ نہیں کی
در حالیکہ اس کی ترتیب میں درود اثر کی زیادہ ضرورت نہ تھی بلکہ ان کا شوق شکوہ
الفاظ کا اس کا عمدہ معاون ہوتا۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ انکی فطری طبیعت کی آزادی
نے خوشامد اور چالوسی کی اجازت نہ دی ہو۔ وہ تصوف بھی بیگانہ ہیں۔ اُن کے بعض

اشعار جو صوفیانہ کہہ سکتے ہیں ان میں بھی خود انھیں کارنگ غالب ہے اور حقیقتی تصوف کہیں چھو نہیں گیا ہے۔ مزاح و طراقت کا بھی کہیں ان کے کلام میں ذکر نہیں۔ ان کی ہنسی بنادنی ہوتی ہے اور مذاق تھپس پھپھ کہیں مذہبی حملے اور طعن و تشنیع سے بھی کام لیتے ہیں مگر اُس میں کسی قسم کی لطافت اور خوبی نہیں ہوتی بلکہ ان کے مرتبے سے گری معلوم ہوتی ہے۔

نقائص کلام | کلام میں وہی نقائص جو عام طور پر ان کے ایجاد کردہ طرز میں پائے جاتے ہیں یعنی کسی عمدہ خیال کا ان میں پتہ نہیں۔ ان کے کسی شعر پر پڑھنے والے کا دل نہیں پھرکتا۔ نہ اُس میں کسی قسم کا انعکاس اور باریک نظری ہے۔ اشعار ٹھس اور بے لوح ہوتے ہیں عام طور پر نقائص کلام یہ ہیں فصیح اور تکلف فارسی تشبیہات جو اردو کا جامہ پہن کر بدنام ہو گئی ہیں۔ بڑے بڑے فارسی عربی سلتی الفاظ جن کی اردو غزل متحمل نہیں ہو سکتی شعر کی ظاہری آرائش کو مقدم سمجھنا معمولی ادبیت خیالات کا بے موقع اظہار شاندار الفاظ میں رُسرقہ کا بھی الزام ان پر لگایا جاتا ہے مگر سچ پوچھیے تو یہ دستور قدیم سے چلا آتا ہے۔

ناسخ کے کارندے | ناسخ اپنے تخلص کے اعتبار سے طرز قدیم کے مٹانے والے تھے مگر غور سے دیکھئے تو اس تغیر کا شوق اور خیال لوگوں کے دلوں میں پہلے سے چلا آتا تھا مگر انھوں نے اُس کی ابتدا کی اور اپنے کلام میں اُسکو برتا۔ مرزا حاجی صاحب اُس زمانہ کے ایک ممتول اور بار سوار رئیس تھے جو خود بھی ذی استعداد تھے اور انکی سرکار میں مرزا قاتل اور قاضی محمد صادق خاں اختر وغیرہ ایسے باکمال لوگ جمع رہتے تھے ناسخ کی خوش نصیبی سے مرزا کے دربار میں رسائی ہو گئی جہاں ایسے کامل لوگوں کی صحبت میں انکو بھی زبان کی تراش و خراش اور تحقیق و تدقیق کا شوق پیدا ہوا اور ان کے دل بڑھانے سے کام نے ردز ہونہ رنگ پکڑنا شروع کیا۔ رفتہ رفتہ طبیعت میں اُمنگ

اور دل میں جوش بڑھ گیا۔ غرض کہ مرزا حاجی کی ہربانی سے ان کی شاعری خوب چمکی اور اس کو لکھنؤ میں خوب فروغ حاصل ہوا۔ ناسخ نے جو تغیرات غزل میں کئے اُن میں سے بعض یہ ہیں۔ لفظ اُردو بجائے ریختہ کے استعمال کیا جو لکھنؤ میں جاری ہو گیا۔ مگر دلی میں عرصہ تک وہی پرانا لفظ قائم رہا۔ ایسی غزلیں کہیں جن کی رد نہیں اکہری۔ مثلاً کا۔ کو۔ ہے۔ نہیں۔ سے۔ نہیں۔ پر۔ تک وغیرہ ہیں۔ افعال میں بھی تیسرے کیا۔ مثلاً آئے ہے جائے ہے کی بجائے آتا ہے۔ جاتا ہے۔ اور آئیاں۔ دکھائیاں وغیرہ ترک کر دیا۔ یہ آخری فرق لکھنؤ اور دلی کی زبان کا بہت متاثر فرق تھا جو ابھی تک کسی قدر باقی ہے۔ ناہذب اور فحش الفاظ جو بعض قدما کے کلام میں پائے جاتے تھے انھوں نے خارج کر دیے۔ عربی اور فارسی الفاظ اور ترکیبوں کی طرف زیادہ توجہ کی اور ہندی الفاظ کو بے اوقات بے ضرورت خارج کیا۔ الفاظ کی تذکیر و تانیث کے سخت قواعد مقرر کیے۔ غزل کا دائرہ وسیع کیا الفاظ کا صحیح استعمال مقرر کیا ایک طولانی فہرست اس قسم کے تغیرات کی جو اُن کے زمانے میں عمل میں آئے۔ تذکرہ جلوہ خضر اور شعر الہند میں دی ہوئی ہے ناسخ کی تعریف یہ ہے کہ انھوں نے ایسے مقرر کردہ قواعد پر جو بھی سختی سے عمل کیا اور اپنے شاگردوں کو بھی در آمد پر مجبور کیا اُنکے انتقال کے بعد اُنکے شاگرد میر علی اور سطر شکست نے اُن سب تغیرات کو ایک کتاب کی صورت میں منضبط کیا شاگردا ناسخ کے بہت سے شاگرد تھے جن میں سے چند مشہور لوگوں کے نام یہ ہیں:-

دذیر۔ برق۔ رشک۔ بحر۔ منیر۔ تہر نادر۔ آباد طاہر۔

برق | فتح الدولہ بخشی الملک مرزا محمد رضا برق، مرزا کاظم علی خاں کے بیٹے اور واجد علی شاہ آخری تاجدار اودھ کے مصاحب خاص اور استاد بھی تھے۔ بادشاہ کے ساتھ اُن کو بہت محبت تھی چنانچہ جب بعد از نزاع سلطنت بادشاہ کلکتہ گئے تو وہ

بھی اُن کے ہمراہ تھے جہاں شاعر میں انتقال کیا۔ یہ شعر اُن کا اُن کے حصال ہے

برق جو کہتے تھے آخر وہی کر کر اٹھے
جان دی آپ کے دروازہ پہ مگر کر اٹھے

برق شاعری کے علاوہ بانکپن میں بھی مشہور تھے۔ بانک بنوٹ وغیرہ اچھی جانتے اور تلوار خوب لگاتے تھے۔ لکھنؤ میں باعتبار اُن کے عالی خاندان اور فی تربت ہونے کے اور نیز ان کے اخلاق و چہرہ کی وجہ سے اُن کی بڑی شہرت تھی۔ پُر گو شاعر تھے اور اپنے استاد نسخ کے متبع تھے اُن کے کلام میں بھی مثل ان کے استاد کے تکلف اور فصیح بہت ہے مگر زبان پر قدرت اور شعر میں مزہ ہے۔ ایک ضخیم دیوان چھوڑا جس میں مختلف اصناف سخن موجود ہیں ایک شہر آشوب لکھنؤ کی تباہی کا بہت درد انگیز لکھا ہے یہ بھی گو کہ اپنے پرانے رنگ میں ہے مگر اکثر اشعار بہت مؤثر و درد انگیز ہیں۔ جلال اور سحر ان کے دو مشہور شاگرد تھے نمونہ کلام یہ ہے:-

اذان دی کہیے مینا توں در میں بھونکا
کہاں کہاں ترا عاشق تھے پکار آیا

ولہ

قیس کا نام نہ لو ذکر جنوں جانے دو
دیکھ لینا مجھے تم موسم گل آنے دو

ولہ

نکلا غبار دل سے صفائی تو ہو گئی
اچھا ہوا جو خاک میں تم نے ملا دیا

ولہ

آتا نہیں قرار دل بیت راز کو
غم میں پھنسا ہوں دام بہت چھوٹ کر

سیر شیخ امداد علی حجر شیخ امام بخش اپنے استاد نسخ کے ہم نام کے بیٹے تھے

مگر پریشانی اور عشت میں گزری آخر عمر میں اب کلب علی خاں والی رامپور اُن کی

سرپرستی فرماتے تھے۔ رامپور ہی میں پچھتر برس کی عمر میں سن ۱۸۸۲ء میں اس دارفانی سے رحلت کی۔ ان کے دیوان کی ترتیب ان کے دوست نواب سید محمد خاں نند شاگرد آتش نے کی۔ ان کے کلام میں بھی پیچیدہ تہنیلیں اور دقیق استعارات پائے جاتے ہیں مگر پھر بھی اس قدر فصیح اور الفاظ کی بھرمار نہیں ہے جیسا کہ دیگر شاگردان ناسخ کے یہاں ہے۔ اکثر اشعار بہت صاف اور سلیس اور پُر اثر بھی ہوتے ہیں۔ صحت الفاظ اور تحقیق لغت کے اشارے تھے۔ ناسخ اور رشک کے بعد لکھنؤ کے دور متوسط کے شعراء میں بہت بڑا اور جبر رکھتے تھے اور تحقیق الفاظ کے معاملہ میں خاص کر بہت مستند سمجھے جاتے تھے۔ کچھ صاف و سادہ اشعار بطور نمونہ کے پیش کئے جاتے ہیں۔

میرا دل کس نے لیا نام بتاؤں کس کا	میں ہوں یا آپ میں گھر میں کوئی آیا نہ گیا
دک	
ظالم ہماری آج کی یہ بات یاد رکھ	اتنا بھی دل جلوں کا ستانا بھلا نہیں
دک	
مدت سے اتفات مرے حال پر نہیں	کچھ تو کجی ہے دل میں کہ یہ بھی نظر نہیں
دک	
افسوس ٹکڑ گئی رنج و طلال میں	دیکھا نہ خواب میں بھی جو کچھ تھا خیال میں
دک	
کیا کیا نہ مجھ سے سنگدلی دلیروں نے کی	پھر پڑیں سمجھ پہ نہ سمجھا کسی طرح

آباد | مرزا احمدی حسن خاں متخلص بہ آبا و مرزا غلام جعفر کے بیٹے تھے سن ۱۸۸۵ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ نوابان فرخ آباد سے سلسلہ قرابت رکھتے تھے اور لکھنؤ کے دوسرا میں شمار کیے جاتے تھے شعر گوئی سے بڑا شوق تھا۔ مقررہ اوقات پر اپنے مکان پر شاعرہ

کرتے تھے اور دوسرے مشاعروں میں بھی بالالتزام جلتے تھے پُر گوشتا عرتھے دہ
دیوان ایک تنوی اور تین واسوخت یادگار چھوڑے ہیں جن میں سے ایک دیوان مسموم
یہ انگارستان عشق لکھنؤ میں شائع ہوا تھا۔ ان کا ایک مجموعہ "بہارستان سخن" جس میں
ناسخ و آتش کی ہر طرح غزلیں جمع کی ہیں بہت مشہور ہے جس سے ان دونوں استادوں
کے کلام کے موازنہ کا بہت اچھا موقع ملتا ہے۔ آباد کے کلام میں کوئی خاص خصوصیت
نہیں، البتہ کہیں کہیں کوئی پھرتا ہوا شعر نکل آتا ہے۔

خواجہ وزیر علیؒ خواجہ محمد وزیر المتخلص بہ وزیر خواجہ محمد فقیر کے بیٹے تھے سلسلہ خاندان
ان کا باپ کی جانب سے حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند سے ملتا ہے لکھنؤ میں
عالی خاندان ہونے اور نیز اپنے ذاتی تقدس کی وجہ سے بڑی عزت سے بسر کی آخر
عمر میں گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی اور شعر و سخن سے نفرت ہو گئی تھی۔ فتوح اور تہذیب اعمال
کا بہت شوق تھا ہر وقت نقوش بھرا کرتے تھے۔ سود و پیسہ ماہوار سے خرچ کم نہ تھا
مگر آمدنی کہیں سے کچھ نہ تھی۔ آزادی مزاج کا یہ حال تھا کہ واجد علی شاہ بادی شاہ نے
دو مرتبہ یاد فرمایا مگر وہ کچھ نہ کچھ عذر کر کے اپنی جگہ سے ہلے نہیں بالآخر سن ۱۲۷۵ھ میں
وفات پائی منشی اشرف علی شاگرد نسیم دہلوی نے مادہ تاریخ خوب نکالا ہے۔

مرزا شعر کا ہائے جاتار ہا

ان کی وفات کے بعد ان کے شاگردوں اور دوستوں نے ان کا کچھ کلام بصورت
غزلیات جمع کر کے شائع کیا اور اس کا تاریخی نام "دفتر فصاحت" رکھا جس سے
سن ۱۲۷۵ھ فصلی مطابق سن ۱۲۷۵ھ اس کی تاریخ اشاعت نکلتی ہے۔ ان کے بہت سے
شاگرد تھے جن میں سب کے مشہور فقیر محمد خاں گویا ہیں خواجہ وزیر کا رنگ ہی ہے جو ان کے استاد
کا ہے مگر اس میں شک نہیں کہ اپنے استاد کے سب سے زیادہ مشہور اور سب سے زیادہ
محبوب شاگرد ہی تھے۔ مشکل مشکل طرحوں میں طبع آزمائیاں کی ہیں اور اپنے نظریہ کے

موافق خوب خوب شعر نکالے ہیں۔ حق یہ ہے کہ اپنے عہد کے شعرا میں خواجہ وزیر بہت بڑے پائے کے شاعر تھے نمونہ کلام یہ ہے۔

چلا ہے ادول راحت طلب کیا شادمان ہو کر	زمین کو سبے جانوں درخ دے گی آسمان ہو کر
اسی باعث تو نکل عاشقاں کو منع کرتے تھے	اکیلے پھر رہے ہو یوسف بے کار دال ہو کر
ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشق دلگیر کو	کیسے تیرا انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو
دلہ	

ہے شہر شہیم باز عجب خواب ناز ہے	فتنہ تو سو رہا ہے در فتنہ باز ہے
دلہ	

نہ کر عووض سے جرم و گناہ بے حد پر	الہی بخشہ کو غفور الرحیم کہتے ہیں
کہیں عدد نہ کہیں مجھ کو دیکھ کر محتاج	یہ ان کے بندے ہیں جن کو کرم کہتے ہیں

رشتہ سالہ
میر علی اوسط رشتہ میر سلیمان کے بیٹے تھے بزرگوں کا وطن نبض آباد تھا مگر ان کی نشوونما لکھنؤ میں ہوئی اور یہیں ان کی شاعری بھی پروان چڑھی ناسخ کے مشہور شاگرد تھے زیادہ تر ان کی شہرت ان کی مبسوط اور جامع لغت موسومہ بلفلس اللغات پر مبنی ہے جو زبان فارسی میں ہے اور اردو اور ہندی الفاظ و محاورات کی صحت کی تحقیق اس میں کی گئی ہے یہ تاریخی نام ہے جس سے سن تالیف ۱۲۶۵ھ نکلتا ہے وہ ان کی زندگی ہی میں مشہور و مقبول ہو چکی تھی اب اس کا ایک حصہ نشر کا کوہ دی نے چھپوا کر دفتر نور اللغات سے شایع کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے دیوان بھی ہیں جن کے علی الترتیب تاریخی نام "نظم مبارک" (۱۲۵۳ھ) اور "نظم گرامی" (۱۲۶۵ھ) ہیں رشتہ کا بھی رنگ یہی ہے جو ان کے استاد ناسخ کا ہے ان کا کلام بھی بالکل بے مزہ اور سیدھا پھیکا ہے اور اس زمانے کے عیوب اس میں بھی سب موجود ہیں رشتہ تاریخی گوئی میں بڑا لکڑھکتے تھے مات مات رتائیں کہتے تھے۔ اپنے بعد انھوں نے

بہت سے شاگرد چھوڑے جن میں مہینہ مشہور ہیں۔ مہینہ پہلے ناسخ کے شاگرد تھے مگر ان کے بعد رشک سے اصلاح سخن لیتے تھے۔ رشک کچھ دن کانپور اور الہ آباد میں بھی رہے ہیں آخر عمر میں کربلائے معلیٰ چلے گئے تھے اور وہیں ۸۲ سالہ میں ستر برس کی عمر میں وفات پائی، ان کا بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ صحت الفاظ کا بہت خیال رکھتے تھے اور خود اپنے استاد کے زمانے میں بھی اسی بات کے لیے مشہور تھے۔ ان کے کلام میں بلب و خیالی اور مضمون آفرینی کا پتہ نہیں معمولی باتیں کہتے ہیں اور بالکل معمولی طریقے سے کہتے ہیں۔ ان کو اس بات کا خیال تھا کہ جو لفظ جس طرح معمولی بول چال میں بولا جائے اسی طرح وہ نظم بھی لکھا جائے مثلاً ہم آپ میں آئیں گے تو وہ آئیں گے آپ ہی (آپ ہی)!

دل ہی میں سراغ در دل دار ملے گا

بہت پرگوشتھے مگر کلام رعایت لفظی اور ضلع جگت کی پیچیدگیوں میں ایسا پھنسا ہوا ہے کہ دو چار شعر بھی اچھے مشکل سے ملتے ہیں۔ انکی ایک طویل غزل ہے جسکی قافیہ "راگ و تاؤ" وغیرہ ہے چونکہ قافیہ مشکل تھا انھوں نے محنت و جانفشانی سے بہت سے ہم قافیہ لفظ جمع کیے تھے۔ نمونے کے طور پر چند شعر لکھے جاتے ہیں۔

وہ محبت نہیں وہ چاؤ نہیں
ایک دو تین چار تاؤ نہیں
یہ وہ دیو ہے جس میں تاؤ نہیں
اس طرح کا کوئی الاؤ نہیں
فرقت یار میں پلاؤ نہیں
پاؤ رونی ہے نانیاد نہیں
بارِ غم پر مراد باؤ نہیں
جس میں ذرہ کہیں بھراؤ نہیں

یار کو ہم سے کچھ لگاؤ نہیں
پرزوں میں دستخط کر دینا حال
گنگ کو بھر غم سے کیا نسبت
ایکی جاڑے ہیں اور نالہ و آہ
چاؤل الماس گوش لخت جگر
میرے کھانے سے کیوں فلک کباب
بجھیں کیوں طرح طرح زندیاں
یہ زمین غزل وہ ہے اے رشک

اتفاق سے "بلاؤ" کا قافیہ رہ گیا تھا اس کی کمی کسی ظریف نے پوری کر دی اور خود انھیں کی طرف منسوب کر دیا۔

دور سے چھٹے دکھاؤ نہیں
رشتہ بٹھا ہے بن بلاؤ نہیں

مہر مرزا حاتم علی بیگ متخلص بہ ہر شمس ۱۲۳۳ھ میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک مشہور خاندان اصفہانی کے نوہال تھے۔ اُن کے والد مرزا فیض علی بیگ قزلباش ایٹ ایٹا کمپنی کے عہد میں علی گڑھ کے تحصیلدار تھے۔ اُن کے دادا مرزا مراد علی خاں بھمد نواب شجاع الدولہ لکھنؤ آئے اور خطاب دکن الدولہ سے مسرراز ہوئے وہ کسی زمانے میں رائے بریلی کے ناظم تھے والد کا انتقال ان کی صغر سنی میں ہوا تھا مشہور ہے کہ اُن کو شہر گوئی کا شوق بچپن سے تھا اور چودہ برس کے سن میں شہر گئے تھے جب ان کے بھائی مرزا عنایت علی بیگ متخلص بہ ماہ آتش کے شاگرد ہوئے تو خود انھوں نے زانوئے شاگردی ناسخ کے سامنے نہ کیا اور کہتے کہتے پختہ کار ہو گئے ۱۸۷۱ء میں سرکاری امتحان پاس کر کے چنار گڑھ ضلع مرزا پور کے مصنف ہوئے چنانچہ اُن کا یہ شعر اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے

از بسکہ سوزِ بحر سے خوگر ہوئے ہیں ہم
مصنف چنار گڑھ کے مقرر ہوئے ہیں ہم

دہ عدالتِ عالیہ ہائی کورٹ کے وکیل بھی تھے ۱۸۷۷ء کے غدر میں انھوں نے چند انگریزوں کو پناہ دی تھی جس کے صلے میں خلعتِ فاخرہ اور دو گاؤں جاگیر میں سرکار سے عنایت ہوئے۔ اس کے بعد وہ آگرے آ گئے جہاں وکالت کرتے تھے اور کچھ دنوں آنریری مجسٹریٹ بھی کی ہے۔ ۱۸۷۹ء میں بمقام ایٹہ انتقال کیا۔ وہاں اُن کے بیٹے مرزا سخادت علی کچھ دن تحصیلدار رہے ہیں۔
ہر مذہب امامیہ رکھتے تھے مگر متعصب بالنگل نہ تھے اکثر مشہور لوگوں سے

دوستی تھی مثلاً غالب، انیس، دبیر، غلام امام شہید، صبا، منیر وغیرہ چنانچہ غالب کے اکثر خطوط اُن کے نام اُردو سے معاشی میں موجود ہیں۔ ہمارا اجد بلونت سنگھ راجہ بارس جو اُن دنوں آگرے میں ٹھہرے تھے ان کے شاگرد ہوئے اور پچاس روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کیا۔

تصانیف تھر کی اکثر تصانیف زمانہ غدر میں تلف ہو گئیں مگر کتب ذیل مطبوعہ وغیرہ مطبوعہ یادگار باقی ہیں۔

(۱) دیوان اُردو موسوم بہ ”الماس درخشاں“ تاریخی نام خیالات مہر (۱۲۸۶ھ) اس کو ان کے پوتے مرزا قاسم حسین قزلباش نے شایع کر دیا ہے۔
(۲) ”پیرایہ عروض“ ایک مختصر رسالہ فن عروض میں۔
(۳) ”ایاغ ونگستان“ ابتدائی عملداری انگریزی کی مختصر تاریخ ۱۸۷۳ء میں شائع ہوئی۔

(۴) ”مثنوی داغ نگار“ جو ایک دن میں لکھی تھی۔

(۵) ”داغ دل مہر“ داسوخت۔

(۶) ”مثنوی شعاع مہر“ ۱۸۷۵ء میں شائع ہوئی جس کی تعریف مرزا غالب نے اپنے خطوط میں بہت کی ہے۔

ان کے علاوہ ”مثلیہ عشرت“ ضبط اتمام ”ہمد آخرت“ بیان سخنائش ”عبد قیصریہ“ پنجہ مہر ”توقیر شرف“ اور اور کچھ نظمیں بھی اُن کی طرف منسوب ہیں۔ بہت پرگو تھے مختلف مضامین پر لکھتے تھے اور تاریخ خوب کتنے تھے دوسرے درجہ کے شعرا میں تھر کا مرتبہ بلند ہے۔ اُن کے کلام میں سلاست و روانی اتنا صائب اور زبلیں پر قدرت ہے۔ بعض اشعار اُن کے نہایت صاف و سلیس اور بہت پر لطف ہوتے ہیں۔
منیر سید اہل حسین متخلص بمنیر خلف سید احمد حسین شاد شکوہ آباد ضلع بن پوری

۲۴۱
 کے رہنے والے تھے لکھنؤ میں عرصے تک رہے اور یہیں تعلیم و تربیت پائی۔ اپنے اُردو دیوان "منتخبات عالم" کے شروع میں جو فارسی دیباچہ لکھا ہے اُس میں اُنھوں نے اکثر اپنے واقعات زندگی بیان کیے ہیں پہلے ناسخ سے پذیرِ لایہ خط و کتابت اصلاح سخن لیتے تھے پھر کانپور میں جب وہ نواب نظام الدولہ کی ملازمت میں تھے اور ناسخ وہاں پہونچے تو یہ اُن سے ملنے گئے اور رشتا گر دیو گئے اور اُنہی کی ہدایت سے بموجب وہ ارشاد سے بھی مشورہ کرنے لگے چنانچہ اپنے کلام میں ان دونوں بزرگوں کا ذکر بہت ادب و احترام سے کرتے ہیں اور ان کی قابلیت کی بہت تعریف کرتے ہیں کلکتہ مرثیہ آباد اور الہ آباد میں بھی رہے تھے مگر لکھنؤ کے عاشقوں میں تھے یہاں کی خیمیاں اُن کو مجبور کرتی تھیں کہ اپنی مستقل سکونت وہاں اختیار کریں اور شعر و شاعری کے جلسوں میں برابر شریک ہوں۔ اس شوق کا ذکر اُن کے کلام میں اکثر پایا جاتا ہے۔ لکھنؤ وہ کم سے کم سال میں ایک مرتبہ ضرور آتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ یہاں ظفر الدولہ نواب علی اصغر خاں کے ملازم بھی ہو گئے مگر تھوڑے دنوں کے بعد پھر کانپور واپس جانا پڑا جہاں تھوڑے دن رہنے پائے تھے کہ لکھنؤ کی کشش نے پھر زور کیا اور اب کی مرتبہ نواب سید محمد ذکی متخلص بہ ذکی کے سلسلہ رفقاء میں داخل ہوئے اور اُن کے کلام کو اصلاح بھی دینے لگے لکھنؤ میں دو سال قیام کر کے نواب نجل حسین خاں کی فرمائش سے فرخ آباد گئے جہاں نواب موصوف کی حین حیات قیام کیا۔ اسی عرصے میں ہمارا جگان دھولپور اور اوروں نے بھی اُن کو اپنے دربار میں طلب کیا تھا مگر انھوں نے باندے میں ملازمت کر لی جہاں نواب علی بہادر والی ریاست کے استاد مقرر ہو گئے۔ بعدِ غدر ایک رنڈی مسماۃ نواب جان کے قتل کی سازش میں ان پر مقدمہ قائم ہوا اور کالے پانی کی سزا تجویز ہوئی مگر ۱۸۶۷ء میں قید سے رہائی پائی۔ بالآخر مجدد نواب کلب علی خاں رامپور میں قیام کیا اور ہمیں کی خاک میں ۱۸۷۱ء میں آرام کیا۔

تصانیف تین دیوان یادگار چھوڑے ہیں (۱) منتخبات عالم (۲) تنویر الاشعار (۳) نظم منیر۔ مثنوی معراج المضامین جس میں ائمہ معصومین کے کشف و کرامات بیان کئے ہیں انھیں کی تصنیف ہے۔ بہت پُرگو شاعر تھے اور مرتبہ بھی کہتے تھے مرتبہ میں مرزا دبیر کے شاگرد تھے۔ قصیدے بڑے زوردار کہتے تھے اور قطعہ پرانی محسن و غنیرہ میں بھی بہت زور و طبیعت دکھاتے تھے۔ ان کا رنگ ان کے استاد ناسخ اور رشک کا سمجھا جاسیے۔ اکثر اشعار میں بلند پروازی اور عمدہ تخیل ہے، قطعات بہت صاف سادہ اور سلیس ہیں، غزلوں میں پورا لکھنؤ کا رنگ ہے مختصر یہ کہ منیر کا کام مرتبہ اُس زمانے کے شعرا میں بہت بلند ہے۔

آتش مثنوی ۱۲۳۰ ہجری | خواجہ حیدر علی آتش خلیفہ خواجہ علی بخش دہلی کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد نواب شجاع الدولہ کے عہد میں دہلی چھوڑ کر فیض آباد آئے اور محلہ مغلیہ روہ میں سکونت اختیار کی۔ آتش کی ولادت فیض آباد میں ہوئی۔ یہ بہت صغیر سن تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا اسی وجہ سے تعلیم سے بھی محروم رہے اور بُری صحبت میں بیٹھ کر مزاج میں شہیدہ سری اور بانک پن آگیا نواب مرزا محمد تقی خاں ترقی کی ملازمت اختیار کر لی اور انھیں کیساتھ لکھنؤ آئے۔ یہاں اُس زمانے میں مصطفیٰ اور انشا کے زوردار مقابلے ہو رہے تھے۔ اسی کو دیکھ کر ان کو بھی شعر و سخن کا شوق پیدا ہوا مصطفیٰ کے شاگرد ہو گئے اور چند روز کی محنت میں ایسی مشق ہم پہونچائی کہ خود صاحب طرز ہو گئے۔ ناسخ اور انشا کی طرح ان کی استعداد علمی درجہ تکمیل کو نہیں پہونچی تھی۔ البتہ درسی کتابیں دیکھی تھیں۔ اور ایک رسالہ فن عروض کا عربی میں پڑھا تھا۔

ناسخ اور آتش کی طرز زندگی میں بھی مثل ان کے کلام کے بین فرق تھا آتش نہایت سادگی سے زندگی بسر کرتے تھے جس میں تکلف اور تصنع کو مطلق دخل نہ تھا۔ وہ حُسن کے

عاشق تھے اور آزاد مزاج واقع ہوئے تھے سپاہیانہ وضع اور لباس رکھتے تھے مگر اس میں بھی بالکین کو دخل تھا تلوار باندھتے تھے اور مشاعروں تک ہیں اپنے ساتھ لے جاتے تھے قناعت اور توکل کے ساتھ زندگی بسر کی کبھی کسی امیر کی اُس کی دولت کی وجہ سے خوشامد نہیں کی۔ شاگرد کبھی کبھی خود سلوک کرتے تھے مگر ان کا دست سوال کسی کے سامنے دراز نہیں ہوا۔ اسی روپیہ مہینہ بادشاہ کے یہاں سے ملتا تھا جس سے مشکل گزارہ ہوتا تھا۔ اور کبھی کبھی کوئی شاگرد بھی اعانت کرتا تو کوئی انکار نہ تھا۔ محلہ معالیجاں کی سرائے میں ایک ٹوٹا پھوٹا مکان تھا جس میں غریباً موزندگی بسر کرتے تھے۔ مزاج میں انتہا درجہ کی وضع داری اور خود داری تھی۔ اُمرار سے بہت نوک کی لیتے تھے۔ مگر معمولاً بہت منکسر المزاج اور خلیق واقع ہوئے تھے آخر میں ان سے اور ان کے استاد مصحفی سے کچھ بگاڑ ہو گیا تھا اصلاح لینا بند کر دی تھی اور آپ اپنی غزلوں پر ایک گہری نظر اصلاحی ڈالتے تھے ناسخ کے معاصر تھے۔ لکھنؤ اس عہد میں دو فرقوں پر منقسم تھا ایک جانب داران ناسخ دوسرے داران آتش۔ اس آپس کے مقابلہ سے یہ فائدہ ضرور تھا کہ دونوں استادان سخن مقابلہ کے خیال سے طبیعت پر بہت زور دے کر کہتے تھے۔ البتہ ایک لطیف پیرایہ میں ایک دوسرے سے نوک جھونک مچتی رہتی تھی مگر انشا اور مصحفی کی طرح دائرہ تہذیب سے باہر نہ ہوتے تھے۔ اس قسم کے دو چار شعرونما لکھے جاتے ہیں۔

ناسخ

ایک جاہل کہہ رہا ہے میرے دیوان کا جواب

بو مسلم نے کہا تھا جیسے قرآن کا جواب

آتش

اس پر آتش نے یہ کہا

کیوں نہ دے ہر دم اُس ملحد کے دیوان کا جواب

جس نے دیوان پناٹھرایا ہے قرآن کا جواب

آتش نے ایک مرتبہ کہا

یہ بزم وہ ہے کہ لایخیر کا مقام نہیں
ناتسخ کی طرف سے جواب دیا گیا۔

جو خاص بندے ہیں وہ بندہ عوام نہیں
ہزار بار جو یوسفؑ کے غلام نہیں
مگر باد جو دامن سب کے آتش اپنے حریف ناتسخ کا بہت احترام کرتے تھے چنانچہ
مشہور ہے کہ ناتسخ کی وفات کے بعد انھوں نے شعر کہنا چھوڑ دیا۔ آتش نے ۱۲۶۳ھ
میں انتقال کیا۔ رشک نے تاریخ — کہی ہے

خواجہ حیدر علی لہجہ و امر دند

طرز کلام | کلام میں اُن کے تخلص کے اعتبار سے گرمی بہت ہے۔ تفسیر اور تکلف
مطلق نہیں۔ نہ معمولی اور مبتذل خیالات ہیں جن کا عیب شکوہ الفاظ سے چھپایا گیا
ہو نہ سجا اور فضول مقبولوں سے شعر بے مزہ کئے گئے ہیں ترشے موعی الفاظ آبدار
موتیوں کی طرح لڑی میں پروئے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اکثر اشعار میں روانی
موسیقیت کی حد تک پہنچ گئی ہے۔ محاورات ایسے بر محل استعمال کئے ہیں کہ
شاعری مرصع سازی معلوم ہوتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ ان کی شاعری میں تیز العکاس
اور حیر کی طرح درد و اثر کی تڑپ نہیں ہے پھر بھی ان کے بعض اشعار پوری اُردو
شاعری میں اپنا جواب نہیں دے سکتے۔ تیز و غالب کے بعد اگر کسی کا مرتبہ ہے تو وہ
آتش ہیں۔ بڑی خوبی ان کے کلام کی یہ ہے کہ جذبات کو نہایت مؤثر اور دلکش الفاظ
میں ادا کرتے ہیں۔ فوق البھوک الفاظ ان کے یہاں بہت کم ہیں۔ زبان مزیدار اور
مرد و مرہ کی بول چال ہے جس میں ابتذال نہیں ہے۔ شعر باسانی سمجھ میں آتے ہیں
اور بہت لطف دیتے ہیں۔ محاورات بہت منتخب اور بر محل ہوتے ہیں تلاش
الفاظ بہت قابل تعریف ہے۔ خیالات میں بلندی ہے۔ اگرچہ غالب کی ایسی
نہیں اور عموماً فواہش سے پاک صاف ہیں۔

قصایف | پہلا دیوان خود انھیں کی زندگی میں شایع ہو گیا تھا اور نہایت مقبول ہوا تھا۔ دوسرا دیوان جسے پہلے دیوان کا ضخیمہ سمجھا جاتا ہے ان کے عزیز شاگرد میر دوست علی خلیل نے ان کے مرنے کے بعد مرتب کر کے پہلے دیوان میں شامل کر دیا۔ انھوں نے سوائے غزل کے اور کسی صنف شعر میں طبع آزمائی نہیں کی۔

نقائص کلام | بعض کوتاہ نظر لوگ ان کے کلام میں یہ سقم نکالتے ہیں کہ ان کے یہاں فقط باتیں ہی باتیں ہیں کلام میں سبستگی اور اشعار میں مضامین عالی نہیں اور اس سے نتیجہ ان کی بے استعدادی کا نکالتے ہیں مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ حقیقی شاعری علم و فضل پر مبنی نہیں ہے گو اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ کم علمی کی وجہ سے وہ اکثر الفاظ غلط استعمال کرتے تھے۔ مثلاً المضاف بجائے المضاعف، حلوہ بیدودہ بجائے حلوائے بیدودہ کفار بجائے کفارہ، بقتلید فامطالع بجائے مطالعہ وغیرہ اس کے جواب میں ان کی طرف سے یہ عند پیش ہو سکتا ہے کہ انھوں نے تلفظ و وجہ کے موافق ان الفاظ کو استعمال کیا۔ اور لغوی صحت کی طرف توجہ نہیں کی اور بہت اچھا ہوا کہ انھوں نے زیادہ تحقیق سے کام نہیں لیا کیونکہ اسی چھان بین نے زبان کو سخت اور بے لوج کر دیا اور اجنبی غیر ملکی الفاظ کی بھر مار کر دی

ناسخ اور آتش کا مقابلہ | دونوں زبان اردو کے کامل استاد اور صاحب طرز تھے۔ اب اس زمانے میں ناسخ کا رنگ پھیکا پڑ گیا اور لوگ اس کو پسند نہیں کرتے البتہ جب وہ اپنے عروج پر تھا تو اس کی بڑی قدر تھی اور وہ بہت مقبول تھا۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اپنے تذکرہ گلشن بنیارس میں ناسخ کو آتش پر ترجیح دیتے ہیں اور شیخ صاحب ہی لے نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے اپنے تذکرہ گلشن بنیارس میں آتش کے حال میں جو ان کا اور ناسخ کا مقابلہ کیا ہے وہ عجب گول گول الفاظ میں ہے جس سے کسی کی کمتری یا کسی کی کثرتی صاف طور پر نہیں ثابت ہوتی، فرماتے ہیں مردم ان دیار آتش و ناسخ را کہ از اساتذہ (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

۲۴۲
 کے کلام کو زیادہ پسند کرتے ہیں مگر غالب اپنے ایک خط میں آتش کو فوقیت دیتے
 ہیں اور لکھتے ہیں کہ ان کا کلام بہت موثر ہے حق یہ ہے کہ بندش کی جتنی، الفاظ کی
 حلاوت، اور مضمون کی بلندی میں آتش کو ناسخ پر یقیناً فوقیت حاصل ہے آتش
 کے یہاں الفاظ نہایت شیریں اور مزیدار ہوتے ہیں۔ بخلاوت ناسخ کے کہ ان کو
 موٹے موٹے الفاظ کا شوق ہے آتش کے استعارے نچرل ہوتے ہیں۔ ان میں بے تکلفی اور
 تڑپ ناسخ کی نسبت زیادہ ہوتی ہے آتش کے خیالات بہت رفیع ہیں اور
 ان کا گیر کیٹر آزادانہ اور فقیرانہ ہے جس کی ناسخ کے یہاں کمی ہے۔ صوفیانہ مضامین
 یہ نسبت ناسخ کے آتش کے یہاں بہت زیادہ ہیں مختصر یہ کہ ناسخ کے کلام میں
 صرف شکوہ الفاظ اور استعارات تشبیہیں ہیں اور جو مزہ اور حلاوت کہ آتش کے یہاں ہے انہیں

سلم آجاست قریب ہم انگارند دہر در اہموزن شاردن و قباححت این عمیق لایحی علی من لہ حظ من انعم
 اگر ناسخ کو وہ فوقیت دیتے تو یقیناً ان کے کلام کو بھی وہ ضرور پسند کرتے اور اس کے دیکھنے کا
 اشتیاق ان کو ضرور ہوتا مگر تعجب ہے کہ اسی تذکرہ میں ناسخ کے حال میں لکھتے ہیں
 ”دیوانے دیگر از انکار و قادش فراہم آمدہ ہم در شہر رسید اما خاطر اسودگی جواز انتخاب ان
 بایستاد“ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ”در سرا دیوان دیکھنے کو نواب صاحب کا جی نہیں چاہا پھر کیونکر
 ہالیفین کہا جاسکتا ہے کہ وہ ناسخ کو آتش پر فوقیت دیتے تھے۔“

۱۷ مزہ غالب نے اپنے ایک خط میں جو جو دھری عبدالغفور کے نام ہے یہ قطعہ نقل کیا ہے

اگرچہ شاعران لغتہ گفتار	زیک جام اند در نرم سخن مست
دلے بابادہ بعضے حسہ لیاں	خامو چشم ساقی نیر پوست
مشو منکر کہ در اشعار این قوم	درائے شاعری چیزے دگر بہت

اس کے بعد اس ”حیزے دگر کی مثال میں میر تقی میر، سودا، مومن، اور قاسم کا ایک ایک
 شعر پیش کر کے لکھا ہے کہ ”ناسخ کے یہاں کمتر اور آتش کے یہاں بیشتر یہ تیز فشر ہیں۔“

مطلق نہیں ہے۔ زبان کی صحت اور صفائی دونوں کے یہاں بے مگر اس میں
 شک نہیں کہ بحیثیت ایک حقیقی شاعر کے آتش کو ناسخ پر ترجیح ہے
 شاگرد | آتش کے مشہور شاگرد حسب ذیل تھے۔ رند، صبا، خلیل، شمیم، نواب مرزا
 شوق اور آغا جوشرف۔ نمونہ کلام یہ ہے:-

آئیے بھی لوگ بیٹھے بھی اٹھ بھی کھڑے ہوئے اللہ رے شوق اپنی جبین کو خبر نہیں بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا قاصدوں کے پانوں توڑے بگمائی مری اس بلاے جاں سے آتش دیکھئے کیونکر نبھے مشتاق درد عشق جگر بھی ہے دل بھی ہے کو چہ یار میں سایہ کی طرح رہتا ہوں رخسار زرد پر مرے بہتے ہیں اشک خوں یہ کیفیت اُسے ملتی ہے ہو جس کے مقد ہیں پر کرتا ہے مرے صیاد نو کاٹ اس طرح باغ میں آئے ہو ساتھ انکے بھی پھر لو دو کام	میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا اس بُت کے آستانہ کا پتھر رگڑ گیا جو چیرا تو اک قطرہ خوں نہ نکلا خط دیا لیکن نہ بتلایا نشان کوئی دوست دل سوا شیشہ سے نازک دل سنا ز کوئی دوست کھاؤں کدھر کی چوٹ بچاؤں کدھر کی چوٹ در کے نزدیک کبھی ہوں کبھی دیوار کے پاس یکجا دکھاؤں خزان و بہار رنگ مئے الفت نہ خم میں ہے نہ شیشہ میں ساغر میں حسرت پر داز بھی اڑ جائے بال پر کے کھاتہ لبک طاؤس کا جھگڑا ہی چکاتے نہ چلو
سننے والا نہیں ہے رونے پر پیامبر نہ بیس ہوا تو خوب ہوا	ہم کو غربت وطن سے بہتر ہے زبان غیر سے کیا شرح آزد کوئے
سوے نام کے باقی اثر التان سے نہ تھے	زمین سے دب گئے دبے جو کھاس سے نہ تھے
شگفتہ رہی ہے خاطر ہمیشہ سفر ہے شرط مسافر نواز بہتر ہے	تقاعدت بھی بہار بنجراں ہے ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے
نقش پا سے رنگاں سے یہ صدا ہے آرہی	د قدم میں راہ طے ہے شوق منزل چاہیے

انوس ہے فریاد کو پہلے ہی نہ سوجھی | سر پھوڑ کے مرجائیے اس کو کہتی سے

رند | نواب سید محمد خاں تخلص بہ رند سراج الدولہ نواب غیاث محمد خاں کے بیٹے

تھے ۱۲۱۳ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے چونکہ نواب وزیر کے خاندان سے قریبی تعلق تھا (ان کے والد نواب برہان الملک سعادت خاں کے حقیقی بھائی تھے)

اس واسطے ہو گیا صاحبہ کے دامن تربیت میں ناز و نعمت سے پرورش پائی جب تک فیض آباد میں رہے اپنا کلام میر حسن خلیق کو دکھلاتے اور وفا تخلص کرتے تھے

۱۲۲۰ء میں لکھنؤ چلے آئے اور یہیں سکونت اختیار کر لی لکھنؤ اگر خواجہ حیدر علی آتش کے شاگرد ہوئے۔ اور اب رند تخلص رکھا۔ پہلا دیوان جو گلستانہ عشق کے نام سے مشہور ہے ۱۲۵۰ء میں مرتب ہوا۔ دوسرا دیوان ان کی وفات کے بعد شائع ہوا

تخلص کی مناسبت سے رندانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ اور دربار اودھ کی مشہور عشق عشرت اور مزہ داریوں کا پورا لطف اٹھاتے تھے۔ اپنے استاد آتش کے مرے کے بعد شراب چھوڑ دی تھی اور مہنیات سے تائب ہو گئے تھے۔ اسی عرصہ میں بارادہ ج روانہ ہوئے مگر راستہ میں بمقام بھئی عین غدر شروع ہونے سے کچھ دنوں پہلے سفر آخرت اختیار کیا۔ کلام ان کا نہایت صاف اور سادہ ہے جس میں محاورات کی برجستگی اور تاثیر کا رنگ بھلکتا ہے۔ بلند پروازی اور خیال آفرینی ان کے یہاں کم ہے۔ مگر مذاق شعر بہت سلیم ہے اور ان کے اشعار مہذب کانوں پر ناگوار نہیں ہوتے۔ کچھ ایسے بھی اشعار پائے جاتے ہیں جن میں روحانیت اور تصوف کی جھلک ہے غرض کہ آتش کے شاگردوں میں ان کا بہت بڑا درجہ ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

دید لیلیٰ کے لئے دیدہ مجنوں ہے ضرور | میری آنکھوں سے کوئی دیکھے تماشہ تیرا

ولہ

پھینک دیں گے اسے ہم حیر کے پہلو اپنا | تجھ پر قابو نہیں دل پر تو ہے قابو اپنا

دلہ		
آغند لب تل کے کریں آہ و زاریاں	تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل	
مقابلہ کرو۔		
بنال بیل اگر بامنت سر پار سیت	حافظ کہ مادو عاشق زاریم و کارما زار سیت	
اسے بیل اگر نالی من باتو ام آواز م	سدا تو عشق گلے داری من عشق گل اندامے	
اودل ہدف تیرنگہ پھر کیا تو نے	اگلے ہی رب زخم کھٹے ابھی آلے	
دلہ		
دو چار گام ہاں سے ہے دو تیر لگو بہت	ٹوٹیں یہ پاؤں دیکھو تو آکر کہاں تھکے	
قطرہ		
بس باب آپ شریف لیجائیے	گزر رہی ہے جو کچھ گزر جائے گی	
طبیعت کو ہو کا قلع چند روز	ٹھرتے ٹھرتے ٹھہر جائے گی	
خلیل	میر دوست علی متخلص بہ خلیل سید جمال علی کے صاحبزادہ تھے اور بدولی ملک اودھ کے رہنے والے تھے یہ بھی آتش کے مشہور شاگردوں میں ہیں۔ ۱۲۵۹ء میں نواب ناور مرزا کی رفاقت میں کلکتہ گئے۔ ان کے کلام میں ناہمواری ہے بعض اشعار نہایت عمدہ اور بلند اور بعض بالکل معمولی ہیں۔ ان کو بھی غیر مانوس الفاظ اور رعایت لفظی کا بہت شوق ہے شعر عاشقانہ ہوتے ہیں مگر وہی عشق مجازی اور بعض میں ابتذال پایا جاتا ہے۔	
نسیم	پنڈت دیبا شکر کول متخلص بہ نسیم خلف پنڈت گنگا پرشاد کول آتش کے شاگرد اور مثنوی گلزار نسیم کے مشہور مصنف ہیں۔ پنڈت جی عموماً اپنے تخلص ہی سے مشہور ہیں۔ ایک معزز گنیمیری خاندان سے تعلق رکھتے تھے ۱۲۲۶ء میں پیدا ہوئے اور جوانی کی حالت میں ۱۲۶۷ء میں بمصر ۳۲ سال انتقال کیا	

فارسی میں کافی دستگاہ رکھتے تھے اور بہدا مجد علی شاہ پادشاہ اودھ فرج میں بخشی گری کے عہدہ پر مامور تھے۔ بچپن ہی سے اُن کو شعر و سخن سے شوق تھا چنانچہ اکثر اساتذہ اودھ و فارسی کا کلام بخوبی پڑھا تھا بعد ۲۰ سال آتش کے شاگرد ہوئے ان کی زندہ جاوید تصنیف شتوی گلزار نیم شتوی میر حسن کے جواب میں ہے مشہور ہے کہ پہلے یہ بہت ضمیمہ تھی مگر اساتذہ کے کہنے سے اُنھوں اس کو مختصر کر دیا۔ اور اب یہ اختصار کی ایک لا جواب مثال ہے۔ اس کا سنہ تصنیف ۱۲۵۲ھ اور سنہ اشاعت ۱۲۶۰ھ ہے اس وقت مصنف زندہ تھے اور اس کی اشاعت سے دفعتاً اُن کی شہرت ہو گئی۔ اس کا ایجاز۔ روانی۔ مناسبت الفاظ پر جستگی محاورات نادر تشبیہات و استعارات۔ یہ سب قابلِ تعریف ہیں۔ البتہ تصنیع ضرور ہے۔ اور اسی وجہ سے اس کی حقیقی دلاویزی اور تاثیر میں کمی ہے۔ فن کے لحاظ اور تخیل کے اعتبار سے یہ ایک معرکہ الاراء تصنیف ہے۔ شتوی بحر البیان سے اس کا مقابلہ ایک فضول سی بات ہے کیونکہ دونوں کا طرزِ بیان ہے۔ یہ شتوی اس قدر مقبول ہوئی کہ اس کے بہت سے اشعار بطور ضرب المثل زبان پر چڑھ گئے ہیں اس سے پندت و دانشگر کا نام ہمیشہ کے لیے روشن ہے اور وہ اودھ کے ایک ایسے ناز شاعر کہلائے جانے کے قرار واقعی مستحق ہیں۔

صبا میر وزیر علی نام۔ میر بندہ علی کے بیٹے تھے لکھنؤ وطن تھا۔ یہیں پیدا ہوئے اور یہیں ان کا نشوونما ہوا۔ اُن کے چچا میر اسرف علی نے اُن کو بیابانیا تھا اور انھوں ہی نے اُن کو بقدر ضرورت عربی اور فارسی کی تعلیم دی تھی۔ صبا بہت خلیق اور سلنار اور بڑے یار باش آدمی تھے۔ اُن کے دوست احباب ہر وقت اُن کے پاس رہتے تھے اور ان کی خاطر تواضع یہ دل کھول کر کرتے تھے دوسرے نو پیہ واجد علی شاہ کی سرکار سے اوٹھ کر نو پیہ ماہوار نواب حسن الدولہ کے یہاں سے ملتے تھے خود آتش کے مشہور شاگرد تھے اور اپنے بھی بعض مشہور شاگرد چھوڑے۔ ۱۲۸۰ھ میں گھوڑے سے

گر کر جان دی۔ ان کا ایک منجم دیوان عاشقانہ رنگ میں شایع ہو گیا ہے جس کا نام غنیمت آرزو ہے۔ ایک مثنوی شکار نامہ واجد علی شاہ بھی ان کی یادگار ہے۔ ان کے کلام میں تصنع اور آواز اور غیر مانوس الفاظ کی کثرت ہے کبھی کبھی کوئی ٹڑپتا ہوا شعر اپنے استاد آتش کے رنگ میں بھی کہہ جاتے ہیں۔

آغا جوشرف میر سادات حسین خاں نام عرف آغا جودا جودا علی شاہ بادشاہ اودھ کے سہمی یعنی مرزا حامد علی کو ریت و لیمہ کے خسر تھے۔ غدر کے بعد اودھ کے نصیب زدہ قافلہ کے ساتھ یہ بھی کلکتہ چلے گئے اور قیام راج میں ولیمہ کے عہدہ تھے اتفاق سے ولیمہ کا عین جوانی میں انتقال ہو گیا جس سے ان کو سخت صدمہ ہوا جو کلام سے ظاہر ہو رہا ہے۔ ان کا طرز کلام وہی ہے جو لکھنؤ اسکول کے شعرا کا ہے۔ یعنی زبان نہایت صاف و سلیس۔ بدشیں اور ترکیبیں دلچسپ۔ البتہ مضمون آفرینی کی کمی ہے۔ فارسی اور عربی الفاظ ان کے کلام میں بہت کم ہیں۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

جہاں میں حسن پرستوں کی جان لینے کو	نکھڑے نکھڑے بنکھنے میں خبر دیا کیا
ٹپک ٹپک کے کہیں گل بنا کہیں لالہ	چمن میں رنگ نہ لایا مرا لہو کیا کیا
زباں جو ان کی شرف نشہ میں بہکتی ہے	مڑے مڑے کی وہ کرتے ہیں گفتگو کیا کیا
پھڑک کے جان نہ دیتا تو آہ کیا کرتا	فقس سے اور بنکھنے کی ساہ کیا کرتا
شاخ گل جھوم کے گلزار میں میٹھی جھوٹی	پھر گیا آنکھ میں نقشہ تری انگڑائی کا
رما کے دھوئی جو بیٹھا ہوں مانگ پر اس کی	اسی کیسے کا مجھ کو فقیر ہونا تھا

اس دور میں زبان میں تہذیب جملہ حاضر اور شعرا ہند میں ایک مختصر فہرست ان تغیرات کی دی ہے۔ جو تاریخ اور آتش اور نیز ان کے شاگردوں کے عہد میں نظم اردو میں قوس میں آئے وہ تغیرات یہ ہیں غیر مانوس اور بوئے فارسی اور عربی الفاظ

ادھر کیوں کی کمی۔ اکثر ہندی الفاظ جو ترک کر دئے گئے تھے اُن کا پھر داخل شعر کیا جانا بہت
اُن محاورات کا استعمال جو حسن شعر کو بڑھائیں اور بر محل ہوں مشتوق کا غلط خیال گل میل
سرد قمری وغیرہ کے رواج اور دروازہ کار تشبیہات استعارات اور فضول مبالغوں کی کمی۔

باب ۹

در بارہ لکھنؤ اور اس کے شعرا واجہ علی شاہ اختر کا عہد

جس طرح دہلی اردو شاعری کا گہوارہ تھا۔ اسی طرح اُس کے زوال کے بعد لکھنؤ اُس کا
مسکن دامن بن گیا۔ اس وجہ سے کہ دہلی کے سب پرانے استاد مثل آرزو اور تمیر و سودا
و تنویر وغیرہ کے اپنا وطن چھوڑ کر اور فرماں روا یاں اودھ کی داد و دہش اور جو د و سخا کے
افسارے سن کر لکھنؤ چلے آئے۔ شاہان اودھ نے بادشاہان دہلی کے تتبع میں نہ صرف
بڑے بڑے شاعر اپنے ہمارے میں جمع کئے تھے بلکہ خود بھی شعر و سخن کی طرف متوجہ ہو گئے
تھے۔ چنانچہ فرماں روا یاں فیروز خان کا مختصر ذکر کیا جاتا ہے سب شاعر تھے۔

آصف الدولہ آصف | نواب آصف الدولہ متخلص بہ آصف شعر و سخن کے بڑے

قد روان و مربی تھے جن کی سخاوت اب تک ضرب المثل ہے۔ نواب سچئی خاں نامہ
مرزا امالی عرف آصف متخلص تھا۔ نواب شجاع الدولہ بہادر کے فرزند و لہجہ اور نشانی
تھے۔ ۲۷ برس کی عمر میں بمقام فیض آباد ۱۱۸۵ھ میں منہ نشین ہوئے۔

تاریخ جلاوس یہ ہے

رونی مندر وزارت ہند

گشت از پائے آصف الدولہ

اس میں ہر کے تعمیر سے جو لفظ آصف الدولہ کی آخری ہ کے عدد ہیں ۸۰۰ لکھتے ہیں، جب لکھنؤ دار السلطنت ہوا تو انھوں نے مشہور محل اور عمارتیں یہاں تعمیر کرائیں جو اب تک ان کی یادگار موجود ہیں ان کو فن تعمیر کا بہت شوق تھا۔ ان کے عہد میں انگریزوں کی آمد اور وہیں زیادہ ہوئی اور ان کا رسوخ بڑھ گیا۔ کئی انگریز اجارہ دار کی نوکری و تجارت کے سلسلہ سے اودھ میں آئے۔ ریزیدنی کے خرچ کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی تھی۔ اس دربار میں ہندوؤں کو بڑے بڑے عہدے ملے تھے۔ راجہ نول رائے صفدر جنگ کے دیوان تھے راجہ مینی بہادر شجاع الدولہ کے مشیر تھے اور آصف الدولہ کے زمانے میں راجہ ٹکٹ رائے۔ ہمارا جھانڈالال۔ اور خوشحال رائے پسر راجہ نول رائے جلیل القدر عہدوں پر متنازع ہوئے شعر و شاعری اور جملہ علوم و فنون کے بڑے قدردان تھے، خود بھی شعر کہتے تھے اور اپنا کلام میر سوز کو برائے اصلاح دکھاتے تھے۔ نواب موصوف کے کلام میں اپنے استاد کی سی سادگی اور صفائی ہے اور تصنیع اور تکلف جو ناسخ کے زمانے میں وبال جان ہو گیا ان کے یہاں نہیں ہے ایک اور دیوان ان سے یادگار ہے جس میں تقریباً ۳۰ صفحات میں غزلیں ۱۰۰ صفحات میں رباعیاں اور محسن اور ۱۰۰ صفحات میں ایک مثنوی ہے۔ انھیں کے مبارک عہد میں ملک الشعراء میرزا رفیع سودا اور خدائے سخن تیسر اور میر سوز وغیرہ دہلی سے لکھنؤ آئے اور انھیں کی سرکار دولتمدار کے مداح اور وظیفہ خواہ رہے۔ نوٹ: کلام یہ ہے:

ہاں اپنا سرمہ تسلیم دیکھتے ہیں
خدا کی خدائی میں کم دیکھتے ہیں
کسی کا جو نقش قدم دیکھتے ہیں
تیرا شہنشاہی کا ہم دیکھتے ہیں

جہاں تیغ اس کی علم دیکھتے ہیں
جہاں صنم تجھ میں ہم دیکھتے ہیں
گزرتے ہیں سو سو خیالی اپنے دل میں
بتوں کی لگی میں شب و روز آصف

نواب وزیر علی خاں
المخلص وزیر و وزیر

آصف الدولہ کے بعد ۱۷۹۷ء میں ان کے بیٹے وزیر علی منوہرات
پر بیٹھے مگر چار ہی مہینے کے بعد ان کو انگریزوں نے معزول کر دیا
کیا یہ گیا کہ وہ نواب آصف الدولہ کے صلیب سے نہیں ہیں ممکن ہے یہ وجہ ہو کہ وزیر علی کے
مزاج میں سرکشی تھی۔ معزولی کے بعد وہ بنارس بھیجے گئے جہاں غصہ میں انھوں نے
مسٹر چیری ریڈیٹ کو مار ڈالا اور سرکشی و بغاوت شروع کر دی آخر کالج پور میں جہاں
انھوں نے پناہ لی تھی گرفتار ہو کر انگریزوں کے حوالے کئے گئے پھر وہ سرکاری حکم سے
قلعہ فورٹ ولیم میں قید کئے گئے۔ وزیر علی شعر کہتے تھے اور وزیر مخلص کرتے تھے
ایک غزل کے چند اشعار جو مصیبت کی حالت میں لکھے تھے درج کیے جاتے ہیں۔

جوں سبزہ زردے آگتے ہی پیر و نکستے ہم
ارمان بہت رکھتے تھے ہم دل کے چین میں
ہم وہ نہ قلم تھے کسی مالی کے لگائے
زندان مصیبت میں بھلا کس کو بلائیں

اس گردش افلاک سے پھولے نہ پھلے ہم
میٹھے نہ خوشی سے کبھی سائے کے تلے ہم
زنگس کے نہالوں میں تھے آصف کے پلے ہم
رہتے ہیں وزیر ہی ہی سے دن رات سے ہم

نواب سعادت علی خاں

نواب آصف الدولہ کے سوتیلے بھائی نواب سعادت علی خاں
منوہرات پر متمکن ہوئے۔ اُن کے عہد میں انگریزی گورنمنٹ سے ایک عہد نامہ کیا گیا
جس سے انگریزوں کا رسوخ بڑھ گیا۔ ان کا دو تہائی ملک ان کے قبضہ سے نکل کر انگریزی
علاقہ میں شامل ہو گیا۔ چونکہ ملک میں ہر طرف امن و امان تھا بادشاہ کو عیش و عشرت کے
سواے اور کوئی کام نہ تھا۔ یہی مثل اپنے بڑے بھائی آصف الدولہ کے علوم و فنون
کے بڑے تدر دان تھے اور خود بھی کبھی کبھی شعر کہتے تھے گو کہ ان کا کوئی کلام نہیں ملتا
مصحفی پور افشا کے مشہور معر کے انھیں کے زمانہ کی یادگار ہیں یہ نواب سعادت علی خاں
کے دربار کے شاعر تھے اور جان پیلی انگریزوں کی طرف سے ریزیڈنٹ۔

غازی الدین حیدر | نواب سعادت علی خاں کے بعد ان کے بیٹے غازی الدین حیدر

مند وزارت پر مشتمل میں جلوہ افروز ہوئے اور پانچ برس بعد ہندو باد گورنر جنرل
بہادر لارڈ ڈسٹننگز نواب ویر سے بادشاہ کملاکے جانے لگے چنانچہ جب ۱۸۱۹ء
میں ان کی تخت نشینی ہوئی تو اس قدر ساز و سامان اور تکلف اس قریب میں کیا گیا کہ
زرد جو اہر بکثرت لٹائے گئے۔ تاریخ نے کسی سے

ابو ناسخ کہ ظل اللہ گردید

غازی الدین حیدر اردو شعر کہہ لیتے تھے۔ مگر ان کا کلام جو زیادہ تر منقبت اور ترغیب
کی صورت میں ہے اس قدر روکھا پھیکا اور بیزہ ہے کہ ڈاکٹر اسپرنگر کا قول ان کے متعلق
سچ معلوم ہوتا ہے کہ ”ان کے اشعار اس درجہ خراب ہیں کہ واقعی بادشاہ کا کلام معلوم ہوتے ہیں“
نصیر الدین حیدر غازی الدین حیدر کے بعد ان کے بیٹے نصیر الدین حیدر تخت سلطنت
پر بیٹھے ان کا زمانہ سلطنت ۱۸۲۶ء سے ۱۸۳۶ء تک ہے مندرجہ نشانی کی تاریخ ہے۔

جاویدان سلطنت ہند مبارک باد

جس سے بارہ سئ تینتالیس نکلتے ہیں۔ یہ بھی مثل اپنے پدر بزرگوار کے ائمہ معصومین کی
شان میں اکثر کہاتے تھے۔ اور بادشاہ تخلص کرتے تھے۔ چنانچہ ان کی یہ غزل مشہور ہے۔

یہ کس ست کے آنے کی آرزو ہے	کہ ساقی لیے ساغر مشک بو ہے
سمایا ہے جب کہ تو نظروں میں میری	جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تو ہے
جناؤں میں کیا اپنا حال پریشاں	عمیاں زلف و لہار سے موبو ہے
چلو قبر فرما دیر فاسخ کو	مگر آب شیریں سے لازم دھو ہے
شفقین کے ہوتا ہے گردنِ ظاہر	یہ کس کشتہ بے گنہ کا ہو ہے
گلستاں میں جا کر ہر اک گل کو دیکھا	نیریں سی رنگت نہ تیری سی بو ہے

رہے سایہ پختن بادشاہ پر
خداوند عالم نگہبان تو ہے

نصیر الدین حیدر کے بعد اُن کے حقیقی چچا محمد علی شاہ ۱۸۳۷ء لغایت ۱۸۴۷ء اور پھر ان کے بیٹے امجد علی شاہ (۱۸۴۷ء لغایت ۱۸۵۷ء) تخت نشین ہوئے۔ یہ بھی علوم اور فنون کے مربی اور شعرو سخن کے قدردان تھے۔ اور اُن کے زمانہ میں بھی شرار انعام اکرام اور وظائف اور مناصب سے سرفراز ہوتے تھے۔ ان کے بعد واجد علی شاہ کا زمانہ آیا جو کسی قدر تفصیل طلب ہے لہذا علیحدہ لکھا جاتا ہے۔

اختصار یہ تخلص سلطان عالم حضرت واجد علی شاہ آخری تاجدار اور ودھ کا ہے۔

بعد وفات امجد علی شاہ اُن کے بیٹے سلطان عالم واجد علی شاہ ۲۷ سال ۱۸۵۷ء میں سربراہ آراءے سلطنت ہوئے۔

مبارک مبارک ہو شاہانہ تاج

تاریخ جلوس ہوئی۔ سلطان عالم کو فن تعمیر سے بے حد شوق تھا تخت نشین ہوتے ہی

تعمیر قیصر باغ کا خیال پیدا ہوا۔ اُس کو عمارات و ایوان و کٹنا بارہ دی نرد پل

سنگ مرمر و تصاویر سنگی سے مزین کیا۔ مشہور ہے کہ دو کروڑ روپے اس عمارت میں صرف

ہوا یہاں ہر برسات میں ایک خاص میل ہوتا تھا جس کے تکلفات اور شان و شوکت

بڑے لوگوں کی زبانی اب تک سنے جاتے ہیں۔ سلطان عالم کو شروع میں چند روز نظام

ملکت کا شوق اور عدالت و رعایا پروری کا ذوق رہا مگر بالآخر مصاحبوں اور بدخواہ

ہم نشینوں نے رفتہ رفتہ مزاج کو بدل دیا اور عیش و عشرت کی طرف مائل کر دیا۔ اب

بجز محفل رقص و سرود اور کوئی مشغلہ نہ رہا شہنشاہ کی تفصیف سے جلسہ

رہس کی بنیاد پڑی۔ صد ہا خوبصورت اور خوش گلو طوائفیں ملازم ہو گئیں جو محفل شاہی کو

اپنے پُر اثر نعروں سے محفوظ کیا کرتی تھیں۔ غرض کہ اسی عیش و عشرت اور ناپہ رنگ کی

بدولت ملک میں انتہاء درجہ کی بد نظمی پھیل گئی جس کی وجہ سے سلطنت انگریزی کو بار بار

تہمیش کرنا پڑی۔ مگر اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ آخر کار ۳۱ جنوری ۱۸۵۷ء کو انتزاع

سلطنت کا حکم سنایا گیا اور ایک ہفتہ کے اندر یہ عظیم الشان ملک جس کی آمدنی

دو کروڑ سالانہ سے کم نہ تھی بادشاہ کے قبضہ سے نکل کر حکومت انگریزی میں شامل ہو گیا
سلطان عالم معزولی کے بعد کلکتہ بھیج دیے گئے اور پتھر کہتے ہوئے کلکتہ چلے گئے ۷

دردیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں | رخصت اے اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

جہاں تقریباً دیر ۷۰ سال قلعہ فورٹ ولیم میں نظر بند کیے جانے کے بعد محلہ ٹیپا برج
میں قیام اختیار کیا۔ چونکہ سلطان عالم کو ہمیشہ سے فنِ تعمیر سے دلچسپی تھی یہاں بھی
انھوں نے عالیشان کوٹھیاں اور پھر فصا باغات بنوانا شروع کیے اور پھر وہی
ہی عرصہ میں ٹیپا برج لکھنؤ کا ایک مختصر نمونہ بن گیا۔ سلطان عالم نے جو سفر لکھنؤ سے
کلکتہ تک کیا تھا اس کا مختصر حال اپنی ایک مثنوی میں جس کا نام "حزنِ اختر" ہے
قلیند کیا ہے۔

سلطان عالم کو مختلف چیزوں سے شوق تھا۔ مگر ہر بات میں نفاست اور جدت
طرازی ملحوظ رہتی تھی۔ جانوروں اور مختلف اقسام کی پٹریوں سے اتنا شوق تھا کہ انکا
کلکتہ کا چڑیاخانہ دیکھنے کے لیے لوگ دور دور سے آتے تھے فنِ موسیقی علی الخصوص
ناچنے اور بتانے کے لطیف فن میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ اسی طرح شعر و سخن کے
بھی بید دلدارہ تھے۔ اور بڑے بڑے کامل استاد اس فن کے اپنے دربار میں جمع
کر لیے تھے اگر سچ پوچھیے تو انھیں مثنویوں کی زیادتی نے یہ روز بد دکھایا۔ علاوہ
اردو کے ٹھیک ہندی میں بھی ان کا کلام موجود ہے اور ان کی بنائی ہوئی ٹھمریاں
داد رے وغیرہ جس میں وہ "جان عالم پیا" تخلص کرتے تھے اب تک لکھنؤ میں زبانِ
خاص و عام ہیں۔ کلکتہ ہی میں ۱۸۹۹ء میں اس دار فانی سے رحلت کی۔

تصانیف | ان کی متعدد تصانیف اس وقت موجود ہیں۔ اور مختلف اصنافِ سخن
میں طبع آزمائی کی جس میں قصائد، غزلیات، مثنویاں، مرثیہ وغیرہ سب شامل ہیں
تصانیف حسبِ ذیل ہیں :-

(۱) چھ دیوان تفصیل ذیل - شہزاد فیض - قمر مضمون - سخن آئینہ گلہ - عاشقان سہ ماہ نگار - نظم نامہ -

(۲) فتویاں - حُرین اختری (جس کا ذکر اوپر ہوا) خطابات محلات اس میں ان محلات کا ذکر ہے جن کے ساتھ عقد ہوا یا جن کے ساتھ متعہ ہوا اور کن کن سے اولاد ہوئی اور کن کن کو طلاق دیا گیا۔ یہ فتویٰ اسی وقت کی تصنیف ہے جب بادشاہ ایام غدر میں فورٹ ولیم میں قید تھے۔ تاجہ - دھن - فتویٰ درن - دبیارے - عشق (۳) ہرانی جن کی تین جلدیں ہیں۔ ایک موسوم بہ جلد ہرانی جس میں ۲۵ مرتبہ یاد و ہزار ایک سو گیارہ بند ہیں۔ دفتر غم و بحرالم - اس میں بابائیں مرتبہ ہیں۔ سترائے ایمان اس میں ۳۳ مرتبہ ہیں۔

(۴) قصائد اردو و فارسی موسوم بہ قصائد المبارک

(۵) مباحثہ بین النفس والعقل

(۶) صحیفہ سلطانی - اس میں کچھ اویعیہ اور آریات قرآنی ہیں۔

(۷) نصاب اختری۔

(۸) عشق نامہ۔

(۹) رسالہ ایمان در بیان مصائب اہل بیت۔

(۱۰) دفتر پریشان

(۱۱) مقل معبر۔

(۱۲) دستور واجدی در سیاست مدن۔

(۱۳) صوت المبارک۔

(۱۴) ہیبت حیدری۔

(۱۵) جوہر عروص (۱۶) ارشاد خاقانی۔ یہ آخری دو کتابیں علم عربی میں ہیں

منحصر یہ کہ ان کی تصانیف کی تعداد تقریباً ۴۰ ہزار جلد ہوگی اصلاح سخن میر مظفر علی اسیر
اور نواب فتح الدولہ برق سے لیتے تھے برق کو مزاج شاہی میں خاص خصوصیت حاصل
تھی اور بادشاہ سے بہت محبت کرتے تھے۔ چنانچہ اسی وجہ سے ساتھ ہی ساتھ کلکتہ
گئے اور وہیں چند ماہ بعد ۱۸۸۷ء میں انتقال کیا۔ یہ شعر ان کا ان کے حسب حال ہوا۔
برق جو کہتے تھے آخر وہی کر گراٹھے | جان دی آپ کے دروازے پر مگر اٹھے

اسیر برخلاف اس کے شرف رفاقت سے محروم رہے اور لکھنؤ ہی میں رہے یہ بات
سلطان عالم کو ناگوار گزری تھی۔ علاوہ اسیر اور برق کے اس عہد کے مشہور شاعر امانت
قلق، بحر، بحر، ذکی، درخشاں، بول، شفق، بخود، تہنتر، عطار، دیہلال، رستہ در تھے
جن میں سے اکثر دامن دولت سے وابستہ بھی تھے۔ صاحبزادوں میں نواب لیسہ بہادر
کو کب اور نواب برجیس قدر بہادر برجیس تخلص کرتے تھے۔

طرز کلام | طرز کلام وہی ہے جو اُس زمانہ میں لکھنؤ کے شعرا کا عام رنگ تھا رعایت
لفظی کا اکثر خیال رہتا ہے سوز و گداز کی کمی ہے۔ البتہ ان کی مثنوی "حزن اختری"
جس میں مصائب سفر کا بیان ہے نہایت دلکش اور پُر تاثیر ہے اس کی سلاست
اور فصاحت اور خوبی زبان کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ دیوانوں اور مثنویوں کے علاوہ ان کے
خطوط بھی بہت دلچسپ ہیں جو انھوں نے قیام کلکتہ کے زمانہ میں اپنی محبوب بیوی نواب
زینت محل کے نام لکھے تھے جن کو نواب اکلیل محل یا ممتاز جہاں کے خطاب سے یاد کیا ہے
یہ خطوط بادشاہ کی اجازت سے مقفے اور مسجع دیباچہ کے ساتھ اکبر علیاں تو قمر نے جو
بادشاہی منشی تھے جمع کئے۔ یہ خطوط بترتیب نہ جمع کئے گئے ہیں اور کتب خانہ میں شائع
کئے گئے ہیں۔ ان میں اکثر شاعرانہ انداز کے ساتھ نہایت محبت اور اخلاص سے اپنا
اشتیاق اور لکھنؤ کی یاد کا درد انگیز صورت میں بیان کیا ہے۔ یہ خط اس لیے جمع کئے
گئے تھے کہ بادشاہ کو تہنتر کے مصائب اور اپنی پیاری بیوی کی مفارقت سے کسی قدر

تسکین ہو۔

نمونہ کلام یہ ہے:-

اس عشق نے رسوا کیا۔ میں کیسا تاؤں کیا کیا	آہ دل ناشاد نے اور آسماں پیدا کیا
مردھوکا۔ دہن عقد غزال نکھیں پر ی چہرہ	شکم سیرا بدن خوشبو جس دریا۔ زبان عیسیٰ
برائے میر گھر سارند میخانہ میں گرا کے	گرے سا غزلندھے نیشا ہنستہ سلتی بہ دریا



یہی تشویش شب دروز ہے بنگالے میں	لکھنؤ پھر بھی دکھائے گا مقدر میرا
---------------------------------	-----------------------------------



یہ تمنا نہ ہے زیست میں اس بار خدا	پھر مجھے لکھنؤ دنیا میں دکھائے غربت
ہاں وطن دیکھوں تو شاداں ہو دل ناہرا	یہ بھی ممکن ہے کہ روتے کو ہنسائے غربت
دست خلد سے بڑھ کر ہے کہیں وطن	تنگی گور سے بدتر ہے فضا کے غربت
یوں تو شاہان جہاں پر ہے پڑا وقت مگر	ختم ہے اختر بیکس پہ جھانکے غربت

اسیرؔ سید مظفر علی خاں تخلص بہ اسیر خلف سید احمد علی ایٹھی کے رہنے والے تھے کتب درسیہ علمائے فرنگی محل سے پڑھیں مصنفی سے اصلاح سخن لیتے تھے نصیر الدین چیل کے زمانہ میں شاہی ملازمت شروع کی اور امجد علی شاہ کے عہد میں اقتدار پایا۔ اس کے آٹھ نو سال تک و امجد علی شاہ کے مصاحب خاص رہے اور تدبیر الدولہ مدبر الملک کے معزز خطاب سے سرفراز ہوئے۔ بادشاہ کبھی کبھی اپنے کلام میں بھی ان سے مشورہ کرتے تھے جب بادشاہ کلکتہ جانے لگے تو انھوں نے رفاقت منظور نہ کی جس سے بادشاہ آزرہ خاطر ہوئے جس کا ذکر جا بجا اپنی تصانیف میں کیا ہے۔ بعد غدر نواب یوسف علی خاں والی رامپور اور پھر ان کے صاحبزادے نواب کلب علیخان نے ان کی اور ان کے کلام کی بڑی قدر دانی کی۔ پھر مدت العمر اسی ریاست کے دعا گو رہے

لہ ولادت: برکت علی

اور چھ ماہ رام پور اور چھ ماہ لکھنؤ رہا کرتے ۱۲۹۶ء مطابق ۱۸۸۱ء میں بعمر ۸۱ برس
 لکھنؤ میں انتقال کیا اور یہیں مدفون ہوئے۔ بہت مشاق اور پر گو شاعر تھے ان کی
 تصانیف میں چھ دیوان اردو ہیں جس میں سے چار چھپ چکے ہیں ایک دیوان فارسی
 اور ایک سنوئی "درۃ التاج" اور رسالہ عروض بھی شائع ہو گئے ہیں۔ ان کے علاوہ
 مرثیے اور قصائد بھی بہت سے لکھے ہیں۔ علم عروض اور فن نظم کے استاد کامل تھے
 زبان پران کی حیرت انگیز قدرت سب کو تسلیم ہے مگر کلام کا رنگ وہی ہے جو انسانی
 کے اہل لکھنؤ کا تھا۔ البتہ کبھی کبھی اس رنگ خاص سے علیحدہ ہو کر اچھے اچھے شعر
 نکالتے ہیں۔ شاگرد بھی بہت زبردست اور نامی گرامی پائے۔ مثلاً امیر مینائی، ان کے
 علاوہ ان کے دونوں بیٹے متخلص بہ حکیم و افضل اور نیز شوق اور واسطی بھی مشہور گرد
 اور صاحب دیوان شاعر تھے۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

کئے کو یوں جہاں میں ہزاروں ہیں یار و دوست	مشکل کے وقت ایک ہے پروردگار دوست
کس سے کہوں تلون اینا کے روزگار	دشمن یہ لاکھ بار ہوئے لاکھ بار دوست
ضد سے جتنا ہے یہاں کافروں میں فرق	ناہد اتنا تو نہیں سب سے دوزخ میں فرق
زنجیر تعلق مرے پاؤں سے تو نکلے	ہے فاصلہ دو گام کا ہستی سے عدم تک
آبا ہے ہم کو ہاتھ یہ مضمون چراغ سے	روشن اُسی کا نام ہے جو جلنے دل

امانت سید آغا حسن خلیف میر آغا رضوی لکھنوی روضۃ مشہد مقدس کے کلید بردار
 سید علی رضوی کی اولاد سے تھے شروع میں مرثیہ گوئی کا شوق ہوا۔ میاں دلگیر کو جو
 اس زمانہ کے مرثیہ گوئیوں میں نامور تھے اپنا کلام دکھاتے تھے چند روز بعد غزل گوئی
 کی طرف توجہ کی چونکہ میاں دلگیر نے اصلاح دینے سے انکار کیا انھوں نے بھی اصلاح
 لینا ترک کر دی۔ ۱۲۸۷ء میں بیس برس کی عمر میں کسی عارضہ کی وجہ سے فوت گویائی
 جاتی رہی اور گونگے ہو گئے مجبوراً بذریعہ تحریر بات کرتے تھے۔ یہی حالت ۱۲۹۶ء

تک رہی آخر کار خدا کی قدرت سے یہ مرض جاتا رہا بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ کہ بلا
جا کر زبان خود بخود کھل گئی اور قوت گویائی عود کر آئی۔ امانت کو معا اور چستان کہنے کا
بہت شوق تھا ان کی تصانیف سے دیوان خزان الفصاحت گلدستہ امانت اندر بھیجا
اور اکثر مرثیے شائع ہو چکے ہیں۔ ایک واسوخت بھی لکھا ہے جو نہایت اعلیٰ درجہ رکھتا
ہے ان کی تصانیف میں واسوخت اور اندر بھیجا کو خاص شہرت حاصل ہوئی اندر بھیجا
کو انوکھی اور دلچسپ کتاب ہونے کی وجہ سے اور نیز اس وجہ سے اردو ڈراما کی حیثیت
سے یہ سب سے پہلی تصنیف ہے۔ اپنے جانشین دو لڑکے چھوڑے لطافت اور
فصاحت جو اپنے اپنے رنگ میں شعرا کے لکھنؤ میں بہت نامور ہوئے۔ ان کا انداز
کلام خاص ہے یعنی رعایت لفظی اور صنائع بدایح کا اس قدر شوق تھا کہ بعض شعر محض
لفظی گورکھ دھند معلوم ہوتے ہیں۔ لکھنؤ اسکول کے رنگ کے سب سے
بڑے برتنے والے یہی ہیں جن کے لفظ لفظ سے تصنع اور بناٹ ظاہر ہوتی ہے
مثال کے طور پر چند شعر لکھے جاتے ہیں۔

نیرم عالم میں یہ ہر شب ہے امانت کی دعا	شمع رد کے پیار سے روشن مرا کاشانہ ہو
فی سبیل اللہ پانی ان کو ردائے آبلو	کانٹے اب دیکھے نہیں جاتے زبان خار کے

برعکس اس کے کہیں کہیں نہایت صاف اور مزیدار شعر بھی نکل آتے ہیں۔

آئسو داں میں زلف سب کے خیال میں	موتی پر رہا ہوں ترے بال بال میں
عشق کا خیر نگاہ ہے دل پہ کاری اندول	زخم کی صورت ہے خوں کھول جاری اندول
نصل گل میں اتدن بس تم ہوں در میخانہ ہو	سامی مہوش ہو۔ مے ہو۔ شیشہ ہو۔ پیادہ ہو
کو چہ قاتل تلک اے دل رسائی کیجے	کاسہ سر ہاتھ میں لے کر گدائی کیجے

آفتاب اللہ تلق	خواجہ ارشد علیاں عرف خواجہ اسد اللہ صاحب بہ آفتاب الدولہ
----------------	----------------------------------------------------------

خواجہ وزیر کے بھانجے اور شاگرد بھی تھے وہ اپنے آپ کو واجد علی شاہ کا بھی شاگرد

بتاتے تھے جو خوشامد اور زمانہ سازی پر مبنی معلوم ہوتا ہے اور واقعیت سے دور ہے
ان کے کلام میں محض لفظی تصنیفات اور مثنوی میں تو اکثر جگہ ابتذال اور رکاکت بھی پائی
جاتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بلحاظ زبان کے ان کا کلام بہت مستند اور قابل قدر
ہے مگر شعر کی حقیقی خوبیوں سے محروم ہے۔ ان کی مشہور مثنوی طلسم الفت نہایت دلچسپ
اور قابل قدر کتاب ہے۔ ان کے دیوان موسوم بہ منظر عشق کے مثنویات میں چند قصیدے
واجب علی شاہ کی تعریف میں ہیں۔ ایک خمس بھی ان کی تصنیف سے ہے جس میں
بادشاہ کی نظر بندی کا حال نہایت دردناک طریقہ سے لکھا ہے سچ پوچھیے تو یہ
ربخ و افسوس محض اپنے عیش و عشرت کے مفقود ہونے کی وجہ سے ہے نہ کہ جب وطن
اور بادشاہ کی محبت کے خیال سے۔

زکریا ہمدانی علی خاں تخلص بہ ذکی۔ شیخ کرامت علی کے بیٹے تھے۔ لکھنؤ کے رہنے
والے تھے مگر آخر عمر میں مراد آباد جا رہے تھے۔ غازی الدین جیدر کے عہد میں لکھنؤ
آئے اور شیخ ناسخ کے شاگرد ہوئے۔ ایک قصیدہ بادشاہ کی تعریف میں پڑھا جس کے
صلہ میں انعام و اکرام پایا۔ یہاں سے وہ دہلی اور پھر دکن گئے جہاں اُن کی بڑی قدر و
متمزت ہوئی۔ دکن سے لوٹ کر واجد علی شاہ کے زمانہ میں پھر لکھنؤ آئے جنھوں نے
اُن کو ملک شہزادی کا خطاب عنایت کیا۔ بعد از نزاع سلطنت مراد آباد میں سکونت
اختیار کر لی تھی مگر نواب یوسف علی خاں والی رام پور کی سرکار سے چند روز وابتہ
رہے۔ نواب صاحب کے انتقال کے بعد انبالہ گئے اور وہیں ۱۲۸۱ھ میں انتقال کیا
علم عروض سے خوب واقف تھے اور اس فن میں ایک رسالہ بھی لکھا ہے جو ۱۲۴۹ھ
میں شائع ہوا تھا۔ مشائی اور خوشگو شاعر تھے۔ اور درویشی سے درجہ کے شاعر لکھنؤ
میں بلند پایہ رکھتے تھے۔

درخشاں سید علی خاں مخاطب بہ ہمتاب الدولہ کوکب الملک ستارہ جنگ کا

تخلص ہے۔ اسیر لکھنؤی کے شاگرد تھے اور انھیں کی کوشش سے دربار میں ہو گئے تھے بادشاہ کے ساتھ کلکتہ گئے اور وہیں انتقال کیا۔ فن نجوم سے بھی کچھ واقفیت رکھتے تھے۔ شاید اسی مناسبت سے یہ خطاب دیا گیا ہو معمولی قابلیت کے آدمی تھے۔

اختر قاضی محمد صادق خاں اختر قاضی محمد لعل کے صاحبزادے سبکی بنگالہ کے قاضی زادوں میں تھے وطن چھوڑ کر لکھنؤ آ رہے تھے۔ یہ غازی الدین حیدر کا زمانہ تھا جنھوں نے ان کو ملک الشعر کا خطاب دیا آخر مرزا قنیل کے شاگرد ہو گئے اور صحفی جرائد اور افتاد وغیرہ کے شاعروں میں شرکت کی چند دن فرخ آباد میں بھی قیام کیا تھا مشہور ہے کہ واجد علی شاہ نے ان کا تخلص ان سے مانگ لیا تھا اور اس کے صلے میں بہت کچھ انعام و اکرام دیا تھا تھوڑے عرصہ میں واجد علی شاہ کچھ ناراض ہو گئے جس کی وجہ سے ان کو لکھنؤ چھوڑنا پڑا اور اٹارہ کے تحصیلدار ہو گئے جہاں ۱۸۵۸ء میں انتقال کیا۔ اختر بڑے جامع کمالات اور لکھنؤ کے نامی شاعروں میں سے تھے فارسی بہت کہتے تھے چنانچہ ان کی فارسی تصنیفات حسب ذیل ہیں: ”محکمہ حیدریہ“ غازی الدین حیدر کی تعریف میں۔ ”گلدستہ محبت“ جس میں گورنر جنرل لارڈ ڈسلیٹننگز اور غازی الدین حیدر کی ملاقات کا حال ہے۔ ”مثنوی سر اسد سوز“۔ ”صبح صادق“ جو اپنی سوانحی آب ہی لکھی ہے تذکرہ آفتاب عالمیاب جس میں پانچ ہزار فارسی شعر کا حال اور کلام فراہم کیا تھا۔ ”یوان فارسی“ بہار سخن آں، رہا راقبال، و ہفت اختر، ایک دیوان ریختہ یہ ان کی مشہور غزل قطعہ بند بطور نمونہ کلام پیش کی جاتی ہے

جب پردہ رخ سے دور کرے وہ نقاب کا	جلوہ ہر ایک ذرہ میں استقباب کا
کل بن کے شیخ مجتہد عمر ساقی	دکھلا کے باغ سبز ثواب عذاب کا

لے تذکرہ گل رعنا اور مخمیانہ جاوید ذرہ میں ان کے حال میں لکھا آگے لکھنؤ میں وفات پائی۔

کھنے لگا زراہ تبختر بھے بطنر
میں نے کہا کہ یہ تو ہیں ہم خوب جلتے
گستاخی ہو سنا تو اک عرض میں کروں
تقویٰ ہمارے آگے ہو جب آپ کا درت
ہے ہورے کینچ باغ ہوساقتی ہوا ہوش
گردن میں ہاتھ ڈال کے وہ توخ بے حجاب
کھینچے آہنی سے اپنا ملا کر وہ منہ سے منہ
منت سے یوں کہے کہ ہمارا ہوا ہے
اس وقت ہم سلام کریں قبلہ آپ کو

سلام ہو گا حشر میں مینا شراب کا
پر کیا کریں کہ ہے ابھی عالم شباب کا
کیجیے جو آپ بھگو نہ سورد عتاب کا
اور ہولفتین آپ کے اس اجتناب کا
اور واں نخل نہ ہو کوئی باعث حجاب کا
دے ذائقہ زباں کو دہن کے لعاب کا
یہ ریش جس پہ جلوہ ہے رنگ خضاب کا
گر پی نہ جاے جلد یہ پیالہ شراب کا
گر کچھ بھی خوف کیجئے روز حساب کا

اور امتحاں بغیر تو یہ آپ کا سلام
قائل نہیں ہے قبلہ کسی شیخ و شاب کا

۱۰

مرثیہ اور مرثیہ گو

مرثیہ کی تعریف | مرثیہ وہ صنف نظم ہے جس میں کسی مردہ شخص کی تعریف کی جائے
اہل اسلام اس کے بہت شاہین رہے ہیں۔ یہ قصیدہ کے برعکس ہے کیونکہ قصیدہ میں
کسی زندہ شخص کی تعریف کی جاتی ہے۔ اصطلاح میں مرثیہ انہیں نظموں کو کہتے ہیں جن میں
حضرت امام حسنؑ اور حضرت امام حسینؑ اور دیگر شہداء کے ربلیکی شہادت کا ذکر کیا جائے
اور جو علی العموم محرم کے زمانہ میں کسی مجلس عزاد میں یا کسی تعزیر کے ساتھ بہت

سوز و گداز اور خوش الحانی کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں۔ ابتدا میں اس قسم کی نظمیں صرف
 بین کے اشعار تک محدود ہوتی تھیں یعنی ان میں ہمدوح کی صفات حسنہ کا بیان
 ہوتا تھا اور اس کی موت پر اظہارِ افسوس کیا جاتا تھا۔ اس قسم کے مرثیے بہت مختصر
 ہوتے اور ان کی غرض اصلی صرف گریہ و بکا ہوتی تھی۔ امتداد زمانہ سے مرثیہ کا دائرہ وسیع
 ہوتا گیا اور اس میں مختلف قسم کے نئے نئے مضامین داخل ہونے لگے۔ مثلاً چہرہ
 ہمدوح کے مناقب، دشمنوں کے معائب، مناظر جنگ، مناظر قدرت، رجز خوانی گھوڑے
 اور تلوار کی تعریف، سامانِ حرب و ضرب وغیرہ اس قسم کے مضامین کے اضافہ
 سے مرثیہ کا مرتبہ بڑھ گیا اور آخر کار وہ اردو نظم کی ایک مستقل صنف بن گیا۔

مرثیہ کی قدامت | عرب کی شاعری کی ابتدا مرثیہ ہی سے معلوم ہوتی ہے۔ مگر جب
 شاعری شاعر کے ذاتی مفاد پر مبنی ہو گئی تو مرثیہ کو زوال ہونا شروع ہوا اس لیے کہ
 اس سے کسی قسم کے نفع کی امید نہ تھی، کیونکہ مرنے والا کسی کو کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے
 نتیجہ یہ ہوا کہ جس قدر قصیدہ گوئی کو جو ذاتی مفاد پر مبنی تھی ترقی ہوئی اتنا ہی مرثیہ گوئی
 میں تنزل ہوا۔ فارسی شاعری کی بنیاد چونکہ تکلف اور زورِ مدحی پر قائم ہوئی تھی اس
 لیے اس کی ابتدا قصیدہ گوئی سے ہوئی۔ اور وہ انواع سخن جن کو جذبات سے لازمی
 تعلق تھا جس میں مرثیہ بھی داخل ہے وفتا پستی کی حالت میں آگئے۔ بہر حال
 کہ قدامت کے یہاں ایسے بعض شعر ملتے ہیں جن میں فطرتی اثر اور جوش پایا جاتا ہے مثلاً
 شاہنامہ میں مادرِ سہراب کا اظہار رنج و الم اپنے پیارے بیٹے سہراب کی موت پر
 یا فرخی کا مرثیہ محمود غزنوی کی وفات پر جو دس بارہ بیتوں سے زیادہ نہیں۔ مگر یہ
 یا اس قسم کے اور اشعار جو ہنسی ہوں آج کل کے خیال کے مطابق بہ مشکل مرثیہ کہے جاسکتے
 ہیں اس کے بعد سعدی اور خسرو کا زمانہ آیا۔ انھوں نے بھی مرثیے لکھے مگر وہ مقبول
 نہیں ہوئے۔ اور نہ لوگوں کو ان کے متبع کا زیادہ خیال پیدا ہوا۔ علاء الدین کا شمس کاشی

گو کہ بمثل مرثیہ نگار تھے۔ مگر انھوں نے بھی طرز قدیم میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔ اسی طرح طالب آملی، غزالی، میلی، کلیم وغیرہ نے گوکہ اور اصناف سخن میں خوب خوب کہا ہے مگر ان کے مرثیے مشہور نہیں ہیں۔ اسی طرح ظہوری کے مرثیے جو علی عادل شاہ کے واسطے لکھے گئے تھے بحر تعریفوں کے اور کچھ نہیں۔ البتہ ملا منقیل نے اس صنف میں ایک خاص زور اور جوش پیدا کیا جس سے ایران میں ایک تغیر عظیم پیدا ہو گیا اور ایرانی شاعر اس کو بہت پسند کرنے لگے۔

اردو مرثیہ کی ابتدا جیسا ہم بیان کر چکے ہیں اردو شاعری کی ابتدا کن میں ہوئی تھی اور اس کی ابتدائی گوششوں میں صنف مرثیہ بھی داخل تھی۔ شاہان گو گسندہ دیجا پور نہ صرف شاعروں کے قد و اداں تھے۔ بلکہ خود بھی مذہبی آدمی ہونے کی وجہ سے مرثیہ وغیرہ خوب کہتے تھے۔ مگر مرثیہ اُس زمانہ میں بالکل ابتدائی حالت میں تھا دکن نے کوئی مرثیہ نہیں کہا۔ البتہ چند بند شاہ وجیہ الدین کی تعریف میں ہیں اُن کو مرثیہ سمجھے یا کچھ اور۔ اس کے بعد جب شعرائے دہلی کی ترقی کا زمانہ آیا تو یہ لوگ مرثیہ کے بہت شائق تھے اور اس کو ایک مذہبی فرض سمجھ کر لکھتے تھے۔ مرثیہ کی نظم میں چونکہ مذہبیت کا رنگ غالب ہوتا تھا اس لیے عیوب شاعری پر نکتہ چینی کی نظر نہ ڈالی جاتی تھی۔ میر تقی نے اپنے تذکرہ نکات الشعرا میں اور میر حسن نے اپنے تذکرہ میں اکثر اپنے شعرا کا حال لکھا ہے جو مرثیہ گو تھے۔ مثلاً میرامانی، میر عاقل میرال علی درخشاں، سکندر، صبر قادر، گمان، ندیم وغیرہ اسی طرح میر سودا نے بھی مرثیے لکھے ہیں مگر ان میں کوئی خاص بات نہیں۔ ان میں حقیقی جذبات و اثر کی کمی ہے۔ میرزا حکیم اور میر حسن کے مرثیے کوئی خصوصیت نہیں رکھتے البتہ اس لیے مقابل قد و غرور ہیں کہ یہ بزرگوار میرانیں کے اجراء میں تھے۔ سودا کے وقت تک عموماً مرثیے لکھنے والے گل رعنا میں لکھا ہے کہ دکنی نے کربلا کے حالات میں ایک مثنوی لکھی ہے ۱۲۔

چومصر سے ہوا کرتے تھے۔ غالباً سب سے پہلے سودا نے سدس لکھا جواب تک مرقع ہے۔ اسی طرح ضمیر نے مرثیہ کے مضمون میں اضافہ کیا اور اس میں جدید تشبیہات و استعارات محرک کارزار کے مفصل حالات، شاعرانہ استدلال اور دلچسپ مبالغے داخل کیے جو تاریخ دہرے کے زمانہ میں مزاج کمال تک پہنچ گئے ضمیر نے کلام میں زور بندش میں حسنی اور صفائی بیداری اور سوز کی جگہ سخت اللفظ پڑھنے کی بنیاد ڈالی۔

بزرگانِ انیس اور انکی خدمات
رہنے کے ساتھ

ابھی ہم ذکر کر چکے ہیں کہ میر لہانی۔ اور میرزا ملک اور حسین نے مرثیہ کے تھے مگر اب وہ ملتے نہیں میر حسن کے

چار بیٹے تھے جس میں سے تین یعنی خلیق اور خلق اور محسن شاعر تھے خلق اپنے والد ہی کے شاگرد تھے صاحب دیوان ہیں اور مرثیہ بھی کہتے تھے اور سو برس کی عمر میں انھوں نے انتقال کیا۔ خلیق بھی بچائے خود ایک نہایت مشہور شاعر تھے جن کے حالات علیحدہ ذیل میں ظہور کیے جاتے ہیں۔

خلیق | میر مستحسن خلیق میر حسن کے صاحبزادے عمر میں خلق سے چھوٹے تھے فیض آباد اور کھنویں تعلیم و تربیت پائی۔ سولہ برس کی عمر سے شوق سخن شروع کی اور چونکہ خود انکو شعر گوئی کا بہت شوق تھا اور باب کو بوجہ تصنیف مثنوی سحر البیان فرصت نہ تھی لہذا ان کو مصحفی کا شاگرد کرادیا۔ تھوڑے دنوں میں یہ مشافی ہو گئے اور کلام اس قدر بازم ہوئے لگا کہ ایک مرتبہ مرزا محمد تقی ترقی کے یہاں فیض آباد میں شاعر تھا جس میں خواجہ حیدر علی آتش بھی بلائے گئے تھے اور خیال تھا کہ وہ وہیں روک لیے جائیں گے جب شروع جلسہ میں خلیق نے غزل پڑھی جس کا مطلع تھا

ریشک آئینہ ہے اُس ریشک فر کا پہلو | صاف ادھر سے نظر آتا ہے ادھر کا پہلو

تو آتش نے اپنی غزل پھاڑ ڈالی اور کہا کہ جب ایسا شخص یہاں موجود ہے تو پھر میری کیا ضرورت ہے۔ تھوڑے عرصے کے بعد جب میر حسن کا انتقال ہو گیا تو

عیال کا بوجھ سر پر اچھوٹا نہ آمدنی کچھ نہ تھی لہذا غزلوں کی فروخت سے اپنا کام چلاتے تھے
 میر خلیق ایک پُرگو شاعر تھے ایک دیوان مرتب کر لیا تھا مگر وہ شایع نہ ہو سکا۔ آخری
 عمر مرثیہ گوئی میں صرف کی اور ضمیر اور فصیح اور دلگیر کے معاصر تھے۔ میاں دلگیر ناسخ کے
 شاگرد تھے مگر چونکہ زبان میں لکنت تھی اس لیے اپنا کلام خود نہ پڑھتے تھے۔ البتہ مرثیہ کو
 قدیم رنگ سے علیحدہ کر کے اُس میں کچھ جدیدیں پیدا کی تھیں۔ مرزا فصیح (شاگرد ناسخ و دلگیر)
 راج کو گئے اور وہیں رہ گئے اب صرف ضمیر اور خلیق کے واسطے میدان مرثیہ گوئی رہ گیا
 تھا۔ لہذا یہ دونوں بالکمال ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے کاوشیں کرتے
 تھے جس کا نتیجہ مرثیہ کی تکمیل و ترقی کے واسطے بہت اچھا نکلا۔ مرثیہ کی صورت میں یہ
 تغیر ہوا کہ بجائے چھ مصرعہ کے اب ممدس کا رواج ہوا۔ اس کی ابتدا سودا سے
 ہوئی تھی اور خلیق نے اس کو پھیلایا۔ سلام بطرز غزل کے جانے لگے مرثیہ پڑھنے کا طریقہ
 بجائے سوز کے تحت اللفظ مقرر ہوا۔ جو غزل مستزاد کے اسلوب پر کسی جاتی رہ نوح کہلاتی
 اور اُسکو سوز ہی کے اسلوب میں پڑھتے تھے۔ پہلے مرثیہ چالیس پچاس بندوں تک
 محدود تھا۔ میر ضمیر پہلے شخص ہیں جنہوں نے اُس کو طول دیا۔ اس طرح کہ پہلے تہمید پھر
 سراپا۔ پھر میدان جنگ کا نقشہ دکھایا اور خاتمہ شہادت پر کیا۔ اس جدت کی بڑی قدر ہوئی
 اور اس نے مرثیہ گوئی کے عالم میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا اس وجہ سے کہ
 قدیم زمانہ میں مرثیہ محض حصول ثواب کی غرض سے رونے رُلانے کے واسطے ایک مقررہ
 طریقے پر کہی جاتے تھے اب اس میں دوسری چیزیں شامل کی جانے لگیں جن کی جانچ
 برتاؤ بھی اسی طرح کی جاتی تھی جس طرح اساتذہ شعرا کے کلام کی ہوتی ہے۔ ان جدید
 مطالب کے اضافہ سے مرثیہ گوئی کے قالب میں ایک نئی روح پھونکی گئی اور اُس کی
 بوسیدہ ہڈیوں پر اس اضافہ سے نیا گوشت پوست چڑھایا گیا۔ اور اب وہ شاعری
 کی ایک مقررہ صنف قرار پایا جس سے کہ اب کثرت فرقہ ہائے اسلام یہاں تک کہ اہل ہندو بھی

دلچسپی لیتے ہیں اور بہت ذوق و شوق سے سنتے ہیں۔ میر خلیق کا بہت بڑا کارنامہ یہ
 ہے کہ انھوں نے صفائی زبان اور صحت محاورہ پر بہت توجہ کی اور درود و اثر کو خالی تشبیہوں
 اور لفظی مناسبت کے مقابلے میں زیادہ ملحوظ رکھا۔ اور یہی فرق انکے اور ضمیر کے یہاں
 ماہ الامتیاز ہے۔ انیس نے بھی اس معاملہ میں اپنے پدیر بزرگوار کی پوری پیروی کی۔ اسی طرح
 پڑھنے کے طریقے میں بھی میر انیس نے اپنے والد ہی کا متبع کیا۔ یہ زیادہ تر اعضا کی حرکت سے
 کام نہ لیتے تھے بلکہ صرف آنکھ کی گردش یا خفیف سی گردن کی جنبش سے سب کام نکالتے
 تھے میر خلیق کا خاندان زبان اردو کی صحت اور محاوروں کی صفائی کے لیے مشہور ہے چنانچہ
 ناسخ اپنے شاگردوں سے براہر کہتے تھے کہ اگر زبان سیکھنا ہو تو خلیق کے گھرانے سے سیکھو۔
 میر انیس | میر میر علی انیس ^{۱۲۱۵} یا ^{۱۲۱۶} ہجری میں بمقام فیض آباد محلہ گلاب باڑی
 میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد رہتے تھے۔ اپنے والد کے سایہ عاطفت میں تعلیم
 و تربیت پائی۔ لکھنؤ میں اُس وقت آئے جب اُن کے بڑے صاحبزادے میر نفیس پیدا
 ہو چکے تھے۔ چھوٹے بھائی اُنس ہمراہ تھے۔ ابتدا میں فیض آباد کے تعلقات بالکل
 منقطع نہیں ہوئے اس وجہ سے کہ باپ اور بھائی وہیں رہتے تھے مگر جب بعد کو پورا
 خاندان لکھنؤ چلا آیا تو یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی ابتدائی کتابیں مولوی حیدر علی صاحب
 سے اور صدر مفتی میر عباس صاحب سے پڑھی تھی۔ ورزش کے بہت شائق تھے اور
 فنون سپہ گری میر کاظم علی اور ان کے بیٹے میر امیر علی سے حاصل کیے جو اس فن میں اُس
 زمانہ کے استاد مانے جاتے تھے فن شسواری سے بھی واقف تھے فن سپہ گری کی معلومات
 جنگ کے مناظر وغیرہ دکھانے میں بہت کار آمد ثابت ہوئی حسن تناسل کے ایسے عاشق
 تھے کہ خواہ وہ انسان میں ہو یا کسی دوسری شے میں اُسکی دل سے قدر کرتے تھے۔ انکو اپنی
 عزت خاندانی پر بڑا فخر تھا اور خود داری و عزت خاندانی کا ہمیشہ خیال رہتا تھا و صدر
 بھی بہت بڑے تھے مٹے جلنے میں رکھ رکھاؤ کا بہت خیال رکھتے تھے ایک وقت معینہ پر لوگوں نے

ملاقات کرتے تھے کوئی شخص حتیٰ کہ اُن کے گھر والے بھی بغیر اطلاع اُن کے پاس نہیں آ سکتے تھے۔ امراء سے بہت کھینچ کر ملتے تھے یہاں تک کہ بادشاہ وقت کے یہاں بھی اُس وقت تک نہیں گئے جب تک کہ ایک معتمد شاہی اُن کو لینے نہ آیا۔ وہ اپنی عزت خاندانی اور عزت پیشہ کو سب باتوں پر مقدم سمجھتے تھے۔ اُمین و صندوقدار کی بہت سختی سے پابندی تھی جس کو انھوں نے اپنے اور اپنے احباب اور ملنے والوں کے واسطے مقرر کر لیا تھا۔ وضع اور لباس بھی خاص تھا جس کو انھوں نے عمر بھر نبایا۔ لوگ جس طرح اُن کے کلام کی عزت کرتے تھے اسی طرح اُن کی پابندی وضع کے بھی قدردان اور مداح تھے۔ ایک مرتبہ نواب تھور جنگ ایک رئیس حیدر آباد نے میر صاحب کی جوتیاں اٹھا کر ان کی پالکی میں رکھ دیں اور اس پر ان کو بڑا فخر و ناز تھا۔ یہ ان کے مزاج کی خودداری، قناعت اور استغنا کا نتیجہ تھا کہ کبھی کسی کی تعریف میں یا رویہ کے لالچ میں ایک حرف زبان سے نہیں کہا البتہ امراء لکھنؤ جو بدایا و تحائف مداح آل رسول سمجھ کر پیش کرتے تھے اُس کو قبول بھی کر لیتے تھے۔

میر انیس لکھنؤ سے تا انتراع سلطنت کبھی باہر نہیں نکلے۔ جب کبھی باہر جانے کا ذکر ہوتا تو فرماتے کہ اس کلام کو اسی شہر کے لوگ خوب سمجھ سکتے ہیں اور کوئی اس کی قدر کیا کرے گا اور ہماری زبان کا لطف کیا اٹھائے گا۔ لیکن نبایا ہی لکھنؤ کے بعد پہلی مرتبہ ۱۸۵۹ء میں اور پھر ۱۸۶۱ء میں نواب قاسم علی خاں کی طلب اور اصرار سے پیشہ عظیم آباد تشریف لے گئے اور واپسی میں بنارس میں بھی ایک مرتبہ ٹھہرے تھے۔ اس کے بعد ۱۸۶۱ء میں مولوی سید شریف حسین خاں کی تحریک اور نواب تھور جنگ بہادر کے سخت اصرار سے دکن حیدر آباد گئے اور لوٹتے ہوئے الہ آباد میں قیام کیا اور ان سب مقامات پر اپنے معرکہ الآرامیوں سے لوگوں کو مستفیض اور داخل حسانت کیا جس مجلس میں پڑھتے لوگ اس کثرت سے جمع ہو جاتے تھے کہ باوجود سخت انتظام اور

پہروں کے بھی چپہ بھر زمین سننے والوں سے خالی نہ رہتی تھی۔ جب دوسرے شہروں کا یہ حال تھا تو پھر خاص لکھنؤ کا کیا پوچھنا ہے جو قدردانی اور کمال کا سرچشمہ تھا۔ میر صاحب کا انتقال بعارضہ بھاری ۱۲۹۱ھ مطابق ۱۸۷۸ء میں ہوا۔ اور اپنے بلوغ ہی میں دفن ہوئے۔

میر انیس بحیثیت شاعر | میر صاحب خلقی شاعر تھے اور شاعری درشتہ میں پائی تھی۔

کوئی خاندان اتنا زبردست سلسلہ مشہور اور قابل شہرہ کا نہیں پیش کر سکتا۔ لہذا جو فخر

میر صاحب کو اپنے خاندان پر تھا وہ بجا تھا۔ میر صاحب نے بچپن ہی میں جبکہ فیض آباد میں

قیام تھا شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ پہلے حوزہ تخلص کرتے تھے شاید اس مناسبت سے

کہ ان کے پردادا میر ضاحک اور مشہور شاعر شیخ علی خاں میں بہت ربط و ضبط تھا۔ جبکہ

آئے تو ان کے والد ان کو ناسخ کے پاس لے گئے ناسخ نے کہا کہ تخلص کو بدل دو چنانچہ

ایسا ہی کیا انیس تخلص اختیار کیا۔ انیس نے کم سنی سے مرثیہ کہنا شروع کر دیا تھا

اور تھوڑے ہی دنوں کی مشق میں درجہ کمال کو پہنچ گئے تھے۔ چنانچہ انکی شہرت ان کے

والد ہی کے زمانہ میں ہو چکی تھی۔ جب خلیق اور ضمیر میدان مرثیہ گوئی سے ہٹ گئے تو

دیر و انیس کا زمانہ آیا جنھوں نے اس فن کو معراج کمال تک پہنچا دیا۔

تقانیف | میر صاحب نے ہزار ہا مرثیہ، سلام، قطعات، رباعیاں لکھی ہیں۔ افسوس

ہے کہ ان کا پورا کلام اب تک شائع نہیں ہوا مگر جس قدر چھپ چکا ہے پانچ جلدوں میں

۱۷ کسی نے کیا خوب مادہ تاریخ نکالا ہے جس میں مصرعہ کے ایک جزو سے میر انیس اور دوسرے جزو

سے مرزا دیر کی دقات کا سن نکلتا ہے۔ مصرعہ یہ ہے

غم انیس میں ہے ہے دیا دیر کا غم

۱۷ بہ نسبت قرن عقل نہیں معلوم ہوتی اس وجہ سے کہ میر ضاحک دیر اور سودا کے معاصر تھے اور شیخ علی خاں

آرزو کے زمانہ میں ہندوستان آئے تھے اور ان سے سن میں بڑے تھے لہذا زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ

ضاحک نے اپنی بہت مصرعہ سنی میں شیخ لکھیں کیلئے لکھا اور غیر افادت سن کی وجہ سے غیر ممکن ہے۔

ہے۔ بالقی اُن کے اعزہ کے پاس محفوظ ہے۔ مشہور ہے کہ انھوں نے ڈھائی لاکھ شعر کہتے جن میں کچھ غزلیں بھی تھیں۔ جس طرح اُن کا کلام لاجواب ہے اسی طرح اُن کے پڑھنے کا طریقہ بھی لاجواب تھا اُن کی آواز قد قدامت، صورت غرض ہر شے اس کام کے لیے موزوں واقع ہوئی تھی پڑھنے کا طریقہ یہ تھا کہ بڑا آئینہ سامنے رکھ کر تنہائی میں بیٹھتے اور پڑھنے کی مشق کرتے تھے۔ میر انیس کا کلام ہموار ہے اور دوسرے شاعروں کی طرح رطب و یابس کا مجموعہ نہیں ہے۔ ادب اردو میں میر انیس ایک خاص مرتبہ کہتے ہیں بحیثیت شاعر کے اُن کی جگہ صفت اولین میں ہے اور بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو انکو زبان اردو کے تمام شعراء سے بہترین اور کامل ترین سمجھتے ہیں اور ان کو ہندوستان کا شکسپیر اور خدائے سخن اور نظم اردو کا ہومر اور دھندل اور بالمیک خیال کرتے ہیں۔

انیس کی خدمت | انیس نے زبان اردو کی بڑی خدمت کی اُس کو خوب صاف کیا
زبان کے ساتھ | اور مانجا اور اُن کا کلام اپنی فصاحت اور تازگی کے لیے مشہور عالم
ہے وہ صحت محاورہ کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اور اسی پر اُن کو بڑا فخر دنا تھا لغات
کی معلومات ان کی بہت وسیع تھی۔ اور الفاظ کی سیاحت میں ان کو کمال حاصل تھا
بہت سے نئے نئے محاورے اُن کی وجہ سے داخل زبان ہوئے اور قدیم محاورات بھی
استعمال بھی انھوں نے بتایا۔ ابتدائی کلام میں کچھ قدیم محاورات پائے جاتے ہیں
مگر جوں جوں مشق بڑھتی گئی اور تجربہ وسیع ہوتا گیا اسی قدر کلام صاف ہوتا گیا۔
میر صاحب کی زبان دلی اور لکھنؤ دونوں جگہ مستند مانی جاتی ہے اُن کا خاندان
صحت محاورہ کا محافظ سمجھا جاتا ہے چنانچہ خود فرماتے تھے کہ میں فلاں لفظ یا فلاں
ترکیب کو اس طرح استعمال کرتا ہوں جیسا میرے گھرانے میں رواج ہے نہ کہ اس طرح کہ
جیسے آپ اہل لکھنؤ کہتے ہیں۔ میر حسن اور میر خلیق کے تعلقات ہو سیکم صاحب کے
خاندان کے ساتھ وابستہ تھے۔ مشہور ہے کہ فیض آباد میں ان کے یہاں ایک باقاعدہ

دفعہ تھا جس میں ایسے محاورے اور مثلیں جو بہو بیگم صاحبہ کے گھر میں بولی جاتی تھیں باقاعدہ درج ہوتی رہتی تھیں اور اس دفعہ کے انگریزی میر حسن اور میر خلیق تھے ظاہر ہے کہ زبان کی صحت و صفائی کے واسطے ان سے زیادہ کون مستند ہو سکتا تھا میر صاحب کا مرتبہ زبان اردو میں بہت خاص ہے اسوجہ سے جو احسان انھوں نے زبان کے ساتھ کیا وہ بھی خصوصیت رکھتا ہے۔ اردو باوجود اصنافِ نظم کی تنوع اور کثرت کے رزمیہ نظم سے اب تک تمیذ ست تھی اُس میں ہوم کی الیاڈ ورجل کی اینیڈا دیاس کی ہما بھارت و المیک کی رامائن یا فردوسی کے شاہنامہ کی طرح کی کوئی تصنیف موجود نہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ زبان اردو ایک نوخیز چیز ہے اور اس قسم کی تصانیف رزمیہ کے لیے ایک مدتِ مدید کی ضرورت ہوتی ہے اگر یہ کمی کسی طرح پوری ہو سکتی تھی تو وہ انیس کے مشہور مرثیہ سے ہوئی۔ ان کے مرثیوں کی تمیذیں اور مناظر جنگ وغیرہ ایسی استادانہ اور کمال سے لکھے گئے ہیں کہ نظامی کے سکندر نامہ اور فردوسی کے شاہنامہ کا آسانی سے مقابلہ کر سکتے ہیں اسی طرح مناظر قدرت اور جذبات انسانی جس زور کے ساتھ انھوں نے دکھائے ہیں اُس کا بھی جواب زبان اردو میں کہیں نہیں ملتا۔

مرثیہ نگاری | انیس کو مناظر قدرت کی ہو ہو تصویر کھینچنے میں کمال حاصل تھا اس قسم کے بیانات مرتبہ سے غیر متعلق نہیں ہوتے بلکہ اصل مضمون کے تحت میں ہوتے ہیں مگر پھر بھی بالذات ایک مکمل چیز ہیں جو مرثیہ سے بے تکلف علیحدہ کیے جاسکتے ہیں پورا مرثیہ ایک ایسا مرقع معلوم ہوتا ہے جس میں صد ہا خوبصورت خوبصورت مکمل تصویریں چھپاں ہیں جو بظاہر ایک دوسرے سے تعلق نہیں رکھتیں مگر پھر بھی مجموعی حیثیت سے اسی کل کے تحت میں سب آتی ہیں مثلاً صبح کا سماں طلوع آفتاب نسیم سحر کے خوشگوار جھونکے شام کا سہانا وقت چاندنی کا لطف یا تاریکی کا بھیاں تک منظرِ باغ میں پھولوں کا کھلنا اور ہلنا۔ سبزہ کی بہار وغیرہ وغیرہ الگ الگ چیزیں ہیں مگر سب مرثیہ کے جز و ضروری ہیں۔

اخبار جذبات

مثل عالم ظاہر کے عالم باطن یعنی جذبات کے اظہار پر بھی میر صاحب کو بہت بڑی قدرت حاصل ہے۔ جذبات خوشی و غم۔ غصہ و محبت۔ رشک و حسد۔ بیم ورجا وغیرہ ایسی استاد سے بیان کرتے ہیں کہ دل و جد کرتا ہے ایک اور کمال یہ ہے کہ کہنے والے کی عمر جنس۔ حالت وغیرہ کا پوری طرح خیال رکھا جاتا ہے مثلاً اگر کسی بچہ کی زبان سے کچھ الفاظ کہے گئے ہیں تو خیالات اور زبان دونوں بچوں ہی کے ادا کیے جاتے ہیں۔ وہ کبھی اس نازک فرق کو نظر انداز نہیں کرتے جس سے اُن کی اصول ڈراما نویس کی کما حقہ واقفیت کا اندازہ اچھی طرح کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح عورتوں کے مختلف رشتوں کے نازک فرق کو بھی بدرجہ اتم ملحوظ رکھتے ہیں۔ معرکہ جنگ میں مبارزوں کی رجحان و افنی حریف کا جواب۔ حملہ آوروں کے حملے۔ پہلوانوں کی لڑائیاں۔ سامان حرب و ضرب علی قدر مراتب اس خوبی سے دکھاتے ہیں کہ میدان کارزار کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے تلوار اور گھوڑے کی تعریف حد بالحد ہزار ہا جگہ کی گئی ہے مگر ہر دفعہ تشبیہ اور تشخیل نئی ہوتی ہے اور نیا لطف دیتی ہے۔

مرثیوں میں تسلسل بیان ایک حیرت انگیز چیز ہے۔ میر انیس ایک مستند مورخ کی حیثیت نہیں رکھتے کیونکہ جن واقعات کو انھوں نے نظم میں باندھا ہے وہ من و عن ہرگز دتو ع پذیر نہیں ہوئے۔ اُن کا وجود اگر ہے تو شاعر کے تخیل میں ہے مگر یہی تخیلی وجود مابعد کے شعراء اپنے ماقبل کے شعراء کے کلام سے اخذ کرتے چلے آتے ہیں میر انیس کا کلام اغلاط سے بھی بالکل پاک نہیں مولوی عبدالغفور صاحب نسخ نے ایک رسالہ لکھا تھا جس میں انھوں نے انیس اور دبیر کی عروج و زوال اور دوسری قسم کی غلطیاں دکھائی ہیں۔ ان دونوں بزرگوں کے طرفداروں نے بھی اسکے جواب میں سالے لکھے اور اپنے اپنے استادوں کی جانبداری کا حق ادا کیا مگر یہ پوچھیے تو واقعیت

بن بن میں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ میر انیس اور مرزا دبیر کے مرثیے اصلی حالت میں اور صحیح طور پر نہیں چھپے۔ ان میں کچھ کتابت کی غلطیاں ہیں اور کچھ اُن لوگوں کی حسب موقع تحریفیں ہیں جنہوں نے مرثیے پڑھے کہیں کہیں پُرانے محاورات بھی ہیں جو اب متروک ہو گئے۔ مگر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ تمام مرثیوں میں ہمواری نہیں کی گئی۔ اشعار تو انیس اور دبیر ایسے پختہ کار شاعروں کے درجہ سے گرے ہوئے ضرور ہیں مگر تعجب کی کیا بات ہے اس وجہ سے کہ انہوں نے لاکھوں شعر کے اگر کہیں کہیں غلطیاں بھی ہو گئیں تو اُس سے اُن کی اُستادی پر کیا حرف آتا ہے۔

میر انیس کا طرز | میر انیس تخیلوں۔ استعاروں، اور صنائع بدائع میں کمال رکھتے ہیں وہ فضول مبالغہ اور سیما اغراق کو ہرگز نہیں پسند کرتے جن کی اُس زمانہ میں کثرت تھی صنائع بدائع کا استعمال اس خوبی سے کرتے ہیں کہ جس سے شعر پر کوئی بار نہیں پڑتا اور حسن بڑھ جاتا ہے۔ اسی طرح ان کی تخیلیں بھی نہایت حسین اور بہت ارفع اور نہایت آسانی سے سمجھ میں آنے والی ہیں وہ ان سے ایک عجیب دلکش اثر پیدا کرتے ہیں بڑی چیز کی مثال ہمیشہ بڑی بھیر سے دیتے ہیں اُن کی تشبیہات کبھی معمولی اور ادنیٰ قسم کی نہیں ہوتیں۔ کلام حسب موقع کہیں صاف و سلیس اور کہیں رنگین ہوتا ہے۔ مگر فصاحت اور زور کہیں ہاتھ سے نہیں جاتا۔ بیان میں روانی غضب کی ہوتی ہے۔ فصاحت نشست الفاظ اور زور یہ سب اُن کے کلام میں ملے ہوئے ہیں۔ اشعار بہت صاف اور سلیس اور جلد سمجھ میں آنے والے ہیں اور یہ آخری صفت بعض وقت دھوکا دیتی ہے اور معنی معنی کو اُس گہرے غار کے پانی کی طرح پوشیدہ کر دیتی ہے جس کو صفائی اور سرجوں کی روانی نے چھپا دیا ہو۔ ان کے قادر الکلام ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ ایک ہی بات اور ایک ہی مضمون کو اُسی سادگی اور دل آویزی کے ساتھ صد بار دہا کر کے کہتے ہیں اور پھر ہر مرتبہ وہ نئی معلوم ہوتی ہے۔

انیس کا مرتبہ اُردو شعر کی صفت اولین میں نہایت اعلیٰ دار فح ہے انکی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اُس زمانہ میں جب تصنع اور تکلف اور مبالغے اور اغراق کا بازار گرم تھا ان کی شاعری جذبات حقیقی کا آئینہ تھی اور حسن نیریل شاعری کا آغاز حالی اور آزاد کے زمانہ سے ہوا اس کی داغ بیل انیس نے ڈالی تھی۔ انیس نے مرثیہ کو ایک کامل حربہ کی صورت میں چھوڑا جس کا استعمال حالی نے نہایت کامیابی سے کیا۔ انکی ان خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ انگریزی داں طبقہ میں بہت مقبول ہیں جس کا دماغ معمولی شعر و شاعری کی عطر بنری سے بعض وقت پریشان ہو کر حقیقی شاعری کی نکہت کے لیے عیباب ہوتا ہے ان کی شہرت برابر ترقی کر رہی ہے اور ہماری رائے میں اُس وقت تک ترقی کرتی جائیگی جب تک زبان اُردو ترقی کرے گی۔ بلکہ اُسی وقت انیس کی واقعی قدر کی جائے گی۔

دبیر | مرزا سلامت علی دبیر دہلی میں ۱۲۱۸ھ مطابق ۱۸۰۳ء میں پیدا ہوئے ان کے والد کا نام مرزا غلام حسین تھا۔ ارباب تذکرہ میں خاندان کی نسبت اختلاف ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ ان کو علی خاندان اور اُن کے بزرگوں کو نہایت معزز ثابت کیا جائے مگر اس میں شک نہیں کہ مرزا دبیر ایک شریف اور معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور اُن کے بزرگ قدیم زمانے میں کچھ اثر ضرور رکھتے تھے ان کے والد تباہی دہلی کے بعد لکھنؤ آئے اور یہیں شادی کر کے رہ پڑے اُس کے بعد جب دہلی میں تسلط ہو گیا تو پھر دہلی واپس گئے مگر دبیر اپنے والد کے ساتھ لکھنؤ اُس وقت آئے جب ان کی عمر تقریباً سات برس کی تھی۔ مرزا استعداد علی معقول رکھتے تھے اور درس تدبیر اور بحث و مباحثہ بڑے بڑے شائق تھے جس سے اُن کی ذہانت اور طباعی کو جولانی کا خوب موقع ملتا تھا شروخین سے قدرتی مناسبت رکھتے اور علی الخصوص مرثیہ گوئی کے بچپن ہی سے دلدادہ تھے۔ میر ضمیر کے شاگرد ہو گئے اور تھوڑے ہی عرصہ میں اپنی ذہانت اور طبیعت جو دت سے اپنے ہم مشقوں پر گویا سبقت لے گئے۔ اب ان کا شمار اچھے مرثیہ

گوئیوں میں ہونے لگا چنانچہ مرزا جب علی بیگ سرور نے فسانہ عجائب میں اُس وقت لے
مشہور مرتبہ گویاں لکھنؤ میں دبیر کا بھی ذکر کیا ہے۔ مرزا دبیر کی شہرت برابر ترقی کرتی گئی
یہاں تک کہ انکو بادشاہ وقت کے سامنے پڑھنے کا بھی افتخار حاصل ہوا لکھا ہے کہ اکثر رؤسائے
لکھنؤ اور محلات شاہی بھی اُن کی شاگرد ہو گئی تھیں اور اب یہ زبان اُردو کے مسلم الثبوت
استاد مانے جاتے تھے۔ اُن کی شہرت سے اور نیز استاد کی عزت و محبت کے برتاؤ سے
بعض لوگ آتش رشک و حسد سے جلنے لگے اور استاد و شاگرد میں ایک خاص موقع پر
جبکہ مرزا دبیر نے نواب افتخار الدولہ کی مجلس میں اپنا مرتبہ پڑھا تھا۔ رنجش اور بددلی پیدا
کرادی مگر غنیمت ہے کہ اس معاملے نے طول نہیں کھینچا اور مصحفی و انشائی طرح تھکا کھینچی
کی نوبت نہیں آئی آخر کار معاملہ رفع دفع ہو گیا مرزا صاحب ہمیشہ اپنے استاد کا نام ادب
و احترام سے لیتے تھے اور لوگوں کو بھی کوئی موقع ان کو برا بھلا کہنے کا اپنے سامنے نہیں
دیتے تھے۔ مرزا صاحب کا دامن شہرت وسیع ہو چکا تھا کہ میر انیس فیض آباد سے لکھنؤ پہنچے
اب میر ضمیر پور سے ہو گئے تھے مقابلہ آئندہ مرزا دبیر اور میر انیس میں شروع ہوا یہ دونوں
بزرگوار بھی نہایت تہذیب و متانت سے ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے اور جب کبھی
کسی مجلس میں یکجائی کا موقع ہوتا تو ایک دوسرے کا بہت ادب و آداب کرتے تھے
۱۲۹۱ ہجری میں مرزا صاحب کو ضعف بصارت کی شکایت ہوئی چنانچہ حکم واجد علی شاہ
جو اس وقت میاں برج میں قیام گزیریں تھے کلکتہ تشریف لے گئے جہاں ایک ہوشیار ڈاکٹر
نے کامیابی سے ان کا علاج کیا۔ مثل میر انیس کے یہ بھی عذر ۱۲۸۵ء تک گھر سے نہیں
نکلے تھے۔ مگر ۱۲۸۵ء میں مرشد آباد اور ۱۲۸۵ء میں پٹنہ عظیم آباد گئے اور ۱۲۹۲ء
مطابق ۱۲۸۵ء میں لکھنؤ میں اس دارنا پائدار سے رحلت کی اور اپنے ہی مکان
میں مدفون ہوئے۔

۱۲۸۵ء اب حیات میں لکھا ہے کہ یہ مجلس نواب مشرف الدولہ کے یہاں ہوئی تھی ۱۲۔

دبیر بحیثیت مرثیہ گو | مرزا دبیر مرثیہ گوئی کے استاد کامل تھے۔ انھوں نے اپنی پوری عمر اسی مشغلہ میں صرف کی۔ ان میں میر انیس کی اکثر خصوصیات موجود ہیں اور شکوہ الفاظ اُس پر طرہ ہے مرزا صاحب سامعہ نواز الفاظ کے ساتھ اعلیٰ تخیل، نئی تشبیہات، اور تازگی مضامین کے بھی بہت دلدادہ ہیں اس میں بھی شک نہیں کہ با اوقات اُن کا مقصد پورا نہیں ہوتا اور کوہ کندن و کاہ بر آوردن کی مثل صادق آتی ہے۔ اُن کے کلام میں ایک عالم فاضل کی بھلک برابر آتی ہے وہ آیات قرآنی اور احادیث کو باندھنے کے بہت شائق ہیں اور بعض وقت اُردو کے ساتھ عربی کا جوڑ خوب بیٹھاتے ہیں۔ دوسری صفت یہ تھی کہ بہت پُر گو اور زود گو تھے اُن کی کثرت خیالات حیرت انگیز ہے۔ مختصر یہ کہ اپنی حسین اور نادر تشبیہات سے، اپنی شاندار آیات سے، اپنے اعلیٰ مضامین سے، اپنے پر شکوہ الفاظ سے، اپنی طباعی و ذہانت سے اپنی زور گوئی اور پُر گوئی سے، اور اپنی ایجاد پسند طبیعت سے وہ ضرور اس قابل ہیں کہ میر انیس کے پاس شعر کی صف اولین میں اُن کو جسگہ دی جائے۔

انیس اور دبیر کا مقابلہ | ان دونوں کے مقابلے سے اہل لکھنؤ دو بڑی جماعتوں پر منقسم ہو گئے ایک طرف داران انیس دوسرے جانب داران دبیر جو بہ اصطلاح اہل لکھنؤ انیسے اور دبیر سے کہلاتے تھے ان دونوں فریقوں کی جنبہ داری بعض اوقات حد اعتدال سے بڑھ کر سمجھ اور مضحکہ انگیز درجہ تک پہنچ جاتی تھی۔ مگر ایک مؤرخ کا یہ فرض نہیں ہے کہ ان جزئی مباحث میں پڑے پھر بھی ان نامور استادوں کے کلام کا مقابلہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ دونوں بزرگ ایک ہی زمانہ میں تھے یہاں تک کہ ایک سال کی کمی بیشی میں پیدا ہوئے ایک ہی سال کی کمی بیشی میں انتقال کیا۔ دونوں ایک ہی صنف نظم (مرثیہ) میں مشغول و منہمک تھے۔ دونوں کی سوسائٹی

اور ماحول ایک ہی تھا۔ دونوں نے اپنی تصنیفات از قسم مراثنی و رباعیات و سلام وغیرہ بکثرت چھوڑے اور دونوں زبان اُردو کے مستند اور مسلم الثبوت استاد تھے اب فرق دیکھنا چاہیے کہ کیا ہے۔ انیس موروثی شاعر تھے شاعری اُن کو دہرائے میں ملی تھی چنانچہ خود کہتے ہیں :-

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں
پانچویں پشت ہے شپیر کی مداحی میں

مگر مرزا دبیر کو یہ شرف حاصل نہ تھا۔ دونوں کا طرز بھی جدا جدا ہے انیس کی خاص وجہ زبان کی صفائی اور حلاوت، بندش کی چستی اور محاورے کی درستی پر ہے برخلاف اس کے مرزا دبیر کے یہاں جدت خیالات، بلند تخیل، نئی نئی تھیلیں اور پر شکوہ الفاظ زیادہ کلام ہیں۔ مختصر طور پر فصاحت اور سادگی میر انیس کے کلام کا جوہر ہے اور صنعت اور رنگینی مرزا دبیر کا مایہ ناز ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میر صاحب کا کلام ایسی بھدّی ترکیبوں اور درواز کار تشبیہوں سے پاک و صاف ہے جو مرزا صاحب کے یہاں بکثرت ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے کہ مرزا صاحب کو عربی درسیات بہت مستحضر تھیں اور میر صاحب کو اس قدر نہ تھیں اور یہی کتابی علم کی کمی میر صاحب کی شکستگی کلام کا باعث ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا ایک فضول سی بات ہے۔ اس معاملہ میں آخری فیصلہ کن چیز ادبی ذوق ہے اور ہر شخص کا ذوق الگ الگ ہوتا ہے اس زمانہ میں یہ بات داخل فیشن ہو گئی ہے کہ دبیر کے کلام کو کم کر کے دکھایا جائے اور انکا مرتبہ انیس سے بہت کم رکھا جائے مگر حق یہ ہے کہ دبیر بھی مثل انیس کے مسلم الثبوت استاد تھے جیسا کہ خود ان کے معاصرین امیر علیانی اور آسیہ بھٹوی نے اعتراف کیا ہے ان کی شہرت خود ان کے زمانہ میں بھی بہت تھی جیسا کہ لفظ "استاد" سے ثابت ہے

جو اُن کے واسطے برابر استعمال کیا جاتا ہے۔

مرثیہ کی مقبولیت کے اسباب | لکھنؤ ہمیشہ سے شیعیت کا مرکز رہا ہے اور اہل تشیع شہداء کو بلا کا
دل سے ادب و احترام کرتے ہیں۔ اس شہر میں عشرہ محرم بڑے دھوم دھام اور خاص
اہتمام کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہاں کے تعمیر پسند بادشاہوں نے بڑے بڑے
امام باطلے بنوائے جہاں ایام عزاء میں مومنین جمع ہوتے ہیں اور شہداء کے بلا کی مجالس
نہایت حیرت انگیز اور تکلف سے کرتے ہیں، امیر سے غریب تک اس عینہ کو متبرک سمجھ کر جلیم ارم
عزاداری اُس میں انجام دیتے ہیں۔ اظہار غم کا سب سے زیادہ مؤثر طریقہ مرثیہ خوانی ہے۔
کوئی شخص یہاں تک کہ بڑے سے بڑا مشکل بھی علی الاعلان کسی مذہبی رسوم کی مخالفت
کی جرأت نہیں کر سکتا مرثیہ لکھنا اور پڑھنا ہمیشہ سے ایک مذہبی کام سمجھا جاتا ہے
ہر شیعہ شخص اپنی پڑی خوش نصیبی سمجھتا ہے اگر ایک بند بھی امام مظلوم کی شان میں یا ایک
شعر جناب امیر کی تعریف میں حصول ثواب کی نیت سے وہ کہہ دے۔ یہاں کے بادشاہ
ایسے لوگوں کی قدر دانی اس غرض سے کرتے تھے کہ لوگ اُن کو باندھب خیال کریں ورنہ ایک
وہ سال بھر دنیاوی عیش و عشرت میں منہمک رہتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ ایک عینہ کی
عزاداری سال بھر کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے گی۔ مگر علما اور شعرا مرثیہ کی قدر ایک
دوسرے نقطہ نظر سے کرتے تھے۔ وہ اُس کو ایک ادبی چیز سمجھتے تھے۔ بہر طور جو کہ
وجہ بھی ہو وہ زمانہ مرثیہ کے عروج کا زمانہ تھا۔

مرثیہ سے کیا کیا | میرضیہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے مرثیہ میں نئی نئی ایجادیں کیں۔
فائدے پہنچے | رزمیہ۔ سراپا، گھوڑے اور تلوار وغیرہ کی طولانی تعریفیں نئی نئی

تشبیہات اور عمدہ تخیل کے ساتھ، مناظر جنگ، مع تفصیل جزئیات، غیر فصیح الفاظ
اور ترکیبوں کا ترک، جن کو قدیم مرثیہ نویس مدت دراز سے برتتے چلے آتے تھے غرض کہ
یہ اور اسی قسم کی بہت سی جدتوں کا سہرا میرضیہ کے سر ہے مگر انیسویں صدی نے انہیں چیزوں

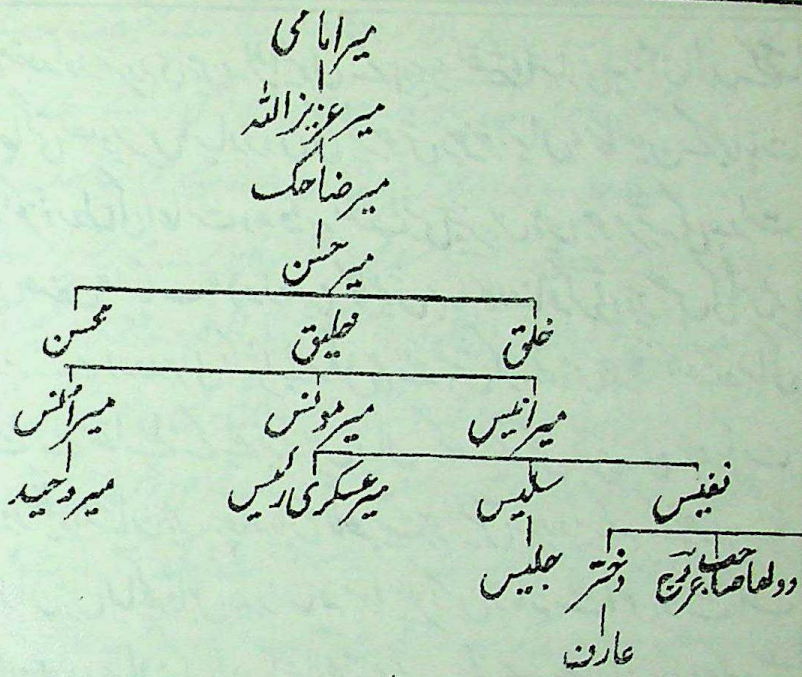
کو ترقی کی معراج تک پہنچایا اور اُن میں چار چاند لگا کے حقیقت یہ ہے کہ ان بزرگوں نے اس صنف شاعری کو ترقی کے آسمان تک پہنچا دیا اور اسی زمانے سے سدس جس میں عموماً مرثیے لکھے جاتے ہیں پر جوش و خروش نظموں کے لیے بھی مناسب خیال کیا جانے لگا۔ "مد و جزر اسلام" حالی کا مشہور سدس اسی عنوان پر ہے۔ سرور جہاں آبادی نے بھی اسی صنف کو اپنی قومی اور نیچرل نظموں کا آلہ کار بنایا۔ اگر غور سے دیکھئے تو آزاد، حالی اور سرور وغیرہ کی دلچسپ اور زور دار نظمیں سب مرثیہ ہی کی خوشہ چین اور رہن منت ہیں کیونکہ زمانہ حال کے طرز میں وہ سب خصوصیات موجود ہیں جو مرثیہ میں پائی جاتی ہیں مثلاً تمہید و تسلسل بیان، اعلیٰ جذبات کا اظہار، سلاست زبان، تشبیہات، تخیل وغیرہ جو ہماری جدید شاعری کے بڑے عنصر ہیں سب قریب قریب وہی ہیں جن کو مرثیہ کے استاد اب سے بہت پیتر نہایت کامیابی سے برت چکے ہیں۔

قدیم طرز لکھنؤ کی مصنوعی اور مخرب خلاق فضلہ شاعری میں مرثیہ کی نمود اور اُسکی سلاست و فصاحت اور ادب آموزی نے وہی کام کیا جو ریگستان میں ایک خوشنما بنہ زار کرتا ہے مرثیہ میں اُس حقیقی شاعری کا پر تو ہے جو اعلیٰ جذبات کو برانگیختہ کرتی ہے۔ اُس کی ادب آموزی ایسے وقت میں، جب دنیا کے شاعری عیش پسند دباؤں کی خوشامداد و تہمت میں نہایت ادنیٰ اور در کیا جذبات کی دلدل میں کھپسی ہوئی تھی، قابلِ صد ہزار آغوش ہے ہر چند کوئی مرثیہ لطیف و لطیف نہ ہو مگر پھر بھی وہ ایک اخلاقی نظم ضرور ہے اور اس معنی میں اُس کے مفید ہونے میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔ اُس کا مضمون ضرور عالی اور مقدس ہو گا۔ لہذا شاعر کو غزل میں وہ کیسا ہی پست اور لاابالی خیال ظاہر کرے مگر مرثیہ میں مناسبت مضمون کے خیال سے وہ ضرور سنجیدہ اور اخلاق آموز شعر کہنے پر مجبور ہو گا۔ شاعر حالی، مہدی، عفت، انصاف وغیرہ کی تعریفیں جو ہم اس افسانہ مصائب و غم میں برابر سنتے رہتے ہیں ہماری درست خیالات کے لئے ادب ہم میں شریف اور اعلیٰ جذبات پیدا کرنے

کے لیے از بس مفید اور ضروری ہیں۔ لڑائیوں کے ہو ہو، نقشے، اسلامی نبرد آزماؤں کے تنہا مقابلوں کی جیتی جاگتی تصویریں، مبارزوں کی ٹپر جوش رجو خواتیاں، مخالفین کے جوابات کفار کا قتل و قح، کمزوروں کی اعانت و مدد، یہ سب ایسی چیزیں ہیں جو مرثیہ کی بدولت ہماری نظم اردو میں صنف "ایک" (رزمد) کا پیش بہا کا اضافہ کرتی ہیں جس کی اُس میں اب تک کمی تھی۔ ہمارے اردو مراثی اکثر ایسے مکمل مرتعے پیش کرتے ہیں جو بلا تکلف دنیا کی بہترین رزمیات سے مقابلے کے لیے تیار ہیں زبان کے ساتھ بھی مرثیہ کی خدمات نہایت بیش بہا اور عظیم الشان ہیں۔ چارپانچ لاکھ بیت جوائیس اور دبیر کہہ کے چھوڑ گئے ان سے ہماری زبان میں کیا کچھ قابل قدر اضافہ ہوا پھر اُس زمانہ سے اس وقت تک کے استعمال نے ان کو اور صاف کیا اور مانتجا الحق مرثیہ نے محدود میدان اردو کو وسیع کیا اور زبان اردو کے سلاج خانے میں ایک نہایت قیمتی اور ضروری حربہ اضافہ کیا۔

دیگر مرثیہ نویس | اس زمانہ کے دیگر مرثیہ نویس میاں دلگیر اور فتح تھے جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے ان سے پیشتر میاں مسکین (جن کے مفصل حالات نہیں معلوم ہو سکے سو اس کے کہ ان کا نام میر عبد اللہ تھا) افسرہ۔ سکندر گدا وغیرہ ہیں۔ جن کے رشتے اب بھی کبھی کبھی دیکھنے میں آجاتے ہیں۔

خاندان انیس | یہ عجیب بات ہے کہ علم و فضل اور شاعری اس مشہور خاندان میں پشتہا پشت سے چلی آتی ہے اور اب تک ماشاء اللہ سلسلہ جاری ہے۔ مشعل شاعری باپ سے بیٹے کو منتقل ہوتی چلی آئی ہے اور اب تک وہ روشن ہے۔ میر انامی (جو میر انامی سوسوی ہروی کہلاتے ہیں) اس خاندان کے مورث اعلیٰ تھے۔ ان کے بعد سلسلہ خاندان بصورت شجرہ حسب ذیل ہے۔



اس خاندان میں اصحاب ذیل کے کچھ مختصر حالات ہدیہ ناظرین کے جاتے ہیں:-
میر مونس | میر محمد نواب مونس میر انیس کے چھوٹے بھائی تھے اور بہت اچھا مرثیہ
کہتے تھے گوشتہ نشینی کی زندگی بسر کرتے تھے مگر میر انیس کی طرح مشہور نہ تھے۔ مرثیہ نہایت
مؤثر اور دل کش طرح سے پڑھتے تھے۔ راجہ امیر حسن خاں صاحب مرحوم والی ریاست
محمود آباد مرثیے میں ان کے شاگرد تھے اور ایک معقول مشاہیر دیتے تھے۔ میر مونس
کا انتقال ۱۲۹۲ھ میں ہوا اور کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔

میر نفیس | میر خورشید علی نفیس میر انیس کے بڑے صاحبزادے اپنے بھائیوں میر سکس
اور میر ریس سے زیادہ ممتاز اور زیادہ مشہور تھے لائق باب کے لائق فرزند تھے اور
انہیں سے اصلاح سمجھ لیتے تھے۔ ان سے میر انیس بلکہ پورے خاندان کا نام روشن
ہوا۔ بہت خوش گو اور قابل تھے اور اپنے بعد ایک بڑا ذخیرہ راشی و سلام و رباعیات وغیرہ
کا چھوڑ گئے۔ ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۹۰۱ء میں بمبئی میں انتقال کیا۔

عانت | سید علی محمد عانت سید محمد حیدر کے صاحبزادے میر نفیس کے نواسے

ولادت ۱۲۹۲ھ

وفات ۱۳۱۸ھ

تھے ۱۸۵۹ء میں پیدا ہوئے اور اپنے نانا کی زیر نگرانی تعلیم و تربیت پائی اور انھیں سے مشورہ و سفارش کرتے تھے۔ ہمارا سہروردی محمد علی خاں والی ریاست محمود آباد اُن کے شاگرد ہیں اور مبلغ ایک سو پچیس روپیہ ماہوار سے اُن کی خدمت کرتے تھے۔ عارف صاحب بہت بڑے زبانداں تھے اور لکھنؤ کے مرثیہ گوئیوں میں ایک خاص درجہ امتیاز اُن کو حاصل تھا۔ اُن کے مرثیے نہایت فصیح و بلیغ اور زبرد دار ہوتے ہیں۔ اُن کے مرثیوں میں مثل پیارے صاحب رشید کے ہمارے ساتھی نامہ وغیرہ نہیں ہوتا وہ مرثیت کا زیادہ خیال رکھتے تھے ۱۲۳۴ھ میں ہجرۃ سال انتقال کیا۔

جلیس | سید ابو محمد عرف ابو صاحب جلیس میر سلیس کے صاحبزادے پیارے صاحب رشید کے شاگرد تھے۔ ہوناہر شخص تھے مگر افسوس ہے کہ جوانی میں ۱۲۲۵ھ میں انتقال کیا۔ مرثیہ اور غزل کہتے تھے۔ بالفعل اس خاندان میں دو لکھا صاحب عروج (میر نفیس کے صاحبزادے) اور فائق (عارف کے صاحبزادے) اور قدیم (سلیس کے صاحبزادے) موجود ہیں اور اپنے کلام سے اہل لکھنؤ اور دیگر شائقین کلام کو مستفیض اور محفوظ کرتے ہیں۔ سید میرزا افس کا خاندان | یہ خاندان بھی لکھنؤ کے مرثیہ گوئیوں کا ایک مشہور خاندان ہے اس کے بھی مختصر حالات یہ دیکر ناظرین کیے جاتے ہیں۔

سید میرزا افس | سید محمد میرزا افس سید علی میرزا کے صاحبزادے اور سید ذوالفقار علی میرزا کے پوتے تھے صاحب دیوان ہیں مگر اب تک ان کا کلام چھپا نہیں اور ان کے خاندان میں محفوظ ہے۔ ہر اتوار کو اُس زمانے کے بڑے بڑے شاعر مثل فائق، بھگت، اسیر، میر گلشن وغیرہ کے بلاناغہ اُن کے مکان پر جمع ہوتے تھے اور شعر و شاعری کے تذکرے دیتے تھے۔ نوابی میں تنویر و میر ماہوار ان کو خزانہ شاہی سے ملتا تھا۔ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد افس نے نواب سنور الدولہ کی سفارش سے نواب ملکہ جہاں کی سرکار میں بحیثیت داروغہ ملازمت کر لی تھی اور بہت عزت سے زندگی بسر کرتے تھے ۱۲۷۵ھ میں نواب گل علی خاں

والی رامپور نے انس کو طلب کیا اور اپنے استاد منشی امیر احمد صاحب بینائی کو ان کے لینے کے واسطے لکھنؤ بھیجا انس رامپور گئے مگر تھوڑے عرصہ کے قیام کے بعد پھر لکھنؤ واپس آئے جہاں ۱۲۰۰ھ میں بمر ۹۵ سال نقض کی چونکہ ان کا کلام چھپا نہیں لہذا اس کے متعلق کوئی رائے نہیں ظاہر کی جاسکتی صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ناسخ کے شاگرد اور کہنہ مشفق شاعر تھے۔ ان کے پانچ بیٹے تھے عشق، عشق، صبر، صابر اور عاشق۔

فتن | حسین مرزا عشق معروف بہ میر عشق اپنے زمانے کے نامی مرثیہ گو اور انیس و دبیر کے ہم عصر تھے۔ یہ بھی مثل انھیں استادوں کے مرثیہ کے اُتار دمانے جاتے ہیں اور ان کا کلام بہت اعلیٰ درجہ کا اور بے عیب ہے۔ سچ پوچھیے تو کلام کی عمدگی کے اعتبار سے ان کی شہرت کم ہے۔ ان کے پوتے عسکری مرزا مؤدب جو اپنے چا رشید کے شاگرد ہیں اب بھی موجود ہیں اور مرثیہ اچھا کہتے ہیں۔

عشق | سید مرزا عشق مرثیہ اور غزل دونوں کے اُتار تھے لکھنؤ میں سید صاحب کے لقب سے مشہور ہیں۔ ایک عرصہ دراز تک کربلا میں قیام کیا اور بعد اپنے بڑے بھائی میر عشق کے انتقال کے وہاں سے واپس آئے۔ مرثیہ اور غزل دونوں خوب کہتے تھے ناسخ کے شاگرد تھے اور ان کا کلام جذبات، حسن بندش، نزاکت خیال اور تاثیر کے لیے مشہور ہے۔ بعض لوگ تو ان کی نسبت بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں مگر امتنا ضرور ہے کہ یہ ایک فطری شاعر تھے اور ان کے کلام میں بہت سوز و گداز اور تاثیر ہے اور ان کا مرثیہ اپنے زمانے کے شعر میں بہت بلند ہے میر انیس ان کے ساتھ بہت محبت کرتے تھے اور انھیں کی صحبت سے یہ برابر فیضیاب رہے۔ ۱۲۰۹ھ میں ٹھہر، سال انتقال کیا۔

احمد مرزا صابر | یہ اپنے مشہور بیٹے پیارے صاحب رشید کی وجہ سے قابل ذکر ہیں۔ ان کی شادی میر انیس مرحوم کی دختر سے ہوئی تھی جس سے دو مشہور خاندانوں کا اتحاد ہو گیا یہ واجد علی شاہ کے وظیفہ خوار اور نواب ملک جہاں کے یہاں داروغہ تھے۔ واجد علی شاہ

اُن کو بہت مانتے تھے اور اُن کو محل شاہی نواب زہرہ محل کی ڈیوڑھی کا داروغہ کر دیا تھا۔
جو منظم خطوط بادشاہ اپنی محبوب بیوی کے نام بھیجتے تھے اُن کے جوابات اسی طریقہ کی
نظم میں ان کی طرف سے قلم بند کرتے تھے ۲ سال کی عمر میں ۱۳۱۷ھ میں انتقال کیا۔
پیادے صاحب رشید | سید مصطفیٰ امیر زامعروف بہ پیادے صاحب المتخلص بہ رشید

۱۳۶۳ھ پیدا ہوئے اور ضروریات زمانہ کے مطابق تعلیم پائی ان کی شادی میر عسکری
رئیس خلع میر انیس کی صاحبزادی کے ساتھ ہوئی تھی۔ اپنا کلام اپنے چچا میر عسق کو
دکھاتے اور کبھی کبھی میر انیس سے بھی اصلاح لیتے تھے عشق کے بعد اپنے دوسرے
چچا عشق سے مشورہ کسٹھن کیا اور سچ پوچھئے تو انھیں کارنگ اُن کی غزلوں اور مرثیوں پر زیادہ غائب
ہے رشید کی توجہ زیادہ تر زبان پر تھی اور اس میں وہ اپنے استاد انیس کے قدم بقدم چلتے تھے
مرثیہ غزلیں سلام زیاعیاں، بکثرت کہیں۔ کبھی کبھی قصیدے بھی کہے۔ ان کی غزلوں
میں سلاست زبان، محلات اور پابندی محاذ و کابہت خیال ہے مگر جدت خیال اور
تاثیر کم ہے۔ اُن کو فارسی ترکیبیں زیادہ پسند نہ تھیں سلاموں میں غزلیت کارنگ یادہی
مگر رباعیاں کثرت سے ہیں اور دقتی بہت عمدہ ہیں علی الخصوص وہ رباعیاں جو بڑھاپے
پر لکھی ہیں بہت موثر اور دلچسپ ہیں۔ رشید بحیثیت مرثیہ گو کے زیادہ مشہور ہیں مرثیہ میں
انھوں نے دنی چیمپس یعنی ساقی نامہ اور بہار اضافہ کی جس سے مرثیہ کی ادبی شان اور بڑھ گئی
اور نفس مرثیہ میں کوئی خلل بھی نہیں آیا کیونکہ ایسے اشعار حسب موقع وہ رکھتے ہیں۔
ان سے پیشتر بھی اکثر استادان فن اس قسم کے اشعار مرثیوں میں کہہ گئے ہیں مگر رشید نے
ان کو ایک ممتاز جگہ دی اور طول دے کر لکھا۔ ۱۸۹۴ء میں نواب راجپور نے رشید کو
سنا تھا۔ رشید پٹنہ عظیم آباد بھی گئے تھے جہاں اُن کی بڑی قدر اور خاطر مدارات ہوئی
نواب بہرام الدولہ کے اصرار سے حیدر آباد دکن کا سفر کیا جہاں حضور نظام نے اُن کا
مرثیہ سنا اور بہت پسند کیا۔ اسی طرح کلکتہ اور دیگر مقامات میں بھی سفر کا اتعلق ہوا تھا۔

رشید کا انتقال عمر ۴۷ سال ۱۳۳۶ ہجری میں ہوا اپنے بعد بہت سے شاگرد چھوڑے جن میں سے مشہور لوگوں کے نام یہ ہیں۔ سید باقر صاحب حمید (یہ اُن کے بھائی تھے اور ۱۳۳۷ء میں انتقال کیا) محمود بید فیر ناصری، جلیس مرحوم، اشتر (مولف حیات رشید) شدید ناظم، فرہاد وغیرہ پیارے صاحب رشید لکھنؤ کی ادبی دنیا میں نہایت ممتاز درجہ رکھتے تھے اور زبان کے بڑے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ غزل اور مرثیہ دونوں خوب کہتے تھے۔

خانہ دان دبیر | مرزا اوج
انہیں کے رنگ میں کہتے تھے ان کی بھی پٹنہ، حیدر آباد اور رامپور وغیرہ میں بڑی شہرت تھی اور ان سب مقامات سے اُن کی حسب لیاقت ان کی خدمت کی جاتی تھی۔ مرزا اوج بھی مثل اپنے پدر بزرگوار کے بہت بڑے زبان دان اور عروض کے استاد سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ ایک رسالہ بھی انھوں نے اس فن میں لکھا ہے۔ غرودکن نے ان کو بھی سنا ہے۔

نعت | نعت اُس نظم کو کہتے ہیں جس میں پیغمبر اسلام کی مدح میں اشعار کہے جائیں۔ بہت سے شاعر گزرے ہیں جنھوں نے اس صنف نظم میں بہت کچھ کہا ہے مگر ان سب میں امیر مینائی اور محسن کا گوروی بہت مشہور ہیں۔

باب ۱۱

نظیر اکبر آبادی اور شاہ نصیر دہلوی

نظیر اکبر آبادی | ان کا تعلق کسی خاص دور سے نہیں ہے اور ان کا کلام بھی ایک

خاص رنگ رکھتا ہے لہذا ان کا ذکر علیحدہ کیا جاتا ہے۔

نظیر اکبر آبادی بعد محمد شاہ ثانی تقریباً اُس زمانے میں پیدا ہوئے جب نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا تھا۔ اس وجہ سے وہ میر و سودا اور دیگر قدیم شعرا کے دہلی کے معاصر کے جاسکتے ہیں مگر چونکہ عمر زیادہ پائی تھی اس وجہ سے انشا و تراکات اور ناسخ تک کا زمانہ دیکھا۔ یہ ان کی خصوصیت ہے کہ بسبب اپنی طویل عمر کے مختلف عہد کے شعرا ان کی نظر سے گزرے۔ ان کا طرز کلام بھی ایک عجیب رنگ رکھتا ہے۔ قدامت میں ان کا شمار اس وجہ سے نہیں ہو سکتا کہ ان کا اکثر کلام زمانہ حال کا معلوم ہوتا ہے۔ متوسطین شعرا کے دہلی میں بھی یہ نہیں لیے جاسکتے۔ اس وجہ سے کہ ان کے کلام میں بہت آزاد روی ہے اور ان کے اور ان کے مضامین اور انداز میں زمین و آسمان کا فرق ہے لکھنؤ کا قدیم طرز تو ان میں چھو نہیں گیا ہے کیونکہ ان میں ہنوت اور رنگینی جو طرز لکھنؤ کی خاص پہچان ہے مطلق نہیں پائی جاتی اسی طرح دور جدید کے شعرا کے دہلی مثلاً غالب، ذوق اور سمن وغیرہ سے بھی یہ بالکل علیحدہ ہیں اس وجہ سے کہ ان کے یہاں سادگی ہے اور فارسی الفاظ اور فارسی ترکیبوں کا ان کو میلان کے مطلق شوق نہیں ہے۔

نظیر کا نام دلی محمد اور ان کے باپ کا نام محمد فاروق تھا۔ نظیر کی ولادت شہر دہلی میں ہوئی چونکہ اپنے باپ کی بارہ اولادوں میں صرف یہی بچے تھے لہذا باپ ان سے بہت محبت کرتے تھے۔ احمد شاہ ابدالی کے حملے کے وقت نظیر اپنی ماں اور نانی کو لیکر اگرچہ چلے گئے مگر جہاں حملہ تلج گنج میں جو تاج محل کے قریب واقع ہے سکونت پذیر ہو گئے۔ ان کی شادی ایک عورت مسماۃ تہور بیگم دختر محمد رحمن سے ہوئی تھی جن سے ایک لڑکا خلیفہ گلز اعلیٰ اور ایک لڑکی امامی بیگم تھیں۔ نظیر فارسی کی معمولی قابلیت کے علاوہ تھوڑی بہت عربی بھی جانتے تھے اور فن خوشنویسی سے بھی واقف تھے جس کا اُس زمانے میں بہت چرچا تھا۔ نظیر کی طبیعت میں آسودگی اور قناعت اس درجہ تھی کہ انھوں نے

حسب الطلب نواب سعادت علی خاں لکھنؤ آنے سے اور اسی طرح بھرت پور کے جانے سے بھی انکار کر دیا۔ اوائل عمر میں مٹھرا گئے تھے جہاں کسی جگہ معلّٰی کی نوکری کرتی تھی مگر ٹھوٹے ہی دنوں کے بعد آگرہ واپس آ گئے اور یہاں لالہ بلاس رام کے لڑکے کو بمشا ہمرہ سٹہ روپیہ ماہوار پڑھایا کرتے تھے۔

آخر عمر میں مرض فالج میں مبتلا ہو گئے تھے اور اسی مرض میں بہت کبرسنی کی حالت میں ۱۶ اگست ۱۸۵۷ء کو انتقال کیا جیسا کہ اُن کے ایک شاگرد کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے۔ لائل صاحب ۱۸۵۳ء اُن کا سنہ وفات بتاتے ہیں مگر کوئی سند نہیں دیتے ہیں۔ نظیر بہت صحبت پسند آدمی تھے اور مختلف قسم کے لوگوں کی سوسائٹی میں ملتے جلتے تھے اسی وجہ سے اُن کا تجربہ بہت وسیع تھا جس سے انھوں نے اپنے اشعار میں بہت بڑا فائدہ اٹھایا ہے۔ اُن کو گلنے سے اکسرت سے اور سیر تاشے سے بہت شوق تھا۔ نہایت حلیم الطبع، منکسر المزاج، اور اسی کے ساتھ نہایت ظریف اور با مذاق واقع ہوئے تھے۔ کسی طرح کا تعصب اور خود بینی اُن کے مزاج میں نہ تھی ہندو مسلمان سب اُن کو مانتے۔ اور سب اُن سے محبت رکھتے تھے۔

جوانی میں البتہ بہت رنگین مزاج تھے اور عشق و عاشقی کا بھی ذوق رکھتے تھے کہا جاسکتا ہے کہ جس قدر کلام ہیں ان کے فواہش ہیں وہ اسی ذوق کی یادگار ہے۔ مشہور ہے کہ ایک رنڈی سے جس کا نام موتی تھا، اُن سے تعلق تھا اور آلودانہ زندگی شاید اسی زمانے میں بسر کرتے ہوں گے اس زندگی کی جو جیتی جاگتی تصویریں اُن کے کلام میں موجود ہیں وہ یقیناً اسی عہد کی یادگار ہیں اور اگر غور سے دیکھا جائے تو فواہش کو مستثنیٰ

۱۔ وہ مصرع تاریخِ یہ ہے ع۔ خمس بے سرو پا بیت بے دل۔ فرو بے سر شدہ

خ + م + ب + ت + ر + د

۱۲۴۶ھ

۴ ۲۰۰ ۲۰۰ ۲ ۴۰۰ ۶۰۰

کر کے اُن میں ہمیشہ مرقعے اُس میں سوسائٹی کے ہیں جس میں وہ اُس وقت ملتے جلتے تھے مگر بڑھاپے میں یہ باتیں سب بدل گئی تھیں۔ گزشتہ گناہوں سے توبہ کر کے وہ ایک صوفی صافی ہو گئے تھے۔ اس زمانے کا ان کا کلام نہایت قابل قدر اور پُر اثر ہے۔ بہت پُر گوشا عر تھے۔ کہا جاتا ہے کہ دولاکھ سے زیادہ شعر کے تھے مگر وہ سب کلام تلف ہو گیا بالفصل جس قدر موجود ہے اس کی تعداد تقریباً چھ ہزار شعر سے زیادہ نہ ہوگی اور یہ لالہ بلاس رام کی کاپیوں سے نقل کر کے لیا گیا ہے کیونکہ خود اُن کو اپنے کلام کے محفوظ رکھنے کی مطلق پروا نہ تھی۔

نظر بحیثیت واعظ و ناصح | اگر نظیر کے کلام میں سے اُن کے معمولی اشعار نکال ڈالے جائیں تو اُن کا شمار بڑے بڑے فلسفیوں اور ناصح شعرا میں ہو سکتا ہے۔ اُن کے اشعار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ولی کامل دنیا و مافیہا کی بے ثباتی اور بے حقیقتی پر پُر زور لکچر دے رہا ہے اور ایک دوسری زندگی کی تعلیم ہم کو دیتا ہے۔ جو رذائل اور معائب سے بالکل پاک ہے انکی دس گیارہ ایسی دلچسپ اور مؤثر نظمیں ہیں جن کے اکثر اشعار فقیر اور سادہ لوگ خوش الحانی سے پڑھ پڑھ کے ہمارے دلوں کو بیتاب کرتے ہیں۔ اس قسم کی نظموں میں وہ "دنیا پیچ ست و کار دنیا ہمہ پیچ" کے پوری طرح سے قائل ہیں۔ وہ خیر و خیرات کے بہت معترف ہیں اور دنیا کو مزرع آخرت سمجھتے ہیں۔ اُن کی تمثیلیں بہت اعلیٰ اور دلکش ہوتی ہیں اُن کی نظم "موت پر" اور "سچا رہ نامہ" معرور اور سرکش لوگوں کے لیے ایک تازہ عینت ہے اور اُن کو آگاہ کرتا ہے کہ دنیا اور فانی ہے اس کو چھوڑو اور عاقبت کی فکر کرو۔ نظیر کا مقابلہ اس معنی میں شیخ سعدی سے خوب ہو سکتا ہے۔ کیونکہ دونوں کا کلام صاف اور سلیس اور دونوں میں تصوف کا رنگ ہے دونوں عاشقانہ رنگ کے اُستاد اور

لے مثلاً زری کی جو محبت تجھ تڑپائے گی بابا" یا "بٹ مارا جمل کا آپہ سچا ٹانگ کو دیکھ ڈر بابا وغیرہ ۱۵

دونوں اپنی اپنی جگہ پر اور اپنے اپنے رنگ میں نصیحت گو بھی ہیں۔ نظیر چونکہ صوفی مشرب آدمی تھے لہذا ان کو تمام مذہبی جھگڑوں اور مناقشوں اور نیز مذہبی پابندیوں سے بالکل بے تعلقی تھی، ان کی صوفیانہ نظیں بہت اسی اعلیٰ درجہ کی ہیں اور اس حیثیت سے اُن کا مقابلہ کسی دوسری زبان کے بہتر سے بہتر اخلاقی شاعر سے ہو سکتا ہے۔ وہ "الوحدة فی الکثرة" کے دل سے قائل اور سچ "بامسلمان اللہ اللہ بامرہن رام رام" کے پورے عامل تھے اسی وجہ سے ہندو اور مسلمان دونوں اُن سے دلی محبت رکھتے اور ان کو اپنا مرشد اور گرد سمجھتے تھے چنانچہ جب اُن کا انتقال ہوا تو ان کے جنازہ کے ساتھ ہزار ہا ہندو شریک تھے اور اپنی رسم و رواج کے مطابق نہایت ادب و احترام سے اُس کو لے گئے۔ نظیر مثل گردناک کے ایسے تارک الدنیا فقیروں اور سادھوؤں کے خاص شاعر تھے جو لوگوں کو ترک ماسوا اللہ کا سبق دیتے ہیں۔ انگریزی شعرا میں یہی حال درڈس ور تھ کا ہے جس کی سائٹ (غزل) دنیا ہمارے ساتھ بہت ہے بہت مشہور ہے۔ نظیر کی وسیع النظری، آزاد خیالی، ہمہ گیری اور بے تعصبی، ایسی خصوصیات ہیں جو ان کے کلام کو تمام دوسرے شعرا کے کلام سے تمیز اور ممتاز کرتی ہیں۔

نظیر بحیثیت حقیقی ہندوستانی شاعر کے نظیر کی ہمدردی و محبت بنی نوع انسان کے ساتھ محدود نہیں ہے بلکہ ہندوستانی شاعر کے وہ حیوانات اور بے جان اشیاء سے بھی ایک خاص انس و محبت رکھتے ہیں۔ ان کی نظیں جانوروں کے متعلق مثلاً کچھ کا بچہ، گھری کا بچہ، جنگ جانوراں، ہرن کا بچہ، بلبلوں کی لڑائی وغیرہ اسی قدر دلچسپ ہیں اور اس قدر جزئیات سے مملو ہیں کہ پڑھنے والے کو ان کی عام واقفیت اور ہمہ دانی پر تعجب ہوتا ہے اسی طرح چھوٹے بچے اُن کی نظیں مثلاً کبوتر بازی، پتنگ بازی، تربوز سح کیا دقت تھا وہ جب تھے ہم دودھ کے چٹورے سچ "کیا دن تھے وہ بھی یار جب ہم تھے بھولے بھالے"

ہوئی، دیوالی، بسنت، عید وغیرہ کو پڑھ کر بارغ بارغ ہوتے ہیں۔ نظیر زندگی کے تمام
 لطفوں اور حلقوں سے خوب بہرہ اندوز ہوتے تھے۔ وہ ہندو مسلمانوں کے
 تہواروں میں شریک ہوتے اور اُن کے میلے ٹھیلوں کی خوب سیریں کرتے تھے
 انھیں سیر تماشوں میں اُن کا پائے تہذیب کبھی پھسل جاتا ہے اور بے نکان وہ
 اُڑانے لگتے ہیں مگر یہ ضرور ہے کہ انھیں چیزوں سے وہ مفید مطلب اور اخلاقی نتائج
 بھی نکالتے ہیں اور بقول شکسپیر "بہتر سے وعظ سنتے ہیں اور ہر چیز میں اچھائی دیکھتے
 ہیں" یہ اُن کی خصوصیت ہے کہ انھوں نے دنیا کے مختلف اشغال اور کھیل تماشوں کا
 حال اس مزے سے اور ایسے جوش مسرت کے ساتھ لکھا ہے کہ معلوم ہوتا ہے بچوں کی طرح
 وہ خود اُن سب میں شریک ہیں پھر معمولی معمولی چیزوں کو ایسی دلچسپ تفصیل سے بیان
 کرتے ہیں کہ بغیر تعریف کیے رہا نہیں جاتا۔ اُن کی معلومات غیر محدود اُن کا خزانہ
 لغات غیر مختتم اور اُن کی صفائی بیان دلکش ہے۔ ان کے مزاج میں چونکہ مذہبی تعصب
 اور نارواداری نہ تھی بلکہ کثرہن کو وہ نہایت نفرت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھتے
 تھے اسی وجہ سے وہ ہندوؤں بہت خلط ملط رکھتے تھے اور اُن کے ہم درواج،
 اُن کی زبان، اُن کے خیالات اُن کے تہوار اور اُن کے معتقدات تک ایسے دلچسپ طریقہ
 سے اور اس قدر صحت کے ساتھ بیان کر گئے ہیں کہ ہم کو اُن کی ہمہ دانی پر تعجب معلوم
 ہوتا ہے۔ وہ دوسرے مذہب کی چیزوں کے ساتھ کبھی متحیر نہیں کرتے اور نہ
 اُن کو حقارت کے ساتھ دیکھتے ہیں، اسی سے اُن کے کلام میں ایک مقامی رنگ ہے
 جو اکثر ہمارے شعرائے اردو میں کیا اب بکنا یا اب ہے البتہ کہیں کہیں سودا، اور
 انشا کے کلام میں اس کا پتہ چلتا ہے۔ نظیر ایک خالص ہندوستانی شاعر تھے۔
 کیونکہ اُن کے خیالات، ان کی زبان، اُن کے مضامین سب مقامی رنگ
 میں ڈوبے ہوئے تھے۔

ان کی خدمت
زبان کے ساتھ

اُن کی خدمت زبان کے ساتھ بہت قابل قدر ہے۔ انھوں نے ایسے الفاظ سے بہت فائدہ اٹھایا جن کو شعرا ادبی اور بازاری سمجھ کے چھوڑ دیتے ہیں چونکہ ایسے الفاظ مروجہ مضامین شعر سے میل نہیں کھاتے اس وجہ سے عام شعرا ان کو معمولی اور سوتیانہ سمجھ کے ترک کرتے ہیں اور شعر میں اُن کو داخل کرنا خلاف شان سمجھتے ہیں۔ نظیر نے کمال کیا کہ ایسے ہی الفاظ کو اپنے اشعار میں جگہ دی اور دنیا کو دکھلادیا کہ ان میں وہ خوبیاں چھپی ہوئی ہیں جن کو ظاہر بین نگاہیں نہیں دیکھ سکتیں۔ البتہ اس میں بھی شک نہیں کہ اس قسم کے سب الفاظ اُس عزت کے مستحق نہیں تھے جو اُن کو حاصل ہوئی مگر بہت سی چیزیں باوجود مخالفت اور احتیاط کے بھی ادبی دنیا میں داخل ہو گئیں۔ نظیر کی مستعمل لغات تین قسموں پر تقسیم کی جاسکتی ہیں:-

- (۱) ایسے الفاظ جو اُن کے ابتدائی رنگ کے کلام میں بکثرت پائے جاتے ہیں اور اب بالکل خلاف تہذیب سمجھے جاتے ہیں۔
- (۲) ایسے الفاظ جو معمولاً اردو شاعری کے مایہ بساط ہیں۔
- (۳) وہ جو اہریرے جن سے حسن شعر بڑھ جاتا ہے اور خزانہ زبان مالا مال ہو جاتا ہے۔

نظیر بحیثیت شاعر الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ پڑھے لکھے نہیں تھے بلکہ ایک معمولی غلط گو شاعر تھے اور اپنے اشعار سے بازاری لوگوں کا دل خوش کیا کرتے تھے۔ اُن کا کلام غیر مہذب بلکہ فحش درجہ تک پہنچ جاتا ہے اور انھوں نے اپنے عامیانہ اور سوتیانہ الفاظ کی آمیزش سے ہماری زبان کو غارت کر دیا۔ ان الزامات کے متعلق ہم آگے لکھیں گے مگر بالفعل مختصر طور پر اتنا کہنا ضروری سمجھتے ہیں کہ جو چیز نظیر کی خامی اور کمزوری سمجھی جاتی ہے وہی ہماری راے میں فی الحقیقت

ان کی بڑی خصوصیت اور صفت ہے۔ مثلاً وہ ایسی معمولی چیزیں اور مناظر (پیلے ٹھیلے وغیرہ) جن کو عام لوگ بہت پسند کرتے ہیں دیکھنے کے بہت شائق تھے اور ان کے بیان کے لیے ان کو عام فہم اور سیدھے سادے الفاظ کی ضرورت تھی لہذا ان کا بڑا کمال یہی ہے کہ وہ عوام الناس کے خیالات اور جذبات اور ان کی بول چال کو خود انھیں کی زبان سے ظاہر کرتے ہیں۔ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ وہ ایسی چیزوں کو فلسفیانہ نظر سے یا دور سے کھڑے ہو کر بطور تماشا کے دیکھنا نہیں چاہتے نہ ان میں کوئی نقص یا اعتراض نکالنا چاہتے ہیں بلکہ وہ ان کا سچا فوٹو من و عن کھینچ دیتے ہیں وہ ایسے منظروں اور مجموعوں کو حکیمانہ یا جادو خانہ نظر سے نہیں دیکھتے اسی وجہ سے ان کا بیان ان چیزوں کا نہایت دلچسپ اور نچرل ہوتا ہے۔ تصنیع اور بناوٹ ان کے کلام میں مطلق نہیں ہوتی حالی نے شاید اسی کثرت الفاظ کے خیال سے نظیر کو میر انیس پر ترجیح دی ہے۔ نظیر اپنے موقعوں پر کوئی نکتہ چینی نہیں کرنا چاہتے بلکہ خود ان میں شریک ہو کر ان سے لطف اٹھانا چاہتے ہیں۔ ان کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ جس طرح کسی کی ہجو نہیں کہی اسی طرح کسی کی تعریف میں کوئی قصیدہ بھی نہیں لکھا۔ یہ دونوں باتیں ہمارے نزدیک ان کے کلام کا بہت بڑا جوہر ہیں اور ان لغزشوں کی تلافی کر دیتی ہیں جو ابتدائے عمر میں ان سے سرزد ہوئی ہوں گی۔

نظیر جدید رنگ کے پیشرو تھے | یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ زمانہ موجودہ کی فطری اور قومی شاعری جس کی ابتدا مولانا آزاد اور حالی وغیرہ سے کی جاتی ہے۔ اُس کے پیشرو بلکہ موجد نظیر اکبر آبادی کہے جاسکتے ہیں جس طرح انیس اور دبیر نے فاضلانہ قابلیت کے ساتھ مناظر جنگ اور مناظر قدرت کے بمثل مرتے اپنے اشعار میں دکھائے ہیں۔ اسی طرح نظیر نے بھی معمولی معمولی چیزوں کی ہو بہو تصویریں جن کی گنجائش شعر میں مطلق نہ تھی، سیدھے سادے کثر الفاظ میں کھینچ دی ہیں جس سے ان کا کلام عوام الناس

میں بہت مقبول ہے۔ اس مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ فارسی کے دقیق لفظ اور ترکیبیں اور پیچیدہ تشبیہیں اور استعارے اُن کے کلام میں کہیں نہیں۔ ان کی تحریر سادہ اور بے تکلف اور ان کا بیان صاف اور اصلیت کے مطابق ہوتا ہے۔ مگر محمد نجر کی پرستش سے وہ نادانف ہیں، جنگوں اور پہاڑی چوٹیوں کا حال اُن کے یہاں نہیں ہے قدر کی مناظر کا نوٹ وہ صرف اسی حالت میں کھینچتے ہیں جب اُن مناظر کا تعلق انسان سے ہوتا ہے، مثلاً باغوں میں روضۂ تاج گنج کو انھوں نے منتخب کیا۔ ان کی نظمیں برخلاف معمولی اردو نظموں کے سلسل ہوتی ہیں۔ البتہ اُن کے کلام میں وہ وسیع النظری اور گہرائی نہیں ہے جو متاخرین شعراء دہلی کے کلام میں ہے۔ غرض کہ اپنے سادہ بیان سے، اپنے بے تکلف مگر پُر زور الفاظ سے، اپنے عام دلچسپی کے مضامین سے اپنے دلکش اشعار سے جن میں تصنع اور یک رنگی کا نام نہیں، نظیر اکبر آبادی ایک ایسے طرز کی بنا ڈال گئے جو آگے چل کر ہمدانی زبان اور ادب کی ترقی بلکہ ہمارے قومی احساس کے از سر نو زندگی کا بہت بڑا باعث ہوا۔

نظیر کا ظریفانہ رنگ	نظیر کا ظریفانہ رنگ خاص ہے اور عجیب قسم کا ہے، اس رنگ کی ترقی کا باعث اُن کا عام لوگوں کے ساتھ میل جول
---------------------	--------------------------------------------------------------------------------------------------------

اور ربط ضبط ہے چونکہ وہ عام لوگوں سے بے تکلفانہ اور مساویانہ ملتے تھے اور اُن کے شادی و غم میں برابر شریک رہتے تھے لہذا اُن کو فطرت انسانی کے مطالعہ کا خوب موقع ملتا تھا اور معلومات کے ساتھ اُن کی خوش طبعی اور ظرافت میں اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ وہ افلاس اور مصیبت کی تکلیفوں کو نہایت تحمل اور خندہ پیشانی سے برداشت کرتے اور لطائف حوادث کو اپنے مذاق میں اڑا دیتے تھے۔ اُن کی ظرافت نہ تکلیف دہ ہے نہ اُس میں شہد پن ہوتا ہے۔ نظیر اور انشاد دونوں اپنے اپنے رنگ میں ظرافت کے استاد تھے مگر ان دونوں کی ظرافتوں میں فرق ہے۔ انشا کی ظرافت ایک

ایسے درباری کی ظرافت ہے جو ہر مذاق باتوں سے اپنے مالک کو خوش کرنا چاہتا ہے اور اس کو شش میں وہ بھانڈوں کی طرح اپنی اور دوسروں کی بے عزتی کی بھی مطلق پروا نہیں کرتا ہر چیز کو اپنے آقا کی خوشنودی مزاج پر وہ قربان کر دیتا ہے۔ نظیر ایک آزاد ظریف ہے جو اپنی با مذاق باتوں سے کسی کو سبج دینا نہیں چاہتا کسی کی عزت پر حملہ کرتا ہے۔ اور سب کو خوش رکھتا ہے۔ مختصر یہ کہ انشا کی ظرافت میں خوشامد اور بھٹی کی بوا آتی ہے اور نظیر ان عیوب سے پاک ہے۔ یاد جو اس کے انشا اور نظیر میں کئی باتوں میں مماثلت بھی ہے دونوں شاعروں نے مشکل مشکل روایہ اور قافیوں میں طبع آزمائی کی ہے اور بعض غزلیں ہر طرح بھی کہی ہیں دونوں عربی مصرعے اشعار میں کامیابی کے ساتھ موزوں کرتے ہیں۔ دونوں کے کلام میں مقامی رنگ یعنی ہندی الفاظ اور ہندی رسم و رواج وغیرہ کثرت سے ہیں، دونوں نے مختلف زبانوں میں شعر کہے، دونوں کے کلام میں تصوف کا سنہرے رنگ جلوہ گر ہے۔ زبان کے بارہ میں دونوں آزاد ہیں۔ مگر فارسی اور عربی الفاظ صحت کے ساتھ استعمال کرنے میں انشا شاق ہیں۔ اور بمقابلہ نظیر کے ان کے یہاں مستزکات کم ہیں۔ اور ان کی ظرافت کا رنگ بہت زیادہ گہرا ہے۔

نظیر بحیثیت مصور کے چونکہ نظیر کو فن موسیقی سے بہت شوق تھا اس لیے ان کو انتخاب الفاظ میں اس فن سے بہت مدد ملی۔ وہ ایک آرٹسٹ اور بہت بڑے مرقع نگار ہیں ان کو اپنے اشعار کے واسطے انتخاب الفاظ میں وہی انہماک تھا جو انگریزی شاعر ٹینیسن کو تھا۔ وہ صنعت تجنیس کے بہت شائق ہیں اور اکثر ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جن کی آواز سے انہماک مطلب ہو جاتا ہے۔ مثلاً لڑائی بھڑائی کے موقع پر وہ نقیض حروف لاتے ہیں۔ شادی و مستی کی محفلوں اور تہواروں کے بیان میں انھیں کے مناسب مہر پہلے اور دلکش الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ دور از کار تشبیہات ان کے کلام میں کم ہیں اور دیگر صنائع پدائع بھی نہایت اعتدال سے ہیں۔ اور آوروں

وغیرہ سے اُن کا کلام پاک ہے۔

اُر دو کا شیکسپیر بہارا
کون شاعر ہو سکتا ہے

یہ سوال بہت دلچسپ ہے کہ اُر دو کا شیکسپیر بہارا کون شاعر ہے
اصل یہ ہے کہ ڈراما کا وجود اہل عجم میں تھا ہی نہیں اور نہ ہمارے

اُر دو شعرا نے اُس کو سنسکرت سے اخذ کیا۔ سودا اپنی اعلیٰ درجہ کی طباعی اپنی زبردست
شخصیت اپنی عام واقفیت اور قدرت زبان کی وجہ سے ضرور قابل لحاظ ہیں۔ اُنھوں نے
بے مثل سچوں لکھی ہیں اور اسی وجہ سے وہ ایک زبردست کمیڈی نگار ہو سکتے تھے مگر اُن
میں ٹریجڈی لکھنے کا مادہ یعنی فطرت انسانی کے ساتھ ہمدردی اور اس کا وسیع علم بہت محدود
ہے۔ میر کی حالت یہ ہے کہ سوز و گداز تو اُن کے یہاں بدرجہ اتم ہے مگر کیرکٹر نویسی سے وہ
ناواقف ہیں۔ سوائے غزل اور مثنوی کے دیگر اصناف سخن اور نیز دیگر شعبہ ہائے زندگی
میں اُن کی واقفیت بہت محدود ہے۔ انشاکے یہاں مسخر اور ظرافت کی بہتات ہے اور
وہ اپنی قوت نقالی اور قدرت زبان کی وجہ سے خود اکیٹر بننے کے لیے زیادہ موزوں تھے
مگر اُن کے درباری تعلق نے اُن کو ایک دوسری راہ پر لگا دیا اور تعمق خیال بھی ان میں
بہت کم ہے۔ انیس و دبیر کو فطری شاعر تھے زبان پر پوری طرح قدرت حاصل تھی
کیرکٹر نویسی کے بھی مشاق تھے۔ مگر اُن کا دائرہ عمل محدود ہے یعنی وہ محض مثنیہ نگار تھے
اور یہ تخصیص اُن کے واسطے قوت اور کمزوری دونوں کا باعث تھی۔ ایرانی پیش پلے
یعنی تعزیر داری وغیرہ جس کا مقابلہ مرسل (معجزات) کے ڈراما اور ٹریجڈی (مذہبی اسرار)
کے ڈراما سے کیا جاسکتا ہے۔ باقاعدہ ڈراما سے قریب تر ہیں اور یہی انیس و دبیر کے موضوع
ہیں۔ لیکن اُس مذہبی جوش سے جو اُن کی نظموں میں سرایت کیے ہوئے ہے معمولی معمولی
کیفیات و جذبات انسانی نظر انداز ہوتے رہے۔ نظیر کو بھی مثل سودا انشا اور انیس کے
زبان پر پوری طرح قدرت حاصل تھی، اُس کی خصائل انسانی کی معلومات اکثر مشاہیر
شعرا سے بڑھی ہوئی تھی۔ وہ ہندو اور مسلمان بچے اور بوڑھے، امیر و غریب، خواص و عوام

دنیا دار اور تارک الدنیا سب ملتا جلتا تھا اور سب کا دوست اور بہی خواہ تھا۔
 عورتوں کا علم بھی اُس کو کافی تھا۔ گو اُس کے یہاں ایسے مرتعے جیسے شکسیر کے
 یہاں، ایوجن، ڈسٹریوٹا، پورٹیا اور افیلیا کے ہیں موجود نہیں ہیں جس کی وجہ شاید یہ ہو کہ
 ہماری ہندوستانی سوسائٹی میں پردہ کا رواج ہے اور عورتیں آزادی کے ساتھ مردوں سے
 نہیں مل سکتیں اور اسی وجہ سے نظیر کو معزز عورتوں سے ملنے اور اُن کے خیالات اور
 جذبات دریافت کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اُس کو صرف شاہدان بازاری کا تجربہ ہوا لہذا
 اُس کے اشعار میں اسی مخصوص جماعت کی طرف اشارات پائے جاتے ہیں اُس کو کیرکٹر نگاری
 کا بڑا ملکہ تھا اور قوت بیان یہ بھی بڑے غضب کی پائی تھی مگر شکسیر کی طرح اُس کے خیالات
 میں غم نہیں ہے۔ اور نہ شکسیر کی ایسی اعلیٰ درجہ کی ذہانت اُس میں ہے۔ اُس کی
 نظمیں ایسی ہیں جن میں ڈراما کی کچھ خصوصیات پائی جاتی ہیں گو وہ پوری طرح ڈراما نہیں کہی
 جاسکتیں۔ ایک "لیلے مجنوں" جو ٹریجڈی ہے اور دوسری "ہادیو کا بیاہ" جو اپنے
 انبساطی رنگ کی وجہ سے کینڈی کہے جانے کی مستحق ہے۔ اسی طرح اُس کی نظمیں
 "یکچہ کا بچہ" اور "بیلادوں کی لڑائی" نہایت مزے کی اور اعلیٰ درجہ کی ہیں۔ نظیر میں سودا کا زور
 میر کی بلند پروازی، انشا کی ظرافت، انیس و دسیر کا جوش و خروش نہیں ہے مگر یہ
 سب صفات اُس میں ایک حد تک ضرور پائی جاتی ہیں۔

نظیر کی سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ وہ معمولی معمولی چیزوں کے بیان میں ایسی
 دلچسپی پیدا کر دیتا ہے جو دوسروں کے یہاں اعلیٰ مضامین میں بھی نہیں پائی جاتی۔
 جب غزل کی کیرنگی اور قصیدہ کی لفاظی سے جی اگتا جاتا ہے تو نظیر کے اس قسم
 کے مضامین بہت پسند آتے ہیں۔ اُس نے شعر میں نئے نئے مضامین اختیار کئے اور
 ادب اردو کو بہت وسعت دی۔ یہ سچ ہے کہ وہ کوئی فاضل شاعر نہیں اور نہ وہ
 کیفیت اشیا کو فلسفیانہ طریقہ سے یا بہت گہرائی کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ بعض اوقات

وہ خوش بھی کہ جانا ہے اور ایسے موقعوں پر اُس کی صاف بیانی سے تہذیب کے دل کو چوٹ لگتی ہے وہ بڑے پایہ کا شاعر بھی نہ سہی۔ اور اُس کے کلام میں بعض متروکات و اغلاط بھی ضرور ہیں۔ زبان اور خیالات بھی بہت سستے و رفتہ نہیں۔ مگر بالکل خالص ہندوستانی شاعر ہے اور ہندوستانی مضامین پر لکھتا ہے۔ ہندوستانی جذبات اُس کے دل میں جوش زن ہیں اور وہ مذہبی تعصب اور فرقہ وارانہ جھگڑوں سے بالکل پاک و صاف ہے، اپنے تنوع مضامین، اپنی ناصحانہ روش، اپنی وسیع النظری، اپنی ہر طبقہ کے ساتھ دلچسپی اپنی خالص ہندوستانی اور علی الخصوص ایک جدید رنگ کی ایجاد کے سبب سے نظیر پوری طرح اس کا مستحق ہے کہ اُس کو شعرا کے اردو کی محفل میں ایک ممتاز جگہ دی جائے۔

شاہ نصیر دہلوی
سنی ۱۸۷۷ء
شاہ نصیر کا شمار مثل نظیر اکبر آبادی کے زبان اور زمانہ دونوں اعتبار سے طبقہ متقدمین میں کیا جاسکتا ہے مگر ان کو شہرت شعرا کے متوسطین کے زمانہ میں حاصل ہوئی۔ اس لیے ان کو دور متقدمین و متوسطین کے بیچ کی کڑی سمجھنا چاہیے۔ نصیر الدین نام نصیر تخلص اپنے سیاہ رنگ کی وجہ سے میاں کلو کے عرف سے مشہور تھے۔ شاہ غریب کے بیٹے دلی کے رہنے والے تھے۔ باپ ایک گوشہ نشین فقیر تھے اور جو آمدنی چند مواضعات جاگیر سے ہوتی تھی اُس پر بفرقات تھی۔ ہر چند کہ غریب باپ نے تعلیم و تربیت میں پوری کوشش کی مگر نصیر کو سوائے شاعری کے اور کچھ نہ کیا۔ شاعری کی طرف اُن کا رجحان بچپن سے تھا۔ شاہ محمدی مائل کے شاگرد ہو گئے جو شیخ قیام الدین قائم سے اصلاح لیتے تھے اور اس نسبت سے شاہ نصیر سودا اور خواجہ میر درد سے بھی ایک تعلق شاگردی پیدا ہو گیا تھا۔ خاندانی رشتہ اور نیز شاعری کی وجہ سے شاہ عالم کے دربار میں نصیر کی رسائی ہو گئی۔ جہاں اُن کا قدر دانی خوب ہوتی تھی اور انعام و اکرام سے بھی سرفراز ہوتے تھے۔ شاہ نصیر نے سفر بہت کیے

اور اکثر شہروں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ علی الخصوص لکھنؤ اور حیدر آباد متعدد مرتبہ گئے تھے۔ اپنے وطن دہلی میں اپنے مکان پر اکثر شاعرے کرتے تھے جن میں اُس زمانہ کے مشہور شعراء جمع ہوتے تھے ایسے ہی جموں میں اُن کے شاگرد ذوق کو اپنی ابتدائی بلند پروازیوں کے جوہر دکھانے کا خوب موقع ملتا تھا۔

جب دہلی میں تباہی آئی اور شعراء و مرثیہ مستشرقین ہونے لگے۔ تو شاہ نصیر بھی ہر اہل زہونڈ مٹھنے باہر نکلے، دو مرتبہ لکھنؤ آئے اور چار مرتبہ حیدر آباد گئے۔ لکھنؤ میں جب یہ پہلی مرتبہ پہنچے تو مصحفی، انشاء، اور جرات کا زمانہ جن سے خوب خوب مقابلے رہے دوسری مرتبہ ناسخ اور آتش کا آوازہ سخن بلند ہو رہا تھا۔ ناسخ سے بھی اُن سے مقابلے ہوئے اور یہ کامیاب ہوئے۔ حیدر آباد جانے کی یہ تقریب ہوئی کہ دیوان چند دلال جو شاد آں تخلص کرتے تھے اور اہل کمال خصوصاً شعراء دہلی کے بڑے قدردان تھے اُن کی داد و دہش کا شہرہ سن کر یہ وہاں پہنچے۔ مشہور ہے کہ دیوان موصوف نے ذوق اور ناسخ کو بھی حیدر آباد بلا بھیجا تھا مگر انھوں نے انکار کیا۔ شاہ نصیر نے اپنے حیدر آباد کے قیام میں بہت سے شاگرد جمع کر لیے اور اُن کے سبب سے وہاں بازار شاعری بہت گرم ہو گیا تھا۔ بالآخر جو تھی مرتبہ جب وہ حیدر آباد گئے تو چند روز قیام کر کے ۱۲۵۴ھ مطابق ۱۷۷۱ء میں وہیں انتقال کیا۔

تصانیف | شاہ نصیر ایک پرگو شاعر تھے ساٹھ برس تک مشغلہ شعر میں منہمک رہے اس طویل مدت میں ایسے ذہین و ذکی شخص نے جو اس قدر شاعری کا دلدادہ ہو کیا کچھ نہ کہا

اے دیکھو "بدن سرخ ترا" "چمن سرخ ترا" والی غزل مصحفی کے حالات میں اور اسی طرح میں شاہ نصیر کی غزل اُن کے حالات میں آبکیات میں ۱۲۵۴ء تذکرہ گل رعنا میں لکھا ہے کہ ابکی مرتبہ جیسی ان کی قدر ہونا چاہیئے تھی نہیں ہوئی ۱۲۵۴ء قاضی مخدوم موسیٰ کی خانقاہ میں دفن ہوئے۔ ایک شاگرد نے "چراغ گل" کے الفاظ سے تاریخ نکالی (آبکیات ذکر شاہ نصیر) ۱۲۔

ہوگا۔ مگر افسوس ہے کہ ان کا اکثر کلام تلف ہو گیا۔ اس لئے کہ ان کو کلام کے جمع کرنے اور حفاظت سے رکھنے کی عادت نہ تھی۔ ان کے ایک شاگرد مہاراج سنگھ نے ان کا کچھ کلام بصورت دیوان کے جمع کیا جس میں تقریباً ایک لاکھ شعر کے جاتے ہیں مگر بعض اصحاب تذکرہ لکھتے ہیں کہ ان کے دیوان کی ترتیب میر عبد اللہ الرحمن خلیف میر حسین مسکین شاگرد مومن نے کی تھی جس کا ایک قلمی نسخہ نواب صاحب راسپور نے اپنے کتب خانہ کے لیے خرید کیا تھا۔

شاہ نصیر نہایت ستین و مہذب گمراہ کے ساتھ ہی بڑے بذلہ سنج اور شگفتہ مزاج تھے۔ سیکڑوں شاگرد دہلی لکھنؤ اور حیدر آباد میں چھوٹے حنفی المذہب تھے مگر تعصب مطلق نہیں رکھتے تھے۔ آخر آخر میں اپنے بایہ ناز شاگرد ذوق سے چٹک ہو گئی تھی۔ کیونکہ کثرت مشق نے ذوق کے دل میں ایک قسم کی انانیت پیدا کر دی تھی اور وہ سودا و میر ایسے بالکالوں کی برابر کی کا دعویٰ کرنے لگے تھے۔

ان کا مرتبہ شاعری میں شاہ نصیر کی خصوصیت یہ ہے کہ سنگلاخ زمیوں اور مشکل مشکل ردیف و قافیہ میں غزلیں کہتے تھے جن میں اچھے شعر نکالنا ہر کسی کا کام نہیں مثلاً

شب کو کیونکر تجھ کو ہے بھبتا سر پر طرہ ہار گلے میں

جوں پروین دہالہ مہ تھا سر پر طرہ ہار گلے میں

بادہ کشی کے رکھلاتے ہیں کیا ہی قرینے ساون بھادوں

کیفیت کے ہم نے جو دیکھا دو میں مہینے ساون بھادوں

وقت ناز ہواں کا قامت گاہ خند گاہ کماں بجاتے ہیں اہل عبادت گاہ خند گاہ کماں

ولہ

خال پشت لب شیریں ہے عسل کی کھٹی روح فرہاد لپٹ بن کے جہل کی کھٹی

شکوہ الفاظ کے بھی عاشق تھے۔ ان کے بعض استعارات اور تشبیہیں بہت نادر اور دلچسپ ہوتے ہیں۔ مثل صائب کے مثالیہ اور اخلاقی مضامین بھی خوب باندھتے ہیں۔ فی البدیہہ کہنے میں بھی مشاق تھے۔ علمی استعداد کم رکھتے تھے اور کہیں کہیں متردک الفاظ بھی نظم کر گئے ہیں گو کہ کلام میں زور اور اثر ہے۔ مگر بلند پروازی اور اعلیٰ خیالات کم ہیں۔ دوسرے درجہ کے شعرائیں ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ کلام میں کوئی خاص بات نہیں البتہ اپنے زمانے کے استاد تھے اور صد ہا لائق شاگرد چھوڑ گئے۔

۱۷ مثلاً۔ دیہات جاگیر کے تعلق سے ایک دفعہ تحصیلدار سونی پت کے پاس ملاقات کو گئے اور کچھ رنگتروں دلی سے بطور سوغات ساتھ لے گئے۔ تحصیلدار نے کہا کہ جناب شاہ صاحب! رنگتروں کی تکلیف کیا مندر تھی۔ آپ کی طرف سے بڑا تحفہ آپ کا کلام ہے ان رنگتروں کی حُسن تشبیہ میں کوئی شعر ارشاد فرمائیے۔ اسی وقت رباعی کہی اور سنائی ۵

اے نیرِ برج آسمان اقبال ان رنگتروں پر غور سے کیجئے گافیاں
یہ نذرِ حقیر ہو مستبول خاطر پردہ میں تقف کے ہیں گرہ بند ہلال
(آبجیات ذکر شاہ نصیر)

۱۲

طبقہ متوسطین شعرائے دہلی ذوق و غالب کا زمانہ

دہلی کی شاعری کا
دوبارہ عروج

دلی کا از سر نو پھر عروج ہوا۔ صفات گذشتہ میں ہم لکھ چکے ہیں کہ
اُردو شاعری کا مرکز ترقی دلی سے لکھنو منتقل ہو کر آگیا تھا۔ لیکن قدیم
کی تخم زری بیکار نہیں گئی اُن کی کوششیں سرسبز ہوئیں اور وہ درخت جس کو دلی کے قدیم
شاعروں نے بڑی کد و کاوش سے سیچا تھا۔ اب وہ نئے سرے سے پھلنا شروع ہوا۔ دنیا
میں مدوجز ترقی و تنزل اور تنزل و ترقی کا قاعدہ ہمیشہ سے چلا آتا ہے یہی دلی کا بھی
حال ہوا تھوڑے عرصہ کی خاموشی کے بعد شاعری دہلی کی مجلس ہزار داستان نے پھر نئے سرے
شروع کی۔ اور تمام اُردو دواں پبلک کو اپنی خوشنویسیوں کا گریویدہ بنالیا۔ غالب، ظفر، ذوق
مومن وغیرہ اس دور کے نامی گرامی شعراء ہیں۔ غالب کی خدا داد ذہانت اور طباعی کا مقابلہ تو
دنیا کے بہترین شعراء سے کیا جاسکتا ہے۔ ذوق و مومن کو کہ غالب کے مقابلہ میں نہیں
چمک سکتے تھے مگر پھر بھی اپنے معاصرین میں بہت نمایاں درجہ رکھتے تھے ظفر بھی کوئی معمولی
درجہ کے شاعر نہ تھے اور چونکہ مشاغل حکمرانی کی زیادہ فکر نہیں رکھتے تھے اس لیے شعر کے شغل سے
دل بہلاتے رہتے تھے وہ ذوق و غالب کے شاگرد تھے۔ اس زمانہ کے شعراء دہلی جدید طرز
لکھنو کے بالکل متبع نہ تھے جہاں تصنع تکلف اور رعایت لفظی وغیرہ شاعری کی جان بھی جاتی
تھی۔ ان کا کلام حقیقی شاعری اور صحیح جذبات سے ملبوس ہے۔ غالب اور مومن کے یہاں
فارسی الفاظ و محاورات کثرت سے ہیں اس وجہ سے کہ وہ فارسی کے بڑے زبان دان
اور شاعر تھے۔ ان حضرات کے ابتدائی کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے قدما کی سیدی

سادگی ہندی ترکیبیں کمال کران کی جگہ فارسی الفاظ رکھ دیے ہیں۔ اس زمانہ کا انکا کلام محض فارسی الفاظ کا ایک مجموعہ معلوم ہوتا ہے۔ ہندی لفظ اور محاورے یہ اُسی وقت استعمال کرتے تھے کہ جب وہ کسی فارسی لفظ یا ترکیب کے ساتھ میل کھاتے تھے اور کلام کا حسن بڑھاتے تھے۔ مومن اور غالب کے بعد غلبہ فارسی میں ایک معتد بہ کمی واقع ہوئی۔ جملوں کی ترکیبیں سہل ہو گئیں۔ شعروں میں صفائی اور روانی پیدا ہوئی۔ ایسوجہ سے غالب مومن کے شاگردوں کا کلام بہت صاف ہے۔ مثال کے لیے حالی، سالک، ظہیر، انور اور بحر قح کے کلام کو دیکھنا چاہیے۔

مومن ۱۲۱۵ء لغایت ۱۲۶۵ء
مطابق ۱۷۹۹ء لغایت ۱۸۴۹ء

حکیم مومن خاں حکیم غلام نبی خاں کے بیٹے تھے۔ ان کے دادا حکیم نامدار خاں جن کی اصل پنجاب کے کشمیر سے تھی سلطنت منلیہ کے آخری دور میں اگر بادشاہی طبیبوں میں داخل ہوئے اور شاہ عالم کے زمانہ میں چند مواضعات جاگیر میں پائے جب سرکار انگریزی کی حکومت ہوئی تو ان کی پنشن مقرر ہو گئی جس کا کچھ حصہ مومن خاں کو بھی ملتا تھا۔ مومن خاں کی ولادت ۱۲۱۵ء میں ہوئی۔ بچپن ہی سے ذہانت اور طباعی اور شعر کہنے کی استعداد ان میں موجود تھی۔ حافظہ بہت زبردست پایا تھا۔ جبات سنتے تھے نوادہ یاد ہو جاتی تھی۔ عربی و فارسی میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ فن طب جو انکا موروثی پیشہ تھا اپنے باپ اور چچا سے حاصل کیا۔ شاعری کے علاوہ نجوم میں بھی انھوں نے کمال حاصل کیا تھا اور ایسا ملکہ ہم ہو پچایا تھا کہ ان کے احکام (پیشین گوئیاں) سنکر بڑے بڑے منجم حیران رہ جاتے تھے اکثر احکام کے صحیح ہونے کے سبب لوگ ان کے بہت متقد تھے اور اکثر آئندہ کی باتیں ان سے دریافت کیا کرتے تھے شطرنج سے بھی انکو کمال مناسبت تھی۔ اور دلی کے مشہور شاطر کرامت علی خاں سے قرابت قریبہ رکھتے تھے مگر ان تمام مشاغل اور فنون کو انھوں نے ذریعہ معاش نہیں بنایا تھا۔ آدی بہت خوبصورت خوش وضع اور عاشق مزاج تھے عشق یازی کے لیے دلی اور سرسبز شہر پایا تھا۔ جہاں انکے

عشق و محبت کے افسانے لوگوں کے زباں زد تھے۔ جب جوانی کی ہوس کی ختم ہو گئی تو انھوں نے تمام بڑی باتوں سے توبہ کر لی تھی اور نماز روزہ کے سختی سے پابند ہو گئے تھے جو کلام انکی جوانی اور آزادہ روی کے زمانہ کا ہے وہ عاشقانہ رنگ میں ڈوبا ہوا ہے مگر آخر عمر میں کام میں بہت بچنگی اور متانت آگئی تھی۔ ابتدا میں شاہ نصیر کو اپنا کلام دکھانے تھے مگر چند روز کے بعد اُن سے اصلاح لینی چھوڑ دی اور اپنی ہی ذہانت اور طباعی پر بھروسہ رکھتے تھے۔ دلی سے پانچ مرتبہ باہر نکلے اور رام پور۔ سہوان۔ جہانگیر آباد۔ اور سہانپور کی بسر کی چنانچہ کہتے ہیں ۷

دلی سے رامپور میں لایا جنوں کا شوق	ویرانہ چھوڑ آئے میں میرانہ ترنم
چھوڑ دلی کو سہواں آیا	ہرزہ گردی میں مبتلا ہوں میں

مگر وطن کی محبت نے پھر اپنی طرف جلد بلایا۔ جب مرزا غالب نے ۱۲۸۷ھ میں دلی کا راج کی پریشین پروفیسری قبول کرنے سے انکار کیا تھا تو اسی صاحب نے یہی جگہ بشاہرہ اتھی روپیہ ماہوار اس شرط پر کہ باہر جائیں مومن خاں کو دینا چاہی مگر انھوں نے باہر جانے سے انکار کیا اسی طرح کپور تھلہ بھی بشاہرہ تین سو پچاس پر نہ گئے۔ کیونکہ سن یا تھا کہ وہاں ایک گوینے کی بھی تنخواہ ہے۔ نواب وزیر الدولہ بہادر والی ٹونک نے ایک مرتبہ انکو بلا بھیجا اور اپنے پاس رکھنا چاہا مگر انھوں نے اس بنا پر انکار کر دیا کہ ٹونک میں دلی کی پر لطفت صحبتیں کہاں میسر ہوں گی۔ مومن خاں نہایت آزاد مزاج قانع اور وطن دوست تھے۔ امیروں اور رئیسوں کی دربار داری اور خوشامد سے انکو سخت نفرت اور عار تھا۔ یہی اُن کے گیر گیر کی ایک نمایاں خصوصیت تھی۔ اُن کا دیوان اُمرا کے مدحیہ قصائد سے خالی ہے۔ سوائے اُس قصیدہ کے جس کا مطلع ہے۔

صبح ہوئی تو کیا موا ہے وہی تیو اختر	کثرت دود سے سیاہ شعلا شمع خادری
یہ قصیدہ بطور اظہار شکر یہ کے راجہ اجیت سنگھ رئیس پشیار کی شان میں لکھا تھا	

جنہوں نے اُن کو ایک ہتھنی بطور تحفہ کے دی تھی۔

اپنی قابلیت اور جہر ذاتی کا حکم مومن خاں صاحب کو اس درجہ خیال تھا کہ اسکے مقابلہ میں لوگوں کی نصاحت و بلاغت کو پیچ سمجھتے تھے۔ مشہور ہے کہ گلستان سعدی کو بھی ایک مہولی کتاب کہتے تھے جب سعدی کی نسبت اُن کا ایسا خیال تھا تو اپنے معاصروں ذوق و غایت کو کیا خطرہ میں لاتے۔ اُن کے کلام کو نگاہ حقارت سے دیکھتے اور انکا مضحکہ اُڑاتے تھے تاریخ گوئی میں اُن کو کمال حاصل تھا تاریخ میں تخریج اور تمیہ برا سمجھا جاتا ہے مگر انکی طبع رسلنے اُسکو محنت میں داخل کر دیا تھا تاریخیں نئے نئے طریقہ سے نکالتے تھے مثلاً اپنی صغیر سن مٹی کی تاریخ وفات کسی سے خاک برفرق دولت دنیا بے من نشانم خزانہ بر سر خاک اس میں "خزانہ" کے اعداد سر خاک یعنی (رخ) کے اعداد کے ساتھ ملانے سے ۱۳۶۳ نکلتے ہیں ایک مٹی کی تاریخِ ولادت اس طرح کسی سے

نال کھنے کے ساتھ ہاتھ نے	کسی تاریخ و خستہ مومن
--------------------------	-----------------------

"دختر مومن" کے اعداد سے "نال" کے اعداد خارج کرنے سے تاریخ نکل آتی ہے اسی طرح شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی کی وفات کی تاریخ عجیب طریقہ سے نکالی ہے

دست بیدار اجل سے بے سرو پا ہو گئے	فقر و دیں فضل و نہر لطف و کرم علم و عمل
-----------------------------------	-----------------------------------------

اس میں دوسرے مصرعہ کے الفاظ کے صرف پنج کے حروف سے لودہ تاریخ ۱۲۳۹ھ نکلا ہے۔

تصانیف	تصانیف میں ایک دیوان جس میں چھ مثنویاں شامل ہیں یادگار چھوڑا دیوان
--------	--------------------------------------------------------------------

میں جمیع اصناف سخن جو شعرا کے اردو کو مطبوع ہیں بکثرت موجود ہیں۔ دیوان کی ترتیب اُن کے مشہور شاگرد و نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے کی تھی اور ۱۲۳۹ھ میں مولوی کریم الدین صاحب مؤلف تذکرہ شعرا کے ہند نے اُس کو شائع کیا۔

رنگ کلام مومن خاں کا کلام نازک خیالی اور بلند پروازی کے لیے شہرہ آفاق ہے ان کی تشبیہیں اور استعارے بالکل غیر معمولی ہوتے ہیں اور کلام میں ایک خصوصیت پیدا کر دیتے ہیں اُس میں بلند پروازی کے ساتھ صمیم جذبات نگاری کا جو ہر بھی ہے اور یہی چیز اُنکو طرز لکھنؤ سے علیحدہ کر دیتی ہے۔ عاشقانہ رنگ کے وہ اُستاد کامل ہیں۔ اُن کی علمی لیاقت اور طباعی اُنکو معمولی پامال مضامین سے بچاتی ہے۔ مثل غالب کے وہ بھی کلام میں فارسیت کے بہت دلدادہ ہیں کیونکہ فارسی میں اُنکو بھی وہی تحریر حاصل تھا۔ بعض وقت یہ فارسیت کی کثرت ابھی نہیں معلوم ہوتی اور کلام کو سخت اور گنجلک کر دیتی ہے۔ اُن کی مثویاں سرسبز نشتر ہیں جن میں حرمیں نصیب عاشق کے سوز محبت کا اظہار ہے۔ وہ جذبات سے بھری ہوئی ہیں اور مضطرب دلوں کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہیں۔ البتہ یہ اُن میں کمی ہے کہ عشق بازاری ہے اور طرز ادا بلند نہیں ہے۔ اس معنی میں وہ طلسم الفت اور زہر عشق وغیرہ کے رنگ کی کمی جاسکتی ہیں۔ مومن کے یہاں الفاظ کا طلسم ہے اور اسی لفظی ہیرو پھر سے تخیل کے نئے راستے کھل جاتے ہیں۔ مثلاً چند شعر درج ہیں:-

روز جزا جو قاتل دلجو خطاب تھا	میر سوال ہی مرے خوں کا جواب تھا
پس شکستنِ خم زہرِ محبتِ محلول	گناہگار نے سمجھا گناہ کا بجھے
نقدِ جہاں تھا نہ سزا دیتِ عاشقِ جیف	خونِ سرِ ہا د سرِ گردنِ سرِ ہا درہا
کیوں غش ہوئے دیکھ آئینہ کو	کہنے تھے کہ تاب لائیں گے ہم
آئینہ زنگِ غم نے توڑا	کیونکر اُسے مزہ دکھائیں گے ہم

مومن کا مرتبہ حیثیت شاعر مومن شعرائے اردو میں ایک خاص درجہ رکھتے ہیں۔ نہ صرف اپنی ذہانت اور طباعی اور دلغریب شاعری کی وجہ سے یا اس لیے کہ اُن کے معاصرین اُن کی بڑی قدر کرتے تھے بلکہ اس وجہ سے کہ وہ ایک صاحب طرز ہیں جن کے ہر د

نسیم دہلوی منشی امیر اللہ نسیم حسرت موہانی وغیرہ ایسے نام برآوردہ لوگ ہیں مومن
کے مشہور شاگردوں کے نام یہ ہیں۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ صاحب دیوان و تذکرہ گلشن
بے خار۔ میر حسین نسیم۔ میر غلام علی وحشت۔ اصغر علی خاں نسیم وغیرہ مومن کا انتقال
۱۳۶۸ء مطابق ۱۸۵۶ء میں کوٹھے سے گر کر ہوا۔ انھوں نے حکم لگایا تھا کہ پانچ دن
پاپانچ مہینے پاپانچ برس میں مر جاؤں گا۔ چنانچہ پانچ مہینے کے بعد مر گئے۔ گرنے کی
تاریخ خود کہی تھی۔ دست و بازو بہ شکست۔ چونکہ اسی سال انتقال ہو گیا تھا۔ لہذا یہی
تاریخ ان کے مرنے کی سمجھنا چاہیے۔

شیفتہ نسیم نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ خلف الصدق نواب مرتضیٰ خاں جنہوں نے
لفات ۱۳۸۶ء لارڈ لیک کے ساتھ رہ کر بڑے بڑے کام کئے تھے اور اس کے صلے
میں ہوڈل پول کا علاقہ جاگیر میں پایا تھا۔ علاقہ جہانگیر آباد واقع ضلع بلند شہر خود نواب
مصطفیٰ خاں صاحب نے خرید کیا جو اب تک ان کی اولاد کے قبضہ میں ہے۔ نواب صاحب
موصوف کی ولادت ۱۳۲۱ء مطابق ۱۸۰۷ء میں دہلی میں ہوئی اور غدر ۱۳۵۰ء تک
وہیں قیام رہا۔ اس کے بعد اپنے علاقے جہانگیر آباد میں قیام گزیں ہوئے نواب صاحب
کو شعر و سخن سے ازلی مناسبت تھی۔ پرگو شاعر تھے۔ فارسی میں حسرتی اور اردو میں
شیفتہ تخلص کرتے تھے۔ مشہور ہے کہ فارسی میں غالب سے اور اردو میں مومن سے
مشورہ سخن کرتے تھے۔ شاید اتر یہ ہو کہ پہلے اپنا کلام مومن کو کھاتے ہوں اور
ان کے بعد غالب سے جو ان کے بہت بڑے دوست تھے رجوع کی ہو شیفتہ کی
قابلیت کا نشوونما۔ علم و فن اور شعر و سخن کے ایسے جگمگے میں ہوا جس میں مولوی امام بخش صہبائی
عبداللہ خاں علوی مفتی صدر الدین خاں آرزوہ۔ غالب۔ ذوق۔ شاہ نصیر احسان
نسیم۔ حکیم آغا جان عیش وغیرہ شریک تھے۔ مفتی صدر الدین خاں اور خود نواب
صاحب کے یہاں ہفتہ ہفتہ باری باری سے مشاعرہ ہوتا تھا۔ اہل کمال اس میں جمع ہو کر

مصطفیٰ سخن اٹھاتے تھے۔ نواب صاحب کی سخن فہمی کی اتنی شہرت تھی کہ غالب ایسا صاحب کمال اپنے اشعار کی اچھائی اور بُرائی کی کسوٹی نواب صاحب کی پسندیدگی کو قرار دیتا ہے اور کہتا ہے۔

غالب بے گفتگو نازد بدیں ارزش کاد | نمونہ دیوان غزل تا مصطفیٰ خان خوش نکرود

ایک دوسری جگہ اُن کی طباعی اور ذہانت کی داد دیتے ہوئے کہتے ہیں

غالب ز حسرتی چه سرایم کہ در غزل | چوں ادتلاش معنی و مضمون نہ کردہ کس

نواب صاحب کو سفر حج کے بعد سے شعر گوئی سے ایک بے توجہی سی ہو گئی تھی کبھی احباب کے اصرار سے کچھ کہہ لیتے تو کہہ لیتے۔ زیادہ وقت اپنا طاعت و عبادت اور اوراد و وظائف میں صرف کرتے تھے اور تمام منہیات سے تائب ہو گئے تھے۔ تصانیف میں ایک فارسی دیوان ایک اردو دیوان۔ ایک مجموعہ انشائے فارسی جو فارسی انشا پر دازی کا بہترین نمونہ ہے۔ ایک سفر نامہ موسوم بہ ترغیب السالک لانی احسن المسالک جس کا فارسی نام رہ آلودہ ہے اور ایک مبسوط تذکرہ شعرائے اردو کا زبان فارسی میں مشہور بہ گلشن بے خارا اُن کی یادگار میں۔ شیفتہ بہ نسبت شاعر کے ناقد کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں۔ اپنے زمانہ میں بھی ان کو یہی شہرت حاصل تھی اور اردو اور فارسی شاعری کے اعلیٰ درجہ کے نقاد اور سخن سمجھے جاتے تھے۔ ان کا تذکرہ گلشن بے خارا ایک مبسوط اور مشہور تصنیف ہے اور ہائے نزدیک وہ پہلا تذکرہ ہے جس میں انصاف اور آزادی کے ساتھ اشعار کی تنقید کی گئی ہے۔ اردو میں شیفتہ اپنے استاد مومن کے پیرو ہیں۔ اُن کا کلام اخلاق و تصون کے مضامین سے سریز ہے اُن کے کلام میں دانشمندی مطلق نہیں ہے۔ اُن کے اردو اشعار گو بہت اعلیٰ درجہ کے نہ سہی۔ مگر بلند مضامین صاف اور با محاورہ زبان اور پاکیزہ خیالات رکھتے ہیں۔ دوسرے درجہ کے شعرا میں اُن کا درجہ ممتاز ہے اُن کے صاحبزادے نواب محمد اسحاق خاں نے اردو فارسی کلام مع ایک مفید رسالہ اور حالات کے ۱۹۱۵ء میں نظامی پریس

بدایوں سے چھو کر شائع کیا۔

تسکین ۱۲۱۸ء تا ۱۲۶۸ء | میر حسین تسکین میر احسن عرف میر بن صاحب کے بیٹے تھے۔
دلی میں پیدا ہوئے اور مولوی امام بخش تھبائی سے درسی کتابیں پڑھیں۔ شعر و سخن میں انگریز
سے اصلاح لیتے تھے۔ مگر ان کے انتقال کے بعد مومن کے شاگرد ہوئے اور شہرت حاصل
کی تلاش معاش میں لکھنؤ اور میرٹھ گئے مگر جب وہاں کچھ مقصد برآری نہ ہوئی تو رام پور آ رہے
جہاں نواب یوسف علی خاں نے ان کی بڑی قدر دانی کی چند روز رام پور میں آرام سے
بسر کر کے پچاس برس کے سن میں ۱۲۶۸ء میں رام پور ہی میں انتقال کیا اور وہیں
ہی ہونڈ خاک ہوئے۔

کلام کارنگ گواہی دیتا ہے کہ مومن کے شاگردوں میں یہ خاص مرتبہ رکھتے تھے۔
اپنے استاد کے قدم بقدم چلتے ہیں بلکہ کلام میں اس قدر ہم رنگی پیدا ہو گئی ہے کہ اگر دونوں کا
کلام مخلوط کر دیا جائے تو تمیز کرنا دشوار ہو جائے۔ کاتسکین کے بیٹے میر عبدالرحمن آسی
رام پور میں نواب کلب علی خاں کے زمانہ تک تھے۔ یہ بھی ایک نام برآوردہ شاعر تھے۔
نیم دہلوی | مرزا اصغر علی خاں تخلص بہ نیم نواب آقا علی خاں کے بیٹے تھے

۱۲۹۴ء تا ۱۳۶۲ء | دلی میں ۱۲۱۲ء مطابق ۱۲۹۴ء میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما
پایا ضروریات زمانہ کے موافق تعلیم سے فراغت حاصل کی۔ باپ کے مرنے کے بعد
بھائیوں سے ناموافقت ہو گئی اور وہ اپنے بڑے بھائی مرزا اکبر علی خاں کے ساتھ لکھنؤ
چلے آئے اور یہیں رہ پڑے۔ بعد کو بھائیوں نے غنہ تقصیر کرا کے ملنا چاہا مگر انھوں نے
ایک زمانہ اور پھر دلی نہیں کے تمام عمر لکھنؤ میں فقر و فاقہ کی حالت میں رہے مگر کسی
کے سامنے دست سوال نہیں پھیلا یا۔ بڑے پابند مذہب اور احکام قرآنی کے سختی سے
عامل تھے۔ غدر کے بعد منشی نول کشور کے مطبع میں الف لیلا کے منظوم ترجمہ
کی خدمت پر مقرر ہوئے ایک جلد ختم کی تھی کہ مطبع کی طرف سے تکمیل کتاب کی

جلدی ہوئی جو اُن کو ناگوار خاطر ہوئی اور وہ علیحدہ ہو گئے۔ ان کے بعد منشی طوطا رام
 شایاں نے بقیہ کتاب کو پورا کیا۔ تعجب ہے کہ جس وقت لکھنؤ کا طرز زوروں پر کھٹا اسی
 وقت نسیم دہلوی کو خود اپنے طرز میں لکھنؤ میں بڑی شہرت اور کامیابی حاصل ہوئی
 یہ بڑے زورگو تھے مگر اسی کے ساتھ مزاج میں دارنگی اس قدر تھی کہ جو کچھ لکھتے اس
 کی نقل اپنے پاس نہیں رکھتے تھے جس کی وجہ سے بہت کچھ کلام تلف ہو گیا۔ اُن کا
 دیوان اُن کے شاگرد حافظ عبد الواحد خاں مالک مطبع مصطفائی نے چھپوایا تھا۔
 مگر اُس کو وہ اپنے لیے ننگ سمجھتے تھے۔ اُن کی غزلوں کو مرزا غالب بھی پسند کرتے تھے یا جو
 دہلوی ہونے اور اپنے شہر کی زبان پر فخر کرنے اور اُسکی سختی کے ساتھ پابندی کے اکثر اہل لکھنؤ نسیم
 کے شاگرد ہوئے جن میں عبد اللہ خاں تھر۔ منشی اشرف علی اشرف۔ منشی امیر اللہ تسلیم مشہور ہیں۔
 طرز کلام | نسیم میں مومن کا رنگ بہت پایا جاتا ہے اُن کا نہایت ہی لطیف طرز بیان
 اور نازک خیالی کے ساتھ ملا ہوا ہے جو مومن کا فیض تھا۔ نسیم کو تازگی کلام اور صحت عبارات
 کا بہت خیال تھا۔ لکھنؤ کی قصعات اور لفظی کو وہ پسند نہیں کرتے تھے ان کے کلام
 میں خیال کی دلفریبی کے ساتھ زبان کی صفائی اور پاکیزگی بہت نمایاں ہے اپنے استاد
 کی طرح وہ بھی فارسی ترکیبیں بہت استعمال کرتے تھے۔ اور نزاکت خیال اور طرز بندش
 اور دہائی کلام میں بھی انھیں کے پیرو ہیں۔ نسیم کا مرتبہ شعرا کے درجہ دوم میں بہت تر ہے۔
 ذوق مستعد لغات مستعد
 سلطان مستعد لغات مستعد
 شیخ ابراہیم ذوق ایک غریب سپاہی شیخ محمد رمضان کے بیٹے
 تھے جن کو نواب لطف علی خاں رئیس کی حرم سر کے کاروبار
 کی خدمت سپرد تھی۔ گو وہ کسی بڑے گھرانے سے نسبت نہ رکھتے تھے مگر اپنے جو ہر ذاتی اور
 فنی قابلیت سے ہزاروں شریفوں اور عالی خانہ انوں سے بڑھ کر مشہور ہوئے۔ اُن کی
 ابتداء ہی تعلیم ایک شخص حافظ غلام رسول کے سپرد ہوئی جو معمولی درجہ کے شاعر بھی تھے
 اور جن کے پاس محلے کے اکثر لڑکے پڑھنے آتے تھے۔ حافظ صاحب کو شعر سے بہت

شوق تھا اور اکثر شاعروں میں شرکت کرتے تھے۔ انھیں کے ساتھ ہمارے نوعمر ذوق بھی شاعروں میں جایا کرتے تھے۔ جہاں لوگوں کے اشعار سن کر ان کو ایک روحانی لذت حاصل ہوتی اور شعر کہنے کا شوق دل میں پیدا ہوتا۔ اس زمانہ میں اکثر اچھے اچھے اشعار یاد کر لیتے اور ان کو بار بار پڑھا کرتے تھے اس زمانہ کا کلام حافظ جی ہی کو دکھاتے اور ان ہی سے اصلاح لیتے تھے۔ ذوق کے ہم محلہ اور ہم سبق میر کاظم حسین شاہ نصیر کے شاگرد ہو گئے جن کا اُس وقت دلی میں بڑا شہرہ تھا۔ ان کی دیکھا دیکھی ذوق کو بھی خیال پیدا ہوا کہ شاہ نصیر کے شاگرد ہو جائیں چنانچہ ایسا ہی کیا اور ایک دن میر کاظم حسین کے ساتھ جاکر شاہ صاحب کے شاگرد ہو گئے نوجوان شاگرد کی غیر معمولی ذہانت اور طباعی سے تجربہ کار استاد کو خیال پیدا ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ شاگرد استاد سے بڑھ جائے۔ اسی خیال سے وہ کبھی ان کی غزلوں کو بغیر اصلاح پھیر دیتے کبھی منہ بنا کر کہتے یہ کچھ نہیں۔ طبیعت پر زور ڈال کر کہو۔ ادھر ذوق کو ان کے دوستوں نے استاد کے خلاف ابھار دیا۔ غرض کہ انھیں وجوہ سے رشتہ استاد و شاگردی منقطع ہو گیا۔ ذوق اپنے کلام کو بہ نظر اصلاح خود دیکھنے لگے اور اُس کی درستی و جہتی میں بڑی کدو کاوش کرنے لگے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُنکے کلام نے جلد شہرت حاصل کر لی اور اُنکی غزلیں محفلوں اور مجلسوں حتیٰ کہ کوچہ و بازار میں گائی جاتی تھیں۔ اس زمانہ میں مرزا ابوالنظر ولیعہ سلطنت کے یہاں اکثر شاعرے ہوا کرتے تھے۔ اور بسا اوقات غزلیں فی البدیہہ کہی جاتی تھیں جس سے شاعرانہ جودت اور تیز ہوتی تھی اور نو آموز شعر کا شوق اور زیادہ ہوتا تھا۔ ان شاعروں میں اکثر پرانے اور کہنہ مشوق شاعر مثلاً فراق احسان، شکیبائی، قاسم، عظیم، منت وغیرہ برابر شریک ہوتے تھے انھیں میں بہ توسط میر کاظم حسین بیقرار ذوق کی بھی رسائی ہوئی۔ اتفاق سے اس زمانہ میں شاہ نصیر دلی چھوڑ کر کہیں باہر گئے ہوئے تھے اور ولیعہ سلطنت ظفر کی غزلوں کی اصلاح میر کاظم حسین کے سپرد تھی اتفاقاً ان کو بھی بحیثیت میر منشی

جان لفسٹن صاحب کہیں باہر جانا پڑا اور اب صلاح کا کام ذوق کے سپرد ہو گیا جس کا صلہ چار روپیہ ماہوار بطور مشاہرہ مقرر ہوا۔ یہ تنخواہ گو بہت کم تھی مگر اس کمی کی تلافی ان کی قدر و منزلت اور شہرت کی زیادتی سے بخوبی ہو گئی۔ اس وجہ سے کہ اب شہر کے تمام امیر و رئیس اور نیز کہنے مشق شاعران کو استاد ماننے لگے۔ دلی میں نواب اکبر بخش خاں مخلص بمعروف (مرزا غالب کے خسر) ایک عالی خاندان امیر تھے اور علوم ضروری سے باخبر تھے کے علاوہ کہنے مشق شاعر بھی تھے پہلے شاہ نصیر سے اصلاح لیتے تھے۔ جب ذوق کا شہر ہوا تو انھیں بھی اشتیاق ہوا اور (بقول مولانا آزاد) ذوق کے شاگرد ہو گئے۔ اس وقت ذوق کی عمر تقریباً بیس سال تھی ان دو مشہور آدمیوں کی شاگردی سے نہ صرف ذوق کی شہرت میں اضافہ ہوا بلکہ ان کو اپنے کلام کی جنگلی و صفائی کا انتہائی خیال ہوا۔ اور اسی وجہ سے وہ نہایت عمدہ شعر کہنے لگے اور یہی مشق آئندہ ان کے کام آئی۔ کیونکہ ان کو نواب صاحب کے کلام کی اصلاح میں بڑی کاش کاوش کرنا پڑتی تھی اور ان کی غزلوں کو جو کبھی سودا کبھی جرات بے دردی کے طرز میں ہوتی تھیں بڑی دقت نظر سے بنانا پڑتا تھا

شاہ نصیر سے مرکہ | جب شاہ نصیر دکن سے واپس آئے تو اپنا علم استاد ہی پھر بلند کیا اور ہونہار اور ظہار شاگرد کے دل کو بھی اتنے دنوں کی مشق اور کد کاوش نے اور بڑھادیا تھا مشکل مشکل بچروں اور روایت قافیوں میں کہتے کہتے بڑی مشافی اور روانی پیدا ہو گئی تھی۔ شاہ نصیر نے دکن میں کسی کی فرمائش سے نو شعر کی ایک غزل کہی تھی جس کی روایت بھی

اس مصنف تذکرہ کل رعنا اس معاملہ میں آزاد سے بالکل مختلف رائے رکھتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ آزاد نے آیات میں جس طرح سے ظہر و جمہ کی کاوش فکر سپانی پھیرا ہے ان کے اس وقت کے بھی سنج نگار کو اپنے استاد ذوق کے دامن کمال سے وابستہ کیا ہے اور جو دیکھ اس کہنے مشق شاعر کی عراس وقت چھیاٹھ برس کی تھی اور ذوق پر مشکل اٹھا رہا ہے کے رہے ہوں گے۔ مگر جوش عقیدت میں اس کا خیال نہیں رہا (تذکرہ گل رعنا ص ۲۸۴) اور نیز نواب سید الدین احمد خاں غالب مرحوم نے بھی ایک مضمون میں نہایت مدلل طریقہ سے آزاد کے اس بیان کی تردید کی ہے

ہاتھ و آب و خاک باد وہ غزل دلی کے شاعر ہیں سنائی اور کہا کہ اس طرح میں جو
 غزل لکھے اس کو میں استاد مانتا ہوں۔ شاہ صاحب کی بہارِ طلبی پر ذوق نے مقابلہ کا
 بیڑا اٹھالیا اور ایک غزل اور تین قصیدے لکھ کر تیار کیے۔ شاہ صاحب کو شاگرد کی
 جرات و گستاخی بہت ناگوار ہوئی ایک شاگرد سے اعتراض کر لیا جس کے جواب میں فق
 نے اکثر اناد پیش کئے اور اس مقابلہ میں ذوق ہی کو کامیابی ہوئی اس کے بعد سے انکی
 استاد ی مسلم ہو گئی۔ اُن کے اعلیٰ قصائد کے صلہ میں اکبر شاہ ثانی نے اُن کو سخا فانی ہند
 کا معزز خطاب عطا کیا تھا۔ جب مرزا ابوال مظفر بادشاہ ہو کر بہادر شاہ ہوئے تو انھوں نے
 پہلے یہ قصیدہ گزرا نا سہ

روکش ترے رخ سے ہو کیا نورِ سحر رنگِ شفق ہے ذرہ تیرا پر تو نورِ سحر رنگِ شفق

اس کے صلہ میں اُن کی تنخواہ چار روپیہ سے پانچ روپیہ ہو گئی اور پانچ سے سات رفتہ
 رفتہ سو تک اضافہ ہوا تھا اور عید بقرعید کے موقع پر خلعت و انعام سے سرفراز ہوتے تھے
 آخر ایام میں ایک دفعہ بادشاہ بیمار ہوئے جب شفا پائی تو انھوں نے قصیدہ کہہ کر گزرا نا

دواہ واکیا معتدل ہے بارغ عالم کی ہوا مثلِ نبضِ صاحبِ صحت ہے ہر موجِ صبا

اس کے صلہ میں خلعت کے سوا خطاب خان بہادری اور ایک ہاتھی سح حوضہ فقری
 عنایت ہوا پھر ایک دوسرے قصیدے کے صلے میں۔

شب کو میں اپنے سر بسترِ خواب راحت نشہ علم میں سرسیت غرور و نخوت

۱۰ شکارِ قصیدہ جس کا مطلع ہے ۵

جیکہ سلطان واسد ہر کا ٹھہرا سکن آب و ایولہ ہوئے نشوونما کے گلشن

۱۱ غائب مرزا غالب نے اسی موقع پر یہ غزل کی ہوگی جس کا یہ مطلع و مطلع ہے۔

پھر اس انداز سے ہمارا آلی کہ ہوئے ہر دم تماشا ئی

کیوں نہ دنیا کو غرضی غالب شاہ دیدار نے شفا پائی

ایک گائوں جاگیر میں عنایت ہوا۔ ذوق نے عمر اڑھ سال ۱۲۸۰ء میں انتقال کیا۔ ذوق
اپنی تیزی ذہن، براقی طبع اور قوت حافظہ کے لئے مشہور تھے۔ بڑے خدا ترس اور
ہمدردی انسانی سے لبریز تھے۔ خوف خدا کا یہ حال تھا کہ کبھی کوئی جانور بلکہ ایک چڑیا
سب ہلاک نہیں کی۔ مختلف اذواق سے دلچسپی رکھتے تھے۔ مثلاً موسیقی، نجوم، طب
تعبیر خواب وغیرہ۔ شعر گوئی ان سب پر عادی تھی اس میں ان کو فائیت کا مرتبہ
حاصل تھا۔ جوں جوں عمر گذرتی گئی ان کی قابلیت اور کمال میں اضافہ ہوتا گیا۔ اُن کو فتنہ،
تصوف، تفسیر، حدیث، تاریخ وغیرہ میں دستگاہ کامل تھی، دنیاوی ترقی کے حوصلے
اُن کو مطلق نہ تھے۔ دلی سے اُن کو اس قدر محبت تھی کہ جب راہ چند دلال نے جوشا داناں
تخلص کرتے تھے اور شعرو شاعری کے بڑے دلدادہ اور شعرائے مرہبی تھے انکو حیدر آباد
بلوا بھیجا تو انھوں نے صاف انکار کر دیا اور یہ شعر لکھ کر بھیج دیا۔

ان دنوں گر جہ دکن میں ہے بڑی تدنکن | کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر
ایک ایک گلی کے اندر ایک چھوٹے سے مکان میں رہا کرتے تھے جس میں کوئی زیرے زمین
بلکہ آرام و آسائش تک کا سامان نہ تھا۔ اُسی مکان میں ہر وقت بند اپنی فکر شعرو سخن
میں محو و متغرق دنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر رہتے تھے۔ احکام قرآنی کے پورے
عامل اور نماز روزہ کے سختی سے پابند تھے دن رات میں اکثر اوقات اُردو اور
وظائف میں صرف کرتے تھے

تصانیف | ایک ایسے شخص سے جس نے اپنی عمر کے پچاس برس سے زیادہ شعرو سخن کی
مشق میں صرف کیے ہوں اور سوائے شعرو سخن کے اُس کا کوئی دوسرا مشغلہ نہ رہا ہو میں
لے ظفر نے تاریخ لکھی۔

شب چار شنبہ بہ ماہ صفر | بکرم خداوند جان داد ذوق
ظفر روے اردو بہ تاخن از غم | خواہند و فرمود استاد ذوق
۱۲۷۱ھ

کی جاسکتی تھی کہ متعدد دیوان لاکھوں ابیات کے اُس نے یادگار چھوڑے ہوں گے اس میں کوئی کلام نہیں کہ انھوں نے بہت کچھ لکھا تھا۔ اگر اُن کا سب کلام اس وقت جمع کیا جاتا تو کئی جلدیں تیار ہوتیں۔ مگر افسوس ہے کہ سارا کلام زمانہ غدر کی لوث مار میں ضایع ہو گیا۔ مولوی محمد حسین آزاد اُن کے شاگرد رشید نے اس واقعہ کو نہایت رونگ طریقہ سے اپنی کتاب "آب حیات" میں لکھا ہے اور یہ بتلایا ہے کہ اُن کا جقدر کلام ہمارے سامنے ہے وہ خود اُن کی اور حافظ غلام رسول دیران کی متعدد کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ذوق غزل اور قصیدہ دونوں کے استاد کامل تھے جن کی تعداد کافی مقدار میں وہ چھوڑ گئے ہیں۔ آب حیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک عشقیہ خط بطور مثنوی جس کا نام "نارِ جہاں" رکھا تھا اور پانچ سو ابیات کے بعد ہنوز ناتمام تھا ایام غدر کی دستبرد میں ضایع ہو گیا۔ انھوں نے اکثر مخمس رباعیات اور تارنجیں بھی لکھی تھیں جن میں سے اکثر ضایع ہو گئیں مگر چند دیوان موجودہ میں شامل ہیں۔ اپنے شاگرد رشید ظفر کے واسطے کچھ گیت وغیرہ بھی لکھے تھے البتہ سلام اور مرثیہ اور سبجو وغیرہ ان کے کلام میں نہیں پائی جاتیں۔

ذوق کی خدمت | ذوق کا بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے زبان کو خوب صاف کیا اور اس پر جلا دی۔ وہ ایک بہت بڑے صنّاع تھے اور الفاظ کی نشست اور مناسب استعمال سے کماحقہ واقف تھے۔ محاورات اور امثال کے استعمال میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتے۔ الفاظ کا ہر محل استعمال فن عروض سے واقفیت موسیقیت کلام زور تخلیک اور بلندی مضامین یہ سب چیزیں مل کر اُن کے کلام کا جوہر اعلیٰ بن گئی ہیں۔ کسی دوسرے شاعر کے کلام میں لطف الفاظ کے ساتھ خوبی معنی اس قدر نہیں پائی جاتی۔

انداز کلام | ذوق کی شاعری میں تکلف اور تضنع مطلق نہیں ہے اُن کے یہاں تشبیہات اور استعارات اور دیگر صنایع بدیع نہایت مناسبت سے کالملمح فی الطعوم استعمال ہوئے ہیں جسکی وجہ

سے مصنف خفیانہً سجادید اس سہی میں انور اور ظہیر کو بھی شریک بتاتے ہیں۔ دیکھو حال انور دہلی

سے شعر کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ اُن کے کلام سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ شاعر اپنی قابلیت اور علم و فضل کا زبردستی اظہار کرنا چاہتا ہے۔ کلام میں روانی اور نرمی بہت ہے۔ اعلیٰ تخیل اور لہندی مضامین کبھی الفاظ کی خوبصورتی اور صرف بر محل کے مزاحم نہیں ہوتے۔ ہر شعر بر محل اور حشود اند سے پاک ہوتا ہے۔ بہت اشعار اُن کے دیوان میں نہیں ہیں۔ قوت کلام اور تنوع مضامین کے اعتبار سے اُن کا مقابلہ سودا سے کیا جاسکتا ہے اور انھیں کے وہ جتنے تھے بھی۔ مگر اُن کے یہاں اور استادوں کا بھی رنگ موجود ہے۔ مثلاً خواجہ میر درد اور جرات و مصحفی قصیدہ میں وہ کامل استاد مانے گئے اور اپنے تمام معاصرین پر سبقت لے گئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے اکثر قصائد ضایع ہو گئے مگر جو کچھ ہمارے سامنے ہیں اُن کی قادر الکلامی، اعلیٰ تخیل اور بلند پروازی اور روانی کلام کے بے مثل نمونے ہیں اس صنف میں وہ آپ اپنی نظیر تھے۔ اُن کی غزلیں تازگی مضامین، خوبی محاورہ سادگی اور صفائی کے لیے مشہور ہیں۔ اُن کے کلام میں شاہ نصیر، سودا، درد، مصحفی، اور جرات سب کا رنگ پایا جاتا ہے اسی وجہ سے اُن کے کلام کو گلدستہ گلہائے رنگارنگ کہنا بے جا نہیں۔ ان کی وہ غزلیں جو جرات کے رنگ میں ہیں مگر جرات کے عیوب سے پاک ہیں نہایت اعلیٰ درجہ کی ہیں۔ اُن کے کلام پر بعض لوگوں کی یہ اعتراض ہے کہ وہ معاصر سے پاک نہیں ہے اور عام لوگوں کے لئے ہے۔ ایسی صورت میں جب اُن کے اکثر معاصرین ٹپا بٹپے فارسی و عربی داں شاعر تھے جن کا کلام معمولی آدمیوں کی سمجھ سے باہر تھا یہ اعتراض بے جا بھی نہیں ہے تازک خیالی اور معانی آفرینی میں اگرچہ وہ غالب سے کم ہوں مگر سادگی اور صفائی اور ترم الفاظ کے لحاظ سے وہ ان سے بڑھے ہوئے ہیں اور قصیدہ میں انوں سے کہیں زیادہ ہیں۔ مختصر یہ کہ آسمان شاعری پر دوش ایک درخشاں تارہ بن کر چمکے اور زبان اردو کے بہترین شعرا میں ان کا شمار کیا جاسکتا ہے۔

شاگرد اُن کے سیکڑوں شاگرد تھے جن میں نواب مرزا خاں داغ۔ ظفر۔ آزاد۔ ظہیر اور

اور بہت نامور ہوئے ہیں۔ اُن کے ایک ہی بیٹے تھے خلیفہ محمد اسماعیل جو اُن کے
فرزندان روحانی کی طرح زمانہ غدر میں دنیا سے اٹھ گئے۔

ظہیر متونی ^{۱۹} | سید ظہیر الدین نام ظہیر تخلص سید جلال الدین حیدر کے بیٹے دلی کے
باشندے تھے اُن کے والد ابو المنظر بہادر شاہ کے خوشنویسی میں استاد مرصع رقم خان بہادر کے
خطاب سے سرفراز تھے خود ظہیر بھی کم سنی ہی میں شاہی ملازمت میں داخل ہو گئے تھے
اور راقم الدولہ خطاب اور ایک مرصع دوات انعام میں پائی تھی شعرو سخن سے بچن ہی سے
شوق تھا چودہ برس کے سن میں استاد فدق کے شاگرد ہو گئے۔ غدر ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ
میں ناچار دلی سے نکلنا پڑا۔ جھڑ سونی پت۔ نجیب آباد ہوتے ہوئے بریلی آئے اور یہاں
سے لکھنؤ کا ارادہ کیا مگر وہاں کے ابتر حالات سن کے کچھ دنوں بریلی میں رہ کر رام پور چلے گئے
وہاں چار برس رہے۔ اُس کے بعد دلی آئے اور محکمہ جنگی میں ملازمت مل گئی اُس کے
تھوڑے عرصے کے بعد اخبار جلوہ طور کے ایڈیٹر ہو گئے جو بلند شہر سے نکلتا تھا۔ اُن کے
مضامین کو مہاراجہ شیو دھان سنگھ والی اور نے پڑھا اور بہت پسند کیا۔ ان کو اور
بلوا بھیجا جہاں یہ چار برس رہے۔ وہاں کی سازشوں سے دل برداشتہ ہو گئے۔ محبوب
ہو کر پھر دلی آئے اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کی سفارش سے جپور کے محکمہ پولیس
میں ان کو ایک معقول جگہ مل گئی۔ بے پور میں کم و بیش انیس سال رہے۔ دلی ریاست
کے مرنے پر اُن کا تعلق ریاست سے منقطع ہو گیا۔ چند روز پریشانی میں بسر ہوئے
تھے کہ نواب محمد علی خاں خلف نواب امیر خاں دلی ٹونک نے بلا بھیجا اور
جب تک نواب زندہ رہے یہ بہت عزت و اکبر و سے ان کے ساتھ رہے
نواب کے مرنے کے بعد اُن کے صاحبزادے نواب ابراہیم علی خاں نے اُن کا وظیفہ مقرر کر دیا
اس طریقہ سے تقریباً پندرہ سولہ برس ٹونک میں رہے آخر عمر میں حیدر آباد چلنے کا شوق پیدا
ہوا تھا چنانچہ ٹونک سے رخصت نے کر حیدر آباد گئے جہاں آٹھ مہینے کے قیام کے بعد

باریابی ہوئی مگر تنخواہ مقرر ہونے کی نوبت نہ آئی تھی کہ موت نے ساری امیدوں اور آرزوؤں کا خاتمہ کر دیا۔ بیکاری کے زمانہ میں جب پریشاں حال ہو گئے تھے تو ہمارا راجہ سرکشن پرشار نے اُن کی بہت مدد کی تھی۔

ظہیر ایک پر گوشاعر تھے۔ تصنیفات کا حال یہ ہے کہ ایک دیوان سنی گلستان سخن آگرہ میں چھپ گیا ہے۔ دیوان دوم و سوم کا حق تصنیف قاضی عبدالکریم مالک مطبع کریم بیبی نے خرید لیا تھا اور یہ بھی چھپ گئے ہیں۔ چوتھا دیوان جس میں بقول حسرت موہانی تین سو غزلوں کے علاوہ بہت سے قصائد اور مستزاد شامل ہیں اُن کے نواسے کے پاس ہے۔

ظہیر اپنے زمانہ کے مشہور شاعر تھے گو کہ ذوق کے شاگرد تھے مگر کلام میں مومن خاں کارنگ زیادہ پایا جاتا ہے جس کا اعتراف بعض غزلوں کے مقطعوں میں خود انھوں نے کیا ہے۔

طرز مومن سے نہ آگاہ تھا جب تک کہ ظہیر	سچ تو یہ ہے کہ کبھی رنگ غزل نے نہ دیا
کیا نباہی طرز مومن اسے ظہیر	طاق ہیں لاریب اپنے فن میں ہم

آخری دور کے بڑے نامور شاعر تھے اور اپنے زمانہ میں زبان اور شاعری دونوں کے استاد ملنے جاتے تھے ان کے مشہور شاگرد نجم الدین احمد شاقب بدایونی ہیں جو پہلوان سخن کے لقب سے مشہور ہیں۔

انور | سید شجاع الدین عرف امر اور زرا متخلص بہ انور ظہیر مذکورہ بالا کے چھوٹے بھائی تھے اور یہ بھی ذوق کے شاگرد تھے ذوق کے بعد اپنا کلام مرزا غالب کو دکھلانے تھے نہایت قابل اور ہونہار شاعر تھے مگر افسوس ہے کہ بچہ پورہ میں عین جوانی میں بمر ۳۳ سال انتقال کیا۔ ان کے تمام معاصرین ان کی بڑی عزت اور قدر کرتے تھے اور یہ اُن سب مشاعروں میں شریک رہ چکے ہیں جو غدر کے دس سال بعد دلی میں

ہوا کرتے تھے جن میں دائع، حالی، ظہیر، مجروح، ساکت، ارشد، مشتاق وغیرہ اپنی
 لاجواب غزلیں سناتے تھے۔ ان کے دو دیوان ضایع ہو گئے مگر محترمی لالہ سری رام
 صاحب قابل مصنف، خانہ جاوید نے بڑی محنت اور مشقت سے متفرق اور پریشان
 مسودوں سے ایک دیوان جمع کر کے چھپوایا ہے۔ انور کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ
 ان میں ذوق غالب اور حسن تینوں کا رنگ کچھ کچھ ملتا ہے۔

غالب ۱۲۱۲ھ لغایت ۱۲۸۵ھ | زبان اردو کے بہت بڑے ماہر، آسمان شاعری کے سب سے
 ۱۲۹۶ھ لغایت ۱۸۶۹ء عیسوی | درخشندہ تارے، اپنے زمانہ کے استاد کامل، فلسفی شاعر

مرزا اسد اللہ خاں متخلص بہ اسد و غالب ۱۲۱۲ھ مطابق ۱۷۹۶ء میں بمقام آگرہ پیدا
 ہوئے لقب مرزا نوشہ تھا اور خطاب نجم الدولہ ویر الملک، نظام جنگ، بادشاہ دہلی سے
 عطا ہوا تھا مرزا کو جس طرح اپنی ذاتی قابلیت پر اسی طرح اپنی اصل و نسل اور عالی
 خاندان ہونے پر بھی بڑا فخر و ناز تھا۔ جیسا کہ ان کے اکثر اردو فارسی کلام سے ظاہر ہوتا ہے
 مثال کے لئے یہ چند شعر کافی ہیں۔

غالب از خاک پاک تو را نیم ترک زادیم و در نژاد ہمی ایسکیم از جماعت اتراک فیض حق را بہینہ شاگردیم بہ تلاشے کہ بہت فرزدیم ہمہ بر خویش تن ہے گریم	لاجرم در لب فرہمندیم بستر گمان قوم پیوندیم در تمامی زماہ دہ چندیم عقل کل را ہمینہ فرزدیم بہ معاشے کہ عیت خوردیم ہمہ بر روزگارے خندیم
--------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------	-----------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------

اشعار مذکورہ بالا سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا خاندانی سلسلہ ایک ترکمانوں سے
 جو وسط ایشیا کے رہنے والے تھے، ملتا ہے جو اپنے آپ کو سلاطین سلجوقیہ کی دسالت
 سے فریدون کی نسل میں سمجھتے تھے۔ مرزا کے دادا سب سے پہلے ہندوستان آئے اور

شاہ عالم کے دربار میں عزت پائی مرزا کے والد مرزا عبداللہ بیگ خاں نے ایک متلون
زندگی بسر کی۔ کچھ دنوں دربار اودھ میں رہے پھر حیدر آباد گئے جہاں نواب نظام علی
خان بہادر کی سرکالہ میں تین سو سوار کی جمیعت سے ملازم رہے کئی برس بعد گھر آئے
اور آئور میں راجہ بختاوار سنگھ کی ملازمت اختیار کی یہاں کسی سرکش گڑوسی کی لڑائی
کے موقع پر ۱۲۱۵ء میں مارے گئے۔ اس وقت مرزا کا سن پانچ برس کا تھا مرزا عبداللہ بیگ
خاں کی شادی خواجہ غلام حسین خاں کی لڑکی سے ہوئی تھی جو فوج کے کیمدان اور اگرہ
کے مشہور رئیس تھے۔ والد کے انتقال کے بعد مرزا کی پرورش اور تعلیم تربیت ان کے
چچا مرزا نصر اللہ بیگ خاں کے سپرد ہوئی جو انگریزی فوج میں رسالدار تھے اور حسن
خدمات اور وفاداری کے صلہ میں سرکار انگریزی سے جاگیر پائی تھی۔ ان کا انتقال
بھی ۱۲۱۵ء میں ہو گیا اس وقت غالب کی عمر نو برس کی تھی اس کے بعد ان کی خبر گیری انکی
ناہال میں ہوتی رہی اور ان کے چچا کی جاگیر کے عوض میں سرکار انگریزی سے پنشن بھی ملتی رہی
مرزا کا بچپن اگرہ میں گزرا جہاں وہ ایک کہنہ مشق استاد شیخ معظم سے تعلیم پاتے رہے اور کہا
جاتا ہے کہ اسی زمانہ میں مشہور شاعر نظیر اکبر آبادی سے بھی کچھ ابتدائی کتابیں پڑھی تھیں
جب ان کی عمر چھوڑہ برس کی ہوئی تو ہر مرزا نام ایک پارسی سے جو زند پانڈ کا عالم اور بڑا
سیاح تھا ان کی ملاقات ہو گئی۔ ہر مرزا نے آخر میں مذہب اسلام قبول کر لیا تھا اور عبد الصمد
نام رکھا تھا۔ یہ ان کے ساتھ تقریباً دو برس رہا اور چونکہ فارسی کی طرف ان کو قدرتی مہارت
تھی لہذا اس سے انھوں نے پوری طرح کتاب کمال کیا اس کے فیضان صحبت کا مرزا کو
فخر تھا۔ اور اس میں شک نہیں کہ اس کی تعلیم و تربیت کے اثر سے مرزا میں وہ صمیم اور با محاور
فارسی قدیم لکھنے کا بادیہ بخوبی پیدا ہو گیا جو صرف ایک اہل زبان ہی کی مدد سے ہو سکتا ہے۔

غالب دہلی میں پہلی مرتبہ ۱۲۱۵ء میں آئے جب ان کے چچا کی شادی نواب فخر الدہلہ
کے خاندان میں ہوئی تھی۔ اور خود ان کی شادی نواب الہی بخش خاں معروف کی بیٹی کے

ساتھ جو نواب فخر الدولہ والی لہارہ کے چھوٹے بھائی تھے ۱۲۲۵ء میں ہوئی جبکہ ان کا سن تیرہ برس کا تھا۔ دہلی کی فضا میں اس وقت شاعری گونج رہی تھی، مشاعرے جاگ رہے تھے۔ شادی بھی ایک مشہور و معروف شاعر کی بیٹی کے ساتھ ہوئی، ان سب باب سے نوعمر غالب کی نوخیز طبیعت پر شاعری کا اثر اتر پڑا۔ شروع میں وہ فارسی کہتے تھے اور اس میں بہت کچھ کہا مگر رفتہ رفتہ اردو شاعری کی روتہ افروز ترقی اور ماحول کے اثر سے اردو کی طرف توجہ کی۔ پہلے اسے تخلص کرتے تھے جب کسی شخص کا یہ شعر سنا کہ

اسد تم نے بنائی یہ غزل خوب اسے ادبیر رحمت ہے خدا کی

یہ سنتے ہی اس تخلص سے فقرت ہو گئی۔ کیونکہ ان کا یہ بھی قاعدہ تھا کہ عوام الناس کے ساتھ شریک حال ہونے کو بہت بُرا جانتے تھے چنانچہ ۱۲۲۵ء میں "اسد اللہ غالب" علی بن ابی طالب کی رعایت سے غالب تخلص اختیار کیا لیکن جن غزلوں میں اسے تخلص تھا انھیں اسی طرح رہتے دیا۔ مرزا مظہر علی میں کلکتہ بھی گئے تھے پہلے اپنی پیش کے جوان کے چچا کو جاگیر ضبط ہو جانے کے عوض ملتی تھی اور آخر میں بند ہو گئی تھی مگر باوجود متعدد کوششوں کے اور ولایت میں اپیل دائر کرنے کے بھی مرزا اپنی اس کوشش میں ناکام رہے۔ کلکتہ کے راستے میں مرزا نے لکھنؤ اور بنارس کی بھی سیر کی تھی اور ایک قصیدہ نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ کے واسطے اور ایک شریفیہ سلطنت کی مدح میں پیش کی تھی مگر آخری ہاجہ رازمہ واجد علی شاہ کی سرکار سے بھی پانچ سو روپیہ سال ان کے واسطے مقرر ہے تھے مگر دو برس کے بعد جب انشراح سلطنت ہوا تو وہ موقوف ہو گئے۔ ۱۲۲۶ء میں غالب تین ماہ کے واسطے کوئٹہ شہر کی عداوت کی وجہ سے قید ہو گئے تھے۔ مگر قید میں ان کے مرتبہ کے موافق ان کا احترام کیا گیا۔ ۱۲۲۷ء میں غالب ایک فارسی پروفیسر کے لیے جو دلی کلج میں خالی ہوئی تھی امیدوار تھے مگر چونکہ نامن صاحب سکریٹری کوڈرمنٹ نے بروقت ملاقات مرزا کا استقبال نہیں کیا اس لیے انھوں نے اپنی کسر شان سمجھ کر

ملازمت قبول نہ کی۔ ۱۲۶۶ء (مطابق ۱۸۴۹ء) میں خطاب نجم الدولہ دیراللمک نظام جنگ بادشاہ نے دربار میں عطا کیا۔ اور ایک تاریخ خاندان تیموریہ لکھنے کا حکم دیا اور پچاس روپیہ مہینہ اس کے صلہ میں مقرر کیا۔ ۱۲۷۱ء میں ذوق کی وفات کے بعد مرزا استادشہ مقرر ہوئے اور اصلاح کلام ان کے سپرد ہوا۔ غدر کے ایام میں بوجہ سلسلہ ملازمت اور تقرب شاہی کے مرزا بھی مصائب میں مبتلا ہو گئے تھے۔ پیش بند ہو گئی اور ان کے چال چلن کے متعلق تحقیقات کی جانے لگی آخر میں جب پوری صفائی ہو گئی اور یہ بے گناہ ثابت ہوئے تو انکی پینشن بحال ہوئی اور عزت سابقہ واپس دی گئی۔ غالب نواب یوسف علی خاں والی رام پور کے استاد بھی تھے جو ان کو سوردیہ ماہوار بطور پینشن کے عمر بھر دیتے رہے غالب کا انتقال ۱۲۸۵ء مطابق ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء عہد عمر ۷۳ سال چار ماہ بمقام دہلی ہوا اور وہیں دفن ہوئے۔

عام حالات اور غالب نہایت خلیق اور منہار واقع ہوئے تھے اور ایک بڑی جماعت طبعی عادات احباب اور قدر دانوں کی رکھتے تھے۔ دوستوں کے ساتھ خط و کتابت کا سلسلہ جاری تھا جس کو وہ نہایت باقاعدہ طرز پر وقت کی پابندی کے ساتھ انجام دیتے تھے اور دور دراز شاگردوں کے کلام کی اصلاح بھی مرسلت ہی کے ذریعہ سے ہوتی تھی اور وہ جواب دینے میں بہت متعذر تھے۔ ان کی یہ عادت مرنے دم تک جاری رہی۔ محبت ہمدردی ان کے خمیر میں پڑی تھی جیسا کہ ان کے خطوط اور اشعار سے مترشح ہوتا ہے مذہبی تعصب اور غلو سے کوسوں دور تھے۔ پچ پوچھ تو ان کا مذہب ہی نوع انسان کے ساتھ ہمدردی اور محبت تھی جس میں کسی فرقہ اور جماعت کا مطلق خیال نہیں کرتے تھے۔ انکی مذہبی آزادی اور غیر متعصبی کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے کہ ان کے دوستوں اور شاگردوں میں متعدد ہندو تھے جن میں سب سے زیادہ نامی و گرامی منشی ہوگوالا تھے جو فارسی شعر کہنے میں بڑا ملکہ رکھتے تھے۔ گوکہ مرزا کبھی آسودہ حلال اور دنیاوی بجاہ و ثروت کے اعتبار

سے فارغ البال نہیں ہوئے مگر پھر بھی جس قدر اُن کی آمدنی تھی۔ وہ اپنی ضروریات کے ساتھ اپنے اجاب اور ارباب احتیاج کے واسطے بلا تکلف وقف تھی۔ سخاوت کے ساتھ وہ صاف گزنی اور صاف باطنی کے لیے بھی مشہور تھے۔ چنانچہ خود اپنے عیوب اور میوں کو بھی کبھی نہیں چھپاتے بلکہ علی الاعلان اُن کو ظاہر کر دیتے تھے۔ مثلاً یہ سب جانتے ہیں کہ وہ شراب پیتے تھے مگر اس واقعہ کو اُنھوں نے کبھی نہیں چھپایا بلکہ اپنے اشعار میں اور نیز اجاب کے خطوط میں کسی معقول توجیہ کے ساتھ لکھتے تھے اور اس طرح گویا کہ وہ اپنی ہندامت کا اظہار کر رہے ہیں۔ خلق و تواضع کے ساتھ ان کو اپنی خوردادی اور عزت اور اپنے مرتبہ کا بھی بہت بڑا خیال رہتا تھا۔ بڑے بڑے امراء سے وہ برابری سے ملتے اور اپنی علو شان کا ہر وقت خیال رکھتے تھے جیسا کہ اس واقعہ سے پایا جاتا ہے جب اُنھوں نے دلی کالج کی پروفیسری کو نامنظور کیا۔ کبھی کبھی اُن کا یہ خیال حد اعتدال سے متجاوز بھی ہو جاتا تھا۔ مگر اپنے وسیع حلقہ اجاب کے ساتھ وہ ہمیشہ رفیق مدار اور انکسار و تواضع ہی سے پیش آتے تھے۔ اُن کے خانگی تعلقات خاص کر اپنی بیوی کے ساتھ شگفتہ نہ تھے مرزا کی شادی تیرہ برس کی عمر میں ہوئی تھی۔ اگرچہ وہ اپنی بیوی سے زیادہ محبت نہیں رکھتے تھے مگر پھر بھی کوئی ظاہری رنجش نہ تھی اور نہ میل ملاپ میں کوئی فرق تھا۔ مرزا کی کئی اولادیں ہوئی تھیں مگر وہ سب بچپن میں مرگیں۔ مرزا کے چھوٹے بھائی جو فائر العقل تھے اور انھیں کے ساتھ رہتے تھے غدر کے زمانے میں مرے۔ مرزا اپنی بیوی کے بھانجے زین العابدین خاں عارف سے بہت محبت کرتے تھے یہ بہت ہونہار شاعر تھے اور مرزا کے سامنے ان کا انتقال ہو گیا تھا ان کے دو بچوں سے مرزا صاحب کو کمال محبت تھی۔ آخر عمر میں مختلف امراض و آلام نے مرزا صاحب کو بہت پریشان کر دیا تھا پھر اس زمانہ میں ان کی مالی حالت بھی درست نہ تھی۔ ایسی صورت میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ وہ اپنے افکار و مضامین کو شراب نوشی سے ہلکا کر دیتے تھے۔

مے سے غرض نشاط ہے کس ردیہ کو | اک گونہ بے خودی بٹھے دن رات چاہیے

میر کی طرح غالب بھی مصائب و آلام کا فرد چکھے ہوئے تھے اسی وجہ سے ان کے کلام میں بھی مثل میر کے ایک خاص درد و اثر ہے۔ مرزا صاحب کے کلام میں تنازعہ بے جا نہیں ہے بلکہ اُس سے حسن شعریں اضافہ ہوتا ہے اور کلام کی قیمت بڑھ جاتی ہے اس لئے کہ وہ نہایت مدلل اور لطیف پیرایہ میں ادا کیا جاتا ہے جیسے فرماتے ہیں ۷

ہوں ظور سی کے مقابل میں خفائی غالب | میرے دعوے پر یہ محبت ہے کہ مشہور نہیں

سب سے زیادہ قیمتی اور نمایاں جوہر مرزا صاحب کے کلام میں اُن کی نہایت لطیف ظرافت اور شگفتہ مزاجی ہے جس کی بدولت بڑی سے بڑی تکلیفوں کو بھی ہنس بھیل کر کاٹ دیتے تھے اسی خیال کو نہایت فلسفیانہ طریقہ پر ظاہر کرتے ہیں ۷

سرخ سے خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

تاریک سے تاریک موقعوں پر بھی ان کی ظرافت اور لطافت کی بجلی چمک جاتی ہے جس سے مصائب کی تیرگی کا فورہ میر جاتی ہے۔ اُن کی ظرافت میں کسی قسم کی تیزی اور بد مزگی نہیں ہوتی بلکہ اُس میں مناسبت اور جدت اسلوب کے ساتھ ہمدردی کی جھلک نظر آتی ہے۔ کہیں کہیں اُن کے کلام میں بنیادی کا پر تو ہے مگر یہ کیفیت تنقیر سے پیدا نہیں ہوتی اُن کی ظرافت و مذاق سے کوئی نہیں چھوڑتا حتیٰ اگر اپنی بوی کی نسبت بھی ایک خط میں لکھتے ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے۔ تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے۔ اگر مرزا صاحب کے اس قسم کے لطائف و ظرائف بالاستیعاب دیکھنا ہوں تو مولانا حالی کی یادگار غالب دیکھنا چاہیے جس میں ایسی باتیں کثرت مذکور ہیں

غالب کیفیت شاعر کے | مرزا کا پایہ شاعری میں بہت بلند ہے اور اُس کو سب نے تسلیم کیا ہے

وہ نہایت وسیع النظر اور کثیر المعلومات تھے اور اُن کے معاصرین بھی اس بارے میں اُن کی بڑی قدر کرتے تھے۔ اُن کو فارسی سے اس قدر شغف تھا کہ وہ ہمیشہ یہ خواہش ظاہر کرتے کہ میری قابلیت کا اندازہ میرے فارسی کلام سے کیا جائے اور اس بات پر نہایت افسوس کرتے کہ لوگ اس قدر فارسی سے بیگانہ ہوتے جاتے ہیں کہ اُن کے کلام کا قدرداں اور سمجھنے والا کوئی نہیں ہے۔

بیادید اگر ایسا بود ز بال دانے | غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد

یہ عجیب بات اور نیرنگی قسمت ہے کہ اُن کی شہرت کا باعث اُن کی فارسی شاعری نہیں بلکہ اُردو شاعری ہوئی جس کی خود وہ کوئی قدر نہیں کرتے تھے۔

فارسی میں تابدانی کا اندر تسلیم خیال | مانی دار ز نگم داکں سنو از رنگ من است

اُردو وہ کبھی کبھی تبدیل ذائقہ کے لیے اور اپنے احباب کے اصرار سے کہ لیا کرتے تھے مختلف کتابیں اُن کی نظر سے گزری تھیں اور نہایت تہمت کی نظر سے اُن کو پڑھا تھا قوت حافظہ کا یہ حال تھا اور اُس پر اتنا اعتبار تھا کہ کتابیں عاریت لے کر پڑھتے اور خود کبھی نہ مول لیتے تھے۔ فی البدیہہ اشعار کہنے کی بھی عادت تھی جیسا کہ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے جبکہ کلکتہ میں ایک دوست مولوی کریم حسین کی فرمائش سے چکنی ڈلی کی تعریف میں فوراً چند اشعار کہہ دیے تھے۔ عربی میں گو انھوں نے درس نظامیہ کی تکمیل نہیں کی تھیں مگر مہارت کافی حاصل تھی۔ فن عروض کے استاد کامل تھے اور اس کے علاوہ نجوم میں بھی کچھ دخل تھا۔ تصوف سے کما حقہ واقف تھے اور اُس کے مسائل اپنے اشعار میں نہایت خوبی کے ساتھ نظم کئے ہیں تاریخ، ریاضی اور ہندسہ سے اُن کو مطلق دلچسپی نہ تھی گو کہ تعجب یہ ہے کہ دو تین کتابیں تاریخ کی خود تصنیف کر گئے ہیں اسی طرح مرثیہ اور تاریخ گوئی سے بھی اُن کو کوئی لگاؤ نہ تھا لہٰذا یہ کتنا عجیب نہیں معلوم ہوتا کہ مرزا کو تاریخ گوئی سے کوئی لگاؤ نہ تھا یوں تو اُن کے اُردو دیوان میں بھی

البتہ فارسی میں بہت سے نوحے موجود ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک بہت بڑے فلسفی شاعر تھے اور اُن کی ذہانت کے مختلف پہلو تھے۔ جس کی وجہ سے ایک شاعر کا تجربہ ایک مصور کی چابکدستی کے ساتھ مل گیا تھا۔

تصانیف | حسب ذیل تصانیف اُن کی یادگار ہیں:-

- | | | |
|---------------------|-------------------|---------------------|
| (۱) عود ہندی | (۲) اُردو کے معنی | (۳) کلیات نظم فارسی |
| (۴) کلیات تشر فارسی | (۵) دیوان اُردو | (۶) لطائف غیبی |
| (۷) تیغ تیز | (۸) قاطع برہان | (۹) تیغ آہنگ |
| (۱۰) نامہ غالب | (۱۱) مہر نیروز | (۱۲) دستنبو |

(۱۳) سبب چین۔ "عود ہندی" اور "اُردو کے معنی" اُردو خطوط کا مجموعہ ہیں جو انھوں نے اپنے احباب کو لکھے تھے اور اول مرتبہ بصورت کتاب ۱۸۶۹ء میں شائع ہوئے تھے۔ عود ہندی میں علاوہ خطوط کے چند دیباچے اور تقریریں بھی شامل ہیں "لطائف غیبی" مباحثے میں ہے اور سیف الحق کے فرضی نام سے لکھی ہے "تیغ تیز" اور "نامہ غالب" بھی اُسی مناظرے سے تعلق رکھتی ہیں جو قاطع برہان کی وجہ سے ہوا تھا۔

(بقیہ صفحہ ۳۲۹)

درین تاخیریں موجود ہیں مگر ظاہر ہے کہ متعدد عہدہ تاریخیں اُن کے قطعات میں شامل ہیں۔ مثال کے طور پر ہم دو فارسی مادے دیکھتے ہیں جو بالکل ایک نئے ڈھنگ سے نکالے گئے ہیں۔ تاریخ وفات رزامیدانیگ

زوال واقف میرزا میدانیگ

میرزا کے سہادی میں از عزرات

بحریت وہ در وہادی چہا کتاب

کدر نشیمن از بہشت خلد جایش باد

اس سے بارہ سیکڑے چار دہائیاں اور آٹھ اکائیاں یعنی ۱۸۳۸ء تک تھیں۔ اسی طرح ایک دوسری تاریخ میں فرماتے ہیں

جسم از سال رحلتش از مرے

از بروج سپہر جوے مات

عشرت از کو اکب سیار

گفتم آجا اد گفتم شرمست باد

از خداوند احد العہد

اس میں بارہ سیکڑے سات دہائیاں اور ایک اکائی یعنی ۱۸۳۸ء تک تھیں۔ ۱۲ - ۱۲

”پنج آہنگ“ میں فارسی انشا پردازی کے نمونے نمونے ہیں ”کلیات نظم غالب ان کے فارسی قصائد اور غزلیات، قطعات، شہادت، رباعیات، وغیرہ کا بیش بہا مجموعہ ہے ”مہر نیروز“ تاریخ ہے۔ مرزا نے اس کو حکیم حسن اللہ خاں طیب خاص بادشاہ کے ایام سے لکھا تھا۔ اس کی پہلی جلد میں امیر تیمور سے ہمایوں تک کا حال قلمبند کیا اور مہر نیروز نام رکھا ارادہ تھا کہ اگر سے لے کر بہادر شاہ تک کا بھی حال دوسری جلد میں لکھیں اور ۱۲ ماہ نیم ماہ نام رکھیں کہ اس انشاء میں غدر ہو گیا اور وہ کتاب رہ گئی ”دستبنو“ میں گیا رہ مئی ۱۸۵۷ء یکم جولائی ۱۸۵۷ء تک حال بغاوت تباہی شہر اور اس کے ساتھ اپنے حالات بھی بیان کیے ہیں ”چند چین“ میں چند قصائد اور قطعات فارسی ہیں اور کچھ خطوط ہیں

مرزا صاحب سے ملائے ہوا مباحثہ اس طرح ہوا کہ جب مرزا اکلنتہ میں تھے تو بعض لوگوں نے ان کے کلام پر کچھ اعتراض کیے اور سند میں قیقل کے اقوال پیش کیے۔ مرزا صاحب جن کا قول تھا۔

نام مجموعہ	تعداد قصائد	نام موضوع	تعداد اقوال
کورن و کتوریہ	۳	مشر اسٹریٹنگ	۱
لارڈ اکلینڈ گورنر جنرل	۱	دیم فریور	۱
ورڈ الٹن برا ایضاً	۲	مشر کالون	۱
سرجائس مشکاف ایضاً	۱	لارڈ پارڈنگ گورنر جنرل	۱
جیمس ٹامسن	۱	مشر ایڈمنٹن	۱
مشر برنسٹن	۱	لارڈ کیننگ گورنر جنرل	۱
ٹامس میڈلر	۱	مشر فنگری ٹھیکٹ گورنر	۱

ان کے علاوہ تین چار قطعات بھی انگریزوں کی شان میں ہیں

وہ بھلا قبیل کو لب ماننے والے تھے۔ انھوں نے اپنے کلام کی تائید میں اساتذہ اہل زبان پیش کئے اور کہا۔

دامن از کف کم چگونہ رہا	طالب و غنی، نظیر سی را
خاصہ روح و روان معنی را	آن ظہوری جہان حسنی را

مخامین جو قبیل کے شاگرد تھے اس پر اور برا فروختہ ہو گئے اور مرزا صاحب کے کلام پر اور اعتراض وارد کئے۔ یہ سب واقعات ان کی مثنوی "باد مہالفت" میں مذکور ہیں۔ دوسرا مباحثہ اس وجہ سے ہوا کہ مرزا نے فارسی کی مشہور لغت "برہان قاطع" پر اعتراض کیے اور ان کو کتابی صورت میں شائع کیا اور "قلم برہان" نام رکھا اس کے ایک سال بعد اس کتاب کو ترمیم کر کے اس کا نام "درفش کاویانی" رکھا اس کتاب سے مرزا کی انتہائی قابلیت اور شجر کا پتہ چلتا ہے اس کے اکثر جواب لکھے گئے۔ کلکتہ سے ایک شخص مرزا احمد بیگ نے "مؤید البرہان" کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ غالب نے اس کا جواب "میں تیز" سے دیا اور ایک دوسری کتاب "ساطع برہان" کا جواب "نامہ غالب" سے دیا گیا۔

مرزا کے فارسی کلام پر اس کتاب میں کوئی رائے دینا بے موقع ہے مگر اتنا ہم ضرور کہیں گے کہ وہ نظم و نثر فارسی دونوں کے استاد کامل تھے اور ان کا مقابلہ ہندوستان اور ایران کے بڑے بڑے شعرا خسرو، نظیری، فیضی، بیدل و حزمی وغیرہ سے بے تکلف کیا جاسکتا ہے۔

غالب کی شاعری غالب کی شاعری تین مراتب یا ادوار پر تقسیم کی جاسکتی ہے جس سے ان کی شاعری کی ترقی اور تیز ہر دور کی خصوصیات کا پتہ بخوبی چل سکتا ہے یہ بات ضرور پیش نظر رکھنا چاہیے کہ غالب اپنی قابلیت اور کلام کو اپنے اردو دیوان کی معیار سے کبھی نہیں جانچنا چاہتے تھے۔ ان کا قول تھا۔

فارسی میں تابینہ نقشبانی رنگ رنگ
گلزار از مجموعہ اردو کہ بے رنگ من است

اور وہ ہمیشہ اپنے فارسی کلام ہی کو اپنا مایہ ناز سمجھتے تھے۔ انھوں نے اپنا مقابلہ کبھی کسی اردو شاعر سے نہیں کیا۔ البتہ اہل زبان کے کلام سے اپنے کلام کو تولنے پر ہمیشہ مستعد تھے مگر بالینہ ان کی ذہانت و طباعی اور ان کی فطری شاعری کا پورا اثر ان کے اردو کلام میں بھی اسی طرح جلوہ گر ہے جس طرح ان کے فارسی کلام میں ہے۔ مرزا کا اردو دیوان تقریباً اٹھارہ سو ابیات سے زیادہ نہ ہو گا مگر اس کو زبان اردو کا بہترین خزانہ اور اردو شاعری کا نہایت گراں قدر سرمایہ سمجھنا چاہیے مرزا کی شاعری کا پہلا دور اُس وقت سے شروع ہوتا ہے جب سے کہ انھوں نے شعر کہنا شروع کیا۔ تا عمر پچیس سال جبکہ انھوں نے اپنے اردو دیوان کو چھانٹا اور اس میں سے فارسی کی غیر مانوس ترکیبیں اور بندشیں نکال ڈالیں۔ اب وہ قدیم کلام جو مروجہ دیوان سے خارج کیا گیا تھا ایک عرصہ دراز کے بعد بڑی کوشش اور کاوش سے ہم پہنچا کر پھلایا گیا ہے۔ اور اس کے مطالعہ سے بہت سے فائدے حاصل ہوتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی افکار مرزا کی کس قسم کی ہوتی تھیں۔ نیز یہ کہ کن کن ترکیبوں اور بندشوں کو انھوں نے ترک کیا جو ابتدا میں ان کو پسند تھیں اس سے دریافت شدہ کلام کی نازک خیالیاں اور نئی نئی ترکیبیں قرون وسطیٰ کے ان یورپی شعرا سے ملتی جلتی ہیں جن کو انگریزی اصطلاح میں "اسکولن" کہتے ہیں۔ اس دور کی شاعری میں فارسی ترکیبوں اور نازک خیالیوں کی بہت کثرت ہے علی الخصوص مرزا عبدالقادر بیدل کا بہت قیمتی معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ خود کہتے ہیں کہ

مطرب دل نے مرے تار نفس سے غالب
بھجے راہ سخن میں خوف گمراہی نہیں غالب
ساز پر رشتہ پیئے نخسہ کہ بیدل بازدا
عصائے خضر صحرائے سخن ہے خامہ بیدل کا

”طرز نازک خیالی کے متبعین کی خصوصیت یہ معلوم ہوتی ہے کہ حقائق شعری کو بیدھے بیدھے الفاظ میں کہنے کے بجائے وہ مضمون کو تخیل کی سمیچیدہ گھاٹیوں سے گزارتے ہیں

اور اسی اشکال میں وہ اپنی خصوصیت اور ناموری سمجھتے ہیں۔ بعض اوقات ان کی یہ بلند پروازیاں اور نازک خیالیاں اس قدر بلند ہو جاتی ہیں کہ نظروں سے اوجھل ہو کر شعر کا مطلب اور اثر بالکل جاتا رہتا ہے۔ ایسے اشعار پر دو کوہ کنندہ کا ہر آوردن کی مثل پوری طرح صادق آتی ہے۔ یہ قدرتی بات تھی کہ مرزا کو یہ رنگ بہت پسند آیا اس وجہ سے کہ ان کے مزاج کی اقتاد یہ واقع ہوئی تھی کہ وہ ہر چیز میں اپنے آپ کو عام لوگوں سے علیحدہ رکھنا چاہتے تھے۔ اسی لیے شاعری میں بھی انھوں نے یہ رنگ اپنے واسطے منتخب کیا۔ اس وجہ سے کہ اس میں فارسیت کا غلبہ تھا اور فارسی کا ذوق ان کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بکھرا ہوا تھا۔ یہ طرز ان کے اعلیٰ خیالات کے اظہار کا ایک بڑا آلہ کار تھا۔ مرزا تبدیل کے وہ صرف متبع ہی نہیں بلکہ غلو ص کے ساتھ ان کے حرف بھی ہیں جیسا کہ مذکورہ بالا شعروں سے معلوم ہوا۔ یہ رنگ اگرچہ کچھ اچھا نہ تھا۔ مگر تھوڑی مدت تک مرزا کی طبیعت پر غالب رہا بعد کو وہ خود سنبھل گئے اور اپنے واسطے ایک نیا راستہ نکالا جس میں نہ صرف تبدیل کی پیروی ترک کی بلکہ اُس طرز کا کلام بھی اپنے دیوان سے خارج کر دیا۔ ان کے ابتدائی کلام کی خصوصیات حسب ذیل ہیں عجیب و غریب تشبیہیں۔ ایسی بلند پروازیاں جن سے شعر کے معنی مبہم ہو کر رہ جاتے ہیں۔ فارسی کی ایسی بنائیں اور ایسے غیر مانوس الفاظ جو شعر کی روانی اور فصاحت کلام کے منافی ہیں۔ ابتدائی کلام میں وہ پختہ کاری۔ وہ اثر اور وہ عمیق جذبات جو ان کے بعد کے کلام میں ہیں انہیں پا کے لے جاتے۔ ان کے ایسے اشعار بعض فارسی الفاظ کی لڑیاں ہوتے ہیں جن میں اردو کی آمیزش محض اس وجہ سے ہے کہ شعر اردو کہا جاسکے اور ادنیٰ تغیر سے وہ فارسی ہو جاتا ہے گو ان کے ابتدائی کلام کا مضامین بھی اڑایا جاتا تھا جیسے کہ حکیم آغا جان تمیش نے جل کر کہا کہ قطعہ

مزا کہنے کا جب ہے اک کے احوال سر سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھ تو کیا سمجھے
کلام میر سمجھے اور زبان میرزا سمجھے

مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ اس سے بھی ان کے اعلیٰ درجہ کی دماغی قوت اور آئندہ کے ارتقا کا پتہ چلتا ہے۔ ان کی اس دور کی شاعری بھی نہایت ممتاز اور مخصوص ہے اور ان کی اقتاد طبع سے معلوم ہو جاتا ہے کہ آئندہ وہ کتنی ترقی کرنے والے ہیں۔ ان کی ابتدائی فکر میں بھی ایسی ایسی نازک خیالیاں نئی نئی تخیلیں اور پُر لطف تشبیہیں ملتی ہیں کہ اردو شعرا میں اور کسی کے یہاں نظر نہیں آتیں اپنے مخالفین کے اعتراضات اور مضحکہ انگیز نقالی اور اپنے مخلص احباب مثلاً مولانا فضل حق خیر آبادی اور مفتی صدر الدین خاں آزادہ وغیرہ کی دوستانہ صلاح اور خود اپنی انصاف پسند طبیعت کے تقاضا سے مرزا نے آخر کار یہ رنگ ترک کر کے ایک دوسری روش اختیار کی۔

دوسرے دور میں فارسی کا وہ غلبہ اور نازک خیالیوں کا وہ انداز نہیں جو پہلے مرزا کو مرغوب تھا۔ اس میں زبان صاف ہو گئی ہے الفاظ پر پوری قدرت ہے اور فارسی بنیادوں اور محاورات میں ایک معتد بہ کمی ہے۔ مگر فارسی کے اعلیٰ خیالات ایسے ہی ہیں جن مطلقاً سلیم پروگرام نہیں گزرتے بلکہ سامع کے دل و دماغ میں ایک پُر لطف ہیجان پیدا کر دیتے ہیں اس قسم کے اشعار شہر طوسی سی کاوش کے بعد جب سمجھ میں آ جاتے ہیں تو مسرت کاوش غضب کی ہوتی ہے۔

مرزا کی شاعری کا تیسرا دور ان کے کمال فن کا لب لباب اور ارتقا کمال کی آخری منزل ہے اس دور کے بعض اشعار جامعیت اور اختصار میں فی الحقیقت اپنا جو اب نہیں رکھتے اس مہد کی غزلوں میں قدرت خیال کے ساتھ لطافت زبان اور شستگی کلام عجیب لطف دیتی ہے ان میں ایجاز کے ساتھ سادگی سلاست دردانی نازک خیالی اور جدت تخیل سب کچھ بدرجہ احسن موجود ہے۔ اور انھیں سے غالب کو شعرا کے اردو کی صف اول میں نہایت ممتاز جگہ ملی ہے۔

غالب کے خصوصیات ہماری رائے میں مرزا کے قصہ شاعری کی مستحکم بنیاد ان کی جدت طرازی پہلی خصوصیت جدت پسندی

پر قائم ہے جس میں جدت تخیل، جدت طراز اور جدت قیثہات، جدت استعارات، جدت محاکات، جدت الفاظ، غرض ہر قسم کی جدتیں شامل ہیں۔ پایا مال مضامین مرزا صاحب کی خاص طرز اور اسے بالکل نئے معلوم ہونے لگتے ہیں اور معمولی سے معمولی واقعات ایک ایسے اسلوب سے بیان کر جاتے ہیں کہ گویا اس سے پہلے کبھی نہیں سنے گئے تھے نئے خیالات کے ادا کرنے کا طریقہ بھی نیا ہوتا ہے۔ اس جدت اسلوب سے معمولی سے معمولی خیال اور پایا مال سے پایا مال مضمون بہت مرتفع ہو جاتا ہے۔ اس جدت طرازی اور ادب و سخن کی وجہ سے شعر میں کبھی کبھی معام کی سی صورت پیدا ہو جاتی ہے جس کا حل ایک خاص لطف پیدا کرتا ہے غالب اور اکثر شعرا کے اردو اور نیز بعض شعرا کے فارسی میں بڑا فرق یہ ہے کہ غالب کے یہاں الفاظ خیالات کے تابع ہوتے ہیں اور اور لوگوں کے یہاں معاملہ برعکس ہے جس سے ان کے اشعار میں فصیح اور بد مزگی پیدا ہو جاتی ہے اور اسی قسم کے کلام سے ان کے دیوان بھرے پڑے ہیں۔ مرزا صاحب کے یہاں بخلاف ان کے تک بندی اور قافیہ پیمائی نہیں بلکہ خیال آفرینی ہے۔

غالب نبود شیوہ من قافیہ بندی	ظلمے ست کہ بر کلک و ورق میکم امشب
دوسری خصوصیت	اسی سے متعلق اور ملتی جلتی ان کے کلام میں نظر فرمائی اور بات سے
نظر زیب طرز تحریر	بات پیدا ہوتا ہے۔ وہ ایک مٹر چھڑتے ہیں اور سامع کا ذہن پورا
راگ منضبط کرتا ہے۔ اسی وجہ سے مہول الکلیف سامع مرزا غالب کے شاعرانہ ترانوں سے	
لطف اندوز نہیں ہو سکتے مرزا کسی چیز کا تفصیلی ذکر نہیں کرتے بلکہ ٹپہ ہننے والے کا خیال	
خود اس کے لوازم جمع کر لیتا ہے جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے۔ مرزا صاحب کی شاعری کا	
خاص طغرائے امتیاز جادہ عام سے علیحدگی ہے جس کا شوق بلکہ عشق ان کے رگ و پے	
میں سراپت کے ہوئے تھا وہ کسی چیز میں اپنی شرکت عام لوگوں کے ساتھ پسند نہیں	
کرتے تھے۔ تخلص بدلنے کا دامن جس کا ذکر اوپر ہوا اس کا بین ثبوت ہے۔ اسی طرح	

وہ اپنے لباس، وضع قطع بات چیت، طرز تحریر غرض کہ ہر چیز میں اسی علیحدگی کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے، اُن کے خطوط اُن کے اشعار ہر چیز سے مترشح ہے کہ وہ عام باتوں سے سخت متنفر تھے۔

کیا ابروئے عشق جہاں عام ہو جھٹا | ڈرتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر

ان کی ابتدائی مشکل پسندی اسی علیحدگی پسندی پر مبنی معلوم ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے اُن کی شاعری سے عام دماغ لطف نہیں اٹھا سکتے ان کے الفاظ میں خیالات کا اس قدر زور ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ خیالات قید الفاظ کو توڑ ڈالیں گے۔ ع آگینہ تندی صبا سے کھل جائے ہے۔

غیر خصوصی | مرزا میں بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے اشعار ان کے خیالات کا ذاتی جذبات کا ادا کرنا صحیح فوٹو ہوتے ہیں۔ وہ زندگی اور مختلف کیفیات زندگی کے ترانے گاتے ہیں وہ اپنے اشعار کے ذریعہ سے اپنے دلی کیفیات اپنے کلام کے پرھنے والے کے سامنے پیش کرتے ہیں جن میں کہیں غم و الم کے نالے کہیں ان کی ماند عظمت کا مرقع، کہیں اُن کی حرام نصیبی، کہیں ہیمنہ نا اُمیدی کہیں جانکاہ مصائب، کہیں سہمی بے حاصل کہیں دنیا سے مفار و بیزاری، کہیں رحم خداوندی پر پورا پورا اعتماد، کہیں تعلقات و بنیادی سدا بستی اور اُس کی خوشی اور اُس کے آلام کا بیان ہوتا ہے۔ غرض کہ اُن کے لطیف اشعار اُن کی کیفیات قلبیہ کا جو وقتاً فوقتاً اور آناً فاناً وارد ہوتی رہتی ہیں۔

بیرام طرب ہیں۔

چو تکی خصوصیت | مرزا ایک بہت بڑے فلسفی ہیں اور اُن کے اکثر اشعار حقائق فلسفہ کو نہایت آسانی اور سادگی سے ظاہر کرتے ہیں وہ روز و حقائق تصوف سے پوری طرح واقف اور فرقہ بندی اور مذہبی تعصبات سے بالکل بیزار تھے فرماتے ہیں کہ

ہم موحّد میں ہمارا کیش ہے ترک رسوم ملتیں جب مدت گئیں اجڑائے ایمان لگئیں

اور اُن کے یہ خیال زبانی نہ تھے بلکہ وہ ان پر پوری طرح عامل تھے۔ اُن کی زندگی زندگیِ زندہ بھی رواداری، آزادہ روی کی ایک درخشاں مثال تھی اسی طرح ان کا تخیل عبادت بھی بہت بلند ہے۔ کہتے ہیں ۵

پہرے سرحد اور اک سے اپنا مسجود قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

جنت کے اس خیال سے کہ اس میں نہریں جاری ہوں گی اور وہی سب لطف حاصل ہوں گے جو دنیا میں ہوتے ہیں وہ متفق نہیں بلکہ اس کو اخلاقِ اعلیٰ سے کراہوا سمجھتے ہیں کہتے ہیں ۵

ہم کہ معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

طاعت میں تار پھٹنے سے دنیا میں کی لاگ دونوں میں ڈال دے کوئی لے کر بہشت کو

اُن کے نزدیک مصیبت عظمیٰ خود زندگی ہے جس سے احساس وجود پیدا ہوتا ہے اس وجہ سے کہ وہ اپنے مبداء سے جدا ہو جاتی ہے۔ نعمتِ زندگی کو ایک نالہ لے سمجھنا چاہیے جو نینسان سے جدا ہونے پر ٹہنے اختیار نہ کرتی رہتی ہے۔ اسی مضمون کو مرزا صاحب اس طرح ادا کرتے ہیں ۵

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ڈبویا کچھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

بہشت ایک صوفی صافی کے وہ دنیا کے شادی و غم سے بالکل متاثر نہیں ہوتے بلکہ ایک مرتفع مقام سے ترانہ سنجی کرتے ہیں ۵

تھا خواب میں خیال کو کچھ سے معاملہ جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سودھا

کس قدر خوبصورتی سے وہ اس حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں کہ عالمِ ظاہر ظہرِ روحِ حیات ہے مگر خود روحِ حیات نہیں ہے۔ بقول برگن کے یہی روحِ حیات اجسام میں جلد گر ہے مگر وہ خود اس عالم سے منزہ ہے غالب کہتے ہیں ۵

بے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

یا پنجویں خصوصیت
جذبات نگاری
حقائق فلسفہ کے علاوہ مرزا صاحب کی شاعری جذبات سے بھی مملو ہے
ان کے یہاں جاکھ مصلاب، دنگداز تکلیفیں، ناقابل برداشت مصیبتیں
جو لازمہ زندگی ہیں نہایت مؤثر الفاظ میں بیان کی گئی ہیں، گویا زندگی ایک ایسا جہان ہے
جس کے ساتھ درد سے قضا کے فتنوں کی آوازیں آرہی ہیں چنانچہ اسی زندگی اور غم کے
لازم و ملزوم ہونے کے متعلق مرزا کہتے ہیں۔

تبدیلیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں غم گرچہ جاں گل ہے یہ بچیں کہاں کہ دل ہے غم ہستی کا آئند کس سے ہو مجز مرگ علاوہ	سوت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں غم عشق اگر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک
------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------	------------------------------------------------------------------------------------------------------------------

مرزا کے کلام میں بچوں کی سی حسد اور اپنے معاصرانگریزی شاعر نیلی کی طرح تنک مزاجی
پائی جاتی ہے۔ وہ نہیں سمجھ سکتے کہ ان کو ان کے حال پر کیوں نہ چھوڑا جائے اور ان کے
معاملات میں کیوں دست اندازی اور مزاحمت کی جائے۔ چنانچہ کہتے ہیں ۵

دل ہی تو ہے نہ سنگ و دشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں
بچہ کی بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کو تکلیف کیوں ہو۔ اسی طرح اس شعر میں ۵

نقش میں مجھ سے درد و ادھم کہتے نہ درد ہمدم گری ہے جس پہ گل بجلی وہ میرا آشیانہ کیوں ہو

مرزا کے اشعار میں خود انھیں کے کلام و مصائب کے نقشے نظر آتے ہیں۔ ان کے اشعار کو پڑھ کر رنج
غم کی رفعت اور مصیبت کی عظمت معلوم ہوتی ہے اور گناہ کی ظلمت دور ہو کر اس میں ایک
نورانیت معلوم ہونے لگتی ہے مندرجہ ذیل شعر میں انتہا درجہ کا انگ وادار عاجزی اور
دل پشیمانی نہی و بے حقیقتی کا اظہار کس پر اثر اور درد انگیزہ طریقے سے کیا ہے۔

قدر سنگ سر رہ دکھتا ہوں	سخت انداز ہے گرانی میری
-------------------------	-------------------------

کلام میں ظرافت و شوخی مرزا کی شاعری میں جو مایوسی اور درد کی تاریکی ہے اُس کو اُن کی طبعی ظرافت اور شوخی کثر دُر کر دیتی ہے۔ اکثر اشعار میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ حزن و دیاس کے ابر میں ظرافت کی دھوپ نکلی ہوئی ہے۔ اُنکی ظرافت کی لطافت اور شوخی کلام کی نزاکت کو ہم بے شکلف ایک نازک پھول کے ساتھ تشبیہ دے سکتے ہیں۔ مگر ان کی ظرافت کبھی حد اعتدال سے بڑھ کر پھلڑ نہیں بھجاتی اور متین سے متین آدمی اُس سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ اُن کے اکثر اشعار نفس شاعری کی جان اور فصاحت و بلاغت کے روح رواں ہیں۔ سادہ الفاظ کی سطح کے نیچے عمیق معنی اس طرح پنہاں ہیں جیسے دریا کے شفاف پانی کے نیچے دریا کی تہ اُن کی ہر تصویر الفاظ کے پیچھے اُن کے ہر نقش خیال کی پشت پر ایسے ایسے تخیل کے وسیع مناظر نظر آتے ہیں جن کی مجید فصاحیات و سمات کے سرسبز رازوں سے معمور ہے۔

غالب ایک کامل مصوٰفہ ہیں اور انکو خیالی تصویروں کے کیسینے کا عجیب و غریب بلکہ جمل ہے۔

نیمند اُس کی ہے داغ اس کا ہے راتیں سکی ہیں	بیری نہیں جس کے بازو پر ریشاں ہو گئیں
منہ گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب	یار لائے مرے بالیں پہ اسے پر کس وقت
منہ گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے	خوب وقت آئے تم اس عاشق بیمار کے پاس

مرزا کو عجب قوت ایجاز حاصل تھی۔ اُن کے بعض اشعار ایجاز و اختصار اور بات سے بات پیدا کرنے کے بے مثل نمونے ہیں۔ مثلاً

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد	مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ
--------------------------------	---------------------------------------

شعر نہایت پُر تاثر ہے۔ ظاہر میں تو اور تکاب شدہ گناہوں کے حساب سے بچنا چاہتا ہے مگر درپردہ کہتا ہے کہ بہت سے گناہ ایسے بھی ہیں جن کے نہ کرنے سے دل میں حسرتوں کے داغ پڑ گئے۔ یہ ایک نادر اور صاف گو گنہگار کی تصویر ہے جو خدا سے بے دھڑک کہتا ہے کہ کردہ گناہ میرے کم ہیں مگر ناکر وہ گناہوں کی حسرت زیادہ ہے

اور اسی کی میں تجھ سے داد چاہتا ہوں۔

نا کردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد | یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ملے

غالب کا مقابلہ اپنے | علو خیال، فلسفہ حیات، اور ذہانت و طباعی میں غالب اپنے معاصرین
معاصرین شعرا سے | ذوق و مومن سے بڑھ کر ہیں۔ مگر روزمرہ اور سادگی بیان اور

محاورہ بندی کے اعتبار سے ذوق ان سے بڑھے ہوئے ہیں، گو کہ مومن اس میں بھی
اُن سے کم ہیں۔ یورپ کے شاعروں میں جو اُن کے ہم عصر یا قریب العہد تھے اُن کے کلام
کا توازن شعرائے ذیل کے کلام سے کیا جاسکتا ہے۔

(۱) رابرٹ براؤننگ سے جو انگلستان کا اسی عہد کا ایک فلسفی شاعر تھا۔ پروفیسر
سینٹبری براؤننگ کی نسبت لکھتے ہیں کہ اُس کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ لوح
کا تجزیہ کرتا ہے۔ مرزا غالب تجزیہ اس قدر نہیں کرتے جتنا کہ رموز روحانی کے معنی کو
دریافت کرتے ہیں۔ یقیناً ان کی جھلکیاں وہ دیکھتے ہیں اُن کا کلام مثل مولانا رام وغیرہ کے
سراپا اسرار تصوف نہیں ہے اور نہ من اولہ الی آخرہ کوئی فلسفہ ہے۔ مگر حقائق و
رموز کا ان کے کلام میں جا بجا پرتو موجد ہے۔ ان کو عصری براؤننگ کہنا بجا ہے
ہر چند کہ براؤننگ کے کھرے پن اور اکھر پن سے ان کا کلام پاک ہے۔

(۲) مضامین حزن و یاس میں اُن کا مقابلہ جرمنی کے شاعر "ہین" سے خوب
ہو سکتا ہے۔

(۳) مگر فی الحقیقت اگر کوئی فلسفی شاعر ان کا مقابلہ یورپ میں گزرا ہے تو

لے رزاکے اس خیال کی تائید کہ اکثر گناہ ایسے تھے جن سے میں بچا لہذا اُن کی حسرت کی بھی داد
دی جائے یعنی اُس کا ٹرو نیک ملے۔ اس آیت دافی الہدایت سے ہوتی ہے۔ وَأَنَا نُنْخَافُ
مَقَامَ رَبِّهِ وَنُحْيِي النَّفْسَ مِنَ الْمَوْتِ۔ فَإِنْ أُنْجِئْنَا مِنَ الْمَوْتِ لَمْ

سورة النازہت مید پارہ ۲۰

وہ ہر مہنی کا مشہور و معروف " گیتے " ہے غالب میں ان تین چیزوں کا اجتماع ہو گیا۔
 ہے یعنی فلسفی کی عقل اور اک صوفی کی نگاہ۔ دور ہیں۔ چاہک دست و صورت کا نازک
 ہاتھ ان کی صنعت پُر کاری اور پُر کاری صنعت ہے۔ اور حسن حق ہے اور حق حسن ہے
 وہ ایک صوفی صاف دل تھے اور ان کا یہ نزل بالکل صحیح ہے۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں | غالب ہر پر خامہ نول کے سر دوش ہے

ان کا تصوف کوئی مشغلہ دھسپی نہیں اور نہ ان کی شاعری محض خیالی شاعری ہے
 بلکہ وہ واقعات اور واردات سے لبریز ہے اور اسی وجہ سے اس کا شمار دنیا کی بہترین
 شاعری میں کیا جا سکتا ہے۔

غالب کے شاگرد | غالب کے بکثرت شاگرد تھے جن میں اصحاب ذیل کے نام خاص طور
 پر قابل ذکر ہیں۔

نواب ضیاء الدین خاں بیکر و خشاں تخلص کہ ان کے عزیز بھی تھے میر ہمدی مجروح
 مرزا قربان علی بیگ سالک، خواجہ الطان حسین حالی۔ مصنف یا دیگر غالب،
 منشی ہر گوبال تفتہ۔ نواب علاء الدین خاں علوی۔ ذکی۔ عزیز۔ مشتاق و جہت
 وغیرہ۔ ان میں سے بعض کے مختصر حالات آگے درج ہیں۔

میر ہمدی مجروح | میر ہمدی مجروح خلیفہ میر حسین فگار مرزا غالب کے محبوب اور
 متوفی ۱۹۰۶ء سب سے عزیز شاگرد دلی کے رہنے والے تھے غدر کے ہنگامہ میں

دکن چھوڑ کر پانی پت چلے گئے اور وہیں سکونت اختیار کی کچھ عرصہ بعد جب کہ غدر کا
 طوفان فوجوں اور دلی میں گزرا امن و امان کی صورت پیدا ہوئی تو یہ پھر دلی آ گئے

مصنف کتاب یاد رکھوتی سہا سہ صاحب اہل شہر طراح الدین خدا بخش اور آرمیل شیخ عبد القادر
 صاحب کا دلی شکر یہ یاد کرتے ہیں کہ ان حضرات کے بیش بہا مضامین سے جو غالب کی شاعری پر مکمل
 انھوں نے بہت فائدہ اٹھایا۔

اور اپنے قدیم مشغلہ شعر و سخن سے دلچسپی لینے اور مشاعروں میں شریک ہونے لگے بعد
چند روز کے بہ تلاش معاش آکر گئے جہاں ہمارا چہ شیو دھان سنگھ دانی ریاست نے
ان کی قدر دانی کی۔ آخر عمر میں نواب صاحب رام پور کی قدر دانی اور عنایت دہربانی
سے اسی ریاست میں چلے آئے اور بغاغت زندگی بسر کی۔ ۱۶۳۷ء میں اپنا ایک
دیوان ”منظر معانی“ کے نام سے چھپوایا۔ میر مجروح کی زبان نہایت صاف و سادہ
اور شیریں ہے، چھوٹی بھردوں میں اُن کا کمال بوجہ احسن معلوم ہوتا ہے خیالات میں
ندرت اور مضامین میں جدت اُن کے کلام میں نہیں ہے مگر طرز ادا اُستادانہ ہے اور
اشعار عیوب شاعری سے پاک ہیں۔ مولانا حالی ان کے بڑے معترف تھے۔ میر مجروح
اُن لکڑوں میں ہیں جن کو اردو شاعری کی آخری یادگار سمجھنا چاہیے۔ اُنھوں نے اردو
شاعری کی روایات قدیمہ کو حتی الامکان خوب نباہا۔ مرزا غالب کے اکثر دلچسپ خط
عود ہندی اور اردو کے معنی میں اُن کے نام موجود ہیں۔

سالک متوفی ۱۹۳۷ء | مرزا قربان علی بیگ سالک نواب مرزا عالم بیگ کے بیٹے
تھے حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ مگر بعض کے نزدیک مسقط الراس دلی ہے۔ غرض کہ
دلی میں نشوونما پائی پہلے قربان تخلص کرتے اور مومن خاں سے اصلاح لیتے تھے مگر
جب اُن کا انتقال ہو گیا تو یہ غالب کے شاگرد ہوئے اور سالک تخلص اختیار کیا بعد
کے زمانہ میں یہ دلی چھوڑ کر آکر چلے گئے۔ جہاں کچھ عرصے تک وکالت کرتے رہے۔ اس
کے بعد حیدر آباد گئے اور وہاں محکمہ تعلیمات میں سررشتہ دار ہوئے حیدر آباد
میں مخزن الفوائد کے نام سے ایک اردو رسالہ زیر سرپرستی نواب عماد الملک بہادر
نکلتا تھا سالک کچھ عرصے تک اُس کے مدیر رہے۔ ۱۹۱۷ء میں حیدر آباد ہی میں
انتقال کیا۔ ”ہنجار سالک“ دیوان کا نام ہے۔ یہ بھی غالب کے مشہور شاگردوں میں سے
تھے کلام خیال اور زبان دروں کے اعتبار سے اچھے۔ مگر جدت سے خالی ہے

اُن کا شہر آشوب دہلی کی تباہی پر اور اپنے استاد غالب کا مرثیہ بہت پُر زور اور درد انگیز ہے۔

ذکی متوفی ۱۹۰۳ء | نواب سید محمد کریا خاں رضوی متخلص بسفلی ایک عالی خاندان شخص تھے دلی میں ۱۲۸۹ھ میں پیدا ہوئے ان کے والد نواب سید محمد خاں اور نانا نواب اعظم الدولہ میر محمد خاں معظم جنگ متخلص بہ سہرورد میں یہ دونوں بھی مشہور شاعر اور صاحب دیوان ہیں اور سہرورد کا ایک تذکرہ بھی ریختہ گوشتار کا ہے۔ ذکی کی تعلیم دلی میں ہوئی اور اُن کو زبان فارسی و عربی پر عبور حاصل تھا اس کے علاوہ فن طب حدیث و فقہ اور تصوف اور نجوم وغیرہ میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ موسیقی اور فن خوشنویسی سے بھی باخبر تھے۔ مولانا صہبائی اور پنڈت رام کشور بسمل کے علوم درسیہ میں شاگرد تھے فن شعر میں مرزا غالب کو کلام دکھلاتے تھے جن سے انے کچھ قرابت بھی تھی مرزا ان کا بہت خیال کرنے اور بہت محبت سے پیش آتے تھے مرزا کے ہاتھ کی ایک سند کا عکس ان کے دیوان میں دیا ہوا ہے ذکی کو شعر و سخن سے بہت شوق تھا اور اکثر مشاعروں میں شریک ہوتے رہتے تھے جہاں کہیں جاتے تھے شعر و سخن کی مہفلیں گماتے تھے۔ غالب کے شاگرد رشید اور اُن کے طرز کے قمع تھے خیال آفرینی اور جدت تمثیل ان کے کلام کا جوہر ہے۔ البتہ درد و اثر اس قدر کلام میں نہیں ہے مثل ظہیر والور و سالک وغیرہ کے ان کو بھی تلاش معاش میں وطن سے نکلنا پڑا میرٹھہ گو رکھ پور الہ آباد وغیرہ میں ملازمت سرکاری کر کے ۱۹۰۱ء میں بدایوں میں بحیثیت ڈپٹی انسپکٹر مدارس پیش پائی اور وہیں ۱۹۰۳ء میں انتقال کیا اُن کا دیوان ان کی زندگی میں چھپ گیا تھا اپنے زمانے میں طرز قدیم کے استاد مانے جاتے تھے۔ بہت سے شاگرد چھوڑے جن میں مولوی سید احمد ہولف فرسنگ اصفیہ اور پنڈت جواہر ناتھ کول سانی متخلص زیادہ مشہور تھے۔

رخشاں متوفی ۱۲۸۵ھ [نواب ضیاء الدین احمد خاں متخلص بہ رخشاں دبیر۔ نواب احمد بخش خاں
 رئیس بہار دے چھوٹے بیٹے تھے نواب صاحب لہارو نے اپنی جاگیر اپنے چھوٹے بیٹوں
 کے نام منتقل کر دی تھی جس کا انتظام نواب امین الدین احمد خاں کرتے تھے تیر اور غالب
 سے رشتہ داری بھی تھی اور مرزا ان کو اپنا خلیفہ بنا کر لے جاتے تھے۔ تیر اپنے زمانہ کے مل علم
 اور اہل شرف میں ایک خاص درجہ امتیاز رکھتے تھے اور شہر دہلی کے بڑے ماہر اور
 پرکھنے والے سمجھے جاتے تھے۔ تاریخ سے بھی ان کو بہت پسند تھی چنانچہ الیٹ صاحب
 نے اپنی مشہور تاریخ ہندوستان کی تیاری میں ان کی جامعیت اور معلومات سے
 بہت کچھ مدد لی۔

نواب شہاب الدین احمد خاں متخلص بہ ثاقب تیر کے بڑے بیٹے غالب کی بیوی
 کے بیٹے اور غالب کے شاگرد بھی تھے۔ شعر آرد و فارسی دونوں میں کہتے تھے ۱۲۶۹ھ
 عین عالم شباب میں لہجہ انیس سال انتقال کیا۔

دوسرے بیٹے نواب سعید الدین احمد خاں متخلص بہ طائب، جن کی ولادت ۱۲۵۲ھ
 میں ہوئی اپنے بڑے بھائی ثاقب اور ان کے مرنے کے بعد میر مجروح دسالکے حاتی
 سے مشورہ دہن کرتے تھے۔ کچھ عرصے تک دلی کے آنریری مجسٹریٹ رہے پھر ۱۲۷۹ھ
 میں پنجاب کے اکثر اسسٹنٹ کمشنر ہو گئے ۱۲۸۵ھ میں اپنے والد کے انتقال کے بعد
 اپنے عہدہ سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔

مرزا شجاع الدین احمد خاں متخلص بہ تاباں نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقب کے
 بیٹے شاداں اور داغ کے شاگرد ہیں۔ ان کے دو دیوان ہیں۔ ان کی شاہی مرزا باقر علی خاں
 کاکل کی لڑکی سے بھائی اور یہی مرزا باقر علی خاں ہیں جن کو غالب نے پالا تھا۔
 تاباں اب حضور نظام کے پیش خراب ہیں۔

نواب مرزا سراج الدین احمد خاں متخلص بہ سائل خلف نواب شہاب الدین احمد خاں

داغ کے ایک سربر آوردہ شاگرد اور ایک مشہور و معروف شاعر ہیں۔

آزردہ غزلتہ
مغایت ص ۱۲۷

مفتی صدر الدین خاں آزدہ خلف الرشید مولوی لطف اللہ کشمیری اپنے زمانہ کے جید فاضل اور تبحر عالم تھے۔ اُس زمانہ کی علمی اور ادبی سوسائٹی میں ان سے بڑھ کر اور کوئی ممتاز شخص نہ تھا۔ شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی اور مولانا فضل امام سے فیض تربیت حاصل کیا تھا عہدہ صدر الصدور پر فائز تھے جو اُس زمانہ میں ہندوستانیوں کے واسطے سب سے بڑا عہدہ سمجھا جاتا تھا۔ عربی، فارسی، اردو، تینوں زبانوں میں اُن کو دستگاہ کامل حاصل تھی، ان کے علم و فضل کی اس قدر شہرت تھی کہ نواب یوسف علی خاں والی رامپور اور نواب صدیق حسن خاں صاحب مرحوم رئیس بھوپال نے اُن کے سامنے زانوئے شاگردی نہ کیا تھا۔ سرسید مرحوم بھی ان کے شاگرد تھے اور ہمیشہ ان کا ذکر بڑے ادب و احترام سے کرتے تھے۔ ان کو درس و تدریس کا اس قدر شوق تھا کہ بعد انجام دینے اپنے فرائض منصبی کے اپنے اکثر شاگردوں کو سبق دیتے تھے۔ غالب مومن۔ ذوق۔ شیفتہ وغیرہ ان کے احباب میں سے تھے۔ غدر کے زمانہ میں یہ بھی مصیبت میں مبتلا ہوئے اور نصف جاگیر ضبط ہو گئی۔ آزدہ تینوں زبانوں یعنی عربی، فارسی، اردو میں شعر کہتے تھے۔ اردو میں اصلاح سخن پہلے شاہ نصیر سے اور پھر مجرم اکبر آبادی اور آخر میں سرمنون سے لیتے تھے۔ ان کے اشعار نہایت صاف و سلیس اور پُر اثر ہوتے ہیں مگر کبھی دیوان کی صورت میں مرتب نہیں کئے گئے۔ اُن کا ایک تذکرہ شعرا سے اردو کا بھی ہے مگر اب نہیں ملتا اُن کی شہرت بحیثیت ایک شاعر یا تذکرہ نویس کے اس قدر نہیں ہے جتنی کہ ان کے علم و فضل کی ہے۔



باب ۱۳

دربار رام پور و حیدر آباد امیر و داغ کا زمانہ

بعد از نزاع سلطنت اور غدر سے جبکہ واجد علی شاہ کلکتہ اور ابوالمنظف بہادر شاہ قید کر کے رنگون بھیجے گئے لکھنؤ اور دہلی، جو ایک عرصہ تک اردو شاعری کے مسکن و مامن رہ چکے تھے ادبی لحاظ سے بالکل ویران ہو گئے اور یہاں کے شاعراب ہندوستانی ریاستوں کی طرف نہایت اشتیاق اور حسرت کی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

مٹیابر ج کلکتہ میں وہ شعرائے لکھنؤ جو لکھنؤ میں حضرت سلطان عالم واجد علی شاہ کے دامن دولت سے وابستہ تھے ان میں سے بعض تو اپنے آقا کے نامدار کے ساتھ ہی اور بعض غدر کے بعد جب کسی قدر تسلط اور امن و امان ہو گیا تو وہی کلکتہ ہوئے چنانچہ بادشاہ نے جن کو مناسب نام و خطاب دینے کا خاص ملکہ تھا ان سات بڑے شاعروں کو جو مٹیابر ج میں ان کے ساتھ تھے سب سے زیادہ کا خطاب دیا تھا۔ ان میں سے ہر ایک بڑے بڑے معزز شاہی خطاب سے بھی سرفراز تھا۔ ان لوگوں کی وجہ سے مٹیابر ج کی صمیمیتوں میں بڑی گرمی تھی۔ شاعرے آئے دن ہوا کرتے تھے اور مٹیابر ج سواد کلکتہ نہیں بلکہ لکھنؤ کا ایک محلہ معلوم ہوتا تھا۔ ان سب سے زیادہ میں جن کا ذکر پور ہو بعض شعرا کے نام یہ ہیں :- فتح الدولہ بخشی الملک مرزا محمد رضا برق - مہتاب الدولہ کوکب الملک ستارہ جنگ متخلص بہ درخشاں مالک الدولہ صولت

گلشن الدولہ حاجی مرزا علی متخلص بہ بہار شاگرد رشک عیش۔ مظفر علی بہتر۔ جو غزل میں صبا کے اور مرثیہ میں مرزا دبیر کے شاگرد تھے اور مخدومہ عظمیٰ نواب بادشاہ محل متخلص بہ عالم اور نواب محبوب عالم صاحبہ کے کہ یہ دونوں بیویاں واجد علی شاہ کی تھیں استاد تھے۔ اسی پر لطف مجمع میں داغ اور نظم طباطبائی بھی پہنچ گئے تھے۔ ان صاحبوں اور شاعروں سے زبان اور شاعری اُردو کا بنگال میں بہت چرچا ہو گیا تھا وہاں کے مقامی شعرا میں اس زمانہ میں مولوی عبدالغفور نسّاخ جو اس وقت راج شاہی کے ڈپٹی کلکٹر تھے بہت ممتاز اور معزز سمجھے جاتے تھے۔ نسّاخ ایک فی کمال سخن گو سخن سنج اور اچھے نقاد سخن تھے چنانچہ تذکرہ سخن شعراء دفتر بے مثال قطعہ منتخب، چترہ فیض، شاہد عشرت، مرغوب دل، اشعار نسّاخ، گنج توارخ، قند پارسی، ارمغان، باغ فکر وغیرہ ان سے یادگار ہیں۔ دیروانیس کے کلام پر ایک تنقیدی نظر ڈالی ہے جو اکثر مقامات پر صحیح تو نہیں مگر دلچسپ اور مفید ضرور ہے ان کے مشہور شاگردوں میں انسخ تھے۔

شعراے دہلی اپنا وطن پہلا سفر شعراے دہلی کا اپنے وطن مالوت سے جس کا اشارہ صفحات چھوڑ نکلتے ہیں گذشتہ میں کئی بار ہو چکا ہے چند اسباب پر مبنی ہے اور وہ یہ ہیں یعنی افتخاروں اور مرہٹوں کے حملے اور دہلی کی تباہی ان کے ہاتھ سے تباہان دہلی کی عظمت قدیم کا جاتا رہنا۔ رعایا کی جان و مال کا عدم تحفظ۔ تلاش معاش کی دقتیں۔ شعرا کی بے قدری اور بیکاری پس یہی وجوہ تھیں جن کی بنا پر شعراء اپنا وطن چھوڑنے اور دوسرے مقامات میں تلاش روزگار کے لیے نکل جانے پر مجبور ہوئے چنانچہ فرخ آباد فیض آباد، عظیم آباد، شہر آباد اور حیدر آباد دکن نے دہلی کے ان شورہ بختوں کو اپنی آغوش محبت میں بے تکلف جگہ دی فرخ آباد اور فیض آباد دہلی سے بہ نسبت دوسرے مقامات کے زیادہ قریب تھے مگر چونکہ فرخ آباد ایک چھوٹا مقام تھا اور دوسرا وہاں کم تھے لہذا شعراے دہلی نے پانے فیض آباد اور جب فیض آباد بدل کر کھنودار السلطنت قرار پایا تو پھر کھنودار کا رخ کیا۔ لکھنؤ کے

انتخاب کے خاص اسباب آگے چل کر ہم وضاحت سے بیان کریں گے۔

فرخ آباد | فرخ آباد میں نواب مہربان خاں زند جو نواب احمد خاں بنگلش کے ایک معزز کن دربار تھے خود بہت بڑے شاعر اور موسیقی دان تھے۔ شعر و سخن میں انھوں نے میر سوز سے اور جب مرزا سودا دلی سے فرخ آباد آئے تھے تو ان سے بھی اصلاح لی تھی۔ سودا نے ان کی تعریف میں کچھ قصیدے بھی کہے ہیں کچھ دنوں بعد جب نواب موصوف کا خاندان برسر اقتدار نہ رہا تو شعر و شاعری کا چرچا بھی وہاں کم ہو گیا۔

عظیم آباد | ہمارا جہ شتاب رائے جو اس زمانہ میں بنگال کے حاکم اعلیٰ تھے۔ شاعروں کے قدر دان اور خود بھی شاعر کہلاتے تھے ان کے بیٹے جو راجہ تخلص کرتے تھے میر ضیاء الدین ضیاء، معاصر سودا کے شاگرد تھے کہ وہ لکھنؤ کے بعد عظیم آباد چلے گئے اسی طرح اشرف علی خاں فغان بھی ہمارا جہ موصوف کے دربار میں پہنچ گئے تھے اور ان کی ہمارا جہ بہت قدر کرتے تھے۔ میر باقر حنیس شاگرد مرزا مظہر جان جاناں نواب سعادت جنگ رئیس عظیم آباد کے دامن دولت سے وابستہ تھے اور وہیں انتقال کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے شعرا کے دہلی کی بڑی قدر تھی اور شعر و سخن کا چرچا یہاں خوب تھا۔

مرشد آباد | نوابان مرشد آباد نے بھی اسی طرح شعرا کے دہلی کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور ان کی قدر دانی اور ان کے ساتھ بڑی مہربانی کی۔ میر سوز اور میر قدرت اللہ قدرت معاصر میر و سودا مرشد آباد گئے اور آخر انکر دیں شمس الدین بیوند خاک ہوئے۔ مرزا خور علی خلیق، نواب نواز شمس محمد خاں شہاب جنگ کے بلانے سے بعد محمد شاہ بادشاہ دہلی مرشد آباد آئے تھے یہ اس زمانہ کے مشہور مرثیہ گو اور مرثیہ خوان تھے۔

ناٹھ | ٹانڈہ جو آنولہ ضلع بریلی اور رام پور کے قریب واقع ہے، نواب محمد یار خاں متمصل بہ امیر کا قیام گاہ تھا۔ نواب صاحب نواب فیض اللہ خاں دلی رام پور کے حقیقی چھوٹے بھائی تھے اور خود بھی شاعر اور شعر اروز تھے۔ انھوں نے پہلے میر سوز

اور سودا کو بلوایا مگر حیب وہ نہیں آئے تو قائم چاند پوری کو جو خواجہ میر درد سودا کے شاگرد
تھے طلب کیا اور ان کو وہ شور و سیہ ماہوار دیتے تھے اور انھیں کے شاگرد بھی تھے
مضنی۔ قدوسی لاہوری۔ میر محمد نعیم پروانہ اور عشرت وغیرہ بھی اس دربار کے زلمہ خوار رہ چکے
ہیں۔ نواب صاحب کا انتقال بمقام رام پور ۱۱۸۸ھ میں ہوا۔

حیدر آباد پہلی مرتبہ شعراء اس ملک کی جانب کم متوجہ ہوئے۔ اس وجہ سے کہ دور دراز کا
سفر اور راستہ مرہٹوں اور پٹاریوں کی غارت گری کی وجہ سے پر خطر تھا۔ مگر اس پر
بھی کچھ باہمت لوگ پہونچ ہی گئے چنانچہ خواجہ احسن اللہ بیان شاگرد منظر آصف جہا
ثانی کے عہد میں حیدر آباد پہونچے اور وہیں ۱۲۱۳ھ میں رحلت کی ران کے ایک شاگرد
راے کلاب چند بھتم نے "اُستادان جہاں رفت متارتخ کہی شاہ نصیر بھی متعدد بار
حیدر آباد گئے تھے۔

فیض آباد و کھنڈ | انتخاب فیض آباد کے وجہ :-

(۱) دلی سے فیض آباد بہ نسبت دیگر مقامات مذکورہ کے قریب تر تھا۔

(۲) شعراء کی قدر و ماں بہ نسبت دیگر مقامات کے زیادہ ہوتی تھی

(۳) امیر الزہر ابیکم معروف بہ بیکم صاحبہ شجاع الدولہ کی بیوی اور آصف الدولہ
کی ماں محمد شاہ بادشاہ دہلی کی بہت لاڈلی لے پالک بیٹی تھیں ان کا وطن اصلی دہلی تھا
اس وجہ سے ان کو اپنے اہل وطن یعنی دلی والوں سے کمال محبت اور بہرہ بردی تھی اور ان کے
ساتھ علی قدر مراتب بڑی شفقت اور محبت سے پیش آتی تھیں۔

(۴) نواب آصف الدولہ بہادر کو دہلی کے رئیس اعظم خاتمان کی بیٹی منسوب تھیں
اس وجہ سے کھنڈ کو دہلی کے ساتھ ایک دوسرے پر بڑی محبت نصیب ہو گیا تھا۔ کچھ شعراء پر
موقوف نہیں، دہلی کے تہاڑا باب حرفہ و پیشہ ارباب نشاط و غرض کہ ہر جماعت اور
پیشہ کے لوگ فیض آباد میں بکثرت موجود تھے مشہور تہوں ہے کہ بیکم صاحبہ کی داود دہش کا

شہر سن کر آدمی دہلی پہنچ کر آگئی تھی۔ برخلاف اس کے ریاستہائے نظام و نظم و ضبط سلطان
اور کرناٹک اور مرشد آباد دہلی سے بہت دور تھے پس کوئی تعجب نہیں کہ فیض آباد میں اتنا
جمع ہو گیا ہو۔ پھر جب نواب آصف الدولہ نے لکھنؤ کا رخ کیا اور اسکو اپنا مستقل دار الحکومت
بنالیا تو یہ ساری محفل وہاں سے اٹھ کر لکھنؤ چلی آئی۔ چنانچہ اسی زمانہ میں یا اس کے قریب
رتیب یہ لوگ فیض آباد اور لکھنؤ پہنچ گئے تھے۔ یعنی مرزا سودا، میر تقی، میر سوز، مرزا محمد
تقی خاں ترقی شاگرد میر سوز، طالب علی خاں عیسیٰ شاگرد فیصل، جعفر علی حسرت، بقا اللہ خاں
بقا میر حسن، میر ولی اللہ محبت شاگرد سودا، میر حمید علی حیراں شاگرد سرپ سنگھ دیوانہ،
میر ضاحک، میر زافا خرمکین، میر غلام حسین برشتہ شاگرد میر ضیا، نغیاں، قائم، مصحفی
انشاء بر آرت، رنگین، قتیل، قاضی محمد صادق خاں اختر (جو ہو گلی کے رہنے والے تھے)
ان کے علاوہ دیگر شعرا بھی مختلف اوقات میں دہلی سے لکھنؤ آئے اور لکھنؤ کی صحبت و شعر و سخن کو
گمانے رہے۔ نیز مرزا جواں بخت و لیہد شاہ عالم جو تھوڑے دنوں لکھنؤ رہ کر بنارس چلے گئے
اور مرزا سلیمان شکوہ، مرزا جواں بخت کے چھوٹے بھائی جو بعد کو آئے اور بڑے ترک افغان
سے لکھنؤ میں رہتے تھے ان کی وجہ سے بھی شعر و شاعری کو بہت فروغ ہوا۔ بس یہ معلوم
ہوتا تھا کہ گلستان لکھنؤ اعزاز دل خوش الحان سخن کے دلکش تراژوں اور پر لطف نواسنجوں سے
معمور اور مست ہو رہا ہے۔

شعراے دہلی و لکھنؤ کا طرز لکھنؤ کو نقصان پہنچانے والی پہلی ضرب اقتزار سلطنت
دوسرے مقالات پر نشر ہو جاتا اودھ کو کھنسا چاہئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ داجد علی شاہ کلکتہ
بھیج دیے گئے۔ اسی کے ساتھ دوسری ضرب کاری جس نے ہماری اردو شاعری کو سخت نقصان
پہنچایا۔ غدر شاہ اور دہلی اور لکھنؤ کی تباہی و بربادی کی صورت میں ظاہر ہوئی اس وجہ سے
کہ یہی دونوں شہر بغاوت اور نیز انتقام بغاوت دونوں چیزوں کے بڑے مرکز تھے۔ بہادر شاہ کو
محرم پھر اکرا دقید کر کے ہندوستان سے باہر بھیج دیا۔ قلعہ معلے کے رہنے والے جو

ابنک شعرائے دہلی کا ملہا ماد اپنا ہوا تھا اور اُدھر تیر بتر ہو گئے۔ شعر و سخن کا
 کیا خاک خیال آتا جب جان و مال کے ساتھ عزت و آبرو بھی خطرہ میں پڑ گئی تھی۔ انھیں
 اسباب سے اور اسی حالت میں لکھنؤ اور دہلی کے شاعر اپنا وطن چھوڑ کر نکل کھڑے
 ہوئے اکثروں نے رام پور کا رخ کیا کیونکہ وہ دہلی اور لکھنؤ سے قریب تھا۔ پھر وہاں کے
 والی ریاست بھی اہل سخن کے بڑے قدردان اور رتی تھے کچھ لوگ حیدر آباد پہنچے کچھ لاہور
 و جواہر کی ہندوستانی ریاستوں مثلاً آگرہ، جہ پور، بھرت پور، پٹنہ، کپور تھلہ وغیرہ میں
 پناہ گزیں ہوئے۔ اسلامی ریاستوں یعنی ٹونک، بھوپال، منگروڑ (کاٹھیاواڑ) مالیر کوٹلہ
 اور بھادپور نے بھی اکثر خانماں بریلو شاعروں کو اپنی طرف کھینچا۔ چنانچہ کچھ تو یہاں کے
 درباروں میں نوکر ہو گئے کچھ ان ریاستوں میں رہ کر وہاں کے والیاں ملک کی فیاضیوں سے
 بہرہ مند ہونے لگے۔ مختصر یہ کہ رام پور اور حیدر آباد ہی ایسے دو بڑے دربار تھے جنہوں نے
 ان خستہ اردل شکستہ شاعروں کی بڑی قدر کی۔ لہذا ان دو مقامات کے شعرا کا کچھ حال
 ہم اسی باب میں آگے کسی قدر تفصیل سے لکھیں گے۔ آگرہ نے بھی جہاں کے
 حکمران ہمارا راجہ شیو دھان سنگھ مشہور قدردان سخن تھے۔ ظہیر۔ تصویر۔ نقشہ شاگردانِ ذوق
 اور میر۔ حجروج اور سالک شاگردانِ غالب کی بڑی قدر کی۔ ہمارا جہ موصوف نے فرزا راجہ علی
 سرور مصنفِ فسانہ عجائب کو بھی اپنے ہاں بلایا تھا۔ اسی طرح ظہیر اور ان کے چھوٹے
 بھائی انور جے پور چلے گئے اور آخر الذکر کا انتقال بھی وہیں ہوا۔ آگرہ گورگانی مالیر کوٹلہ اور
 بھادپور میں رہے ٹونک منگروڑ اور بھوپال کا علیحدہ علیحدہ ذکر آتا ہے۔

ٹونک | والی ٹونک نواب میر ابوالہیم علی خاں ^{۱۸۵۸ء} میں پیدا ہوئے اور اپنے
 پدر برہم گوار نواب محمد علی خاں کی عزت و کی بعد ^{۱۸۵۸ء} میں سندھ آئے حکومت ہو یہ
 شاعر ہیں اور خلیل تخلص فرماتے ہیں پہلے سب خیر آبادی شاگرد امیر مینائی کے شاگرد تھے
 ان کے انتقال کے بعد ان کے چھوٹے بھائی مصطفیٰ خیر آبادی سے شوقِ سخن کرنے لگے۔ ان کے دربار

میں اور بھی بہت سے شاعر تھے جن میں تلمیر اور نواب سلیمان خاں مخلص برآسن زیادہ مشہور ہیں آسن میر مظفر علی اسیر کے شاگرد اور صاحب دیوان ہیں۔ نواب صاحب موصوف نے ان کو خاص طور پر ٹونک طلب کیا تھا ان کے اکثر شاگرد وہاں موجود ہیں مثلاً اصغر علی خاں آبرو حبیب اللہ حبیب عبد الرحیم خاں شرف خواجہ سید کرامت علی خلش و آغ کے شاگرد تھے انہوں نے اپنے بعد ایک غیر مطبوع دیوان اور بہت سے شاگرد چھوڑے اور سلسلہ عبسوی میں انتقال کیا۔ نواب صاحب موصوف کے صاحبزادے بھی شاعر ہیں اور اپنے پدر بزرگوار کے قدم بقدم چلتے ہیں۔

منگروں کا ٹھکانہ دار میں ایک چھوٹی سی اسلامی ریاست ہے اس دور دراز مقام میں بھی اردو شاعری کا خوب چرچا ہوا جس کی وجہ والی ریاست نواب حسین میاں بہادر کی توجہ اور قدر دانی کی جاسکتی ہے۔ ان بزرگوار نے لکھنؤ اور دلی کے اُس وقت کے اکثر نامور شاعروں کو اپنی ریاست میں یکے بعد دیگرے طلب کیا تھا۔ چنانچہ آغ۔ تسلیم جلال اور مشتاد جو ناسخ کے مشہور شاگرد اور لکھنؤ میں استاد مانے جاتے تھے۔ اس قدردان سخن کی فیاضیوں سے وقتاً فوقتاً بہرہ یاب ہوتے رہے مقام کی دوری اور آب و ہوا کی نام ساز گاری کی وجہ سے ان لوگوں نے وہاں قیام تو زیادہ نہیں کیا مگر اکثر ان میں کے ریاست سے ماہانہ تنخواہ پاتے رہے جو ان کو ان کے مکان پر برابر بھیج دی جاتی تھی۔

بھوپال فرماں روا کے ریاست ہر ہائیس نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ بالقاباہا اپنی ریاست کی بلکہ تمام ہندوستان کے تعلیمی معاملات میں بے حد دلچسپی لیتی ہیں چنانچہ مسلم یونیورسٹی اور امپریل کالج دیگر قومی تعلیم گاہوں کے قیام میں انہوں نے ہمیشہ بہت بڑی فراخ دلی سے حصہ لیا ہے اور شاہانہ عطیے ان کو عنایت کیے ہیں۔ خود بھوپال میں

لے موجودہ فرمانرواے ریاست ہر ہائیس نواب حمید اللہ خاں بہادر بالقاب ہیں۔ ۱۲

صد ہا اسکول اور مدارس اُن کے عہد مبارک میں اردو ریاست ہی کے روپ سے قائم ہوئے
جو ہمیشہ ان کی علم دوستی اور ہنر پروری کی یادگار رہیں گے۔ آپ مختلف علوم و فنون میں کافی
دستگاہ رکھتی ہیں اور متعدد کتابوں کی مصنف ہیں بہت سے قابل اپنا کسٹوں کو جو ناسازگار
زمانہ کی وجہ سے اپنے علمی کارناموں کو شائع نہ کر سکے آپ کی ذات سے بہت بڑی مدد
پہونچی ہے سیرت نبوی کی تکمیل کے واسطے جس کا بہت بڑا حصہ مولانا شبلی نعمانی مرحوم نے تیار
کر دیا تھا اب تک معقول رقم ماہانہ عطا فرماتی رہتی ہیں۔ آپ کی والدہ ماجدہ نواب
شاہ جہاں بیگم صاحبہ مرحومہ بھی بہت اچھی شاعرہ تھیں اور اُنہ دو میں شیریں اور بعد کو
تاجور اور فارسی میں شاہ جہاں تخلص کرتی تھیں۔ انھوں نے اپنا عقد ثانی نواب صدیق حسن
خان صاحب سے کر لیا تھا۔ نواب صاحب موصوف عربی و فارسی کے بڑے عالم و فنان
اپنے زمانہ کے ایک مشہور محدث اور مفسر سمجھے جاتے تھے۔ مفتی آزاد دہ کے شاگرد تھے اور
تقریباً ڈیڑھ دو سو کتابوں کے مصنف تھے۔ شعر اور اہل علم کے بڑے قدردان
تھے اور دو میں توفیق اور فارسی اور عربی میں نواب تخلص کرتے تھے نواب شاہ جہاں بیگم کے
والد ماجد نواب جہانگیر محمد خاں مرحوم بھی خوب شعر کہتے تھے اور دولت تخلص کرتے تھے
اُن کا دیوان چھپ گیا ہے۔ علاوہ خاندان ریاست کے بھوپال میں اور بھی بہت خوش گو
شاعر ہمیشہ رہے ہیں۔

چونکہ ترقی شاعری کے آخری عہد میں رام پور و حیدر آباد نے شعرا کے اجتماع اور
قدردانی میں بہت نمایاں حصہ لیا ہے لہذا اُن کا حال اختصار کے ساتھ علیحدہ علیحدہ
لکھا جاتا ہے۔

رام پور | ہمارے نزدیک اس امر کی کہ رام پور میں بہ مقابلہ اور شہروں کے شعرا کا مجمع
خاص طور پر زیادہ ہوا تین دہیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ دلی اور لکھنؤ کے درمیان
اور ان دونوں شہروں سے مساوی فاصلہ پر واقع ہے۔ دوسرے یہ کہ فرمانروایان ریاست

خود بھی زبردست شاعر اور سخن سنج اور شعرا کے قدردان تھے اور شعرا کی محنت و ہیکر کا دی
کے بدلے ہمیشہ ان کو بیش بہا انعامات و وظائف سے سرفراز کرتے رہتے تھے میرے
یہ کہ وہ علماء و ادباء اور شعرا کو اپنا ملازم نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان سے مساویانہ برتاؤ کرتے
اور اکثر ان کی نازک مزاحیاں برداشت کرتے تھے۔ ان کا دیار اسی قسم کے اہل علم و فضل کا
مجمع تھا اور نواب صاحب خود ان کی دلچسپیوں میں حصہ لیتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ
لوگ بڑی بڑی تنخواہوں پر بھی ادل تو رام پور سے نکلنا ہی نہیں چاہتے اور اگر جاتے
بھی تو ہمیشہ واپس لو کیا کرتے رہتے تھے۔

نواب یوسف علی خاں | نواب یوسف علی خاں خلف نواب محمد سعید خاں بڑے علم و دست
انسر پرورد اور شعر کے مربی رئیس تھے خود بھی شاعر تھے اور اردو فارسی دونوں میں شعر کہتے
تھے اردو میں ناظم تخلص کرتے تھے صاحب دیوان تھے ابتدا میں حکیم مومن خاں سے
اصلاح لیتے تھے۔ ان کے بعد مرزا نوشہ غالب پھر میر مظفر علی اسیر کو کلام دکھلانے لگے
دلی اور لکھنؤ کی تباہی کے بعد جو شاعر وہاں سے نکلے ان کو رامپور ہی میں جگہ ملی تھی۔ مولانا
فضل حق خیر آبادی۔ مرزا غالب۔ میر حسین تکیں۔ میر مظفر علی اسیر اور بہت سے علماء و
شعرا ان کے دامن دولت سے وابستہ تھے۔ نواب صاحب ہوصوف نے شعراے دہلی و لکھنؤ
کو اپنے دربار میں جمع کر کے اردو شاعری کو گنگا جہنی کر دیا تھا۔ یعنی ان دونوں طرزوں کو ملا کر
ایک نئے طرز کی بنیاد ڈالی تھی جس نے ان کے بلند اقبال صاحبزادے نواب کلب علی خاں
کے زمانہ میں بڑی ترقی کی۔

نواب کلب علی خاں | نواب کلب علی خاں کے عہد میں جو ۱۲۰۰ء مطابق ۱۸۶۹ء میں اپنے
۲۵ سالہ تاس ۳۰۰۰ء | والد نواب یوسف علی خاں کی جگہ مندر نشین ہوئے اردو شاعری نے
رام پور میں پہلے سے بھی زیادہ ترقی کی۔ برخلاف فرید رک اعظم بادشاہ حرمی کے جو اپنے
زمانہ میں کل بادشاہان یورپ میں علم دہنر کا بڑا رتی اور قدردان سمجھا جاتا تھا نواب صاحب

موصوف بڑے سخی اور فیاض تھے اور ہمیشہ انعام و اکرام سے شعرا کی قدر افزائی کرتے تھے
 اُن کا مبارک عہد ادبی حیثیت سے رام پور کا ذریعہ عہد کہا جاسکتا ہے۔ اُنھوں نے اپنی
 دانشمندی و قدر دانی اور مردم شاشی سے اپنی چھوٹی سی ریاست میں بڑے بڑے اہل
 کمال اور ارباب فن کو جمع کر لیا تھا جس کی نظیر ہندوستان کی کسی دوسری ریاست میں نہیں
 ملتی تھی اس ریاست میں اُس وقت کے بہتر سے بہتر حکماء کامل تیار شعرا خوشنویس بہاننگ
 کہ ہر ایک حرفہ اور پیشہ کے بھی مشہور اہل کمال مثلاً چو بداز یاد رچی، رکابدار وغیرہ سب
 موجود تھے۔ علما کے کردہ میں علامہ عبدالحق خیر آبادی، علامہ عبدالحق مہندس، مولانا
 ارشاد حسین۔ سید حسن شاہ محدث اور مفتی سعد اللہ وغیرہ، حکماء اور اطباء کے طبقہ میں حکیم
 محمد ابراہیم اور اُن کے صاحبزادے حکیم عبدالعلی، حکیم علی حسین اور حکیم احمد رضا و حکیم حسین رضا
 وغیرہ تھے شعرا کی جماعت بہت زبردست تھی۔ یوں تو اور بہت سے تھے مگر مشہور لوگوں
 میں یہ حضرات زیادہ نامور ہیں۔ میر مظفر علی اسیر، شیخ انداز علی بکچر۔ امیر دارنا جلال۔ تسلیم
 میر۔ قلی۔ عروج۔ حیا۔ جان صاحب۔ آغا ججو شرف شاگرد آتش۔ انس شاگرد ناسخ
 شاغل۔ شاداں۔ غنی۔ ضیا۔ خواجہ محمد بشیر۔ منصور۔ رتنا وغیرہ۔ ان مشاہیر کے علاوہ
 اور سیکڑوں قابل اور لائق شخص پڑے ہوئے تھے جن کی پرورش و درپردہ دانی ریاست
 کرتی تھی مقرب لوگوں کے قیام کے واسطے ایک اعلیٰ درجہ کا مکان مخصوص تھا جو مصاحب
 منزل کے نام سے مشہور تھا مگر بادجو دان اخراجات شاہانہ کے اسراف کا الزام ریاست پر
 عائد نہیں ہوتا تھا کیونکہ یہ جتنے لوگ تھے سوائے مولانا ارشاد حسین۔ مولوی عبدالحق اور شی
 امیر احمد مینائی کے کسی کی تنخواہ تنور دیہ سے زیادہ نہیں تھی۔ علاوہ اس کے کسی کو مفت
 اور فضول تنخواہ نہیں ملتی تھی اور یہ سب لوگ ریاست کے مختلف کاموں پر باعتبار اپنی
 قابلیت اور سہن کے مقرر تھے مگر یہ ضرور ہے کہ نواب صاحب اپنے تمام ملازمین سے قطع
 نظر انعام و اکرام کے نہایت شفقت اور محبت سے پیش آتے تھے۔ عید بقر عید اور

اکثر خوشی کے موقعوں پر تمام معزز اور مقرب لوگوں کو خلعت اور انعام سے سرفراز فرماتے اور جن سے زیادہ خصوصیت ہوتی ان کی خبر گیری خاص طور پر فرماتے۔ قرض اردوں کا قرض ادا کر دیتے اور مختلف طریقوں سے ان کو رہن منت کرتے تھے۔

نواب کلب علی خاں نے دریاۓ مقبول و مقبول مولانا فضل حق خیر آبادی سے پڑھی تھیں۔ پہلے انھوں نے اردو فارسی نثر لکھنے کی فراغت کی۔ اور اکثر کتابیں تصنیف کیں مغلہ جن کے بلبل نغمہ سنج ترانہ غم۔ قندیل حرم۔ اور شگوفہ خسروی زیادہ مشہور ہیں۔ فارسی میں ان کا دیوان تلج فرخی کے نام سے مشہور ہے۔ اردو میں اپنا کلام امیر مینائی کو دکھاتے اور انھیں سے شورو سخن کرتے تھے اور چار دیوان ان کی یادگار اور ان کی اعلیٰ قابلیت کے نمونے ہیں۔ نیشہ خسروانی۔ دستو خاقانی۔ درۃ الانتخاب۔ اور توفیق سخن نواب صاحب نواب تخلص کرتے تھے اور نہایت عمدہ شعر کہتے تھے۔ ان کو کیمقن لفظی کا خاص شوق تھا اور الفاظ کی صحت و عدم صحت کے مناظرے ان کے سامنے اکثر ہوا کرتے تھے جن میں بکر۔ سلیم جلال۔ امیر۔ اور منیر وغیرہ جو اس فن خاص میں خاص بصیرت اور دلچسپی رکھتے تھے، نمایاں حصہ لیتے تھے۔ اسی وجہ سے نواب صاحب کا بیشتر کلام سرود کات اور غیر فصیح الفاظ اور ترکیبوں سے پاک ہے۔

اس اجتماع شعرا کا نتیجہ بہت اچھا ہوا کہ اس کی وجہ سے دلی اور لکھنؤ کے مختلف طرز آیس میں مل گئے اور ایک نئے طرز کی بنیاد پڑی جس کی ابتدا نواب یوسف علی خاں کے زمانہ میں ہو چکی تھی۔ یہ اردو شادی کا ایک ایسا اہم اور غور طلب سکہ ہے جس کی طرف کافی توجہ اب تک منحطف نہیں ہوئی ہے۔ ناسخ کا طرز ان کے شاگردوں کے زمانہ میں جو کہ اپنے استاد کی روش کو قائم نہ رکھ سکے تھے بد سے بدتر ہو گیا تھا ان لوگوں کے کلام میں اس طرز کے تمام عیوب تو موجود تھے مگر خوبیاں مفقود تھیں اس طرز کے برتنے والے راسخو میں بکر۔ منیر۔ قلندر اور امیر تھے برخلاف اس کے طرز دلی

کے سپردِ داغ و تسلیم تھے۔ داغ گو کہ ذوق کے شاگرد تھے مگر انھوں نے ایک ایسا دلکش طرز
اختیار کیا تھا جس میں جرأت کا کچھ رنگ ملتا جلتا تھا۔ اُن میں اور لکھنؤ والوں میں زمین
و آسمان کا فرق تھا۔ اُن کے اشعار بہت مقبول ہوئے بہت شخص اُن کے رنگ و لہارہ
تھا۔ تسلیم گو کہ لکھنؤ کے تھے مگر رنگ بالکل دلی کا اختیار کیا تھا۔ وہ نیم دہلوی کے شاگرد تھے
جو مومن کے شاگرد تھے نیم کے طرز کی کیفیت ہم اُن کے حالات میں مفصل بیان کر چکے ہیں
اُن کے شاگرد تسلیم پر داغ کے رنگ کا جادو کبھی نہ چلا رہا تھا۔ اُس کو ہمیشہ برا سمجھتے رہے اور
جہاں کہیں رہے اپنے استاد اور استادِ استاد یعنی نیم اور مومن کی پیروی کرتے رہے۔ مومن اور
غالب تھوڑے عرصہ تک رامپور میں رہے تھے اس وجہ سے اُن کا اثر کچھ زیادہ نہ پڑ سکا
اور میر حسین شکیں کوئی ایسے بلند مرتبہ شخص نہ تھے کہ اپنا اثر اپنے وقت کی زبان اور شاعری
پر ڈالتے۔ مختصر یہ کہ یہ دونوں اسکول اپنی لکھنؤ اور دلی۔ آپس میں لڑتے جھگڑتے اور مباحثہ
کرتے رہے جس کا نتیجہ شاعری کے لئے عموماً اچھا ہوا۔ یعنی ناسخ کے زمانہ سے جو ایک بیجا
لفظی اور تصنع کا شوق داخل زبان ہو گیا تھا وہ جاتا رہا کہ سکھ اُس کو شدید نقصان
پہونچا اور اسی کے ساتھ لفظی تحقیق کا یہ بارک نتیجہ ہوا کہ ایسے الفاظ اور ترکیبیں جو قدما
کی یادگار اور اہل دہلی کی بانیہ ناز تھیں رخصت ہو گئیں۔ اب لوگ شاعری کے صحیح
جذبات اور اُن کے مناسب الفاظ سے واقف ہو گئے لکھنؤ کے طرز قدیم کے بیداروں
نے دیکھ لیا کہ اب اس جدید رنگ کے سامنے اُن کا رنگ نہیں جم سکتا مجبوراً اُن کو طرزِ دہلی
کی طرف متوجہ ہونا پڑا چونکہ داغ کو مقبولیت عام حاصل ہو رہی تھی جیسا کہ ہم ابھی اوپر
کہہ چکے ہیں۔ لہذا اُن کے معاصرین کو اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ پہلے کی پسند کا
اتباع کرتے ہوئے وہی طرز اختیار کریں۔ چنانچہ امیر جو داغ کے بڑے حریف اور مقابل
تھے اُن کو بھی اس رائے عامہ کے سامنے تسلیم کرنا پڑا۔ اور اسی وجہ سے اُن کا دوسرا دیوان
یعنی مہتمم خانہ عشق داغ کے رنگ میں ہے گو کہ کہیں کہیں اپنے خاص رنگ میں بھی کہہ جاتے ہیں

اسی طرح انھوں نے "جوہر انتخاب" اور "گوہر انتخاب" ایک میر اور دوسرا خواجہ سیرور کے رنگ میں کہہ کر اس بات کا ثبوت دیا کہ وہ دلی کے رنگ کو لکھنؤ پر ترجیح دیتے ہیں۔ شاگردان امیر علی انفس میں ریاض جلیل اور حفیظ نے ایک قدم اور بڑھایا بلکہ ان کے اکثر اشعار تو ایسے ہیں جو داغ اور شاگردان داغ کے کلام سے علیحدہ نہیں کئے جاسکتے یہی حال جلال کا بھی سمجھنا چاہیے جلال، رنگ اور برق کے شاگرد تھے اور انکی نشوونما بالکل لکھنؤ کے طرز پر ہوئی تھی مگر عجیب ہے کہ انھوں نے بھی اس رنگ کو چھوڑ کر دلی کا رنگ اختیار کیا چنانچہ انکا ایک یونان بالکل اسی رنگ کا ہے اور اس میں انھوں نے میر کی بہت پیروی کی ہے مگر ہمارے اس لکھنے سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ امیر و جلال بالکل اپنے رنگ کو بھول گئے تھے۔ البتہ ایک بڑی حد تک اس کی پیروی کرتے تھے ہمارے خیال میں قدیم رنگ کا خاتمہ اس وقت ہوا جبکہ انجمن معیار لکھنؤ میں قائم ہوئی جس کے ماہوار میاں اور اس کی تحقیقات نے طرز قدیم کو لوگوں کے دل سے محو کر دیا۔

موجودہ فرمانروا سے رامپور موجودہ فرمانروائے رامپور یعنی ہر بانہس نواب سید حامد علیاں صاحب بہادر نے مجمع القابہ ایک نہایت روشن خیال تعلیم یافتہ اور مثل اپنے اسلان گرام کے نہایت اعلیٰ درجہ کے شاعر اور سخن فہم اور شعرا کے مربی اور سرپرست ہیں ان کے زمانہ میں بھی شعراء اور ہر قسم کے بالکالوں کا رامپور میں مجمع رہتا ہے اور یہ لوگ ہمیشہ ان کے جود و سخا سے بہرہ یاب ہوتے رہتے ہیں اس زمانہ کی تمام قوی درس گاہیں اور مفید تحریریں ان کے فیوض نامتناہی سے فیضیاب ہوتی رہتی ہیں۔

امیر مینائی علیہ السلام منشی امیر احمد مینائی امیر تخلص خلف مولوی اکرم محمد علیہ السلام میں بہار نقابت علیہ السلام نصیر الدین حیدر لکھنؤ میں پیدا ہوئے حضرت مخدوم شاہ مینا کے جن کا مزار لکھنؤ میں مریح خاص دعام ہے مخاندان میں ہیں اسی تعلق سے مینائی کہلاتے ہیں درسی کتابیں مفتی سعد اللہ مرحوم اور ان کے سمعہ علیائے فرنگی محل سے پڑھی تھیں اور لڑائی فارسی

میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ منشی صاحب اپنی ذات سے بڑے منکر المیزاج صاحبِ دقویٰ
 اور صوفی مشربِ بزرگ تھے۔ خاندانِ سابر یہ چشتیہ کے سجاد و نشین حضرت امیر شاہ صاحب
 سے بیعت رکھتے تھے۔ طب جفر و نجوم وغیرہ سے بھی واقف تھے۔ نہایت ذکی و طباع مکتبی اور
 جفاکش تھے۔ اسی وجہ سے اپنے ماصروں میں جس طرح اپنی وضعِ داری اور سادگی
 کی وجہ سے مشہور تھے اسی طرح اپنے علم و فضل اور کمال و قابلیت میں بھی اُن سے ممتاز تھے۔
 شعر و سخن کا شوق بچپن ہی میں پیدا ہو گیا تھا اس فن میں آپ کو منشی مظفر علی اسیر
 سے تلمذ تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ اپنی ہمہ دانی اور طبیعت کی روانی سے اپنے استاد سے بھی
 بڑھ گئے۔ ان کے وقت میں تمام فضائے لکھنؤ شاعری سے بھری ہوئی تھی۔ شاگردانِ آتش
 و ناسخ کے مناقشے روزِ مرہ کے مشاعرے جس میں شہر کے اساتذہ مثل صبا و خلیل و زبد
 و تحفہ وغیرہ کے شرکت کرتے تھے، رات کے زورِ دشوار اور انیس دوسرے کے معرکے
 غرض کہ ان تمام چیزوں نے ہونہار شاعر کی منجلی طبیعت پر بہت بڑا اثر ڈالا جس کا نتیجہ یہ
 ہوا کہ تھوڑے ہی دنوں کی محنت و جانِ نکاحی میں ایسی ششِ سخن ہم ہو پچائی اور اتنی شہرت
 حاصل کی کہ ۱۸۵۲ء میں ان کے اشعار کا تذکرہ سلطان عالم و امجد علی شاہ کے دربار
 میں ہوا اور اُن کو بلا کر اُن کا کلام سنا گیا اور حسبِ حکمِ سلطانی دو کتابیں "ارشاد السلطان"
 اور "ہدایت السلطان" انھوں نے تصنیف کیں جن کے صلہ میں خلعتِ فاخرہ اور انعام
 عطا ہوا۔ اُسی وقت سے اُن کی شہرت کا زمانہ شروع ہوا جو برابر ترقی کرتا گیا۔ مگر الحاقِ
 اودھ اور ندر کی وجہ سے شعرائے دربار کے تمام حوصلے پست ہو گئے اور وہ ادھر ادھر
 منتشر ہو گئے۔ بعدِ غدر امیر نے دوستوں کے کہنے سے سرکاری ملازمت کرنے کا ارادہ
 کیا تھا مگر جب عہدہ صدر امینی کے واسطے صاحبِ بیع کو درخواست دینے کے متعلق اُن سے
 کہا گیا تو اُن کو یہ بات ابھی نہ معلوم ہوئی اور ملازمت کا خیال ہی ترک کر دیا۔ تھوڑے روز
 کی بیکاری اور خانہ نشینی کے بعد فردوس مکانِ نواب یوسف علی خاں والی ریاست رامپور

نے اُن کو طلب کیا جو شعرا اے لکھنؤ دہلی کے اُس وقت بڑے سرپرست تھے۔ نواب موصوف کے انتقال کے بعد خلدیشاں نواب کلب علی خاں بہادر کا عہد حکومت آیا جس میں اردو شاعری کو ادب بھی فروغ ہوا۔ ان سخن فہم اور رتبہ شناس رئیس نے ہونڈہ ڈھونڈ کر تمام ہندستان کے نامی و گرامی شعرا ادبا کا ہاں کو بلا کر اپنے دامن دولت کے سایے میں لے لیا تھا۔ غرض کہ یہ زمانہ یعنی ایسر کے قیام راپور کا زمانہ ان کی شاعری اور اقبال دونوں کے عروج کا زمانہ تھا۔ اسی میں ان کو نواب کی اُتادی کا فخر حاصل ہوا۔ رام پور میں ان کو بڑی عزت حاصل تھی اور وہ ایک بڑی ادبی اور سوشل اُستی سمجھے جاتے تھے۔ تنخواہ بھی محقول تھی جس کی وجہ سے بڑے بڑے سے آزادانہ زندگی بسر کرتے اور شعر و شاعری اور تصنیف تالیف میں مشغول رہتے تھے غرض کہ ۴۳ برس رام پور میں نہایت عزت و آبرو سے بسر کر کے جس میں اکثر مرتبہ لکھنؤ بھی آنا ہوا تھا۔ بالآخر حیدر آباد کو روانہ ہوئے وہاں جانے کی تقریب اس طرح ہوئی کہ سنہ ۱۹ء میں جب نظام حیدر آباد کلکتہ سے واپس آ رہے تھے تو رانس میں بنارس میں ٹھہرے ایسر نے ایک قصیدہ اُن کی تعریف میں کہہ کر بمقام بنارس اُن کی حضور میں پیش کیا تھا حضور نظام کو وہ بہت پسند آیا اور ایسر سے حیدر آباد آنے کی فرمائش کی چنانچہ سنہ ۱۹ء میں وہ عازم حیدر آباد ہوئے۔ یہاں تھوڑے دن قیام کیا تھا کہ بیمار ہوئے اور تھوڑے برس دس مہینے کی عمر میں اس دار فانی سے رحلت کی و علالت کے زمانہ میں داغ اور پنڈت رتن ناتھ سرشار اُن کی عیادت کو جاتے تھے اور ہمارے سر کشن پرشاد بھی اکثر مقدم رنجہ فرماتے تھے جیسا کہ منشی صاحب کی اس رباعی سے ظاہر ہوتا ہے۔

رباعی

رشکِ دم عیسیٰ ہے دمِ سرد مرا
درماں مرے حق میں ہو گیا درما

بے آپ کا اخلاق جو ہمدرد مرا
فرماتے ہیں ہر روز عیادت میری

دارغ نے وفات کی تاریخ لکھی۔

جو مراہم فن تھا میرا ہم صغیر
یہ سفر تھا اُس مسافر کا اخیر
کیا لکھوں تفصیل امراض کثیر
مولود آزار و اسہال و زخیر
در حقیقت باطناً پایا فقیر
شاعری میں خاص تلمیذ امیر

وائے دیلا چل بادیاسے وہ
مصطفیٰ آباد سے آیا دکن
کہا کہوں کیا کیا ہوئیں بیماریاں
بتلائے حدت صفاد تپ
گو بظاہر تھا امیر احمد لقب
شاہ مینا سے ہے نسلی سلسلہ

ہے دعا بھی دارغ کی تاریخ بھی
نصر عالی پائیے جنت میں امیر

تصانیف | امیر بہت پر گو شاعر تھے اُن کی بعض نشر کی کتابیں اور ایک اُردو دیوان
موسوم بہ "غیرت بہارستان" بنا جاتا ہے کہ زمانہ غدر میں تلف ہو گئے پھر دوسری آفت
یہ آئی کہ ۱۸۹۵ء میں اُن کے مکان میں آگ لگ گئی جس میں انکی اکثر تصانیف اور قیمتی
کتابیں جل کر خاک ہو گئیں۔ موجودہ تصانیف میں جن کی فہرست ذیل میں دی جاتی ہے
اُن کے دو دیوان عاشقانہ یعنی "مرآۃ الغیب" اور "صنم خانہ عشق" اور ایک نعتیہ اشعار
میں موسوم بہ "محامد خاتم النبیین" اور نیز "امیر اللغات" نہایت قابل قدر اور مشہور
معروف تصانیف ہیں۔ اُن کی تصانیف ترتیب وار حسب ذیل ہیں:

(۱) ارشاد السلطان - (۲) ایت السلطان - (۳) غیرت بہارستان

اس میں وہ غزلیں ہیں جو قبل غدر مشاعروں میں پڑھی تھیں۔ نیز چند قصائد و درود
واجد علی شاہ۔ یہ کلام غدر میں تلف ہو گیا۔

(۴) نور تجلی - (۵) ابرکرم۔ یہ دونوں شہزاد بھی غدر سے پہلے لکھنؤ میں لکھی
تھیں۔ (۶) ذکر شاہ انبیا بصورت سندس مولود شریف ہے۔

- (۷) صبح ازل آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت کے بیان میں۔
- (۸) شام اید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بیان میں۔
- (۹) بیلہ القدر معراج کے حال میں (۱۰) مجموعہ داسوخت۔ چھ داسوختوں کا مجموعہ جن کے تاریخی نام حسب ذیل اور سند تصنیف ۱۲۸۵ھ ہے۔ یعنی "بانگ اضطرار" "داسوخت اردو" "دشکایات رنجش" "صغیر آفتاب" "حد اغیار" "غبار طبع" اس میں کو ایک حمد و بیاض کے ساتھ مینائے سخن کے نام سے دائرہ ادبیہ لکھنؤ نے چھاپا ہے (۱۱) محمد خاتم النبیین۔ مؤلفہ ۱۲۸۹ھ۔ فہرستہ دیوان ہے (۱۲) انتخاب یادگار۔ رام پور کے شعراء اردو کا تذکرہ ہے جو اب کلب علی خاں بہادر کے حکم سے ۱۲۹۵ھ میں لکھا تھا جیسا کہ تاریخی نام سے ظاہر ہوتا ہے (۱۳) خیابان آفرینش نشر میں مولود بشریف ہے (۱۴) مرآۃ الغیب۔ اردو غزلوں اور قصائد کا پہلا دیوان ہے (۱۵) صنم خاتون مطبوعہ ۱۳۱۳ھ (۱۶) گوہر انتخاب مؤلفہ ۱۳۱۳ھ یہ دونوں میر تقی میر اور خواجہ میر درد کے رنگ میں کچھ غزلیں لکھی گئی ہیں۔ (۱۸) قیسر دیوان جو ہنوز غیر مطبوع ہے۔ اس میں چند قصائد اور رباعیات شامل ہیں (۱۹) سرسبز بصیرت جو ایسے عربی و فارسی الفاظ کی ایک فرہنگ ہے جو اردو میں غلط استعمال ہوئے ہیں اس میں ان کا صحیح طریقہ استعمال مع اسناد کے بتایا ہے (۲۰) بہادر ہند۔ ایک مختصر لغت اردو محاورات و الفاظ کی جس کو امیر اللغات کا نقش اول لکھا چاہئے۔ (۲۱) امیر اللغات جس کو منشی صاحب کاسب سے بڑا کارنامہ سمجھنا چاہیے مگر فردوس ہے کہ وہ ناتمام رہ گئی صرف دو جلدیں الف ممدودہ اور الف مقصورہ کی اب تک تیار ہوئی ہیں۔ اس کتاب میں قابل مصنف کے تبحر اور محبت اور نیز ان کی بے حد کد کاوش اور محنت و جان کا ہی کاپرہ چلتا ہے۔ اس کی دو جلدیں چھپ گئی ہیں تیسری بھی تیار تھی مگر شائع نہ ہو سکی۔ ابتدا آٹھ جلدوں میں اس کے

نکالنے کا ارادہ تھا۔ نواب کلب علی خان بہادر کے عہد میں شریع ہوئی تھی اور اس کے
 بڑے سرپرست ہنر آفریں سر الفرو لائل لکھنؤ گورنر ممالک متحدہ تھے جنرل عظیم الدین
 خاں نائب پریسڈنٹ کونسل آف انڈیا کیسی رامپور نے بھی اس کی سرپرستی کی تھی منشی صاحب
 نے اپنے خطوط میں اس کتاب کا اکثر ذکر کیا ہے (۲۲) خطوط اور متفرق چیزیں نظم و نثر
 میں منشی صاحب کے شاگرد اور دوست بہت کثرت سے تھے اور منشی صاحب کو خط
 لکھنے کا بہت شوق تھا لہذا ان کا مجموعہ خطوط بہت دلچسپ ہے اس کو ان کے شاگرد
 رشید مولوی احسن اللہ خاں ثاقب نے ایک نہایت مفید اور دلچسپ دیباچہ کے ساتھ شائع
 کیا ہے ان خطوط سے منشی صاحب کے عادات و اطوار اور کیر کڑ پر بہت کافی روشنی پڑتی ہے
 اور اگر کوئی لکھنا چاہے تو ان کی سوانح عمری کا بہت عمدہ مواد ان سے فراہم ہو سکتا ہے نیز
 ان میں فن نظم اور زبان کے متعلق اکثر مشکل مسائل کو حل کیا ہے "رسالہ اسرار نظم اور
 "زاد الامیر" اور مناجات وغیرہ کو ان کے متفرق تصانیف میں سمجھنا چاہیے۔

شاگرد | منشی صاحب کے سیکڑوں شاگرد تھے جن میں سے چند کے نام یہ ہیں: ناظم
 نواب صفد جاہ جلیل ریاض برہم زابد کوثر خیر آبادی و سیم حیراں حسن کاکوروی
 عابد رضا دل بزار ثاقب اصغر مصطر سرشار حفیظ جوئیوری آہ اختر
 قرآن میں ریاض جلیل مصطر اور حفیظ بہت مشہور ہیں۔

آئینہ شاعری | آئینہ صرف ایک طباع شاعر بلکہ ایک متبحر عالم بھی تھے۔ اور ادبی دنیا
 میں ان کی شہرت انھیں دونوں باتوں پر مبنی ہے۔ ان کا پہلا مطبوعہ دیوان مرآۃ الغیب
 کسی قدر ناہموار ہے کیونکہ ابتدائی کلام کے ساتھ جو بھٹا اور بے مزہ ہے بعد کی غزلیں
 جن سے مشاقی اور بختگی معلوم ہوتی ہے ملی جلی ہیں ان کے ابتدائی کلام میں وہ سب عیوب
 موجود ہیں جو ناسخ کے رنگ کے لئے مخصوص ہیں۔ یعنی جاوے جا رعایت لفظی تبدل
 رکیک اور بدنام تشبیہیں۔ عورتوں کا لباس اور سامان زینت مثلاً انگلیں کرتی اور

نگہمی جوئی وغیرہ غرضکہ اس میں کوئی چیز نئی اور کھل نہیں ہے بلکہ وہی پرانے فرسودہ مضامین ہیں جو الٹ پلٹ کر رنگین عبارت میں بیان کئے گئے ہیں۔ البتہ اُن کا دوسرا دیوان "حسنیہ عاشق" اُن کے بڑے حریف اور معاصر داغ کے طرز پر ہے اور اس میں اعلیٰ تخیل سلاست روانی اور دلکش عاشقانہ ترکیبیں بکثرت موجود ہیں۔ اُن کے لغتہ اشعار گو کہ قدیمی مقررہ طرز میں ہیں مگر اکثر اعلیٰ تخیل فصاحت و بلاغت اور جوش اعتقاد کے بہترین نمونے ہیں غرضکہ منشی صاحب کو مختلف اصناف سخن غزل قصیدہ لہائی محسن مہذس وغیرہ پر عبور تام حاصل ہے۔ اُن کا کلام اعلیٰ خیالات فصاحت و بلاغت روانی و سلاست روانی الفاظ اور ایجاز کے لئے مشہور ہے حضور و انداد ضائع بدائع لفظی کی کثرت سے اُن کا کلام پاک ہے۔ ان کے اشعار میں شگفتگی نزاکت خیال بلند پروازی شیرینی زور اور قادر الکلامی بدرجہ احسن موجود ہے تصوف کی چاشنی بھی کہیں کہیں جلوہ گر ہے جو مشرقی شاعری کی جان اور ادب موزی کی خاص پہچان ہے۔ اس قسم کے خیالات کسی ایک شاعر کی ملک خاص نہیں ہوتے بلکہ مختلف لوگوں کے کلام میں برتبدیل الفاظ پائے جاتے ہیں۔

اخلاق و عادات | منشی صاحب ایک پیکر متانت اور عجم تہذیب تھے شرم و حیا ان کے اخلاق کا خاص جوہر تھی۔ طبیعت نہایت عمت والی پائی تھی۔ راستبازی بہر دی سے بھرے ہوئے نہایت متقی و پرہیزگار اور سادہ مزاج واقع ہوئے تھے کبھی کسی لفظ فحش سے زبان کو آلودہ نہیں کیا اور نہ کسی کی جو لکھی سچے پاک باز۔ صوفی مشرب احکام قرآنی کے پورے عامل تھے اسی وجہ سے اُن کے تقدس اور بے ریاکی کی شہرت لوگوں میں اُسی قدر تھی جس طرح اُن کے علم و فضل اور کمالات شاعری کی مزاج میں انکار اور تواضع اس قدر تھی کہ اپنے معاصر حریفوں علی الخصوص داغ سے کبھی مباحثہ کی کوشش نہیں کی بلکہ تمام اپنے ہم عصروں سے نہایت خلوص اور محبت کا برتاؤ رکھتے تھے

ادبی مسائل کا جو اُن سے پوچھے جاتے تھے نہایت آزادی سے جواب دیتے تھے۔ اور کسی شخص یا جماعت کی پاسداری کبھی نہیں کرتے تھے اپنے بعد چار بیٹے چھوڑے۔ قرآن و ضمیر۔ آخر جو خدمات زبان کی منشی صاحب نے انجام دیں اُن کا ذکر ہم امیر اللغات کے سلسلہ میں اوپر کر آئے ہیں۔ منشی صاحب ایک بہت قابل اور طبائع شاعر تھے اور اُن کے اکثر اشعار و زبان زد خلقات ہیں۔ اُن کا مرتبہ شعرائے اردو میں بہت بلند ہے۔ چند اشعار بطور نمونہ چند اشعار بطور نمونہ یہاں لکھے جاتے ہیں۔

قریب ہے یار روز عشر چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر

جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

(اس شعر کو مسٹر جسٹس محمود نے اپنا ایک فیصلے میں بطور سند کے لکھا تھا)

اے روح کیا بدن میں پڑی ہے بدن کو چھوڑ

میں لا بہت ہوا ہے اب اس پسین کو چھوڑ

ترپھی ذرا ہوائی تو ہیں شمشیر کے خواص
دیکھو تو بے قرار ی خنجر کے خواص
کچھ سیراز کے مجھ میں ہیں کچھ میر کے خواص
وگرنہ ربط کی اُس سے ہزارا میں تھیں
مرے دونوں پہلوؤں میں دل بیقرار ہوتا
وہی تیرے کھوں نہ مارا جو جگر کے پار ہوتا
سب ترپنے تلکھانے کا مزا جاتا رہا
جانے دو اک بے وفا جاتا رہا جاتا رہا
بندے اگر قصور نہ کرتے قصور تھا
آنکھوں کا کچھ گناہ نہ دلی کا قصور تھا

سیدھی نگاہ میں ہیں تیری تیر کے خواص
ترکش میں تیر میان میں شمشیر بے قرار
کتاب ہے شعر سن کے کوئی واہ کوئی آہ
کیا یہ شوق نے اندھا بھنے سو بھلا کچھ
وہ مزا دیا ترپ نے کہ یہ آرزو ہے یارب
جو نگاہ کی تھی ظالم تو پھر آنکھ کیوں چرائی
ایک دل ہم دم مرے پہلو سے کیا جاتا رہا
کھو گیا دل کھو گیا رہتا تو کیا ہوتا امیر
موقوف جرم ہی یہ کرم کا ظہور تھا
صورت تیری دکھا کے کہوں گا یہ درجہ تر

کیا کرتے تھے اپنی جستجو ہم

ملا جب وہ کھلا تب یہ سما

جدا ہے وقت رز کا نام ہر صحبت میں اے ساقی
پیری ہے میکشوں میں خود ہے پرہیزگاروں میں

ملا کر خاک میں بھی ہمارے شرم ان کی نہیں جاتی
نگہ نیچی کئے وہ سامنے مدفن کے بیٹھے ہیں

نیم جاں کر کے مجھے سر پہ کھڑے ہیں چپکے
آفت میں برابر ہے وفا ہو کہ جفا ہو
اے جو مری لاش پہ وہ طنز سے بولے
ہاتھ اٹھاتے بھی نہیں ہاتھ لگاتے بھی نہیں

انکھیں کھولیں بھی بند بھی کیں
اب ہم ہیں خفا تم سے کہ تم ہم سے غفا ہو
وہ شکل نہ سامنے سے سر کی

کیا تنگ ہے جلا دمری سختی جاں سے
وائے قسمت جو سب کی سنتا ہے
باقی ہے امیر اب تو فقط جان کا جانا
خودی سے خودی میں جو شوق حق پرتی ہے
بڑھ اے آہ رسا ب کنگرے پر عرش کچھنی
زنگبر اے دل و اماندہ اب منزل قریب آئی
نشاخ گل ہی ادنیٰ ہے نہ دیو اور جن بلبل
وصل ہو جائے یہیں حشر میں کیا رکھا ہے
ہم چلے دیر سے کعبہ کو تو وہ بت بولا
انگلیں تھی یہ سے پانی کی چار بونریں
خود ترے ہونٹ یہ کہتے ہیں کہ بورے کلو
مجھ سے مانگوں میں تبھی کو کہ بھی کچھ مل جائے
ہر وار پہ کہتا ہے کہ ظالم کہیں مر بھی
وہ بھی عاشق کی التجا نہ سنے
ہوش و خرد و تاب و توان چلے کب کے
جسے تو فریست سمجھا ہے اے غافل عہدی ہے
بلندی کو بلندی جانا ہمت کی پستی ہے
اسی پستی آگے اور آباد ایک پستی ہے
تری ہمت کی کوتاہی تری قسمت کی پستی ہے
آج کی بات کو کیوں کل پہ اٹھا رکھا ہے
جا کے لے لیجے کعبہ میں خدا رکھا ہے
جس دن سے پہنچ گئی ہے تلوار ہو گئی ہے
اور معشوقوں کی ہوتی ہے نزاکت کسی
تو سوالوں سے ہی ایک سوال اچھا ہے

نہ چوک دقت کو پا کر کہ ہے یہ دہشت

کبھی امید نہیں جس سے جا کے آنے کی

داغ دہلوی ۱۲۸۷ء نواب مرزا خاں داغ ۱۲۸۳ء مطابق ۱۲۴۲ء ہجری میں دلی میں
 لغات ۱۹۰۵ء پیدا ہوئے۔ ان کے والد نواب شمس الدین خاں، نواب ضیاء الدین
 خاں دالی لوہارو کے بھائی تھے۔ ان کا انتقال ۱۲۵۲ء میں ہوا جبکہ داغ تقریباً
 چھ سات برس کے ہوں گے۔ دادا کا نام نواب احمد حسین خاں تھا والد کے انتقال
 کے بعد داغ کی ماں نے مرزا محمد سلطان عرف مرزا فخر بہادر خلع بہادر شاہ کے ساتھ
 نکاح کر لیا اور شوکت محل کا خطاب پایا۔ ماں کے ساتھ یہ بھی لال قلعہ پہنچے جہاں اسکی
 تعلیم و تربیت ہوئی۔ قلعہ میں شعر و سخن کا چرچا بہت تھا، داغ کی پختلی طبیعت پر اپنے
 گرد و پیش کا بڑا اثر ہوا اور یہ بھی شاعری کی مقناطیسی قوت کے اثر سے متاثر ہو گئے
 چونکہ بادشاہ اور مرزا فخر و دونوں ذوق کے شاگرد تھے یہ بھی امتداد ذوق کے شاگرد ہو گئے اور
 ان کے ساتھ مشاعروں میں جاتے اور داد سخن لیتے رہے۔ ابتدا میں فارسی اور عربی کی تعلیم
 بھی کچھ حاصل کی تھی چنانچہ فارسی مولوی غیاث الدین مولف غیاث اللغات اور مولوی
 احمد حسین صاحب سے پڑھتے تھے۔ خوشنویسی شہسواری۔ بانک پٹے وغیرہ کا بھی بہت
 شوق تھا۔ اور یہ فنون انھوں نے باقاعدہ استادوں سے حاصل کئے تھے شعر کا شوق انکو جلتی
 تھا اور طبیعت چونکہ مناسب پائی تھی۔ اس لئے ٹھوڑے ہی دنوں کی مشق سے سچے کار شاعر ہو گئے
 ۱۲۸۷ء میں مرزا فخر نے وفات پائی۔ مرتبی باب کا مرزا ان کے واسطے کیا کم مصیبت تھی کہ
 دوسرے ہی سال یعنی ۱۲۸۸ء کے عالم آشوب ہنگامے نے ان کے رہے سے حواس اور
 کھو دیے اور وہ بھی ہزاروں لاکھوں آدمیوں کی طرح دلی چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ جب کسی قدر
 ہنگامہ فرو ہو اتوں اہل خاندان کے رام پور آئے جہاں نواب یوسف علی خاں بہادر جو
 ان کو پیشتر سے جانتے تھے اُس وقت سربراہانے حکومت تھی۔ داغ پہلی مرتبہ دلیہد
 ریاست نواب کلب علی خاں بہادر کے مصاحب مقرر ہوئے اور داروغہ اصطبل کی خدمت

ان کے سپرد ہوئی۔ اس خدمت کو انھوں نے نہایت قابلیت اور محنت کے ساتھ انجام دیا تھا اور اس وقت سے ان کو گھوڑوں سے اور سواری سے دلچسپی ہو گئی تھی داغ نے اپنی عمر کے ۲۴ سال نواب کلب علی خاں بہادر کی ملازمت میں رام پور میں گزارے جہاں یہ نہایت عزت و آبرو عیش و آرام سے زندگی بسر کرتے تھے۔ رام پور میں ان کو اس قدر آرام تھا کہ اُس کو آرام پور کہتے تھے نواب کی ہر ایسی چیز و زیارت سے بھی مشرف ہوتے تھے انھوں نے دلی، لکھنؤ، پٹنہ اور کلکتہ کا بھی سفر کیا۔ جہاں ان کی بڑی قدر ہوئی اور ان کے واسطے مشاعرے منعقد کئے گئے۔ کلکتہ میں تین چار ماہ قیام کیا اور وہاں کے مشاعرے میں لبر شرکت کی۔ اپنے قیام کلکتہ کا ذکر انھوں نے اپنی شہنوی "فریاد داغ" میں کیا ہے ۱۸۸۶ء میں نواب کلب علی خاں کی بے ہنگام موت سے ان کی تمام آرزوؤں اور امیدوں پر پانی پھر گیا ان کو بھی بعض اور لوگوں کی طرح جن کو اس مصیبت عظمیٰ سے نقصان پہنچا تھا۔ رام پور چھوڑنا پڑا چنانچہ وہ دلی چلے گئے اور وہاں کچھ دن قیام کر کے نکلے اور راستے میں مختلف مقامات کی سیر کرتے ہوئے ۱۸۸۷ء مطابق ۱۳۰۵ھ میں حیدر آباد پہنچے۔ راستے میں لاہور، امرتسر، کٹن کوٹ، آگرہ، علی گڑھ، متھرا، بے پور اور ریاست منگروں واقع کاٹھیاوا میں ٹھہرتے ہوئے اور تھوڑے تھوڑے دن قیام کرتے ہوئے گئے تھے اور ان سب مقامات میں سیوں آدمی ان کے شاگرد ہوئے پہلی مرتبہ اعلیٰ حضرت حضور نظام سے توسط راجہ گروہاری پرشاد متخلص بہ باقی ملاقات ہوئی تھی مگر چونکہ کوئی صورت حسب مراد اُس وقت نہیں نکلی لہذا دلی ایسے آئے مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ۱۳۰۷ھ میں سر آسماں جاہ بہادر کی طلبی اور حکم سے پھر حیدر آباد گئے اور اب کی مرتبہ قسمت نے یادری کی اعلیٰ حضرت (میر محبوب علی خاں) کے استاد مقرر ہوئے اور ہمیشہ قرار تنخواہ اور انعام و اکرام کے علاوہ مقرب السلطان بلبل بہندوستان جہاں استاد ناظم پار جنگ دبیر الدولہ فصیح الملک کا معزز خطاب نہایت ہوا۔ ظاہر ہے کہ ایسی عزت افزائی کے بعد داغ کی عمر حیدر آباد میں نہایت

کامیابی اور خوشی و خرمی سے گزرنے لگی۔ اُن کی خواہ پہلے ساڑھے چار سو روپیہ ماہوار مقرر ہوئے تھے مگر چند روز کے بعد ایک ہزار اور پھر پندرہ سو روپیہ ماہوار مقرر ہو گئے، جو بیش بہا صلے اور انعام و اکرام تقریموں کے موقع پر یا تصادم غیرہ کے صلے میں ملتے تھے۔ وہ اس کے علاوہ تھے حیدر آباد میں داغ کو دنیاوی ثروت کا جس قدر عروج حاصل ہوا، ہمارا حیا میں کسی اور دشاغر کی کسی رئیس کے دربار میں نہ اس قدر عزت اور قدر و منزلت کیگی اور نہ اتنی بیش قرار خواہد کسی کو ملی ہوگی۔ یہ ترقی ایسی نہ تھی کہ جو حاسدوں کی آنکھوں میں نہ کھٹکتی چند لوگوں نے اعتراضات کرنا شروع کئے۔ ان میں ایک ڈاکٹر مائل حیدر آبادی بھی تھے۔ تھوڑے مقابلے کے بعد مخالفین کے منہ بند ہو گئے داغ تقریباً اٹھادھ برس حیدر آباد میں رہے جہاں حضور نظام سے لے کر تمام اماردار و سائن کی عزت کرتے تھے اُن کی وجہ سے بازارِ شاعری جو شاہ نصیر کی وفات کے بعد کسی قدر سرد پڑ گیا تھا، پھر گرم ہو گیا۔ سیکڑوں شاگرد اُن کے حیدر آباد میں ہو گئے اور مشاعرے کثرت سے ہونے لگے۔ داغ کے فروغ اور ترقی کی ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ریاست کے یاسات سے بالکل الگ رہے اور نہ کسی پارٹی یا جماعت کی سازشوں میں کبھی شریک ہوئے۔ اسی وجہ سے وہاں بہت ہرول و عزیمت اور نہایت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اُن کے آخری زمانہ قیام حیدر آباد میں امیر مینائی بھی رام پور سے آگئے تھے۔ اودان ہی کے ساتھ رہتے تھے مگر قبل اس کے کہ حضور نظام کی حضوری حاصل ہو انتقال کر گئے۔ داغ بجا رضہ فارغ ۱۹۰۵ء میں حیدر آباد میں مرے اور وہیں دفن ہوئے۔

عام عادات و اخلاق | نواب مرزا خاں داغ خوش طبع رنگین مزاج بذلہ سنج اور
 مبشاش بشاش تھے مزاج میں خود اسی نمی خوشامد اور تملی سے دور رہتے تھے۔
 کثیر الاحباب تھے اور اپنے نمب احباب کے ساتھ نہایت شفقت و محبت سے پیش آتے
 تھے اپنے معاصرین مثلاً جلال امیر، شمس الدین، غلام وغیرہ سے اُن کے تعلقات بہت مخلصانہ اور

دورانہ تھے۔ رقابت پیشہ کی وجہ سے کبھی دوستی اور ملاقات میں فرق نہیں آیا۔ انھوں نے کبھی کسی کی ہجو نہیں کہی اور نہ کبھی اپنے مخالفین اور معترضین سے لڑے جھگڑے البتہ معاصروں سے کبھی کبھی شاعرانہ نزاکت جھوک رہتی تھی۔ بڑے رسا اور اسرار دار لکھ ترقی سے واقف تھے اور یہی طبری وجہ دہ بار نظامت میں ان کی ترقی کی تھی۔

دآغ کی شاعری | دآغ اپنے زمانے کے بہت مشہور شاعر تھے۔ ان کی زبان میں فصاحت و سادگی اور بیان میں ایک خاص قسم کی شوخی اور باتکپن ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے معاصرین امیر، جلال، تسلیم وغیرہ سے زیادہ مشہور ہوئے۔ ان کا طرزِ عام پسند اور بہت دلچسپ ہے۔ اسی وجہ سے ان کے متبعین کثرت سے ہیں۔ مشہور ہے کہ ان کے شاگردوں کی تعداد پندرہ سو سے متجاوز ہے۔ یہی شہرت و حرمت اور شاگردوں کی کثرت ان کے جوہر ذاتی اور شاعرانہ قابلیت پر دال ہے۔ دآغ نے ایک باضابطہ دفتر کھول دیا تھا۔ جس کے کارکن بعض ان کے شاگرد اور اکثر تنخواہ دار فشی بھی تھے۔ اس دفتر میں مہلار کلام کا کام جاری تھا۔

تصانیف اچانک دیوان ان سے یادگار ہیں۔ گلزارِ دآغ۔ آفتابِ دآغ۔ ہشتابِ دآغ یادگار دآغ۔ آخر الذکر یعنی یادگار دآغ کا ایک ضمیمہ بھی ہے اور یہ ضمیمہ اور اصل دیوان دونوں ان کی وفات کے بعد شائع ہوئے تھے۔ ایک مثنوی موصوم بہ زیاد دآغ بھی لکھی ہے ان کے علاوہ چند تصانیف حضور نظام اور نواب صاحب رامپور کی تعریف میں ایک پرجوش شہر آشوب دلی کی تباہی پڑا اور چند قطعات و رباعیات بھی ان سے یادگار ہیں۔ گلزارِ دآغ اور آفتابِ دآغ دونوں رامپور میں چھپے تھے اور ان میں زیادہ تر وہ غزلیں ہیں جو رامپور کے مشاعروں میں امیر مینائی اور تسلیم و جلال وغیرہ ملک ہم طرحی میں کہی گئی ہیں۔ اس زمانہ کے کلام میں ان کی بے انتہا شائق اور نیریز مثنوی مختصر جہاں نشانی معلوم ہوتی ہے۔ ہشتابِ دآغ اور یادگار دآغ دکن کی تصنیف ہیں ان میں

بھی کلام کی روانی اور فصاحت جو ان کا خاص انداز ہے، خاص طور پر قابل تعریف ہے
 گلزارِ داغِ جوانی کی تصنیف ہے جب جذباتِ عشق و محبت محض خیالی نہ تھے بلکہ ذاتی تجربہ
 کا آئینہ تھے آفتابِ داغ بھی اسی زمانہ سے تعلق رکھتا ہے جیسے ادواتِ قلب اور جذبات
 حقیقی کی اصلی تصویریں شاندار الفاظ میں کھینچی گئی ہیں مگر برخلاف ان کے مہتابِ داغ اس
 زمانہ کی تصنیف ہے جبکہ حرارتِ عشق و جوانی دھیمی اور ہلکی ہو کر ضیائے ماہتاب کے مانند
 نہایت خوشگوار ہو گئی ہے اور شباب کی دلولہ انگلیوں اور ہنگامہ آریاں خصوصیت ہو کر ان کی جگہ
 کہولت کی پختہ کاری اور سکون و اطمینان نے لے لی ہے مثنوی فریادِ داغ میں اپنے
 عشق کا حال جو کلکتے کی ایک مشہور رنڈی مٹی پائی سجات کے ساتھ اُن کو تھا اور رح و رح و رح
 کامیلہ بے نظیر و یکھن کی غرض سے آئی تھی ایک شاعرانہ رنگ میں بیان کیا ہے اس
 مثنوی کے بہت سے اشعار نہایت اعلیٰ درجہ کے ہیں اور سادگی اور روانی و عمدگی اُن
 کی قابلِ داد ہے علی الخصوص عاشق کا معشوق کی تصویر سے مخاطب نہایت دلکش انداز
 میں بیان کیا گیا ہے مگر بعض جگہ تعیش اور خراب جذبات کی تصویریں متانت اور تہذیب
 سے گری ہوئی ہیں قصائد میں اُن کا مرتبہ بہت کم ہے یعنی سدا اور دوق وغیرہ سے تو کوئی
 نسبت ہی نہیں بہاؤ سے نزدیک اُمیرِ مینائی کے قصائد کو بھی وہ نہیں پہنچتے ان میں کسی
 طرح کے بلند مضامین اور اعلیٰ تخیل نہیں ہیں غزل گوئی کا رنگ اُن پر غالب ہے
 اور اکثر اشعار قصیدے کے نہیں بلکہ غزل کے معلوم ہوتے ہیں اور مقررہ قواعد قصیدہ گوئی
 کے منافی ہیں تشبیہ و استعارے میں بھی کسی قسم کی جدت نہیں پائی جاتی اور ان میں بھی ہر
 عاشقانہ رنگ جھلکتا ہے اُن کی رباعیات کا بھی یہی حال ہے یعنی بجائے ادبِ اخلاق
 وغیرہ سکھانے کے اُن کے مضامین زیادہ تر عاشقانہ ہی ہیں البتہ تاریکیں بہت اچھی اور
 استادانہ کہی ہیں۔

طرزِ کلام | داغ کی عظمت ان تین چیزوں پر موقوف ہے یعنی (۱) ان کی شہرت عام

(۲۸) اُن کا طرز خاص (۳) وہ خدمات جو انھوں نے زبان کے ساتھ انجام دی ہیں دماغ
میٹھی میٹھریلی اور عاشقانہ شاعری کے مسلم الثبوت استاد ہیں۔ اُن کی سب سے بڑی خصوصیت
یہ ہے کہ سچیدہ اور گنگولک ترکیبوں اور موٹے موٹے غیر مانوس قاری اور عربی الفاظ کو انھوں
نے اپنے کلام میں جگہ نہیں دی اسی سے ان کا کلام فصیح اور تکلف سے خالی ہے الفاظ
نہایت سادہ اور معمولی ترکیبیں سیدی سادی اور درست۔ بندش نہایت چست شعری
ظاہری زیب و زینت یعنی سنانجہ بدارنگ کی کثرت اور درواز کار تشبیہوں اور مبالغہ آور
مستوز وائد سے بھی اُن کا کلام پاک ہے اشعار بالکل نئے تھے زور دار مقرر ہوتے ہیں
کلام میں زندگی اور جو پچالی پائی جاتی ہے ان کا کلام مختلف مضامین سے ملو اور غزل کے
جس قدر موضوع ہیں اُن سب پر حاوی ہوتا ہے کہیں مثنوی حاضر جوابی۔ کہیں ظریفانہ
بزلہ لہجہ، کہیں کسی، اعجاز پر چوڑی کی ہے کہیں کسی زاہد کی داڑھی کھسٹی ہے کسی جگہ مبالغہ اندی
میں نیاز عاشقانہ اور ناز مستوقانہ کے بے مثل مرتفع کھینچے ہیں کسی مقام پر پھر کی ہر مال نصیبی
کا ذکر ہے کسی موقع پر قیوں کی میاں یوں اور سازشوں کا بیان ہے غرض کہ اشعار کسی
نہ کسی جذبہ انسانی کے سچے فوٹی ہیں اور چونکہ ان جذبات کا اظہار نہایت سلیس اور
عام فہم عبارت میں ہوتا ہے اس لئے وہ دلوں پر ہمیشہ تیر و نشتر کا کام دیتے ہیں۔ اُنکے
اکثر اشعار میں جرأت کی معاملہ بندی اور زندگی صفائی ملی جلی ہوتی ہے اور خوبی محاورہ
اور لطافت زبان اس پر طرہ اُن کا رنگ اُن کے زمانے میں اس قدر مقبول ہوا کہ سیکڑوں
پیر و اور ناول اُن کے پیدا ہو گئے یہاں تک کہ اُن کے بڑے حریف مقابل مثنوی امیر احمد
میلانی نے بھی اپنے دوسرے دلوں میں زیادہ تر اُن ہی کا رنگ اختیار کیا۔

کلام پر اعتراض زیادتی شہرت بعض وقت الزام و اعتراض کا باعث ہوتی ہے۔ دماغ
پر یہ بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ ارباب نشاط کے شاعر تھے اور اُن کے اشعار صبح
اور مغرب اخلاق ہوتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ بڑی زیادتی ہے اس وجہ سے کہ اُن کے

سیکڑوں بلکہ ہزاروں شعرا لیے نکلیں گے جن میں خیالات نہایت پاک و صفات اعلیٰ بہت بلند ہیں اُن کی ہر چیز کھوٹی نہیں ہے بلکہ اسی ذرا نمد و کلام میں سونے کے ریزے بھی بہت ہیں مگر اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کے یہاں اصلیت (اور کبلیٹی) اور متانت بہت کم ہے فلسفہ اُن کے کلام میں مطلق نہیں کہ کسی اعلیٰ خیال کی شرح و بسط ہے۔ فلسفہ حیات اور فلسفہ معشوق سے وہ بہت کم تعلق رکھتے ہیں جس عشق کا وہ بیان کرتے ہیں اُس میں بھی کوئی عظمت کوئی سچائی اور حقیقی حسن کی جلوہ گری نہیں ہے۔ اُن کے معشوق اکشر معشوقِ بازاری ہیں جو اپنے حسن اور ناز و انداز کو سرِ راہ لے کر بیٹھتے ہیں جن کا بوس دکنار اور اختلاط مثل اشیا و بازاری کے خرد اور بیجا جاتا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ اُن کے بعض اشعار مذہب کانوں کے سننے کے لائق نہیں ہوتے اور صرف ایسی محفلوں میں گائے جارہے ہیں جہاں نردانِ قدح خوار جمع ہوں اور رباب نشاط کے جھکے ہوں رخصا ہر ہے کہ ایسے اشعار میں عشق و عاشقی کے صرف سطحی جذبات ہوتے ہیں اور ان سے قلب کے اندرونی پردے متاثر نہیں ہوتے اور نہ اُن کے سمجھنے میں جو لائق خیال کا موقع ملتا ہے و آغ کے اشعار صرف اے عشق سے تعلق رکھتے ہیں جس کو خلوص اور روحانیت سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ اُن میں میر کا ایسا دہوداغ ہے نہ غالب کی سی معنی آفرینی و نازک خیالی۔ اُن کی تشبیہات بھی نادر اور عالی نہیں بلکہ وہی معمولی اور پامال تشبیہیں ہیں جن کو سُنتے سُنتے کان تھک گئے ہیں ان میں جہت اور قدرت مطلق نہیں ان کی مثنوی (فریاد و آغ) میں تو ایک معشوقِ بازاری کے عشق کا حال ہے جس میں کوئی بلند آیدیل و مطلق نہیں۔

مگر اب اس ہمہ وہ ایک بلند و تریہ شاعر ضرور ہیں اور اُن کی زبان کے ساتھ اس خدمت کی ضرورت قدر کرنا چاہیے کہ انھوں نے سخت اور مغلط الفاظ ترک کیے اور سیدھے سادے میثوس الفاظ اور محاورے اپنے کلام میں استعمال کیے جس سے کلام کی بے ساختگی اور فصاحت اور بڑھ گئی۔ یہ بھی اُن کا کمال ہے کہ طویل اور مشکل بحر میں سر بیٹے اور میٹھے الفاظ میں لکھیں

پخت اور برجستہ اور نہایت فصیح اور بے تشوہ زوائد اشعار نکالے بغرض کہ ان ہی سب خوبوں کی وجہ سے اور نیز اس وجہ سے کہ ان کو اکثر مشہور و معروف لوگوں کی استادی کا خسر حاصل ہے ان کا مرتبہ شعرائے متاخرین میں بہت بلند ہے۔ تغزل میں دآغ کی شاعری کا اعتراف سب نے کیا ہے۔ حالی لکھتے ہیں ۵

دآغ و مجروح کو سن لو کہ پھر اس گش میں نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانہ ہر گز اقبال نے بھی ایک پر زور مرثیہ ان کی نسبت لکھا ہے۔ ان کے حریف و معاصر امیر یمنی کا صحیح معنوں میں کوئی مد مقابل اگر ہے تو یہی ہیں۔

شاگرد | شاگردوں کی فہرست بہت طر لانی ہے جن میں سے چند نام جو بہت مشہور ہیں یہاں لکھے جاتے ہیں:۔ اعلیٰ حضرت حضور نظام حیدر آباد خلد آشاں یعنی نوب میر محبوب علی خاں متخلص بہ آصف۔ ڈاکٹر مسر محمد اقبال۔ رسائل دہلوی۔ بیخود دہلوی۔ احسن مارہروی۔ بیخود بدایونی۔ نوح ناروی۔ نسیم بھرپوری۔ جگر مراد آبادی۔ آغا شاعر دہلوی وغیرہ۔

امیر و دآغ کا مقابلہ | یہ مقابلہ بھی اسی قبیل سے سمجھنا چاہیے جیسا کہ میر و مرزا کا مقابلہ ان کے حالات میں لکھا گیا ہے۔ امیر اور دآغ دونوں اپنے اپنے رنگ میں مسلم الثبوت استاد مانے گئے ہیں۔ دونوں بزرگوار اپنے زمانے کے بہت بڑے غزّال تھے اور اکثر ہم طرح غزلوں پر طبع آزمائی کرتے تھے۔ دونوں نے ماشا اللہ کثرت شاگرد دیا کئے اور دونوں کا حلقہ اجاب وسیع تھا۔ اخلاق و عادات کے اعتبار سے دونوں وسیع الاخلاق و درست پرست اور علیم الطبع تھے۔ دونوں ذکی الطبع اور ذہین اور شاعری کے دلدادہ تھے۔ دآغ کو امیر پر اس محسنی میں نزیت ہے کہ دنیاوی جاد و جلال اور مرزہ الحالی کے اعتبار سے اپنے آخر زمانہ میں وہ ان سے بڑھ گئے۔ اسی کا نتیجہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ان کو امیر سے زیادہ شہرت بھی حاصل ہوئی دآغ کا کلام مطبوع عام و پند یدہ انام ہے جس طرح اُس سے عالم و فاضل اور شامہ مظلوم ہو سکتے ہیں اُسی طرح اُس کو پڑھ کر یاد دہش سے سن کر ایک عامی بھی اُس سے

لطف اٹھاتا ہے۔ مگر صاحب ذوق جو قوت میزہ سے کام لیتے ہیں اور جن کو داغ کے کھلمی
 اور معمولی اشعار پسند نہیں آتے ان کو ایرسی کا کلام اچھا معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس میں متانت
 تہذیب کے ساتھ بلند خیالی بھی ہے اور وہ ضروریات شعر یہ کہیں پر راکھتا ہے۔ مگر اصل یہ
 جیسا کہ ہم اوپر کہہ آئے ہیں کہ کلام کا فرق دراصل کلیم کا فرق ہے۔ خود شاعر کے مزاج
 ماحول اور افتاد طبیعت کو اس کے کلام میں بڑا دخل ہوتا ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ داغ ایک
 بڑے زندہ دل رند شرب شخص تھے ان کا فرائج پارہ کی خاصیت رکھتا تھا پھر ان کی نشوونما
 دلی کی شاعرانہ فضا میں ہوئی تھی۔ برخلاف اس کے منشی صاحب ایک مولوی منشی تھے
 ماب بزرگ تھے لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور وہیں عرصہ تک رہے۔ دامن سلطنت سے وابستہ
 ہونے کی وجہ سے اس عہد کے شعرائے شاہی سے بھی گاڑھا در تانہ رکھتے تھے
 امیر ان کے آقا طرد برتق، صبا، بحر، قلق وغیرہ ان کے یار تھے۔ پس ان لوگوں کے
 اثر اور نیز ان کے طرز سے وہ کیسے پختہ ہو سکتے تھے۔ وہ اس زمانہ کے رنگ میں ڈبل ہوئے
 تھے اور یہی حالت ان کی برابر رہی یہاں تک کہ قیام رام پور اور داغ وغیرہ کی صحبت نے
 ان کا بڑا رنگ ایک حد تک زائل کر دیا۔ منشی صاحب کا ادراک عر کا جس قدر کلام ہے
 وہ ناسخ اور شاگردان ناسخ کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے چنانچہ ان کا پہلا دیوان مرآۃ الخب
 اس دعوے کی بڑی دلیل ہے۔ اس میں اگر کہیں کہیں عمدہ اشعار ملتے ہیں تو ان کے ساتھ ہی
 ساتھ رکیک و مبتذل خیالات بھڑی اور بے مزہ تشبیہیں، انگلیا کرتی، کھنکھی چوٹی وغیرہ نامناسب
 رعایت لفظی کی بھی بھر مار ہے۔ دیوان مذکور اگرچہ لائق مصنف کی استادی اور قدرت کلام کا
 پتہ دیتا ہے مگر کچھ بھی ناہمواری مندرجہ بالا سے مملو ہے۔ داغ کا رنگ اگرچہ دلی میں قائم ہوا
 مگر انھوں نے اس میں کچھ حیدت پیدا کر کے اپنا ایک خاص طرز بنالیا یعنی جس رات کی
 معاملہ بندی کو آتش کی صفائی زبان اور محاورہ گوئی کے ساتھ سمودیا اور اسی سے وہ چیز پیدا
 ہو گئی جو داغ کا طرز خاص کہلاتا ہے یعنی رندمرہ اور زبان، محاورات کا بر محل استعمال

لفظوں کی نشست و ترتیب اور خیالات کی دل نشینی، ان کے اشعار کا ظاہری یا خارجی حصہ تو بہت اچھا ہوتا ہے مگر داخلی یا معنوی حصہ بہت سطحی ہے۔ ان کا کلام لوگوں کو بہت پسند آیا کیونکہ ان کے غنائ کے موافق تھا اور یہی بہت بڑا راز ان کی شہرت و کامیابی کا ہے منشی صاحب نے دکن کے رنگ کی مقبولیت اور اپنی شہرت کے مٹ جانے کے خیال سے انھیں کارنگ اختیار کیا اور ہر چند صبح ہے کہ اس تبدیلی رنگ کی وجہ سے ان کے مابعد کے کلام میں بیشتر سے بہت زیادہ صفائی اور روانی پیدا ہو گئی مگر کچھ بھی وہ داغ تک نہ پہنچ سکے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں وہ ان سے کم رہے۔ اسی وجہ سے ان کا دوسرا دیوان ”منحشاء عشق“ ”گلزار داغ“ سے ”اگر وہ داغ کے طرز کے اعتبار سے دیکھا جائے تو بہت کم ہے بہر حال یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ منشی صاحب نے یہ کیا کم کمال کیا کہ اپنے طرز قدیم کو چھوڑ کر طرز جدید میں مابقی خاصی کامیابی حاصل کر لی۔

اگر ایک بلند نقطہ نظر سے ان دونوں استادوں کی شاعری کو دیکھا جائے تو یہ ماننا پڑیگا کہ حقیقی شہریت اور آئین الہامی جو قدیم استادوں کے یہاں پائی جاتی ہے ان دونوں کے یہاں بہت کم ہے مگر بالآخر باعتبار شکوہ الفناء اور متانت انداز فکر خیالی کے اثر کو داغ پر فوقیت حاصل ہے عروض اور ضربیات شعری کے اعتبار سے آئیر بہت بڑے استاد تھے ان کے کلام میں اس قسم کے سقم نہ تھا اور یہی ملیں گے اور قصیدہ گوئی میں تودہ داغ سے یقیناً بہتر ہیں۔ داغ کو اس صنف خاص سے زیادہ لگاؤ نہ تھا گوکہ ان کے معقدین اس بارہ میں بھی ان کی افضلیت کے قائل ہیں حقیقت یہ ہے کہ داغ ایک بہت بڑے غزل گو اور ایک طرز خاص کے موجد تھے اور یہی ان کی شہرت کا باعث کہا جاسکتا ہے۔ منشی صاحب جامع الکملات تھے شاعر کے علاوہ بہت بڑے نثر اور ناقد بھی تھے اور علمی قابلیت تودہ داغ سے یقیناً بہت بڑھی رکھتے تھے ”امیر اللغات“ اور ان کے وہ خطوط جن میں انھوں نے اکثر نہایت سچیدہ نکات اور حیل کے لئے ان کی قابلیت اور تلاش کے شاہد عائد ہیں

قصیدہ میں وہ سودا اور ذوق کے ہم پلہ کے جا سکتے ہیں۔ البتہ ظہیر دہلوی شاگرد ذوق اس صنف میں اُن کے قریب قریب ہیں۔ ان دونوں میں یہ بھی ایک بہت بڑا فرق ہے کہ امتداد زمانہ کے ساتھ منشی صاحب کی شاعری ترقی کرتی رہی اور داغ کا رنگ آخر عمر میں کچھ لگا ہو گیا تھا۔ اُن کا بہترین زمانہ اُن کے قیام راجپور کا زمانہ کہا جاسکتا ہے جب سے کہ وہ حیدر آباد گئے اور وہاں ثروت و عیش اُن کو نصیب ہوا شاعرانہ جگر کا وی اور محنت کے عہد عادی نہ رہے۔ مگر یہ ہے کہ آخری فیصلہ کن چیز اس معاملہ میں نقاد کا رنگ طبیعت اور رجحان مذاق ہے۔

داغ کا کلام اس قدر مقبول اور مشہور ہے کہ اُس کا کچھ انتخاب دینا ایک فعل عبث معلوم ہوتا ہے مگر کچھ بھی چند اشعار بطور نمونہ کے یہاں پیش کیے جاتے ہیں تاکہ ناظرین اُن سے لطف اٹھائیں۔

خدا کریم ہے یوں تو مگر ہے اتنا رشک
آج رہا ہی جہاں سے داغ ہوا
ڈر گئے نام شغاس کے رہے خواہش مرگ
جو عاشقی میں خاک ہو اکیمیا ہوا
وہ غفلت کہ اب کیا ہم نے

کہ میرے عشق سے پہلے تجھے جمال دیا
خانہ عشق بے چسراغ ہوا
مُنہ ذرا سا زکُل آیا ترے بیماروں کا
کتنا تھا آج خاک میں کوئی رُلا ہوا
جو ہمیں پہلے کام کرنا تھا

جو ہو سکتا ہے اس سے وہ کسی سے ہو نہیں سکتا

مگر دیکھو تو پھر کچھ آدمی سے ہو نہیں سکتا

کچھ آگے داور عشر سے ہے امید بخی
لطف فرما جو رہتا تو ٹھکانا ہی نہ تھا
خاطر سے یا لہانا سے میں مان تو گیا
دیکھا ہے بتکدے میں جو اے شیخ کچھ دلوچھ

کچھ آپ نے رے کہنے کا اعتبار کیا
عین حکمت تھی وہ کافر جودل آزار دہا
جھوٹی تسم سے آپ کا ایمان تو گیا
ایمان کی تویہ ہے کہ ایمان تو گیا

دعہ ہے یہ مرے اُن کے قیامت کی ہے تکرار
کل تاب فغاں تھی تو یہ تاثیر کہاں تھی
میخانے کے قریب تھی مسجد بھلے کو داغ
آنکھ پڑتی ہے کہیں پاؤں کہیں پڑتا ہے
کیسا جواب حضرت دل دیکھے ذرا
لطف نے تجھ سے کیا کہوں زاہد
اڑ گئی یوں دنا زمانے سے
نظارہ رہنما ہیں اور دل میں بدگمانی ہے
جو کتا ہوں کہ مرتاہوں تو فرماتے ہیں مر جاؤ
نرخ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ کہتے ہیں
مریض عشق کی کیا پلہ چھتے ہو یہ چھو
گرے ہوتے اچھ کر آستان سے
ہر دل میں نئی طرح سے ہر یاد کسی کی
بے پی تو سہی تو بے بھی ہو جاے گی زاہد
یاد سب کچھ ہیں مجھے سحر کے صدمے ظالم
اُرد ہے جس کا نام نہیں جانتے ہیں داغ

اور بات ہے اتنی کہ اُدھر کل ہے اُدھر آج
کیا کیا لب خاموش یہ قرباں ہے اثر آج
ہر شخص پوچھتا تھا کہ حضرت اُدھر کہاں
سب کی ہے تم کو خبر اپنی خبر کچھ بھی نہیں
پیغامبر کے ہاتھ میں ٹکڑے زباں کے ہیں
ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں
کبھی گویا کسی میں تھی ہی نہیں
ترے کوپے میں جو جاتا ہے آگے ہم بھی تھے ہیں
جو غن آتا ہے پھر پر تو ہزاروں دم بھی ہوتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اُدھر پر وار آتا ہے
کہ زندہ کوئی بھی تیمار دار باقی ہے
چلے آتے ہو گھبرائے کہاں سے
ملتی نہیں فریاد سے فریاد کسی کی
کمبخت قیامت ابھی آئی نہیں جاتی
بھول جاتا ہوں مگر دیکھ کے صورت ستری
ہندوستان میں دھوم ہماری زباں کی ہے

جلال لکھنوی

۱۲۵۰ تا ۱۳۲۵

حکیم سید رضا من علی جلال حکیم اصغر علی داستان گو کے بیٹے تھے
لکھنؤ میں ۱۲۵۰ء میں پیدا ہوئے کتب درسیہ فارسی و عربی سے
نواب آصف الدولہ کے مدرسے میں فراغت حاصل کر کے اپنے آبائی پیشہ طبابت کی نکل
کی طرف توجہ کی۔ زمانے کے رنگ کے موافق انکو شعر و سخن کا شوق بچپن ہی میں پیدا ہو گیا
تھا اور کچھ دنوں بعد اس میں اس قدر محو ہو گئے کہ سجا کے حکمت کے شاعری کو

اپنا مستقل فن قرار دیا۔ ابتدا میں امیر علی خاں ہلال سے اصلاح لیتے تھے جب کلام میں کچھ
 ہتکنگی آگئی تو انھیں کے توسط سے اُن کے استاد رشک کے شاگرد ہو گئے۔ رشک اُس
 زمانہ میں ایک خاص شہرت رکھتے تھے وہ ناسخ کے بہت ممتاز شاگردوں میں تھے اور استاد
 اسقدر انکا خیال کرتے تھے کہ جو غزلیں اصلاح کے واسطے اُن کے پاس آئیں وہ اُن کو بغیر
 اصلاح رشک کے حوالے کرتے جب رشک سفر عراق پر روانہ ہونے لگے تو انھوں نے جو ان
 جلال کو نواب فتح الدولہ برق کے سپرد کیا جن کی شاعری کا اس زمانہ میں بڑا زور و شور تھا
 روزانہ مشاعرے منعقد ہوتے جن میں بڑے بڑے اساتذہ وقت مثل بھڑا شیر، امیر قلی
 وغیرہ کے شریک ہوتے تھے۔ جلال بھی ان مشاعروں میں بے تکلف جاتے اور استادوں کے
 کلام کو سنتے اور خود اپنی غزلیں سناتے۔ غدر ۱۸۵۷ء نے ان مصیبتوں کو درہم و برہم کر دیا اور
 شعرا کو بجائے شعر کی تحفیل کے اب اپنے پیٹ کا خیال پیدا ہوا اسی زمانہ میں اور انھیں
 اذکار کی بدولت جلال نے ایک دواخانہ شہر لکھنؤ میں ایک شخص بخشی نند رائے کے مکان میں
 کھول لیا تھا جو ان کے والد کے دوستوں میں تھے اور شاعر بھی تھے مگر اس شغل میں بھی وہ
 اپنی محبوب شاعری کو کبھی نہیں بھولے اور اس میں بھی اُس کی شتی برابر جاری رہی۔ بالآخر
 نواب یوسف علی خاں دلی رام پور کی قدر دانی نے اُن کو رام پور گھیسٹ بلایا جہاں اُن کے
 والد و استان گویوں میں ملازم تھے تھوڑے عرصہ بعد جب نواب کا انتقال ہوا اور دلی ریاست
 نواب کلب علی خاں ہوئے تو انھوں نے حکیم صاحب کو بمشاہدہ تنور پیہ ماہوار ملازم
 رکھ لیا حکیم صاحب اپنی تنک مزاجی اور نازک دماغی کی بدولت کسی مرتبہ ملازمت سے
 کنارہ کش ہوئے مگر نواب صاحب کی قدر دانیوں اور قیاضیوں نے کبھی ان کو رام پور
 سے ترک تعلق نہ کرنے دیا۔ وہ تقریباً بیس سال رام پور میں رہے اور برابر شاعروں میں
 شریک ہوتے رہے جہاں اُن کے معاصر اور حریف نواب مرزا خاں داغ منشی امیر احمد
 اور منشی امیر حمید الدینی بھی شریک ہوتے تھے۔ اس زمانے کے ان چاروں استادوں کی غزلیں

جو اکثر ہم طرح ہوتی تھیں خالی از لطف نہیں ہیں کیونکہ اُن سے تقابل کلام کا اور ہر ایک شاعر کا رنگ طبیعت دریافت کرنے کا بہت اچھا موقع ملتا ہے نواب کلب علی خاں بہادر کے انتقال اور کونسل آف ریکھنسی کے قائم ہونے سے یہ پر لطف صحبتیں بھی قائم نہ رہ سکیں اور شعرا سب تر تتر ہو گئے حسن اتفاق یہ کہ ایک چھوٹی سی ریاست منگول واقع کاٹھیاواڑ کے مدیس با اختیار نواب حسین میاں نے جن کو شعر کی قدردانی اور شعرا کی سرپرستی کا بڑا فخر حاصل ہے حکیم صاحب کو اپنے یہاں طلب کر لیا مگر وہاں بوجہ دُوری اور ناموافقت آب و ہوا وہ عرصہ تک نہ رہ سکے چند ہی دن میں اپنے وطن مالوٹ لکھنؤ میں واپس آ گئے جہاں نواب صاحب موصوف اُن کو کچھ پیس روپیہ ماہوار اور مبلغ ستر روپیہ تنصیف کا صلہ جو وہ اُنکی خدمت میں بھیجتے تھے برابر عنایت کرتے رہے۔ آخر عمر میں حکیم صاحب کا سوائے شعر و شاعری اور اصلاح کے کوئی اور مشغلہ نہ تھا بمر چھپتر سال بتایا کہ ۲ اکتوبر سنہ ۱۲۹۷ھ انتقال کیا۔

تصانیف | تصانیف حسب ذیل موجود ہیں :-

- (۱) "چار دیوان"
 - (۲) "سرمایہ زبان اردو جو محاورات و اصطلاحات زبان اردو کی ایک مبوط کتاب ہے"
 - (۳) "افادہ تائیر کج" فن تائیر کج گوئی پر ایک چھوٹا سا رسالہ ہے۔
 - (۴) "منتخب القواعد" اس میں اکثر ہندی الفاظ کی اصل بتائی ہے اور مفرد و مرکب الفاظ کی تحقیق ہے۔
 - (۵) و (۶) "دولغات زبان اردو کے موسوم بہ نتیج اللغات" "گلشن فیض"
 - (۷) "رسالہ دستور المفصحا" جو فن عروض پر ایک مختصر رسالہ ہے۔
 - (۸) "مفید الشعراء" ایک رسالہ در باب تحقیق تذکیر و تانیث۔
- نہرست مذکورہ بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنکو تحقیق زبان کے ساتھ بڑا شغف تھا اور شل اپنے اُستاد رشک کے انھوں نے بھی اکثر رسالے اور لغات زبان اردو کے الفاظ و محاورات

واصطلاحات کے متعلق تصنیف کے بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ جس کام کو رشک نے شروع کیا تھا۔ اُسکو انھوں نے درجہ تکمیل کو پہنچایا ہر چند کہ اُن کی یہ تصانیف ایک تبدیلی مود میں ہیں اور اُن کے بعد اب بڑی کتابیں اسی موضوع میں نہایت شرح و بسط اور زیادہ تفصیل و تنقید کے ساتھ لکھی گئی ہیں مگر پھر بھی جلال کی خدمات کا اعتراف کرنا چاہئے اُنکو بحسن سے محبت و تکرار اور بحث و مباحثہ کا شوق تھا چنانچہ اُس زمانے میں بھی وہ اساتذہ وقت کے اسقام سے چشم پوشی نہیں کر سکتے تھے۔ بے تکلف اُن کی غلطیاں اُن کے مزہ پر کھدینے تھے اور یہ عادت اُن کی آخر عمر تک باقی رہی اسی کی وجہ سے اُن سے اور اُن کے معاصرین سے محکمۃ الاراء مناظرے اور مباحثے اس معاملہ میں ہوتے رہے۔

مزاج کی کیفیت [کما جاتا ہے کہ جلال ایک مغرور و متکبر اور ہموں دیگرے نیست کے خیال کے آدمی تھے۔ مشہور ہے کہ وہ اکثر مشاعروں میں صرف اس وجہ سے شرکت نہیں کرتے تھے کہ غرض سخن اُن کو اس کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ اپنے زمانے کے اکابر شعرا تک سے ملنے میں اُن کو عار تھا۔ دوسروں کے اشعار کی تعریف کرنے کی انھوں نے قسم کھائی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا حقارت آمیز برتاؤ جھگڑے اور فساد کا باعث ہوا کرتا ہے چنانچہ تسلیم کے ایک شاگرد ظہیر احسن شوقِ نموی نے در کتابیں لکھ ڈالیں جس میں کہ جلال کی خوب خبر لی گئی اور اُن کے کلام کی غلطیاں نکالی گئیں اور ان پر صد ہا اعتراض وارد کئے گئے مگر حق یہ ہے کہ جلال اپنے شاگردوں اور دوستوں سے بہت اچھی طرح پیش آتے تھے اور دوسروں کے کلام کی اصلاح بہت محنت اور محبت سے دیتے تھے۔

خصوصیات کلام | جلال کو طرزِ گفتار کا آخری شب سمجھنا چاہیے وہ قدیم اساتذہ گفتار کے قدمِ قدم چلتے تھے اور اس شاہراہِ عام سے کبھی ہٹنا نہیں چاہتے تھے ان کے متعدد دیوانوں میں کسی قسم کی دل آویزی اور خصوصیت اور مایہ الاقیانہ کوئی شے نہیں ہے البتہ زبان میں تصنع بہت کم اور بے عیب ہے پھر کہ ہر اشعار میں نکلتے ہیں مگر عام طور پر کلام بے نمک اور معمولی ہے

جذبات یا انعکاس کا اُس میں کہیں پتہ نہیں خیال آفرینی کم ہے۔ اکثر وہ معمولی معمولی باتیں ہیں اور بعض اشیاء تو ان کی اُستادی کے درجہ سے بہت گرے ہوئے ہیں مگر اس میں بھی شک نہیں کہ کنگھی چوٹی اور عورتوں کی زیب زینت کے مضامین جو قدیم طرز لکھنو کا مایہ ناز تھے اُن کے یہاں نہیں پائے جاتے۔ اس کے علاوہ صحت الفاظ کا بھی اُن کو بڑا خیال رہتا ہے اور کلام تعقید اور نامناسب الفاظ سے پاک ہوتا ہے۔ جلال اپنے آپ کو صحت الفاظ و محسوس اور ہ بادشاہ سمجھتے تھے بہت بُرگو تھے۔ اور شاید یہ بُرگوئی ہی بد مزگی کلام کا باعث ہو۔ مشہور ہے کہ بڑی پچیس غزلوں کی اصلاح اور تین چار غزلوں کی تصنیف ان کا روزمرہ کام مول تھا۔ چنانچہ اُس زمانے کے گلدستے اُن کی اور اُن کے شاگردوں کی غزلوں سے بھرے رہتے تھے مختصر یہ کہ وہ کلام کے بہت لچھے ناقد تھے اور اُردو کے دوسرے درجہ کے شعرا میں اُن کا پایہ بلند ہے۔

شاگرد ان کے مشہور شاگردوں میں اشخاص ذیل قابل ذکر ہیں یعنی خود ان کے بیٹے کمال جو ریاست رامپور میں ملازم تھے ادب انتقال ہو گیا۔ میرزا رحیم یاس اور اُن کے صاحبزادے آرزو۔ احسان شاہجہاں پوری اور سردار اودھ سنگھ۔

آرزو اسید انور رحیم صاحب لکھنوی آرزو تخلص خلف میرزا رحیم یاس مثل اپنے والد کے جلال کے شاگرد ہیں۔ لکھنؤ کے بہت نامور شاعر ہیں۔ اور کمال کے انتقال کے بعد جلال کے جانشین ہی سمجھے جاتے ہیں۔ پہلے امید تخلص کرتے تھے اب آرزو کرتے ہیں فن عروض میں ان کو پوری دستگاہ حاصل ہے اور تمام اصناف سخن میں شعر کہنے پر قادر ہیں۔ مرثیے بھی کہتے ہیں اور ابٹا رامانویسی کا شوق ہے۔ گوکہ لکھنؤ کے باشندے ہیں مگر طرز دلی دلوں کا ہے، آرزو کا کلام اُن کے اُستاد جلال کے رنگ کا بہت اچھا نمونہ ہے جبکہ انھوں نے اپنے طرز کو دلی کے رنگ میں سودیا تھا۔ ان کے کلام میں سادگی اور دلی اور حلاوت اور جذبات سب کچھ موجود ہے۔ موجودہ شعرا کے لکھنوی میں بلند پایہ رکھتے ہیں۔

لہ ولادت :- ۱۸۶۲ء ذی قعدہ ۱۲۸۰ھ

احسان | احسان علی خاں نام احسان تخلص قاسم علی خاں کے صاحبزادہ ہیں ۱۲۷۶ء میں
بمقام اوطاع بریلی پیدا ہوئے اس کے بعد ان کے والدین شاہجہاں پور چلے گئے جہاں
ان کی تعلیم و تربیت ہوئی ۱۳۰۷ء میں ان کو شعر کہنے کا شوق ہوا۔ ابتدائی کلام حافظ
تتار احمد خاں تائب کو دکھاتے تھے ۱۳۱۷ء میں جلال کے شاگرد ہوئے۔ ۱۳۲۷ء میں
محکمہ ہمد و بہت کو رکھپور میں سرکاری ملازمت پائی اور بعد کو قانون گوئی منصرمی اور پیشکاری
کے عہدوں پر فائز ہوئے ۱۳۲۷ء میں ملازمت چھوڑ کر مختاری کا امتحان دیا اور شاہجہانپور
میں کام شروع کیا ۱۳۲۷ء میں ایک گلدستہ موسوم بہ "گلستہ ارغوان" نکالا جو کچھ عرصہ کے بعد
بند ہو گیا۔ ۱۳۲۷ء میں ان کا پہلا دیوان "محکمہ خیال" چھپا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ اور کتابیں
بھی ان کی تصنیف سے ہیں۔ ۱۳۲۷ء میں منگروں اور وہاں سے حیدر آباد گئے تھے
احسان ایک خوشگو شاعر ہیں مگر کوئی خصوصیت ان کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔ جلال
کے مشورہ شاگردوں میں ہیں۔

تسلیم ۱۳۲۷ء | نصرت ساعی رام پور کے چوتھے رکن منشی امیر احمد تسلیم تھے ۱۳۲۷ء میں
بمقام منگلوسی جو نواح فیض آباد میں ایک گائوں ہے پیدا ہوئے ان کے
والد مولوی عبدالصمد پہلے بدوسرائے میں جو دریا آباد کے قریب واقع ہے قیام کرتے تھے
بعد کو فیض آباد چلے آئے اور وہیں توطن اختیار کیا تھوڑے عرصہ کے بعد لکھنؤ آ گئے اور
محمد علی شاہ کے عہد میں صیغہ فوج میں بشاہرہ بیٹس روپیہ ماہوار ملازمت کر لی تسلیم بھی
بچپن میں اپنے باپ کے ساتھ فوج میں داخل ہوئے تھے اور ان کی علیحدگی کے بعد ان کے
عہدے پر فائز ہوئے۔ فارسی دہری کی تعلیم خود اپنے والد سے اور مولوی شہاب الدین
اور مولوی سلامت اللہ رام پوری سے حاصل کی تھی۔ فن خوشنویسی کے ایک استاد تھے
اور مطبع منشی نو لکھنؤ میں بشاہرہ بیٹس روپیہ ماہوار ملازم تھے شعر و سخن میں وہ نسیم دہلوی
۱۳۲۷ء راقم الحروف نے بھی فن خوشنویسی میں چند روز آپ سے استفادہ کیا ہے۔ ۱۳۲۷ء مترجم

<p>کے شاگرد تھے۔ اور طرز دہلی کے تبحر پر بڑا فخر کرتے تھے چنانچہ کہتے ہیں کہ</p>	
<p>میں ہوں اے تسلیم شاگرد نسیم دہلوی</p>	<p>مجھ کو طرز شاعران لکھنؤ سے کیا غرض</p>
<p>تھوڑے عرصہ کے بعد واجد علی شاہ کے زمانہ میں جب انکی ملین توڑ دی گئی تو یہ بیکار ہو گئے انھوں نے ایک منظوم عرضداشت اپنے ہاتھ سے خوشخط لکھ کر مقبول الدولہ مرزا ہمدی علی خاں بٹالگر دنا سنج کی وساطت سے پیش کی بادشاہ نے دیکھا اور اس پر یہ حکم لکھا</p>	
<p>بشنوے خوشنویس دے خوش گو</p>	<p>ہر دین میکنی دہر دو نکو</p>
<p>اسم تو مندرج بہ دفتر شد</p>	<p>بست و دہ روپیہ مقرر شد</p>
<p>چنانچہ ان کا تیس روپیہ ماہوار مقرر ہو گیا اور شعرائے شاہی کے زمرہ میں یہ داخل ہو گئے بعد ان نزاع سلطنت یہ رامپور چلے گئے جہاں کچھ عرصہ تک یہ کوئی مقبول ملازمت ملی اور نہ مقبول شعرائے حلقے میں داخل ہو سکے کچھ عرصہ کے بعد ایک قصیدہ مدحیہ نواب کلب علی خاں کے حضور میں جو اس وقت وسیع ریاست تھے پیش کرنے کا موقع ملا غدر کا ہنگامہ فرو ہونے کے بعد تسلیم رامپور سے لکھنؤ واپس آئے اور یہاں اپنے بچھڑے ہوئے اعزاز سے ملے اس کے کچھ عرصہ بعد وہ منشی نو لکھنؤ کے مشہور مطبع میں جس کو قائم ہوئے اس وقت تھوڑا عرصہ گزارا تھا مصحفوں میں ملازم ہو گئے جہاں ان کے استاد نسیم نے بھی کچھ دنوں ملازمت کی تھی۔ لکھنؤ میں نواب محمد تقی خاں کی سرکار سے بھی دس روپیہ ماہوار ان کو ملتے تھے اور نواب صاحب اپنا کلام اصلاح کے لیے ان کو دکھاتے تھے جب ۱۸۵۵ء میں نواب کلب علی خاں سریر آرا کے ریاست تھے تو ان کے طلب فرمانے سے یہ پھر رامپور گئے اور اب کی مرتبہ تیس روپیہ ماہوار تنخواہ ہوئی جو بعد کو پچاس روپیہ تک بڑھا دی گئی اور عہدہ نظارت و شیکاری سے ترقی کر کے وہاں کے مدارس کے ڈپٹی انچیف مقرر ہوئے نواب صاحب موصوف کی رحلت کے بعد یہ پھر رامپور سے نکلے اور لونگ ہونے ہوئے منکول پہنچے جہاں کچھ دنوں قیام کر کے نواب عالی شان نواب سید حامد علی خاں بہادر زالی رامپور</p>	

کے طلب فرمانے سے پھر رام پور آ گئے اس مرتبہ نواب صاحب نے ازراہ قدر دانی چالیس روپیہ بطور منشن مقرر کر دیئے جو ان کو آخر وقت تک ملتے رہے تسلیم نے اکانوے برس اس دنیا کے ناپائدار کی سیر کر کے ۱۹۱۱ء میں سفر آخرت اختیار کیا۔

تصانیف | کہا جاتا ہے کہ ان کا پہلا دیوان زمانہ غدر میں ضائع ہو گیا۔ مطبوعہ دیوان

ان کے حسب ذیل ہیں :-

(۱) "نظم ارجمند" یہ لکھنؤ میں چھپا ہے اور اس میں قبل غدر کا بھی کچھ کلام اور ان کی روشنیاں بھی ہیں (۲) "نظم دل افروز" مطبوعہ رامپور (۳) "دفتر خیال" ایضاً چوتھا دیوان ناتمام بنا جاتا ہے کہ ان کے کسی شاگرد کے پاس رام پور میں موجود ہے ان کے علاوہ شنوئیاں حسب ذیل ہیں :-

(۱) نالہ تسلیم (۲) شام غریباں (۳) صبح خنداں (۴) دل و جاں (۵) نغمہ بلیں (۶) شوکت شاہجہانی (۷) گوہر انتخاب (۸) تاریخ رامپور ان کے علاوہ انھوں نے نواب صاحب رامپور بالقابہ کا سفر نامہ یورپ منظوم لکھا ہے جس میں تقریباً بیس پچیس ہزار شعر ہیں۔

انداز کلام | کلام نہایت سلیس ہے تکلف بھوس اور زور دار ہے تمام اصناف مہن میں شنوئی سب سے اچھی ہے اور اس میں وہ اپنے ہم عصروں پر گونے سبقت لے گئے ہیں اسی میں وہ خوب پھلتے پھولتے ہیں بعض قصیدے بھی بہت زور دار لکھے ہیں۔ غزلیں اکثر پر محنی اور پر لطف ہوتی ہیں اور ان کا پہلا دیوان "نظم ارجمند" ہماری رائے میں سب دیوانوں سے بہتر ہے۔ مگر پر گوئی نے ان کے ساتھ بھی وہی کیا جو دیگر شاعر کیساتھ کیا ہے یعنی کلام کو پھیکا اور بے مزہ بنا دیا ہے تسلیم تین باتوں کے واسطے مشہور ہیں۔ اپنی غزلوں اور شنوئی کے لئے دوسرے مومن کے تتبع کے واسطے تیسرے اس وجہ سے کہ ہمارے زمانہ کے ذہین اور قابل شاعر حسرت موہانی کے وہ استاد ہیں

تسلیم نے اپنی عمر کا اکثر حصہ مصیبت و افلاس میں بسر کیا یہاں تک کہ بعض اوقات
نفردفات کی زحمت اٹھائی۔ اکثر اوقات اُن کے احباب اور اُن کے شاگرد اُن کی اعانت کرتے تھے
اُن کی طویل عمر صائب کی ایک طویل داستان تھی جو آخر کار موت پر ختم ہوئی۔ مگر مغلی اور
پریشاں حالی نے اُن کے دل میں کسی قسم کا چڑچڑاہٹ اور غم و غصہ پیدا نہیں کیا تھا بلکہ
برعکس اس کے مد نہایت ملنا اور قانع و راضی ہوئے تھے۔ اور کسی مرنے والے حال میں پیشہ
پران کو رشک و حسد بھی نہیں ہوا۔ تسلیم کے ساتھ قدیم رنگ کا خاتمہ ہو گیا۔

اُن کے شاگرد بہ کثرت ہیں جن میں مولانا حسرت موہانی، عرش گیاروی، حاجی محمد امین خاں
صبر معروف بہ بلبل تسلیم بہت ممتاز اور قابل ذکر ہیں۔ حسرت موہانی کا کچھ مختصر حال اس
آگے چل کر حصہ نشر میں لکھیں گے۔

چند جدیدہ اشعار بطور نمونہ نذر ناظرین کے کئے جاتے ہیں۔

ہائے کینکٹ میں گھبراؤں گا اے دستِ ہول	اب تو دامن بھی نہیں ہے کہ ہل جاؤں گا
نالہ کہتا ہے، دل پوچھا، شوق ہے اُداس	تو کیا بدل گیا کہ زمانہ بدل گیا
آبرو گر جاتا ہے کنجِ خلوت کر قبول	قطرہ نیاں صدف میں آکے گویا ہو گیا
عمر بھر رشک و ساتھ تھا کہنا کیا حال	وہ ملاجی کبھی تنہا تو میں تنہا نہ ہوا

قطرہ نگوں بھی نہیں دل میں رہے	ہائے تر ہوگی نہ بان تیر کیا
-------------------------------	-----------------------------

کچھ کہہ دو بھڑک سچ کہ توقع بندھی رہے	تو ترونہ آسرا دل امیدوار کا
تسلیم کس کے واسطے بیٹے ہو گھر چلو	کیا اعتبار وعدہ ہے اعتبار کا
دل مرا تھا اگر گیا، کم ہو گیا، جانا رہا	غم تھیں کا ہے کا ہے جانا رہا جانا رہا
دھونڈتا ہے ناز و شب لیکر چراغِ مرداد	کیا ترا اے آسمان پر جتنا جاتا رہا
رقم میں سفیدی جو کفن کی نظر آئی	سمجھا میں پس مرگ مرے ساتھ کڑی نصیب
اور میں بھی کہے شاگردی پہ اے تسلیم ناز	میں نسیم دہلی کے کفش برداروں میں ہوں

واعظ خدا شاس نہ پورنگا تمام عمر
پنا تم پر رخ سے اُن منہ سے نہ کرنا
دُر انا کیوں ہوئے التکلم واعظ مجھ کو دنیخ سے
گردش بخت بہت دیکھ چکے اے تسلیم
کرتے ہیں سجدے اس لئے دیر و حرم میں ہم
طفلی سے جو بت شوخ ہو آفت کا بنا ہو
کہے گا ارادہ کے نکلے تو ہیں گھر سے

اب تک پڑا ہوا ہے حرام و حلال میں
یہ بات مرے دل میں ہے یا برگ حنائیں
مرا حصہ نہیں ہے کیا خدا کے فضل احسان میں
جہل کے میخانہ میں اب گردش ساغر و کجھو
کیا جلنے وہ شوخ کہاں ہو کہاں نہ ہو
وہ فتنہ جوانی میں قیامت نہ ہو کیا ہو
آجا سے وہ بت سامنے اس دم تو مزاج ہو

عشر [ضمیر الدین عرش] صوبہ بہار سے تعلق رکھتے ہیں منشی بندہ علی وکیل گیا کے
صاحبزادہ ہیں ایک عرصہ تک اخبارات و رسائل سے تعلق رکھنے کے بعد انھوں نے
ریلوے کی ملازمت اختیار کر لی پہلے شمشاد شاگرد ناسخ کے شاگرد ہوئے مگر بعد کو تسلیم کو کلام
دکھانے لگے۔ ان کے اکثر تصانیف غیر مطبوعہ ہیں پہلے ایک دیوان موسوم بہ "دکتر عرش"
و آغ کے رنگ میں لکھا مگر وہ شائع نہیں ہوا بعد میں دیوان موسوم بہ "نظم نو نگار" تسلیم کے
رنگ میں اور انھیں کا اصلاح کردہ ہے۔ ان کے علاوہ ایک تفسیر دیوان بھی لکھا ہے
دو مختصر رسالے زبان اردو میں عروض پر اور ایک تانقہ آگرہ دہلی موسوم بہ "دہار گدہ سلطانی"
بھی اُن کی یادگار ہیں۔ کچھ عرصہ تک بہار پرنس کی ایڈیٹری بھی کی ہے۔ اکثر غزلیں نیچرل
رنگ میں خوب لکھتے ہیں لہذا اسی رنگ میں مشہور ہیں۔

دبّار حیدر آباد

حیدر آباد دکن اپنی روایات علم و ادب کے واسطے ہمیشہ سے مشہور ہے
نظام الملک آصف جاہ اول جس طرح شہلن بیجا پور اور گولکنڈہ کے ملک کے وارث
قرار پا گئے اسی طرح اُن کے تعلق علمی اور سرپرستی سخن کے بھی وارث وہی ہوئے

حیدر آباد ہمیشہ سے علم و فن اور شعر و شاعری کا مرکز اور ملکی و غیر ملکی ہر قسم کے شعرا اور اہل کمال کا ملجاء مادی ہا ہے۔ فرمانروایان سلطنت اور امرا کے دولت کا آوازہ سخاوت اور شہرہ بیاضی سن سن کر شعراء و علماء و فقہاء و محدثین شمالی ہند اور نیز در و دراز اقطار انصاری مثلاً ایران، عربستان، بخارا، سمقند وغیرہ سے آتے تھے اور یہاں کی غیاظیوں سے بہرہ مند ہوتے تھے یہ کمال لوگ انکار دنیاوی سے خارج ہو کر علم و ادب کی خدمت کرتے اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے تھے اور ریاست کی بڑی زینت سمجھے جاتے تھے خود فرمانروا بھی محض شاعری کے قدردان اور سرپرست ہی نہ تھے بلکہ خود بھی شعور سخن کا ذوق سلیم رکھتے تھے اگرچہ بعض عہدوں میں شاعری کا بازار سرد رہا مگر پھر بھی شمع سخن جو لیک رہتہ روشن ہو چکی تھی وہ ہمیشہ بجھی نہیں۔ فرمانروایان سابق اس زمانہ کے موافق فارسی زیادہ کہتے تھے مگر زمانہ حال میں اردو کا چرچا زیادہ ہو گیا ہے جس کی تفصیل آئندہ سطور میں کی گئی ہے۔

نظام الملک آصفیہ اول | بانی خاندان نظام الملک آصفیہ اول کا نام میر قزلباش تھا
۱۷۱۷ء تا ۱۷۴۷ء | فارسی میں شکر کہتے تھے اور ددیوان اس زبان میں یادگار چھوڑے

ہیں۔ شکر تخلص کرتے اور مرزا عبدالقادر بیدل سے اصلاح لیتے تھے کلام میں تصوف کا رنگ بہت غالب تھا۔ مشہور ہے کہ نظم و نثر کوئی زبانوں میں لکھ سکتے تھے ممکن ہے کہ اردو میں بھی کہا ہو مگر ان کا کلام اب دستیاب نہیں ہوتا۔

میر محبوب علی خاں متخلص بہ آصف | ہزارائیں مظفر الملک فتح جنگ نواب میر محبوب علی خاں
۱۷۶۷ء تا ۱۷۹۷ء | نظام الملک آصفیہ ششم اگرگت ۱۷۶۷ء مطابق ۱۷۹۷ء عیسوی۔

۱۷۹۷ء میں آصفیہ ششم میں پیدا ہوئے اور کچھ کم تین برس کی عمر میں ۲۶ فروری ۱۷۹۷ء کو مر گئے۔ ریاست ہوئے۔ اپنی تعلیم و تربیت مختلف علوم و فنون میں مختلف اوقات میں محاذ فیل کے سپرد ہوئی۔ مولوی محمد زماں خاں شہید مولوی مسیح الزماں خاں۔ مولوی انور اللہ خاں مولوی

اشرف حسین مظفر حسین خوشنویس۔ مرزا نصر اللہ خاں۔ مٹر کلارک۔ سردار جنگ۔ افسر جنگ اور مٹو خاں وغیرہ آپ کو زبان عربی و فارسی اردو و انگریزی سب میں عبور حاصل تھا۔ علوم مردہ کے علاوہ فنون سپہ گری و شہسواری کے ماہر کامل تھے۔ نشانہ بے مثل لگاتے تھے۔ آپ کے علم و فن اور شہر و سخن کی قدردانی کی وجہ سے تمام علماء و فضلاء عصر اور مشہور شعراء عہد کا مجمع دار السلطنت حیدر آباد میں ہو گیا تھا۔ جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں۔ مولانا کرامت علی۔ مولانا حیدر علی مصنف منتہی الکلام۔ مولوی امین الدین خاں خلف علامہ رشید الدین خاں دہلوی۔ مولوی وحید الزماں خاں۔ مولوی ممدی علی۔ مولوی مشتاق حسین۔ مولوی سید حسین و سید علی بلگرامی۔ مولوی نذیر احمد۔ مولوی عزیز مرزا وغیرہ اور ان کے علاوہ سیکڑوں باکمال تھے کہ جو لکھنؤ اور دلی اور نیز دیگر مقامات سے شہر پار دکن کی قیاضیوں اور حیر آباد میں ہن برسنے کا شہرہ سن سن کر حیدر آباد چلے گئے تھے۔ نظام مرحوم کی علمی سرپرستی اور قدردانی کا بین مثال مولوی سید احمد دہلوی کی مشہور اردو لغت فرہنگ آصفیہ کی طباعت و اشاعت ہے جس کے واسطے اعلیٰ حضرت نے نہ صرف زر کثیر مصنف کو عنایت کیا بلکہ اس کے صلہ میں پچاس روپیہ ماہوار بطور پنشن کے عمر بھر کے واسطے مقرر کر دیا تھا اسی شاہانہ فیاضی اور سرورانہ قدردانی کا نتیجہ یہ بھی ہوا کہ بعض اور مشہور کتابیں اس مبارک عہد میں تصنیف کی گئیں۔ مثلاً تمدن عرب مرتبہ و مترجمہ مولوی سید علی بلگرامی سوا غمیری تو اب سرسار جنگ بہادر تاریخ دکن وغیرہ۔ اسی در دولت سے مولانا شبلی نعمانی۔ مولانا حاتی۔ مولوی عبدالحی صاحب مصنف تفسیر حقانی۔ قدر لگرائی پندرت رتن ناٹھ سرشار۔ مولوی عبدالحی شرر۔ پروفیسر شہباز اور بیسیوں ایسے کالمافن براہر فیضیاب ہوتے رہے اور عمر بھر نہایت اطمینان کے ساتھ اپنے اپنے مشاغل علمیہ میں مصروف رہے استاد شاہ بلبیل ہندوستان نواب مرزا خاں داغ کی شہرت و ثروت کا ایسا عروج ہوا جو اس سے پیشتر کسی رئیس کی وجہ سے کسی شاعر کو میسر نہیں ہوا تھا۔ مشہور ہے کہ آخر میں ان کی تنخواہ پندرہ سو روپیہ

ماہوار ہو گئی تھی۔ علاوہ ان پیش بہانعات اور خلعت دیوہ کے جو وقتاً فوقتاً ان کو ملتے رہتے تھے۔

ہر چند کہ امیر مینائی اس معاملہ میں ناکام رہے اس وجہ سے کہ ان کی عمر نے دفا نہیں کی مگر ان کے صاحبزادے اختر مینائی اور ان کے مشہور شاگرد حافظ جلیل حسن جلیل اب تک درباری شاعر ہیں اور جلیل کو تو موجودہ حکمران کی استادی کا فخر حاصل ہے۔ میر محبوب علی خاں آصف تخلص فرماتے تھے اور اپنے استاد داغ کے متبع تھے دو دیوان آپ کی یادگار ہیں۔ کلام میں داغ کا رنگ ہے اور حسن الفاظ کے ساتھ حسن ظاہری کے ساتھ حسن باطنی بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔

موجودہ فرمانرواے دکن ہنگواں ٹہاگٹس ایلحضرت سر عثمان علی خاں بہادر بنجمیع القابہ شہنشاہ میں اپنے پدر بزرگوار کے متبع ہیں۔ آپ بھی نہ صرف قدر دان و مربی فن بلکہ بہت بڑے ناقد اور دلدادہ سخن ہیں آپ نے بھی اپنے دربار دربار میں ایک مجمع شعرا و ادبا اور علما و فضلا کا جمع کیا ہے۔ آپ کے مبارک عہد میں عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام جس سے کہ زبان اردو کی ترقی اور وسعت میں بہت بڑا اضافہ اور اس کو بے انتہا استحکام حاصل ہوا اور نیز دارالترجمہ کا قیام جس سے بہت سی پیش بہانہ زبانوں کی کتابیں اردو میں ترجمہ ہو گئیں۔ آپ کے عہد زریں کی ایسی یادگاریں ہیں جس کے احسان سے ہماری زبان اور ہمارا ادب کبھی عہدہ برا نہیں ہو سکتا۔ آپ عثمان تخلص کرتے ہیں اور آپ کا ایک دیوان غزلوں کا چھپ گیا ہے۔ حضرت جلیل سے استفادہ سخن کرتے ہیں۔ کلام میں صفائی سادگی بے تکلفی اور فصاحت کوٹ کوٹ کر بھری ہے زوائد سے کلام پاک ہے۔ ہنگواں ٹہاگٹس زبان فارسی اور عربی میں بھی اچھا دخل رکھتے ہیں اور کبھی کبھی ان زبانوں میں بھی طبع آزمائی فرماتے رہتے ہیں۔

ہمارا راجہ چند لال شاداں
۱۸۶۶ء تا ۱۸۷۵ء

امراؤ و رسائے سیاست عہد قدیم میں بحیثیت سرپرست شعر اور
اہل کمال کے جو مرتبہ ہمارا راجہ چند لال کو حاصل ہے وہ کسی
دوسرے کو نصیب نہیں ہوا شاداں تخلص کرتے تھے اور ایک عرصے تک پیشکار ریاست یعنی
وزیر اعظم کے عہدہ بھلیہ پر ممتاز رہے۔ ہمارا راجہ بہادر قوم کے کھتری تھے۔ علاوہ خود اہل کمال
جو نیچے اہل کمال کے بڑے مربی اور سرپرست تھے اور اس عہد میں ہر دور سخاوت اپنا نظیر نہیں
رکھتے تھے ان کی سخاوت کی مثالیں اب تک بطور ضرب المثل حیدر آباد میں مشہور ہیں۔ اپنے زمانہ
میں اس قدر مشہور تھے کہ ریاست حیدر آباد کو ان کے نام کے ساتھ نسبت دی جاتی تھی اور
حیدر آباد چند لال کا حیدر آباد کہلاتا تھا ان کی سخاوت کا شہرہ سن کر ہندوستان اور ایران کے
اکثر شعرا اور اہل کمال وہاں جمع ہو گئے تھے اور جو شاعرے خود انھیں کے محل سرا میں ہرات
کو ہوتے تھے ان میں یہ صاحبان فن جمع ہو کر اپنا اپنا کمال دکھاتے تھے۔ انھیں شاعروں
میں نصیر دہلوی نے بھی اکثر شرکت کی ہے اور بیش بہا انعامات سے مالا مال ہو کر واپس
ہوئے ہیں۔ ذوق اور ناسخ بھی طلب کئے گئے۔ مگر حجب وطن اور راہ کی تعب نے اس طرف
جلانے سے ان کو باز رکھا۔ ہمارا راجہ موصوف اور درنازی دونوں زبانوں میں کہتے تھے چنانچہ
دو دیوان اردو و سائیک دیوان فارسی ان کی یادگار ہیں۔ مشہور ہے کہ ان کے زمانہ میں
تین سو سے زیادہ شاعر حیدر آباد میں جمع تھے جن کی ملامت و تنخواہ سو روپیہ سے ہزار روپیہ
تک مہنی کسی تھی ایک کتب موسوم بہ "عشر کدہ آفاق" بھی ان کی تصنیف ہے اس
میں انھوں نے اپنے خاندانی حالات اور خود اپنے سوانح اور اپنی خدمات کا حال
تفصیل سے لکھا ہے۔

راجہ گردھاری پر شاد بانی
۱۸۷۵ء تا ۱۹۰۱ء

راجہ گردھاری پر شاد معروف بہ محبوب نواز راجہ غنی دھرم کے
سکینہ کا لیستہ تھے فارسی اور سنسکرت کے عالم تھے اور غنی میں
بھی اچھا دخل رکھتے تھے یہ بھی مشاعر حیدر آباد میں اور انکو بھی شعر و سخن کا ذوق اور سرپرستی شعر

شوق تھا۔ انھوں نے نواب مرزا خاں باغ کی جب وہ حیدر آباد گئے ہیں بڑی تندر
 اور مدد کی۔ اکثر کتابیں ان کی تصنیف ہیں جن میں حسب ذیل زیادہ مشہور ہیں۔ بھگوت گیتا
 کاتھوجہ فارسی منظوم۔ کیشو نامہ۔ کلیات باقی۔ قصائد باقی۔ پرلنار۔ کنز التایید۔ بقائے
 باقی سیاق باقی۔ پیرایہ عروض۔ آئینہ سخن۔ ان کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ غریبی و ولاری
 کس قدر برہتے تھے۔ ان کے کلام میں تصوف کا رنگ بہت ہے۔ فلفلہ اور مذہب کے لوگوں کو
 برہمچاری پسند تھی اور ایک سچے درویش کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کی رباعیات نہایت منفرد اور
 دلچسپ ہیں۔ ان کے کلام سے بڑی علمی قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے شمس الدین فیض کے شاگرد تھے
 ہمارا جہ سرکش پیر شاہ تخلص پر شاہ
 بہت ممتاز اور مشہور شاعر اور اسکالری ہیں سلسلہ خاندانی ایک
 سذولت تھی

نہایت قدیم اور مرزوقی کے خاندان سے ملتا ہے جن کا کوئی رکن نظام ہائے سابق میں سے
 کسی کے ساتھ حیدر آباد آیا تھا۔ ان کے دادا ہمارا جہ مرزا پر شاہ اس کو نسل آن رکھنے کے
 ایک رکن تھے جو جنت آشیان میر محبوب علی خاں کے زمانہ تالیفی میں قائم ہوئی تھی۔ ہمارا جہ
 چند دلال اور یہ ایک ہی خاندان سے ہیں۔ ان کے دادا نے ان کو زبان عربی و فارسی میں
 بڑے قابل بنادوں سے اعلیٰ درجہ کی تعلیم دلائی تھی اس کے علاوہ انھوں نے انگریزی اور
 تہذیب اور مرہٹے زبانوں میں بھی کافی دستگاہ ہم پہنچائی۔ ہمارا جہ صاحب موصوف عربی و
 فارسی وارد و نہایت بے تکلفی اور صفائی سے لکھتے ہیں علاوہ نظم کے نثر کا اسلوب بھی
 نہایت دلکش ہوتا ہے۔ شاہ تخلص فرماتے ہیں اور حضور نظام سابق یعنی میر محبوب علی خاں
 کے شاگرد ہیں جنھوں نے ان کو "شاگرد خاص آصف جاہ" کے مرزوقی سے ممتاز کیا تھا۔ دو
 اردو جرائد یعنی "مردیہ آصفیہ" اور "محبوب الکلام" کی کرسی ادارت پر بھی چند روز آپ ممکن
 رہے۔ "محبوب الکلام" میں حضور نظام سابق بھی اپنا کلام اکثر شائع ہونے کے لئے
 عطا فرماتے تھے۔ ہمارا جہ صاحب موصوف ایک اچھے خاصے صوفی ہیں اور ان کا

کلام مکمل تصوف سے لبریز ہے اُن کے دیوان اردو فارسی مشائخ ہو چکے ہیں ایک دیوان معروف بہ حکمدہ رحمت میں صرف اختصار میں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تعصبات سے مرتفع ہو کر آپ مذہب کو کس بلند نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں اور اخوت انسانی کے کس قدر قابل ہر مذہب خاندانی روایات بدل دیا پر بھی آپ پوری طرح عامل ہیں اور ہمارا ہر چند دلال کے نقش قدم پر چلنے کے لئے سعی رہتے ہیں۔ تقریباً ہم تصانیف آپ کی موجود ہیں جن میں سے بعض کے مینام ہیں۔ نرم خیال (۳ جلدیں) میں ہر بیانات شاد۔ ہدیہ کشاد۔ سر یاد شاد۔ مطلع نورینہ۔ ایمان شاد۔ غار شاد۔ نعمت شاد۔ ارغوان وزارت۔ محسن القرآن۔ مثنوی آئینہ وجود۔ مثنوی سر وجود۔ وغیرہ کلام بہت دلچسپ اور بے تکلف ہوتا ہے علی الخصوص فارسی و عربی اشعار کا اردو شعر میں ترجمہ یا الضمین بہت دلکش اور دلچسپ ہوتی ہے۔ کلام میں حسن صوری و معنوی دونوں موجود ہیں۔ اہل علم میں اپنے خاندانی عہد وزارت سے سرفراز ہوئے اور خطاب "راجہ راجگاں ہمارا جہاد" جو ان کے بزرگوں کا تھا ان کو صفا ہوا۔ ۱۹۰۸ء میں وزیر اعظم مقرر ہوئے اور تین سالطہ کا خطاب غایت ہوا۔ ۱۹۱۱ء میں کے سی۔ آئی۔ اسی۔ اور سلطانہ میں جی۔ سکا آئی۔ اسی۔ گورنمنٹ انگلشیہ سے ملا۔ ۱۹۱۲ء میں عہدہ وزارت سے کنارہ کش ہو گئے تھے مگر تھوڑے عرصہ سے پھر قلمدان وزارت آپ کو سپرد ہوا ہے۔

انجمن ترقی اردو یہ مشہور معروف انجمن حیدرآباد میں تیرہ جودہ برس سے قائم ہے جب سے یہ عالم وجود میں آئی اپنے قابل اور ہر لحاظ سے انگریزی سکریٹری مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے کی سرپرستی اور نگرانی میں یہ برابر ترقی کر رہی ہے سکریٹری صاحب موصوف کی ان تحکیم کوششوں اور حیدر لائق اور قابل اشخاص کی قلمی اور ادراعات اور سب سے بڑھ کے اعلیٰ حضرت فرمانروا کے دکن کی نظر کیسیا اثر کی بدولت یہ انجمن زبان اردو ملک ترقی اور اشاعت کے نہایت مفید کام انجام دے رہی ہے۔ زبان انگریزی کی اکثر مفید و مشہور

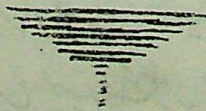
کتابیں نہایت قابلیت اور احتیاط کے ساتھ ترجمہ ہو گئیں یا ہو رہی ہیں۔ مثلاً بکلی کی تاریخ تمدن
 ایٹ کی سوانح عمری پولین بونا پارٹ پلوتارک کی سوانح عمریاں اچھا کسے یونان، غیرہ کی لیک کی
 تاریخ اخلاق۔ ان کے علاوہ بیسیوں مستند کتابیں۔ سائنس، فلسفہ، اخلاق، اقتصادیات
 تاریخ کی۔ خواہ بصورت تالیف یا ترجمہ شائع ہو چکی ہیں یا پیش نظر ہیں۔ اسی طرح اردو کی
 اکثر پرانی کتابیں اترند کرے بھی نہایت صحت اور عمدگی اور مفید فاضلانہ دیباچوں کے
 ساتھ نکل چکے ہیں۔ اردو رسم الخط کی اصلاح و ترقی اور اس کو باقاعدہ اور سہل القراءۃ
 بنانے کے واسطے قابل اور تجربہ کار اصحاب کی کمیٹیاں بنائی گئی ہیں۔ پروفیسر بروہن کی
 تاریخ ادب ایران اور تیکسن کی تاریخ ادب عرب بھی سنا ہے کہ ترجمہ ہو گئیں اور چھپنے کے
 واسطے تیار ہیں۔ انگریزی و اردو کے علاوہ عربی فارسی اور فرانسیسی کی پیش بہا تصانیف
 سے بھی انجمن غافل نہیں ہے۔ ترجمہ کی آسانی کے واسطے سائنس اور علوم و فنون کے
 اصطلاحات کا اردو میں ترجمہ کر دیا گیا ہے اور بصورت لغت یا فرنگ کے شائع بھی
 ہو گیا ہے۔ اسی طرح لغات اور محاورات اور صناعات اور پیشہ وروں کی مخصوص اصطلاحیں
 بھی مرتب کی گئی ہیں اسگورڈ کی مختصر زبان انگریزی کی لغت کے اردو ترجمہ کا حکم ہو گیا اور
 اور اس کام کے لیے تقریباً بیس تھیں آدمی مقرر ہیں جب یہ تیار ہو جائے گی تو یقیناً مفید
 چیز ثابت ہوگی۔ سنا گیا ہے کہ انجمن اردو کا تعلق ٹائپ تیار کرنے کی فکر میں ہے جس سے
 کتابوں کے چھپنے اور بعد کو ان کے پڑھنے میں بہت آسانی ہوگی۔ مختصر یہ کہ انجمن کے
 اشغال متعدد اور مختلف ہیں اور سب قابل تعریف ہیں۔ البتہ زیادہ ہمت زیادہ مستعدی
 اور زیادہ محنت کی ضرورت ہے اور کام کرنے والے بھی زیادہ ہونا چاہئیں تاکہ جو کام
 شروع کیا جائے وہ جلد ختم ہو جائے اور پبلک کو زحمت انتظار نہ اٹھانا پڑے۔ انجمن کا
 مشہور و معروف سربراہی رسالہ "اردو" جو زیر ادارت سکریٹری صاحب موصوف ہکتا ہے
 ہندوستان کے نہایت کارآمد و مشہور رسائل اور جرائد میں سے ہے اور اس میں زبان

اور ادب اردو کے متعلق نہایت قابل قدر اور دلچسپ مضامین ہوتے ہیں۔ حال میں انجمن نے ایک رسالہ موسوم بہ "سائنس" زیروادت ڈاکٹر مظفر الدین صاحب قریشی جاردی کیسا ہے جس میں صرف مضامین سائنس ہوتے ہیں۔ یہ بھی مثل "اردو" کے نہایت مفید اور کارآمد مضامین کا حامل ہوتا ہے جس سے انشاء اللہ ملک کی بہت کچھ توقعات پوری ہوں گی۔

عثمانیہ یونیورسٹی | عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام سے وہ روز افزوں علمی و ادبی عمیق قومی جذبات پورے ہو گئے جو اعلیٰ تعلیم کی زبان مادری میں نشر و اشاعت کے متعلق لوگوں کے دلوں میں عرصہ دراز سے موجزن تھے اور جن کے واسطے وہ بہت سہیلی سے انتظار کر رہے تھے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کا تقرر ابتدائی مباحث و مراحل طے ہو جانے کے بعد بالآخر ہٹرا گزشتہ ہائس حضور نظام کے فرمان خسروی مورخہ ۲۲ ستمبر ۱۹۱۸ء کے بموجب عمل میں آیا بالفعل تمام شعبہ ہائے علوم کی تعلیم زبان اردو میں ہوتی ہے۔ انگریزی صرف بطور زبان ثانوی کے ایک ضروری ہیکٹ رکھی گئی ہے تاکہ طلباء اس زبان سے بھی نا آشنا اور انگریزی بولنے والی دنیا کے حالات و خیالات سے بے خبر نہ رہیں۔ اب تک صرف ایک کالج یونیورسٹی سے متعلق ہے جس کا افتتاح ۱۹۱۹ء میں ہوا تھا۔ یونیورسٹی نمایاں ترقی کر رہی ہے اور طلباء کی تعداد برابر بڑھتی جاتی ہے۔ گورنمنٹ آف انڈیا نے یونیورسٹی کی حیثیت تسلیم کر لی ہے اور اس کے امتحانات اور ڈگریوں کو وہی مرتبہ حاصل ہے جو اسی درجہ کی برٹش انڈیا کی کسی یونیورسٹی کے امتحانوں اور ڈگریوں کو حاصل ہے۔ بالفعل یونیورسٹی میں شعبہ ہائے الہیات (تکھیالوجی) علوم و فنون (سائنس و آرٹس) اور قانون کی تعلیم دی جاتی ہے۔

دارالترجمہ | عثمانیہ یونیورسٹی کے واسطے ضروری کتابیں فراہم کرنے کی غرض سے دارالتصنیف و الترجمہ قائم ہے جو یونیورسٹی کے زیر نگرانی نہایت عمدہ اور مفید کام انجام دے رہا ہے۔ ابھی پانچ ہی چھ برس کی مختصر عمر میں اس کی قابل فخر کوششوں سے وہ تمام کتابیں تیار ہو گئی ہیں جو یونیورسٹی کے انٹرمیڈیٹ اور بی۔ اے کے درجوں کے واسطے درکار ہیں۔

اس میں آٹھ قابل مترجم زیر نگرانی ایک افسر اعلیٰ کے، جو ایک مشہور فاضل مصنف ہیں کام کرتے ہیں۔ دارالترجمہ کی خدمت قابل تحسین و آفریں ہیں۔ خاص کر جب ہم اُن وقتوں کا خیال کرتے ہیں جو علوم و فنون کی کتابوں کے ترجمہ میں اور اردو میں سائنٹفک الفاظ کے وضع کرنے یا اُن کے مرادف قائم کرنے میں مترجموں اور مصنفوں کو ہوتی ہیں۔ سنا گیا ہے کہ اس خاص کام کے واسطے ماہران فن کی کمیٹیاں قائم کی گئی ہیں جن کے متعلق وضع الفاظ و اصطلاحات علمیہ کا کام سپرد ہے۔ حال ہی میں اس موضوع پر ایک مفید گفت بھی شائع ہو گئی ہے۔ دارالترجمہ کی ابتدا شروع میں بطور ایک عارضی دفتر کے ہوئی تھی مگر کام کی اہمیت کے لحاظ سے ہزار گز انڈمانس ے اُس کی عمر میں دس برس کی اور توسیع کر دی ہے۔ دارالترجمہ کی خدمات میں علاوہ مکمل یونیورسٹی کو درس کے علوم ذیل کی کتابوں کی تصنیف و تراجم داخل ہیں تاریخ (جس میں مشرقی اور مغربی اور قدیم و جدید ہر قسم کی تاریخ داخل ہے) فلسفہ اقتصادیات۔ ریاضی (خالص اور مخلوط دونوں) طبیعیات۔ کیمیا اور فنون۔ جب فن تعلیم و انجینیری اور طب کے شعبے یونیورسٹی میں کھلیں گے تو ان فنون کی کتابیں بھی ترجمہ کی جائیں گی جس کے واسطے ابھی سے خیال رکھا گیا ہے۔ مصنفہ اور مترجمہ کتابوں میں ڈیڑھ سو سے زیادہ تیار اور شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں سے اکثر داخل درس ہونے کے قابل ہیں۔ مختصر یہ کہ دارالترجمہ زبان اردو کی اشاعت اور توسیع کے واسطے ایک نہایت مفید محکمہ ہے۔ اور خدمات کے لحاظ سے درازی عمر کا مستحق ہے۔



باب ۱۴

اردو شاعری کا جدید رنگ

آزاد اور حالی کا زمانہ

طرز جدید کے پیشرو [اردو] مشرقی نگاروں اور نیز نظیر اکبر آبادی نے اُس نئی روشنی کی جھلک دیکھ لی تھی جو بالآخر زمانہ نابعد میں جدید رنگ میں جلوہ گرہونے والی تھی۔ ان لوگوں نے اس جدید رنگ کے واسطے ایک شارع عام اپنے زمانہ کے خیال کے موافق تیار کر دیا تھا۔ جس پر راستہ چلنے والے بعد کو آئے اور شاعری میں اصلاح کا درخ دکھا دیا تھا ہماری رائے میں قدیم زمانہ کے مرثیوں میں طرز جدید کا تخم یقیناً موجود تھا جس کی آبپاری بعد کے آئینوں نے کی اور انھیں کے مبارک ہاتھوں سے وہ درخت پروران چڑھا اور برگ و بار لایا مناظر قدرت و اوقات کے سچے نوٹوں الفاظ میں انسان کے قلبی جذبات کا من و عن انظار نصائح آموزی کیفیات قلبیہ کا انظار الفاظ میں سلاست و روانی تشبیہ و استعارے کا حد سے تجاوز نہ ہونا یہ سب باتیں جو زمانہ حال کی شاعری کی جان ہیں پرانے مرثیوں میں کم و بیش ضرور پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح نظیر اکبر آبادی نے بھی اپنے کلام میں اس آنے والے انقلاب کی خبر دے دی تھی اور ہمارے نزدیک زیادہ صفائی اور زیادہ وضاحت سے دی تھی اس وجہ سے کہ مراثی میں تو یہ چیزیں بطور فروع و تنہید کے تھیں اور نظیر کے یہاں وہ ایک مستقل عنوان کی صورت میں ہیں مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اُس زمانے کے لوگوں نے اس رنگ کو قدر کی نگاہوں سے نہیں دیکھا اور اس کو ایک فضول چیز سمجھ کے اختیار نہیں

کیا۔ اسی وجہ سے مرثیہ گوئز سے شاعر کہلاتے تھے اور نظیر کو تو خیر قدیم کے دلدادہ ایک
 عامی اور جاہل شاعر سمجھتے تھے اور اب بھی سمجھتے ہیں کیونکہ اُس نے اُن کے خیال
 کے بموجب قواعد مقررہ کی پابندی نہیں کی اور وہ عالم و فاضل نہیں تھا اور الفاظ کی
 تراش و تراش کی اُس نے کبھی پرواہ نہیں کی یہ لوگ چونکہ شعر کے حسن ظاہر کو دیکھتے تھے
 اس وجہ سے نظیر کا بے تکلف اور خیر لکلام اُن کو پسند نہیں آیا۔ اُن پرانے خیالات کو محو
 کرنے کے لئے کسی زبردست ثبوت کی ضرورت تھی جبکہ مختصر کیفیت مستند ذیل میں بیان کی گئی ہے۔
 انقلاب کا اثر | انقلاب زمانہ اردو شاعری کے قدیم رنگ کے موافق ثابت نہیں ہوا۔ پہلی اور
 لکھنؤ کی سلطنتیں مٹ جانے سے شعرا کے سر پرست اُٹھ گئے اب یہ لوگ بے پشت و دہشتہ
 رہ گئے اور معمولی آدمیوں کے دست نگر ہو گئے جن کی نسبت زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے
 کہ اُن کے دل میں شوق تو تھا مگر اتنا دیرمہ اُن کے پاس کہاں تھا کہ مثل بادشاہوں یا اُمراء کے
 شعرا کی سرپرستی کر سکیں۔ ہر چند جیسا کہ پیشتر کہا جا چکا ہے اکثر لوگ روزی کی تلاش میں راہپور
 و جہد آباد اور دوسری ہندوستانی ریاستوں میں چلے گئے۔ مگر وہاں بھی عرصہ دراز تک
 اُن کے پانوں نہ جم سکے اور تھوڑے عرصہ کے بعد یا تو ایک جگہ سے دوسری جگہ آتے
 جاتے رہے یا اپنے وطن کو واپس آ گئے۔ اسی کے ساتھ انقلاب زمانہ نے امراء کو صرف
 دولت کے اور بھی بہت سے مفید استعمال سکھائے جس سے شعرا کی قدر اور شاعروں کے مالی
 انفع پر بہت کچھ اثر پڑ گیا۔ لوگ اب زیادہ مادہ پرست اور کاروباری ہو گئے۔ تھے جن کی دنیا
 میں شری صاف اور سادی صحت نظم کی خوش رنگ شفق سے بہتر ہے اب وہ پُرانے رنگ
 کے غزل میں کوئی لطف نہیں پاتے تھے ہر چند کہ صنف غزل مقبول رہا اور اب تک مقبول
 ہے۔ دہلی کی تباہی، انزع ملک اور وہ ہندوستان اور ان ہنگاموں کے انقلابات نے
 لوگوں کی آنکھیں کھول دیں اور اب وہ خواب غفلت سے چونکے اور افکار دنیاوی میں مبتلا ہو گئے
 ہندوستانی ریاستیں گمان ہنگاموں سے محفوظ تھیں مگر رفت و زمانہ کے موافق اُن کو

بھی اپنے معاملات کی اصلاح کرنا ضرورت تھی۔ اس وجہ سے وہ دیاستیں جو شعرا کی ملبا وادنی بنی ہوئی تھیں وہ بھی اس انقلاب سے محفوظ نہ رہ سکیں جس کا اثر شعرا کی تنخواہوں و منافع پر بھی بہت کچھ پڑا۔

انگریزی تعلیم کا اثر | انگریزی تعلیم سے بھی اردو نظم و نثر دونوں پر بہت کچھ اثر پڑا اور انکوٹری تقویت پہنچی۔ انگریزی تعلیم نے زبان اردو کے ساتھ ہندوستان میں وہی کیا جو انگلستان میں خود زبان انگریزی کے ساتھ دینا سانس نے سوٹھویں صدی میں اور رومانس (افسانہ نگاری) کے شوق نے اٹھارویں صدی میں کیا تھا ترجموں سے اس انقلاب کی ابتدا ہوئی۔ انگریزی ادب نے جس میں نظم و نثر اور ڈراما سب کچھ داخل ہے بہت گہرا اثر ڈالا اور ہمارے رہنماؤں کے دل میں اردو زبان کے اسی نئے طرز پر ترقی کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ ابتدائی نقوش البتہ زیادہ گہرے نہیں تھے کیونکہ نقاش یا تو زبان انگریزی سے بالکل نا آشنا تھے یا بہت کم واقفیت رکھتے تھے وہ اس جدید رنگ سے ان تراجم کے ذریعہ سے واقف ہوئے تھے جو خود انگریزوں کے ایمان سے کراے گئے تھے۔ مگر باوصف اس کمی کے وہ اس جدید رنگ کی تمام خوبیوں سے بخوبی واقف تھے اور انھوں نے اب ارادہ کر لیا تھا کہ طرز قدیم کو جس میں زمانہ حال کی روش کے اعتبار سے اکثر خرابیاں پائی جاتی تھیں بدل ڈالیں اور اس میں ایک جدت کی چاشنی پیدا کریں مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ تغیر نو اور دفتہ نہیں ہوا۔ بلکہ آہستہ آہستہ اور بتدریج عمل میں آیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نئے طرز کے ساتھ پرانا طرز بھی قائم رہا۔ برخلاف دینا سانس اور رومانس کے دلدادوں کے ہماری زبان کے راہ نمادوں نے اپنے قدیم شعرا کے ادب و احترام اور نیز ان کے رنگ کی مدح سرائی اور قدر دانی میں کسی قسم کی کمی نہیں کی۔ سولانا حالی کی ”یادگار غالب“ اور آزاد کا مطبوعہ ”دیوان ذوق“ ہمارے

سے نشاۃ ثانیہ یعنی پندرھویں صدی عیسوی میں یورپ میں اور علی الحفصہ ص انہی میں نون لطیفہ بلکہ جس مروجہ علوم و فنون کا فرد وسطی کے اثر سے نکل جانا اور ایک نیا طرز اختیار کرنا ہے۔

اس دعوے کی پوری طرح تائید کرتے ہیں۔ ہمارے راہبر قدامت شکن تھے بلکہ جدید رنگ کی تائید و تلقین کرنے کے باوجود وہ قدامت پرست رہے اُن کی غرض صرف یہ تھی کہ ادب اُردو کا دائرہ اتنا وسیع ہو جائے کہ اُس میں جدید رنگ بھی شامل ہو کر اُس سے پرانے رنگ کا نقص اور تکلف جاتا رہے۔ فضول مبالغے، دور از کار تہسہیں، بے مزہ لفافے، ان چیزوں کے وہ مخالف تھے اور اُن کی اصلاح کی بنیاد انھیں خرابیوں کے دور کرنے پر پڑی تھی۔

جدید رنگ کی خصوصیات | جو جو جدید رنگ پھیلتا گیا اور قوی ہوتا گیا اُسی قدر وہ مقبول ہوا اور اُس کے معرفت اور برتنے والے پیدا ہوتے گئے۔ نئی پود جو قدیم رنگ سے بالکل نا آشنا تھی اُس نے اس جدید رنگ کو بہت شوق کے ساتھ اور بہت جلد قبول کیا۔ اس رنگ کے خاص خصوصیات یہ ہیں۔ نئے سبکات اور مضامین تلاش کئے گئے غزلوں کا دائرہ جدید خیالات کے لئے تنگ اور بے مناسب پایا گیا۔ مستزاد شاعری کا دور دورہ ہوا کیونکہ ان انسان کے کہنے والوں کو زیادہ آسانی ہوتی ہے۔ قافیوں پر قابو ہوتا ہے اور اظہار خیال مائل کیا جاسکتا ہے جو غزل میں مشکل ہے ایسے مضامین جن کی عبارت میں تکلف اور تصنع کی ضرورت تھی ترک کئے گئے۔ رباعی اور قطعات پر زیادہ توجہ کی گئی۔ نیچرل مضامین جو قدیم شاعری میں پس پشت ڈال دیے گئے تھے اب پیش پیش ہو گئے اور اُن پر بالابتداع لکھا جانے لگا۔ مثلاً برکھارت، جاڑے اور گرمی کی بہاریں، دیواروں کی روانی، پہاڑوں کے خوشنما مناظر، اب ہماری جدید شاعری میں داخل ہو گئے جو قدما کے یہاں خال خال نظر آتے ہیں اسی طرح خیالی نظمیں، بیانیہ نظمیں، تاریخی نظمیں، نصیحت آمیز اور اخلاقی نظمیں، پوٹریل نظمیں، اشعار، بصورت سوال و جواب وغیرہ وغیرہ بھی جدید شاعری میں جگہ پانے لگے۔ غزلوں میں بھی بہت بڑا انقلاب ہوا اب وہ پرانے فرسودہ مضامین زلف و کاکل، کنکھی چوٹی، مستی کا جل وغیرہ کے معیوب سمجھے جانے لگے، اب جذبات انسانی، اور کیفیات قلبی کا من و عنان اظہار اور بے ثباتی دنیا وغیرہ کا نہایت پر اثر الفاظ میں بیان کیا جاتا

داخل فیشن ہو گیا۔ حسرت موہانی اور عزیز لکھنوی کی غزلیں اسی قبیل کی ہوتی ہیں۔

اصناف سخن میں جدتیں | ایجاد اور اختراع کے شوق کی ترقی کے ساتھ کچھ ایسے لوگ بھی پیدا ہوئے جنہوں نے انگریزی نظموں کی بعض بحر میں اردو میں داخل کرنے کی کوشش کی مگر اس بات کا خیال نہیں رکھا کہ اُس قسم کی نظمیں بہ لحاظ اپنی نوعیت کے زبان اردو سے میل نہیں کھاتیں۔ اسی طرح مینک درس (نثر مرجز) کے بھی بہت شائق پیدا ہو گئے مگر اس کو بھی پبلک مذاق نے پسند نہیں کیا اور یہ صنف بھی اردو میں بالکل نامقبول رہی۔ ابستہ میں بعض مشہور اور کثرت مشق استادوں نے اس پر طبع آزمائی کی تھی، مثلاً مولوی سید علی حیدر صاحب طباطبائی، مولانا شرم حوم، آزاد کا کوڑی وغیرہ اب بھی کچھ لوگ اس قسم کی بے قافیہ نظمیں لکھتے ہیں مگر ان کو دراج عام شہرت نہیں دیتا۔ مولوی عظمت اللہ نے یہ جدت کی ہے کہ ہندی دو ہروں کی پیروی اور نظم میں شرم درج کر دی اور الفاظ اور مضامین وغیرہ بھی ہندی ہی ہوتے ہیں۔ اکثر ایسی نظمیں نہایت دلکش اور بامزہ ہوتی ہیں اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ قدیم طرز اور معمولی اصناف سخن بالکل بھلا دیے گئے تھے۔ ایسا نہیں ہوا۔ سندس یعنی چھ مصرعہ والی نظم کو جو مرثیہ کے واسطے مخصوص ہو گئی تھی، مولانا حالی نے اپنی مشہور کتاب ”مدو جز اسلام“ معروف بہ ”سندس حالی“ لکھ کے شہرت جاودانی بخشی۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد سے اس صنف خاص کا بہت رواج ہو گیا اور اب یہ اس قدر مقبول ہے کہ ہر قسم کی نظمیں نیچرل بیان، مدحیہ، اخلاقی، سیاسی، وطنی ترانے، تاریخی نظمیں سب اسی صورت میں لکھی جاتی ہیں اور اُس کی وجہ ظاہر ہے۔ اُس کی بحر میں نہایت زور دالا اور خوش آئند معلوم ہوتی ہیں۔ سلسلہ بیان کا اس صنف میں بہت موقع ملتا ہے۔ چاروں مصرعوں کے ہم قافیہ ہونے کی وجہ سے کوئی رکاوٹ نہیں پیدا ہوتی جس نے شعر کا لطف اور ترنم بڑھ جاتا ہے۔ سندس کے علاوہ اور اصناف نظم میں بھی مضمون کے ساتھ مناسبت اور میل کا بہت لحاظ رکھا جاتا ہے نفس شعر میں یہ تغیر ہوا ہے کہ ماوہ گوئی اور مبالغہ آمیز باتیں ترک کر دی گئی ہیں۔

اور اب سادگی صفائی اور واقفیت شعر کی جان سمجھی جاتی ہے اسی وجہ سے زمانہ موجودہ کی نظمیں بہت کثر اور جذبات سے بھری ہوتی ہیں۔

جدید رنگ کے اثرات | انگریزی طرز تعلیم نے اس عام افسردگی کو دور کر دیا جو آخر آخر میں لکھنؤ والوں کی شاعری پر چھا گئی تھی۔ اس نے شاعری کا دائرہ وسیع کیا اور ایک نئی روح آزادی اور بلند خیالی کی بھونکی۔ شعر کی ترقی اور جدید فن تنقید اور ڈراما نویس کے رواج کا بھی وہی باعث ہوئی۔ اس کی وجہ سے ایک وسیع اور قیمتی ذخیرہ الفاظ، نئے تخیلات، نئی تشبیہات، نئے نئے مناظر اور شعر کے نئے نئے سامان زینت فراہم ہوئے۔ نئے نئے خیال ہاتھ آئے اور ان خیالات کے اظہار کے لئے نئی طرزیں اور صورتیں اختیار کی گئیں۔ اس کی مدد سے اکثر جدید الفاظ زبان میں داخل ہوئے اور زبان اس قابل ہو گئی کہ معنی کا نازک نازک فرق الفاظ کے ذریعہ سے ادا کر سکے۔ انگریزی تعلیم کے اثر نے زبان اردو کو قدامت پرستی کی زنجیروں سے آزاد کیا جس نے لوگوں کے دل و دماغ کو ایسا جکڑ رکھا تھا کہ ان کے خیالات میں نوعِ بانی نہیں رہا تھا۔ ان کا مطلع نظر محدود ہو گیا تھا اور ان کی ذہانت و طباعی رنگ خوردہ ہو گئی تھی۔ ہندوستان کی دیسی زبانوں میں اس کی وجہ سے گویا گایا پلٹ ہو گئی اور اب ایک درخشاں مستقبل اپنے سامنے رکھتی ہیں، اور نئے تجارب اختیار کرتے اور نئے خیالات کے اظہار میں ان کو اپنے اوپر پورا بھروسہ ہے اس نے ان میں اتنا تغیر عظیم پیدا کر دیا ہے کہ زمانہ حال کی تصانیف ان زبانوں میں گویا دوسری زبان کی تصنیفیں معلوم ہوتی ہیں مگر اس میں بھی شک نہیں کہ ان خوبیوں کے باوجود بعض خرابیاں بھی اسی کی وجہ سے پیدا ہوئیں مثلاً مقررہ قواعد عروض سے لاپرواہی، ہر قسم کے قابل و ناقابل مضمون کو شعر کے سانچے میں ڈھالنا انگریزی الفاظ کی بھرمار بھر بھی اگر غور سے دیکھا جائے تو اس کے فوائد نقصانات سے زیادہ ہیں اور یہ خرابیاں بھی جو آج پیش نظر ہیں کسی وقت دفع ہو جائیں گی۔

جدید ادب اردو کے نئے طرز پہلا طرز ان لوگوں کا ہے جو سب سے پہلے دیکھا اپنا نصب العین سمجھتے

ہیں یعنی قدامت پسند فرقہ جو بجائے زمانہ موجودہ کے گذشتہ زمانہ میں زندگی بسر کرتا معلوم ہوتا ہے۔ ان کو اگلے وقت کی زبان تو پسند ہے اور خود اپنی زبان کسی طرح پسند نہیں آتی۔ اپنے کلام کو قدیم سانچے میں ڈھالتے اور جدید طرز سے نفرت کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک معمولات زندگی پر غور کرنا بھی ایک گناہ کبیرہ ہے اور یہ اس کو ایک بڑے فخر کی بات سمجھتے ہیں کہ ایسے مضامین جس میں کچھ فلسفہ کچھ تصوف اور کچھ عاشقانہ رنگ کی آئینرش ہو بس انھیں میں شمار کئے جائیں۔ اگر ان کو حقیقی تصوف اور عاشقانہ رنگ سے لگا دیتا تو البتہ معذور تھے مگر بغیر کسی تعلق کے یہ اتنا قدما کے محض نقال کہہ جاسکتے ہیں یا الفاظی کے شعبہ بانہ پرانے مضامین کے ساتھ پرانی بھریں اور الفاظ استعمال کرنے میں بھی ان کو انہماک ہے۔ یہ لوگ اس وجہ سے شعر کہتے ہیں کہ صرف شاعری کو دلیل علم و قابلیت جانتے ہیں ایسے ہی لوگوں پر انگریزی شاعر پیپ کا وہ شعر صادق آتا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے۔

”وہ شعر اس وجہ سے کہتے ہیں کہ ان کے باپ بھی شعر کہتے تھے اور اپنی عدم ذہانت سے اپنی ناخلفی کا اظہار کرتے ہیں۔“

ظاہر ہے کہ ایسے لوگ سچے شاعر کہلانے کے کیونکر مستحق ہو سکتے ہیں البتہ شاعروں کے نقال کہے جاسکتے ہیں۔ اسی قسم کے لوگوں کے کلام سے آج کل کے رسالے اور گلہ سے بھرے ہوتے ہیں مگر ان کے ساتھ ہی کچھ ایسے بھی ہیں جو قدیم طرز کی پیردی زیادہ قابلیت اور ہوشیاری سے کرتے ہیں اور قدما کی جانشینی کے مستحق سمجھے جاسکتے ہیں۔ مگر ہمارے ملک کے بعض طبیعت دار نوجوان ان لوگوں کے کلام کو بھی پسند نہیں کرتے غرض کہ طرز قدیم کے قابل اور ناقابل دونوں قسم کے پیردی زمانہ موجودہ کی رفتار سے پیچھے چلے جاتے ہیں اور فی الحقیقت اگر زمانہ موجودہ کی ضروریات پر نظر ڈالی جائے تو یہ کوئی مفید خدمت بھی انجام نہیں دیتے البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی کوششوں سے شاعری کا لنگر حرکت میں ضرور ہے۔

دوسرا طبقہ یہ طبقہ طبقہ اول کی بالکل ضد ہے۔ یہ مغربی چیز کا عاشق و دلدادہ ہے۔ اپنے

ملک کی پرانی روایات کو نظر حثارت سے دیکھتا ہے۔ مغربی شاعری کی تعریفوں میں زمین و آسمان کے قلابے ملتا ہے اور اتنا نہیں سمجھتا ہے کہ مغربی شاعری مشرقی لوگوں کے کہاں تک حسب حال اور مناسب ہو سکتی ہے۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ مغربی تعلیم کی شرابی نے ان لوگوں کے دماغوں کو چکرایا اور اتنا سد ہوش کر دیا ہے کہ وہ کوئی اصحیح رائے نہیں قائم کر سکتے۔ اس طرز کے بانیوں نے محض نقل کو اصل الاصول قرار دیا ہے۔ وہ ہر چیز کو نئے رنگ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ پرانے زمانے سے اور پرانے زمانے کی باتوں سے یا تو شرماتے ہیں یا ان کی بے اعتنائی سے ٹال دیتے ہیں ایسے لوگوں کے نزدیک جدت اور صرف جدت شاعری کی جان ہے۔ یہ لوگ اس بات کی مطلق پروا نہیں کرتے کہ ان کا کلام کسی قسم کا اثر کرتا ہے یا نہیں اور حالات ملکی کے مناسب ہے یا نہیں۔ اسی قسم کے لوگوں نے کتابوں کے آرٹ کو ترجموں سے بھر دیا ہے وہ بھی نہایت بے سلیقگی سے محض فروخت کی غرض سے کئے گئے ہیں ان ترجموں میں یہ بہت بڑا نقص ہے کہ علاوہ غلط اور غیر معتبر ہونے کے وہ عمدہ اور مستند کتابوں کے بھی ترجمے نہیں ہوتے بلکہ صرف ایسی کتابوں کے ترجمے ہوتے ہیں جو پسندیدہ عوام ہیں۔ مثلاً انگریزی ناولسٹ رینالڈس کے تراجم۔ اور اس پر بھی غضب یہ ہے کہ اکثر ترجمے اصل سے نہیں کیے جاتے بلکہ ترجمہ ترجمہ ہوتے ہیں جس سے اصلیت بالکل مفقود ہو جاتی ہے۔ اس ترجمہ کے شوق بلکہ ناکارہ کتابوں کے ترجمہ کے شوق کے ساتھ ایک نیا طرز تحریر بھی اختیار کیا گیا ہے جس کو انگریز جو رنیلین کہتے ہیں یعنی ایک ایسی ناقص اور نامکمل زبان جو نہ پوری طرح سے خیالات کے اظہار پر قادر ہے نہ معنی کے نازک نازک فرقوں کو الفاظ کے ذریعہ سے ظاہر کر سکتی ہے یہ حال عام طور پر ان کے لیے ہے کہ ناول نویسوں کا ہے جن کی لغو اور مضرت تصانیف سے بازار بھر اہل ہے۔ نیز جلد باریا اخبار نویسوں کا بھی یہی حال ہے۔ پرانے طرز کو ترک کرنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ طرز ادا نامکمل ہو، رنگ فوق الہرک ہو۔ اور عبارت طرز ہجون بن جائے۔ ادیبوں کو اس کا ضرور خیال رکھنا چاہیے کہ بدنامی کو خوبصورتی پر بھدے پن کو حسن تناسب پر اور شور و غل کو نغمے پر ہرگز

جو اپنے وقت کے ایک مشہور و معروف عالم تھے اور بزائے غیاث الدین بلبن ہرات سے
ہندوستان آئے تھے اور کچھ گاؤں پانی پت کے قریب اُن کے گزارہ کے واسطے بادشاہ نے مقرر
کر دیے تھے۔ وہ پانی پت کے قاضی بھی مقرر ہوئے تھے اور اجناس بازاری کے نرخ کا تقرر
اور عیدین میں نماز پڑھانے کی خدمت اُن کے سپرد ہوئی تھی۔ خواجہ صاحب کے والد خواجہ
ایز بخش غربت اور ناداری کی حالت میں زندگی بسر کرتے تھے جب اُن کا انتقال ہوا تو خواجہ
صاحب کی عمر نو برس کی تھی۔ اُن کے والد کو ایک مجنونانہ کیفیت رہتی تھی لہذا اُن کی تعلیم و
تربیت کا بار اُن کے بڑے بھائی اور بہن پر پڑا۔ اُس زمانہ کے دستور کے مطابق قرآن شریف
حفظ کرنے کے بعد انھوں نے رسمی تعلیم عربی و فارسی کی شروع کی سید حفیظ علی میرمنون دہلوی
کے بھائی سے فارسی پڑھی اور مولوی ابراہیم حسین انصاری سے جو بعد فراغت علوم کھنوسے
واپس گئے تھے عربی شروع کی۔ انھیں ادبیات سے فراغت نہیں ہوئی تھی اور ہنوز سترہ برس
کی عمر کو نہیں پہنچے تھے کہ ان کی شادی ان کی مرضی کے خلاف کر دی گئی۔ تحصیل علم کے شوق
میں اور نیز اس خیال سے کہ بیوی کے خبر گیراں خوش حال ہیں یہ چپکے سے گھر چھوڑ کر ۵۵ھ
میں دلی چلے گئے یہاں مولوی نواز شعلی سے جو اُس زمانہ کے ایک مشہور معلم اور واعظ تھے
سال ڈیڑھ سال تک عربی پڑھتے رہے۔ اس وقت ان کو صرف دو نحو۔ منطق۔ عروض وغیرہ
میں کافی دستگاہ ہو گئی تھی۔ مگر ۵۵ھ میں اپنے اعزاء کے اصرار سے پھر پانی پت واپس گئے
یہاں اپنے طور پر کتب بینی کا مشغلہ جاری رہا۔ ۵۷ھ میں کلکتری حصار میں ایک ملازمت کر لی
مگر غدر ۵۷ھ کے ہنگامہ کی وجہ سے پھر اپنے وطن واپس آئے۔ اب کی مرتبہ منطق و فلسفہ کے
ساتھ حدیث و تفسیر کی کتابیں بھی نظر سے گذریں۔ غرض کہ تین چار برس پانی پت میں قیام کے
بعد ان سے نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے جو کہ جہانگیر آباد ضلع بلند شہر کے رئیس اعظم تھے ملاقات
ہو گئی اور نیز ان کی مصاحبت میں رہنے کا موقع مل گیا۔ نواب صاحب موصوفت ایک جید فاضل
اور مشہور شاعر تھے اردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے تھے۔ یہ سلسلہ مختلف فیہ ہے

کہ آیا حالی نے اپنا کلام شیفۃ کو دکھلایا اور ان سے اصلاح لیتے تھے یا نہیں مگر اس میں کوئی شک نہیں جیسا کہ خواجہ صاحب کو خود اعتراف ہے کہ نواب صاحب کی ملازمت اور صحبت سے ان کو بہت کچھ فائدہ پہونچا۔ ان کے اس شعر سے اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ وہ شیفۃ سے استفادہ سخن کرتے تھے۔

حالی سخن میں شیفۃ سے مستفیض ہوں	شاگرد میرزا کا مقلد ہوں میر کا
---------------------------------	--------------------------------

جہانگیر آباد کی شاعرانہ نضا۔ نواب صاحب کی محبت وہاں کی فارغ البالی کی زندگی۔ ان سب چیزوں نے پُرانا شعر و شاعری کا شرق جو ایک مدت سے افسردہ ہو رہا تھا از سر نو تازہ کر دیا اور اب یہ اپنی غزلیں مرزا غالب کے پاس بہ نظر اصلاح دلی بھیجنے لگے وہ شیفۃ کے پاس بحیثیت اُن کے رفیق اور ان کے بیٹوں کے معلم کے تقریباً آٹھ برس رہے۔ اس کے بعد وہ قسمت آزمائی کے لیے لاہور آئے جو اس وقت دلی سے بعد غدر نکلے ہوئے لوگوں کا ملجا و ماویٰ ہو رہا تھا۔ یہاں ان کو گورنمنٹ کالج پو میں ایک جگہ مل گئی جس میں ان کو سرشہ تعلیم کی انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی ہوئی کتابوں کی عبارت دیکھنا اور درست کرنا پڑتی تھی چونکہ اس کام میں انگریزی ادب سے ایک قسم کی بالواسطہ واقفیت حاصل ہو گئی اور انگریزی خیالات اور طرز ادا سے ایک خاص مناسبت پیدا ہو گئی تھی لہذا مشرقی شاعری اور مشرقی انشا بردازی کی فضول باتوں کی وقعت اُن کے دل میں کم ہو گئی اور اسی کے ساتھ اپنی زبان اور اپنی شاعری میں بھی اسی طرز کی اصلاح کا خیال پیدا ہوا۔ یہ اس جگہ پر تقریباً چار برس رہے ہوئے کہ وہاں سے دلی واپس آنا پڑا جہاں اُن کو انگلو عربک اسکول میں شجری کی جگہ مل گئی۔ لاہور میں حفیس کالج میں بھی آٹھ مہینے تک وہ شجرہ چکے تھے مگر وہ جگہ اُن کو پسند نہیں آئی تھی۔ دلی میں سرسید مرحوم سے ان سے ملاقات ہوئی جن کی خاص فرمائش سے مشہور و معروف "مسدس حالی" لکھا۔ ۱۸۸۷ء میں جب کہ وہ عربی کالج میں معلم تھے سر آسماں جاہ علی گڑھ آئے ہوئے تھے جن سے سرسید مرحوم نے انکا تعارف کرا دیا اور انھوں نے اندازہ قدر دانی و مردم شناسی پچھتر دوسرے ماہ اور نظام گورنمنٹ سے

ادبی خدمات کی انجام دہی کے واسطے اُن کا مقرر کر دیا۔ بعد کو جبکہ مولانا حالی علی گڑھ کالج کے ڈیپوٹیشن کے ساتھ حیدر آباد گئے تھے تو یہ تنخواہ مبلغ توڑ پیر یا ہوا کر دی گئی تھی ملازمت سے دست کشی کے بعد مولانا نے پانی پت میں سکونت اختیار کر لی تھی جہاں ایک قسم کی فارغ البالی کے ساتھ اپنے محبوب شغل تصنیف و تالیف میں وہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ۱۹۱۲ء میں خطاب شمس العلماء بجلد دے ان کی قابلیت اور تعلیمی خدمات کے سرکار سے عطا ہوا۔ بالآخر ستمبر برس کی طویل عمر میں ۱۳ صفر ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۹۱۴ء کو اس دارِ پائدار سے رحلت کی۔

مولانا حالی پرانے زمانے کے یادگار لوگوں میں تھے۔ نہایت خلیق النساء، حلیم الطبع اور سچے فدائی قوم دنیوی جاہ و ثروت کا خیال اُن کے دل میں مطلق نہ تھا۔ ان کی زندگی ایک سچے انشا پر دار کی زندگی تھی جس نے اپنے تعلیمی و تصنیفی مشاغل کے آگے دنیوی مرتبہ و عزت کو ہمیشہ پیچ بٹھا۔ قومی ہمدردی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی مگر اس کے ساتھ فرقہ دارانہ اختلافات سے وہ بالکل علیحدہ تھے۔ اُن کا مطلع نظر بہت بلند تھا اور لم تقوْ لُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ؕ کے وہ پورے عامل تھے۔

سما کی شاعری اور اُس پر حالی کی شاعری کی ابتداء دہلی میں ہوئی۔ جبکہ وہ سترہ برس کی عمر غالب اور شیفتہ کا اثر میں چھپ کر گھر سے نکل گئے تھے دلی میں وہ مرزا غالب کی صحبت میں اکثر آئے جاتے تھے اور انھیں کے سامنے زانوئے شاگردی سہ گیا تھا۔ اس ناشایں وہ شاعروں میں بھی شریک ہوتے اور نکات شریہ مرزا غالب ہی سے حل کرتے تھے مرزا بھی ان سے بہت خوش تھے اور اُن کی طباعی اور مستعدی کی قدر کرتے تھے دلی چھوڑنے کے بعد وہ جہانگیر آباد آئے جہاں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کی صحبت میں اُن کی شاعری کے رنگ میں پختگی آئی نواب صاحب کی صحبت اُن کی شعر گوئی کی محرک ہوئی تھی اور یہیں انھوں نے اپنا رنگ بدلا اور مقصد شاعری کو بھی تبدیل کیا اب ان کو پرانے رنگ کی فضول باتیں اور بے لطف مبالغے پسند نہیں آتے تھے کسی چیز کا من و عن بیان پر سادے الفاظ میں جس میں حقیقی جذبات

کا بھی کچھ شمول ہوا اب اُن کو مرغوب ہونے لگا۔ مرزا غالب سے اب بھی وہ اصلاح لیتے تھے
 اور انھیں کا رنگ اُن پر غالب تھا۔ ہر چند کہ شیفتہ کا اثر اور رنگ اُن کے اس زمانہ کے کلام
 میں بہت کچھ پایا جاتا ہے نواب صاحب کے انتقال کے بعد وہ جہانگیر آباد سے لاہور آئے۔
 مگر یہاں ان کا دل نہیں لگتا تھا اور یہاں کا قیام وہ اپنے واسطے ایک قید سمجھتے تھے چنانچہ
 اس زمانہ کے لاہور کے حالات اور وہاں کے لوگوں کی بے اعتنائی کا حال جو انھوں نے قلمبند
 کیا ہے اس سے ان کے دلی خیالات کا پورا اندازہ ہو جاتا ہو مگر یہیں لاہور میں گورنمنٹ بک ڈپو
 کی ملازمت میں اُن کو انگریزی علم ادب سے ترجموں کے ذریعہ سے واقفیت حاصل ہوئی جس کا اثر
 ان پر بہت چھا پڑا۔ یہ زمانہ ان کی علمی زندگی کے سُرخ بدل جانے کا زمانہ تھا اور ان کے اس
 زمانہ کی تحریروں میں ہم کو اس جدید رنگ کی ابتدائی نظر آتی ہے جو بعد کو ان کی زندگی کا
 بہت بڑا کارنامہ ثابت ہوا۔ انگریزی شاعری کے بڑے مداح تھے اور اُس کی سادگی اور
 صفائی اور بلند نظری کو بہت پسند کرتے تھے ان کا دل چاہتا تھا کہ کاش یہی سب چیزیں ہمارے
 ملک کی شاعری میں بھی داخل ہو جائیں۔ اسی زمانہ میں لاہور میں ۱۸۷۷ء میں ایک ادبی انجمن
 قائم تھی جس کے بانی مولانا محمد حسین آزاد اور کرنیل ہارلڈ ڈارکٹر سرسرتیہ تعلیم پنجاب اُس کے
 سرپرست تھے۔ اس انجمن کے جلسوں میں گو مشاعرے ہوتے مگر وہ اس زمانہ کے مشاعرہ نگار
 طرح نہیں تھے یعنی نہ تو کوئی مصرعہ طرح مقرر کیا جاتا نہ کسی خاص ردیفہ قافیہ کی پیری
 کی جاتی۔ لوگ اپنے اپنے اخبار جو کسی خاص مضمون پر لکھے جاتے جو انجمن کی طرف سے پہلے سے
 مقرر ہو جاتا تھا انجمن کے جلسوں میں پڑھتے تھے۔ حالی گو کہ اس انجمن کے بانیوں میں مدھے مگر
 اس کے ابتدائی شرکار میں ضرور تھے اور اس کے جلسوں کی شرکت میں بڑی سرگرمی حصہ
 لیتے تھے چنانچہ ان کی چار نظمیں ”برکھارت نشاط اید مناظرہ و رحم و انصاف اور حب وطن“
 اسی انجمن کے مشاعروں میں پڑھی گئی تھیں اور بہت مقبول ہوئی تھیں۔
 سرسید کا اثر غالب اور شیفتہ کا اثر اُن کی شاعری پر بطور بالائیں بیان ہوا اب دیکھنا

چاہیے کہ سر سید مرحوم نے ان کی شاعری پر کیا اثر ڈالا۔ سر سید اس زمانہ میں مسلمانوں کو ان کے خواب غفلت سے جوق نکانے اور ان کی اصلاح کے کام میں مشغول تھے۔ جب انھوں نے حالی کی طبیعت کا رنگ دیکھا تو ان سے کہا کہ موجودہ مسلمانوں کے زوال کے متعلق ایک نظم لکھ دو جس میں حالی اسی کوشش کا نتیجہ تھلا۔ یہ نہایت کامیاب کتاب ثابت ہوئی اور چھپنے کے ساتھ ہی فروغ مقبول عام ہو گئی۔ ان کا رنگ اس قدر مقبول ہوا کہ اُس کے بہت سے ناقل پیدا ہو گئے مگر اب تک کسی شخص کو اس صنف میں وہ کامیابی نہیں نصیب ہوئی جو مولانا حالی کو ہوئی جس کے وہ فی الواقع مستحق تھے اب وہ ایک قومی شاعر کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ سندس کے بعد بعض اور نظمیں دہلی کی تباہی اور بربادی پر اور حکیم محمود خاں صاحب کا مرقیہ جس میں مسلمانوں کی زندان گذشتہ کی عظمت اور زندان موجودہ کی پستی کا نہایت مؤثر الفاظ میں نقشہ کھینچا ہے اسی رنگ میں لکھا گیا۔ ان نظموں سے ان کی شہرت ایک رفتار مزید طیب کی ہو گئی۔ وہ اپنے ہم ندموں کو اپنے پر زور اور مؤثر الفاظ کے ذریعہ سے ابھارے تھے کہ اب وقت آگیا ہے کہ کمر ہمت باندھیں اور اپنی قوم کو تعزالت سے نکالنے میں جو کچھ ان سے ہو سکے مدد دیں۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کے مخاطب ان کے اہل مذہب ہی نہیں بلکہ کل اہل وطن یعنی اہل ہند تھے۔ ان کے اعلیٰ خیالات شریف عورتوں کے متعلق ”چپ کی داد“ اور ”مناجات بیوہ“ کی صورت میں ظاہر ہوئے جو نہایت مؤثر اور دلکش نظمیں ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے اشعار فلسفیانہ اور عیسائی ہوتے تھے جیسا کہ ان کے ترکیب بند ”تحفۃ الاخوان“ سے ظاہر ہے۔

تصانیف مولانا حالی کی منظوم تصانیف حسب ذیل ہیں۔ ان کی نشر کی تصانیف نشر کے باب میں بیان کی جائیں گی۔

(۱) شریان منظرہ تعصب و انصاف و حمد و انصاف برکھارت نشاط امید
حب وطن۔ (۲) سندس حالی۔ (۳) شکوہ ہند (۴) کلیات حالی جس میں ان کا
دیوان مع مقدمہ شعر و شاعری شائع ہوا ہے۔ (۵) مناجات بیوہ، اور چپ کی داد۔

(۶) مرثی غالب و حکیم محمود خاں و تباہی دہلی وغیرہ (۷) مجموعہ نظم حال جس میں اردو کی متفرق نظمیں ہیں (۸) مجموعہ نظم فارسی جس میں فارسی کا کلام ہے۔

مثنویاں | ان کی مثنویاں بہت مقبول ہوئیں۔ یہاں تک کہ بعض تو یونیورسٹیوں کے کورس میں داخل ہیں۔ ان کی عمارت بہت صاف اور بے تکلف مشرقی مبالغے اور صنائع بدائع سے خالی ہے ان میں خلاقی تعلیم نہایت مؤثر اور دل فریب انداز سے دی گئی ہے اور کہیں کہیں بصورت مکالمہ ہے جس میں ہر فرد کی اچھائیاں اور بُرائیاں نہایت حسن و خوبی کے ساتھ واقعات تاریخی کے حوالوں سے بیان کی گئی ہیں مثلاً مثنوی رحم و انصاف میں رحم اور انصاف دونوں اپنی اپنی تفصیلات اور دوسرے کی خرابیاں اور نقص ایک دلکش انداز سے بیان کرتے ہیں۔ انکا فیصلہ عقل کے پسو کیا جاتا ہے جو فیصلہ کرتی ہے کہ تم دونوں ایک دوسرے کے لازم و ملزوم اور معاون و مددگار ہو۔ مثنوی پرکھارت بھی نہایت محفوار و چمپ مثنوی ہے اس میں ہندوستان کے موسم بہار یعنی برسات کا حال بڑی خوبی اور دل فریبی سے بیان کیا گیا ہے مثلاً بارش کے فائدے پھاٹوں اور میدانوں میں اس موسم میں نرش زمر دین کا بچہ جانا بکل جاندار ہستیوں میں ایک خاص قسم کی زندگی اور امنگ کا پیدا ہونا وغیرہ۔ اس کی زبان بے تکلف اور سہل اور طرز ادا نہایت سنجیدہ ہے۔ فضول مبالغے اور دور از کار تشبیہیں اور استعارے اس میں مطلق نہیں۔ یہ اس رنگ کی ابتدائی تصنیف ہے جس میں مولانا کو آخر عمر میں کمال حاصل ہوا البتہ اگر میرا نے شعرا کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو یہ نظیں بہ لحاظ زبان و تخیل کے کوئی اعلیٰ درجہ کا کمال نہیں رکھتیں۔ مگر اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ ایک ایسے رنگ کی راہبر ہیں جس میں لوگوں کے اب یہ دل نشیں ہوتا جاتا ہے کہ علاوہ معمولی فرسودہ مضامین شاعری کے کچھ اور بھی چیزیں ہیں جن پر شاعر بخوبی طبع آزمائی کر سکتا ہے۔

مدرسہ حالی | مولانا کی یہ سب سے زیادہ مقبول اور سب سے زیادہ مشہور تصنیف ہے۔ یہ ایک نیا دور پیدا کرنے والی کتاب ہے اس کی مقبولیت اب بھی ویسی ہی ہے جیسی کہ پہلے تھی۔ یہ ایک

الہامی کتاب ہے اور اسکو تاریخ ارتقا ادب اردو میں ایک سنگ نشان سمجھنا چاہیے یہ
ایک نیا مارہ ہے جو اردو کے افق شاعری پر طلوع ہوا۔ اس سے ہندوستان میں قومی اور
وطنی نظموں کی بنیاد پڑی اور اس نے یہ ثابت کر دیا کہ ایسی پُر اثر اور پُر درد نظموں کے
واسطے مسدس نہایت موزوں چیز ہے۔ اس کے بہت سے نقال پیدا ہوئے مگر کوئی شخص
اب تک یہ لحاظ جوش اور زور تخیل اور طرز ادا کے مولانا تک نہیں پہنچا۔ اس میں اسلام کی
گذشتہ عظمت مسلمانان سابق کے کارنامے، اُن کے بلند خیالات اور اولوالعزمیاں اور
برخلاف اس کے زمانہ موجودہ میں اُنکی پستی و زوال اور سستی و کمالی کا ذکر ہے۔ آخر میں مسلمانوں
سے اپیل کی گئی ہے کہ تاریخ عالم میں جو اُن کا مرتبہ پہلے تھا اب پھر اُس کو حاصل کرنے کے لیے
مکرمیت باندھیں۔ یہ کتاب بوڑھے جوان بچے سب کے دل پسند ہے۔ اس نے کاروان مسلم
کے لئے بانگ جس کا کام کیا کہ اُنھیں اور آمادہ کار ہوں طبع ہوتے ہی اس کی عظیم الشان
اشاعت ہوئی زمانہ حال کی کوئی اردو کی کتاب مقبولیت میں اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔
ہندوستان کا ہر بڑھا لکھا مسلمان اس سے آشنا ہے اور کچھ عرصہ ہوا کہ بہت سے لوگوں کو
تو یہ حفظ تھی۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ تمام قومی اچھائیوں اور برائیوں کا ایک
ساتھ جائزہ لیتی ہے یعنی اچھائیاں زمانہ گذشتہ کی اور برائیاں زمانہ موجودہ کی۔ اس میں شاعر
زمانہ جاہلیت کی حالت، جزیرہ نماے عرب کی تمام تمدن دنیا سے انقطاعی صورت
عرب اقوام کا آپس میں ذرا ذرا سی بات پورننا جھگڑنا اُن کا تعصب اور ناروا داری۔ اُن کا
طفیان ویت پرستی وغیرہ وغیرہ نہایت صحیح واقعہ نگاری کے طریق پر دکھایا ہے۔ اسی
حالت میں پیغمبر اسلام کا ظہور ہوتا ہے۔ آپ کی تبلیغ کے ابتدائی فترات اعلیٰ کلام حق
نویس علوم۔ استیصال ظلم و تعصب۔ اصلاح اخلاق اور اُن تمام خوبیوں کی نشر و اشاعت
جن کے مفقود ہونے سے آج کل اہل اسلام مورد آفات ہو رہے ہیں اور جن کی کیفیت
آخر کتاب میں نہایت وضاحت اور اثر سے لکھی ہے۔ اس میں اسلام کی وہ تمام بیش بہا خدیں

کی گئی ہیں جو اُس نے اپنے علوم و فنون کے ذریعہ سے اخلاقی اور علمی دنیا میں کی ہیں۔ پھر مسلمانوں کی تعمیرِ بلاد اور سیر و سیاحت کا ذکر ہے جس میں یہ بتایا ہے کہ وہ اپنے وطن سے نکل کر دور دراز مقامات پر مثلاً اسپین میں جبرالٹر اور ہندوستان میں کوہ ہمالہ تک پہنچ گئے

ہمالہ کو ہیں واقعات ان کے ازبر

نشان ان کے باقی ہیں جبرالٹر پر

سر سید مرحوم اس کتاب کے متعلق یوں رائے زنی کرتے ہیں:-

”یہ کتاب بالکل مناسب ہوگا کہ اس کتاب نے ہماری صنفِ نظم میں ایک نیا دور پیدا کر دیا اس کی عبارت کی خوبی اور صفائی اور روانی کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ یہ امر کچھ تعجب خیز نہیں کہ اتنا مہتمم پاشا ان مضمون اس قدر واقعیت کی پابندی کے ساتھ ادبِ بلاغت اور مبالغہ اور تخیل و استعارہ کے جو کہ ہماری شاعری کی جان اور شاعروں کا ایمان ہے اور پھر اس قدر مؤثر اور سلیس اور فصیح طریقہ سے بیان کیا جائے اُس کے بہت سے بند تو ایسے ہیں کہ ان کو پڑھ کر سخت سے سخت دل کے لوگ بھی بغیر آنسو ہائے نہیں رہ سکتے کیوں نہ ہو جو چیزوں سے نکلتی ہے وہ ضرور دل میں گھر کرتی ہے۔“

شکوہ ہند | شکوہ ہند اور قصیدہ غیاثیہ بھی مسدس مدو جزو اسلام کے طرز میں ہیں یعنی ان میں بھی وہی بیانِ اسلام کی قدیمی شان و شوکت اور موجودہ پستی و نکبت کا ہے جو اب ہندوستان میں رونما ہے۔ ترک لذات کی جگہ زینداری سوانگی کی جگہ آرام طلبی، قوت اور مردانگی کے عوض ضعف اور لودائیں، چالاک کی دستبرد کے بدلے سستی و کالی اب گھر گھر نظر آتی ہے۔ اس مرتع میں کہیں کہیں تصاویر کا رنگ شوخ اور تیز ہو گیا ہے مگر صرف اس غرض سے کہ خوابیدہ جماعت چوٹے اور اپنے خوب غفلت سے بیدار ہو۔

مراثی | مرثیہ مرزا غالب و حکیم محمود خان وغیرہ بھی نہایت دلچسپ و مؤثر اور قابلِ تدریس نظمیں

لے اس کا جواب بیانِ یزدانی نے ”رخصت عروس“ کے نام سے لکھا ہے جس طرح شکوہ میں حاتی نے ہندوستان کی شکایت کی ہے کہ اس نے ہرگز شراب کیا اسی طرح رخصت عروس میں یزدانی نے خود اپنی شکایت کی ہے کہ ہم نے ہندوستان کو خراب کیا ہے

ہیں۔ اول الذکر علی الخصوص نہایت ہی درد انگیز اور پر زور مرثیہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کا رنج و غم مشکل بہ نظر ہو گیا ہے وہ سچے جذبات اور حقیقی تاثر سے بسریز اور ایک غمزدہ دل کی کیفیات کی سچی تفسیر ہے۔ سادگی یعنی شائے افراق و مبالغہ سے اس کا مقرر ہونا جو مشرقی شاعری کا جوہر ہے، اس کا نشان اقرار ہے اور فی الحقیقت یہی ایک کتاب مولانا حالی کی شہسرت شاعری کے واسطے بالکل کافی ہے حکیم محمود خاں صاحب کے مرثیہ کانگ سدس اور شکوہ کانگ ہے اس میں دلی کی تباہی اور مسلمانوں کی بستی کا ذکر نہایت اثر کے ساتھ عبرت انگیز طریقہ سے کیا ہے۔ مناجات بیوہ | یہ چھوٹی سی عجیب و غریب کتاب مولانا کی ہمارے نزدیک ”مرثیہ“ اور ”شکوہ“ سے بھی زیادہ مطبوع خلافت ہے اس کی بھر کسی قدر غیر معمولی ہے جو اصطلاح علم عروض میں ”صوت التناوب“ کہلاتی ہے۔ فعلن فعلن فعلن۔ سو مثل معاملات کی اصلاح کی ہو اس کتاب کی تصنیف کے زمانہ میں ہندوستان بھر میں پھیلی ہوئی تھی بنگال میں وریا ساگر بیوہ عورتوں کے حامی تھے مناجات بیوہ میں بیوہ عورتوں کی دردناک حالت میں اس انداز سے بیان کی گئی ہے کہ اس کو بڑھ کر یا سن کر دل پھٹ جاتا ہے اس کا ترجمہ ہندوستان کی اکثر زبانوں میں ہو گیا۔ ہے اس کتاب کے متعلق کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ اس کو بڑھتے وقت اکثر شہر دار عورتیں کہتی ہیں کہ کاش ہم بیوہ ہوتے تو اس سے زیادہ لطف اندوز ہوتے۔ اس کی تعریف اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے۔

چپ کی داد | اس کتاب میں عورتوں کی خوبیوں اور بیزاری کے اعلیٰ افراطی نصیبی کا ذکر ہے یہ حیدر آباد کن میں مصنف نے ایک بڑے جیلہ میں جس کے صدر و ملاجہ سرکشن پرشاد وزیر عظم ریاست تھے، پڑھ کر سنائی تھی یہ کتاب بھی مولانا کے خاص رنگ کی ہے یعنی اس میں بھی وہی سلاست بیان اور صفائی زبان اور سیدھی سیدھی باتیں ایک لطیف پیرایہ میں ہیں جو ان کا خاص شیوہ ہے۔ ان تمام نظموں کی یہ خاص خوبی ہے کہ فرقہ وارانہ اختلافات مصنف مرفوع ہیں۔

دیوان حالی | اس کے شروع میں مقدمہ شعر و شاعری ہے جس میں کہ نفس شاعری کی حقیقت سے نہایت فاضلانہ طور پر بحث کی گئی ہے۔ دیوان میں حسب معمول قدیم غزلیات قدیم و جدید دونوں رنگ کی رباعیات، قصائد، ترکیب بند، تاریخیں سب کچھ ہیں۔ قطعات میں اکثر کسی اخلاقی مسئلہ کو بصورت قصہ یا مکالمہ کے بیان کرتے ہیں بعض قطعات فی الواقع نہایت بلیغ اور عمیق خیالات پر مشتمل ہیں۔ غزلیات اور اصناف سخن میں سب سے زیادہ ہیں۔ اور مغلّی و پیچیدہ خیالات سے خالی ہیں۔ طرز جدید کی غزلوں میں پُرانا رنگ بدل کر زمانہ حال کی روش کی ابتدا معلوم ہوتی ہے۔ یہ سب غزلیں جذبات سے لبریز ہیں۔ بعض اشعار میں کوئی کنجیال یا واقعہ مسلسل قطعہ بند صورت میں بیان کیا گیا ہے جو موجودہ رنگ کی خاص پہچان ہے۔ رباعیات مختلف مضامین پر اکثر اخلاقی اور نصیحت آمیز ہیں۔ ان میں مفید اور کارآمد باتیں مکرر اور زوردار الفاظ میں قدام کے طرز پر بیان کی گئی ہیں جو بہت مقبول ہیں اور قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں ان کا ترجمہ انگریزی میں مٹرجی۔ اسی۔ وارڈ نے کر دیا ہے قصائد کی یہ شان ہے کہ برخلاف طریقہ سابق کے مارج کی ساری قابلیت مدوح کی مدح اور محض لفظی شان و شکوہ میں صرف نہیں ہوتی بلکہ مدوح اپنے اہم خصال اور ذمہ داریوں سے بھی آگاہ کیا جاتا ہے اور موقع موقع پر نصیحت و عبرت کی باتیں بھی اسکو سنائی جاتی ہیں۔ موجودہ حضور نظام خداداد ملک کی تخت نشینی کا قصیدہ مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔

مقدمہ شعر و شاعری | اس میں نفس شعر و شاعری سے بحث اور شعر کے اعلیٰ ترین پیل یعنی مہنگا مقصود کا ذکر ہے۔ ماہیت شعر کے متعلق مشرقی اور مغربی شعرا اور ناقدین کی رائیں نہایت تفصیل و وضاحت سے مثالوں کے ساتھ بیان کی گئی ہیں۔ مقدمہ گو کہ بڑی قابلیت سے لکھا گیا ہے مگر کسی قدر سطحی ہے لائق مصنف کا خیال ہے کہ اردو غزل اور نیر و گہ اصناف سخن اصلاح کے متعلق ہیں لہذا ان میں ضروری اصلاح ضرور ہونا چاہیے۔ وہ غزل میں مروجہ

بیان حسن و عشق کو نہیں پسند کرتے بلکہ اُس کو اُس بلند پایہ پر دیکھنا چاہتے ہیں جس میں صرف
 بہترین اور اعلیٰ ترین مظاہر دوستی و محبت کا بیان ہو۔ اسی طرح وہ عورتوں کے بناؤں نگار
 اور شیخ و زاهد سے چھپڑ چھپڑ کے بھی غزل میں حاضری نہیں ہیں۔ دائرہ غزل کو وسیع ہونا چاہیے
 اور اس میں نہ صرف عاشقانہ فلسفیانہ صوفیانہ اور اخلاقی مضامین ہوں بلکہ ان کے
 علاوہ اُس میں نیچرل قومی اور سیاسی مضامین بھی جگہ پائیں۔ دوستی زبان بھی بہت ضروری
 بنتے ہے اور الفاظ اور محاورات کی صحت کا ضرور خیال رکھا جائے اسی طرح

اے انوس سے کہنا چاہیے کہ لائق مصنف نے اس موقع پر مولانا حالی کا مفہوم نہیں سمجھا اور عام طور پر لکھ دیا
 کہ شیخ و زاهد پر چھپڑ چھپڑاں کسے اور ان کو بنانے کا اردو شاعری میں عام رواج ہو گیا ہے اُس سے لوگوں کو
 باز رہنا چاہیے۔ مولانا نے اس موقع پر جو عبارت دعاظ اور زاہد کے لفظ نے اور ان پر نکتہ چینی کے متعلق لکھی ہے
 اُس کا اہل یہ ہے کہ اس قسم کی نکتہ چینی صرف دو صورتوں میں جواز ہو سکتی ہے۔ دوسرے بالکل بیکار ہے اور اس کو ترک
 کر دینا چاہیے۔ پہلی صورت یہ ہے کہ اس قسم کی نکتہ چینی انھیں لوگوں کو ذرا سہ ہے جن کو فی الواقع اُس جماعت کے قسم
 کی مخالفت ہو دوسری صورت یہ ہے کہ اگر اس قسم کی کوئی مخالفت نہ ہو تو یہ طنز و تشبیہ ایسے طریقے سے کیا جائے
 سے مقصود اصلی ان معائب کا اظہار ہو جو اُس جماعت میں عموماً پائے جاتے ہیں۔ مثلاً یا مکر سالوس دشو منت
 درستی۔ بد خلقی وغیرہ۔ یہ کہ اُن کی ذات پر بلاوجہ حملہ کیا جائے یا اُن کی پستی میں اپنی بلندی ثابت کی جائے
 مولانا حالی نے اس مجوزہ نظر پر کے ثبوت میں ذوق کے دو شعر پیش کئے ہیں۔

رند خراب حال کو زاهد نہ چھپڑ تو تجھ کو پرائی کیا پٹری اپنی نہیڑ تو

اور اس کے آگے لکھا ہے کہ چونکہ اس شعر میں اُس خصلت کی طرف اشارہ ہے جو طیفہ زہاد و عباد میں کھڑائی
 جاتی ہے کہ اور دن کو تو ذرا اسی بات پر ملاحظہ کرتے ہیں اور آپ اپنی اصلاح سے بے خبر ہیں لہذا اس قسم
 اشعار پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ دوسرا شعر یہ ہے۔

ذوق زیبا ہے جو ہر لیش سفید شیخ پر دسمہ آب بنگ سے ہندی نے گلنگ سے

اس شعر میں کوئی بات ایسی نہیں پائی جاتی جو شیخ پرطن کی وجہ مقول ٹھہرے۔ سوائے اس کے کہ بے چارے شیخ
 کی داڑھی سفید ہے اور بعض اس خرم میں اس کو بھنگا اور شرابی بنایا گیا ہے۔

اسی اصول کثافت میں درجہ آخر مختلف لوگوں کے اس بحث پر لکھے جاتے ہیں جن سے تاثر میں خود اندازہ کر لیں گے
 کہ کوئی سا لکھ کس پر مطلق ہوتا ہے اور کس قسم کی منطق کی اہواز اس کی مانتی ہے (بقیہ اشعار ص ۴۶ پر)

صنائع بدائع یعنی شعر کے ظاہری تکلفات کی بہتات نہ ہونا چاہئے اور نہ شعر کی خوبی کا دار و مدار اُن پر رکھا جائے سنگلاخ زمینیں اور مشکل روایت قافیہ جن کے مصحفی اور شاہ نصیر وغیرہ دلدادہ تھے اُن سے احتراز کرنا چاہیے حتی الامکان روایت بھی آزاد بجائے اولیات حائلی حائلی کا مرتبہ ادب اردو میں خاص طور پر ممتاز ہے سب سے پہلے اُن ہی نے غزل و قصیدہ میں جدید رنگ شامل کیا مئس کی اہمیت علی طور پر ثابت کی اور سلمانوں کے انحطاط کا تذکرہ غزل اور مئس میں مؤثر طریقہ سے کیا۔ وطن یعنی مادر ہند پر نظمیں لکھیں طرز قدیم پر کہ جس میں تکلف و تفسیح اور ظرافت و اقبہ باتیں جزو غالب تھیں ضرب کاری لگائی بھواری خیال کو مد نظر رکھا اور عبارت کو تعقید و تکلف سے پاک کیا یاسی مضامین اپنے کلام میں داخل کئے آزاد کے ساتھ حائلی کو بھی اردو شاعری کے جدید رنگ کا بانی سمجھنا بالکل سجا ہے۔ اُن کے کلام کی خصوصیات حسب ذیل ہیں نیچر

بقیہ مضمون حاشیہ صفحہ ۴۱۵

شیخ صاحب برائیاں مے کی	اور جو کوئی کچیت کی آ جائے	(ریاض)
اک طیب دی تھی حضرت زاہد کو اسے ریاض	اب ہاتھ مل رہا ہوں کہ اچھی ٹپری نہیں	"
کسی میکیش کو دیں گے تختہ انگور کی خدمت	بجانب شیخ ٹھیکہ لے چلے میں باغ رضوان کا	(برائے)
مے بنیاد کن عرض کہ ایں جو بہر ناب	پیش اس قوم بشور اید ز خرم زرد	(غالب)
دیکھنا تاریخ سر شیخ معتم کی طوف	کیا کلس موک کا ہے گنبد و ستار پر	(ناسخ)
کماں مینانہ کلا دروازہ غالب اور کماں اعلا	برائے جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ تم نکلے	(غالب)
کب کسی در پہ چہ سائی کی	شیخ صاحب نماز کیا جانیں	(داع)

۱۵ اس موقع پر برادرینا ضروری ہے کہ مولانا حائلی روایت کے خارج کرنے کی صلاح نہیں دیتے بلکہ اُن کا نشانہ ہے کہ غزل گوئی میں جہاں تک ممکن ہو آسانی مد نظر رکھی جائے اُن کے الفاظ میں کہ شاعر کو چاہیے کہ ہمیشہ روایت ایسی اختیار کرے جو قافیہ سے میل کھاتی ہوئی ہو اور روایت و قافیہ دونوں مل کر درخت خصوصاً سے زیادہ ہوں بلکہ رفتہ رفتہ غریب لکھنی لکھنی چاہئیں اور سر دست محض قافیہ پر قناعت کرنی چاہیے

کی پیروی۔ مبالغہ اور اغراق سے احتراز۔ سادگی اور صفائی۔ جذبات اور درد و اثر اُن کی عبارت بہت صاف سادہ اور جلد سمجھ میں آنے والی ہے۔ صنائع بدائع بہت کم اور احتیاط کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ فضولِ تعلیٰ اور بے جا اظہارِ علم و فضل سے محترز رہتے ہیں۔

نقائصِ حال | وہ کہیں کہیں قواعد عروض سے باہر نکل جاتے ہیں اور صحتِ الفاظ و مخدرات کا خیال نہیں رکھتے۔ غیر مانوس انگریزی الفاظ بھی کہیں کہیں لکھ جاتے ہیں شاید اس غرض سے کہ کلام میں ایک خصوصیت پائی جائے اور معاصرین کے کلام سے تمیز ہو۔ کبھی اکھا جھیل بہت اعلیٰ ہوتا ہے اور کبھی محض تنک بند ہی کی دلدل میں پھنس کر رہ جاتے ہیں ایک رفارہ اور فیشلسٹ کی حیثیت بھی کہیں کلام کے مزے کو پھیکا کر دیتی ہے لیکن بلوچہ داس کے بھی اُن کے کمال شاعری پر کوئی حرت نہیں آتا۔ ہمیں کوئی شک و شبہ نہیں کہ جس طرح وہ قومی اور وطنی نظموں کے موجد ہیں اسی طرح مناظر قدرت اور نیرچل شاعری میں بھی اُن کا کلام لا جواب ہے اور اُن کا کلیہ احسان کبھی نہ بھولے گا کہ اُنھوں نے اردو شاعری کو ایک بڑی حد تک اُن مضر اخلاق چیزوں سے پاک و صاف کر دیا جو اُس میں سرایت کئے ہوئے تھے اور اُس میں ایک نئی روح پھونکی۔ مختصر یہ کہ ہر چند وہ شعرائے اردو کی صف اول میں شامل نہ بھی کئے جائیں مگر ادبِ اردو کے سب سے بڑے محسن وہ ضرور شمار کئے جائیں گے۔

مولانا محمد حسین آزاد شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد کو جدید رنگ کا بانی اور ادبِ اردو کا مجدد سمجھنا بالکل بجا ہے۔ زمانہ حال کے بہت بڑے ادیب، بہت مشہور نثر، نامی گرامی نقاد فنِ تعلیم کے بہت بڑے ماہر اور ایک مشہور و معروف اخبار نویس تھے۔ ان کمالات کے علاوہ جدید فارسی کے استاد کامل اور فلاوچی (علم الاسماء) کے بھی بڑے ماہر تھے اُن کی خدمات اور احسانات زبانِ اردو پر بے حد ہیں اردو شاعری میں اس رنگ کا بانی اور اُس میں ایک نئی روح پھونکنے والا اگر کوئی فی الحقیقت کہا جاسکتا ہے تو وہ مولانا کی ذات ہے وہ صحیح معنوں میں ادیب تھے اُن کے کچھ مختصر حالات آئندہ حقہ شریں بھی بیان کئے جائیں گے جس سے اکھا

حقیقی تعلق ہے۔ یہاں اُن کی شعر و شاعری کا ذکر نہایت اختصار کے ساتھ کیا جاتا ہے۔
 آزاد کی شاعری آناؤ فطری شاعر تھے اور ازل سے شاعرانہ طبیعت لائے تھے۔ اُن کی شری بھی
 اس قدر دلچسپ اور شاعرانہ تخیل رکھتی ہے کہ کسی طرح شعر سے کم نہیں ہے اُن کے والد چوکتا استاد
 ذوق کے دوست تھے اور اُن کی صحبت میں بیٹھتے اُٹھتے تھے لہذا آزاد بھی اوّل عمر میں اپنے والد
 کے ساتھ اُستاد کی خدمت میں اکثر حاضر ہوتے اور اُن کی صحبت سے فیضیاب ہوتے۔ انھیں کی
 معیت میں دلی کے بڑے بڑے مشاعروں میں شریک ہوتے تھے جہاں مشہور لسانہ فہن سے
 شناسائی کے علاوہ اُن کے کلام کے حسن و قبح سے بھی بخوبی واقف ہوتے جاتے تھے۔ اُستاد ذوق سے
 نوجوان آزاد کو بڑی حسن عقیدت تھی اور انھیں کے فیض صحبت اور حسن تربیت کا یہ اثر ہوا کہ آزاد کے
 دل میں جذبہ شاعری پیدا ہو گیا۔ دلی کی آخری عظمت و شان کی یاد دلانے والی صحبتیں گرم
 تھیں کہ ۱۸۵۷ء کا غدر ہوا اور فلک تفرقہ پرداز نے اُن مجموعوں کو منتشر کر دیا۔ اب لوگ
 ادھر ادھر تلاش معاش میں سرگرداں ہو گئے چونکہ لاہور دلی سے قریب تھا اس وجہ سے
 دلی کے اکثر تباہ حال اشخاص وہاں چلے گئے اُن ہی لوگوں میں محمد حسین آزاد، راسے بہادر
 منشی پیارے لال، پنڈت من بھول میسنشی، مولوی سید احمد مولف فرنگ آصفیہ، مولوی
 کریم الدین، اور خواجہ الطاف حسین حالی تھے جن کو تقدیر نے ایک جگہ جمع کر دیا تھا۔
 حسن اہفاق سے پنجاب میں اس وقت کرنل ہالرائڈ ڈاکٹر تعلیمات تھے جو علامہ دربان فارسی
 اور اردو پر عبور رکھنے کے زبان اُردو کی توسیع و ترقی کا دل سے خیال رکھتے تھے انھیں کے
 ایسا سے مولانا آزاد نے ایک اپنی انجمن "انجمن پنجاب" کے نام سے لاہور میں قائم کی جس کے
 جلسے اُسی انجمن کے مکان میں ماہوار ہوا کرتے تھے اس انجمن کے قیام کی خاص غرض یہ تھی کہ
 اُردو شاعری میں جو مبالغہ کے طوفان اور تشبیہ و استعارہ کے انبار ہیں وہ سب نکال دیے
 جائیں نیز یہ کہ مشاعروں میں جو طرہ مصرعہ طرح دینے کا مروج ہے وہ موقوف کیا
 جائے اور بجائے اس کے شعر اخص خاص مضامین و عنوان پر طبع آزمائی کیا کریں۔

قبل اس کے کہ اس قسم کے شاعرے شروع ہوں مولانا نے انجمن کے جلسوں میں اپنے ناصحانہ
 لیکچر اور دیکھنے والوں سے پہلے لوگوں کو تیار اور آمادہ کر دیا اور یہ دکھایا کہ یہ جدید رنگ عنقریب
 مقبول عام ہو جائے گا اور حقیقی شاعری کیا چیز ہے۔ اُس کی ضروریات بتائیں اور وہ خرابیاں
 بھی دکھادیں جو بالفصل پرانے رنگ کی شاعری میں پائی جاتی ہیں۔ مئی ۱۹۲۸ء میں
 جوائڈریس انجمن کے افتتاح کے موقع پر انھوں نے پڑھا تھا اُس میں اُردو شاعری
 کے عیوب، تکرار مضامین، غلو و مبالغہ، فضول تشبیہات و استعارات، اُس کا تصنع اور
 خلاف فطرت رنگ، غرض کہ جو جو عیوب موجودہ شاعری میں پائے جاتے ہیں وہ سب
 بر وضاحت بیان کر دیے اور صاف صاف کہہ دیا کہ اگر اُردو شاعری کی بقا منظور ہے تو ہم کو
 چاہیے کہ عشق و عاشقی کے پرانے ڈھکوسلے ترک کریں اور عودس شاعری کو تیرہ و تار جھڑیل
 سے نکال کر زمانہ موجودہ کی روشنی میں لائیں۔ شاعروں سے کہا گیا کہ پرانے مضامین ترک کر دو
 سادگی، اظہار اصلیت اور درود و اثر بھاشا سے اور صاف بیانی فائدہ رسانی اور وسعت نظر
 مغربی شاعری سے سیکھو۔

قصایف منظوم | آزاد نے جو کچھ زبان سے کہا اُس پر خود عمل بھی کیا انھوں نے اسی نئے رنگ
 میں متعدد چھوٹی چھوٹی مثنویاں اور نظمیں لکھیں اور بیان ہو چکا ہے کہ اُستاد ذوق کی صحبت
 نے اُن کے دل میں شاعری کا شوق اور جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ اُستاد کی وفات کے بعد وہ حکیم
 آغا جان عیش سے اصلاح لینے لگے اور اپنا کلام دہلی کے شاعروں میں سنانے لگے کہا جاتا
 ہے کہ اُن کا اس زمانہ کا کلام غدر کے ہنگامہ میں سب ضائع ہو گیا۔ غدر کے بعد اُن کو ریاست
 جیندھ میں ایک جگہ مل گئی تھی جہاں وہ مشق نظم کرتے اور سلام، رباعیاں، مرثیے، غزلیں
 قصیدے وغیرہ سب کچھ کہتے رہے۔ اس زمانہ کا کچھ کلام اُن کے بیٹے مولوی محمد ابراہیم
 نے ۱۹۹۹ء میں "نظم آزاد" کے نام سے شائع کیا ہے۔ لاہور میں ۱۹۷۸ء میں اُس
 شاعرے کی بنیاد پڑی تھی جس کا ذکر اوپر ہوا۔ اسی میں انھوں نے اپنی وہ دلچسپ

نئے رنگ کی نظم پڑھی تھی جو مثنوی شب قدر کے نام سے مشہور ہے اور جس میں رات کی آمد اور
 شام کی کیفیت کا ذکر ہے۔ پُرانے خیال کے لوگوں نے اس جدت کی بڑی مخالفت کی جس سے
 نئی امنگوں پر تو کوئی اثر نہ پڑا مگر اتنا ضرور ہوا کہ مشاعرہ ایک سال سے زیادہ قائم نہ رہ سکا
 مشاعرہ کے بند ہو جانے سے بھی مولانا اپنی کوششوں سے باز نہ آئے اور کچھ نہ کچھ اس رنگ
 میں کہتے رہے۔ کبھی نہ کبھی وہ اردو نظمیں انگریزی نظموں کے طرز پر کہتے تھے جن میں کسی انگریزی
 چیز کا ترجمہ نہیں ہوتا تھا بلکہ انگریزی خیالات کو زبان اردو کے سانچے میں ڈھال دیتے تھے مثلاً
 اُن کی نظم "اولوالعزمی کے لئے کوئی سدا راہ نہیں، انگریزی شاعر مینی سن کی نظم "اکسپریس کے انداز
 پر ہے مگر اس کا ترجمہ ہرگز نہیں ہے۔ اسی رنگ کی دوسری نظمیں حسب ذیل ہیں۔ مثنوی ستر
 حقیقی معرفت آئی۔ سلام علیک جیسے چاہو سمجھو۔ جغرافیہ طبعی کی ہسپلی۔ مبارکباد جشنِ جوبلی ایک
 تارے کا عاشق۔ محنت کرو۔ یہ سب نظمیں مجموعہ نظم آزاد میں موجود ہیں۔

آزاد کا قدیم و جدید رنگ | قبل اس جدید رنگ اختیار کرنے کے آزاد اُسی پُرانے رنگ میں
 طبع آزمائی کرتے تھے۔ چنانچہ مجموعہ نظم آزاد کے آخر میں اُن کے پُرانے رنگ کی غزلیں اور قصائد
 موجود ہیں جن میں کچھ کچھ اشعار دیکھ کر پُر زور دار اور صوفیانہ رنگ کے بھی نکل آتے ہیں اسی کو
 اُن کے آئندہ رنگ کا سنگ بنیاد سمجھنا چاہیے۔ جدید طرز کی مثنویاں حسب ذیل ہیں۔ مثنوی
 شب قدر یہ اُن کا شاہکار ہے اور اس میں مختلف لوگوں کے اشتغالِ شب کے وقت کے
 نہایت عمدگی اور رنگ آمیزی سے بیان کیے ہیں۔ طالب علم۔ مہاجن اور چور کی کیفیت
 علی بالخصوص پڑھنے کے قابل ہے۔

طالب علم

ہیں مدرسہ کے طالب علم اپنے حلال میں	کل صبح امتحان ہے سو اس کے خیال میں
نیل کے یاد کرتے ہیں آپس میں دور سے	پڑھتے جیسا جدا بھی ہیں کچھ فکر و غور سے

کر لیں جو کچھ کرنا ہے شب درمیان ہے کل صبح اپنی جان ہے اور امتحان ہے

جی چھوڑ بیٹھے مرد یہ بہت سے دور ہے
قسمت تو ہر طرح ہے یہ محنت ضرور ہے

ہماجن

اور وہ جو لکھتی ہے ہماجن جہان میں آدمی نجی ہے پردہ ابھی ہے دکان میں
گنتی میں دام دام کی ہے دم دیے ہوئے بیٹھا ہے گود میں ہی کھاتا لے ہوئے
ہے سارے لین دین کی میزوں تمام کی لیکن غضب ہے بدھ نہیں ملتی چھ دام کی

چور

اسے رات تیرے پردہ دامن کی اوٹ میں زردیہاہ کار بھی ہے اپنی چوٹ میں
بیٹھا نقب لگا کے کسی کے مکان میں ہے اور ہاتھ ڈالا اُس کے ہر اکینہ میں ہے
اباب باندھیرے میں گھر کا ٹٹول کر ہے چپکے چپکے دیکھ رہا کھول کھول کر

لے جائے گا غرض کہ جو کچھ ہاتھ آئے گا
دیکھو کمایا کس نے ہے اور کون اڑائے گا

شاعر

اس تیرہ شب میں شاعر روشن دماغ ہے بیٹھا اندھیرے گھر میں جلائے چراغ ہے
دوبلہ ہے اپنے سر کو گریباں میں دال کے اڑتا مگر بے کھولے ہوئے پر خیال کے
لا تافلک سے ہے کبھی تارے اُتار کر جاتا زبیں کی تہ میں ہے پھر غوطہ مار کر

پڑھتا ہے ذرہ ذرہ پہ افسوں نئے نئے
ہو جاتے ہیں وہی دُر مضمون نئے نئے

مضمون تازہ گر کوئی اس آن مل گیا اس تیرہ شب کے پردہ میں شاعر جو چھوڑ مطلب اڑاتا شعرے مضمون غزل کے ہی	یوں خوش ہے جیسے نقشِ سلیمان مل گیا پھر تا ٹوٹتا ہوا مانتہ کو رہے لاتا پھر ایسے ڈھب سے لفاظی بل کے ہے
-----------------------------------------------------------------------------------------------------------	------------------------------------------------------------------------------------------------------------

تعریفیں اس کی کرتے ہیں جو شعر سننے ہیں
مضمون بیاہ جن کا وہ سر بیٹھے دھنتے ہیں

اپنے متعلق

عالم ہے اپنے بسترِ راحت پہ خواب میں پھیلائے ہاتھ صورتِ امید دار ہے مجھ کو ٹوٹک سے ہے نہ ہے مال سے غرض	آزاد سر جھکائے خدا کی جناب میں اور کرتا صدقِ دل سے دعا بار بار ہے رکھتا نہیں زبانی کے جنجاں سے غرض
-------------------------------------------------------------------------------------------------------------	----------------------------------------------------------------------------------------------------------

یار بے التبا ہے کرم تو اگر کرے
وہ بات دے زباں پہ کہ دل میں شکر ہے

آجاتی پرکھی جو ہے شوخی مزاج میں کر جاتا صاف دشمن بد میں پر چوٹ ہے کھوٹا اگر زبان کا ہے دل کا کھرا ہو ہے	کرتا ہے اس کو خیرِ عدد کے علاج میں اچھا تو ہے کہ رکھتا نہیں دل میں کھوٹ ہے امنا ضرور ہے کہ ذرا سخر ا تو ہے
---------------------------------------------------------------------------------------------------------------	------------------------------------------------------------------------------------------------------------------

(۲) مثنوی محب وطن اس میں انھوں نے ایک دوسرا رنگ اختیار کیا ہے اور اپنے مطالب کو بعض سچے اور بعض فرضی واقعات سے ثابت کیا ہے۔

(۳) مثنوی خواب اس ایک نہایت زوردار مثنوی ہے جس میں یہ دکھلایا ہے کہ قسم کی تمدنی ترقیاں کسی ملک میں صرف اس ہی کی صورت میں ہر سکتی ہیں۔

(۴) مثنوی ابر کرم اس میں ہندوستان کے موسم بہار یعنی برسات کا سہل دکھلایا ہے یہ جاتی کی برکھارت کے طرز پر ہے

(۵) صبح امید اس میں نہایت مؤثر طریقہ سے دکھلایا ہے کہ مختلف کاروبار عالم مثلاً زراعت تجارت ملک گیری تعلیم وغیرہ میں امید ہی کام کرتی ہے اور کامیابی کا دار و مدار اسی پر ہے۔ آزاد و حالی کا فرق آزاد مثل حالی کے شاعری کے دلدادہ نہ تھے۔ اُن کا کلام بھی عیوب شاعری سے پاک صاف نہیں۔ حالی سرسید مرحوم کی وجہ سے اور نیز اپنی مناسبت طبعی سے ایک قومی شاعر ہوئے اور منزل اسلام کے راگ کو اکثر اپنے پُر جوش کلام کی لے میں آلاپا۔ آزاد کو اس قسم کی کوئی نصیلت حاصل نہیں ہے اُن کی افتاد طبیعت عالمانہ تھی اور وہ علاوہ کامل نثار و شاعر ہونے کے ایک مشہور ماہر تعلیم اور جریدہ نگار اور ناقد بھی تھے اُنھوں نے ضروریات زمانہ کا لحاظ کر کے اپنے میلان طبیعت کو برائے زمانہ کا عام رنگ تھا جدید رنگ سے بدلا اور ایشیائے نفس سے کام لے کر اسی میدان میں شہادت علمی کا درجہ حاصل کیا۔ اُن کے مختصر مجموعہ نظم سے پایا جاتا ہے کہ وہ نظم سے نثر کو زیادہ ضروری اور مقدم سمجھتے اور اسی میں اپنے ملک اور اپنے ہم وطنوں کی فلاح و بہبود دیکھتے تھے۔ چنانچہ اُن کے دلی جذبات اور قلبی واردات کا اظہار جس قدر کہ نثر میں ہوا وہ نظم میں نہ ہو سکا۔ اُن کی نثریں گو نظم نہیں مگر حقیقی معنی میں بے تکلف اُن پر شعریت کا اطلاق ہو سکتا ہے۔

مولوی محمد اسماعیل میرٹھی | مولوی محمد اسماعیل صاحب ۱۲ نومبر ۱۸۴۲ء کو پیدا ہوئے۔ میرٹھی دکن تھا۔ سولہ سال کی عمر میں سرشیرہ تعلیم کی ملازمت اختیار کی۔ تھوڑے عرصے کے بعد رتن کر کے فارسی کے پید مولوی مقرر ہوئے۔ پہلے سہارنپور میں پھر میرٹھی میں ایک عرصہ تک اسی عہدہ پر رہ کر ۱۸۸۸ء میں سنٹرل نارمل اسکول آگرہ کو تبدیل ہو گئے جہاں بارہ برس تک قیام کر کے ۱۸۹۹ء میں نیشنل لی۔ بعد میں اپنے وطن مالوہ یعنی میرٹھی واپس آئے۔ اور یہیں قیام اختیار کر کے بقیہ عمر تالیف و تصنیف میں ختم کر دی اُن کی اعلیٰ قابلیت اور خدمات ادبی کے صلے میں خطاب ”خان صاحب“ بھی سرکار سے عنایت ہوا تھا۔ بالآخر یکم نومبر ۱۹۱۶ء کو اس دنیا سے تپا امداد سے رحلت کی۔ آگرہ کے قیام میں مولوی صاحب موصوف نے

اپنی وہ اردو ریڈریں اور پرائمرس تصنیف کیں جو گورنمنٹ کی منظوری سے ایک عرصہ دراز تک داخل کورس رہیں۔ یہ درسی کتابیں نہایت سادہ بے تکلف اور دلکش طرز میں لکھی گئی ہیں جو بچوں کی سمجھ میں بخوبی آسکتی ہیں اور ان کے لئے نہایت موزوں ہیں۔ اس معاملہ میں مولوی صاحب موصوف نے ممالک متحدہ کے واسطے وہی کیا جو مولانا محمد حسین آزاد نے صوبہ پنجاب کے واسطے کیا تھا بلکہ ایک معنی میں ان سے بھی زیادہ خدمت انجام دی۔ یہ سب ریڈریں سلاستِ زبان اور عمدگی مضامین کے اعتبار سے نہایت اعلیٰ درجہ کی ہیں۔ بلکہ پچھلے تو ان کا جواب سرشتہ تعلیم کی منظور شدہ کتابوں میں کسی صوبہ میں اب تک نہیں ہوا ہے۔ مولوی صاحب شاعر اور شارِ دونوں تھے۔ ان کا خاص رنگ ان دونوں صنفوں میں سادگی اور صفائی ہے جس کے وہ استادِ کامل تھے۔ شاعری میں طرزِ جدید اور طرزِ قدیم دونوں پر انھوں نے طبع آزمائی کی ہے اور تمام اصنافِ سخن میں کچھ نہ کچھ کہا ہے اور بہت خوب کہا ہے۔ چنانچہ عاشقانہ، سیاسی، اخلاقی، سوشل اور نیچرل غرض کہ ہر قسم کی نظمیں ان کی کہی ہوئی موجود ہیں اور حق یہ ہے کہ بے تکلفی اور سادگی میں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ مولانا شبلی نعمانی کا قول تھا کہ حالی کے بعد اگر کسی نے سننے کے لائق کچھ کہا ہے تو وہ مولوی اسماعیل میرٹھی ہیں۔ مولوی صاحب موصوف کا کلیاتِ سلاستہ میں شائع ہوا تھا اور اس میں ان کی تمام قدیم و جدید ہر رنگ کی نظمیں ہیں۔ ان کے کلام میں تصوف کا رنگ بھی کچھ پایا جاتا ہے اور طباعی اور قادر الکلامی ان کے لفظ لفظ سے ظاہر ہے۔ مولوی صاحب کو تصوف کا بھی ذوق تھا اور حضرت غوث علی شاہ پانی پتی کے مریدان خاص میں تھے۔ ان کے جدید رنگ کی نظمیں نہایت اعلیٰ درجہ کی ہیں اور زمانہ موجودہ کی نیچرل نظموں کی پیشرو ہیں۔ اردو میں بینک درس معنی بغیر قافیہ والی نظم یا شعر مرتب ہیں بھی انھوں نے طبع آزمائی کی اور نہایت دل آویز طریقہ سے خیالات کو ادا کیا ہے۔ علاوہ عنہ لیات کے جس میں صوفیانہ اور اخلاقی مضامین ہیں انھوں نے اکثر اخلاقی نظمیں قصے کہانی

کے طرز پر شل "ایسا پس فیلس" کے لکھی ہیں جن سے عمدہ اخلاقی نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں
 قلندہ اگرہ کے متعلق بھی ان کی ایک مشہور نظم ہے اس میں انھوں نے مسلمانوں کی ابتدائی
 ترقی کے دور نہایت مؤثر طریقے سے دکھا کر موجودہ ترقی کے راستے بتائے ہیں۔ اُن کا یہ بھی قصد تھا
 کہ لغات اُردو کی ترتیب اور قواعد اُردو کی تکمیل نے طرز سے کہیں چنانچہ اُن کے مسودات
 محفوظ ہیں اور امید کی جاتی ہے کہ کسی نہ کسی وقت ضرور شائع ہوں گے آخر عمر میں وہ
 حضرت امیر خسرو کے کلام کی تنقید اور اُن کی سوانح عمری مستند کتابوں اور تاریخوں کے حوالے
 سے مرتب کر رہے تھے اور قرآن العیدین کی تنقید مکمل ہو چکی تھی کہ موت نے اس کام کو
 روک دیا اسی طرح یہ بھی نا جاتا ہے کہ ادب اُردو کی ایک تاریخ لکھنے کا بھی ارادہ تھا مگر وہ
 بھی پورا نہ ہو سکا مختصر یہ کہ مولوی صاحب زمانہ حال کے شاعروں اور شارحوں میں بہت
 بلند پایہ رکھتے تھے اور طرز قدیم و جدید دونوں کا مجموعہ تھے۔

سُردر جہاں آبادی | غنشی دُرگاسہائے سُردر کو بھی اُردو شاعری کے طرز جدید کا ایک کن رکن
 سمجھنا چاہیے یہ اُن لوگوں میں تھے جنہوں نے رنگ جدید کی طرف سب سے پہلے رہنمائی کی
 جہاں آباد ضلع پٹی بھیت کے رہنے والے تھے ۱۸۷۰ء میں پیدا ہوئے شعر و شاعری سے
 فطری مناسبت تھی۔ اور کلام پُرانے اور نئے دونوں رنگوں کا ایک دلچسپ مجموعہ ہے
 ان کا اعلیٰ خدما ہفاودع ماکدر "یہ تھا یعنی پُرانے اور نئے رنگوں میں جو جو باتیں عمدہ اور
 قابلِ قدر تھیں وہ لے لیں اور باقی کو چھوڑ دیا۔ مثلاً قدما کا درد و اثر اور بلند خیالی اور الفاظ
 کے ایجاز و اختصار کے ساتھ جدید رنگ کے تازہ مضامین اور حب الوطنی کے
 جذبات نہایت بخوبی کے ساتھ ملے جلے ہیں اور زمانہ حال کی معمولی بے لطف باتوں
 اور زمانہ گذشتہ کی غیر مہذب معاملہ بندی سے کلام پاک ہے۔ شستگی الفاظ کے ساتھ
 بلند خیالی اور پاکیزگی ملی ہوئی ہے۔

سُردر کو شعر و شاعری سے حدودِ رجب کا شوق تھا بلکہ اُن کی نسبت یہ کہنا بجا ہے کہ

اُن کو فانی الشعر کا درجہ حاصل تھا ان کے تمام افعال و اقوال حرکات و سکنات شعریت میں ڈوبے ہوئے تھے اور ایک حقیقی شاعر کا پتہ دیتے تھے جیسا کہ اکثر شعرا کا حال تھا۔ سرور بھی نہایت آزاد مزاج اور زہد شرب و قہوئے تھے فکر فردا سے ہمیشہ آزاد رہتے تھے اسی وجہ سے وہ مصیبت و عسرت کی زندگی بسر کرتے تھے مگر یہ عسرت و مصیبت ان کے شاعرانہ شوق اور جذبات کو کبھی دھیمانہ کر سکی۔ وہ مذہبی تقشف اور تعصب سے بالکل بیگانہ تھے سنان کو نمائش اور نظاہر داری کا شوق تھا بلکہ اُن کی زندگی بے پردائی اور سادگی کا ایک بہترین نمونہ تھی اُن میں دنیا کا مکر و فریب مطلق نہ تھا اور کچھ عیوب اُن میں تھے وہ بھی ہنس معلوم ہوتے تھے سب سے بڑا عیب اُن میں نے نوشی کا تھا مگر یہ بھی مرزا غالب کی طرح اُن کی شاعری اور خیال آفرینی میں اکثر معین ہوتی تھی۔ گو کہ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اسی سخت عادت کی بدولت ان کی ہر نہاد اور قابل قدر زندگی کا بہت قبل از وقت خاتمہ ہو گیا۔ صرف بعمر ۳۲ سال ۱۹۱۷ء میں انھوں نے انتقال کیا۔

اُن کی شاعری کے خصوصیات | (۱) سب سے بڑی خصوصیت اُن کی شاعری کی جذبات نگاری اور ہر دواثر ہے اس رنگ میں وہ اپنے زمانہ میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے مثل استاد اشعرا میر تقی میر کے سرور کے مزاج میں بھی حزن دیاں اور رنج و الم کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اسی وجہ سے مثل میر کے ان کا کلام بھی جذبات نگاری کا ایک مرقع ہوتا تھا۔ اُن کی اس قسم کی نظمیں حسب ذیل ہیں: دیوار کھن، حسرت شباب، اندوہ غربت، مرغان قفس، یادِ طفل، بلبلِ کافسانہ، حسرت دیدار، ماتم آرزو وغیرہ۔

(۲) دوسری خصوصیت حب الوطنی ہے اس میں بھی وہ اپنا جواب نہیں رکھتے تھے مگر یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ وہ کسی خاص جماعت یا فرقہ کی جنبہ داری نہیں کرتے بلکہ اُن کو ہندوستان کا قومی شاعر کہنا بالکل بجایا ہے۔ اُن کے مخاطب صرف اُن کے ہم مذہب نہیں بلکہ ہندوستان کی پوری پہلیک ہے۔ اس قسم کی اُن کی نظمیں یہ ہیں: خاکِ وطن، عروسِ حب وطن، حسرتِ وطن

یاد وطن، مادر ہند وغیرہ۔ یہ مادر ہند بابو بنکم چندر چٹرجی کی مشہور نظم بندے ماترم کے طرز پر لکھی گئی ہے۔ ان تمام نظموں میں حب وطن کا سجا جوش اور اعلیٰ خیالات ہیں انکے سوا بعض عاشقانہ نظمیں بھی اسی طرز کی ہیں مثلاً فاضل گل دیبل۔ شمع و پروانہ وغیرہ۔ (۳۱) اس کے بعد ان کی تاریخی اور مذہبی نظموں کا نمبر ہے۔ ان میں بھی صحیح جذبات، صداقت، فصاحت، بے تکلفی اور روانی بدرجہ کمال پائی جاتی ہیں۔ پدمنی۔ پدمنی کی چتا۔ سیتا جی کی گریہ وزاری۔ ہمارا جہ دسرتھ کی بفراری، جمننا، گنگا پریاگ کا سنگم بستی۔ نور جہاں کا مزار۔ حسرت دیدار اور نند منستی۔ اس قسم کی نظمیں ہیں جو سب اعلیٰ خیالات اور دوداثر سے مملو ہیں ان سب میں "گنگا" اور "جمننا" خاص طور پر تعریف کے قابل ہیں جو محاسن شعری کے علاوہ جذبات اور اثر سے بھرپور ہیں۔ یہ فی الحقیقت نہایت اعلیٰ درجہ کی نظمیں ہیں۔ "جمننا" میں علی انخصوص ہندوؤں کے قدیم تاریخی حوالے بہت دلچسپ ہیں۔

(۳۲) سرور کی چوتھی خصوصیت جو ان کو ان کے معصروں سے ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ انھوں نے اردو اشعار میں ہندی الفاظ کو کھپایا اور اس طرح کھپایا کہ اُس سے شعر کے محاسن میں اضافہ ہو گیا۔ علی انخصوص مذہبی نظموں میں انھوں نے پُرانے ٹھیک ہندی اور بھاشا کے لفظ بہت استادی سے صرف کیے ہیں جن سے کلام کا لطف و بالابو جاتا ہے اسی طرح رامائن اور دیگر مذہب ہندو کی کتابوں کے بعض سین نہایت پُر زور لکھے ہیں ان کی تمام اس قسم کی نظمیں اہل ہند نہایت ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔

انگریزی نظموں کے ترجمے | سرور کو زبان انگریزی کا بہت عمدہ علم تھا مگر چونکہ طبیعت نہایت رسا اور شاعرانہ پائی تھی اس وجہ سے انھوں نے جو ترجمے انگریزی نظموں کے کیے ہیں وہ ہر چند کہ لفظی نہیں مگر بھرپور اصلی معلوم ہوتے ہیں۔ اس قسم کی چیزیں بہت ہیں تقریباً بیس سے کم نہ ہوں گی بعض میں انھوں نے صرف کسی انگریزی نظم کا نام لے لیا ہے اور اُس پر بالکل ہندوستانی طریقہ سے طبع آزمائی کی ہے مرغابی۔ ترانہ خواب۔ بچہ اور ہلال۔ کارزار بستی۔ اُمید و طفلی

موسم سرما کا آخری گلاب۔ یہ سب اسی قسم کی نظمیں ہیں اور اپنے طریقہ میں بہت عمدہ اور لکڑش
ہیں۔ ایسی ہی نچرل نظموں میں اُن کی "بیر ہوئی" اور "کوئل" کو بھی سمجھنا چاہیے۔
سُرور نے بعض اخلاقی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ مگر یہ خیال رکھا ہے کہ شعر کی خوبی اور شادی
و عطا و نصیحت کی روکھی پھیک کی باتوں سے کم نہ ہونے پائے۔ وہ شاعری کو د عطا پر مقدم جانتے تھے
زن خوشخو۔ بے ثباتی دنیا۔ اداسے شرم۔ اسی قسم کی نظمیں ہیں۔ جن میں اعلیٰ خیالات نہایت
حسین پیرایہ میں ظاہر کیے گئے ہیں۔

سُرور کو شعر گوئی میں کمال حاصل تھا وہ ہمیشہ شاعرانہ خیالات میں غرق رہتے تھے
اور نہایت زود گو اور بے تکلف کہنے والے تھے۔ ہر چند کہ اُنھوں نے شادی غزل۔ رباعی
قطعہ قصیدہ۔ ترجیع بند۔ ترکیب بند۔ غرض کہ سب اصناف سخن میں کچھ نہ کچھ لکھا ہے مگر
سُرور ان کو بہت محبوب تھا اور اس میں وہ بہت زور طبیعت دکھاتے تھے۔
مختصر اُن کے کلام کی خصوصیات حسب ذیل ہیں۔ ۱۔ جذبات نگاری۔ درد و اثر علیٰ تخیل
نہایت پیاری اور میٹھی زبان۔ قلبی کیفیات کا سن و سن اظہار و تنوع خیالات اور اُن کا اظہار
نہایت شاعرانہ اور لطیف طریقہ سے خوبصورت الفاظ میں اور وسیع النظری۔ اُن کا کلام دو
مجموعوں میں شائع ہوا ہے ایک وہ زمانہ پریس کا پور سے اُن نظموں کا کلام جو اوقات
مختلف رسالہ زمانہ میں نمخانہ سُرور کے نام سے چھپیں۔ دوسرا جام سُرور کے نام سے انڈین پریس
الہ آباد سے شائع ہوا ہے۔ اُن کا اکثر کلام ضائع ہو گیا مگر اس سے بھی بڑھ کر قابل افسوس یہ
بات ہو کہ اکثر لوگوں نے اُن کا کلام ہتھیار کیا کبھی معاذضہ کے ساتھ اور کبھی معاذضہ بھی ہضم
کر گئے اُن کے انتقال کے بعد جو خطوط شائع ہوئے اُن سے صاف طور سے یہ ثابت ہوتا ہے
کہ کسی صاحب نے اُن سے مختلف مضامین پر کچھ نظمیں لکھوائی تھیں اور اُن کو اپنے نام سے شائع
کر دیا تھا اس سے یہ حقیقت کھل گئی کہ بعض حضرات جو خود تو شاعری سے بہرہ نہیں رکھتے مگر
شعر کی صف اول میں اپنا شمار کرنا چاہتے ہیں۔ دوسروں سے کچھ دے لے کے کھلوایا لیتے

ہیں اور پھر اُس کلام کو اپنے اسم گرامی کے ساتھ بے تکلف شائع کر دیتے ہیں۔
اکبر الہ آبادی | اکبرؒ اپنے زمانہ کی ایک بہت بڑی ہستی تھے انھوں نے ایک نئے طرز کی
 بنیاد ڈالی جس کے وہ خود ہی موجد اور خود ہی خاتم تھے اور اُس طرز خاص میں ان کی نقل بالکل
 محال ہے۔ اُن کا کلام مستع الثقلید اور ناقابلِ رسانی ہے۔ ان کا سب سے بڑا کمال یہ ہے
 کہ ایک بے شل شاعر ہونے کے علاوہ ناصح قوم اور بلند پایہ صوفی صافی بھی تھے شکرِ خطوط
 بھی نہایت دلچسپ لکھتے تھے اور ان میں سے ایک ساتھ ادب سوسائٹی اور حکومت کے زبردست
 نقاد اور ماہر ریاست تھے۔ پھر مذاق و ظرافت میں تو کیتائے روزگار تھے۔

سید اکبر حسین رضوی نام ۱۶ نومبر ۱۸۶۶ء تاریخ ولادت ہے مان کے والدین کا حال
 نہ تھے ابتدائی تعلیم مدرّس اور سرکاری اسکولوں میں پائی ۱۸۶۶ء میں منتاری کا امتحان
 پاس کر کے نائب تحصیلدار مقرر ہوئے ۱۸۷۰ء میں باغی گورنمنٹ کی شل خوانی کی جگہ ملی ۱۸۷۲ء
 میں وکالت کا امتحان پاس کر کے ۱۸۷۵ء تک وکالت کی پھر ملازمت سرکاری کی طرف
 میلان طبع ہوا اور منصف مقرر ہو گئے ۱۸۸۰ء میں بار ڈینیٹ جج اور ۱۸۹۲ء میں عدالت
 خفیفہ کے جج ہوئے۔ اس کے بعد خان بہادر کا خطاب گورنمنٹ سے حاصل کر کے ملازمت
 سے کنارہ کش ہو گئے۔ الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو بھی تھے ستمبر ۱۹۱۲ء میں انتقال فرمایا اور
 دنیا سے ادب کو اپنا سوگوار چھوڑ گئے۔

اخلاق و عادات | طبعاً نہایت خلیق اور منکسر المزاج تھے۔ مذاق اور ظرافت ان میں کوٹ
 کوٹ کر بھرا تھا۔ سوسائٹی کی روح رواں سمجھے جاتے تھے۔ احباب کو جو ان سے ملنے آتے
 تھے اپنی بذلہ سنجی اور ظرافت طبعی سے بہت مسرور کرتے خلیق و مدار۔ تہذیب و مصلحت بھڑکی
 اور ہماں نوازی ان کے خاص جوہر تھے بعض باتیں جو ان کے کلام میں پالیسی یعنی
 مصلحت اندیشی اور زمانہ سازی پر محمول کی جاسکتی ہیں وہ ان کے اُن خطوط میں جو
 خواجہ حسن نظامی عزیز لکھنوی۔ منشی دیانترائے نغم وغیرہ کے نام ہیں ان کی راستبازی اور

صداقت شکاری پر دلالت کرتی ہیں۔ انھوں نے بعض ایسی چیزیں بھی کہی ہیں جن کی اُن سے توقع نہیں ہو سکتی تھی مگر وہ صرف اس لیے کہ وہ خود کو اور دوسروں کو پریشانی میں ڈالنا نہیں چاہتے تھے۔ رند بہادہ سنی تھے مگر شیعوں سے کوئی مخالفت اور تعصب نہیں رکھتے تھے۔ اسی طرح عقائد میں ہر چند کہ وہ ایک پکے مسلمان تھے مگر مذہبی ناروا داری اور عصبیت سے کوسوں دور تھے۔ آخر عمر میں عوارض اور مصائب سے دل شکستہ ہو گئے تھے۔ اپنی اہلیہ اور محبوب بیٹے ہاشم کے انتقال سے اُن پر بڑا اثر پڑا۔ چنانچہ آخر الذکر کی وفات پر ایک دردناک قطعہ لکھا تھا جس کے دو شعر یہ ہیں۔

وہ چمن ہی سٹ گیا جس میں کہ آئی تھی بہار	اب تجھے پا کر میں اے یاد بہاری کیا کروں
بزمِ عشرت میں بٹھانا تھا جسے وہ اٹھ گیا	اب میں اے فردا تری امید داری کیا کروں

اکبر کی شاعری اکبر فطری شاعر تھے بچپن سے اُن کو شعر کا شوق تھا چنانچہ اُن کا ابتدائے عمر کا کلام اُن کی کلیات میں موجود ہے۔ شروع میں اپنا کلام غلام حسین وحید کو دکھاتے تھے جو آتش کے شاگرد تھے۔ اسی زمانہ میں فارسی اور عربی کی درسیات سے فراغت حاصل کی اور یہ معلومات اُن کو آخر عمر میں بہت مفید ثابت ہوئیں۔ ملازمت کے زمانہ میں انھوں نے انگریزی پڑھی اور اُس میں بھی اچھی خاصی مہارت حاصل کر لی۔ اکبر کا دور شاعری ایک بسیط دور ہے جس کو انھوں نے خود پانچ حصوں پر تقسیم کیا ہے۔

پہلا دور ابتدا سے	پہلا دور ابتدا سے
تک	تک

اُس میں انھوں نے لکھنؤ اور دہلی کے مستند اساتذہ کی تقلید اور اُن کے رنگ میں عنایتیں کیں اور اکثر شاعروں میں پڑھیں اُن غزلوں کا وہی رنگ ہے جو قدیم میں بتا جاتا تھا۔ مضافین بھی وہی مقررہ تھے جن پر برابر طبع آزمائی کی جاتی تھی اگرچہ اُن میں کہیں کہیں جذباتِ عشقیہ بھی ہیں مگر صفائی، سادگی، حسنِ مندرج، روانی وغیرہ بدرجہ احسن

پائی جاتی ہیں۔ اس وقت کے کلام سے آئندہ کی ترقی کا پتہ چلتا ہے اگرچہ اس میں کچھ قصص بھی شامل ہے۔

دوسرا دور ۱۸۶۷ء سے ۱۸۸۶ء عیسوی تک | اس عہد میں صداقت اور جذبات کلام میں زیادہ ہیں اصلیت بھی صاف طور پر نمایاں ہے۔ شاعری کی جلا کلام کا جوہر ہے اور قادر الکلامی

کا بھی پتہ چلتا ہے۔ مروجہ اور محبت مضامین کم ہوتے جاتے ہیں۔ مگر پھر بھی کہیں کہیں اُن پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ تصنیف بے تکلفی اور اصلیت سے بدل گیا ہے۔ ذاتی رنگ محدود معینہ پر غالب آ رہا ہے۔ اشعار نے حسود زرد اند سے پاک ہو کر اپنی کینچل بدل دی ہے مگر غزلیں اس میں بھی دل پر چڑھی ہوئی ہیں۔ بہر طور اشعار کے درد اثر نثر بندش اور طرز ادا میں بے فرق معلوم ہوتا ہے۔

تیسرا دور ۱۸۸۶ء سے ۱۹۲۸ء تک | یہ زمانہ بہت بڑی ترقی کا زمانہ ہے۔ اس میں شاعر کو اپنے کلام پر پوری طرح قدرت حاصل ہو گئی ہے۔ وہ راستہ کو ٹٹولتے نہیں اور نہ

کہیں ٹھٹکتے ہیں بلکہ ہمت اور اعتبار کے ساتھ آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اب اُن کے کلام میں پورا استادانہ رنگ آ گیا اور تجربہ اور نو مشقی کا زمانہ ختم ہو گیا ہے اب کلام میں نوکاری کی چھچک اور تردید ہمیں باقی رہا۔ غزلیں اس فعی میں بھی عصر غالب ہیں۔ مذاق و ظرافت کا غلبہ ہے جس میں ابھی وہ بات نہیں جو کہ بعد کو حاصل ہوئی۔ طنز سے بھی کلام آشنا ہوتا جاتا ہے۔ غزلوں کا رنگ اب پرانے رنگ سے علیحدہ ہو کر اُن میں ایک اخلاقی رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ جدت ادا اور ظرافت پر زیادہ زور دیا جاتا ہے روحانیت اور تصوف بھی جلوہ گر ہے۔ غزلوں کا رنگ باعتبار مضامین اور طرز ادا کے تو بہت کچھ ترقی کر گیا ہے مگر پھر بھی خارجی رنگ زیادہ ہے اس زمانہ کا کلام ان کے کلیات اذیل و دہم میں داخل ہے۔

چوتھا دور ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۲ء تک | یہ دور بہت بڑی ترقی کا حامل ہے۔ اس میں اور دور باہن کی نفی میں کوئی زیادہ فرق نہیں بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ اسی کا

شتم ہے اس دور میں اکبرتی الواقع "لسان العصر" ہو گئے ہیں۔ اس میں قدیم رنگ کی غزل گوئی گھٹتی جاتی اور حقائق و فلسفہ بڑھتا جاتا ہے۔ مذاق و ظرافت بدستور ہے بلکہ ادب تیز ہو گئی ہے اور اسی رنگ میں واقعات حاضرہ اور مغربی تہذیب پر نہایت ہر دست نکتہ چینی کی جاتی ہے۔ اب ظرافت و شوخی بے لگام ہو گئی ہے اخلاقی و روحانی فلسفیانہ اور سیاسی رنگ کے کلام میں زور ہے مگر ساتھ ہی عاشقانہ رنگ بھی موجود ہے حسن و عشق کی زیر لبی گفتگو خاموش نہیں ہوئی مگر وہ اب سیاسیات کے غل غپاڑہ میں مدھم پڑ گئی ہے۔ اکبر اب اپنی صنعت کے صانع کامل ہو گئے ہیں اور کلام میں پختہ کاری آگئی ہے خیالات میں تموج ہے۔ قوت ابداع و ایجاد فن عروض کے قواعد اور مشکلات سے دہی نہیں اٹھا خیال کے نئے نئے طریقے اور راستے ذہن میں آتے ہیں۔ اور ان کے واسطے نئے نئے دیکھ بھل قافیوں اور جدید استعاروں اور تشبیہوں سے بہت کام لیا جاتا ہے تصوف اور روحانیت بھی جلوہ گر ہے۔

پانچواں دور ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۱ء تک | اس زمانہ کا کچھ کلام کلیات سوم میں شائع ہو گیا ہے۔ اس دور میں عاشقانہ رنگ گھٹ کر بہت قدر قلیل رہ گیا ہے اور اب اخبار بالکل سیاسی اخلاقی و روحانی رنگ میں رنگے ہوتے ہیں۔ یا پھر وہی ظرافت جلوہ فرما ہے۔ اس دور کو ان کی شاعری کی معراج سمجھنا چاہیے۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس زمانہ کے کلام میں وہ جوش و خروش اور بالکل نہیں جو زمانہ شباب کے کلام میں ہے اور یہ سچ بھی ہے۔ اس لیے کہ طویل عمر نے ان کو زمانہ کے نشیب و فراز اور حقائق سے آگاہ کر دیا ہے اب زندگی ان کی نظر میں ایک عمیق معنی رکھتی ہے اور دنیا کی بے ثباتی برائے ان کی نظر زیادہ جاتی ہے۔ اب چونکہ تجربہ وسیع ہو گیا ہے لہذا اکثر اشعار اس قابل ہیں کہ آدمی ان کو اپنا دستور العمل بنائے۔ اس زمانہ کا ان کا کلام بہت ہے۔ اس قدر کہ دو کلیات مرتب کئے جاسکتے ہیں۔ مگر اب بعض اشعار ایسے بھی ہیں جن کو وہ صیغہ راز میں رکھنا چاہتے تھے یعنی جن کی اشاعت ان کو منظور نہ تھی۔ یہ بھی مشہور ہے کہ انھوں نے اپنے مرنے سے پہلے ایک کتاب سہمی سے "گاندھی نامہ" لکھی جس کو نان کوپریشن

کی ایک تاریخ سمجھنا چاہیے مگر اس کتاب کو انھوں نے مصلوۃ نہیں شائع کیا۔
 اُن کا مطبوعہ کلام تین کلیات میں شامل ہے جن میں سے دو اُن کی زندگی میں طبع ہوئے
 تھے اور تیسرا اُن کے صاحبزادے نے اُن کے انتقال کے بعد شائع کیا خیال کیا جاتا ہے کہ
 ابھی ایک اور شائع ہونے کو باقی ہے اگر نثر کے خطوط بھی بہت خوب لکھتے تھے۔ اُن کے مکتوب الہ
 کثیر التعداد تھے جن سے اُن سے خط و کتابت کا سلسلہ برابر جاری تھا۔ جو خطوط کہ انھوں نے
 خواجہ حسن نظامی، منشی دیاندرائے نعم احسن، مارہروی، مرزا محمد ہادی، عزیز مولوی، عبدالمجید بی لے
 دیا آبادی کے نام لکھے ہیں وہ چھپ گئے ہیں اُن سے اُن کے اصلی مزاج کا رنگ اور بعض نسخے کے واقعات
 بخوبی معلوم ہو سکتے ہیں اور ایک عمدہ و انجمی تیار ہو سکتی ہے یہ خطوط نہایت دلچسپ اور لطیف
 معقولوں کی شان رکھتے ہیں مگر پھر بھی مرزا غالب کے خطوط کی بات ان میں کہاں اگر کوئی بڑے
 شارح تھے لہذا ان کی کوئی نثر کی چیز نہ اے ان خطوط اور ادھ پنچ کے مضامین کے جوڑے
 کے قابل میں موجود نہیں ہے ادھ پنچ ہی سے انھوں نے غالباً ظرفیاد رنگ اخذ کیا ہوگا۔
 اگر کی غزلیات | حقیقتی بندش، روزمرہ، سلاست، روانی، بے تکلفی، اعلیٰ تکمیل اور عمدہ
 تشبیہیں اگر کی غزلوں کی جان ہیں۔ اُن کے اشعار دنیا کی بے ثباتی، دنیاوی جاہ و ثروت
 کی بے حقیقتی اور دنیاوی مسترتوں کی ناپائیداری کے مضامین سے مملو ہیں اور مرد و خزانہ
 یاس کے مضامین بھی بکثرت اُن میں موجود ہیں مگر اگر کی شہرت زیادہ تر اُن کی غزلوں پر مبنی
 نہیں کیونکہ اُن سے اُن کی مجموعی قابلیتوں کا صرف ایک رخ نظر آتا ہے نمونہ کے طور پر
 چند منتخب اشعار اُن کی غزلوں کے یہاں لکھے جاتے ہیں۔

رنگ قدیم

جہاں ہر تیغ تھا کی جنبش ابروئے دوست
 گلشن دل سے اڑا لائی ہے شاہدِ دوست

جہاں نشانوں کے سوا کوئی نہ دیکھتے دوست
 رقص کرتی ہے نسیم کیوں مستانہ و ام

کیسے کیسے گل کھلے ہیں نقش پائے یار سے
 میں وہ آئینہ ہوں اس حیرت سرائے دہر میں
 لکھا ہوا ہے جو روانہ مرے مقدر میں
 نگاہ پڑتی ہے اُن پر تمام محفل کی
 یہی نظر ہے جواب قائل زمانہ ہوئی
 ہزار جلوہ حسن بتاں ہو لے اکبر
 کوئی پہنچا نہیں لے یار تیرے قدر عنا تک
 زمیں پر جمع روشن ہے فلک پر ماہ تاباں ہے
 جو اُس نے ناز سے پوچھا کہ تیری آرزو کیا ہے
 کہیں دل ہوں کہیں میں باعث بیتابی دل ہوں
 کہیں جلوہ ہوں صورت کا کہیں ہوں شاہد معنی
 کہیں عاشق کا مطلب ہوں کہیں مشتاق کی خواہش
 کہیں تصویر حیرت ہوں کہیں غو پریشانی
 کہیں ہوں ولولہ دل کا کہیں ہوں ضبط عقل کا

غیرت داماں گلچیں ہو رہا ہے کوئے دوست
 جس میں جوہر کے عوض رہتا ہے عکس و عکس بہت
 خیال تک نہیں جاتا کبھی ہنسی کی طرف
 وہ آنکھ اٹھا کے نہیں دیکھتے کسی کی طرف
 یہی نظر ہے کہ اٹھتی نہ تھی کسی کی طرف
 تم اپنا دھیان لگائے رہو اُسی کی طرف
 ہماری فکر عالی سر سے ہو آئی طوبیٰ تاک
 تمہارے نور سے ہیں فیضیاب ادنیٰ سے اعلیٰ تک
 خوشی سے یہ ہوئے سچو کہ ہم بھولے مٹا تک
 کہیں انداز بسل ہوں کہیں میں ناز قائل ہوں
 کہیں ہوں محل لیلیٰ کہیں لیلیاے محل ہوں
 کہیں محبوبِ مطلق ہوں کہیں مختار کا مل ہوں
 کہیں ہوں شیفہ رخ کا کہیں لغزل کا لعل ہوں
 روانی میں کہیں دریا کہیں رکنے میں ساحل ہوں

رنگ متوسط

دنیا کا دیدنی وہ تماشا نکل گیا
 ہر ارادے میں نظر آتی ہے اک صورت یاس
 مطمئن ہو کے لگاتا ہوں لحد میں بستر
 پیغام آ رہا ہے دلِ بے قرار کا
 شائق ہوا ہے لوسہ داماں یار کا

اب گردہ گئی ہے وہ میلہ نکل گیا
 شغل اب کچھ بھی نہیں فرخ عزیمت کے سوا
 اب اٹھاتا ہے مجھے کون قیامت کے سوا
 قائم ہے سلسلہ مرے اشکوں کے تار کا
 اللہ رے حوصلہ مرے مشتِ غبار کا

<p>باغ جہاں میں کوئی روش بے خلش نہیں شس و قمر کو دیکھتے ہیں تجھ کو بھول کر اب تو ہے عشق بتاں میں زندگانی کا مزا ہے سبب جوش جنوں کا رنج ہجر اے حضور عشقِ بخت میں کفر کا مجھ کو ادب کرنا پڑا تجربہ نے حُبِ دنیا سے سکھایا احتراز عام ہستی کو تھا مد نظر کرتاں راز</p>	<p>دوڑاؤں گل پہ ہاتھ تو کھٹکا ہے خار کا کیا شعبہ ہے گردش لیل و نہار کا جب خدا کا سامنا ہوگا تو دیکھا جائے گا آپ تو تشریف لائیں ہوش بھی آجائے گا جو برہمن نے کہا آخسر وہ سب کرنا پڑا پہلے کہتے تھے فقط منہ سے اور اب کرنا پڑا ایک شے کو دوسری شے کا سبب کرنا پڑا</p>
<p>شرغیروں کے اُسے مطلق نہیں آئے پسند حضرت اکبر کو بالآخر طلب کرنا پڑا</p>	
<p>(رنگِ آخسر)</p>	
<p>جب یہ دیکھا کہ جہاں میں کوئی میرا نہ رہا اس کی پردانہ رہی خوش رہے دنیا بھر سے حیرت افزا ہے مرا حال مگر کون سنے</p>	<p>شدتِ یاس سے میں آپ بھی اپنا نہ رہا عاقلوں میں مری گنتی ہو یہ سودا نہ رہا دیدنی بھی ہے مگر دیکھنے والا نہ رہا</p>
<p>دیکھنے کی تو ہے یہ بات رہا کیا اُس میں آپ اکبر سے عہث پوچھتے ہیں کیا نہ رہا</p>	
<p>بے تعلق منزل ہستی سے گزرا دل مرا نہیں کام ازباں کا کچھ اب دعا کے سوا</p>	<p>اُس کی نظروں میں سزا دار تمنا کچھ نہ تھا نظر کسی پہ نہیں ہے مری خدا کے سوا</p>
<p>کردں کیا غم کہ دنیا سے ملا کیا یہ دونوں مسئلے ہیں سخت مشکل وہاں قالو بلے یاں بُت رستی</p>	<p>کسی کو کیا ملا دنیا میں تھا کیا نہ پوچھو تم کہ میں کیا اور خدا کیا ذرا سوچو کہا کیا تھا کیا کیا</p>

یہ چرچے ہو رہے ہیں جا بجا کیا	اکبر سربیکس کی ہو خیر
حشر بھی ماضی نظر آیا جو پردا اٹھ گیا	میرے دل سے امتیاز دی و فردا اٹھ گیا

جہاں فانی کی حالتوں پر بہت توجہ عبث ہے اکبر
جو ہو چکا ہے وہ پھر نہ ہو گا جو ہو رہا ہے وہ ہو چکے گا

غور جب ہم نے کیا سانس کو دنیا پایا	ترک دنیا کے خیالات کو دھوکا پایا
------------------------------------	----------------------------------

ہی کو سمجھا نہیں ہوں اب تک اگرچہ وہ اصل مدعا ہے
خدا کو البتہ جانتا ہوں خدا یہی ہے جو ہو رہا ہے
جدائی نے میں بنایا مجھ کو جدا نہ ہوتا تو میں نہ ہوتا
خدا کی ہستی ہے مجھ سے ثابت خدا نہ ہوتا تو میں نہ ہوتا

دل میں ہو خون تو سودا کا خریدار نہ ہو	دل گادلا سمجھ کے جواب اُن کی بات کا
رنگ ظاہر پہ نہ جا نقش بہ دیوار نہ ہو	دہریس سوختہ گرمی بازار نہ ہو
مدعا یہ ہے کہ دم بھر کو بھی بریکار نہ ہو	نقش دل ہو صفت معنی رنگیں لے دوست
وہ ہے آزاد ہم غیروں کا گرفتار نہ ہو	سانس کی طرح چلے منزل ہستی میں بشر
برق خرمن کہیں یہ گرجی گفتار نہ ہو	نہیں آزاد جو اپنوں سے نفل کرے قطع
یہی مستی و صبہ جو عقل کو ہٹا کرتی ہے	بزم ہے شملہ مزا جوں کی سنہل لے اکبر
کہ یہ ماتم میں ہو مصروف اور وہ چین کرتی ہے	جنون عشق سے انسان کی طینت سنورتی ہے
	یہ پتہ ہے بے خبر ہے نصف دنیا نصف دنیا

وہ ایذا میں مجھے مایوسیوں نے دی ہیں لے اکبر
کہ امید قائم رکھتے ہوئے بھی دل میں ڈرتی ہے

اکبر کی خوش طبعی اور ظرافت اکبر کی خاص شہرت انکی ظرافت، بذلہ سنجی اور لطیف طنزیات پر
لے مقابلہ کر داکم اس محفل کے اس محفل سے کہ "مغلی ایک از ہے جو نصف دنیا نصف دنیا سے پھپھاتی ہے ۱۷۰"

یعنی ہے جو اُن کی زندگیوں میں آبدار موتیوں کی طرح چمک رہی ہیں۔ اُن کا ابتدائی ظرفیانہ رنگ اودھ چمک کی نامہ فکاری سے شروع ہوا مگر وہ بہت جلد اس سے گزر کر ترقی کے مدارج اعلیٰ تک پہنچ گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اوائل عمر ہی میں ان کو اس رنگ سے خاص لگاؤ تھا کیونکہ اس زمانہ کے کلام میں بھی مہین اشعار کے ساتھ کہیں کہیں نزاقیہ اور ظرفیانہ اشعار کہہ جاتے ہیں۔ اُس کے بعد جوں جوں زمانہ گزرتا گیا اور موسائٹی کا رنگ بدلتا گیا اُن کے اس رنگ میں ترقی ہوتی گئی اور پختہ کاری آتی گئی اس رنگ نے ان کی شوخ طبیعت کے واسطے نئے نئے راستے کھول دیے اور انھوں نے اس سے نہایت مفید خاص خاص کام لینا شروع کئے۔ اس رنگ میں حقیقتاً وہ بے مثال رہے اور ہر چند کہ بہت سے لوگوں نے ان کی نقل کرنا چاہی مگر صحیح معنوں میں کوئی ناقل نہ ہوا سب نقال رہے وہ حقیقی ظرافت اور شاعرانہ دل و دماغ کا مجموعہ تھے۔ اُن کا تیسرے دور کا کلام خاص کر اس رنگ میں بہت کامیاب ہے اس میں اُن کی ظرافت محض ظرافت ہے آخر عمر میں البتہ اس طرز و روش میں فرق آگیا ہے اور وہ ظرافت کے پردے میں اور بہت سے مفید مضامین ادا کر جاتے ہیں اس وقت اگرچہ وہ نحیف و ناز ہو گئے تھے مگر شاعرانہ دل و دماغ برابر اپنا کام کرتا تھا اس زمانہ میں وہ ظرافت اور بذلہ سنجی کو۔ اخلاقی، سیاسی، روحانی مسائل کے ادائے مطالب کا ایک مؤثر ذریعہ بنائے ہوئے تھے۔ مقصود بالذات صرف ظرافت نہ تھی بلکہ تعلیم حقائق مقصود اصلی تھی۔

اکبر کی ظرافت کے اجزاء حسب ذیل ہیں :-

(۱) جدید اور لطیف تشبیہیں اور تشلیں جو عام مشاہدے کی چیزوں میں برتی جاتی ہیں ان میں وہ تصنع و نازک خیالی سے کام نہیں لیتے بلکہ انھیں چیزوں کا ذکر کرتے ہیں جو ہر شخص دیکھتا ہے اور جانتا ہے اور انھیں کے بیان میں ایک خاص جدت اور لطف پیدا کر دیتے ہیں جس سے دل مزے لیتا ہے۔

(۲) نئے نئے یا مذاق الفاظ مختلف زبانوں کے آخر شعر میں بطریق قافیہ استعمال کرتے ہیں۔
 (۳) معمولی الفاظ ایسے الزکھے طریقہ سے استعمال کرتے ہیں جو اُس سے قبل کبھی نہیں سنے گئے تھے
 (۴) ایسے معمولی اور سبک الفاظ جن کو شعرا عام طور پر استعمال نہیں کرتے۔ وہ شعر میں نہایت جدت طرازی اور شوخی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ اس قسم کے الفاظ کی اتنی کثرت ہے کہ ان کی ایک مختصر فہرست تیار ہو سکتی ہے مثلاً کلو، صلو، بدھو، جمن وغیرہ کہ یہ ان کے خاص اصطلاحات ہیں اور وہ ان کو خاص خاص محضوں میں استعمال کرتے ہیں معمولی معمولی الفاظ مثلاً گٹ پٹ فالتویا اکثر بازاری محاورے جو شعر میں نہیں کھپ سکتے اور عام طور پر پیرکانوں کو بُرے معلوم ہوتے ہیں مگر ان کے کلام میں وہ نہایت عمدگی سے استعمال ہوئے ہیں اسی طرح ایسے بھی الفاظ ہیں کہ جو دیگر شعرا کے یہاں اور محضی میں استعمال ہوئے ہیں مگر اکبر ان کو بالکل دوسرے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ بعض ایسے انگریزی الفاظ بھی لکھ جاتے ہیں جو اردو میں ہنوز مروج نہیں ہوئے اور کلام میں ثقیل اور بے میل معلوم ہوتے ہیں۔ اس قسم کی خراش میں انھوں نے محض اپنی طباعی اور ذہانت سے کام لیا ہے۔ کوئی رنگینی عبارت یا عمق معنی پیدا کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ صرف ہلنا ہلنا نا مقصود ہے۔

اکبر کی ظرافت کو محض بدلہ سنجی اور تخرنہ سمجھنا چاہیے، اس کی تہ میں نہایت لطیف اور عمیق معنی ہوتے ہیں اور کوئی نہ کوئی حقیقت خواہ وہ اخلاقی ہو یا تعلیمی، سیاسی ہو یا معاشرتی ادب آموز ہو یا روحانی ہمیشہ اُس میں پنہاں ہوتی ہے اُن کے الفاظ اور معانی میں ہمیشہ چوٹی اس کا ساتھ ہوتا ہے۔ ان کے پند و نصائح کبھی تلخ نہیں معلوم ہوتے اور نہ اُن کا مذاق عامیانا اور سوتیلانا ہوتا ہے ان کی ظرافت بہت جامع اور وسیع ہوتی ہے۔ وہ کبھی کسی مخصوص شخص یا جماعت کا خاکہ نہیں اڑاتے بلکہ اُن کی ظرافت کے تیر بلا سحاظ مراتب سب طرف چلتے ہیں البتہ واقعات و سیاسیات حاضرہ اُن کی خاص دُکھی کی چیز ہے۔ مغربی طرز تعلیم اور ہندستان میں انگریزی تہذیب کی دلدادگی پر اُنھوں نے بہت کچھ کہا ہے۔ اسی طرح سوسائٹی کی خرابیوں

اور تعلیمی اور مذہبی نقائص کو بھی نشانہ ظرافت بنایا ہے۔ امیرِ غریب، عالم و جاہل، ہندو مسلمان، سنی، شیعہ، سب کی بلا امتیاز و تفریق خبر لی گئی ہے۔ اُن کے کلام کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ سیاسیات سے اُن کو خاص دلچسپی تھی۔ اس قسم کے بعض اشعار بادی النظر میں تو معمولی معلوم ہوتے ہیں مگر نظرِ غور سے دیکھا جائے تو ایمل تیر و نشتر بھرے ہیں۔

اکبر کی خاص اصطلاحات یہ ہیں: مس، شیخ، سید، اونٹ، گائے، کلیا، مسجد، مندر، بُت، کالج، برہمن، لالہ۔ اور اسی قسم کے دیگر الفاظ جو ایک خاص معنی رکھتے ہیں، ہمیں سے مغربی تعلیم کی نظر فریبی اور دلکشی۔ شیخ سے پُرانے رنگ کے مسلمان جو اپنے مذہب کی باتوں سے تودافن ہیں مگر انگریزی تہذیب سے بالکل نا آشنا ہیں۔ سید سے سرید مرحوم جو انگریزی تعلیم و تہذیب کے دلدادہ تھے یا اُن کے متبعین یعنی علی گڑھ کالج کی تعلیم کے عاشق۔ اسی طرح اونٹ سے مسلمانوں کی قدیم شان و شوکت اور گائے سے مسلمان ہندوؤں کا اتحاد مراد ہے۔

اقام ظرافت | اکبر کی ظرافت مندرجہ ذیل اقسام پر تقسیم ہو سکتی ہے۔ مذہب، سیاسیات، تہذیب جدید، پروردہ و تعلیم نسواں، ظرافت الفاظ، طنزیات۔

ان سب اقسام کے نمونے بالترتیب فقہرِ آپیش کیے جاتے ہیں۔

مذہب

فیشن کے انتظام صفائی کو کیا کر دے
اس فرد کو بچائیے تفصیل ذیل سے
یہاں تو شیخ کو دُمن ہے بگل بجانے کی
اب صرف منع کرتے ہیں دیسی شراب کو
رکھتا ہوں اک اونٹنی بھی ٹٹم کے ساتھ
قوال کی بھی صدا ہے جھم جھم کے ساتھ

داڑھی خدا کا نور ہے بیشک مگر جناب
چہرے کے نیچے قہر ہے داڑھی کا جھول جھال
بجائیں شوق سے نا توں برہمن اکبر
مرعوب ہو گئے ہیں ولایت سے شیخ جی
پیتا ہوں شراب اب نہ مزہم کے ساتھ
بے عشتِ حقیقی و مجازی دونوں

صاف کتا ہوں رہیں خوش یا ہوں ناخوش مولوی	آسمان اب چاہتا ہے مولوی کش مولوی
پیارا ہے ہم کو شیخ ہمارا بُرا سہی	چاقو دلائی نہیں دیسی پھرا سہی
مصیبت میں بھی اب یادِ خدا آتی نہیں گویا	دعا منہ سبز نکلی پاگلوں سے عرضیاں نکلیں
بے نمازوں میں ہیں وہ اور اس پر شرما تے نہیں	یہ غنیمت ہے کوئی ٹوٹے تو گمراہ تے نہیں
نیت کس مصروف کا رویں بہ قلب مطمئن	یک فتافی الا نرسٹ دیک فتافی الدادون
شیخ پر گو کہ رشک آتا ہے	اونٹ کے سب لغات جانتے ہیں
ہیں مگر اونٹ پر، ہمیں قابض!	کام کی ہم یہ بات جانتے ہیں
اسلام کی رونق کا کیا حال کہیں تم سے	کونسل میں بہت سید مسجد میں فقط جتن
آج بنگلے میں مرے آئی تھی آواز اذان	جی رہے ہیں ابھی کچھ اگلے زمانے والے
مکہ تک ریل کا سامان ہوا چاہتا ہے	اب تو انجن بھی مسلمان ہوا چاہتا ہے

سیاسیات

سر فیوں نے ریٹ لکھوائی ہو جا جگے تھانے میں	کر اکبر ذکر کرتا ہے خدا کا اس زمانے میں
انہم کھیں مشاغل حضرت اکبر کے ان روزوں	اکم تر کیف بیٹھے پڑھ رہے ہیں فیل خانے میں
مزید ان کے تو شہر میں اڑے پھرتے ہیں موٹر پر	نظر آتے ہیں لیکن شیخ جی اب تک میانے میں
بالرکھنے لگے بجٹ پہ لڑو	ملک کو دیکھو اپنے حق پہ اڑو
کہدیا صاف ہم نے اے خراج	ہو مبارک تمہیں یہ کام یہ کاج
ما مقیمان کوئے دلداریم	یا ڈپویشن مست یا عنسم میم
کھینچو نہ کمانوں کو نہ تلوار بھالو	جب توپ مقابل ہو تو اخبار نکالو
یہ دال لب گنگ بھی گل نہیں سکتی	گلور کے پٹاخے سے بلا ٹل نہیں سکتی
کامیابی کا سُندی پر ہر ایک درست ہے	چونچ طوطا رام نے کھولی مگر پرستہ ہے

اصل کا اُس بُت خود پس کے کوئی اہنٹ کہاں
ممبر علی مراد ہیں یا سکھ ندہان ہیں !
صرف برسہ میں بھلا سلف گورنمنٹ کہاں
لیکن معائنہ کو وہی نایدان ہیں

تعلیم و تہذیب جدید

ہم ایسی کل کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں
شوق لیلائے سول سردس نے اس مجنون کو
کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خطی سمجھتے ہیں
جہانم ہستی کے ٹکڑے اڑ رہے ہیں ترے میں

نہ تیرا فکمی ہے نہ اب حکمرانی
نہ یا ہم ادب ہے نہ وہ مہربانی
نہ وہ وضع ملت نہ قرآن خوانی
ہر اک شاخ میں پاس یہ اے بوا ہے

تعلیم جو دی جاتی ہو ہمیں وہ کیا ہو فقط بازار می ہے
ٹٹھا دیا ہر اک کو مغرب نے پاس کر کے
جو عقل سکھائی جاتی ہو وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے
سنے نہیں ہیں شیخ نئی روشنی کی بات

پردہ و تسلیم نسواں

پردہ اٹھتا ہے ترقی کے یہ سامان تو ہیں
غریب اکبر نے بحث پردہ کی بہت کچھ مگر ہوا کیا
حوریں کالج میں ہو بچ جائیں گی غلمان تو ہیں
اٹھ گیا پردہ تو اکبر کا بڑھا کون سا حق
نقاب الٹ ہی دی اُس نے لکڑی لکڑی لگا دیا
بے پکارے جو مرے گھر میں چلا آتا ہے
صرف حکام سے ملنے میں مزا آتا ہے
ضرورت کیا ہے پردے کی جہاں بیگم پانی ہو
خاتون خانہ ہوں وہ سبھا کی پری ہوں
نظر میں تیرگی ہے اور رگوں میں ناتوانی ہو
تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر

ذی علم و متقی ہوں جو ہوں ان کے مقظم
ترقی کی نئی راہیں جو زیرِ آسمان نکلیں
حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جیت بیگانہ تھی
ہمارے ملک میں ہونا ہے کیا تعلیم نسواں سے

اُستاد اچھے ہوں مگر اُستاد جی نہ ہوں
میاں مسیور سے نکلے اور حرم سے بی بی نکلیں
اب ہے شمعِ انجمن پہلے چراغِ خانہ تھی
بجز اس کے کہ بادِ ادب بھی گھبراہٹیں اماں سے

ظرافتِ الفاظ

ح حکومت کی جیب ہیاں نہ رہی
ہر طرح اب ہے عاجزی ہم میں

حنفی نفی ہیں معطل ہیں
اب ہمارے امام حبیل ہیں

اذا نوں سے سوا بیدار کن انجمن کی سیٹی ہے
کہاں باقی رہو ہم میں وہ اور ادھر گاہی
گئے شربت کے دن باروں کے آگے اتوائے ہر
شیخِ تنلیست کی تردید تو کرتے نہیں کچھ
عاشقی کا ہو ہوا اُس نے بگاڑے سارے کام
شیخ جی گھر سے نہ نکلے اور یہ فرما دیا
پکالیں بیس کر دور دیل تھوڑے سے بولا نا

اسی پر شیخ بیچارے نے چھاتی اپنی بیٹی ہے
ذلیفہ کی جگہ یا پائیر یا آئی ڈی ٹی ہے
کبھی سوڈا کبھی لٹنڈ کبھی دھسکی کبھی ٹی ہے
گھر میں بیٹھے ہوئے والنتین پڑھا کرتے ہیں
ہم تو اے بی میں رہے اغیار بی اے ہو گئے
آپ بی اے پاس ہیں اور بندہ بی بی پاس ہے
ہماری کیا ہے اے بھائی نہ مڑیں نہ مولانا

عہدِ اسلام و عہدِ انگلش میں
پہلے توحید تھی تو اب تحصیل

مٹنے پر قول اکبر سخن گو کا
آگے غل ایک کا تھا اب دو کا

طنزِیات

آزرا گر ملے جو ہے نام و نمود میں
دوزخ کے داخلے میں نہیں ان کو عذر کھ

کیا ہر جِ زندگی ہو اگر حالِ زشتہ میں
فونڈ کوئی لگا دے جو ان کا بہشت میں

نہ نماز ہے نہ روزہ نہ زکوٰۃ ہے نہ حج ہے	تو خوشی پھر اس کی کیا ہے کوئی جنت کوئی حج ہے
ہمارے مجلس اب بھی لطیف اجزا سے ملیں	بزرگ خفش تھے قبل اس کے اب سپر گٹو ہیں
حال دنیا سے بے خبر ہیں آپ	گو تقدس مآب بے شک ہیں
شیخ جی پر یہ قول صادق ہے	چاہ زمزم کے آپ مینڈک ہیں
شیخ جی کو جو آگیا غصہ	لگے کہنے یہ پھینک کر دھستہ
تم ہو شیطان کے مطیع و مرید	تم کو ہر ایک جانتا ہے پلید
ہے تمھاری نمود بس اتنی	جس طرح ہو پڑی پرید پہ لید

استحصال بالجبر

یعنی ایسے اشعار جو ادنیٰ تغیر الفاظ سے کلام اکبر بن گئے ہیں۔

کریمایہ بخشائے بر حال قوم	صلوٰۃ است راجح در ایشاں نہ صوم
کریمایہ بخشائے بر حال بندہ	کہ ہستم اسیر کیٹی و چندہ
رشتہ در گردنم افگندہ پیٹ	مے برد ہر جا کہ یک است دلیٹ
پہلے ہم لوگ یہ سمجھتے تھے	ہر چہ از باپ میر سزنیکو ست
ہو گئی اب خیال کی اصلاح	ہر چہ از آپ میر سزنیکو ست
اکنوں کو ادا مانع کہ پرسد ز پائیر	کز ن چہ گفت دل چہ شنید و مگر چہ کرد
ہیٹ را بر سر من بجائے دستارے عزیز	مرد تا مٹر تو اند شد چہ اقبلہ شود
عمر گزری ہے اسی بزم کی طراری میں	دوسری پشت ہے چندہ کی طلبگاری میں
ڈنر سے تم کو کم فرصت یہاں فاقہ سے کم خالی	چلو بس ہو چکا ملنا نہ تم خالی نہ ہم خالی
الایا ایہا الطفک بجو راحت بہ نادہما	کہ قرآن سہل بود اول دے لے افتاد مشکہا
بکن تزمین پائے خود بہ بوت ڈاسن بتلون	کہ سر تید خبر دار دز را دور ہم منزلہما

سکہ زر بالبوے دردھوتی زرتار داشت گفتش در عین وصل این ناله فریاد حسیت	باد جودش نالہائے زار در اخبار داشت گفت مارا خون ندیش و شکس این کار داشت
در پس ہر گریہ آخر خندہ ایست یاد دار این قول مولانا کے روم	بعد ہر افسوس آخر چندہ ایست مرد آخر میں مبارک بندہ ایست
ہم دُز خواہی و اتم آر و غصاف	ابن خیال ست و محال ست و گزاف

اکبر کی سیاسی نظیں اس قسم کی نظمیں و دُطرَح کی ہیں۔ ایک وہ جن میں محض ظرافت ہی ظرافت ہے یعنی ایک عمدہ خیال ظریفانہ طرز میں ادا کیا گیا ہے اور بس ان کا مقصد صرف خوش طبعی ہے دوسری وہ کہ جن میں ظرافت کے پردہ میں سیاسی معاملات اور حقائق مضمر ہیں۔ اس قسم کے اشعار میں مصنف کی رائے کے ساتھ اُن کی ذاتی ناراضی اور غیظ و غضب بھی شامل ہے۔ ان میں ظریفانہ انداز صرف اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ حق بات کی تلخی و درہرہ کر شاعر کا دلی مطلب سامع کے دل میں اُتر جائے۔ اس قسم کے اشعار سے وہ دہی کام لیتے ہیں جو ایک ہوشیار ڈاکٹر شکر آلود تلخ گوئیوں سے لیتا ہے۔ معمولی اشخاص کے واسطے ایسے اشعار صرف ہنسنے ہنسانے کا کام دیتے ہیں مگر جو لوگ اُن کے انداز طبیعت سے واقف ہیں اُن کے لیے وہ بہت عمیق معنی رکھتے ہیں۔ پڑھنے والے کو چاہیے کہ اس قسم کے اشعار کا مطلب سمجھنے کے واسطے وہ ذرا سوچ و فکر سے کام لے۔ سیاسی اشعار میں وہ مغربی طرز معاشرت کی حقیقی اور اصلی کیفیت دکھاتے ہیں۔ نزدیک یہ سب دام ہیں جو مشرقی روحانیت کو شکار کرنے کے لیے بچھائے گئے ہیں۔ سیاسی حقوق کو محض زنجیر غلامی کی مختلف کڑیاں تصور کرتے ہیں جو سیدھے سادے ہندوستانیوں کے پھانسنے کی تدبیریں ہیں۔ اُن کے نزدیک سرکاری اسکول ایسے کارخانوں سے زیادہ نہیں جن میں کھلا کر لوگ تیار کیے جاتے ہیں اور غلامی ذہنیت اور بڑھاپی جاتی ہے اور انگریزی تعلیم سے زنجیر غلامی کی کڑیاں اور بھی کستی جاتی ہیں وہ محکمہ سی آئی۔ ڈی سے معشوق کی کمر کی تلاش کراتے ہیں اور کہتے ہیں۔

کیا پوچھتے ہو اکبر شو ریدہ سر کا حال
خفیہ پولیس سے پوچھ رہا ہے مگر کا حال

عیسائیت کے اس فرسودہ استراض کے جواب میں کہ اسلام بذریعہ شمشیر پھیلا یا گیا وہ پوچھتے ہیں کہ کیا یورپ بھی اپنی تہذیب اور مغربی ساز و سامان کی چکاچوندھ سے روپیہ وصول نہیں کرتا اور رعایا کو دہائی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ بند کرنا نہیں چاہتا۔ مگر اس قسم کے اشعار کو اُن کی ذاتی رائے سمجھنا ضروری نہیں کیونکہ اکثر ایک بڑے شاعر تھے۔ ریاست داں نہ تھے۔ اُنھوں نے علم پالیٹکس کی تعلیم نہیں پائی تھی بلکہ وہ ایک سرکاری ملازم تھے اور مختلف عہدہ ہائے سرکاری پر اپنے فرائض منصبی قابلیت سے انجام دے کر پیش پاگئے تھے اور حُسن خدمات کے صلے میں خان بہادری کا خطاب بھی ملا تھا چونکہ وہ شاعر تھے لہذا ہر قسم کے خیالات کا اظہار شعری میں کرتے تھے اس سے غرض نہیں کہ وہ خیال اُن کا ذاتی ہوتا یا کسی دوسرے کا ہوتا تھا۔ اُن کو خیال کی واقعیت سے سروکار نہ تھا بلکہ اسکے طرز ادا سے تھا وہ کبھی گورنمنٹ کے موافق اور کبھی گورنمنٹ کے خلاف لکھتے تھے اور چونکہ شاعر تھے لہذا اتان کی گرفت سے بے خوف تھے اُن کی رائیں جیسا کہ اُن کے اشعار سے ظاہر ہوتی ہیں کسی ماہر سیاسیات کی مستند رائیں نہیں شمار کی جاسکتیں کیونکہ اُن کے مقولوں میں بعض جگہ اختلافات بھی ہیں۔ وہ نظریات بہت محتاط تھے اور کوئی ایسی رائے نہیں ظاہر کر سکتے تھے جس کے نتیجے میں اُن کو دشواریاں پیش آئیں۔ وہ شاعر پہلے ہیں اور ماسوائے شاعر بعد کو اُن کا مقدم فرض منصبی خوش کرنا ہے خیالات کا اظہار اُس کے مابعد ہے۔ وہ کسی گردہ یا جماعت کی کمزوریوں کی گرفت کرتے ہیں اور اُن کو اپنے اشعار میں نہایت مختصر جامع اور ظریفانہ انداز سے پیش کرتے ہیں۔ بعض اوقات وہ مسلمانوں کے معرفت ہیں کہ وہ انگریزی تعلیم حاصل کرنے میں کوشاں ہیں۔ دوسرے مواقع پر وہ اسی تعلیم مغربی کے سخت مخالف ہیں کیونکہ یہ بے دینی اور لامذہبی کا زینہ ہے۔ وہ اخلاقی مسائل کو کسی فارم یا فلسفی کی طرح شرح و بیط سے بیان کرنا نہیں چاہتے بلکہ اُن کو اپنے اشعار میں دلچسپ و مختصر طریقہ سے بیان کر جاتے ہیں مگر یہی اختصار مضمون کو بہت معنی خیز اور پُر زور بنا دیتا ہے پھر الفاظ کے انتخاب میں اُن کو وہ یدِ طولی حاصل ہے کہ ایک ہی لفظ سے کسی کئی معنی نکالتے ہیں جیسا کہ نظریں عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتے۔ اُن کے نزدیک تمام ساسی امراض کی جڑ ہندوستان کی کمزوری

ہے ہماری خوشامد اور گرہ گزارنے سے اور اسی طرح آہ و زاری اور اضطراب سے ہم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ یہ قومی کابیر کا مصرف اور کمزوری کی نشانی ہے۔ اسی طرح انھوں نے کانگریس کی کارروائیوں، انتہا پسند جماعتوں اور جابرانہ حکومت کے نقائص کا بھی خوب خاکہ اڑایا ہے۔ یہ سب مضامین نہایت نادر استعارات، لطیف اشارات اور بلیغ ظرافت کے پردہ میں چھپے ہوئے ہیں۔ معمولی پڑھنے والوں کے واسطے تو وہ محض ایک زعفران زار ہیں مگر چشم حقیقت میں ان کی تہ میں ایک معنی دیکھتی ہے۔ ان کے اشعار میں محض سماعی اثر سے بہت زیادہ اثر ہے۔ ان کے بعض اشعار پر گورنمنٹ کو جنگ عظیم اور بلوہ مسجد کانپور کے زمانہ میں ان کو مستنبہ کرنا پڑا تھا کہ شورش انگیز مضامین لکھنے سے آئندہ اجتناب کریں۔ ان کے اشعار بہت مؤثر تھے اور ہر شخص کی زبان پر تھے اس واسطے کہ ان سے اعلیٰ اور عامی سے عالم تک ان کو پرستے اور اپنی اپنی سمجھ کے مطابق ان کا مطلب نکال کر ان سے محفوظ ہوتے تھے۔ ان کے کلام کی یہ بھی ایک خاص صفت ہے کہ اردو اور ہندی زبان کے دلدادہ دونوں اُس کو مساوی طریقہ پر پسند کرتے ہیں۔ سیاسی اور اخلاقی میدان میں اکبر ایک قومی شاعر ہیں وہ اپنی قوم کے لوگوں کو تنبیہ کرتے ہیں کہ تم نے اپنا قومی امتیاز اور قومی آئیڈیل چھوڑ دیے اور مغربی معاشرت اور مغربی تعلیم کے دلدادہ ہو گئے۔ ان کا یہ اعتقاد ہے کہ روحانیت، مادیت، پر ضرور غالب آئے گی تمام سیاسی مشکلات کا ان کے نزدیک حل یہ ہے کہ احکام خداوندی کی تعمیل کی جائے اور قدرت بخشنے والی پر پورا بھروسہ رکھا جائے۔

ایک بحیثیت نکتہ چین سوسائٹی | اکبر کی شاعری کی نوید کا زمانہ وہ تھا جبکہ ہندوستان گویا نیا جہنم لے رہا تھا۔ مغربی تعلیم اور مغربی معاشرت کی شراب خالص ہندوستانیوں کے دماغوں میں شکر گئی تھی جس کی وجہ سے اعتدال دماغی وہ کھو بیٹھے تھے ہندوستان ایک عجیب انقلاب کا جولانگہ تھا۔ مغربی تمدن، مغربی اخلاق، معاشرت، غرض کہ ہر قسم کی مغربیت آنکھوں کو خیرہ اور دماغوں کو تیرہ کر رہی تھی۔ ہندوستانی لوگ مغربیت کے تار و پود کو گھونٹتے تھے کہ انگریز بننا اپنا آخر سمجھتے تھے

اس قسم کے لوگوں کو اس میں خاص لطف آتا تھا کہ پُرانی تہذیب اور پُرانے خیالوں کا خاکہ اُڑائیں وہ ہندوستانی چیز کو نگاہ حقارت سے دیکھتے تھے۔ یورپی نام، یورپی لباس، یورپی طعام، یورپی وضع و قطع مرغوب خاطر تھی انگریزی گفتگو ایک خاص طفرائے امتیاز سمجھی جاتی تھی۔ ہر انگریزی چیز خواہ کسی ہی ہو وہ ہندوستانی چیز سے بہتر خیال کی جاتی تھی۔ مختصر یہ کہ فالتوؤں نے مفتوحوں کے عقل و تمیز ہوش و خرد پر بھی تسلط پالیا تھا۔ قدیم رسم و رواج حتیٰ کہ مذہب کی بھی بے احترامی اور رسوم شکنی کی ہوا چلی ہوئی تھی۔ یہی پُر آشوب زمانہ تھا کہ اس میں کچھ انجام میں ہستیاں بھی پیدا ہو گئیں۔ یہ لوگ آئندہ خطرے سے واقف تھے انھوں نے اُن تیز رفتار لوگوں کو جو شتر بے ہمار کی طرح ٹٹھکے اٹھلے چلے جاتے تھے آگے بڑھنے سے روکا اور راستہ کے خطرات سے آگاہ کیا۔

بنگال کا نام و افسانہ نگار بنگم چند چٹرجی اسی قبیل کا آدمی تھا۔ اس نے اپنے پُر زور اور دلچسپ دلوں میں انگریزی تہذیب اور انگریزی سوسائٹی کا جو خاکہ اُڑایا ہے اور جو کام اس کے افسانوں سے نکلا وہ بہترین و عظیم نصیحت اور سخت ترین نکتہ چینی سے ہرگز نہیں نکل سکتا تھا۔ اگر نے بھی یہی روش اختیار کی مگر اُن کا حربہ بجائے شر کے نظم تھا۔ انھوں نے بھی اُس زمانہ کی حماقتوں کو خوب لتاڑا اور لوگوں کے غرور اور طر ز و روش کا لطیف جوابات الزامی سے خوب خاکہ اُڑایا ہے مگر بعض جگہ وہ چوکے گئے ہیں اور نشانہ خطا کر گئے ہیں۔ انھوں نے تناسب حالات اور مصالح و فتنے کا خیال نہ کر کے بسا اوقات مغربی تہذیب کے درخت کو بیج دیں سے اکھاڑنا چاہا ہے وہ وقت کے ساتھ چلنا نہیں چاہتے تھے اور مغربی تعلیم کے مستقل اور دیر پا فوائد کے بھی قائل نہ تھے۔ شاید اسی وجہ سے یعنی انتہائی قدامت پسندی سے بوری پہلک اُن کے ساتھ نہ تھی اور اسی وجہ سے اُن کی شہرت پر کسی قدر اثر پڑا۔

یہ مصنف صاحب کی ذاتی رائے معلوم ہوتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ اگر ایک بہت مذہبی شخص تھے اور آخر عمر میں تو علی الخصوص اُن کا کلام مذہب اور روحانیت سے ملبوس تھا وہ ترقی اور تہذیب کے کسی حال میں منکر نہ تھے عام اس کو کہ وہ مردوں میں ہویا عورتوں میں۔ مگر جب اس ترقی و تہذیب کا مقصاد مذہب سے ہوتا تھا تو وہ ہزار تہذیبوں کو مذہب پر قربان کرنا پسند کرتے تھے مگر اس سے ان کے کمال اور شہرت پر کوئی اثر نہیں پڑا اور کوئی طبقہ یا جماعت ایسی نہیں ہے کہ جو ان کے کمال فن کی قائل اور معترف نہ ہو محض اس وجہ سے کہ وہ ابنِ انوقت نہ تھے بلکہ برعکس اس کے یہی احترام مذہب مثل ظرافت کے ان کا طرہ امتیاز ہے۔ ۱۲ مترجم

اس نئے انقلاب کے زمانہ میں سرسید سب سے پہلے شخص تھے جو مغربی تہذیب کے فوائد سے بہت متاثر ہو گئے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کو ان کے خواب غفلت سے چونکاتے اور ان کو غمزدگی سے نکالنے کا بس یہی ایک ذریعہ ہے برخلاف اس کے اگر تہذیب جدید کی کامل تقلید اور اس کی ہر بات ماننے کے مؤید نہ تھے۔ ہمارے نزدیک ان کا یہ خیال کہ مغربی تعلیم و تہذیب تمام تر بُری اور ناقابل تقلید ہے صحیح نہ تھا۔ وقت کے سیلاب کو روکنا یا اس کے مخالف چلنا عقل کی بات نہیں ہے۔ اگر جدید تعلیم کے اس وجہ سے مخالف تھے کہ اس میں مذہب کو بالکل بھلا دیا گیا ہے اور اسی وجہ سے لوگ آنا دخیال ہو کر مذہب کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔ وہ پردے کے قیود کو کم کر دیا توڑنے کے کبھی سخت مخالف تھے کیونکہ ان کے نزدیک اس میں بڑے بڑے نقصان ہیں۔ ان کو معلوم تھا کہ انگلستان اور یورپ د امریکہ وغیرہ میں اس جنسی آزادی اور اسے تباط سے بُرے بُرے نتیجے آئے دن پیدا ہو رہے ہیں وہ اس خیال سے کانپتے تھے کہ اگر اسی قسم کا اختلاط مردوں اور عورتوں میں ہندوستان میں واقع ہوا تو اس سے کتنا بڑا طوفان برپا ہو گا۔ ان کے نزدیک مشرقی اور مغربی تہذیب متضاد ہیں بعد المشرقین واقع ہے۔ اس ملک کے حالات خیالات روایات رسوم و رواج یورپ سے بالکل مختلف اور اکثر متضاد ہیں۔ یورپی خرابیوں کی اصلاح کی تدابیر ہندوستان کے لیے موزوں نہیں ہیں کیونکہ اس میں اور ان میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اسی طرح وہ مغربی طرز پر تعلیم لوگوں کے بھی سخت مخالف ہیں۔ کیونکہ اس سے عورتوں کے اخلاق پر ضرور اثر پڑے گا۔ انھیں وجہ ہو انھوں نے مغربی پسندی کا اپنے اشعار میں خوب خاک اڑایا ہے اور جابجا اس پر طنز کیے ہیں ہندوستانی عشاق کو ان کی رائے میں کتاب محبت کا سبق اپنے ہم مشربان یورپ سے لینا پڑے گا اور ہندوستانی معاشق کو ادا و ناز اور کرشمہ و غمزہ کا انداز اپنی یورپی مجلسوں سے سیکھنا پڑے گا کیسیوں اور چندوں کا زمانہ ہے۔ مردوں اور عورتوں دونوں کے خیالات اور جذبات اور اخلاق ہر چیز میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہو گیا ہے۔ پرانے قومی اُمیدیں لوگ کھو بیٹھے یا ان کو عمداً حوالہ ماضی کر دیا۔ علماء و عرفان نے اپنی قدیمی وضع چھوڑ کر شہرت پرستی اور نفس پرستی اختیار

کر لی۔ صوفی اب اپنے زہد و ورع کی تجارت کرنے لگے۔ علمائے مثل سابق کے شمع ہدایت نہیں رہے۔ عورتیں ”پیراغ خانہ“ سے شمع انجمن ”بن گئیں۔ مادیت کا دور دورہ ہے قناعت اور خودداری چھوڑ کر لوگوں نے ترقی کا زینہ خوشامد اور چا پلوسی کو ٹھہرا دیا۔ غرض کہ یہ امور مذکور بالا اس نئے زمانہ کے تبرکات ہیں اور ان سے کسی قسم کا بھی فائدہ متصور نہیں ہے۔ اسی انتہائی قدامت پسندی کی وجہ سے وہ سرسید اور ان کے یقین یعنی تعلیم علی گڑھ کے حامیوں کے سخت مخالف تھے۔ جس قدر سرسید کی رفتار ان کے نزدیک تیزی تھی اسی قدر ہمارے نزدیک ان کی روش سست تھی۔ اکثر اس قسم کے اختلافات ضرورت شری پر بھی مبنی کئے جاسکتے ہیں۔ اکبر نہ صرف جدید خیالات اور جدید تہذیب کی اشاعت کے شاکی ہیں بلکہ وہ قومی تہذیب کے تعلیم کے زوال کے بھی نوحہ گر ہیں۔ وہ درستی اخلاق اچھے علوم قدیمہ اور ان خرابیوں کے جو مشرقی شائستگی میں بیرونی اثرات سے داخل ہو گئی ہیں دور کرنے کے بڑے حامی ہیں۔ وہ تعلیم نسواں کے اصولاً خلاف نہیں مگر اس کا صحیح طریقہ پر رواج چاہتے ہیں۔ ان کی غرض یہ ہے کہ عورتیں تعلیم پا کر اچھی بیویاں اور اچھی مائیں بنیں۔ قومی جائیداد نہ بنیں۔

دو اُسے شوہر و اطفال کی خاطر تعلیم	قوم کے واسطے تعلیم نہ دو عورت کو
------------------------------------	----------------------------------

وہ پرانی پاس و صبح۔ سچائی۔ ہمدردی۔ قناعت۔ خودداری وغیرہ کے فقدان کا افسوس کرتے ہیں اور زمانہ موجودہ کے مایہ ناز صفات پالسی، دروئی، خود غرضی، جھمپتی پر غصہ اور افسوس کرتے ہیں۔ ان کو افسوس آتا ہے کہ اپنی ذاتی ترقی کی کورانہ روش کے پیچھے لوگ اپنے والدین بھائی بہن اور دیگر متعلقین اور واسطہ داروں کے واجبی حقوق فراموش کر بیٹھے یہاں تک کہ خدا کا بھی احساس ان کے دل سے اٹھ گیا۔ دنیا کے بکھیر دلوں کے پیچھے دین کو بھلا بیٹھے ہیں۔ یہ مادہ پرستی کا دور جو صرف تیز رفتار ریل اور ٹیلیگراف و ٹیلیفون کے معجزہ نما اثرات کا قائل ہے ہمارے دلوں کو کسی قسم کا سکون و اطمینان نہیں بخشتا۔ موجودہ دور کی سائنس کی معجزہ نمائیاں اور نئی نئی مشینوں کی

سحر آفرینیاں سراپا فائدہ ہی فائدہ نہیں ہیں۔ مرگ ناگمانی جو اکثر کثرت اضطراب اور تیز حرکتوں کا نتیجہ ہے اور کمی عمر اور خرابی صحت یہ سب اسی کے برکات ہیں۔ جدید طریقہ تعلیم بھی جیسا کہ خیال کیا جاتا تھا۔ اخلاقی و روحانی امراض کے لیے اکیس صفت ثابت نہیں ہوا سائنس کی ترقی اور نیچر کی مغلوبیت نے دل کی تکلیفوں کو کسی طرح رفع نہیں کیا اور نہ وہ مصائب دور کئے جن کے رفع کرنے کی اُمید کی جاتی تھی۔ دونوں تہذیبوں کے درمیان میں ایک عمیق خلیج حائل ہے۔ مغربی تہذیب ہمہ تن دنیاوی جاہلہ و ست تجارت و دولت کی طرف متوجہ ہے اور مشرقی تہذیب کا انتہائے نظر روحانی ترقی ہے وہ بہ آسانی مختصر اور تھوڑی چیز پر قانع ہو جاتی ہے فتوحات اور ملک گیری کا اس کو مشوق نہیں قناعت اور تسلیم درخشاں اس کا آئین ہے

اکبر کے مذہبی عقائد۔ علاوہ شاعر کے وہ ایک ناصح قوم، رلیفا مرزا، واعظ اور فلسفی بھی تھے وہ خدا کی وحدانیت اور تاثیر و عل کے دل سے قائل تھے، اُن کا دلی اعتقاد تھا کہ مذہب کا تعلق دل سے ہے اور اس میں فلسفہ سائنس اور منطق کا کوئی دخل نہیں۔ وہ مذہبی جھگڑوں اور جزئی اختلافات اور تعصبات سے بالکل بری تھے مذہب مَن کے نزدیک ایک نہاد و ریخت کرنے کے قابل شے ہے اُس کو چند آراء و عقائد فلسفیانہ کا مجموعہ نہ سمجھنا چاہیے اکبر کوئی ایسی نکتہ چینی گوارا نہیں کر سکتے جو اعتقاد کے منافی ہو کیونکہ یہی مذہب کی جان ہے اُن میں تعصب اور کٹر پن مطلق نہیں اور اسی وجہ سے وہ ملائیت کی تنگ خیالی کو برا سمجھتے ہیں۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ اسلام اور دیگر مذہب کے جزئی اختلافات ایک وسیع النظر وحد کی نظریں بالکل بے حقیقت معلوم ہوتے ہیں وہ اکثر اشعار میں انسان کی بے حقیقتی کا ذکر کرتے ہیں تاکہ وہ اپنی کامیابی پر مغرور نہ ہو۔ اُن کا قول ہے کہ ہر چند سائنس کی ترقیوں کے قابل ہو مگر خدا کو کسی حال میں دل سے نہ بھولو۔ وہ اصول اخلاق اور فلسفہ اور عقائد و معارف کے بیان کرنے میں یدِ طولی رکھتے ہیں ظو اہم مذہب کی وہ پرواہ نہیں کرتے

وہ نفس کشی اور ضبط خواہشات کو بہت ضروری سمجھتے ہیں۔ رسوم ظاہری مثل پوست کے ہیں اور اصول اور افعال و اطوار مثل مغز کے، وہ تعصب اور غصہ کو بہت بُرا سمجھتے ہیں کیونکہ اس سے تنگ خیالی پیدا ہوتی ہے۔ وسعت نظر اور بلند خیالی ان عیوب کو رفع کر دیتی ہے آخر عمر میں وہ فلسفہ اور تصوف بہت کہتے تھے ایک جگہ انھوں نے مواضع آخرت کا مضمون بہت خوب لکھا ہے۔

نادر کا گوری متوفی ۱۹۱۲ء | نادر علی خاں نادر طرز جدید کے بہت عمدہ کئے والوں میں سے تھے اس رنگ میں ان کی اکثر نظمیں بہت مشہور ہیں دروداثر اعلیٰ تخیل حب وطن ان کے کلام کے مخصوصات سے ہیں یہ انگریزی شعرا بائرن اور ٹامس مورے دلدادہ تھے اور چاہتے تھے کہ انھیں کا رنگ نہایت سلیس اور عمدہ طریقہ سے اُردو میں بھی اُخل ہو جائے ان کی نظمیں ”شمع و پروانہ“ ”شعاع امید“ ”پیکر بے زبان“ ”فلسفہ شعری بہت مشہور ہیں اُن کو اپنے وطن یعنی ہندوستان سے عشق تھا چنانچہ اسی وطنی جذبات کی نظمیں ”مقدس سرزمین“ اور ”مادر ہند“ دیکھنے کے قابل ہیں ”ناسور کی مشہور کتاب ”لالہ رخ“ کے طرز پر انھوں نے بھی ایک نثری لکھی ہے اور اس کا بھی نام لالہ رخ رکھا ہے ان کا انتقال عین جوانی یعنی بیستالیس برس کی عمر میں ۱۹۱۲ء میں ہوا اس بے ہنگام سانسو سے ادبی دنیا نے جو امیدیں ان کی ذات سے قائم کی تھیں اُن سب پر پانی پھر گیا۔

حصہ نظم تمام ہوا



احمد نگر ۵۵،

اختر (مرزا محمد صادق خاں) ۳۲۲، ۲۴۲، ۲۴۹، ۳۲۹،

اختر مینائی ۳۸۹،

اختر (دیکھو واجد علی شاہ)

اردو (رسالہ) ۳۹۳،

اردو دکن ۷۰،

اردو کے قدیم ۷۰،

اردو کے معنی ۳۲، ۳۲۸،

اڑیا (زبان) ۸،

اسپرنگر (ڈاکٹر) ۱۵۱، ۲۰۳، ۲۵۵،

اسپنر ۱۱۸،

اسحاق خاں (نواب محمد) ۳۱۰،

اسد (دیکھو غالب)

اسرار الصلوٰۃ (رسالہ) ۱۰۲،

اسکاٹ (سر والٹر) ۴۴،

اسماعیل (عادل شاہ) ۶۴،

اسماعیل (مولوی محمد) ۲۲۳ تا ۲۲۵،

اسیر (جلال) (دیکھو جلال امیر)

اسیر گھنوی ۲۲۳، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱،

۲۶۲، ۲۸۵، ۳۵۱، ۳۵۳، ۳۵۵، ۳۷۴،

اشرف علی (منشی) ۲۳۶، ۳۱۲،

ابوالفضل ۶۹،

ابوالقاسم (مرزا) ۶۳،

ابوالمظفر (دیکھو ظفر)

ابوالمعالی ۷۳،

اٹل ۱۷۸،

اثر (دیکھو ایداد امام)

اثر ۲۲، ۲۶، ۱۰۲،

اجگر نامہ (مثنوی) ۱۶۳،

احسان دہلوی ۷۰، ۳۰۹، ۳۱۳،

احسان شاہ، بھال پوری ۳۸۲،

احسن مارہروی ۳۷۳،

احسن اللہ (حسن) ۸۸،

احکام الصلوٰۃ ۶۸،

احمد ۷۹،

احمد آباد ۷۲، ۷۳،

احمد بیگ (مرزا) ۳۳۰،

احمد خاں بنگش ۱۱۰،

احمد شاہ ابدالی ۱۰۱، ۲۱۹،

احمد شاہ - بادشاہ ۹۵، ۳۷۷،

احمد علی خاں ۱۰۱،

احمد نظام شاہ ۵۵، ۶۰،

الیٹ صاحب ۳۴۳،
 امامی (میر) ۲۸۴،
 امان اللہ (سید) ۱۴۶، ۱۴۰،
 امامی (میر) ۲۶۷،
 امجد علی شاہ ۲۵۶،
 امداد امام اثر ۱۲۲،
 امن (میر) ۳۱، ۲،
 امید (قرلباش خاں) ۹۶، ۸۱،
 امید (دیکھو آرزو لکھنوی)،
 امیر پٹانی ۲۹، ۳۰، ۳۷، ۱۰۳،
 ۳۴۵، ۲۸۸، ۲۸۶، ۱۶۸،
 ۳۵۷، ۳۵۶، ۳۵۵، ۳۵۴،
 ۳۶۵، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۱،
 ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۸۹،
 امیر (نواب محمد یار خاں) ۳۴۷،
 امیر خاں ۸۷،
 امیر اللغات ۳۶۰، ۳۷۵،
 امین ۶۹،
 انجمن پنجاب ۴۱۸،
 انجمن ترقی اُردو ۱۵۱، ۳۹۲، ۳۹۳،
 اندر بھا ۳۶۲،

اشہر ۲۸۸،
 اعجاز عشق (شہزی) ۱۶۴،
 اعظم ارکا ٹی ۷۹،
 اعظم دہلوی ۲۰۷،
 اعظم خاں ۱۴۸،
 افادہ تاریخ ۳۷۹،
 افق ۱۷۹،
 افسردہ ۲۸۳،
 افضل خاں ۶۵،
 اقبال (ڈاکٹر) ۳، ۳۷۳،
 اکبر الہ آبادی ۳۰، ۳۶۹ تا ۴۵۱،
 اکبر بادشاہ ۵۵، ۸۰،
 اکبر شاہ ثانی ۲۰۸، ۲۱۱، ۳۱۵،
 اکبری عہد ۱۸،
 اکرام علی ۳۱،
 الفرد لائل (میر) ۱۲۲، ۳۶۲،
 الفیلہ ۶۰، ۶۲،
 الم (صاحب میر) ۱۰۵،
 الماس رخشاں ۲۴۰،
 الور ۳۰۵،
 الیاد ۲۷۴۔

بھاگ نگر ۵۵،
 بھاو پور ۳۵۰،
 ہرام دگل اندام ۶۲،
 بھرت پور ۳۵۰،
 ہوبگم ۳۴۸، ۲۴۳،
 بھوپال ۳۵۱، ۳۵۰،
 بیان (خواجہ احسن اشرف) ۹۳، ۲۲،
 ۳۴۸، ۲۱۸،
 بیان (ہزدانی) ۴۱۲،
 بیان بختایش ۲۴۰،
 بیتاب ۱۸۵،
 بیجا پور ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷،
 ۷۱، ۶۹،
 بیچارہ ۵۵،
 بیخود (بدایونی) ۳۷۳،
 بیخود (دہلوی) ۳۷۳،
 بیخود (لکھنوی) ۲۵۹،
 بیدار (اساون لال) ۹۳،
 بیدار (میر محمدی) ۲۱۴،
 بیدل ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰،
 ۳۸، ۳۷، ۳۶، ۳۵، ۳۴، ۳۳، ۳۲، ۳۱، ۳۰، ۲۹، ۲۸، ۲۷، ۲۶، ۲۵، ۲۴، ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰، ۱۹، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱، ۰،

برکھارت ۴۰۸، ۴۰۹،
 بسنت سنگھ ۱۸۲،
 بسل ۳۵۰،
 بقا ۳۴۹، ۲۳۴، ۲۱۶، ۲۱۴،
 بلینک درس ۴۲۴،
 بلوم ہارٹ ۲۰۳، ۱۴۰، ۱۲،
 بلونت سنگھ (ہمارا جہ) ۲۴۰،
 بنگلہ ۸،
 بولبوجی ۵۵،
 بوتان خیال (مثنوی) ۷۷،
 بہار الدین ۷۱،
 بہار سنگھ ۱۴۸،
 بہار شاہ (دیکھو ظفر)،
 بہار علی (میر) ۱۲۵،
 بہار شاگرد رشک ۳۴۶،
 بہار بیخراں (تذکرہ) ۱۶۲،
 بہارستان سخن ۲۳۶،
 بہار دختراں ۷۱،
 بہار ہند ۳۶۱،
 بھاشا ۳۹،
 بھاگ متی ۵۵،

بیل (ستر) ۱۰۵۹۰-۱۰۶۰

بیتنی بہادر (راجہ) ۲۵۳

پٹنہ (عظیم آباد) ۲۷۸

پیالہ ۳۵۰

پیداوت ۱۸

پرکھی راج راسو ۴

پردانہ (سیر محمد نسیم) ۳۴۸

پنہ ۱۷۹

پنہ آہنگ ۳۲۹

پنچہ ہر ۲۴۰

پنچھی نامہ ۷۰

پوپ ۲۲۲، ۲۳۰، ۲۴۰، ۲۴۱

پکول بن ۶۰

پیالے لال (رائے بہادر منشی) ۴۱۸

تاناں (عبدالکلی) ۸۸، ۹۱، ۹۳

تاناں (مرزا شجاع الدین احمد خاں) ۳۳۳

تاجور (دیکھو شاہ جہاں بیگم)

تانا شاہ دیکھو ابوالحسن قطب شاہ

تاجمل حسین خاں (نواب) ۲۴۱

تحفۃ الایجاب ۷۹

تحفۃ الاخوان ۴۰۹

تحفۃ الشعراء ۷۱

تحفۃ عاشقان ۷۰

تحفۃ النساء ۷۹

تحفۃ النصائح ۶۲

تخلص ۴۹

تذکرہ آرزو (دیکھو مجمع الناس)

تذکرہ جہاں ۱۵۰

تذکرہ خازن الشعراء ۱۸۱

تذکرہ شعراے آردور (حیرت) ۷۸، ۷۹، ۱۲۳

تذکرہ شعراے دکن ۷۸، ۷۹

تذکرہ شورش ۵۲

تذکرہ قاسم ۱۶۰

تذکرہ قدرت ۸۸

تذکرہ پکھی نرائی ۷۸

تذکرہ سووی خاں ۷۸

ترجیع بند ۱۴

ترقی (مرزا محمد تقی خاں) ۱۵۵، ۲۴۲

۲۴۸، ۳۴۹

ترکب بند ۱۴

تیغ تیز ۳۳۰

تکین (میر حسین) ۳۰۲، ۳۰۹، ۳۱۱

۳۵۶، ۳۵۲

ٹامس مور ۴۵۱

تسلیم ۳۵۵، ۳۵۱، ۳۱۲، ۳۰۹، ۳۰۲

ٹامل (زبان) ۵۰

۳۶۸، ۳۶۹، ۳۸۲ تا ۳۸۵

ٹامس صاحب ۴۴، ۳۰۶، ۳۲۳، ۳۲۴

تشنہ ۳۵۰

ٹانڈا ۱۹۶، ۴۴، ۴۵

تصوت ۴۲، ۴۶

ٹکلیٹ رائے (ہمارا جی) ۲۱۱، ۲۵۳

تصویر (شعر) ۳۵۰

ٹوڈر مل ۱۹

تغش ۲۸۶، ۲۸۷

ٹونک ۳۵۰

تغیہ (منشی ہرگوپال) ۳۲۳، ۳۲۴

ٹیلیسن ۳۹۸، ۴۲۰

تفضل حسین خاں (علامہ) ۱۸۰

تلمی داس ۱۸

ٹناقب (احسن اللہ) ۳۶۲

ٹنگلی (زبان) ۵۰، ۵۵

ٹناقب بدایونی ۳۲۰

ٹلہر ۱۰۶

ٹناقب (نواب شہاب الدین احمد خاں دہلوی)

ٹمن عرب ۳۸۸

۳۴۳

ٹنبیہ الجہال ۱۶۴

ٹنبیہ الغافلین ۸۶

ٹاجو ۹۰

ٹوہد الاشعار ۴۴۲

ٹام سرور ۴۲۸

ٹنا (خدیجی) ۱۹۸، ۲۶۶

ٹانسٹن ۲۱۰

ٹوفیق (دیکھو صدیق حسن خاں (نواب)

ٹان صاحب ۳۰۶، ۲۵

ٹوقیر (اکبر علیخان) ۲۵۹

ٹان عالم پیا (دیکھو واجد علی شاہ)

ٹوقیر شرن ۲۴۰

جواہر ۱۳۲۰	جرات (دہلوی) ۱۹۵، ۱۷۵، ۲۵، ۲۴
جہانگیر (بادشاہ) ۷	۱۹۸، ۱۲۲، ۲۸۹
جہاد لال ۲۵۳	۱۳۴، ۳۷۹
جیسین ۲۰۴	جرات (موسوی خاں) ۷۷
جے پور ۳۵۰	جنفر زٹل ۱۷۸
	جنگر (مراد آبادی) ۳۷۳
چار شربت ۱۲۱	جنگل کشور (راجہ) ۱۵۷
چاسر ۷۱، ۲۰	جلال (ایسر) ۱۹۶، ۹۸
چپ کی داد ۲۱۳	جلال (لکھنوی) ۲۵۱، ۲۲۴، ۳۰۲، ۲۹
چراغ علی (مولوی) ۳۴	۳۵۷، ۳۶۹، ۳۶۸، ۳۷۷
چرکین ۱۷۸	۳۸۱
چمنستان شعرا ۱۷۹، ۷۱	جلوہ خضر (تذکرہ) ۲۳۳، ۹۷
چند کوئی ۲	جلیل ۳۸۹، ۳۵۷
چند دلال (دیوان سرکار آصفیہ) ۲۲۷	جانی (مولانا) ۸۰
۳۹۲، ۳۹۱، ۳۹۰، ۳۱۶، ۳۰۱	جنیدی ۷۲، ۵۵
	جواں بخت (مرزا) ۲۰۷
حاکم ۱۸۵، ۸۴، ۸۳، ۸۰، ۷۱، ۴۲، ۲۱	جواں بخت (امیر محمد واجد علی شاہ) ۳۴۹
۸۷، ۸۹، ۹۲، ۹۷، ۱۰۹، ۲۰۲	جواہر الاسرار ۶۸
۲۰۸، ۲۱۴، ۲۱۳	جوش عشق ۱۶۴
حاجی (شاعر) ۷۹	جور نیلیس ۴۰۴
حافظ (خواجہ) ۹۸، ۳۶	جود نیال ۱۱۶

حبیبی (دیار علی) ۱۳۱۰

حضرت ۱۴۹ ' ۱۵۵

محفظة ۱۲۵۴

حفظ الدين ۲۱

سید باقر - ۲۸

عبداناد ۳۳۳/۴۱۵۶۵۸۱۵۹

[illegible]

2. 10. 64

‘r q o t p a y

جبرائی ۶۰، ۳۱

حیران میر حیدر علی ۹۱ بم ۳۳،

~~_____~~

خانہ خاں ۴۵۶۷۸۹۱۰

نخا قانی ۴۴ ، ۱۲۱ ،

خاک کی م۔ ۲۰،

خان آرزو (دکھو آرزو)

خانخانان (عبد الرحیم) ۱۹،

خاورنامہ ۶۵

خدا کی سلطانی ۶۵

خریطہ جواہر ۱۹۲

خسرو (امیر) ۱۶ تا ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴

زانی ۱۷۸	رعایت خان ۱۵۷
زکی ۱۳۴۲، ۱۳۴۰	رموز العارفین (مثنوی) ۱۴۰
زہر عشق ۲۰۸	رند (سید محمد خان) ۲۳۵، ۲۳۷
زچچ نامہ ۲۱۸	۲۳۸
زمین العابدین خان (عارف) ۳۲۵	رند (نواب مہربان خان) ۱۱۰، ۱۰۶
زینت المساجد ۹۰	۳۵۸، ۲۴۷
	رنگین (دکھنی) ۷۹
سات گڑھ ۷۰	رنگین (دہلوی) ۱۵۴، ۸۸، ۲۴
ساطع برہان ۳۳۰	۱۸۳، ۱۸۱، ۱۷۷
ساتی (پنڈت جواہر ناتھ) ۳۴۲	۳۴۹، ۲۰۶، ۲۰۲
سالار جنگ (پیر سحاق خان مہتمم الدولہ) ۴۹	روپ سنگھار (مثنوی) ۷۹
سالار جنگ (سر) ۵۸	روح انستہ ۷۹
سالک ۳۰۵، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲	رودکی ۷۱
۳۵۰	روضۃ السلام ۷۹
سامی (عبد القادر) ۷۷	روضۃ الشہداء ۷۵، ۶۹، ۷۰
سانہر (قصبہ) ۱۴۷	ریاض ۲۵۷
سانٹ ۲۹۲، ۲۲	ریاض الجنان ۷۹
سامس (رسالہ) ۳۹۴	ریختہ ۱۱
سبرس ۶۱	ریختی ۲۵، ۱۰۷، ۱۰۷، ۲۰۴
۳۵۸، ۲۵۹، ۲۸	
لبیان ۱۶۵، ۱۲۴، ۴۸، ۲۶	زار ۲۰۷

سکنہ رنامہ ۲۷۴، ۳۸	۲۶۸، ۵۰
سلطان جہاں بیگم (دالیہ پال) ۳۵۱	سراج ۶۸، ۷۶
سلطان عالم (دیکھو واجد علی شاہ)	سراج الدین علی خاں (دیکھو آرزو)
سلطان محمد تخلق ۵۱	سراج اللغات ۸۷
سلیمان خاں (نواب اسد) ۳۵۱	سرب سنگھ (دیوانہ) ۲۱۳
سلیمان شکوہ ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۹۲، ۱۹۶	سرشار پندت رتن ناتھ ۳۵۹، ۳۸۸
۱۹۹، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۷	سربایہ زبان اُردو ۳۷۹
۳۱۳، ۳۳۹	سرمہ بھارت ۳۶۱
سلیمان قلی خاں (ددار) ۱۰۹	سرور ۳۰
سلیس ۲۸۴	سرور (جہان آبادی) ۲۵۲، ۲۸۲
سنجر (سیر) ۶۴	۴۲۸
سودا ۲۲، ۲۴، ۲۷، ۳۳، ۳۸	سرور (میر محمد خاں دہلوی) ۳۴۲
۸۶، ۸۸، ۹۰، ۹۳، ۹۵	سرور (رجب علی بیگ) ۲۵۹، ۳۲، ۴۰
۹۶، ۹۸، ۹۹، ۱۰۸، ۱۲۲	۳۵۰، ۲۷۸
۱۵۳، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۷۱، ۱۷۴	سرپریم (لالہ) ۲۰۸، ۳۲۱
۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۷، ۲۱۰، ۲۲۰	سعادت علی خاں (نواب) ۱۱۱، ۱۸۰، ۲۰۷
۲۵۲، ۲۷۷، ۲۹۳، ۲۹۸، ۳۰۰	۲۵۴، ۲۹۰
۳۱۸، ۳۴۷، ۳۴۹، ۳۷۶	سعادت شاہ (گلشن) ۱۷۱، ۳۷۷
سورج مل جات ۱۲۸	۸۱، ۱۰۰، ۱۷۷
سوز ۲۲، ۱۹۹، ۱۰۶، ۱۰۸، ۱۱۰، ۱۵۶	سعدی (شیخ) ۲۹۱، ۳۰۷، ۳۰۷
۱۹۸، ۲۵۲، ۲۵۳، ۳۴۷، ۳۴۹	سکندر عادل شاہ ۷۹

شکرستان ۲۱۰

شکیر ۳۵، ۲۹۸

شکوہ ہند ۴۱۲

شکلیا ۳۱۳

شمس الدین خاں ۳۶۶

شمس الدین فیض ۳۹۱

شمس ولی اللہ (دیکھو ولی)

شمشاد ۲۵۱

شمع انجمن (تذکرہ) ۷۹

شمع محفل (رسالہ) ۱۰۲

شمع و پیردانہ ۶۷

شوق (قدرت اللہ) ۹۲

شوق (قدوائی) ۴۷

شوق (ظہیر حسن نیوی) ۳۸۰

شوق (نواب مرزا) ۴۷، ۲۲۷

شہباز (پیر و قیسر) ۱۲۲، ۳۸۸

شہید (سید احمد بریلوی) ۳۴

شہید (غلام امام) ۲۲۰

شہید (مرزا محمد باقر)

شہیدی ۲۱

شیریں (دیکھو شاہجہاں بیگم)

شیر و برنج (تثنوی) ۱۸۶

شیفہ (نواب مصطفیٰ خاں) ۱۹۹، ۴۹۴

۲۰۳، ۲۲۴، ۳۰۷، ۳۰۹

۳۱۰، ۳۱۹، ۴۰۴، ۴۰۷

شیلہ ۱۱۹، ۱۷۰

شیو دھان سنگھ (راجہ لور) ۳۱۹، ۳۴۳، ۳۵۰

صابر ۲۸۴

صارم ۷۹

صائب ۳۴، ۹۸، ۲۲۳، ۲۳۰

صبا ۲۸، ۲۲۰، ۲۲۷

صبح امید ۲۲۳

صبر (مرثیہ گو) ۲۶۷، ۲۸۶

صبر (رام پوری) ۳۸۵

صدیق حسن خاں (نواب رئیس بھوپال)

۳۱۲، ۳۵۲

صفیر (بگڑائی) ۹۷

صفتخانہ عشق ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹

صبا ئی (مولوی امام بخش) ۳۱۰، ۳۱۱

ضابطہ خاں ۱۲۹

صناحک (میر) ۱۱۴، ۱۲۲، ۲۴۷

۲۴۷، ۲۸۴، ۳۴۹

ضمیر ۱۹۸، ۲۴۹، ۲۷۰

۲۸۱

ضیاء ۲۲، ۴۹، ۱۲۲، ۲۱۶

ضیاء بخشی ۴۰

طالب ۵۵

طالب آملی ۹۸، ۲۴۷

طالب (نواب سعید الدین احمد خاں) ۳۴۳

طاهر ۳۳

طبعی ۵۵، ۶۲

طبقات الشعراء ۱۲۱، ۱۴۸

طلمس الفت (مثنوی) ۲۴۳، ۳۰۸

طوطا رام شایاں ۳۱۲

طوطی نامہ مولوی حیدر بخش ۶۰

طوطی نامہ غواصی ۶۱

طوطی ہند (دیکھو امیر خسرو)

ظفر بہادر شاہ ۲۴۶، ۲۷۰، ۲۰۹

۳۰۲، ۳۱۳، ۳۱۵

۳۱۷، ۳۱۹، ۳۲۹

ظفر (ظفر بیگ) ۷۷

ظہور الدین (دیکھو حاکم)

ظہوری ۲۰، ۳۲، ۴۱، ۴۴، ۹۸، ۲۴۷

ظہیر (دہلوی) ۵، ۹، ۱۰، ۳۲، ۳۳، ۳۴

۳۵۰، ۳۷۶

ظہیر (فارابی) ۲۷

عاجزہ ۴۹، ۷۷

عارف (لکھنوی) ۲۸۲

عاشق ۲۸۶

عاصمی (میر) ۲۴۷

عاقل خاں رازی ۶۷

عاقل خاں خوانی ۶۵

عالم (نواب بادشاہ محل) ۳۲۶

عالمگیر (دیکھو اورنگ زیب)

عالمگیر ثانی ۸۸، ۱۲۹، ۱۵۷

عباس صفوی ۵۵

عباس (مفتی میر) ۲۷۰

عبدالاحد خاں ۱۲۹

عبداللہ (میر) دیکھو علی شفیق

عبداللہ بیگ خاں (مرزا) ۳۲۲،
 عبداللہ قطب شاہ ۲۰، ۵۹، ۶۰، ۶۳،
 عبدالحجاز خاں (دیکھو صفحہ ملکاپوری)
 عبدالحق (مولوی خیر آبادی) ۳۵۲،
 عبدالحق (مولوی سیکریٹری انجمن ترقی اُردو)
 ۳۹۳، ۴۱،
 عبدالحق (مولوی مصنف تفسیر حقانی) ۳۸۸،
 عبدالحق (ہندس) ۳۵۲،
 عبدالحی (دیکھو تالیاں)
 عبد الرحمن آسی ۳۱۱،
 عبد الرحمن حبشی ۷۶،
 عبدالرسول خاں ۷۶،
 عبدالسلام ندوی (مولوی) ۹۷، ۱۶۲،
 عبدالعزیز (شاہ) ۳۶۲،
 عبدالغفور (دیکھو نساخ)
 عبدالواسع (ملا) ۸۱،
 عبد الوہابی (عزلت) ۷۱، ۷۹،
 عبد الوہاب (افتخار) ۷۷،
 عبقرۃ القاطنین ۱۱۱،
 عثمان علی خاں (سرمدانی حیدر آباد) ۲۸۹،
 عثمانیہ یونیورسٹی ۳۵، ۳۸۹، ۳۹۲،

عراقی ۷۹،
 عرش (گیادوی) ۳۸۵، ۳۸۶،
 عرفی ۲۷، ۹۸، ۱۲۱،
 عزیز دھنی ۷۹،
 عزیز (شاگرد غالب) ۳۲۰،
 عزیز لکھنوی ۲۰۰، ۲۲۹،
 عزیز اللہ (میر) ۲۸۲،
 عسکری (میر رئیس) ۲۲۲،
 عسکری میرزا (مؤدب) ۲۸۶، ۲۸۸،
 عشق (سید حسین میرزا) ۲۸۶،
 عطار د (شاعر) ۲۵۹،
 عطیہ کبریٰ ۸۷،
 عظمت اللہ (مولوی) ۲۰۰،
 عظیم ۳۱۳،
 عظیم آباد ۳۲۷،
 عظیم بیگ (مرزا) ۱۷۹،
 عظیم الدین خاں (جنرل) ۳۶۲،
 علاء الدین خلجی ۵۱،
 علاء الدین خاں علوی ۳۲۰،
 علم الکتاب ۱۰۲،
 علی ابراہیم (نواب) ۷۲،

فائز ۵۵

فائق ۱۹۱

فتح علی ۸۵، ۸۶

فتوت ۷۱

فخر ۷۹

فخرود (مرزا) ۳۶۶

فخری ۸۱

فدوی لاہوری ۱۱۶، ۲۱۹، ۳۲۸

فراق ۲۲، ۸۱، ۱۰۵، ۲۰۷، ۲۱۲

۲۱۵

فراقی ۸۱

فرائد (رسالہ) ۷۹

فرخ آباد ۱۱۰، ۳۲۷

فرخ سیر ۸۶، ۱۳۱

فرد ۱۵

فردوسی ۱۸۷

فرسنامہ ۲۰۳

فرینچ ۷

فرنگی محل ۲۲۶

فریاد ۲۸۸

فرہنگ آصفیہ ۳۸۸

فریاد داغ ۳۶۷، ۳۷۰، ۳۷۲

فرید الدین عطار ۷۰

فرید رک عظم (بادشاہ جہمی) ۳۵۳

فسانہ عجائب ۳۲، ۲۷۸

فصاحت ۲۶۲

فصیح ۲۴۹، ۲۸۳

فضل حق (مولوی خیر آبادی) ۳۳۳

۳۵۵، ۳۵۳

فضلی ۷۴

فطرت ۷۷، ۸۱

فغان ۹۵، ۹۶، ۱۹۸، ۳۲۷، ۳۲۹

فغانی ۹۸

فقیر (میرشمس الدین) ۸۱، ۸۳، ۲۱۰

فورٹ ولیم ۳۱، ۶۱، ۲۵۷

فولاد خاں (شیدی کوئٹوال دہلی) ۱۱۶

فیروز ۱۰۶

فیروز جنگ (نواب) ۹۱

فیلین (ڈاکٹر) ۹۴

فیض آباد ۱۱۰، ۱۳۳، ۱۴۰، ۲۱۲

۲۰۲، ۳۴۶، ۳۴۸

فیض علی ۱۴۸

فیض میر ۱۸۳

فیضی ۱۹، ۴۹، ۸۰، ۳۳۰

قآنی ۴۷

قادر ۴۷، ۴۹

قادری (دیکھو خاک)

قادری (شمس اللہ) ۴۷، ۴۹، ۸۰، ۳۳۰

قاسم ۲۰۹، ۳۱۳

قاطع برہان ۳۳۰

قانون اسلام ۴۹

قائم ۲۲، ۸۳، ۱۰۵، ۲۰۹، ۲۱۰

۳۰۰، ۳۲۸، ۳۲۹

قبول ۸۱، ۳۵۹، ۳۸۳

قتیل (عزیز) ۱۲۱، ۱۲۵، ۱۹۰، ۲۰۸

۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴

قدر و کھن ۴۷

قدر بگرا می ۳۸۸

قدرت ۲۲، ۲۱۳، ۳۳۷

قدرت اللہ خاں (بقا) ۱۲۱

قدرت اللہ خاں (قاسم) ۱۴۸

قربان (دیکھو سالک)۔

قربیہ (رسالہ) ۴۸

قصہ رضوان شاہ (آگاہ) ۷۹

قصہ رضوان شاہ و روح افزا (فائز) ۴۳

قصہ فیروز شاہ ۴۹

قصہ الال و گوہر ۴۹

قصہ منوہر و بدالت ۴۵

قصیدہ ۱۳، ۱۵، ۲۲، ۲۷، ۴۱، ۴۷

قطبی ۴۲، ۵۵

قطعہ ۱۳، ۴۱، ۴۹

قلق ۴۷، ۲۵۹، ۲۴۲، ۲۸۵، ۳۵۵

۳۷۴

قلی قطب شاہ ۲۰، ۵۵، ۵۶، ۵۷

۷۰، ۵۸

قرالدین (سنت) ۱۵۴، ۲۰۹، ۲۱۰

۲۱۱، ۳۱۳

قنبر باغ ۲۵۶

کاظم ۷۹

کاظم حسین (بیقرار) ۳۱۳

کاظم علی (قطب شاہی) ۴۹

کاہرپ کلا ۴۱

گلزار ابراریم ۶۴	کبیر ۱۸
گلزار ارم (شوی) ۱۲۰	کیور تھله ۳۶
گلزار داغ ۳۵	کرناک ۶۵
گلزار عشق ۵۹	کریم الدین (مشی) ۳۰۳، ۳۰۷، ۳۱۸
گلزار انیم ۲۸	کشی پرشاد (مہاراجہ سیر) ۳۲، ۳۵۹
گلشن (دیکھو سعد اللہ)	۳۱۳، ۳۹۲، ۳۹۱
گلشن پنجار (تذکرہ) ۱۲۱، ۹۹	کلب علیخان (سابقہ نواب رام پور)
۳۱۰، ۳۰۹، ۲۷۲	۲۰۴، ۲۰۳، ۲۰۲، ۲۰۱، ۲۰۰، ۱۹۹، ۱۹۸، ۱۹۷، ۱۹۶، ۱۹۵، ۱۹۴، ۱۹۳، ۱۹۲، ۱۹۱، ۱۹۰، ۱۸۹، ۱۸۸، ۱۸۷، ۱۸۶، ۱۸۵، ۱۸۴، ۱۸۳، ۱۸۲، ۱۸۱، ۱۸۰، ۱۷۹، ۱۷۸، ۱۷۷، ۱۷۶، ۱۷۵، ۱۷۴، ۱۷۳، ۱۷۲، ۱۷۱، ۱۷۰، ۱۶۹، ۱۶۸، ۱۶۷، ۱۶۶، ۱۶۵، ۱۶۴، ۱۶۳، ۱۶۲، ۱۶۱، ۱۶۰، ۱۵۹، ۱۵۸، ۱۵۷، ۱۵۶، ۱۵۵، ۱۵۴، ۱۵۳، ۱۵۲، ۱۵۱، ۱۵۰، ۱۴۹، ۱۴۸، ۱۴۷، ۱۴۶، ۱۴۵، ۱۴۴، ۱۴۳، ۱۴۲، ۱۴۱، ۱۴۰، ۱۳۹، ۱۳۸، ۱۳۷، ۱۳۶، ۱۳۵، ۱۳۴، ۱۳۳، ۱۳۲، ۱۳۱، ۱۳۰، ۱۲۹، ۱۲۸، ۱۲۷، ۱۲۶، ۱۲۵، ۱۲۴، ۱۲۳، ۱۲۲، ۱۲۱، ۱۲۰، ۱۱۹، ۱۱۸، ۱۱۷، ۱۱۶، ۱۱۵، ۱۱۴، ۱۱۳، ۱۱۲، ۱۱۱، ۱۱۰، ۱۰۹، ۱۰۸، ۱۰۷، ۱۰۶، ۱۰۵، ۱۰۴، ۱۰۳، ۱۰۲، ۱۰۱، ۱۰۰، ۹۹، ۹۸، ۹۷، ۹۶، ۹۵، ۹۴، ۹۳، ۹۲، ۹۱، ۹۰، ۸۹، ۸۸، ۸۷، ۸۶، ۸۵، ۸۴، ۸۳، ۸۲، ۸۱، ۸۰، ۷۹، ۷۸، ۷۷، ۷۶، ۷۵، ۷۴، ۷۳، ۷۲، ۷۱، ۷۰، ۶۹، ۶۸، ۶۷، ۶۶، ۶۵، ۶۴، ۶۳، ۶۲، ۶۱، ۶۰، ۵۹، ۵۸، ۵۷، ۵۶، ۵۵، ۵۴، ۵۳، ۵۲، ۵۱، ۵۰، ۴۹، ۴۸، ۴۷، ۴۶، ۴۵، ۴۴، ۴۳، ۴۲، ۴۱، ۴۰، ۳۹، ۳۸، ۳۷، ۳۶، ۳۵، ۳۴، ۳۳، ۳۲، ۳۱، ۳۰، ۲۹، ۲۸، ۲۷، ۲۶، ۲۵، ۲۴، ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰، ۱۹، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱
گلشن ہند ۱۴۲، ۱۴۱، ۱۴۰، ۱۳۹، ۱۳۸، ۱۳۷، ۱۳۶، ۱۳۵، ۱۳۴، ۱۳۳، ۱۳۲، ۱۳۱، ۱۳۰، ۱۲۹، ۱۲۸، ۱۲۷، ۱۲۶، ۱۲۵، ۱۲۴، ۱۲۳، ۱۲۲، ۱۲۱، ۱۲۰، ۱۱۹، ۱۱۸، ۱۱۷، ۱۱۶، ۱۱۵، ۱۱۴، ۱۱۳، ۱۱۲، ۱۱۱، ۱۱۰، ۱۰۹، ۱۰۸، ۱۰۷، ۱۰۶، ۱۰۵، ۱۰۴، ۱۰۳، ۱۰۲، ۱۰۱، ۱۰۰، ۹۹، ۹۸، ۹۷، ۹۶، ۹۵، ۹۴، ۹۳، ۹۲، ۹۱، ۹۰، ۸۹، ۸۸، ۸۷، ۸۶، ۸۵، ۸۴، ۸۳، ۸۲، ۸۱، ۸۰، ۷۹، ۷۸، ۷۷، ۷۶، ۷۵، ۷۴، ۷۳، ۷۲، ۷۱، ۷۰، ۶۹، ۶۸، ۶۷، ۶۶، ۶۵، ۶۴، ۶۳، ۶۲، ۶۱، ۶۰، ۵۹، ۵۸، ۵۷، ۵۶، ۵۵، ۵۴، ۵۳، ۵۲، ۵۱، ۵۰، ۴۹، ۴۸، ۴۷، ۴۶، ۴۵، ۴۴، ۴۳، ۴۲، ۴۱، ۴۰، ۳۹، ۳۸، ۳۷، ۳۶، ۳۵، ۳۴، ۳۳، ۳۲، ۳۱، ۳۰، ۲۹، ۲۸، ۲۷، ۲۶، ۲۵، ۲۴، ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰، ۱۹، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱	کلیم (ایرانی) ۲۹۸، ۲۹۷
گلکریٹ (ڈاکٹر جان) ۱۱، ۳۱	کلیم (میر محمد حسین) ۹۶
گل و ہرگز ۷۰	کبیر (قصیدہ) ۶۲
گمان ۲۴۷	کیٹس ۱۱۹
گنگو (برہمن) ۵۲، ۵۳	
گورنمنٹ بک پو پنجاب ۲۰۸	
گوگلڈرہ ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰	
۴۲، ۴۹	
گوہر انتخاب ۳۵۷	
گویا (فقیر محمد خاں) ۲۳۶	
گیٹ ۱۴، ۳۲۰	
گیودراز (خواجہ سید) ۵۲	

لاطینی (زبان) ۱۱۰۶

لائل (سرچارلس) ۱۶۳، ۶۰، ۳۷

۱۶۹۰، ۱۶۷

لطافت ۲۶۲

لطف (مرزا علی) ۱۰۵، ۸۵، ۷۲، ۳۱

۱۰۶، ۱۰۸، ۱۲۳، ۱۶۷

۲۱۰، ۲۱۳، ۲۱۵

لکھنؤ ۲۶، ۳۳، ۸۷، ۹۹، ۱۱۰، ۱۴۰

۱۴۹، ۱۹۲، ۲۱۰، ۲۱۹

۲۲۱، ۲۲۵، ۲۵۲، ۳۰۱

۳۲۶، ۳۲۸، ۳۳۹

مارکوس آن ہسٹنگز ۲۱۱

ماہ پیکر (مثنوی) ۶۲

مالیر کوٹہ ۳۵۰

ماہل (ڈاکٹر حیدر آبادی) ۳۶۸

متوازن ۱۵

متوازی ۱۵

متھرا ۲

مٹیا برج ۲۵۱، ۲۵۷، ۲۷۸، ۲۸۵

مشلت ۲۳، ۱۹۸

مثنوی ۱۴، ۱۴۱، ۱۴۷

مثنوی میر حسن (دیکھو سحر ابلیان)

مجالس رنگین ۲۰۳

مخرج ۳۰۵، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۵۰

مجمع النفاس ۸۷

محب ۳۴۹

محبت خاں (نواب) ۱۹۲، ۲۱۳

محبوب عالم (حرم واجد علی شاہ) ۳۴۶

محبوب علی خاں (میر سابق نظام دکن)

۳۶۷، ۳۷۳، ۳۸۷، ۳۸۹

محرم ۷۹

محسن (خلف میر حسن) ۲۶۸، ۲۸۴

محسن (کاکوردی) ۲۸۸

محسن الدولہ (نواب لکھنوی) ۲۵۰

محسن الملک (نواب) ۳۴

محمد اشرف ۷۱

محمد باسط ۱۴۶

محمد رضی ۱۴۶، ۱۴۷

محمد شاہ ۷۳، ۸۱، ۸۸، ۹۳، ۱۴۱

۱۹۲، ۳۴۷

محمد علی خاں (نواب ٹونک) ۳۱۹

محمد علی شاہ (بادشاہ اودھ) ۲۸۲، ۲۵۶
 محمد غوث (مولانا) ۷۹
 محمد غوث (گواہیاری) ۸۵
 محمد قطب شاہ ۵۹، ۵۸
 محمد یار خان (نواب) ۱۹۶
 محمدی محل ۵۸
 محمود ۷۹
 محمود خان (حکیم) ۴۱۲
 محمد شمس ۲۳، ۱۴
 بدو جزر اسلام (دیکھو حالی)
 مرآۃ الجنان ۱۷۰
 مرآۃ الغیب ۳۶۰، ۳۶۲، ۳۷۴
 مرقع ۱۴، ۲۳
 مرثیہ ۲۳، ۲۸، ۴۸، ۴۸، ۴۸، ۲۸۷
 مرجز ۸۶
 مرزا ۵۵
 مرزا حاجی ۲۴
 مرشد آباد ۷۹، ۲۷۸، ۳۷۶، ۳۷۷
 مرہٹی زبان ۵۵، ۵۰
 مستزاد ۱۴، ۲۳
 مجمع ۷۵

مدرس ۱۴، ۵۰، ۱۴
 مدرس حالی (دیکھو حالی)
 مشاق ۳۱۶
 مشاعرہ ۴۹
 مصحفی ۲۶، ۲۴، ۸۵، ۸۸، ۸۹، ۱۹۲
 ۱۰۰، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۱۴، ۱۲۳
 ۱۲۵، ۱۵۱، ۱۶۵، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۸
 ۱۸۰، ۱۹۶، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳
 ۲۰۸، ۲۱۰، ۲۱۵، ۲۲۴، ۲۲۶
 ۲۲۹، ۲۴۲، ۲۴۸، ۳۴۹
 ۴۱۵
 مضطر خیر آبادی ۳۵۰
 مضمون (شیخ شرف الدین) ۸۱، ۸۲
 ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۵، ۱۵۷
 مضمون اقدس (مثنوی) ۲۰۶
 مطبع منشی نو کشور ۳۸۲، ۳۸۳
 مطرف ۱۵
 منظر (مرزا جانجاناں) ۲۲، ۳۱، ۸۲
 ۸۳، ۸۴، ۸۵
 ۸۶، ۸۸، ۹۰
 ۹۲، ۹۳، ۹۵، ۱۷۷، ۲۱۳، ۲۱۷

منتخبات عالم ۱۱۱،	منظر عشق (دیوان قلن) ۲۶۳،
منتخب القواعد ۳۷۹،	معاملہ بندی ۲۵،
سزدا ۱۷،	ساملات عشق (مثنوی) ۱۶۴،
منصور (شیخ) ۶۶،	معانی (دیکھو قطب شاہ)
منگردل ۳۵۱،	معراج نامہ ۶۷،
من لکن ۶۹،	معروف (غالب آئی بخش خاں) ۳۱۴،
منیر شکوہ آبادی ۲۳۳، ۲۳۸، ۲۳۹،	معیار (انجمن کھنؤ) ۳۵۷،
۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۵، ۳۵۵،	مفید الشراء (رسالہ) ۳۷۹،
مومن دہلوی ۲۶، ۴۷، ۲۲۲، ۲۸۹،	مقبیل (ملا) ۲۶۷،
۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۹، ۳۳۹،	مقدمہ شعر و شاعری ۴۱۴،
۳۵۳، ۳۵۶،	مکذراؤ مرہٹہ ۵۵،
مومن دکنی ۵۵،	مکہ مسجد ۵۸،
مونس ۲۸۴،	مکھن (شاہ) ۸۵،
موبہبت عظمیٰ ۸۷،	ملک شاہ ۶۱،
مؤید البرہان ۳۳۰،	ملک محمد جانشی ۱۸،
مہا بھارت ۲۷۴،	ملکہ مصر (قصہ) ۱۶۹،
مہانرائن (دیوان) ۱۱۷،	منون (میر) ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۱،
مہتاب دارغ ۳۶۹،	مناجات بیہ ۴۱۳،
مہدی ۷۹،	مناظرہ رحمہ و انصاف ۴۰۸، ۴۰۹،
مہدی (حکیم) ۲۲۸،	من پھول (پینٹ) ۴۱۸،
مہر دکنی ۷۹،	منتخب دیوانہا ۷۶،

نجم ۷۹

نجم الدین (دیکھو آبرو)

نجم (علی قلی خاں) ۱۹۶۱۸۱

نذیر احمد (مولانا) ۳۴

نارخ (مولوی عبدالغفور) ۲۰۴، ۱۰۶

۳۴۶، ۲۴۶، ۲۱۳

نیم بھرت پوری ۳۷۳

نیم دہلوی ۳۸۲، ۳۱۲، ۳۱۱، ۳۰۹

نیم (دیاشنک) ۲۵۰، ۲۴۹، ۲۴۷، ۲۴۸

نشاط امید (نظم) ۴۰۸

نشر (کاکوروی) ۲۳۷

نصرتی ۶۷، ۶۶، ۶۵، ۶۱، ۶۰

نصیر (شاہ) ۳۰۰ تا ۲۰۸، ۲۰۷، ۲۰۶

۳۱۳، ۳۰۹، ۳۰۶، ۳۰۳

۳۹۰، ۳۶۸، ۳۴۸، ۳۱۴

۴۱۵

نصیر الدین حیدر (بادشاہ) ۲۵۵، ۲۰۷

تا ۲۵۶

نصیر الدین ہاشمی ۷۰، ۷۹

نظام الملک (آصف جاہ) ۳۸۷، ۳۸۷

نظامی ۲۷۴

نظم ۱۲، ۹

نظم آزاد ۱۹۴

نظم (طباطبائی) ۳۴۶

نظم گرامی ۲۳۷

نظم مبارک ۲۳۷

نظیر اکبر آبادی ۲۶، ۲۸۹ تا ۳۰۰

۳۹۷، ۳۹۷

نظیری ۳۳۰، ۱۹۶، ۱۹۸، ۳۶

نفس الغنۃ (دیکھو نظم گرامی)

نفس ۲۸۴

نکات اشعار ۱۰۰، ۸۷، ۷۷، ۷۷، ۷۷

۱۵۶، ۱۵۴، ۱۵۲، ۱۲۰

۲۶۷، ۱۶۵، ۱۶۳، ۱۵۹

نکتہ (مرزا علی خاں) ۹۵

نندرائے (بخشی) ۳۷۸

نواب (دیکھو نواب صدیق حسن خاں)

نواب (دیکھو نواب کلب علی خاں)

نوادر الالفاظ ۸۷، ۸۲

نوازش علیخاں ۱۲۳

نوازش علی (مولوی) ۴۰۵

نور الدین نوید ۲۱۰

نور المعرفت (رسالہ) ۱۷۴

نورس ۱۶۴

نور پور ۱۶۵

نوطر ص ۱۳۱

نول رائے (راجہ) ۲۵۳

نوری دید شجاع الدین (۱۶۳، ۵۵)

۱۸۰، ۱۶۸

نیر (نواب ضیاء الدین احمد خاں) ۳۴۰

۳۴۳

واجد علی شاہ اختر ۲۹، ۲۲۴، ۲۵۰، ۲۵۲

۲۵۶ تا ۲۶۱، ۲۶۳، ۲۶۴

۲۷۸، ۲۸۶، ۳۴۵

دادات درد ۱۰۲

داسوخت ۱۴، ۲۳، ۵۷، ۹۸

داسوخت امانت ۲۶۲

داقحات درد (رسالہ) ۱۰۲

دایٹر ۱۱۷

دجدی ۷۰

دجدیہ ۶۸

دجی ۱۶۱

دجیہ الدین ۷۲

دجیہ الدین خاں ۱۴۹، ۱۴۷، ۱۲۶

دشت (میر غلام علی) ۳۰۹

دشتی ۹۸

دحید (غلام حسین) ۳۰۹

دحید (میر) ۲۸۴

وداد (سلیمان قلی خاں) ۱۸۱

درجل ۲۷۳

درڈسورتھ ۴۴، ۹۹، ۷۷

وزیر (خواجہ) ۲۸، ۲۳۳، ۲۳۶، ۲۳۷

وزیر علی خاں (وزیری) ۲۳۰

وفا (دیکھو زند)

ولا (مظہر علی) ۳۱

ولی دکھنی ۲۰، ۲۲، ۱۴۱، ۷۰، ۷۶

۷۷، ۸۱، ۸۲، ۸۵، ۸۷

۸۸، ۹۳، ۱۵۴

ولی (سید محمد قیاض) ۷۰

ویاس ۴۴، ۲۷

ویلور ۷۰

ہاشم علی جرمیان پوری ۶۹

هین (شاه جرمنی) ۳۳۹	ہاشمی ۶۷ تا ۶۸، ۲۵، ۲۰۴
یادگار داغ ۳۶۹	بارلاند (کرنل) ۳۱۸، ۳۰۸
یادگار غالب ۳۹۸	بجو ۲۳
یار ۷۹	ہدایت ۲۲، ۱۰۵، ۲۱۵
یاس (میرزا کرچین) ۳۸۱	ہرنز (پارسی) ۳۲۲
یکینی خاں (دیکھو آصف الدولہ)	ہسٹنگز (لارڈ) ۲۵۵
یقین (انعام اللہ خاں) ۲۲، ۹۳	ہشت بہشت ۷۹
یکرننگ ۸۳، ۸۴، ۹۳، ۹۴ تا ۹۵	ہفت پیکر نظامی ۶۲
یوسف (شیخ دہلوی) ۶۲	ہلال ۲۵۹، ۲۹۰
یوسف زلیخا ۶۵، ۶۷، ۶۹	ہدم ۷۹
یوسف عادل شاہ ۵۵، ۶۴	ہدم آخرت ۲۴
یوسف علی ۷۲	ہندی ۱۲
یوسف علیخان (نواب ام پور) ۲۴، ۲۶، ۳۱۱	ہنر ۲۵۹
۳۲۴، ۳۲۳، ۳۵۳، ۳۵۵، ۳۵۸، ۳۶۶	ہنر (مظفر علی)
یول (مشر) ۱۱	ہومر ۲۷۳
	ہوٹل ۴۴

فہرست مضامین

حصہ نثر

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۵	لغایت ۱۸۲۷ء		باب ۱۵
۷	میرامن دہلوی		نشر اردو کی ابتدا اور
۸	میر شیر علی افسوس		ترقی
۹	میر بہادر علی حسینی		
۹	سید حیدر بخش حیدری		
۱۱	مرزا کاظم علی جوان	۱	فہرست اردو کی تعویق آغاز کے اسباب
۱۲	نہال چند لاہوری	۲	زبان دکنی میں قدیم اردو نثر کی تصانیف
۱۲	مظہر علی خاں دلا	۳	دہ مجلس فضلی مصنفہ ۱۸۳۲ء
۱۳	حفیظ الدین احمد	۳	نوط زمر صبح ترجمہ قصہ چہار درویش
۱۳	مولوی اکرام علی		مصنفہ ۱۸۹۸ء
۱۴	لکھنوال جی	۴	فورٹ ولیم کالج سے نشر اردو کے
۴	بینی نرائن		تعلق کے اسباب
۴	مرزا علی لطف		ڈاکٹر جان گلکرسٹ ۱۸۵۹ء

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۱	مرزا رجب علی بیگ سرور متوفی ۱۲۸۳ھ	۱۵	مولوی امانت اشرف
۲۲	نشانہ عجائب		اس عہد کے دیگر منشی اور نشان
۲۷	سرور کی دیگر تصانیف		تراجم قرآن شریف از مولانا
۴	الف بیلہ کے ترجمے		شاہ ولی اللہ و شاہ عبدالعزیز
۲۸	اردو نشانوں میں سرور کا مرتبہ		و شاہ عبدالقادر و شاہ
۱۱	غالب بحیثیت نشان	۱۶	رفیع الدین
۲۹	اردو سے معلیٰ اور عود ہندی	۴	مولوی محمد اسماعیل دہلوی
۳۰	نمونہ نثر مرزا غالب	۱۷	ترتیب صرف و نحوہ لغات اردو
	مرزا کا قدیم رنگ یعنی مقفے اول		ہندوستانیوں کی مرتب کردہ
۳۲	مستجمع عبارت	۱۹	لغات اور دیگر کتب
۳۳	کتبہ رسائل اسلامی سے اردو کو تقویت		عیسائی پادریوں کے کارنامے
۲۵	چھاپہ کی ابتداء	۴	زبان اردو کی توسیع اور ترقی میں
۳۷	رسائل دجراؤد و اخبارات		
۳۸	سر سید احمد خاں		
۴۱	سید صاحب کا طرز تحریر		
۴۲	سید صاحب کے رفقاء کے کلام		
۴۳	نواب محسن الملک ۱۸۳۷ء تا ۱۹۷۶ء		
۴۴	نواب قار الملک ۱۸۳۹ء تا ۱۹۱۷ء	۲۰	مطبوعات لکھنؤ
۴۵	مولوی چراغ علی ۱۸۳۵ء تا ۱۸۷۷ء	۱۶	نثر اردو کا دور متوسط
			اور دور جدید
			فیض محمد خاں گویا بستان حکمت ۱۲۵۱ھ

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۵۵	مولانا تذیر احمد	۴۶	مولوی محمد حسین آزاد
۵۶	تصانیف	۴۸	تصانیف
"	کتب مناظرہ و متعلق مذہب	"	ریڈیں اور اسکولی کتابیں
۵۸	اخلاقی ناول	"	آبجیات
۶۰	لیکچر و تقریریں	۵۰	تیرنگ خیال
"	بحیثیت شاعر کے	"	سخندان فارس
"	اخلاق و عادات	"	قند پارسی اور نصیحت کا کرن پھول
۶۱	طرز تحریر	۵۱	دیوان ذوق
"	مولوی ذکا الدین	"	دربار اکبری
۶۲	تصانیف	"	دیگر تصانیف
۶۳	مولوی سید احمد دہلوی	"	آزاد کا مرتبہ اردو نثر اردوں میں
۶۴	فرہنگ آصفیہ	۵۲	حسانی
"	شبلی نعمانی ۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۲ء	۵۳	ابتدائی تصانیف
"	تعلیم اور ابتدائی مشاغل	"	حیات سعدی
۶۶	قیام علی گڑھ	"	مقدمہ شعر و شاعری
"	ابتدائی تصانیف	۵۴	یادگار غالب
۶۷	قیام حیدر آباد	"	حیات جاوید
۶۸	ندوۃ العلماء	۵۵	مضامین حالی
۷۱	دار المصنفین ام عظم گڑھ	"	طرز تحریر

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۸۳	ترقی اردو		قابلیت اور خدمات کا
۸۴	مولوی وحید الدین سلیم	۷۱	اعتراف
۸۶	شیخ عبدالقادر بی۔ اے	۷۲	اخلاق و عادات
۸۷	بینڈت منوہر لال زقشی	۷۳	تصانیف
۸۸	منشی دیانرائن نغم	۷۴	مولانا بیحیثیت مورخ کے
۸۹	لالہ سری رام دہلوی ایم۔ اے	۷۵	مولانا بیحیثیت ناقد کے
۹۰	تذکرہ ہزار داستان المعروف	۷۶	طرز تحریر
۹۱	بہ خیمائے جاوید	۷۷	سید سلیمان ندوی
۹۲	دیگر نثر ان اردو	۷۸	مولوی عبدالسلام ندوی
۹۳	جدید نثر اردو کے دو طرز	۷۹	مولوی عبدالمجید دریا آبادی
۹۴	پہلا طرز عربی اردو اور اس کے	۸۰	جدید علوم کی ترویج دلی کالج کا قیام
۹۵	مقلبے میں بھاشہ آمیز اردو	۸۱	پروفیسر رامچندر
۹۶	دوسرا طرز خیالی یعنی ٹیگوری اردو	۸۲	مولوی امام بخش صہبائی
۹۷	پرتلی اخباری دنیا	۸۳	مولوی غلام امام شہید
۹۸	ادبی اردو رسالے	۸۴	منشی غلام غوث بختیگر
		۸۵	شمس العلماء سید علی بلگرامی
		۸۶	سید حسین بلگرامی
		۸۷	مولوی عزیز مرزا
		۸۸	مولوی عبدالحمق سکریٹری نجسین
		۸۹	
		۹۰	
		۹۱	
		۹۲	
		۹۳	
		۹۴	
		۹۵	
		۹۶	
		۹۷	
		۹۸	
		۹۹	
		۱۰۰	
		۱۰۱	
		۱۰۲	
		۱۰۳	
		۱۰۴	
		۱۰۵	
		۱۰۶	
		۱۰۷	
		۱۰۸	
		۱۰۹	
		۱۱۰	
		۱۱۱	
		۱۱۲	
		۱۱۳	
		۱۱۴	
		۱۱۵	
		۱۱۶	
		۱۱۷	
		۱۱۸	
		۱۱۹	
		۱۲۰	
		۱۲۱	
		۱۲۲	
		۱۲۳	
		۱۲۴	
		۱۲۵	
		۱۲۶	
		۱۲۷	
		۱۲۸	
		۱۲۹	
		۱۳۰	
		۱۳۱	
		۱۳۲	
		۱۳۳	
		۱۳۴	
		۱۳۵	
		۱۳۶	
		۱۳۷	
		۱۳۸	
		۱۳۹	
		۱۴۰	
		۱۴۱	
		۱۴۲	
		۱۴۳	
		۱۴۴	
		۱۴۵	
		۱۴۶	
		۱۴۷	
		۱۴۸	
		۱۴۹	
		۱۵۰	
		۱۵۱	
		۱۵۲	
		۱۵۳	
		۱۵۴	
		۱۵۵	
		۱۵۶	
		۱۵۷	
		۱۵۸	
		۱۵۹	
		۱۶۰	
		۱۶۱	
		۱۶۲	
		۱۶۳	
		۱۶۴	
		۱۶۵	
		۱۶۶	
		۱۶۷	
		۱۶۸	
		۱۶۹	
		۱۷۰	
		۱۷۱	
		۱۷۲	
		۱۷۳	
		۱۷۴	
		۱۷۵	
		۱۷۶	
		۱۷۷	
		۱۷۸	
		۱۷۹	
		۱۸۰	
		۱۸۱	
		۱۸۲	
		۱۸۳	
		۱۸۴	
		۱۸۵	
		۱۸۶	
		۱۸۷	
		۱۸۸	
		۱۸۹	
		۱۹۰	
		۱۹۱	
		۱۹۲	
		۱۹۳	
		۱۹۴	
		۱۹۵	
		۱۹۶	
		۱۹۷	
		۱۹۸	
		۱۹۹	
		۲۰۰	
		۲۰۱	
		۲۰۲	
		۲۰۳	
		۲۰۴	
		۲۰۵	
		۲۰۶	
		۲۰۷	
		۲۰۸	
		۲۰۹	
		۲۱۰	
		۲۱۱	
		۲۱۲	
		۲۱۳	
		۲۱۴	
		۲۱۵	
		۲۱۶	
		۲۱۷	
		۲۱۸	
		۲۱۹	
		۲۲۰	
		۲۲۱	
		۲۲۲	
		۲۲۳	
		۲۲۴	
		۲۲۵	
		۲۲۶	
		۲۲۷	
		۲۲۸	
		۲۲۹	
		۲۳۰	
		۲۳۱	
		۲۳۲	
		۲۳۳	
		۲۳۴	
		۲۳۵	
		۲۳۶	
		۲۳۷	
		۲۳۸	
		۲۳۹	
		۲۴۰	
		۲۴۱	
		۲۴۲	
		۲۴۳	
		۲۴۴	
		۲۴۵	
		۲۴۶	
		۲۴۷	
		۲۴۸	
		۲۴۹	
		۲۵۰	
		۲۵۱	
		۲۵۲	
		۲۵۳	
		۲۵۴	
		۲۵۵	
		۲۵۶	
		۲۵۷	
		۲۵۸	
		۲۵۹	
		۲۶۰	
		۲۶۱	
		۲۶۲	
		۲۶۳	
		۲۶۴	
		۲۶۵	
		۲۶۶	
		۲۶۷	
		۲۶۸	
		۲۶۹	
		۲۷۰	
		۲۷۱	
		۲۷۲	
		۲۷۳	
		۲۷۴	
		۲۷۵	
		۲۷۶	
		۲۷۷	
		۲۷۸	
		۲۷۹	
		۲۸۰	
		۲۸۱	
		۲۸۲	
		۲۸۳	
		۲۸۴	
		۲۸۵	
		۲۸۶	
		۲۸۷	
		۲۸۸	
		۲۸۹	
		۲۹۰	
		۲۹۱	
		۲۹۲	
		۲۹۳	
		۲۹۴	
		۲۹۵	
		۲۹۶	
		۲۹۷	
		۲۹۸	
		۲۹۹	
		۳۰۰	
		۳۰۱	
		۳۰۲	
		۳۰۳	
		۳۰۴	
		۳۰۵	
		۳۰۶	
		۳۰۷	
		۳۰۸	
		۳۰۹	
		۳۱۰	
		۳۱۱	
		۳۱۲	
		۳۱۳	
		۳۱۴	
		۳۱۵	
		۳۱۶	
		۳۱۷	
		۳۱۸	
		۳۱۹	
		۳۲۰	
		۳۲۱	
		۳۲۲	
		۳۲۳	
		۳۲۴	
		۳۲۵	
		۳۲۶	
		۳۲۷	
		۳۲۸	
		۳۲۹	
		۳۳۰	
		۳۳۱	
		۳۳۲	
		۳۳۳	
		۳۳۴	
		۳۳۵	
		۳۳۶	
		۳۳۷	
		۳۳۸	
		۳۳۹	
		۳۴۰	
		۳۴۱	
		۳۴۲	
		۳۴۳	
		۳۴۴	
		۳۴۵	
		۳۴۶	
		۳۴۷	
		۳۴۸	
		۳۴۹	
		۳۵۰	
		۳۵۱	
		۳۵۲	
		۳۵۳	
		۳۵۴	
		۳۵۵	
		۳۵۶	
		۳۵۷	
		۳۵۸	
		۳۵۹	
		۳۶۰	
		۳۶۱	
		۳۶۲	
		۳۶۳	
		۳۶۴	
		۳۶۵	
		۳۶۶	
		۳۶۷	
		۳۶۸	
		۳۶۹	
		۳۷۰	
		۳۷۱	
		۳۷۲	
		۳۷۳	
		۳۷۴	
		۳۷۵	
		۳۷۶	
		۳۷۷	
		۳۷۸	
		۳۷۹	
		۳۸۰	
		۳۸۱	
		۳۸۲	
		۳۸۳	
		۳۸۴	
		۳۸۵	
		۳۸۶	
		۳۸۷	
		۳۸۸	
		۳۸۹	
		۳۹۰	
		۳۹۱	
		۳۹۲	
		۳۹۳	
		۳۹۴	
		۳۹۵	
		۳۹۶	
		۳۹۷	
		۳۹۸	
		۳۹۹	
		۴۰۰	
		۴۰۱	
		۴۰۲	
		۴۰۳	
		۴۰۴	
		۴۰۵	
		۴۰۶	
		۴۰۷	
		۴۰۸	
		۴۰۹	
		۴۱۰	
		۴۱۱	
		۴۱۲	
		۴۱۳	
		۴۱۴	
		۴۱۵	
		۴۱۶	
		۴۱۷	
		۴۱۸	
		۴۱۹	
		۴۲۰	
		۴۲۱	
		۴۲۲	
		۴۲۳	
		۴۲۴	
		۴۲۵	
		۴۲۶	
		۴۲۷	
		۴۲۸	
		۴۲۹	
		۴۳۰	
		۴۳۱	
		۴۳۲	
		۴۳۳	
		۴۳۴	
		۴۳۵	
		۴۳۶	
		۴۳۷	
		۴۳۸	
		۴۳۹	
		۴۴۰	
		۴۴۱	
		۴۴۲	
		۴۴۳	
		۴۴۴	
		۴۴۵	
		۴۴۶	
		۴۴۷	
		۴۴۸	
		۴۴۹	
		۴۵۰	
		۴۵۱	
		۴۵۲	
		۴۵۳	
		۴۵۴	
		۴۵۵	
		۴۵۶	
		۴۵۷	
		۴۵۸	
		۴۵۹	
		۴۶۰	
		۴۶۱	
		۴۶۲	
		۴۶۳	
		۴۶۴	
		۴۶۵	
		۴۶۶	
		۴۶۷	
		۴۶۸	
		۴۶۹	
		۴۷۰	
		۴۷۱	
		۴۷۲	
		۴۷۳	
		۴۷۴	
		۴۷۵	
		۴۷۶	
		۴۷۷	
		۴۷۸	
		۴۷۹	
		۴۸۰	
		۴۸۱	</

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۱۵	سرشار کی کیریکٹرنگاری	۹۸	سرور و سرشار کا زمانہ
۶	خوجی	۶	اردو کے پرانے قصے
۱۱۷	سرشار نے اپنے نادلوں سے	۷	مطبع منشی نول کٹر
۶	آن نیچرل چیزوں کو خارج کر دیا	۹۹	داتان امیر حمزہ صاحب قرآن
۱۱۹	نقائص کلام	۱۰۰	بوستان خیال
۱۱۹	سرشار بحیثیت ایک صاحب طرز کے	۱۰۱	افسانہ اور ناول کی پہچ کی کڑی
۱۲۳	سرشار اور سرور کا مقابلہ	۱۰۲	ادب پنچ اور اس کی ادبی خدمات
۱۲۴	مولوی عبد الحکیم شرر	۱۰۳	منشی سجاد حسین اڈیٹر ادب پنچ
۱۲۵	ان کی زندگی کے خود نوشتہ حالات	۱۰۴	مرزا پھریگ عاشق
۱۳۵	مرزا محمد ہادی رسوا	۱۰۵	ترکھون ناگھ بھر
۱۳۶	حکیم محمد علی	۱۰۶	نواب سید محمد آزاد
۱۳۷	راشد الخیری	۱۰۷	جوالا پشاد بستی
۱۳۸	نیاز فقیری	۱۰۸	احمد علی شوق
۱۳۹	طرز تحریر	۱۰۹	پندت رتن ناتھ سرشار
۱۴۰	خواجہ حسن نظامی	۱۱۰	عام عادات و اخلاق
۱۴۱	پریم چند	۱۱۱	قصائیف
۱۴۲	سدرشن	۱۱۲	فسانہ آزاد
۱۴۳	دیگر ناول نویس	۱۱۳	سرشار کی مرقع نگاری
		۱۱۴	سرشار کی شوخی اور ظرافت

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۴۹	وگوریہ نانک کپنی		باب ۱۸
"	طالب بنارس		اُردو ڈراما
"	الفریڈ تھیٹر بکل کپنی		
۱۵۰	احسن لکھنوی	۱۴۰	اُردو ڈراما
"	بیٹاب دہلوی	"	ڈراما کی عمومیت
۱۵۱	نیوا الفریڈ کپنی		سنکرت اور ہندی ڈراما نے
"	آغا حشر کشمیری	۱۴۱	اُردو پر کیوں نہیں اثر کیا۔
۱۵۲	دوسری کپنیاں	۱۴۲	اُردو ڈراما کے عناصر خمسہ
	آخرانیسویں صدی کے مشہور	"	سنکرت ڈراما
۱۵۳	ڈراما نویس	"	ہندو مرہٹل پٹے
	شروع بیسویں صدی کے بعض	۱۴۳	سوانگ و نقلیں وغیرہ
"	ڈراما نویس۔	"	اسلامی نظمیں اور روایات
	اُردو ڈراما کی ترقی میں مختلف	"	انگریزی ایجنٹ
۱۵۴	لوگوں نے کیا حصہ لیا۔	۱۴۵	اُردو ڈراما کے اقسام
	ابتدائی ڈراموں کے		اُردو ڈراما پر شادی درباروں کا
۱۵۵	نقائص	"	اثر
۱۵۹	موجودہ ڈراموں میں اصلاح و ترقی	۱۴۶	اندر سبھا امانت
۱۶۰	آئندہ اصلاح و ترقی کی ضرورت	۱۴۸	اُردو ڈراما ادب پارسی
۱۶۱	اُردو ڈراما کا مستقبل	"	ادب بکل تھیٹر بکل کپنی

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۶۳	ایک وسیع زبان ہے		باب ۱۹
"	بعض یورپین محققین کی رائیں		زبان اردو کی خاص خوبیاں
۱۶۴	اردو کی نام نہاد کم ماہگی		اور اُس کے متعلق بعض
۱۶۵	اقسام ادب		اہل الرائے لوگوں کی
"	تصانیف		قیمتی رائیں
"	تراجم		
۱۶۷	مذہبی لٹریچر		
"	ادب اردو کے سرچشمے		
	ہندوستانی اکیڈمی قائم شدہ	۱۶۲	اردو ایک فصیح اور شیریں زبان ہے
"	۱۹۲۷ء	"	ہندو مسلم اتحاد کی علامت ہے
۱۶۸	اردو کا رسم الخط	"	ہندوستان کی عام زبان ہے

تاریخ ادب اردو

باب ۱۵ حصہ نہر

نثر اردو کی ابتدا و اقصیٰ فورت ولیم کالج کلکتہ فورت ولیم کالج کلکتہ

نثر اردو کی تئوین آغاز کے اسباب | اردو نثر کی ابتدا و اقصیٰ فورت ولیم کالج کلکتہ سے ہوئی۔ شمالی ہند میں اس کی عدم ترقی کی خاص وجہ یہ تھی کہ وہاں فارسی کا رواج تھا۔ درباری اور تعلیم یافتہ شرفا کی زبان وہی تھی۔ مراسلے کتابوں کی تقریظیں اور دیباچے یہ سب فارسی ہی میں لکھے جاتے تھے۔ اردو نثر کے تذکرے جن میں ان کے کچھ حالات بھی ہوتے تھے یہ بھی فارسی ہی میں ہوتے تھے۔ نثر کی شان تھی کہ عبادت مقفیٰ اور مستحق غلامی اور بیدل کے طرز پر مروج تھی۔ اس وقت کے اردو نثر نگار غلامی اور بیدل کی ایسی پیچیدہ اور مغلط عبارت لکھنے کے شائق تھے اور اسی قسم کی عبارت لکھنے میں ایک دوسرے پرست لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ فارسی کی مردہ اقسام نثر یعنی مرجز مقفیٰ، ہمسع اور عاری اردو میں بھی بے مصلحت اختیار کی گئی تھیں اور جب کبھی کوئی بات نثر میں لکھنا ہوتی تو وہ نہایت رنگین اور پیچیدہ عبارت میں لکھی جاتی تھی۔ نظم کا عام رواج تھا یہاں تک کہ خطوط بھی نظم میں لکھے جاتے تھے۔ نظم لکھنا قافیہ اور علیت کی بڑی دلیل بھی جاتی تھی اور ایک طرف سے لکھے آدمی کا یہی مقناے امتیاز تھا۔ نظم کا یہ عالم رواج ہوا۔ مقبولیت نثر کو کبھی نظم نہ بنائے ہوئے تھا۔ نثر پچاسی ایک گوشہ گمنامی میں پڑی ہوئی اپنی ترقی کا موقع دیکھ رہی تھی۔ مگر وہ دور نظم کے عروج کا دور تھا اور نثر کی طرف کیسی توجہ نہ تھی۔ یہ اسباب اس کی ابتدا کی تاخیر کے لئے

اور یہی اس بات کی بھی وجہ ہو کہ اُس کی ابتدا ایسے مقام سے ہوئی جو شمالی ہند اور ادبی مرکز سے دور تھا۔
 زبان دکنی میں قدیم
 اردو نثر کی تصانیف کے بہت سے نمونے دستیاب کیے ہیں۔ یہ کارروائی ہنوز جاری ہے اور امید کی جاتی

ہے کہ بہت عرصہ نہیں گزرے گا کہ کافی مواد ایک مکمل اور بہتر تاریخ نثر اردو کی تیاری کیلئے فراہم ہو جائے گا۔
 ایسے محقق ہمارے نزدیک مولوی عبدالحق صاحب اور حکیم مدد غلام اللہ قادری ہیں کہ جن کی کوششیں اس
 بارے میں بہت تحسین اور فخر کے لائق ہیں۔ جہاں تک قدیم ترین نمونے اس وقت تک دریافت ہوئے
 ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ نثر اردو کی تاریخ آٹھویں صدی ہجری سے شروع ہوتی ہے۔ یہ نمونے چھوٹے
 چھوٹے رسالوں کی صورت میں ہیں جن میں دکن اور گجرات کے فقرا اور اہل دل کے اقوال و امثال قلمبند
 کیے گئے ہیں یہ رسالے اکثر فارسی اور عربی کتابوں کے ترجمے ہیں اور زیادہ تر مذہبی رنگ میں ہیں۔ مثلاً
 شیخ عین الدین گنج العلم دہلوی متوفی ۷۹۵ھ کی تصانیف اور معراج العاشقین مصنفہ حضرت خواجہ گیسو دراز
 بکھر گئی جا کر چھ کوئی اپنی حیثیت تو نہیں رکھتا مگر پھر بھی اُس زمانہ کی زبان کا حال بخوبی اس سے معلوم ہوتا
 ہے۔ اور آپ کے نواسے سید محمد عبداللہ دہلوی نے حضرت غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے رسائل العاشقین
 کو دکنی میں ترجمہ کیا۔ اسی طرح شاہ میر انجی شمس المصباح بیجاپوری نے شرح مرغوب القلوب لکھی۔
 اور ان کے فرزند شاہ بہان الدین جہانم متوفی ۸۹۹ھ نے متعدد کتابیں لکھیں جن میں سے دس کے نام
 "جہل ترنگ" اور "گلپاس" ہیں۔ مولانا دہلوی کی "سیرت" ۸۵۳ھ کی تصنیف ہے جس کا ذکر حصہ نظم
 میں مولانا دہلوی کے بیان میں آچکا ہے۔ میران یعقوب نے شمائل الانقیاد و دلائل الاتقیاء کا اردو ترجمہ
 نہایت سلیس اور سادہ دکنی زبان میں ۸۵۳ھ میں کیا۔ سید شاہ محمد قادری نے بھی جہاد ترنگ زیب کے
 زمانہ میں تھے اور وہ خود کے نور دریا خاندان سے تعلق رکھتے تھے مختلف ہی رسالے لکھے ہیں گیارہویں
 صدی میں سید شاہ میر نے ایک مذہبی کتاب زبان دکنی میں "اسرار التوحید" کے نام سے لکھی۔

وہ مجلس فضلی حنفیہ ۱۲۳۲ھ قبل اس کے کہ دکن کی اردو شمالی ہند میں آئے یہاں بھی کچھ کتابیں نثر میں
 لکھی گئیں جو زیادہ تر فقہ کما نیوں کی صورت یا مذہبی رنگ میں تھیں اور فارسی سے ترجمہ ہوئی تھیں

انھیں کتابوں میں فضلی کی وہ مجلس ہو جو بعد محمد شاہ بادشاہ دہلی ۱۲۳۵ھ مطابق ۱۷۳۷ء میں لکھی گئی اس وقت مصنف کی عمر بائیس برس کی تھی جیسا کہ وہ خود اس کتاب کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔ یہ کتاب فارسی کی روضۃ الشہداء کا ترجمہ ہے جو ملا حسین اعظمی کا شعنی کی تصنیف ہے۔ فضلی نے اس کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ میری بڑی تمنا تھی کہ یہ کتاب نہایت سہل اور عام فہم زبان میں جو اس وقت مروج تھی لکھی جائے مگر چونکہ مذہبی کتاب تھی اور میرے سامنے اس سے قبل کوئی نمونہ موجود نہ تھا لہذا مجھے اس کی تحسین میں بہت پس پڑی تھی اسی حالت میں میں نے خواب میں یہ الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام کو دیکھا کہ آپ شریف لائے ہیں اور آپ نے میرے مشکلات کو حل کیا اور امداد فرمائی فضلی جو مذہب امامیہ رکھتے تھے ائمہ معصومین کی شان میں کچھ نظمیں اور مرثیے بھی لکھے ہیں مگر ان کو کچھ شہرت نہیں ہوئی۔ وہ مجلس حسین اصل میں بارہ مجلسیں ہیں۔ بشرار دو کی ایک کمال کتاب تو نہیں کہی جاسکتی البتہ وہ اس زمانہ کی اردو شہر کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ عبارت میں خامی ہو جیسا کہ ہر ابتدائی کام میں ہوا کرتی ہے جیسے پُر تصنع اور متعین اس اسی طرح ایک مختصر نمونہ اس زمانہ کی شہر اردو کا تودا کے کلیات کے شروع میں موجود ہے جس سے اس زمانہ کا رنگ بخوبی معلوم ہوتا ہے زمانہ حال کی پابندی صرف و نحو اس میں بالکل نہیں ہے صرف قافیہ و اسالفا کا مثل نظم کے جملوں کے آخر میں رکھ دیے گئے ہیں۔ مضمون بھی تشبیہوں اور استعاروں سے مملو ہے ایسی عبارت صرف موزوں نہ ہونے کی وجہ سے شرم کی جاسکتی ہے ورنہ اس میں اور نظم میں کوئی فرق نہیں ہے۔ انشا اور نقل کی دریاے لطافت کو فارسی میں ہے مگر نہایت کجیب کتاب ہے۔ اس میں اس وقت کے مختلف پیشہ دروں کی بولیاں مختلف ہم دراج اور معمولی بول چال اور حضرت الامثال اور دلی اور لکھنؤ کی زبان کا فرق اور متروکات قدیم اور مختلف ملکوں کی زبان کا زبان دہلی و لکھنؤ میں شامل ہونے سے اثر وغیرہ وغیرہ درج ہیں۔

دوسری مشہور کتاب اس ہند کی نو طرز صحت ہے جس کو میر محمد علی حسین خان متخلص

فوطر مرقع ترجمہ تفسیر

تہمتین نے امیر خسرو کے قصہ چار درویش سے اردو میں ترجمہ کیا اس کا

چار درویش مصنف ۱۱۹۸ھ

تہ تصیف ۱۱۹۸ھ اردو ادبیہ نواب شجاع الدلہ کے ہند میں کل بھا جکی تعریف میں ایک قصیدہ دیباچہ کے

آخر میں دیا ہوا ہے مصنف نمبر دفعہ رقم کے لقب سے مشہور تھے اور محمد باقر خاں شوق کے بیٹے اور
 ابو المنصور خاں صفدر جنگ کے دربار سے وابستہ تھے۔ بعد اُس کے وہ جنرل اسمتھ کے سرمنشی مقرر ہوئے
 اور انھیں کے ساتھ کلکتہ گئے جب صاحب موصوف و لاہوت گئے تو تحسین پٹنہ چلے آئے اور وہاں نکال
 کرنے لگے اپنے باپ کے انتقال کے بعد وہ پٹنہ سے فیض آباد آ گئے جہاں نواب شجاع الدولہ
 کے ملازم ہو گئے یہ سلسلہ ملازمت نواب آصف الدولہ کے زمانہ تک قائم رہا۔ تحسین علاء خاں نے
 ہونے کے منشی بھی نہایت اچھے تھے چنانچہ ضوابط انگریزی جو اس زمانہ کی گورنمنٹ ہند کے
 قوانین کا مجموعہ ہے اور تواریخ قاسمی اُن کی تصنیف ہیں یہ دونوں کتابیں فارسی میں ہیں
 "نظم رزم" کی عبارت نہایت رنگین اور فارسی و عربی الفاظ سے ملبو ہے غالباً ہی وجہ ہوگی
 کہ ڈاکٹر گلکرسٹ نے قصبہ چار درویش کا ایک دوسرا ترجمہ موسوم بہ "باغ و بہار" نہایت
 صاف اردو زبان میں میرامن دہلوی سے کرایا جس کا مفصل حال آگے آتا ہے۔

نوٹ ولیم کالج سے نثر اردو	انگریزوں نے ہندوستان میں اپنے تجارتی تعلقات کے سلسلہ میں نئے
کے تعلق کے اسباب	بڑے قطعات ملک حاصل کر لیے تھے جن کے عہد انتظام کے واسطے ضروری

تھا کہ اُن کے اعلیٰ عمال اس ملک کی زبان سے جس کا انتظام عاملانہ خواہ تاجرانہ اُن کے سپرد تھا
 اچھی طرح واقف ہو جائیں تجارتی تعلقات یوں مافیہ نامم ہوتے جاتے تھے مگر انتظامی معاملات بڑھتے
 جاتے تھے۔ مترجم جن کے ذریعہ سے اہل ملک کی زبان اور خیالات کو یورپی عمال یا تجارت سمجھ سکتے
 تھے اب بیکار ہو گئے تھے کیونکہ بیخیال پیدا ہو گیا تھا کہ کوئی قوم تا وقتیکہ مفتوح قوم کو زبان مادر رسم و
 رواج اور روایات تاریخی و مذہبی سے کاٹھ بلا واسطہ واقف نہ ہوگی اُس پر پورے طور سے
 حکومت نہیں کر سکتی۔ اور ان سب باتوں کے لیے ضروری تھا کہ حاکم اپنے حکموں کی زبان سمجھیں۔ لہذا
 گورنمنٹ ڈاکٹر کزن نے یہ دیکھ کر کہ اُن کے عمال ہندوستان میں اپنے فرائض منصبی محض نہیں پانے جاتے کیونکہ
 بہت بُری طرح سے ادھر سڑتی پڑا کرتے ہیں یہ تاکید حکم دیدیا کہ آئندہ اُن کے حکام مقامی اپنے
 عمال کے واسطے ایسی زبانوں سے کاٹھ واقف کر ضروری قرار دیں اسی کے ساتھ چونکہ بڑے بڑے قطعات ملک

انگریزی عملداری میں داخل ہوتے جاتے تھے لہذا پارلیمنٹ انگلستان کو اب یہ محسوس ہونے لگا کہ رعایا کی فلاح و بہبود اور تعلیم و ترقی کی ذمہ داری بھی ہمیں پر عائد ہوتی ہے چنانچہ اب اس کی کوشش ہو نیکی کی جوڑ کاوٹ خانہ جنگیوں اور ملکی لڑائیوں کی وجہ سے لوگوں کے تعلیم میں پرکمی تھی جس کی وجہ سے تعلیم کو بہت سخت صدمہ پہنچ رہا تھا اب دد رہو جائے۔ اسی اصول پر تعلیم انگریزی کی اشاعت شروع ہوئی جس سے خیالات اور زبان دونوں میں انقلاب عظیم پیدا ہونا شروع ہوا جس کا اثر کمپننظم پر پڑا اور کمپننشر پر مختصر یہ کہ تعلیم انگریزی نے ہندوستان کے واسطے طوی کیا جواب سے پانچ چھ سو برس پیشتر رینا سانس (نشاۃ ثانیہ) نے یورپ کے واسطے کیا تھا یہ قاعدہ ہے کہ ہر تیر اور انقلاب کے ساتھ اچھائیوں کے ساتھ ساتھ کچھ برائیاں بھی ضرور آ جاتی ہیں مگر اس صورت میں اچھائیوں کا پلہ بھاری رہا۔ یعنی اس تعلیمی تغیر سے دیسی زبانوں کو بہت فائدہ پہنچا۔

ڈاکٹر جان گلکرسٹ نفاہت شمسہ
ڈاکٹر جان گلکرسٹ جو انیسویں صدی کے شروع میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے فاضل اعلیٰ تھے شر اردو کے مرتبی (باپ) کہلائے جانے لگی بحقیقت مستی میں

انھیں کی ان تھک کوششوں سے ملک کی دیسی زبان مینی اردو مکمل ہو کر سرکاری زبان بننے کے لائق ہوئی اور اس میں اتنی صلاحیت پیدا ہو گئی کہ تھوڑے ہی عرصہ میں فارسی کی جگہ وہ سرکاری اور درباری زبان قرار پائی۔ ڈاکٹر موصوف اسکاٹ لینڈ کے باشندے تھے ۱۷۹۵ء میں بمقام ایڈنبرا پیدا ہوئے۔ جارج ہیرٹ کے درگاہ میں جو اسی شہر میں واقع تھی تعلیم پائی ۱۸۲۰ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت میں یہ حیثیت ڈاکٹر داخل ہوئے۔ ابتدا ہی سے یہ خیال ان کے دل میں راسخ تھا کہ انگریزی فرائض فارسی دانی کی اس قدر ضرورت نہیں (جیسا کہ اس وقت دستور تھا جس قدر کہ ملک کی دیسی زبانوں علی الخصوص زبان ہندوستانی کی ہے جو اس وقت ہر طبقہ اشخاص سے میل جول کیلئے سب سے زیادہ مشہور زبان سمجھی جاتی تھی) گلکرسٹ نے خود اس معاملہ میں ہفت کی۔ ان کی نسبت لکھا ہے کہ وہ ہندوستانی کیلئے اپنے اُن مقامات میں جہاں اردو بہت صحیح اور با محاد و بولی جاتی تھی برابر گھومنا کرتے تھے اور اردو کے علاوہ سنسکرت فارسی دیگر مشرقی زبانوں سے بھی باخبر تھے۔ ان کی کامیابی کو دیکھ کر دیگر ملازمین کمپنی کے دل میں بھی

اُردو پڑھنے کا شوق پیدا ہوا مختصر یہ کہ انگریزوں میں اُردو پڑھنے کا رواج اُسی وقت سے ہو گیا۔
 لارڈ ویلیسلی نے جو اُس وقت گورنر جنرل تھے اس تجویز کی اہمیت اور ضرورت پر نظر کر کے اور گلکرسٹ کے
 مفید کاموں کے عمدہ نتائج کو دیکھ کر ان کو مالی امداد بھی بہت دی اور فورٹ ولیم کالج کا انٹر علی مقرر
 کر دیا۔ یہ کالج مسیحیوں میں اس غرض سے قائم ہوا تھا کہ اس میں کمپنی کے انگریزی ملازمین کو ملک کی دیسی زبانوں
 میں تعلیم دی جائے گلکرسٹ عرصہ تک اپنی جگہ پر رہ سکے علالت کی وجہ سے مستعفی ہو کر ستمبر ۱۸۳۷ء میں پنشن لے کر
 ولایت چلے گئے زبان اُردو سے اُن کو اس قدر عشق تھا کہ ایڈنبرا میں ستمبر ۱۸۳۷ء تک قیام کر کے لندن
 آ گئے جہاں اسیداران انڈین سول سروس کو وہ مشرقی زبانوں میں پرائیوٹ طریق پر تعلیم دیا کرتے
 تھے ۱۸۳۷ء میں وہ اور ٹیلنٹ انٹیوٹ میں زبان اُردو کے پروفیسر مقرر ہو گئے جس کو اس سال ایٹانڈیا کمپنی
 نے لندن میں قائم کیا تھا اگر ۱۸۳۷ء میں بند ہو گیا تھا اس کے بند ہونے کے بعد بھی وہ تقریباً سال بھر تک
 شائقین زبان کو پرائیوٹ طور پر اُردو پڑھانے لے آئے اور اپنے بعد اپنی جگہ پر سینئر فورڈ اور ڈکن فوربس کو جو مشہور
 مشرق تھے مقرر کر گئے گلکرسٹ کا انتقال ۸۲ برس کی عمر میں بھام پیرس ۱۸۳۷ء میں ہوا۔ وہ بہت سی
 کتب متعلقہ زبان ہندوستانی کے مصنف ہیں جن کی پوری فہرست ڈاکٹر گریرسن نے اپنی مشہور تصنیف
 "نگوشٹ سرورٹون انڈیا" ہندوستانی زبانوں کے نقشبات کی جلد نہم میں دی ہے۔ انکی بعض مشہور تصانیف
 کے نام یہ ہیں (۱) انگریزی ہندوستانی دکنسری ۲ حصوں میں مطبوعہ ۱۷۹۳ء (۲) اور ٹیلنٹنگوشٹ
 (مشرقی زبانوں) جو زبان اُردو کا آسان مقدمہ ہے مطبوعہ ۱۷۹۸ء (۳) ہندوستانی گرامر
 مطبوعہ ۱۷۹۶ء (۴) ہندوستانی خلا لوجی۔ گلکرسٹ ہی کے انتظام اور ساتھی میں ایک جماعت
 ہندوستانیوں کی کالج میں قائم ہو گئی تھی جنہوں نے نہ صرف انگریزوں کے پڑھنے کے واسطے درسی
 کتابیں بلکہ زبان اُردو ہندی میں مستقل تصانیف نہایت اعلیٰ درجہ کی تصنیف کیں سلطنت
 مغلیہ کی تباہی کے بعد بعض مشہور اہل زبان و اہل قلم اپنا وطن چھوڑ کر ڈاکٹر گلکرسٹ کی شہرت
 اور فیاضی کا شہرہ سن کر کلکتہ پہنچ گئے تھے انہوں نے اُن کی دینے لگے کلکتہ کے لوگوں کو اپنے کالج
 میں خوشی سے جگہ دی۔ ڈاکٹر گلکرسٹ کے ساتھ بعض اور مشہور افسروں کو مثلاً کپتان بوبک کپتان ٹیلر

ڈاکٹر منیر وغیرہ کی خدمات بھی ضرور قابل تعریف ہیں۔ ڈاکٹر گلکرسٹ کے زمانہ میں مشہور ہندوستانی
 اہل قلم جو کالج میں جمع ہو گئے تھے حب ذیل ہیں۔ میرامن۔ انوس حسینی۔ لطف حیدری۔ جوان
 نلوالا جی نہال چند، اکرام علی ولہ۔ سید محمد منیر۔ سید شیر علی انوس اور مداری لال گجراتی۔
 میرامن دہلوی | میرامن دہلوی متخلص بہ لطف دلی کے رہنے والے تھے۔ ان کے آباد اجداد سلاطین
 کے زمانہ میں ظائف اور جاگیروں سے معزز و ممتاز تھے۔ احمد شاہ درانی نے جب دہلی پر حملہ کیا تو فوج
 کی لوت میں میرامن کا گھر بھی شامل تھا اور سونج کل جھاٹ نے ان کی خاندانی جاگیر پر قبضہ کر لیا
 تھا۔ میرامن اس مصیبت میں دلی سے کل کرپٹہ پہنچے یہاں کچھ عرصہ تک رہ کر کلکتہ روانہ ہوئے
 جہاں نواب ولادر جنگ بہادر کے چھوٹے بھائی میر محمد کاظم خاں کی تعینم و تربیت ان کے سپرد تھی۔ انہی
 میں میر بہادر علی حسینی نے ان کا تعارف ڈاکٹر گلکرسٹ سے کر دیا جن کی فرمائش سے انھوں نے اپنی مشہور
 معروف کتاب قصہ چہار درویش لکھی جس کا تاریخی نام بلغ و بہار ہو یہ قصہ اصل میں فارسی میں تھا اور اسکو
 ایسے خسر و دہلوی نے اپنے پیر مرشد حضرت نظام الدین اولیا کے محال علات دل بہلانے کے واسطے
 تصنیف کیا تھا۔ تھوڑے عرصہ کے بعد جب حضرت کو صحت ہوئی تو آپ نے دعا دی کہ اس قصہ کو جو
 کوئی سنے گا وہ حکم خدا بیماری سے شفا پائے گا۔ یہ قصہ فارسی میں بھی بہت مقبول ہے اور اسکے دونوں
 اردو ترجمے یعنی تحسین اور میرامن کے ترجمے مع دیگر تراجم کے جو ہندوستان کی اکثر دیسی زبانوں اور نیز غیر ملکی
 زبانوں میں ہوئے ہیں بہت مقبول ہیں یہ کتاب سنیہ مطابق سنیہ میں ختم ہوئی تحسین کے
 ترجمہ کو میرامن نے اپنی زبان میں لکھا ہے کیونکہ اس میں اکثر غیر مانوس فارسی و عربی الفاظ تھے جن کو
 میرامن نے نکال دیا اور اپنی کتاب کو اس قدر صاف و سلیس و با محاورہ عبارت میں لکھا کہ بقول
 سر سید مرحوم کے جو مرتبہ سیرت سیر کو نظم میں حاصل ہے وہی میرامن کو شعر میں ہے یہ قصہ نہ صرف دیکھنے
 بلکہ اس میں اس زمانہ کے رسم و رواج اور طرز معاشرت کے موقع نہایت وضاحت سے کھینچے گئے ہیں
 جو باچہ میں سبب تالیف کتاب اور اپنا حال لکھ کر زبان اُردو کی ایک مختصر سی تاریخ بھی بنا دی ہے جو
 زیادہ صمیم نہیں سمجھی جاسکتی۔ یہ عجیب بات ہے کہ کتاب باغ و بہار انگریزوں میں بہت مقبول رہی ہے

چنانچہ اب تک وہ انگریزی حکام کے اُردو امتحانوں میں داخل درجہ ہے علاوہ اس کتاب کے
 "گنجینہ خوبی" بھی میرامن کی تصنیف ہے جو ملاحین و اعطا کا شفی کی اخلاق حسنی کے طرز پر ۱۲۰۰
 میں تحریر کی گئی منشی کریم الدین گنیاں کہ میرامن نے کوئی دیوان ضرور مرتب کیا ہوگا مگر اس کا ہمیں
 پتہ نہیں۔ ڈاکٹر فلیمن نے خود میرامن کی زبانی سنا تھا کہ ان کو کسی سے فن شعر میں تلمذ نہ تھا۔
 افسوس ۱۲۳۵ء میر شیر علی دہلوی متخلص بہ افسوس میر علی مظفر خاں کے بیٹے تھے جو فاضل میر قاسم کے
 نسیب ۱۲۳۵ء سرکار میں داروغہ سلع خانہ تھے یہ حضرت امام جعفر صادقؑ کی اولاد میں تھے اور
 ان کے آباؤ اجداد خاف کے رہنے والے تھے۔ ان کے بزرگوں میں ایک شخص سید بدلال الدین نامی ناول
 میں جو اگرہ کے قریب ہے سکونت گزیر ہوئے۔ محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں ان کے باپ اور چچا
 سید غلام علی خاں آگرہ سے دلی آئے اور عہدہ الملک نواب میر خاں کی سرکاری ایک پیش قراست خواہ پر ملازمت
 اختیار کی افسوس دہلی میں پیدا ہوئے جس کو ان کے بزرگوں نے بطریق وطن کے اختیار کیا تھا ۱۲۴۳ء
 میں جب نواب میر خاں کا انتقال ہوا تو افسوس کے والد پٹنہ چلے گئے۔ جہاں نواب میر قاسم اور ان کے
 بعد نواب میر جعفر کی ملازمت کرتے رہے یہاں تک کہ جب آخرا لکھنؤ کے گئے تو وہ لکھنؤ آئے اور
 وہاں سے حیدر آباد گئے جہاں ان کا انتقال ہوا۔ افسوس بھی اپنے والد کے ساتھ پٹنہ سے لکھنؤ آئے
 تھے اور چونکہ سیلان طبیعت شعر و شاعری کی طرف بہت تھیں اور فضائے لکھنؤ میں زمانہ شاعری اس وقت
 گونج رہا تھا انھوں نے بھی شعر کہنا شروع کر دیا وہ اپنا کلام میر جیل علی حیراں کو دکھلاتے تھے اور بعض
 کہتے ہیں کہ میر حسن، میر تقی اور میر سوز سے بھی اصلاح لیتے تھے۔ لکھنؤ میں ان کی سرپرستی نواب
 سالار جنگ بہادر اور ان کے بعد ان کے بیٹے نواب مرزا نواز علی خاں کرتے رہے لکھنؤ ہی کے قیام میں
 نواب حسن رضا خان نائب نواب آصف اللہ کی وساطت سے افسوس کریںل اسکاٹ صاحب سے ملے جن کو
 اعلیٰ قابلیت اور ذہانت و ذکاوت کو بہت پسند کر کے دو سو روپیہ شاہرہ پرائیوٹ کلکتہ بھیجا اور پانچ سو روپیہ
 تراویہ کے لیے بھی عنایت فرمائے افسوس لائے میں مرشد آباد میں مرزا علی لطف صاحب گلشن ہند سے
 بھی ملے تھے کلکتہ پہنچ کر وہ فوراً ولیم کالج کے زمرہ استادان میں ایک معزز پڑھنے والے کی تصاحب فرمایا ہیں

(۱) اردو ترجمہ گلستان سعدی موسوم بہ باغ اردو جو کلکتہ میں پہلی مرتبہ ۱۲۱۲ء میں چھپا تھا اور نہایت قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے (۲) ۱۲۱۲ء میں انھوں نے اپنی مشہور کتاب آرائش محفل لکھنا شروع کی جس میں علاوہ ہندوستان کے جزائری حالت کے فتح اسلام تک ہندو راجاؤں کی ایک مختصر تاریخ بھی ہے اس کی تصنیف میں اکثر تاریخوں سے مدد لی گئی مگر اس کا اصلی مآخذ منشی بوجن رائے پٹیلوی کی خلاصۃ التواریخ ہے ان کے علاوہ انوس نے میر بہادر علی کی شریٰ نظیر منشی عزت شاہ کی مذہب عشق اور مولوی محمد اسماعیل صاحب کی بہار دانش کی تصنیف میں بھی مدد دی تھی اور کلیات سودا بھی اپنی تصحیح سے چھپوایا تھا۔ ان تصانیف کے علاوہ ان کا ایک دیوان بھی ہو جو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ انوس کا انتقال ۱۲۱۵ء میں ہوا۔

میر بہادر علی حسینی | ان کے مفصل حالات معلوم نہیں ہو سکے بہر طور اتنا معلوم ہے کہ وہ فورٹ ولیم کالج میں میر منشی تھے اور کتب ذیل کے مصنف ہیں (۱) اخلاق ہندی جو ڈاکٹر گلکرسٹ کی فرمائش سے ۱۲۰۷ء میں لکھی گئی یہ ہتوپدیش کے ایک فارسی ترجمہ کا جو شاہ نصیر الدین بہاری کے حکم سے مفتی تاج الدین نے مفرح القلوب کے نام سے کیا تھا صاف اور سلیس اردو ترجمہ ہو (۲) شریٰ نظیر یعنی منشی میر حسن شریٰ جو ۱۲۰۷ء میں تصنیف اور ۱۲۰۸ء میں یعنی دو برس قبل اصل منشی کے شائع ہوئی (۳) رسالہ گلکرسٹ یعنی گلکرسٹ صاحب کی گرامر کا خلاصہ زبان اردو کی صرف و نحو اور فن عروض کا رسالہ ہے مطبوعہ کلکتہ ۱۲۰۹ء (۴) ترجمہ تاریخ آسام مصنفہ شاہاب الدین تابس جس میں دنگنیر کے مشہور جرنیل میر حلیہ کے حوالہ آسام ۱۲۰۷ء کا ذکر ہے حسب الحکم کو لبرک صاحب ترتیب پایا۔ ان کے علاوہ قصۃ القمان اور قرآن شریف کے ایک ترجمہ میں بھی حسینی نے شرکت کی تھی۔

سید حیدر بخش حیدری | سید حیدر بخش حیدری سید ابوالحسن کے بیٹے دہلی کے رہنے والے تھے ان کے آباؤ اجداد نجف کے باشندے تھے ان کے والد لالہ سکھ دیو رائے کے ساتھ دہلی سے نکل کر بنارس پہنچے اور وہیں سکونت اختیار کر لی حیدر بخش اپنے والد کے ساتھ تھے بنارس میں اُس وقت نواب علی بابا ایم خاں متخلص خلیل مصنف تذکرۃ گلزار الابرار ایم عدالت انگلزی کے جن تھے انکی سپرگ میں حیدری دیے گئے

تاکہ نواب صاحب فیض صحت چھٹی طرح مستفیض ہوں علوم مذہبی کی تعلیم ان کی مولوی غلام حسین غازی پوری کے سایہ عاطفت میں پڑی جو نواب صاحب موصوف کی عدالت کے ایک سربراہ آردہ مولوی تھے ۱۸۰۱ء میں یہ سن کر کہ نورث ولیم کالج کلکتہ میں قابل نشیون کی مانگ ہے حیدری نے ایک کتاب موسوم بہ "قصہ ہر ماہ" ترتیب دی جس کا سہ تصنیف ۱۲۱۴ھ اور اس کو ڈاکٹر گلکرسٹ کی خدمت میں بطور اپنی قابلیت کے نمونہ کے پیش کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کو بہت پسند کیا۔ اور حیدری کو کالج ڈاکٹر کی ایک منشی گری پر ممتاز کیا حیدری کی اکثر تصانیف ہیں جو زیادہ تر فارسی کتابوں کے تراجم ہیں۔ کتب ذیل زیادہ مشہور ہیں (۱) قصہ یعلیٰ محبوب۔ جو امیر خسرو کی اسی نام کی مثنوی کا اردو ترجمہ ہے یہ غالباً ملازمت کلکتہ سے پیشتر تحریر ہوا تھا (۲) طوطا کہانی یہ محمد قادری کے فارسی طوطی ناکا ترجمہ مصنف ۱۸۰۱ء بحکم ڈاکٹر گلکرسٹ صاحب اصل میں یہ قصہ سنسکرت میں شوکا شپتی کے نام سے تھا فارسی میں اسی نام کی ایک کتابچے باون قصوں پر مشتمل تھی انھیں نے ۱۲۳۰ھ میں لکھی تھی جس سے یہ دوسرا طوطی نامہ پینتیس قصص کا یہ محمد قادری نے ۱۲۹۲ء میں مختصر اور صاف کر کے ترتیب دیا یہ سب قصے، مثل انگریزی کنگ دھتر کے فنانوں کے ہندوستان میں بہت مقبول ہوئے اور ان کے ترجمے مختلف زبانوں میں مختلف اوقات میں ہوئے مثلاً انگریزی میں اسماعیل صاحب نے ۱۸۰۵ء میں کیا۔ بنگلہ میں چند ہی چون سیرام پوری نے ۱۸۰۶ء میں کیا اور طوطا اتھاس نام رکھا ہندی میں بنا پر شادریا نے زبان دکنی میں نظم میں غواصی نے اور شر میں ایک غیر معلوم شخص نے ہندی میں اصل سنسکرت سے بھیرود پر شادریا نے گجراتی نظم میں سالابھٹ نے اور رپٹی میں کسی غیر معلوم شخص نے (۳) آرائش محفل ترجمہ قصہ حاتم طائی اس کو میر شیر علی افسوس کی آرائش محفل سے غلط طبع کرنا چاہیے یہ قصہ سب سے پہلے ۱۸۰۱ء میں کلکتہ میں چھپا تھا اور اس کی زبان نہایت سلیس سہل اور دلچسپ ہے اس کا ترجمہ بھی بنگلہ ہندی اور گجراتی میں ہو گیا ہے (۴) تاریخ نادری ترجمہ نامہ منشی مرزا مہدی مرتبہ ۱۲۲۲ھ (۵) گل مغفر جس کو انھیں کے گلشن شہیداں کا خلاصہ سمجھنا چاہیے جو ملا حسین واعظ کاشفی کے روحۃ الشہدا کا ترجمہ ہے اس کا دوسرا نام وہ مجلس بھی ہے۔ یہ تصنیف ۱۸۱۲ء اور مقام طباعت کلکتہ ہے

اس کا ترجمہ زبان فرانسیسی میں بھی ہو گیا ہو (۶) گلزار دانش شیخ عنایت اللہ کی بہار دانش کا
اُردو ترجمہ جس میں عورتوں کے مکر و کید کے قصے درج ہیں (۷) ہفت پیکر نظامی کی مشہور
مثنوی ہفت پیکر کا جواب مصنف ۱۱۰۷ھ (۸) ان کے علاوہ چند مرثیاتی ایک دیوان غزلیات
اور مجموعہ صد حکایات بھی ان کی تصانیف سے ہیں۔ حیدری کا انتقال ۱۱۰۲ھ میں ہوا جیسا
کہ ڈاکٹر اسپرنگر نے فرست کتب ادو میں ذکر کیا ہے۔

مرزا کاظم علی جوہر اصل میں دلی کے باشندے تھے مگر لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی تھی جہاں
۱۱۰۷ھ میں وہ موجود تھے ان کا ذکر نواب علی ابراہیم خاں نے اپنے تذکرہ گلزار ابراہیم میں کیا ہے
جن کے پاس دینار میں انہوں نے اپنا کچھ کلام نمونہ بھیجا تھا ۱۱۰۷ھ میں کرنل اسکاٹ صاحب
ان کو ملشی گری کی ایک جگہ دے کر لکھنؤ سے کلکتہ روانہ کیا تھا افشی مینی نارائن اپنے تذکرہ جہان میں جو
۱۱۰۷ھ کی تصنیف ہے لکھتے ہیں کہ یہ اُس وقت زندہ تھے بلکہ ۱۱۰۷ھ میں جو شاہ غفور ظہیم
کا کچھ کلکتہ میں ہوئے تھے اُس میں بھی یہ موجود پائے جاتے ہیں۔ کتب ذیل ان کی طرف منسوب ہیں۔

(۱) کالیدس کی مشہور کتاب شکنتلا نائک کا اُردو ترجمہ جس کے دیباچہ میں بطور تہنیک وہ لکھتے ہیں
کہ کالیدس کی اصل کتاب کا ترجمہ برج بھاشا میں ۱۱۰۷ھ میں ایک شاعر نواز کبیشہ نامی نے مسلخاں پر
خدائی خاں پیرا لار شہنشاہ فرخ سیر کے حکم سے کیا تھا اور ڈاکٹر گلکرسٹ کی فرمائش سے یہ ترجمہ
برج بھاشا سے بڑیاں اُردو ۱۱۰۷ھ میں کیا گیا اور اس پر نظر ثانی لالال جی کبیشہ کی اور کلکتہ میں
۱۱۰۷ھ میں طبع ہوا (۲) قرآن شریف کا ایک اُردو ترجمہ حسب فرمائش گلکرسٹ صاحب (۳)
ترجمہ تاریخ فرشتہ متعلقہ خاندان بہمنی (۴) سنگھاسن بتیسی جس کی تصنیف میں لالال جی بھی شریک تھے
(۵) باواسیر یا دستور ہند مطبوعہ کلکتہ ۱۱۰۷ھ میں ہندوستان کی مختلف فصول اور رسوم و ریتوں
اور ریلانوں کے ہمارے دل کا ذکر ہے۔ یہ کتاب بعد ترجمہ شکنتلا نائک کے تحریر ہوئی۔

جوہر نے "خود افروز" (جس کا حال آگے آتا ہے) اور میر و سودا کے کلام کے کچھ منتخب بھی
شائع کیے تھے ان کے دو بیٹے عیاں اور ممتاز بھی کسی قدر مشہور ہوئے۔

نہال چند لاہوری | دلی میں پیدا ہوئے مگر چونکہ لاہور میں زیادہ رہے اس وجہ سے لاہوری کے لقب سے مشہور ہیں۔ ۱۲۰۰ھ میں کلکتہ گئے تھے۔ ان کے کچھ مزید حالات معلوم نہیں ہوئے اس کے جیسا کہ اپنی کتاب مذہب عشق کے دیباچہ میں وہ خود لکھتے ہیں کہ پکتان ولورٹ نے ڈاکٹر گلگرسٹ سے ان کا تعارف کرایا جن کی فرمائش سے انہوں نے فقہ تاج الملوک اور بکاؤنی کا ترجمہ فارسی سے اردو میں کیا۔ ان کی تصانیف حسب ذیل ہیں (۱) مذکورہ بالا مذہب عشق (جو تاریخی نام ہے) معروف بہ قصہ گل بکاؤلی جو شیخ عزت اللہ بنگالی کے اسی نام کے فارسی قصہ مصنف ۱۱۲۲ھ کا اردو ترجمہ ہے۔ ایک دوسرا اردو منظوم ترجمہ اسی قصہ کا کسی شخص ریکوان نامی نے ۱۲۰۰ھ میں کیا ہے جس میں چالیس باب ہیں جو گلگشت کے نام سے موسوم ہیں نیز ایک اردو مثنوی موسوم بہ فقہ المیاس اسی قصہ کی بہت قدیم موجود ہے یہ نام تاریخی ہے جس سے ۱۲۰۵ھ تکٹے ہیں۔ اور اس سے بھی ایک قدیم تر نسخہ کا پتہ چلتا ہے جو زبان دکنی میں ہے جس کا نہ تصنیف ۱۲۰۵ھ ہے مگر ان سے زیادہ مشہور مثنوی گلزار نسیم ہے جس کا نہ تصنیف ۱۲۰۵ھ ہے۔ مذہب عشق کا نہ تصنیف ان تاریخوں سے جو کتاب کے آخر میں دی ہوئی ہیں ۱۲۰۱ھ اور ۱۸۴۳ھ عیسوی نکلتا ہے۔

مظہر علی خاں والا۔ | مرزا لطف علی احمد دہلوی یہ مظہر علی خاں متخلص بہ: آلیہان علی خاں داد کے بیٹے دلی کے رہنے والے تھے مرزا جان پیش اور مصحفی کے شاگرد تھے۔ گلشن بیخار میں میر نظام الدین مخون کو بھی ان کا استاد لکھا ہے یہ بھی کلکتہ کے کالج میں منشی تھے اور اکثر تراجم انکی طرہ منسوب ہیں مثلاً (۱) پند نامہ سعدی کا اردو ترجمہ منظوم مصنف ۱۲۰۰ھ (۲) ناصر علی خاں بلگرامی واسطی کی محبت گلشن کا ترجمہ جو اخلاق و موعظا کی ایک کتاب ہے اور سات بابوں پر مشتمل ہے جو تاریخیں اس کے آخر میں دی ہوئی ہیں ان سے نہ تصنیف ۱۲۰۰ھ نکلتا ہے۔ اس میں اخلاقی حکایتیں آداب گفتگو بزرگوں کی اطاعت و فرمانبرداری اور چند احادیث نبوی و اقوال حضرت علی رضی اللہ عنہ درج ہیں (۳) قصہ نعل و کام کندلا جو سوتلی رام کیشور کی برج بھاشا کا اردو ترجمہ ہے نہ تصنیف ۱۲۰۰ھ (۴) صورت کیشور کی بتیال کیشوری بھاشا کا اردو ترجمہ جو لکھنؤ لال جی کی شرکت میں کیا گیا و جو تسمیہ یہ کہ کہیں قصے کسی بتیال و بھوت نے

راجہ بکراجیت کے سامنے کہ تھے یہ ہندوستانی پہلک میں بہت مقبول ہے مگر اس میں کوئی ادبی ندرت نہیں ہے (۵۱) فلدسی تارک شمشیر شامی کا ترجمہ جو بعد کو انگریزی میں بھی ہو گیا ہے (۵۲) ایک دیوان ریختہ تقریباً سڑھے تین سو صفحات کا جس میں غزلیات قصائد رباعیات وغیرہ سو انگریزی مصنف کے ہیں اس کا ایک نسخہ خود مصنف نے بطور یادگار کے فورت لیمر کالج کو سنہ ۱۸۷۷ء میں دیا تھا۔

حفیظ الدین احمد انھوں نے خرد افروز کے نام سے سنہ ۱۸۷۷ء میں ابو الفضل کی عیار دانش کا اردو ترجمہ کیا اور عیار دانش خود ملا حسین واعظ کاشفی کی انوار سیلی کی تلخیص اور انوار سیلی کلید دمنہ عربی کا ترجمہ جو جو سفکرت سے ماخوذ ہے۔ انھیں قصوں کا ایک نام تمام ترجمہ انوار سیلی سے ایک شخص مرزا امجدی نامی نے کیا تھا جو کپتان ناکس کے منشی تھے اور ان کے ساتھ کلکتہ اور گیا گئے تھے کپتان ناکس نے گیا میں ایک مشہور داستان گوہینگا خاں نامی سے بھی اسی کتاب کا ترجمہ کرایا تھا اور ان دونوں کا مقابلہ کر کے مرزا امجدی کے ترجمہ کو ترجیح دی تھی۔ انوار سیلی کا ایک ترجمہ دکنی زبان میں بھی موجود ہے جو ایک شخص سیدی محمد ابراہیم بھاپوری کی تصنیف ہے اور مدراں میں سنہ ۱۸۷۷ء میں چھپا ہے۔ بستان حکمت فقیر محمد خاں گویا کی بھی اسی کا ترجمہ ہے اور یہی سب سے بہتر ہے۔ نواب میر علی خاں واسطی نے سنہ ۱۸۷۷ء میں ایک مختصر ترجمہ ستارہ ہند کے نام سے کیا تھا اور ایک منظوم ترجمہ موسوم بہ "ارژنگ راضی" بہاری لال بھرت پوری نے سنہ ۱۸۷۷ء میں کیا تھا۔

موسیٰ اکرام علی انھوں نے عربی کی مشہور و معروف اخلاقی کتاب اخوان الصفا کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اصل کتاب کے خاتمہ پر کشف الظنون کا حوالہ دیکر یہ لکھا ہے کہ رسائل اخوان الصفا کو جو تعداد میں اکاؤن میں شواخص ذیل نے تحریر کیا۔ محمد بن نصر بن ابی معروف بقدسی ابو الحسن علی بن ہارون الزنگانی ابو احمد النرجوری عوفی۔ زبید بن رفاعہ اور یہ سب کے سب حکیم تھے۔ اس پوری کتاب کا ترجمہ انگریزی میں ڈاکٹر ڈیٹرس نے سنہ ۱۸۵۷ء لغایت ۱۸۷۹ء میں کیا مولوی صاحب موصوف نے اردو میں صرف اس قدر حصہ کا ترجمہ کیا ہے جس میں کہ حیوانات اور انسان کی برتری کا سوال شاہ جن کے سامنے پیش کیا گیا ہے مختصر نمونہ یہ کہ جانور اپنے ملک انسان کے ظلم و تعدی سے عاجز آگئے ہیں اور انھوں نے اپنا یہ مزانہ

بادشاہ اجنہ کے پاس جس کا نام تہوراسب ہے پیش کیا ہے اس مقدمہ کے فیصلہ کا ایک دن مقرر کیا گیا ہے جس میں سب جاوڑ جمع ہوئے ہیں اور ہر ایک اپنے اپنے فضائل و فوائد اور یہ کہ وہ انسان کو کیا نفع پہنچاتا ہے اور انسان اُس کے ساتھ کیا بدسلوکی کرتا ہے بیان کرتا ہے چنانچہ گھوڑے گدھے اونٹ اور بھینری کے بیان کے بعد دیگرے لیے جاتے ہیں جو سب سے پہلے ہی دھپ ہیں جیسے کہ گنگرہی کی مشہور انگریزی کتاب انونگر ایٹ ہوم۔ یہ ترجمہ کپتان ٹیلر صاحب کی فرمائش سے نہایت سلیس اور آسان اردو میں کیا گیا اور سلسلہ میں شائع ہوا کپتان لاکرٹ کی سفارش سے جو اُس وقت فورٹ ولیم کالج کے افسر اعلیٰ تھے مولوی اکرام علی ^{۱۸۱۵ء} میں محافظ دفتر مقرر ہوئے تھے۔

لؤلؤ لالہ جی یہ گجراتی برہمن تھے مگر شمالی ہند میں سکونت گزیر ہو گئے تھے۔ باوصف اسکے کہ ہندو تھے مگر اردو کے بھی بڑے ماہر تھے چنانچہ "شکنتلاناک" "تنگھاسن متیسی" "تیتان بھیمی" اور قصہ بادھول کی تصنیف میں انھوں نے اصل مصنفوں کو بہت مدد دی تھی جس کا حال ادیب بیان ہوا۔ علاوہ اس کے ^{۱۸۱۵ء} میں انھوں نے ایک کتاب "بان ہندی" میں لطیف حکایات کی تصنیف کی جو "لطائف ہندی" کے نام سے مشہور ہے۔

بینی نرائن | بینی نرائن متخلص بہ جہان دیوان جہاں کے مصنف ہیں جس میں ایک تذکرہ ہندوستانی شعرا کا بھی شامل ہے جو کپتان روہد صاحب سکریٹری فورٹ ولیم کالج کی فرمائش سے ^{۱۸۱۵ء} میں لکھا گیا اور انھیں کے نام پر مضمون بھی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ایک فارسی قصہ کا ترجمہ "چار گلشن" کے نام سے کیا جس میں بادشاہ کیوان اور فرخندہ کے حالات درج ہیں۔ یہ قصہ ^{۱۸۱۵ء} میں منشی امام بخش کے ایک صاحب سے تیار کیا گیا اور کپتان ٹیلر صاحب کے سامنے پیش کیا گیا جنھوں نے اس کو پسند کر کے مصنف کو انعام سے سرفراز کیا اور اُس کی اصل کتب خانہ کالج میں داخل کرادی۔ نگار سن ویٹا اسی کی تحقیق ہے کہ انھوں نے شاہ رفیع الدین صاحب کی تنبیہ الغافلین کا بھی ترجمہ اردو میں ^{۱۸۲۹ء} میں کیا۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ بینی نرائن مسلمان ہو گئے تھے اور مولانا سید احمد صاحب بریلوی سے بیعت بھی کر لی تھی۔

مرزا علی لطف | کاظم بیگ خاں کے بیٹے تھے جو استر آباد کے رہنے والے تھے اور ^{۱۸۱۵ء} میں نادر شاہ کی ہمرہی میں آئے تھے اور بعد کو ابو المنصور خاں صفدر جنگ کی وساطت سے دربار شاہی دہلی میں داخل ہو گئے

لطف فارسی میں بھی شریکت تھے اور اپنے باپ کے شاگرد تھے جن کا تخلص مجرب یا مجری تھا اور دہشامری
 کی نسبت لطف کا خود بیان ہے کہ میں کسی کا شاگرد نہیں ہوں دکن حید آباد کے سفر کے ارادے سے نکلے
 تھے کہ ڈاکٹر گلکرسٹ نے ان کو روک لیا۔ اور ان کا مشہور تذکرہ گلشن ہند ان سے لکھوایا چنانچہ اس
 قصہ کا ذکر انھوں نے اپنے تذکرہ کے دیباچہ میں کیا ہے۔ اس کا تصنیف ۱۲۸۵ھ اور ماخذ نواب
 علی ابراہیم خاں کا تذکرہ گلزار ابراہیم ہے گو کہ اس میں بہت کچھ اضافہ کیا گیا ہے۔ یہ تذکرہ بالکل نیا
 تھا جب حید آباد میں طرفان عظیم آیا تو اس کی ایک جلد مولوی ندی میں بہتی ہوئی جا رہی تھی اتفاقاً وہ کسی
 قدر ان کے ہاتھ آئی اور اب وہ ایک نہایت نفیس مفید اور دلچسپ مقدمہ کے ساتھ مولوی عبدالحق صاحب کٹری
 انجمن ترقی اردو کے اہتمام سے شائع ہو گیا ہے۔ یہ تذکرہ نہایت دلچسپ ہے اس وجہ سے کہ اس زمانہ
 کا طرز تحریر اس وقت کے مشہور شاعروں کے دلچسپ حالات جن سے کہ مصنف سے ملاقات ہوئی
 اور اس وقت کی سوسائٹی کے مرتعے اس میں موجود ہیں ہر چیز کے صحت واقعات کے لحاظ سے بہت
 زیادہ قابلِ ثناء نہیں اور عبارت بھی ضرورت سے زیادہ پر تکلف و پرستش مستعجب و مقفی ہے۔
 مولوی امانت اشرا ان کا تخلص شیدا تھا انھوں نے اخلاق جلالی کا ترجمہ جامع الاخلاق کے نام سے
 کپتان جمیس مونٹ صاحب کے حکم سے ۱۲۸۵ھ میں کیا۔ دیباچہ میں کپتان مذکور کو اور نیز گورنر جنرل
 مارکوئس آف دلزلی کی نہایت مبالغہ آمیز الفاظ میں تعریف ہے۔ مولوی امانت اشرا نے ۱۲۸۵ھ میں
 کتاب ہدایت الاسلام بزبان عربی و اردو تحریر کی جس کا ترجمہ خود گلکرسٹ صاحب نے انگریزی میں
 کیا۔ ۱۲۸۵ھ میں انھوں نے ایک منظوم صرف و نحو اردو موسم بہ "صرف اردو" تصنیف کی۔
 اس عہد کے دیگر منشی اور منتظر علاوہ ان لوگوں کے جن کا ذکر اوپر ہوا اس عہد کے بعض دیگر منشی منتظر
 یہ تھے۔ سید جعفر علی روان لکھنوی، افتخار الدین شہرت، عبدالحکیم خاں کریم دہلوی، مرزا ہاشم علی عیان،
 مرزا قاسم علی ممتاز، میر عبد اللہ مسکین، مرزا جان طیش، مولوی خلیل علی خاں اشک اور مرزا محمد فطرت اشک
 ۱۲۹۰ھ میں اکبر نامہ کا ترجمہ واقعات اکبر کے نام سے تیار کیا مگر وہ شائع نہیں ہوا طیش نے
 ایک کتاب بعد و محاورات پر لکھی اور ۱۲۸۵ھ میں ایک طویل مثنوی بہار و انش کے نام سے لکھی۔ ان کلیات

نوٹ ولیم کالج کی طرف سے شائع ہو گیا ہے۔

ترجمہ قرآن شریف از مولانا شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی مشہور محدث و صوفی اٹھارویں
شاہ عبدالعزیز شاہ عبدالقادر شاہ رفیع الدین ج صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے شروع میں ہوئے ہیں ان کے
متعدد تصانیف ہیں جن میں حجتہ اللہ البالغہ اور زلالت الخفا عن سیرۃ الخلفائین ہدایت مشہور و ممتاز ہیں ان کے
بڑے صاحبزادہ مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب بھی علم و فضل اور زہد و تقویٰ میں لے والد بزرگوار سے
کم نہ تھے ان کا انتقال ۱۲۲۹ھ میں ہوا۔ دوسرے صاحبزادے مولانا شاہ رفیع الدین ۱۱۶۳ھ بھی
ہدایت جید عالم تھے جنہوں نے سب سے بڑا کام یہ کیا کہ قرآن شریف کا سب سے پہلا اردو ترجمہ کیا تیسرے
صاحبزادے مولانا شاہ عبدالقادر تھے (۱۲۱۱ھ) جو اپنے علم و فضل اور کلمات ظاہری و باطنی
کے واسطے مثل اپنے پدر بزرگوار اور برادران محترم کے مشہور تھے۔ انھوں نے ۱۲۰۵ھ میں ایک دوسرا اردو
ترجمہ قرآن شریف کا کیا اور ایک تفسیر موضع القرآن کے نام سے تصنیف کی۔ ان کا ترجمہ ہدایت سلیس
سادہ اور باہموارہ اردو میں ہے جس سے ان کا ترجمہ علی بدرجہ اتم ظاہر ہے۔ یہ ترجمہ استفادہ مقبول ہوا اور اب تک
ہے کہ مولوی نذیر احمد صاحب اپنے ترجمہ قرآن شریف میں انکی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ شاہ صاحب کا
پورا خاندان اس علمی خدمت کے واسطے مشہور ہے اور حق یہ ہے کہ یہ حضرات مترجمین متاخرین کے واسطے کچھ نہیں
چھوڑ گئے کیونکہ ان لوگوں کے تراجم اصل میں قرآن شریف کے تراجم نہیں ہیں بلکہ خاندان شاہ ولی اللہ کے
تراجم کے تراجم ہیں۔ ہمارے نزدیک شاہ رفیع الدین صاحب اور شاہ عبدالقادر صاحب کے ترجمے فی الحقیقت
اس تفسیر عظیم کا پتہ دیتے ہیں جو زبان اردو میں ہونے والا تھا جبکہ فلسفی کا اخطاط ہو رہا تھا۔

مولوی محمد اسماعیل دہلوی | مولوی عبدالغنی کے بیٹے اور شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کے پوتے
تھے۔ ذہانت اور رسائی فکر میں یگانہ روزگار اور اپنے عہد کے بہت بڑے عالم باعمل تھے۔
سید احمد مجاہد بریلوی کے ہمراہ جہاد کی نیت سے نکلے مگر قلعہ بالا کوٹ ملک پنجاب کے قریب غزنی
شہادت سے سیراب ہوئے یہ واقعہ ۱۲۴۳ھ کا ہے۔ شاہ نصیر نے اس واقعہ کو مذاق کے طور پر
ایک قصیدہ کی صورت میں لکھا تھا جس کے دو شعر یہ ہیں۔

کلام اللہ کی صورت ہوا دل ان کا سپارہ	نہ یاد آئی حدیث ان کو نہ کوئی نص قرآنی
ہرن کی طرح میدان و غامیں چڑھ کر ہی ٹھہری	اگرچہ تھے دم شملہ سے دہریشستانی

جب اس قسم کے طنز آمیز اشعار ان کے مریدوں نے سنے تو وہ شاہ نصیر کے کلن پر پڑھ دوڑے اور ان کی خوب خبر لینا چاہی۔ مرزا خانی کو تو الیٰ شہر کو جب اس کی خبر ہوئی تو وہ موقع داردات پر پہنچے اور شاہ صاحب کو ان لوگوں سے پھر پایا۔ مولانا نے موصوف کی مشہور تصانیف حسب ذیل ہیں:۔ رسالہ توحید۔ صراط مستقیم۔ تنزیل العینین۔ تقویۃ الایمان وغیرہ۔

ترتیب صرف دُخو | کتب درسیہ اور تراجم کے علاوہ ترتیب صرف دُخو و تراجم کے اور کبھی پوری توجہ بذول کی گئی۔ کتب مذکورہ ذیل ان یورپین اصحاب کی تصنیف و تالیف ہیں

دلالت اردو | جسکو زبان اردو کی ترقی سے بہت دیکھی تھی۔ سب سے پہلی ہندوستانی گرامر وہ جو ۱۵۰۰ء بھارتیہ کی تصنیف کی تھی جو زبانہ شاہ عالم دہلوی اور شاہ عینی ۱۷۰۰ء میں مملکت ہالینڈ کی طرف سے ہندوستان میں سفیر تھے۔ انھوں نے اگرچہ لاہور دہلی وغیرہ کی بھی سیر کی تھی اور ۱۷۰۰ء میں اپنے ملک کی طرف سے ایران میں بھی سفیر ہوئے تھے، انھوں نے ہندوستانی زبان کی ایک لغت تیار کی جس کو ایک انگریز ڈیوڈل نے ۱۷۰۰ء میں شائع کیا کیٹیلر نے ذکر کیا کہ اگر میں نہ صرف ہندوستانی افعال کی گردانیں ہیں بلکہ احکام عشرہ تواریات اور لارڈس پر ستر کا ترجمہ بھی اردو میں کیا جو ۱۷۰۰ء میں ایک مشہور جرمن پادری شاز نامی نے ایک دوسری ہندوستانی گرامر موسوم بہ گرافیکا ہندوستانی کا زبان لاطینی میں تیار کی جس میں ہندوستانی الفاظ خط عربی و فارسی مع خط انگریزی کے تحریر کیے۔ اسی سن میں مل نے ہندوستانی حروف تہجی اور کچھ ہندوستانی الفاظ کے اور ایک رسالہ لکھا ۱۷۰۰ء میں بھی اسی مضمون کی ایک کتاب جی ای فریز نے تصنیف کی جس میں ہندوستانی حروف تہجی کا دوسرے مالک کے حروف مقابلہ کیا گیا ہے۔ اور ۱۷۰۰ء میں اسی قسم کی ایک تیسری کتاب اتالوی پادری کیسا نو بیلی گاٹی نے تصنیف کی جس کا شاہ مرزا خانی الہامی (مترجم) کے واسطے جن کی تشریف میں اسی تصنیف میں بطور شکر کے شاہ صاحب نے پیش کر دیا ہے۔ فیصلہ دین یہاں وہ تہ طوس کا لیتا ہے نہ ہوتے شتمہ دہلی آریاں مرزا خانی۔ (دیکھو آب حیات و کر شاہ نصیر)۔

نام "الفائیٹم برہانکم" رکھا اس کتاب کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہندوستانی حروف اپنی خاص شکل میں ٹائپ میں لکھے گئے۔ ۱۸۷۱ء میں ہیڈلی کی گرامر اور ۱۸۷۲ء میں زبان پرنگالی میں ایک ہندوستانی گرامر موسوم بہ "گریفیکانڈٹانا" چھپیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر گلکرسٹ کی تصانیف کا زمانہ آتا ہے جنہوں نے نہایت شوق اور تلاش سے متعدد رسائل گرامر اور لغات اور فرہنگیں اور تحقیقات زبان کے متعلق دوسری کتابیں تصنیف کیں اور چھپوائیں ان کی مدت تصنیف بیس برس ہے اور ۱۸۷۱ء سے شروع ہوتی ہے۔ انہوں نے تقریباً پندرہ کتابیں متعلق بہ صرف و نحو و علم الاسماء و لغات و تراجم و المثال وغیرہ تصنیف کیں۔ اکثر ہندوستانی منشی اور پرنٹرز جو فورٹ ولیم کالج میں ملازم تھے ان کے ساتھ بھی یہ شریک تصنیف ہے اس کے علاوہ ان کی نگرانی میں متعدد عمدہ عمدہ ادبی کتابیں تیار ہوئیں مختصر یہ کہ اس عہد کی تصنیفات و تالیفات کے وہ روح رواں تھے اور علاوہ علمی قابلیت استعداد کے ایسے خلیق متواضع اور بہادر واقع ہوئے تھے کہ مختلف اقطاع ملک سے قابل قابل درگ انکی قدردانی کا شہر سن کر ان کے پاس جمع ہو گئے تھے۔ ان کی سب سے زیادہ مشہور تصنیف ایک انگریزی ہندوستانی ڈکشنری مطبوعہ ۱۸۷۱ء اور ایک ہندوستانی گرامر مطبوعہ ۱۸۷۲ء ہیں۔ اسی طرح کپتان ٹیلر اور ڈاکٹر ہنٹ نے بھی ایک ہندوستانی انگریزی ڈکشنری ۱۸۷۱ء میں اور مولوی الامت اللہ نے ایک مختصر ہندوستانی صرف و نحو منظوم موسوم بہ صرف و اردو ۱۸۷۱ء میں تصنیف کیں۔ جہاں شیکسپیر کی ہندوستانی گرامر ۱۸۷۳ء میں اور ہندوستانی انگریزی ڈکشنری ۱۸۷۱ء میں شائع ہوئیں کپتان پرائس اور ٹیمپس نے بھی ہندوستانی کتابیں لکھیں گا رس ڈیٹا سی مشہور مشرق و غربت زبان اردو کے متعلق متعدد کتابیں زبان فرانسیسی میں تصنیف کیں اور ڈنکن فاربرس نے اپنی متعدد تصانیف سے جواز قسم گرامر اور لغت ہیں اور نیز اردو کی قدیم کتابوں کو ایڈٹ کر کے زبان اردو کو محض احسان کیا۔ سر ولیم مائیر بانی ایشیاٹک سوسائٹی بنگال اور ڈاکٹر فیلن نے بھی نہایت مفید کتابیں بصورت گرامر اور لغت تصنیف کیں پلیٹ کی گرامر ۱۸۷۲ء میں اور ڈکشنری ۱۸۷۳ء میں اور پادری کریون صاحب کی مختصر ڈکشنری ۱۸۷۴ء میں چھپ کر نکلیں اور یہ سب کتابیں طلباء کے لیے نہایت مفید سمجھی جاتی ہیں۔

ہندوستانیوں کے مرتب کردہ
لغات و دیگر کتب

اب دیکھنا چاہیے کہ خود ہندوستانیوں نے اپنی زبان کی ترقی و تہذیب
میں کیا حصہ لیا۔ انشا اور قلیل کی متحدہ تصنیف "دریائے لطافت"

جس کو زبان اردو کی سب سے زیادہ مشہور اور قدیم صرف و نحو کی کتاب سمجھنا چاہیے ۱۸۰۲ء میں تحریر اور
۱۸۰۴ء میں بمقام مرشد آباد پہلی بار شائع ہوئی منشی محمد ابراہیم نے ایک اردو کی صرف و نحو معروف بہ
تحفہ الفتن ۱۸۰۲ء میں لکھی مولوی احمد علی دہلوی کا رسالہ "پیشہ فیض" اردو کی صرف و نحو پر ۱۸۰۵ء اور
مولوی امام بخش صہبائی کا ترجمہ حقائق البلاغت ۱۸۰۷ء اور منشی کریم الدین کی قواعد العربیہ کی شاعری ایک
فیض اللہ خاں اور محمد حسن کے رسالجات صرف و نحو مولوی محمد حسین آزاد کی کتاب جامع القواعد مطبوعہ
لاہور ۱۸۰۷ء جلال کی گلشن فیض مطبوعہ لکھنؤ ۱۸۰۷ء جو ایک اردو ہندی الفاظ و محاورات کی تحقیق
کی لغت ہے۔ یہ سب اسی زمانے کی تصنیفات ہیں۔ زمانہ حال کی تصانیف میں منشی امیر محمد صاحب کی مشہور
لغت میر اللغات (جو افسوس ہے کہ ناتمام ہے) مولوی سید احمد دہلوی کی فرہنگ آصفیہ چار جلدوں میں
سالہا سال کی کاوش و محنت کا بہت اچھا نتیجہ اور حضور نظام کی سرپرستی اور دریادلی کا ایک بہترین
نمونہ ہے۔ اور مولوی نور الحسن صاحب تیر کا کہ وہی کی نور اللغات قابل ذکر ہیں۔ انجن ترقی اردو نے
ایک مختصر رسالہ صرف و نحو ایک نئے طریقے سے ترتیب دیا ہے مگر ہماری ناچیز رائے میں باوجود ان تمام
کتب کے جن میں سے اکثر فی زمانہ موجود ہیں پھر بھی ایک مکمل سائنٹفک اردو گرامر کی اب بھی سخت ضرورت
ہے نیز یہ کہ اگر اس زمانے کے فضلا کرمیت باندھ لیں اور امیر اللغات کی باقی جلدیں پوری کر دیں اور
کوئی دریادل رئیس اس کی طباعت کا اہتمام کر دے تو اس میں شک نہیں کہ اس کتاب کی گہل
سے زبان اردو کی نہایت معضل اور عمدہ خدمت سرانجام پائے گی۔

عیسائی پادریوں کے کارنامے
زبان اردو کی ترقی و تہذیب میں

سب سے قدیم اردو ترجمے بائبل کے وہ ہیں جو جن شلز اور کالبرگ نے ۱۷۰۷ء
تاریخ ۱۷۰۷ء میں کیے مرزا محمد فطرت اور دیگر کتب کے مشہور ترجمہ محمد جلیل
کا ترجمہ اردو میں کیا جو بنظر ثانی ڈاکٹر منٹھن ۱۸۰۷ء میں کلکتہ سے شائع ہوا۔ اسی طرح سلیم پور کے
پادریوں نے بھی بائبل کے ترجمے اردو ہندی میں نکالے پادری مارٹن نے ۱۸۰۷ء میں عہد جدید کا ترجمہ

زبان یونانی سے اردو میں کیا جس پر مرزا محمد فطرت نے نظر ثانی کی۔ پوری بائبل کا ترجمہ سیرم پور کے پادریوں نے پانچ جلدوں میں سترہ سالہ عرصہ میں شائع کیا۔ پادری لوگ اپنے مطالب عوام الناس پر دلنشین کرنے کے واسطے انھیں کی زبان میں اپنی تقریریں اور تقریریں کرتے تھے اور اشاعت دین کی غرض سے متعدد رسالے، پمفلٹ اور اخبار وغیرہ نکالتے تھے جن میں مذہبی روایتوں اور گیتوں کے علاوہ بہت سی مفید چیزیں بھی شامل ہوتی تھیں جن سے زبان کو بہت وسعت اور ترقی حاصل ہوئی

باب ۱۶

نثر اردو کا دور متوسط اور دور جدید

مطبوعات لکھنؤ ہر چند کہ نثر اردو کی ابتداء فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے ہوئی تھی مگر لکھنؤ بھی جو دہلی کی تبدیلی کے بعد علم و ادب اور شعرو سخن کا مرکز بن گیا تھا۔ نثر نگاری میں فورٹ ولیم کالج سے کچھ کم نہ رہا۔ کتب ذیل سب اسی اشرف البلاد کی طباعت کی یادگار ہیں۔ **بتان حکمت**، **کلیلہ دمنہ**، **گل بکاوی**، **گلشن نوبہار**، **گل و صنوبر**، **نور تن مصنف محمد بخش مجور شاگرد جرات وغیرہ**۔ **نواب فقیر محمد خاں لکھنؤ** کے ایک مورخ ہیں اور فوج شاہی کے ایک مشہور سالار **بتان حکمت** تھے **حسام الدولہ** خطاب اور گویا تخلص کرتے تھے۔ **ناسخ** کے شاگرد تھے مگر خواجہ نوید

سے بھی اصلاح لیتے تھے۔ صاحب دیوان ہیں گو کہ دیوان ان کے مرنے کے ایک عرصہ کے بعد مطبع منشی نوکشور لکھنؤ میں چھپا گویا کا انتقال ۱۲۶۶ھ مطابق ۱۸۵۰ء میں ہوا۔ انکی تصنیف **بتان حکمت** انوار سیلی کا مشہور ترجمہ ہے جو ۱۲۷۰ھ میں ختم ہوا اور شیخ ناسخ نے تاریخ کمی جس کا صرح تاریخ یہ ہے مع خبر گفت **بتان سیراب حکمت** بہت تالیف اس کا مصنف یوں بیان کرتے ہیں ایک دن ۱۵۰۰ اور خواجہ نوید اور سیاں فتح شاہ کو یہ دونوں شیخ ناسخ کے شاگرد تھے اور چند احباب کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے اور انوار سیلی کا ذکر ہوا تھا اور سب لوگ اسکی تعریفیں کر رہے تھے کہ اثنائے گفتگو میں سب اہل محفل نے

مصنف سے ہزار کیا کہ اکثر زبانوں میں اس کتاب ترجمہ ہو چکا ہے اگر تم اردو میں ترجمہ کرو تو خوب چیز ہو غرض کہ ان لوگوں کے ہزار پر مصنف کی کرمیت باندھی اور ترجمہ شروع کر کے انجام کو پہنچایا۔ اگر کتاب کو بالائے کتاب پڑھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ترجمہ لفظی نہیں بلکہ معنی موقع پر ایجاز و اطباء کو دخل دیا ہے البتہ عربی فارسی الفاظ کثرت ہیں اور زبان بھی شگفتہ اور سلیس نہیں۔ عربی الفاظ اور امثال کثرت استعمال کیے گئے ہیں جس سے کہیں کہیں عبارت بے مزہ اور غلط ہو گئی ہے۔ مگر یہ بات قابل توجہ ہے کہ عبارت مقفی اور مستقیم نہیں کیا کہ سرور کی فسانہ عجائب کی ہے مختصر یہ کہ یہ کتاب یک زمانہ میں مقبول تھی مگر اب لوگ اس کو کم پڑھتے ہیں۔

مرزا حبیب علی بیگ سرور | لکھنؤ کے سب سے قدیم اور مشہور شاعر مرزا حبیب علی بیگ سرور ایک جامع الکمالات
شخص تھا یا پکا نام مرزا صغر علی بیگ تھا ۱۲۸۵ھ یا ۱۲۸۶ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے
سنہ ۱۲۸۳ھ

اور وہیں نشوونما اور تعلیم پائی۔ عربی و فارسی میں اچھا دخل رکھتے تھے اور اپنے زمانے کے مشہور خطاطوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ اس فن میں حافظ ابراہیم کے شاگرد تھے جن کا ذکر فسانہ عجائب میں موجود ہے موسیقی سے بھی علمی اور عملی دونوں طور پر بخوبی واقف تھے فن شعر میں آغا نواز شکیلید میر سوز کے شاگرد تھے جن کا ذکر اپنی کتاب میں بہت محبت و ادب سے کرتے ہیں۔ حریف ظریف ہشاش بشاش و حیرہ اور خوشنود آدمی تھے۔ ان کے دوستوں میں شرف الدین میر بھی اور مرزا غالب بھی تھے اور آخر الذکر نے فسانہ عجائب اور گلزار سرور پر فاضلانہ تقریریں بھی لکھی ہیں۔

سنہ ۱۲۸۵ھ میں سرور کا پور گئے اور کہا جاتا ہے کہ غازی الدین حیدر کے حکم سے لکھنؤ سے جلاوطن کر دیے گئے تھے۔ وہ کانپور سے نہایت بیزار ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ ربیع الثانی کے مہینے میں سہ ماہی نبوی صلیم بارہ سو چالیس تھے آنے کا اتفاق مجبوراً گورہ کانپور میں ہوا بلکہ یہ سب تو بوجہ دلچر ہے اشرف یہاں عنقا صفت ناپید ہیں۔ اسیانہ جوہوں کے تو گوشہ نشین عزت گزین مگر چھوٹی امت کی بڑی کثرت دیکھی یہ طور دیکھ کر دل و حش منزل سخت گھبرا گیا کچھ منہ کو آیا قریب تھا کہ جنون ہو جائے تیر کجی و زیا پیش لائے اس کے بعد کہتے ہیں کہ ہمیں کانپور میں حکیم سید اسد علی صاحب ملاقات ہو گئی جو میر سے حال پر بڑی عنایت فرماتے تھے ایک دن ان سے کہا کہ میں ایک قصہ لکھنا چاہتا ہوں سن کر فرمایا

بیکار مباش کہ کیا کر اُس وقت یہ کلر تو سن طبع پر تازیانہ ہوا یعنی باعث تصنیف کتاب بن گیا۔ پھر اسی کے آگے ایک جگہ طنزیہ طور پر لکھتے ہیں کہ میں بھیچر زہوں مجھ کو زبان کا دعویٰ نہیں۔ اگر شاہماں آباد کا رہنے والا ہوتا تو زبان دانی کا دعویٰ کرتا جیسا کہ میرا من نے کیا ہے جن کی نسبت یوں گلفشانی کرتے ہیں اگر وہاں شاہماں آباد میں چندے بود مباش کرتا نصیحوں کو تلاش کرتا تو فصاحت کا دم بھر تاجیسا کہ میرا من نے چار درویش میں بکھیرا کیا ہے کہ ہم لوگوں کے ذہن دھستہ میں یہ بات آئی ہے دلی کے دُٹے میں یاد رکھ کے ہاتھ منہ توڑے ہیں۔ پھر ٹپڑیں سیسی سمجھ رہی خیال انسان کا خام ہوتا ہو مفت میں نیک بننا ہوتا ہو بشر کو دعویٰ کب سزاوار ہو۔ کاطوں کو یہودہ گوئی سے انکار بلکہ ننگ عار ہو مشکافست کہ خود بویہ نہ کہ عطار بگویند مختصر یہ کہ کانپور ہی میں یہ کتاب لکھی گئی۔ اس کے شروع میں چند سطور بادشاہ وقت غازی الدین حیدر کی مدح و ثنائیں شاید اس غرض سے لکھی ہیں کہ ان کا قصو معان کیا جائے اور لکھنؤ آنے کی اجازت دی جائے۔ یہ کتاب غازی الدین حیدر کے زمانے میں شروع ہوئی تھی اور فیض الدین حیدر کے عہد میں تمام ہوئی۔ جن کی تعریف میں سرور نے لکھنؤ کے حالات کے سلسلے میں بہت کچھ لکھا ہے اور آخر میں ایک عافیہ غزل بھی ان کی شان میں ہے جس کا مطلع ہے ۷

تا ابد قائم رہے فرمانروائے لکھنؤ	یہ نصیر الدین حیدر بادشاہ لکھنؤ
----------------------------------	---------------------------------

اسی غزل کے چند مشہور شعر یہ ہیں ۷

یا تو ہم پھرتے تھے اُن میں یا ہوا یہ انقلاب	پھرتے ہیں نکھوں میں ہر دم کو چہ ہائے لکھنؤ
ان کی استغنا سے کیا کیا آرزو کرتی جو رشک	جامِ حرم پر قف نہیں کرتے گدائے لکھنؤ
جن دانش و خوش طعائر کیوں سب محکوم ہوں	ہے سلیمان ان دنوں فرمانروائے لکھنؤ
یہ رہے آبادیار ب تا بہ دورِ شتری	میں کہیں ہوں مانگتا ہوں پوعائے لکھنؤ
بلبلِ شہزاد کو ہے رشکِ ناسخ کا سرور	اصفہاں اُس نے کیے ہیں چمکے لکھنؤ

احساسِ سخت تنقید کا جواب خواجہ غفر الدین حسین صاحب سخن دہلوی مرحوم نے سرورِ سخن میں نہایت

دنداں شکن اور محمول دیا ہے (دعا سرورِ سخن)

سرور کے اکثر اشارے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب لکھنؤ میں نہیں بلکہ کسی اور جگہ تحریر ہوئی ہوگی۔
 اختتام بعد نصیر الدین حیدر لکھنؤ میں آئی اس کا سنہ تصنیف ۱۲۴۲ھ ہے جیسا کہ آخر کے قطعات تاریخ
 سے معلوم ہوتا ہے ۱۲۴۲ھ میں سرور کی بیوی کا انتقال ہوا اور اسی سال سرور واجد علی شاہ کے درباری شاعر
 میں بشاہرہ پچاس روپیہ ماہوار داخل ہوئے۔ اور انھوں نے اپنا مدحیہ قصیدہ حضرت ظل سبحانی کی
 تعریف میں معرفت قطب الدولہ صاحب شاہی پیش کیا۔ ۱۲۴۲ھ میں بادشاہ کے حکم سے کتاب
 شیر خانی کا ترجمہ موسوم بہ سرور سلطانی کیا اور ۱۲۴۲ھ اور ۱۲۴۳ھ کے اثنا میں اکثر چھوٹے چھوٹے
 قصے تصنیف کیے جن میں سے "ایک شرع عشق" ہے جو نواب سکندر بیگم والی بھوپال کے حکم سے لکھا گیا۔
 ۱۲۴۳ھ میں شگوفہ محبت "امجد علی خاں رئیس سندیلہ کی خرابیش سے تحریر ہوا۔ انتزاع سلطنت
 کی وجہ سے سرور بہت خستہ حال اور پریشان روزگار ہو گئے تھے کچھ دنوں قربان علی شتر دار کا ریشمی مہاراجہ
 اور نشی شیو پرشاد ملازم کمسریت نے ان کی اعانت کی لیکن ۱۲۴۳ھ کے غدر نے اس فیصلہ کو بھی منقطع
 کر دیا۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد مہاراجہ ایشری پرشاد نرواں شگہ والی بنارس کی طلبی پر سرور ۱۲۴۳ھ میں
 بنارس گئے اور مہاراجہ صاحب نے وہاں ان کی بہت قدر افزائی اور خاطر و مدارات کی۔ بنارس میں
 انھوں نے گلزار سرور، شہستان سرور اور دیگر نظم و نثر کی چھوٹی چھوٹی کتابیں تصنیف کیں۔ مہاراجہ
 بنارس کی طرف سرور کو مہاراجہ الوداد اور مہاراجہ پتیالہ نے بھی اپنی اپنی ریاستوں میں طلب کیا تھا اور
 آخر ان کے ایک جوڑی طلبی کرڈوں کی ان کو مرحمت فرمائی تھی۔ سرور کے ایک خط سے جو انکی انشاء سرور
 میں چھپ گیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دہلی لکھنؤ میرٹھ اور راجپوتانہ بھی گئے تھے اس وجہ سے کہ اس خط
 میں انھوں نے اپنے سفر کی تکلیفوں کا حال شرح طور پر لکھا ہے۔ انشاء مذکور میں جو خطوط درج ہیں
 وہ ان کے سوانح زندگی اور اس عہد کے حالات پر کافی روشنی ڈالتے ہیں۔ ایک مرتبہ ان پر ایک الزام
 محسوس بھی لگایا گیا تھا ۱۲۴۳ھ میں سرور اپنی آنکھوں کے علاج کے لیے کلکتہ گئے تھے۔ اور واجد علی شاہ
 سے بھی ملے تھے جو اس وقت قیام راج میں نظر بند تھے۔ مگر سرور وہاں سے ناکام آئے اور بالآخر اپنی
 آنکھوں کا علاج لکھنؤ میں ایک ہندوستانی ڈاکٹر سے کرایا۔ اس کے بعد وہ بنارس گئے جہاں ۱۲۶۴ھ

(مطابق ۱۲۸۸ء) میں (یعنی غالب سے ایک سال پیشتر) انتقال کیا۔

فائدہ عجائب | سرور کا سب سے بڑا کارنامہ ان کی تصنیف فائدہ عجائب ہے۔ اس کا قصہ معمولی حسن و عشق کا افسانہ ہے جس کے مضمون واقعات میں کوئی جدت نہیں اور عبارت اسی زمانہ کی مروجہ فارسی کی تقلید میں پر تکلف و تصنع و مقفی اور مسجع ہے۔ یہ ایک ایسا فرضی افسانہ ہے جس میں سحر و جادو سے لڑائی جادو گروں سے مقابلے سفر کے عجائب و غرائب بکثرت ہیں۔ یہ نوجوان طبیعتوں کو بہت مرغوب ہے مگر سن ریہ لوگ نفس قصہ سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے البتہ اس کی زبان اور مصنوعی عبارت کو اکثر پسند کرتے ہیں۔ اس کی عبارت پر تکلف ہے مگر اس میں واقعات کی فراوانی نہیں ہے بعض فقرات ضرور ایسے ہیں جو مثل نظم کے دلچسپ و ادبی مرقع کاری کا بہترین نمونہ ہیں کتاب کا زمانہ حال کے اصول تنقید سے جانچنا ایک فضول سی بات ہے اس وجہ سے کہ مصنف اگلے زمانے کے لوگوں میں ہیں قصہ پڑانے رنگ کا ہے اور طرز عبارت اس زمانہ کا ہے جب فارسی عام طریقے سے رائج تھی اور دور کے خطوط تک میں تصنع اور تکلف شامل تھا اور سادگی عبارت کو لکھنے والے کی سادہ لوحی اور عدم قابلیت پر محمول کرتے تھے۔ ان قیود پر نظر کرتے ہوئے ہم کو ان لوگوں کا تہہ دل سے ممنون ہونا چاہیے جنہوں نے قدیم فرسودہ طریقوں کو چھوڑ کر ایک نئی شاہراہ قائم کی مثلاً مرزا غالب سرسید وغیرہ جس طرح نظم اور دو کی ابتدا مثنویوں غزلوں اور مثنویوں سے ہوئی اسی طرح فرضی قصوں اور افسانوں پر تشرار و کی بنیاد رکھی گئی اور جس طرح اصناف نظم مذکورہ تدریجی ترقی کرتی ہوئی اس دہے کو پہنچیں اس طرح تشرار و بھی اپنے ابتدائی مذاہج طے کر کے نیا زمانہ حال کی سلیس اور مثنوی سادہ روش پر آگئی۔ فائدہ عجائب کا دو ساجہ اس لیے اور بھی دلچسپ ہے کہ اس میں اس زمانے کی شہر لکھنؤ کی سوسائٹی وہاں کے طرز معاشرت امر اور دوسا کی وضعہاریوں ان کے پر تکلف جلسوں شہر کے رسوم و رواج یکمیل تماشاں کو پیش نظر مختلف پیشوں اور اہل کمال کے حالات بازاروں کی چہل پہل سودا فروشوں کی آوازوں وغیرہ کی دلکش اور حیرتی جاگتی تصویریں ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ انکو شہر لکھنؤ کی ترقی نگاری سے علیحدہ سمجھنا چاہیے اس وجہ سے کہ شہر کے یہاں کی کثرت اور مختلف سوسائٹیوں کے بحیثیت مجموعی نمونے دکھائے گئے ہیں

ان میں تفصیل و طویل سے کام لیا ہو اور اپنے ظریفانہ طرز بیان سے اس میں ایک دلکش اور نظر فریب رنگینی پیدا کر دی ہو برعکس اس کے سرور کے یہاں سوسائٹی کے مرقعے یا کیرکٹر نگاری کے کوششے نہیں ہیں نیز یہ کہ سرور اپنے سلسلہ بیان میں ان چیزوں پر جن کو وہ بیان کرنا چاہتے ہیں صرف ایک سرری گاہ ڈالتے ہیں جس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ سرشار بحیثیت ایک دست کے کیرکٹر نگاری اور تفصیل جو دنیا کو مقام سمجھتے ہیں اور اس کی سرور کو چنداں ضرورت نہیں اس موقع پر ہیڈٹیشن رائٹ کر کے وہ خیالات سننے کے قابل ہیں جو فسانہ عجائب کو پڑھ کر انھوں نے انگریزی میں قلب بند فرمائے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ سرشار کے بہ نسبت سرور کے یہاں لکھنؤ کا بیان بہت زیادہ مکمل۔ بہت زیادہ متناسب اور بہت زیادہ خوبصورت ہو مگر سرور آدمیوں کا حال نہیں لکھتے صرف چیزوں کا مرقع کھینچتے ہیں حلوئی کی دکان کے پاس سے ہم گرتے ہیں اور ہمارے منہ میں نی بھرتا ہوا تھوکیوں کے یہاں کی تھکوریوں دیکھ کر ہمارا جی لچھاتا ہے۔ بالائی کو دیکھ کر نقیب ہیر جاتا ہے کہ لکھنؤ کی بالائی کے آگے ڈیونشا بر کی کریم (بالائی) کوئی۔۔۔۔۔

چیز نہیں لیس فروش، جوہری بنے بقال، کبریے سب کھا مال لیے بیٹھے ہیں، چوک و دروہری بازار میں اور سیرگاہ ہیں (جو باقی نہیں ہیں) ہم اس کتاب میں لکھتے ہیں اور ان کی خوب سیر کرتے ہیں۔ ہماری نگاہ ان بلند عمارتوں و درکروں پر بھی جاتی ہو جہاں سے کچھ حسین تر تریاں جادو بھری گاہوں کے ہم کو جھانکتی ہیں ہم جوک میں ہو کر گزرتے ہیں مگر وہ ایک شہر خوشحال ایک سونیستی معلوم ہوتا ہو۔ راہ گیر اور دکاندار سب سو رہے ہیں ہم مجمع میں چلتے ہیں مگر کھوئے سے گھو ادھل نہیں چھلتا۔ کمرے دایاں ہمارا اشارہ کی جواب نہیں دیتیں تینوینس کرشمہ ناز میں مصروف ہیں مگر منہ سے کچھ نہیں بولتیں۔ کبریے بہرے ہیں۔ بساطی بد حلوئی اونگھ رہے ہیں حلوئی کی مٹھائیاں جیوں میں بھر کر لے چلیں۔ زندگی کا کہیں پتہ نہیں۔ مشورہ گوئیے ہمارے سامنے آتے ہیں مگر ان کا گانا سننے میں نہیں آتا۔ شعرا۔ فوجی سپاہی۔ پہلوان۔ بادشاہ و وزیر سب سامنے سے فافوسی تصویروں کی طرح گزر جاتے ہیں سب خاموش۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے یہ سب تصویریں بے ہوشی کے عالم کی کھینچی ہیں۔ لہذا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ سرور کا لکھنؤ وہ شہر خوشحال ہو جس کا نقشہ نینین نے اپنی مشہور نظم ”ڈسے ڈریم“ (خواب دوزا میں

کھینچا ہے۔ وہ کہتا ہے:-

”کہیں ٹیلر (خافیاں) اپنے دونوں گھٹنوں کے بیچ میں شراب کی بوتل دبا
بیٹھا ہے جو آدھی وہ گئی ہے اور کہیں بڑھا اسٹوڈنٹ (بادرہی) اپنے کام میں
مصروف ہے۔ کہیں حسین میڈ (ماما) کا ہاتھ نو عمر خادم (بیج) نے پکڑ لیا ہے۔ میڈ
کچھ کہنے کے لیے اپنا منہ کھولا چاہتی ہے بیج بوسہ کے واسطے منہ لپکاتا ہے۔ اور ٹرم
کی ٹرنی میڈ کے رخساروں پر دوڑ جاتی ہے“

اُس زمانے میں مقفیٰ مسیح عبارت اس درجہ مقبول اور رائج تھی کہ اس سے احتراز مشکل تھا۔ اسی
وجہ سے فسانہ عجائب کی عبارت سلیس اور دل چلادہ ترہ میں شامیں کی جا سکتی تھیں اس کے اس میں تعقد و
تکلف سمجھ ہو۔ اور سردی کی کھینچی ہوئی تصویریں جیسا کہ پنڈت بشن ٹرائن در نے اد پر بیان کیا ہوا اشخاص
قصہ کے صحیح خط و خال نہیں دکھائیں بلکہ وہ محض اُن اشخاص کے ماحول اور گرد و پیش کو ظاہر کرتی
ہیں تو ان کی پابندی کی وجہ سے سلسلہ بیان کی روانی اور سلاست میں قی پڑ جاتا ہوا اور اکثر جگہ پڑھنے والا
الفاظ کے جال میں پھنس جاتا ہوا۔ یہ سب در نے اپنے جذبہ وطنی کے جوش میں سیرا میں بلکہ دلی والوں پر اکثر چوٹیں
کی ہیں جس کا ذکر اد پر ہوا۔ قصے میں کیر کڑ نویسی کم ہو۔ مگر اسیں شک نہیں کہ ملکہ و ہر نگار کے کیر کڑ میں سچی
محبت۔ باوقائی۔ دلیری۔ معاملہ فہمی۔ جرأت اور نہایت برباری کو نہایت واضح طریقے سے دکھایا
ہے دوسری خصوصیت یہ ہو کہ اس میں ضمناً بعض قصے ایسے بھی بیان کیے ہیں جن کے ہیرو انگریز ہیں مثلاً
پیر جیٹن کا قصہ جس کے ذیل میں کچھ انگریزی الفاظ آگئے ہیں جو شاید اس سے پیشتر نثر اردو میں شائع نہ
استعمال ہوئے ہوں۔ دنیا کی سب سے بڑی کابست جو بند کی تقریر سے ملتا ہوا اور جوگی کی عبرت افزا نصیحتیں
نہایت مؤثر اور دلکش ہیں۔ اس کتاب کے جواب میں دو قصے اور بھی لکھے گئے ایک ”سروش سخن“ مؤلفہ
خواجہ فخر الدین حسین دہلوی جو سنہ ۱۸۷۱ء میں شائع ہوا اور جس میں سرد پر بہت سی چوٹیں کی گئی ہیں اور
دلی والوں کی تعریف میں ہیں۔ دوسرا ”طلسم حیرت“ مؤلفہ محمد جعفر علی شیون لکھنوی جو ۱۸۷۲ء میں
تصنیف ہوا جس میں سرد پر ایک اہل لکھنؤ کی طرف سے ”سروش سخن“ کے مطالعہ کا جواب یا گلیا ہے۔

(۱) ۱۱۷۷ء میں سردار سلطانی ترجمہ "شمشیر خانی" جو شاہنامہ فردوسی کا مخلص ہو اس کا بھی طرز عبارت مثل فسانہ عجائب کے مقفی اور مستح ہے جو تاریخ کے لیے مناسب نہیں ہیں ایک مقام پر جذبہ وطنیت کے جوش میں ہندستان کی بہت تعریف کی ہو جو قابل دید ہو (۲) ۱۱۷۷ء میں شمس الدین ہاشمی نے بھوپال کے جنگلوں کے کسی واقعہ کو بیان کیا ہے کہ ایک سار کا جوڑا جس کی محبت مشہور ہے ایک جنگل میں پھر رہا تھا کہ نہ کو کسی نے مار ڈالا۔ مادہ نے لکڑیاں جمع کیں اور اس کے اوپر نہایت باقاعدہ طریقے پر سی ہو گئی وغیرہ (۳) اسی سال "سکوفہ محبت" بھی لکھا گیا جس میں مہر چند کھتری کا پرانا قصہ نئے انداز سے بیان کیا ہو اور واجد علی شاہ کے سفر کلکتہ کا بھی اس میں ذکر ہو (۴) گلزار سرور جو ایک فارسی کتاب حدائق الفیاق کا ترجمہ ہو جس میں ایک فسانہ کی صورت میں روح اور عشق کا تبادلہ دکھایا گیا ہے یہ ایک مذہبی مضمون ہے جس کو مصنف نے اپنی خاص نگین عبارت میں لکھا ہو اسی پر مرزا غالب نے ایک عجیب تقریظ اسی رنگ یعنی مقفے عبارت میں لکھی ہے (۵) شبتان سرور یعنی الفیلہ کے چند قصوں کا دھچپ ترجمہ جس میں بجا بجا جدیدہ اشعار داخل کر کے کتاب کو بہت دھچپ بنایا ہے

الفیلہ کے ترجمے | الفیلہ کے قصے ہندستان میں ہمیشہ سے مقبول رہے اور ان کا ترجمہ اکثر لوگوں نے کیا ہو شمس الدین احمد نے ۱۱۷۷ء میں مدراس سے ایک ترجمہ کالاجس کا نام "حکایت البلیلہ" ہے اس میں صرف دوسرا توں کی حکایات ہیں اور مدراس کالج کے طلباء کو اسے یہ کتاب لکھی گئی تھی دوسرا ترجمہ ہاشمی عبد الکریم نے ۱۱۷۷ء میں فارسی صاحب کی انگریزی الفیلہ سے کیا جس کی بان اس قدر صاف اور سہل ہو کہ ادبی ذوق کے لوگ اس کو معیار سے گرا ہوا سمجھتے ہیں پھر ایک منظوم ترجمہ ہاشمی نوکشور صاحب کی فرمائش سے ۱۱۷۷ء و ۱۱۷۸ء میں چار حصوں میں قیم دہلوی ہاشمی طوطا دام شایاں ہاشمی شادی لال چمن نے کیا جس کا ایک نثر کا ترجمہ ہاشمی طوطا دام شایاں نے ۱۱۷۷ء میں نکالا۔ اس کے بعد ۱۱۷۹ء میں حامد علی نے ترجمہ کیا اور مرزا حیات دہلوی نے ۱۱۷۹ء میں شبتان حیرت کے نام سے طرز ناول ترجمہ کیا۔ (۶) شاہزادہ ایدورڈ (جو بعد کو ایدورڈ ہفتم ہوئے) کی شادی کے موقع پر سردار نے ایک تہنیت نامہ موسوم بہ "نثر نثرہ نثار" لکھا جس میں انگریزی حکومت کے

فوائد اور برکات نہایت عمدہ الفاظ میں بیان کیے ہیں (۷) انشاءے سرور یعنی سرور کے خطوط جو انہیں کے خاص طرز میں ہیں۔

اُردو و نثر اردو میں سرور کا مرتبہ اس میں کوئی شک نہیں کہ قدیم طرز کے اُردو و نثر اردو میں سرور کا مرتبہ بہت بلند ہو۔ اپنے طرز خاص میں وہ عدیم المثال ہیں۔ مگر بعد کو جب نئے کارنگ بدلا اور کاروباری دور شروع ہوا تو اس قسم کی تیز تکلف اور پختہ عبارت جس کے طویل جملوں اور ثقیل عربی و فارسی الفاظ سے لوگوں کا حجب اُٹا گیا تھا اور موجودہ ضرورتوں کے اظہار کے لیے بھی وہ ناموزوں تھی، ترک کی گئی۔ بہر طور سرور نے اپنا رنگ خوب برتنا اور اس رنگ کے وہ بڑے ماہر تھے اُن کی تمام تصنیفات میں لکھنؤ کے حالات اور یہاں کی سوسائٹی کے مرقعے خاص طور پر بہت دلچسپ ہیں۔ نثر میں اُن کو اتنا شغف تھا اور اس میں وہ اتنے مشور ہوئے کہ ان کے دیگر کمالات یعنی اُن کی خوشنویسی اُن کی سستی بیان تک کہ ان کی شاعری بھی اس کے سامنے فروغ نہ پاسکی۔ اُن کا دیوان مفقود ہو مگر اُن اشعار جو اُن کی نثر کی کتابوں میں جا بجا ملتے ہیں کہا جاسکتا ہو کہ وہ بھی ضرور اعلیٰ درجہ کا ہو گا۔ سرور کو لکھنؤ کے عاشقوں میں ہیں اور لکھنؤ ہی میں رہے۔ مگر پھر بھی اُن کے اشعار سے دلی کا اتباع معلوم ہوتا ہے کیونکہ لکھنؤ کے تصنع اور مبالغہ سے وہ بری ہیں۔

غالب بحیثیت نثر | عام لوگ غالب سے صرف بحیثیت ایک شاعر کے رشتہ اس ہیں اُن کی نثراری کی حیثیت عام نظروں سے پوشیدہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ فارسی اور اُردو دونوں کے لیے بے مثل نثر بھی اسی طرح ہیں جس طرح کہ بے نظیر بے عدیل شاعر ہیں۔ اُن کی نثر اُردو کی تصانیف زیادہ تر خطوط و رقعات ہیں چند تقریظیں اور دیباچے ہیں اور تین مختصر سائے یعنی لطائف غیبی تیغ تیز اور نامہ غالب جو سبک دہان قاطع کے طرز اردو کے جواب میں لکھے گئے۔ اس کے سوا چند اجزاء اور ایک نامہ تمام قصبے کے بھی ہیں جو مرزا نے مرنے سے چند روز پہلے لکھنا شروع کیا تھا۔ مگر ان سب میں ان کے وہ خطوط جو اردو اعلیٰ اور عمدہ ہندی کے نام سے مشہور ہیں اور نیزہ تقریظیں جو چند کتابوں پر لکھی ہیں نثر اُردو کا بہترین نمونہ۔

اس نامہ غالب کو اب حیات میں مرزا کی تصانیف فارسی میں دکھایا ہے۔

ان کے خاص رنگ کا آئینہ ہیں۔

اُردو کے مُثلے اور دوسری ^{۱۸۵۰ء} تک مرزا فارسی میں خط و کتابت کرتے تھے جیسا کہ ان خطوط سے پایا جاتا ہے جو پنج آہنگ میں چھپے ہیں اور نیز بعض جگہ خطوط اُردو میں بھی اس کا ذکر ہے۔ اُس کے بعد انھوں نے اُردو میں خط و لکھنا شروع کیے۔ ان کا رنگ بالکل مخصوص ہو اور انھیں پُرشارد کی ایک خاص طرز کی بنیاد قائم ہوئی۔ مگر جہاں تک خیال ہو کوئی شخص اُن کی پوری تقلید اور نقل میں کامیاب نہیں ہوا یوں تو بہت سی اشعار اور رقعات کی کتاب میں موجود ہیں کثر مشہور لوگوں کے مکاتیب بھی شائع ہو چکے ہیں مگر غور سے دیکھا جائے تو مرزا کا رنگ سب سے حلیمہ ہو۔ اس میں کسی قسم کا تکلف اور تصنع خشونت اور خشکی مطلق نہیں عبارت کی روانی اور سلاست معلوم ہوتا ہے کہ قلم برداشتہ لکھتے چلے جاتے ہیں اور مضامین کی کثرت پتہ دیتی ہے کہ ایک دیا گئے مضامین اُٹھا چلا آتا ہے۔ یہ ایک خاص صفت ہے کہ ہر چیز عبارت حد درجے کی بے تکلف اور درزمرہ ہو مگر استبدال اور بوقت اس میں مطلق نہیں بلکہ اس میں ایک ادبی شان ہے۔ بطور ہر فقرے سے عیاں اور ظرافت ہر جملے کی تہ میں پنہاں ہو۔ مرزا اکثر ایسے خیالات کا جن سے اُن کا مکتوب لیا ہوا فنی نہ بھی ہو اس عبارت اور صفائی سے اظہار کرتے ہیں جیسے کہ وہ جانتے ہیں کہ اُن کی تحریر کا زور اور اُن کا انداز بیان اُس کی زبان بند کر دے گا بلکہ اُس کو اُن کے اہمیت میں ایسر کرے گا۔ اُن کی تحریر میں بالکل باتوں کا مزہ آتا ہے۔ اور بعض خطوط انھوں نے فی الواقع مکالمہ کی صورت میں لکھے ہیں کسی میں مکتوب لیا کہ غائب فرض کر لیا ہو۔ جس سے معلوم مکتوب لیا کہ کوئی دوسرا شخص معلوم ہونے لگتا ہے۔ قلم کی ایک جنبش سے وہ ایسی سحر آفرینی کر دیتے ہیں کہ دل منے اٹھانے لگتا ہے۔ مرزا نے اپنے خطوط میں علاوہ ایک طرز خاص اختیار کرنے کے یہ جدت بھی کی ہے کہ القاب و اس کا فرسودہ طریقہ اور بہت سی اور باتیں جو عموماً خطوط میں لکھی جاتی ہیں مگر درحقیقت فضول اور بیکار ہیں سب چھوڑ دیں۔ دہنج آہنگ میں لکھتے ہیں کہ خطوط نویسی میں میرا طریقہ یہ ہے کہ جب خط لکھنے کیلئے قلم و کاغذ اٹھاتا ہوں تو مکتوب لیا کہ کسی ایسے لفظ سے جو اس کی حالت کے موافق ہوتا ہے پکارتا ہوں اور اس کے بعد ہی مطلب شروع کر دیتا ہوں نقاب آداب کا پرانا طریقہ اور سکڑے و سادہ فی غم کا قدیم روئے میں نے بالکل

اٹھادیا۔ مثلاً یہاں چند نمونے اسی شان کے لکھے جاتے ہیں۔ ابا بابا میرا پیارا مہدی آیا آدھ بھائی
 مزاج تو اچھا ہی بیٹھو یہاں پور ہر دارالسرور ہے جو لطف یہاں ہے وہ اور کہاں ہے؟ آدھ میاں
 تیز زادہ آزادہ دلی کے عاشق دلدادہ ڈھکے ہوئے اُردو بازار کے رہنے والے حد سے لکھنؤ کو گڑا کہنے
 والے۔۔۔ برخوردار نور چشم میر مہدی کو بعد دعا حیات و صحت کے علوم ہو بھائی تم نے بنجا کو کیوں نہ دیا
 تب کو کیوں چٹھنے دیا۔ کیا بنجار میرن صاحب کی صورت میں آیا تھا کہ تم مانع نہ گئے۔؟ میری جان تو
 کیا کہہ رہا ہو غیب سے یا نا رو یا نا صبر و تسلیم تو کن رضا شیوہ صوفیہ کا ہو کھ سے زیادہ اس کو کون سمجھے گا؟ سید
 صاحب چھا لکھو کلا کلا ہو بعد اتفاق کے شکوہ شروع کر دینا اور میرن صاحب کو اپنا مہربان کر لیتا
 یہاں ہم مرزا کا ایک خط جو میر مہدی کے نام ہو تمام دگمال نقل کرتے ہیں کہ مرزا کی وہ تمام خصوصیات
 تحریر جن سے ان کی نثر بھی مثل نظم کے معجز نامعلوم ہوتی ہے بخوبی سمجھ سکیں مثلاً خط سے القاب و ب
 کا بالکل غائب ہونا اور بجائے اس کے ایک فرضی مکالمہ سے خط کا شروع کو یا جانا و عبارت کی دلی
 شوخی اور بے تکلفی۔ مذاق کے پیرایہ میں کچھ دو تارہ نصیحتیں بھی کرنا۔ جدید نگار یعنی جمہوریت پسندی کے
 برخلاف پراپیٹوٹ خط میں بھی "ملکہ انگلستان" کے پہلے لفظ "جناب" لکھنا جس سے ان کی حد و وجہ کی قدا
 پسندی اور تہذیب کا پتہ چلتا ہے۔ ابتدائی چند سطور کو جن سے خط شروع ہوتا ہو ہم مکالمے کی صورت
 میں لکھے دیتے ہیں۔ غ سے غالب اور م سے میرن صاحب سمجھا جائیے۔

خط بنام میر مہدی

غ۔ اے جناب میرن صاحب السلام علیکم۔

م۔ حضرت آداب۔

غ۔ گو صاحب آج اجازت ہو میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کو۔

م۔ حضور میں کیا منع کرتا ہوں میں نے تو یہ عرض کیا تھا کہ اگر اوج تندہیت ہو گئے ہیں بنجار جاتا رہا ہو
 صرف بخش باقی ہے وہ بھی رفق ہو جائے گی میں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے لکھ دیتا ہوں آپ
 پھر کریں تکلیف کریں۔

غ۔ نہیں میرن صاحب اس کے خط کو آئے ہوئے بہت ن ہوسے ہیں وہ خفا ہوا ہوگا۔ جواب لکھا
م۔ حضرت وہ آپ کے فرزند ہیں آپ سے خفا کیا ہوں گے

غ۔ میاں آخر کوئی وجہ تو بتاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو۔

م۔ بھان اللہ سبحان اللہ اے لو حضرت آپ تو خط نہیں لکھتے اور مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہو۔
غ۔ اچھا تم باز نہیں لکھتے مگر یہ تو کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ میں میری ہدی کو خط لکھوں۔

م۔ کیا عرض کو دس سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور وہ پڑھا جاتا تو میں منتا اور خط لکھتا
اب جو میں وہاں نہیں ہوں نہیں چاہتا کہ آپ کا خط ملے۔ میں اب بخفیہ کو روانہ ہونا ہوں
میری روانگی کے تین دن کے بعد آپ خط شوق سے لکھیں گے۔

غ۔ میاں بیٹو ہوش کی خبر تو تمھارے جانے سے نہ جانے سے مجھ کیا علاقہ میں بوڑھا آدمی بھولا
آدمی تمھاری باتوں میں آگیا اور آج تک اس کو خط نہیں لکھا (اسکے بعد سلسل خط شروع ہوتا ہے)
لاحول ولا قوۃ منو میر ہدی۔ صاحب میر کچھ گنا، نہیں میرے پہلے خط کا جواب لکھو تیری رفع
ہوئی پوچش کے رفع ہونے کی خبر شتاب لکھو۔ پر میر کا بھی خیال رکھا کرو۔ یہ جلدی بات کہ وہاں کچھ کھانسی
ملنے سی نہیں تھا اور میر اگر ہو گا بھی تو عصمت بی بی از بے چادری ہوگا۔ حالات یہاں کے مفصل میں
صاحب کی زبانی معلوم ہوں گے دیکھو بیٹھے ہیں جانوں حکیم میر شرف سیل دران میں کچھ کوسل ہو تو رہی ہو۔
بخشیمہ روانگی کا دن ٹھہرا تو ہو اگر چل نکلیں اور پونج جائیں تو ان سے پوچھو کہ جناب بلکہ انگلستان کی
سالگرہ کی نشانی کی نخل میں تمھاری کیا گت ہوئی تھی اور یہ بھی معلوم کر لیں کہ یہ جو ناری شل شہر ہو کہ دفتر کا
خورد اس کے سنی گیا ہیں۔ پوچھو اور نہ چھوڑو جب تک نہ بتائیں۔ اس وقت پہلے تو آندھی چلی پھر برف
آیا اب میٹھ برس رہا ہو۔ میں خط لکھ چکا ہوں سزا نہ لکھ کر چھوڑ دوں گا۔ جب زرخ موقوف ہو جائے گا
تو کلیان ڈاک کے لئے جائے گا۔ میر فرزند حسین کو دعا ہے بچے اللہ انہم پانی پت کے سلطان العلماء اور
مجتہد العصرین گئے کہ وہاں کے لوگ تمھیں قبلہ دیکھ بکھنے لگے یا نہیں۔ میر نصیر الدین کو دعا۔
اس کاٹ چھانٹ سے تدا کی طویل اور غیر دیکھ پطر زخیر کی درستی ہو گئی اور یہ ایک بہت عمدہ

حدت کی مثال قائم ہو گئی جس سے اردو خطوط نویسی پرانے تکلف و تصنع اور بے موقع اظہار علمیت سے آزاد ہو کر نہایت شیریں و درحسب بن گئی۔ ہر چند کہ یہ اختراع اُن کے معاصرین کو پسند نہ آیا مگر جوں جوں زمانہ بدلتا گیا اور دقت گزرتا گیا اب لوگوں کو اس کی اہمیت کا ضرور احساس ہوا اور ہر طرف اس کے شیعین پیدا ہو گئے مولانا حالی۔ سر سید۔ مولوی ذکا اللہ۔ مولانا محمد حسین آزاد اور اُن کے علاوہ دیگر بابرِ قلم مثلاً امیر میناں اکبر وغیرہ نے بھی سادگی عبارت کو پسند کیا اور اپنے اپنے طریق پر نثر لکھیں مگر حق یہ ہو کہ مرزا کی سادگی و دلکشی، شوخی و ظرافت جذبات نگاری و اظہار مافی الضمیر میں کوئی ان کا مد مقابل نہ ہوئے گا۔

ان کے رفعات کی ایک سنی خصوصیت یہ بھی ہو کہ وہ ان کے حالات زندگی کے مصطفیٰ اور محلِ اُمینہ ہیں۔ یہاں تک کہ اگر کوئی شخص یہ زحمت گوارا کرے کہ ان کے خطوط کو تاریخ تحریر کی ترتیب سے جمع کرے اور ان کے وہ حصے جو مرزا کے حالات زندگی کے متعلق ہیں علیحدہ کرتا جائے تو مرزا کی ایک مختصر خود نوشتہ سوانح عمری اُن سے مرتب ہو جائے گی۔ یہ خطوط اُن کی زندگی اور جزییات زندگی کی تصویریں ہیں ان حیات، احباب اور معاصرین سے تعلقات کے متعلق ان کے نظریے اور معاصر اور قدیم شعرا کے متعلق ان کے خیالات سب بخوبی اخذ کیے جاسکتے ہیں بعض کو پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہو کہ مرزا کی غرض اصلی مکتوبات ایسے دل کو خوش کرنا اور اُس کا غم غلط کرنا ہو۔ اُن کا مذاق ظرافت بھی سب سے بڑا ہو۔ اردو نظم میں اُس کا جواب ہی نہیں۔ اہل یورپ میں بھی اس قسم کی لطیف ظرافت مفقود ہو۔ فریخ شاعر و الیٹر اور انگریزی نثر ڈین سوئیٹ اپنے اپنے طرز میں ایک خاص رنگ ظرافت لکھتے ہیں مگر مرزا اُن سب سے علیحدہ ہیں و الیٹر کی طرح اُن میں نقالی اور سوئیٹ کی طرح اُن میں تیزی اور دل آزاری نہیں چو اُن کی ظرافت کی لطافت اور نزاکت کا پرتو ایڈیٹس میں کچھ کچھ پایا جاتا ہے مرزا کا یہ بہت بڑا احسان ہو کہ انھوں نے نثر اردو کو خشکی اور بدمزگی کے الزام سے بچا لیا۔

مرزا کا قدیم رنگ یعنی متقی اور سچ عبارت | مرزا ہر چند خطوط میں سادگی اور سلاست عبارت کے علاوہ تھے مگر راج زمانہ کے موافق احباب کی کتابوں پر تقریظیں اُسی پرانے انداز میں لکھتے تھے۔ اسکی وجہ مولانا حالی کی زبان سے سننا چاہئے وہ کہتے ہیں مرزا کو اس میں معذور سمجھا جائے۔ جو لوگ تقریظوں اور دیباچوں کی

فرمایش کرنے والے تھے وہ غیر ان تکلفات بارودہ کے ہرگز خوش ہونے والے نہ تھے۔ جو طریقہ اس زمانے میں ریویو لکھنے کا لکھا ہے اس کو اب بھی بہت کم لوگ پسند کرتے ہیں اور مرزا کے وقت میں تو اس کا کہیں نام و نشان ہی نہ تھا۔ یہاں اُن کی دو تقریظوں کی کچھ عبارت بطور نمونہ دی جاتی ہے تاکہ اس رنگ میں بھی اُن کا انداز تحریر بخوبی معلوم ہو سکے۔ ۱۔ مرزا عجب علی بیگ سرود کی گلزار سرود کی تقریظ ”سبحان اللہ خدا کی کیا نظر فرور منقش ہیں تعالیٰ اللہ کیا حیرت آور قدرتیں ہیں یہ جو حدائق العشاق کا فانی زبان سے عبارت آمد دو میں نگارش پاتا ہے ارم کا بین دنیا سے اُٹھ کر بہارستان قدس کا ایک باغ بن جاتا ہے۔ وہاں حضرت رضوان ارم کے نخلبند آبیار ہوئے یہاں مرزا عجب علی بیگ سرود حدائق العشاق کے صمیمہ نگار ہوئے۔ اس مقام پر یہ میرزا جو موصوم بہ اسد اللہ خاں درخیاط بے حکم الدولہ اور مخلص غائب ہے خدے جہاں فرس سے توفیق کا درخلاق سے انصاف کا طالب ہو ہاں اے صاحبان فہم و ادراک سرود سحر بیان کا اُردو کی نشر میں کیا پایہ ہے اور اس بزرگوار کا کلام شاہد معنی کے واسطے کیا گواہی بہا ہے۔ مجھ کو دعویٰ تھا کہ انداز بیان اور شوخی تقریر میں فسانہ عجائب بے نظیر ہے جس نے میرے دعوے کو اور فسانہ عجائب کی یکتائی کو متا دیا یہ وہ تحریر ہے.....“

۲۔ مفتی میرعلی کی کتاب سراج البعرفت کی تقریظ: حق یوں ہے کہ حقیقت از دوسے مثال ایک نامہ دیم یہ سچیدہ سرستہ ہے کہ جس کے عنوان پر لکھا ہے لا مؤثر فی الوجود الا اللہ اور خط میں مقدمہ جہ لاموجود الا اللہ اور اس خط کا لانے والا اور اس راز کا بتلانے والا وہ نامہ آدرار نام آدر ہے کہ جس پر رسالت ختم ہوئی ختم نبوت کی حقیقت اور اس معنی خاص کی صورت یہ ہے کہ مراتب توحید چار ہیں۔ آسمانی انعامی صفاتی ذاتی اعمیائے مشیین صلوات اللہ علیٰ نبینا وعلیہم اعلیٰ اعلان مدارج سگندہ پر مامور تھے خاتم الانبیاء کو حکم ہوا کہ حجاب تعینات اعتباری کو اٹھا دیں اور حقیقت بے رنگی ذات کو صورت الا ان کا ان میں دکھائیں اب نجیبہ معرفت خواص امت محمدی کا سینہ بہا اور کلمہ لا الہ الا اللہ مفتاح باب نجیبہ ہے.....“

کتب و رسائل اسلامی سے اُردو کی تقویت | ایک بہت بڑی تحریک جو ہر چند ادبی نوعیت نہیں کہتی تھی مگر اس سے بلاشبہ نشر و ترویج کو بہت فائدہ پہونچا اور اُس کی تقویت کا باعث ہوئی مولوی اید احمد شہید بریلوی نے لکھا

بزرگ ستادوں یعنی شہر و معروف شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر کے زمانہ میں شاعت مذہب و ہدایت کی صورت میں دنیا ہوئی جس کی وجہ سے تبلیغ دین کی غرض سے مختلف کتب رسائل عوام الناس کے فائدے کے واسطے صاف ادب و سہل زبان میں لکھے گئے۔ یہ خیال برابر زور پکڑتا اور قوت حاصل کرتا گیا اور گواہی حاصل ہوئی کہ جو مولوی صاحب صوفی اٹھائی تھی ان کی وفات کے بعد امتداد زمانہ سے دب گئی تھی مگر مشہور راہبر قوم سر سید احمد خاں کے تمام تعلیمی معاشرتی مذہبی اور سیاسی اصلاحات کی وہی روح رواں تھی۔ سید صاحب اور ان کے رفقاء کے جدید اصولوں کی اشاعت نے گو ملک میں ہر وقت بہت بے چینی اور مخالفت پیدا کی تھی اور اختلافات کی آندھی سے ملک کی فضا گرد آلود ہو گئی تھی مگر محمد کتب و رسائل ان مسائل کی موافقت و مخالفت میں لکھے گئے ہر چند کہ وہ مذہبی رنگ کے تھے مگر چونکہ وہ سبب اور سلیس زبان میں ہوتے تھے اس وجہ سے زبان کو ان سے یقیناً بہت کچھ تقویت و مدد پہنچی مولوی سید احمد شہید علیہ السلام میں پیدا ہوئے اور شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر صاحب ایسے بزرگوں سے علوم دینیہ کی تکمیل کی جنہوں نے بعد کو توہم کی صورت اختیار کر لی تھی چونکہ بڑے قابل اور فصیح شخص تھے لہذا ان کی تقریریں در و عظام سن سن کر لوگ بکثرت ان کے مرید ہو گئے تھے۔ اپنے اصول کی تبلیغ پہلے دہلی میں مکمل کر کے شہرہ میں لکھتے گئے اور وہاں سے ۱۲۶۷ھ میں حج بیت المقدس کی نیت سے مکہ روانہ ہو گئے۔ وہاں کچھ دنوں قیام کر کے قسطنطنیہ چلے گئے۔ اور چھ برس تک ترکی کی سیر و سیاحت اور نیز اپنے بھتیحوں کی جماعت پیدا کرتے رہے جب ترکی واپس آئے اور یہاں کے مسلمانوں کے عقائد کا دیگر مالک کے لوگوں سے مقابلہ کیا تو نسبتاً زمین آسمان کا فرق پایا۔ اور اسی سے ان کے دل میں صلاح کا خیال پیدا ہوا چونکہ آدمی پر جوش تھے لہذا اور اشاعت دین کے متعلق ان کے جوش کی کوئی انتہا باقی نہیں ہی تھی

۱۷ مصنف صاحب کا یہ خیال صحیح نہیں معلوم تھا کہ جو چھوٹے ہی بصورت اشاعت و ہدایت مولوی سید احمد شہید کے زمانے میں شروع ہوئی تھی اور جو تیسریں اور تالیس مذہب میں سر سید مرحوم نے پیش کیں یہ دونوں ایک ہی چیز ہیں اس وجہ سے کہ دہلیوں کے اصول کے مطابق جملہ احکام شریعت میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ پر بلا کسی توجیہ اور تاویل کے عمل واجب ہے اور سر سید مرحوم اپنے مقدمات اور اصولوں کے ثابت کرنے میں لاطی عقلی اور تاویلات سے بہت کچھ کام لینا چاہتے تھے جو عقائد و ہدایہ کے بالکل منافی ہے۔ ۱۸

چنانچہ پہلے سکوں سے اُنھوں نے جہاد کا اعلان کیا اور سترہ سو میں مولوی اسماعیل کو ساتھ لے کر
پشاور کی طرف روانہ ہو گئے کہا جاتا ہے کہ اُن کے مریدوں اور معتقدوں کی تعداد ایک لاکھ سے زائد
تھی۔ اور اکثر امراء و شاہیر نے جوان کے معتقد اور ہم خیال تھے اس مذہبی کام کے واسطے کافی روپیہ سے
اُن کی مدد کی تھی۔ ۱۸۲۹ء میں اپنے اس مشن میں ان کو اتنی کامیابی ہو گئی تھی کہ پورا پشاور اُن کے
قبضہ میں گیا تھا لیکن بعد کو اُن کے اُصولوں کی سختی دیکھ کر افغانوں نے جنھوں نے اُنکو مدد دینے کا
 وعدہ کیا تھا۔ اُن سے بیوفائی کی۔ یہ حالت دیکھ کر وہ دریائے اتک کے اُس پار پہاڑوں میں چلے
جہاں سترہ سو میں سکھوں کے ایک دستہ سے جس کا سردار شیرنگھ تھا مقابلہ کرتے ہوئے مارے گئے۔
شاہ عبدالعزیز صاحب نے قرآن شریف کی تفسیر موسوم بہ تفسیر عزیزی فارسی میں لکھی جس کا اب ترجمہ
اُردو میں ہو گیا ہے اور اُن کے بھائی شاہ عبدالقادر صاحب نے قرآن شریف کا ترجمہ اُردو میں کیا جو ۱۸۸۰ء
میں ختم ہوا اور ایک شخص سید عبداللہ زامی نے جو مولوی سید احمد مذکور کے مرید تھے ۱۸۲۹ء میں بمقام
ہنگلی اس کو چھپوایا۔ اسی طرح مولوی سید احمد صاحب کی کتاب تنبیہ الغافلین جو اصل میں بان فارسی
میں تھی اس کا بھی اُردو ترجمہ انھیں مولوی عبداللہ نے ۱۸۷۰ء میں ہنگلی سے شائع کیا مولوی اسماعیل
صاحب کا مشہور رسالہ تقیۃ الایمان اور نیزہ مریدان مولوی سید احمد کی تصانیف مثلاً ترغیب جہاد
ہدایۃ المؤمنین نصیحة المؤمنین موضع الکبائر والبدعات۔ ماہ مسائل وغیرہ یہ سب سی زمانے کی کتابیں
ہیں جو اصل میں اشاعت دین کی غرض سے لکھی گئی تھیں مگر جن سے زبان اُردو کو بھی ضرورت قوت پہنچی۔
چھاپہ کی ابتدا منجملہ اور باب کے چھاپے نے بھی اشاعت و ترقی زبان میں بہت بڑی مدد دی اور
قدیم حالت میں ایک بہت بڑا قریب آکر دیا اٹھارہویں صدی کے آخر میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں ایک
چھاپہ خانہ کھل گیا تھا جس میں ڈاکٹر گلکرسٹ اور کالج کے مشیوں کی تصانیف خود ڈاکٹر گلکرسٹ کے
اہتمام میں چھپ کر تیار ہوتی تھیں مگر انکی تیاری میں اتنا مقدور و پیہڑچ ہوتا تھا کہ آخر کار یہ مطبع بند کر دیا
پڑا اور ڈاکٹر گلکرسٹ کی بعض کتابیں بھی یہاں نہ چھپ سکیں اس کے علاوہ اس زمانے میں جوٹا پ کے
حروف مروج تھے وہ بھی نہایت بدنام اور بھدے تھے اسی زمانے میں سیرم پور واقعہ بنگال کے پادریوں نے

بھی ایک چھاپہ خانہ کھولا تھا جس میں مختلف ہندوستانی زبانوں کی کتابیں چھپتی تھیں۔ ۱۷۷۷ء میں اس
 چھاپہ خانہ میں آگ لگ گئی اور اکثر کتابیں جل کر خاک ہو گئیں۔ ۱۷۷۸ء میں ایک لیتھوگراف چھاپہ خانہ
 دہلی میں قائم ہو جس نے اشاعت کتب کو بہت آسان کر دیا۔ اس میں پُرانی کتابوں کے ساتھ ساتھ
 انگریزی اور دیگر غیر ملکی زبانوں کے تراجم اور کتابیں اور رسائل مختلف مضامین پر طبع ہوتے تھے۔
 غازی الدین حیدر کے عہد میں لکھنؤ میں بھی بہت صرف سے اور کھف کے ساتھ ایک مطبع ٹائپ کھولا گیا تھا۔
 جس میں سب سے پہلے ہفت تلم تمچھی تھی دوسری کتابیں جو اس مطبع سے نکلیں حسب ذیل ہیں مناجات الہیہ
 زبان عربی ۱۷۸۷ء میں۔ حماد حیدری فارسی میں ۱۷۸۷ء میں یہ دونوں کتابیں غازی الدین حیدر کی
 تعریف میں ہیں۔ گلدستہ محبت جس میں ذاب گورنر جنرل لارڈ ویسٹنگ اور غازی الدین حیدر کی ملاقات
 کا حال فارسی میں ہے۔ پنچورہ خطاطی تاج اللغات جو ایک عربی کالغت زبان فارسی میں ہے۔
 ۱۷۸۷ء میں ایک انگریز مسٹر آرچر جنھوں نے ایک لیتھوگراف چھاپہ خانہ کانپور میں کھولا تھا نصیر الدین حیدر
 کے حکم سے لکھنؤ آئے اور یہاں بھی ایک مطبع جاری کیا۔ ایک اور مشہور کتاب جو اس زمانے میں لکھنؤ میں چھپی
 ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ تھی جس کو لارڈ بریم نے سائنس کے فوائد اور اعمال پر تصدیق کیا تھا اس کا ترجمہ
 سید کمال الدین حیدر محدث یہ میر محمد حسینی لکھنوی نے اسکول بک سوسائٹی کلکتہ کی فرمائش سے کیا اور
 مطبع سلطانی میں ۱۷۸۷ء میں چھپایا یہ ترجمہ نہایت صاف اور سلیس رد میں ہے۔ سب سے پہلی کتاب جو
 لکھنؤ میں لیتھوگراف چھپی شرح الفیہ تھی۔ ۱۷۸۷ء میں تقریباً بارہ چھاپہ خانہ لکھنؤ کے لکھنؤ میں موجود تھے
 جن میں مطبع خیر جن اور مطبع مصطفائی بہت مشہور ہیں۔ ۱۷۸۷ء میں منشی کمال الدین حیدر نے جو
 رصد خانہ شاہی کے میر منشی تھے بادشاہ کی خوشودی مزاج کے واسطے خاندان شاہی کی تاریخ لکھنا شروع
 کی مگر کچھ باتیں بادشاہ کو پسند نہ آئیں جن کی وجہ سے رصد خانہ توڑ دیا گیا اور کتاب کی طباعت بھی
 روک دی گئی اور بہت سے اہل مطبع کانپور چلے گئے۔ مطابع کی تاریخ میں سب سے اہم واقعہ اس عہد کا یہ ہے
 کہ لکھنؤ میں منشی زکندر صاحب نے اپنا مشہور مطبع جاری کیا جس کی بدولت پُرانی پُرانی فارسی اور عربی
 دیر سنسکرت ہندی کی وہ کتابیں چھپیں جو کس میر سی کی حالت میں پڑی تھیں اور اگر شایع نہ ہوتیں تو معدوم

ہو جاتیں۔ اس مطبع نے علم کے محدود دائرے کو وسیع کر دیا اور اس کے فوائد ملک کے تمام طبقوں کو یکساں طور پر پہنچائے تعلیم و تعلم کی ارتقائی ہو گئی۔ اس میں حدیث و تفسیر قرآن شریف با ترجمہ اصول وغیرہ جملہ علوم اہل اسلام۔ فرزند پران سید کو غیر علوم اہل ہندو یکساں طور پر نہایت فراخ دلی سے شائع کیے گئے قرآن شریف کے مترجم چھپنے سے لوگوں کو اس کے مطالب سے آگاہی ہوئی اور اس سے ہندی فائدہ مسلمانوں کو ہوا جو بائبل کے ترجمے سے مسیحوں کو پہنچا تھا۔

رسائل و جرائد و اخبارات اطاعت کی آسانیوں کا ایک نتیجہ یہ بھی ہو کہ رسائل جرائد اور اخبارات زبان اردو میں بکثرت جاری ہوئے جس سے ملک کے معلومات میں بہت کچھ اضافہ ہوا اور انکو دنیا بھر کی خبریں بے تکلف معلوم ہونے لگیں۔ ہندوستانی اخبارات سے جو دستخطیں چھپنے لگے ملک کے لیے تمدنی و اقتصادی معلومات کا ایک دروازہ کھل گیا اور ترجموں کی راہیں فراخ ہو گئیں اور مضمون نویسوں کو علاوہ توسیع زبان کے یہ موقع بھی ملا کہ اپنی زبان کو یورپی مضامین اور طرز کے موافق ڈھالیں۔ مثلاً میں بجائے فارسی کے اردو سرکاری زبان قرار پائی جس سے اس کا نہ صرف مرتبہ بڑھا بلکہ عربی و فارسی کے وہ سب الفاظ اور مصطلحات جو اب تک اس زبان میں رائج تھے اردو زبان میں منتقل ہو گئے اور رواج پا گئے مغربی تمدن کے اثر نے بھی زبان کو طرح طرح کے فوائد سے مالا مال کیا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ فارسی کی تقلید میں جو عبارت اور لفظوں پر زور دیا جاتا تھا وہ طریقہ متروک ہو کر زبان صاف اور سادہ ہوتی اور بجائے الفاظ کے نفس مطلب اور مضمون پر زور دیا جانے لگا۔ اس کے علاوہ دوسری کتابیں جو تعلیمی ضرورت کے انگریزی یا دوسری زبانوں سے ترجمہ کی گئیں ان کا ترجمہ سوائے صاف اور سادہ زبان کے سیمپل و عبارت میں ہو بھی نہیں سکتا تھا لہذا صاف اور سلیس عبارت میں ترجمہ کی گئیں چنانچہ کلکتہ اور لاہور میں جم و تکریری کتابوں کے ترجمے کیے گئے وہ سب اسی قبیل کے تھے۔ اور اب اردو فارسی سے بے نیاز ہو کر اپنے پائوں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو گئی۔ اس اصلاح کو سر تیدا سے قابل بزرگ کے مساعی و جمیل نے بہت تقویت پہنچائی۔ یہ انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہندوستان کی ایک بزرگ ہستی اور مسلمانوں کے ایک بزرگ اور مصلح اعظم تھے جن کا کچھ مختصر حال آگے لکھا جاتا ہے۔

سرتید احمد خاں ۱۸۹۸ء تا ۱۸۹۹ء

جو ادا والدہ عارف جنگ سرتید احمد خاں بہادر کے بی بی ایس آئی
ہندوستان کے مشہور ریڈر اور ایک فصیح البیان اور جلیل القدر مصنف فلسفی، ایفادہ اور ریڈر تھے۔
ان کی قابلیت ان کی ہر و اعزیزی اور ان کی مقناطیسی قوت کے اثر سے بہت سے قابل قابل اہل علم و
فہم ان کے گرد جمع ہو گئے تھے جن کے ادبی کارناموں سے نہ صرف ادیب رفیع مال مال ہوا بلکہ وہ ایک طنز
تحاص کے موجد ہوئے اور ہندوستان کے مسلمانوں کے طرز زندگی اور معاشرت پر ان کی ماسعی جمیلہ کا بہت
گہرا اثر پڑا چونکہ سید صاحب کی زندگی مختلف شعبوں اور مشاغل پر منقسم ہے لہذا ان سے قطع نظر کہ
ہم یہاں ان کا ذکر صرف ایک ادیب قدوسی لیڈر کی حیثیت سے کرتے ہیں۔

سرتید مرحوم دلی میں ۱۸۹۸ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان علوم تربت اور اعزاز کے لحاظ سے
ایک مشہور خاندان تھا۔ ان کے آباؤ اجداد جو اہل عرب کے رہنے والے تھے دامغان آئے اور وہاں کچھ
دنوں قیام کر کے ہمدان اور ہرات پہنچے۔ ان کے بزرگ شاہجہاں کے عہد میں ہندوستان آئے اور یہاں
عہدہ ہائے جمیلہ پر ممتاز ہوئے۔ عالمگیری ثانی نے سید صاحب کے دادا کو جواد الدلہ کا خطاب دیا تھا جو
حسن اتفاق سے خود سید صاحب کو بھی عنایت ہوا سید صاحب کے والد میر تقی ایسے قانع بزرگ تھے کہ
کہا جاتا ہے جب کہ شاہ ثانی نے ان کو عہدہ وزارت پر ممتاز کرنا چاہا تو انھوں نے اس سے انکار کر دیا
سید صاحب کی والدہ نے جن کا نام عزیز النساء بیگم تھا جو ایک روشن دل خاتون تھیں، سید صاحب کی
پرورش کی اور ان کو زمانے کی ضروریات کے موافق تعلیم دلائی سید صاحب نے خوش نصیبی سے ایسا نیا
پایا تھا جس میں غائب صہبائی، آرزوہ، شیفہ، مومن وغیرہ کی طرح کے زندہ دل ابابکمال موجود تھے
مرزا غائب در سید صاحب میں اس قدر ارتباط تھا کہ سید صاحب ان کو چچا کہتے تھے ۱۸۹۳ء میں سید صاحب
دلی میں بعد از سرشتہ داری مقرر ہوئے اور یہ ان کی پہلی ملازمت تھی۔ ۱۸۹۴ء میں نائب میر منشی اور
۱۸۹۴ء میں امتحان منصفی پاس کر کے منصف ہوئے۔ ۱۸۹۶ء سے ۱۸۹۷ء تک دلی کے صدر امین
رہے اور اسی زمانے میں اپنی مشہور و معروف کتاب آثار الصنادید لکھی جس میں دلی کے مشہور مقامات
اور آثار قدیمہ اور تیر اپنے زمانہ کے دلی کے تمام کالین اور فقرا و علما اور شرار وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔

اس کتاب کی اتنی شہرت ہوئی کہ اس کا ترجمہ انگریزی میں ہوا اور فریچ میں گارسن ڈیٹا سنی ترجمہ کیا
 جو ۱۸۵۱ء میں شائع ہوا۔ یہ صاحب نے ۱۸۴۸ء میں ایک کتاب موسوم بہ "جلاء القلوب" جس
 میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کا حال ہے۔ ۱۸۴۸ء میں "تحفہ حسن" ۱۸۴۸ء میں "تفصیل
 فی جرح السائل" (ترجمہ معیار العقول) ۱۸۴۶ء میں "نوائد الافکار" اور "قول متین" ۱۸۴۵ء میں "کلمۃ الحق"
 ۱۸۴۵ء میں "راہ سنت" ۱۸۴۵ء میں "سلسلہ ملوک ہند" جس میں دلی کے بادشاہوں کے مختصر
 حالات راجہ جودھنٹر کے وقت سے لکھے ہیں۔ اور ۱۸۴۵ء میں ترجمہ کیمیائے سعادت تصنیف کیں۔
 ۱۸۴۵ء میں یہ صاحب بخونہ نقل ہو گئے جہاں انھوں نے تاریخ بخونہ لکھی آئین اکبری کی تصحیح
 بخشی کا فخر بھی یہ صاحب کو حاصل ہے۔ ستر بلائیں جنھوں نے آئین اکبری کا انگریزی میں ترجمہ
 کیا ہے یہ صاحب کی کاوش کے معرف اور ان کی تصحیح کے معترف ہیں۔ ۱۸۴۵ء میں انگریزوں کی
 یہ صاحب نے مختلف طریقوں سے امداد کی۔ اور جب ان کو ایک علاقہ ان کی خدمات کے صلے میں
 پیش کیا گیا تو انھوں نے اس کے لینے سے انکار کر دیا۔ ۱۸۴۵ء میں انھوں نے اپنا مشہور پمفلٹ
 "ابا بغاوت ہند" تصنیف کیا جو ۱۸۴۳ء میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ ایک اور کتاب "وفا دار
 مسلمانان ہند" کے نام سے شائع کی۔ برنی کی تاریخ فیروز شاہی کی ایذا ملک سوسائٹی کی فرمائش سے
 تصحیح کی۔ ۱۸۴۶ء میں ان کی تفسیر بائبل موسوم بہ "تیسین الکلام" شائع ہوئی جس کو قدیم روش کے
 مسلمانوں نے ناپسند کیا اور اس پر کتبہ چینی کی۔ مگر اہل یورپ نے اس کی بڑی قدر کی۔ ۱۸۴۶ء میں
 یہ صاحب بدل کر غازی پور آئے جہاں سائینفک سوسائٹی کا سنگ میل رکھا گیا۔ اس سوسائٹی کے
 قیام کی غرض یہ تھی کہ مشہور اور مستند انگریزی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا جائے تاکہ اہل اسلام یورپ کے
 خیالات اور وہاں کے تمدن سے واقف ہوں۔ ڈیوک آف آرگائل جو اس زمانے میں سکریٹری آف اسٹیٹ ہند
 تھے اس سوسائٹی کے مربی (پٹرین) اور لفٹنٹ گورنر پنجاب بنگال اس کے وائس پٹرین بنائے گئے
 ایک زمانے میں یہ سوسائٹی بہت مشہور و مقبول تھی اور اس کے ممبروں نے نہایت عمدہ عمدہ رسالے
 مختلف مضامین مثلاً تاریخ بیوگرافی ذراعت منہاجت اقتصادیات پر لکھے۔ ۱۸۶۲ء میں وہ علی گڑھ آئے

اور ان کے ساتھ سوائی بھی وہیں منتقل ہو کر آگئی۔ ۱۸۶۶ء میں انھوں نے ایک انگریزی اسکول میں داخلہ لیا
 میں اور ۱۸۷۰ء میں اسی طرح کا ایک سکول غازی پور میں قائم کیا تھا اور مختلف مقامات میں انگریزی تعلیم
 کے فوائد اور برکتوں پر لکچر دیے تھے۔ ۱۸۶۶ء میں انھوں نے ایک نمبر قائم کی جس کا نام برٹش نیشن
 ایسوسی ایشن تھا۔ اور نیز اپنی سائنٹیفک سوائی کا ایک ہمار سالہ "علیگڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" کے
 نام سے نکالا جس میں وہ خود بھی مختلف قسم کے مضامین پر کچھ نہ کچھ لکھتے تھے۔ انگریزی اخباروں کے
 بھی اچھے اچھے مضامین اس میں ترجمہ کر کے شائع کیے جاتے تھے۔ ۱۸۶۶ء میں ان کا بندس کو
 تبادلہ ہو گیا مگر ان کے ادبی اور تعلیمی کاموں میں اس سے کسی قسم کا حرج واقع نہیں ہوا۔ اسی عرصہ
 میں انھوں نے ایک ہندوستانی یونیورسٹی قائم کرنے کی بھی کوشش کی تھی اور گورنر جنرل کو اس مضمون کا
 ایک میموریل بھی بھیجا تھا اور ان کے اس خیال کے ساتھ ہمدردی بھی ظاہر کی گئی تھی۔ ۱۸۶۶ء میں سالہ
 "احکام طعام یا اہل کتاب" تصنیف ہوا جس سے مذہبی لوگوں میں ایک قسم کی شورش پیدا ہو گئی اور
 یہ صاحبان باتوں کی وجہ سے بہت بدنام ہو گئے۔ ۱۸۶۹ء میں اپنے بیٹے مسٹر محمود کے ساتھ
 (جو بعد کو الہ آباد ہائیکورٹ کے جج ہو گئے تھے) ولایت گئے اور اہل یورپ کے طرز معاشرت اور
 اخلاق و عادات اور میزان کے سیاسی اور تعلیمی انتظامات کا مطالعہ خوب کیا۔ اسی زمانے میں مسٹر محمود
 کی مشہور کتاب "لائف آف محمد" (سوانحی آنحضرت صلیم) کا ایک لیرا جواب انھوں نے لکھا اور نیز
 مسلمانوں کے واسطے ایک سہ ماہی کا کج ولایت کے اکسپوژٹ اور کیمبرج کانفرنس کے انداز پر ہندوستان
 میں کھولنے کا خیال پیدا ہوا۔ ولایت میں ان کو سی۔ ایس۔ اے کا خطاب اور ۱۸۷۰ء میں ہندوستان
 سوسائٹی کے یہاں انھوں نے اپنا مشہور و معروف ہمار سالہ تہذیب و اخلاق جاری کیا جس کے
 مطالعہ سے مسلمانان ہند کے خیالات میں ایک انقلاب عظیم رونما ہوا اس سے مسلمانوں کو وہی فوائد
 پہونچے جو انیس اور شیل کے رسائل میں ملے اور یہ سیکٹیرس سے اہل انگلستان کو حاصل ہوئے تھے اسکے
 جلدی کر کے یہ غرض تھی کہ مسلمانوں کے خیالات علی الخصوص مذہبی خیالات میں وسعت اور ترقی پیدا
 ہو اور وہ مغربی علوم کی طرف مائل ہوں جس سے ان کے تمام معاشرتی اور تمدنی معاملات میں

ضرور اصلاح ہو جائے گی۔ اس میں مختلف قسم کے مضامین مذہب معاشرت اور تعلیم پر لکھے جاتے تھے اور لکھنے والے خود سرسیدؒ نواب حسن الملکؒ نواب وقار الملکؒ مولوی چراغ علیؒ ایسے بزرگ تھے جو اپنے خیالات کو نہایت صفائی اور آزادی کے ساتھ ظاہر کر دیتے تھے۔ اس رسالہ کی یہ بڑی کوشش تھی کہ مسلمانوں کے دل سے یہ غلط خیال کہ اسلام علوم دنیاوی اور اصلاح کا دشمن یا مخالف ہے نکل جائے اور اُن کو یہ معلوم ہو جائے کہ کن ارباب سے اس قسم کے خیالات اُن کے پیش رووں کے دل میں پیدا ہو گئے تھے۔ وہ نقصان پہنچانے والے اور تکلیف دہ رسوم و قیود کو ترک کریں۔ وہ اپنے افلاس ادبار کا احساس کریں اور کٹھ ملاؤں کے پنچے سے نجات پا جائیں۔ اسی زمانے میں ایک تفسیر قرآن بھی یہ صاحب تصنیف فرمائی جس کی چھ جلدیں شائع ہوئیں مگر نصف قرآن تک پہنچی۔ جلد ۱۲۹

میں طبع ہوئی تھی۔ اس تفسیر کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بہت سی باتوں پر جن کا حوالہ قرآن شریف ہے بائبل کے قصص سے روشنی ڈالی گئی ہے جہاں روزِ آخر و بہشت معرود وغیرہ جو دیگر اقوام نے اعتراضات اور شکستہ حیلوں کی ہیں اُن کا شافی جواب دیا گیا ہے۔ بعض تاویلات اور ضعیف و غیر مستند احادیث سے احتراز کی ہدایت کی گئی ہے اور جو شکوک کہ علومِ ماویٰ کے پڑھنے سے قرآن کی الہامی کتابت نے میں پیدا ہوتے ہیں رفع کیے گئے ہیں۔ مگر ان دونوں چیزوں سے قدیم دوش کے ختم بھی پیر و سید صاحب کے سخت مخالف ہو گئے اُن کو کاؤنٹر نیجری کے خطابات دیے گئے۔ اکثر اخبارات اور رسائل صرف اسی غرض سے جاری کیے گئے کہ یہ صاحب درائے جدید خیالات کا خاکہ اڑایا جائے اور دوسرے مشہور ظریف اخبار اور صدیچ میں اُن کے کارٹون منظر اور نسخہ آئینہ مضامین نظم و نثران کے نسبت لکھے گئے۔

گر یہ صاحب اپنے مشاغل میں سرگرم رہے اور اس مخالفت کا اُن پر مطلق اثر نہ پڑا آخر عمر میں انھوں نے اپنے محبوبہ کی رتی کے اور کوئی خیال نہ کیا۔ یہ سب وہ سرکاری ملازمت سے کنارت ہو گئے اور تعلیم اور سیاسی مشاغل میں گزار دی۔ بالآخر ۱۹۰۷ء میں ایک طویل عمر پا کر اولیٰ کلیاں متحدگی بسر کر کے اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور تمام ہندوستان کو اپنا مہوگار چھوڑ گئے۔

یہ صاحب کا طرزِ تحریر اقتیاد صاحب اردو جرائد نگاروں کی ایک بہت بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ مکالم

بہت زبردست اور ان کا تجربہ علمی بہت اعلیٰ تھا ان کا طرز تحریر زوردار مگر صاف اور سادہ ہے اس میں کسی قسم کی عبارت آلتی نہیں ہے کچھ غلطیاں بھی اس میں نکلیں گی مگر یہ صاحب قواعد صرف و نحو کی پابندی کی مطلق پر مبنی نہیں کرتے تھے وہ مقررہ قواعد انشا پر داری سے بالکل بے نیاز تھے مگر یہی چیز ان کی شہرت اور قابلیت کو نقصان پہنچانے کے بجائے اس میں اور اضافہ کرتی تھی۔ ان کے طرز جدید نے قدیم تصنع نگاری پر جو بیدل اور طور وری کی فارسی کی تقلید میں اردو میں بھی برتی جاتی تھی ایک ضرب کی رسی لگائی اور یہ ثابت کر دیا کہ سادہ اور بے تکلف عبارت میں تصنع سے زیادہ خوبیاں ہیں۔ مضمون کو دیکھو اور عبارت آرائی سے غرض نہ رکھو۔ پریسید صاحب کا عمل تھا اور حقیقت میں یہی حال ان کی تمام تحریروں کا ہے ان کی عبارت ان کے ادائے مطالب میں کبھی قاصر نہیں ہوتی انکو نہ بان پر عبور حاصل ہو نہ اثر اردو دیکھنے میں وہ ایسے شاق تھے کہ ان کے پیشتر کوئی ان کا ہم پلہ نہیں تھا مولانا جانی تو ان کو اثر اردو کا مرثیہ اعلیٰ قرار دیتے ہیں۔ سب سے بڑی خوبی سید صاحب میں تھی کہ وہ مشکل سے مشکل اور دقیق سے دقیق مضمون کو خواہ وہ مذہبی ہو یا سیاسی۔ نہایت صاف اور بے تکلف زبان میں مادا کر سکتے تھے اور نیز اپنے مضامین کے حق و قبح کو بھی نہایت زوردار الفاظ میں وضاحت سے بیان کر سکتے تھے مگر سید صاحب اور غار کے معاصرانہ تعلقات کو دیکھ کر یہ ماننا پڑتا ہے کہ مرزا کی طرز خاص کا سید صاحب پر ایک خاص اثر پڑا اور جو سادگی اور بے تکلفی ان کی عبارت میں پائی جاتی ہے اس کا نقش ازل غالب کے کربا تھوں صورت پذیر ہو چکا تھا۔

سید صاحب کے رفقاء کلام دنیا کے تمام بڑے لوگوں کی سب سے بڑی پہچان یہی ہے کہ وہ اپنے ساتھ والوں میں بھی اپنا ہی ایسا جوش و خروش اور صداقت و استبازی پیدا کر دیتے ہیں یہی حال یہ صاحب کے حواریوں کا تھا جن کی زبردست جماعت نے اپنے ادبی اور سیاسی کارناموں سے ہندوستان میں ایک ہنگامہ پیدا کر دیا خاص خاص لوگ جو اس جماعت میں شامل ہونے کا فخر رکھتے تھے یہ ہیں:-
نواب محسن الملک، نواب قار الملک، مولوی چارغ علی، مولوی ذکا، دانش خواجہ الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی، مولانا عبد الرحمان، مولوی زین الدین، ان میں سے اکثر اصحاب کے کچھ مختصر حالات اس کتاب میں

قلب بند کیے گئے ہیں حال کی قومی شاعر تھے مولوی نذیر احمد اپنے نصیحت آمیز افسانوں اور ناولوں کیلئے مشہور ہیں شبلی اور ذکا انٹرنیشنل فنڈ اور تاریخ کے امام تھے مولوی چراغ علی اور نوح حسین الملک کے پیش بہادر گراں قدر مضامین نے ادب اُردو کو ہمیشہ کے لیے ممنون احسان کیا ان تمام بزرگوں کی سامعی جیلہ جو مسلمانوں کی اصلاح حال کے لیے وقف تھیں نہایت بار آور اور کامیاب ثابت ہوئیں اور ان کی تصانیف سے زبان اُردو میں بیش بہا اضافہ ہوا۔

نوح حسین الملک تا ۱۹۰۶ء
محسن الملک کو اب سید ہندی علی خاں بہادر ۱۳۷۷ھ میں مادہ میں پیدا ہوئے

عمولی درسیات سے فراغت کر کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی دس روپیہ ماہوار پر کلارک مقرر ہوئے۔ رفتہ رفتہ ترقی کر کے ۱۳۸۷ھ میں اہلہ بھر سریشیہ دار اور ۱۳۸۷ھ میں تحصیلدار مقرر ہوئے۔ اپنی خدمات کی انجام دہی میں انھوں نے انتہاء درجہ کی قابلیت اور کارگزاری کا ثبوت دیا اور اسی افتاء میں دو کتابیں اُردو میں ایک قانون ال اور دوسری قانون فوجداری کے متعلق تصنیف کیں جن کو اُس زمانے میں شہرت ہوئی ۱۳۸۷ھ میں ڈپٹی کلکٹری کا مقابلہ کا امتحان کامیابی سے دیکر ۱۳۸۷ھ میں مرزا پور کے ڈپٹی کلکٹر مقرر ہوئے۔ ان کی قابلیت کی شہرت دودھ دھو پہنچی تھی۔ چنانچہ سرالار جنگ اول نے ان کو حیدر آباد طلب کیا اور ۱۳۸۷ھ میں وہ مالیات کے افسر اعلیٰ (ڈپٹی کمشنر جنرل) مقرر ہوئے۔ قیام حیدر آباد کے زمانے میں انھوں نے اکثر کام نہایت مفید انجام دیے۔ مثلاً محکمہ بہبود بست پبلش میں بہت مفید اصلاحیں کیں اور بجائے فارسی کے اُردو کو سرکاری زبان قرار دیا ۱۳۸۷ھ میں ریونیو سکرٹری یعنی اعلیٰ معتمد مال اور ۱۳۸۷ھ میں فنانس اور پبلشکل سکرٹری کے معزز عہدے پر منتار ہوئے اور سرکار نظام سے محسن الدولہ محسن الملک منیر نواز جنگ کا خطاب پایا۔ سفر انگلستان بھی کیا تھا اور گلیڈسٹون سے ملاقات کی تھی۔ بالآخر پبلشکل سائزوں کے سبب اپنے عہدہ سے علیحدہ ہو کر آمد اسٹھ سور پور ماہوار پنشن پا کر علیگڑھ چلے آئے جہاں بقیہ عمر کا ج کے انتظام اور سرپرستی اعلیٰ تعلیمی خدمات میں صرف کی۔

سید صاحب سے اُن سے بہت قدیم تعلقات تھے مشہور ہے کہ جب سید صاحب شروع شروع میں

مغرب میں کچھ دست اندازیاں کر رہے تھے تو عام مسلمانوں کی طرح یہ بھی اُن کو کافر و ملحد سمجھتے تھے مگر
بعد کو جب اُنکی حقیقت سے آگاہ ہوئے تو اُن کے بہت بڑے مداح اور معاون ہو گئے چنانچہ تہذیب الاخلاق
میں اکثر پیش بہامضامین انھیں کے قلم سے ہیں جو ایک مذہبی اور تاریخی حیثیت رکھتے ہیں اور جنکی مرض اصلی
صرف یہ ہے کہ زیادہ حال کے مسلمان جو نکتہ و فلاکت کے گڑھے میں پڑے ہو سہیں اپنے بزرگان سلف
کے قدم بہ قدم چلیں اور اپنے آپ کو ہر حیثیت یعنی تعلیم و اخلاق و سیاست کے اعتبار سے
کامیاب بنائیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تمام مضامین اُن کے تبحر علمی و وسیع النظری اور انصاف پسندی
کے شاہد عادل ہیں مولانا حالی نے بہت پرچ لکھا ہے کہ "حیدرمدی علی مسلمانوں کے دلوں کو اُن کے
بزرگوں کے کارنامے یاد دلاد لاکر اُچھارتے تھے اور جو کچھ کہ انھوں نے سیرت کی تائید میں لکھا وہ بڑے
استدلال و استقار سے لکھا۔ اکثر اُن کے مضامین جو ایک اچھی خاصی کتاب کے برابر ہیں بڑی مٹاش اور
محنت سے لکھے گئے ہیں۔ اسی طرح مولانا شبلی بھی ان کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ
میدان ادب میں وہ کسی شخص سے بڑے نزدیک سے پہچانے گئے ہیں اور اُن کا ایک خاص طرز فکر یہ ہے۔
ان کے طرز فکر کے خصوصیات یہ ہیں کہ عبارت نہایت زور دار ہوتی ہے مگر اس پر کبھی صفائی
اور سلاست اور حسن بیان میں فرق نہیں پڑتا اگر کہیں بُرے طرز کی تقلید میں عبارت گرائی اور رنگینی
پیدا کرنا چاہتے ہیں تو اُن کے صنائع و بدائع اور استعارات و تعقيلات بڑے نہیں معلوم ہوتے بلکہ حسن عبارت
کو اور بڑھا دیتے ہیں مگر یہ چھنا چاہیے کہ اس قسم کی پرکھ عبارت وہ زیادہ نہیں لکھتے تھے۔ انکے
زیادہ تر مضامین صاف سادہ اور لیس ہیں۔ علاوہ مضامین مذکورہ بالا کے اُن کی کئی کم مشہور تصنیف
سوائے آیات مینات کے نہیں ہے اہد یہ ایک مذہبی رنگ کی کتاب ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مولوی
ظفر علیاں نے ڈیرہ کی مشہور کتاب معرکہ مذہب و سائنس کا ترجمہ نواب صاحب موصوف ہی کی فرمائش سے
کیا تھا نواب صاحب نے خود اس میں انتقال کیا اور سرسید کے قریب دفن ہوئے۔

ذہب وقار الملک اخلافت علی گندھ کے خلیفہ ثانی نواب وقار الملک مولوی شاق حسین شیخ فضل حسین
۱۳۱۵ھ کے صاحبزادے تھے احمدیہ (یوپی) کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئے ایک

کیونکہ خاندان سے تھے مرفوع میں کسی اسکول میں پڑھاتے تھے اور زمانہ تھا میں مردہ میں کچھ سرکاری خدمات انجام دیں پھر رفتہ رفتہ سرشتہ دار اور منصرف صدر الصدور ہو گئے اور سریت کے ساتھ کام کرتے رہے سریت کی سفارش سے حیدر آباد پہنچے جہاں سرالار جنگ کے حکم سے ناظم دیوانی کے عہدہ پر ممتاز ہوئے اور اپنی قابلیت تن وہی اور دیانت سے حکام اعلیٰ کو مطمئن اور خوش رکھا سازشوں کی وجہ سے ان کو بھی حیدر آباد چھوڑنا پڑا مگر پھر جلائیے گئے اور دوبارہ انھوں نے نہایت عمدہ اور مفید اصلاحیں سرکاری کاموں میں کیں جن کے صلہ میں معزز خطابت و قوال الدولہ و قار الملک کا کار اصفیہ سے عنایت ہوا۔ ۱۸۹۱ء میں ملازمت کے گناہ کش ہو کر بقیہ عمر قوی کاموں میں علی بالخصوص علی گڑھ کانج کی اصلاح و ترقی میں صرف کردی۔ تو اب صاحب موصوف ۱۸۹۶ء میں سائنٹفک سوسائٹی کے ممبرانہ تہذیب الاخلاق کے مہتمم بھی ہو گئے تھے تصانیف آپ کی چند تسمیٰ مضامین میں "تہذیب الاخلاق" میں شائع ہوئے اور ایک انگریزی کتاب "فریخ ریور لیوشن اینڈ پولیس" کا اردو ترجمہ سرگزشت پولیس یوٹا پارٹ ہے جس کی تالیف میں منشی گلزاری اللہ اور بابو گنگا پرشاد نے بھی کچھ حصہ لیا تھا اور ۱۸۹۸ء میں مطبع نزل کشور سے چھپ کر شائع ہوا۔

مولوی چراغ علی | نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی ۱۸۹۴ء میں پیدا ہوئے والد کا نام ۱۸۹۴ء تا ۱۸۹۵ء مولوی محمد بخش تھا انھوں نے میرٹھ سہارنپور اور پنجاب میں سرکاری ملازمت

کر کے ۱۸۵۶ء میں انتقال کیا اور اپنے بعد چار لڑکے چھوڑے جن میں چراغ علی سب سے بڑے تھے چراغ علی ابتدائی تعلیم سے فراغت کر کے ضلع بستی کے محکمہ خزانہ میں مبلغ میں رہا ہوا پر مقرر ہوئے ۱۸۶۲ء میں عدالت جوڈیشل کٹر اندوہ کے ڈپٹی منصرف اور پھر سیتاپور کے تحصیلدار ہوئے ۱۸۶۷ء میں سریت کی کوشش سے حیدر آباد گئے جہاں نواب محسن الملک کی ماتحتی میں نائب مستمال ہشاہرہ چار سورہ پورہ مقرر ہوئے اور رفتہ رفتہ ترقی کر کے ریونیو اور پولیٹیکل سکرٹری کے معزز عہدہ پر ہشاہرہ پندرہ سو روپیہ ماہوار ممتاز ہوئے ۱۸۹۸ء میں انتقال کیا۔

مولوی چراغ علی نہایت بیدار مغز متدین غیر متعصب اور راست باز شخص تھے کتب بینی کا لالہ کو

اس قدر شوق تھا کہ مقامات دور دراز مثلاً مصر و شام سے کتابیں منگواتے تھے۔ ابتدائے عمر سے مضمون نگاری کا شوق تھا جس میں مذہبی رنگ غالب تھا۔ کبھی کبھی عیسائیوں یا دیوانوں سے بھی مقابلہ ہو جاتا تھا۔ جس میں سب اسلام کی خوبیوں کو نہایت مدد سے ثابت کرتے تھے یہ مطالعہ کتب کے عاشق اور پابندی اصول کے ایک سرگرم تھے۔ انکی تصانیف کثرت سے ہیں علاوہ ان کتابوں کے جو ملازمت جسدِ ابا کے زمانے میں حیدرآباد کے انتظامی محاللات اور سرکاری رپورٹوں وغیرہ کے متعلق انھوں نے لکھیں بلکہ جو عام پریسی کی ہیں شہور ہیں تحقیق ان کے بعد اسلاموں نے زانہ حکومت میں کیا کیا اصلاحات کیں۔ رسول بوقت اسلام کی زیادتی برتیں قدیم قوموں کی مختصر تاریخ ان کے علاوہ ان کے مضامین تہذیب الاخلاق اور ردہ خطوط مجموعہ سائل کے نام سے چھپیں اور چند امداد اور انگریزی پمفلٹ بھی ان کے جو مسائل اختلافی پر لکھے گئے تھے۔ مولوی صاحب صوف علاوہ ایک متحرر فاضل اور جید عالم ہونے کے فن منظرہ میں ایک بہت بڑی دستگاہ رکھتے تھے اور ان کو مکمل شکل مسائل میں دلنشین جواب دینے کا ایک خاص سلیقہ تھا۔ اور عبارت بھی نہایت نادر دار لکھتے تھے ہر چند کہ اُس میں ادبی شان کم ہوتی تھی۔

مولوی محمد حسین آزاد شمس العلماء، مولوی محمد حسین آزاد گزشتہ صدی کی تیسری دہائی میں دلی میں پیدا ہوئے ان کے والد مولوی بازر علی جنھوں نے شمالی ہند میں مضمون نویسی میں بڑی

متوفی ۱۹۱۰ء

شہرت حاصل کی تھی ذوق کے دلی دوست تھے۔ اسی وجہ سے آزاد کی ابتدائی تعلیم استاد ذوق کے سایہ عاطفت میں ہوئی انھیں کی بابرکت صحبت میں انھوں نے شعر گوئی اور فن عروض سیکھا آزاد چار دہائی کا لک کے تعلیم یافتہ تھے جس سے مولوی نذیر احمد مولوی ذکار اللہ سٹریٹ لال آئوٹ ایسے لائق اور ہنرمند لوگ پڑھ کر نکلے استاد ذوق کے ساتھ یہ بڑے بڑے شاعروں میں شریک تھے اور بڑے بڑے شعرا کے رفیق خاص ہوتے تھے اور انھیں ادبی حشر میں ان کا ذوق سخن سیراب ہوتا تھا۔ بعد از وفات ان کی مصیبتوں کے بعد آزاد اپنے وطن بنگلہ کھڑے ہوئے اور سرگرداں پھرتے ہوئے لکھنؤ پہنچے۔ ان کے والد کا انتقال غدر میں ہو چکا تھا اس لئے کہ کلام اور کچھ خود ان کا کلام جو پہلے کا تھا غدر میں ضائع ہو گیا تھا ہنگامہ غدر فروری کے بعد آزاد نے کمپاش کے مختلف ذرائع اختیار کیے کچھ دنوں تک ایک فوجی اسکول میں اسٹریٹ کے رفیقوں کے بعد اس کام کو چھوڑ دیا۔ آخر کا پھرتے پھرتے غدر میں لالہ ہوئے اور مولوی حبیب علی کندی سے بیعت من قبول

والدات

لفظت گوئی کہ میری مشق سے ملے جن کی سفارش سے مشق تعلیم کے حکم میں پندرہ روپیہ ہوا کے طراز میں ہو گئے
 چھوٹے ٹھکانے کی وجہ سے اتنا موقع نہیں ملتا تھا تھا تا کہ بڑے بڑے افسانہ سرکاری سے ملیں جو ان کی بیانات
 اور قابلیت کا لحاظ اور قدر کر کے ان کو کسی اعلیٰ عہدے پر بھیجیں ان کے اتفاق سے ماہر پیرایے لال آشوب کے ذریعہ سے
 جو ان کے ہی خواہ اور دوست تھے میر جگر صاحب کو لکھ کر مشق تعلیم تک رسائی ہو گئی جو علوم و الاسنہ مشرقیہ سے
 کمال ذوق رکھتے تھے۔ اور رسائی کی صورت یہ ہوئی کہ میر صاحب نے لفظ آباد کو مؤنث لکھا تھا جس
 کی نسبت تذکرہ دہلیت کا کچھ شبہ تھا۔ ماہر پیرایے لال نے آزاد کو بلایا اور ان سے اس کی بابت مدتیہ
 کیا گیا۔ انھوں نے "آباد" کو مذکر کہا۔ اور جب تذکرہ مانگی گئی تو یہ خبر سدا کا پڑھ لیا ہے۔ کس بھڑک کا آباد
 نسخہ میں معجون زر تباد ہے۔ اس وقت سے میر صاحب کی خدمت میں ان کی رسائی ہو گئی اور کچھ ترقی
 بھی ہو گئی سب سے پہلے یہ اردو فارسی کی درسی کتابیں لکھنے پر مامور ہوئے۔ چنانچہ فارسی
 کی پہلی اور دوسری کتاب اردو کی پہلی۔ دوسری اور تیسری اور قصص ہند اس زمانہ کی انکی مشہور
 تصانیف ہیں جو بیسیوں میں نہایت مقبول ہوئیں۔ اور انھیں تصانیف کی بدولت پنجاب میں کوئی تعلیم
 بہت رائج ہوئی آزاد کو یہ بھی فخر حاصل ہے کہ انھوں نے انجمن پنجاب کے قیام میں بہت بڑا حصہ لیا جسکی
 وجہ سے صوبہ پنجاب میں اردو کی ترقی اور ترویج ہوئی جب میر جگر صاحب کے بعد کرنل ہال لائڈ ان کو سرکار تسلیم مقرر ہوئے
 جن کو زبان اردو کا محسن سمجھا جاتا ہے۔ تو ۱۸۷۵ء میں آزاد نے کرنل صاحب موصوف کو
 اس بات پر آراء دیے کہ انجمن پنجاب کی سرپرستی میں ایک خاص مشاعرہ قائم کیا جائے جس کی غرض یہ ہو کہ
 اردو شاعری کی مبالغہ آمیز اور پر تصنع روش بدل جائے اور اس میں حقیقت اور اصلیت کی روح پیدا
 کی جائے ۱۸۷۵ء میں وہ کسی سرکاری کام سے کلکتہ اور پٹنہ من پھول کی معیت میں ایک سفارتی
 مشن پر کابل دہلی آگئے تھے۔ ایران وہ دہ مرتبہ گئے۔ پہلی مرتبہ ۱۸۷۵ء میں اور دوسری مرتبہ ۱۸۷۳ء میں
 تہران قادی سے ان کو ایک خاص لکھا دھکا اور اسی وجہ سے اس کا مطالعہ انھوں نے خاص طور پر کیا تھا لہذا
 ایران کے قیام نے ان کو جدید فارسی سے بھی آشناء کر دیا تھا۔ انھیں جوہ سے ان کی وہ تصانیف جو زبان
 فارسی کے متعلق ہیں کبھی اور معلومات سے پر ہیں۔ کرنل ہال لائڈ نے آزاد کو اتالیق پنجاب

ایک سرکاری اخبار کا سب ایڈیٹر شاہرہ چھتر دپسہ ماہوار مقرر کیا تھا۔ اور ایڈیٹر اسے بہادر
بیابے لال آشوب تھے جب تھوڑے عرصہ کے بعد یہ اخبار بند ہو گیا اور پنجاب میگزین "اُس کی جگہ
نکھاتر آزاد اُس کے بھی سب ایڈیٹر مقرر ہوئے اور اُن کے بعد مولانا حالی کچھ دنوں اس عہد پر متعین
رہے۔ آزاد گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی اور فارسی کے پروفیسر بھی ہو گئے تھے۔ ۱۹۰۷ء میں ملکہ دکنویس کے
جوبلی کے موقع پر اُن کی قابلیت کے صلہ میں اُن کو شمس العلماء کا خطاب عطا ہوا۔ دماغی محنت اور سفر
ایران کا تعب و داپنی پیاری بٹنی کی بے وقت موت کی وجہ سے جن کو وہ بہت عزیز رکھتے تھے اور
جن کو نہایت عمدہ تعلیم دلائی تھی اُن کے قوائے دماغی پر بہت بڑا اثر پڑا جس کی وجہ سے وہ عہد میں
کچھ جنون کے آثار معلوم ہونے لگے جس سے وہ کسی ادبی کام کے لائق نہیں رہے۔ آخر عمر تک یہی
حالت جنون کی رہی اور ۲۲ جنوری ۱۹۱۷ء کو اس جہان فانی سے رحلت کی۔

تصانیف آزاد کی حسب ذیل تصانیف ہیں۔ فارسی ریڈریس (۲ حصے) قدیم اردو ریڈریس (۲ حصے)
اردو کا قاعدہ و قواعد اردو قصص ہند۔ جامع القواعد نئی اردو ریڈریس (بہ حصوں میں) آبجیات
نیرنگ خیال۔ سخنران فارس۔ قند پارسی۔ نصیحت کا کرن پھول۔ دیوان ذوق۔ نظم آزاد۔ دوزخ بکری
نگارستان فارس۔ سپاس و حماک۔ جہانورستان۔

ریڈریس اور اسکولی کتابیں [اردو اور فارسی ریڈریس اور ابتدائی رسائل صرف دو خطبائے اسکول اور ابتدائی
کے واسطے لکھے گئے تھے۔ ان سب کی عبارت نہایت سلیس اور عام فہم ہے اور فی الحقیقت طلباء کے واسطے
وہ بہت مفید اور کچھ عرصہ تک داخل درس رہی بھی ہیں علی الخصوص قصص ہند جس میں تاریخ ہندوستان
کے مشہور مشہور حالات و واقعات عجیب و غریب بلیغ اور پُر زور عبارت میں لکھے گئے ہیں۔ یہ لبواب کتاب
جماعت طلباء میں اور نیرنگ خیال میں صحیح مقبول ہے اور اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں بچے اسکو
دب و پوائے قمار کے مجموعہ سمجھتے ہیں اور پڑھتے لکھتے اُس کی عبارت کے دلدادہ ہیں۔ جملوں کا توازن عبارت
کی جیسی الفاظ کی شکرہ اور مضامین کی ترتیب اس کی تجف جس کتابوں سے اُس کا درجہ بلند کر دیتی ہے۔
آبجیات مولانا آزاد کا شاہ کار اور اُن کی بہترین تصنیف آبجیات ہے۔ اس میں مشہور مشہور شعرا کے

مختصر حالات مع ان کے نمونہ کلام اور تنقید کے درج ہیں۔ اور زبان اردو کی تاریخ اور ان تغیرات کا بھی ذکر ہے جو زبان اردو میں وقتاً فوقتاً ہوتے رہے ہیں حقیقت میں اس کتاب کی تصنیف سے ایک بہت بڑی کمی پوری ہو گئی اس وجہ سے کہ گو کہ اس سے قبل اکثر تذکرے اور مجموعہ اشعار موجود تھے۔ مگر وہ قابل اعتناء نہ تھے اور نامکمل بھی تھے۔ بعض کا تو یہ حال تھا کہ مشہور مشہور شاعروں کا حال صرف چند سطروں میں لکھ دیا۔ اور ان میں بھی آدھے سے زیادہ محض کلمات توصیف و تحسین۔ ادب اردو آزاد کا نمونہ ہے کہ انھوں نے ایک باقاعدہ اور مفصل تذکرہ شعر اترتیب دیا جس کے واسطے یقیناً ان کو بڑی محنت اور کاوش کرنا پڑی ہوگی۔ وہ ایک ایسا خزائنہ معلومات ہو کہ جس کے مابعد کے مصنفین بہت کچھ مدد لے سکتے ہیں اور لیتے رہے ہیں۔ علاوہ اس خوبی یعنی گنینہ معلومات ہونے کے اس کی اصلی خوبی اس کی بے مثال طرز عبارت ہے کہ جس کی نقل کی سب کوشش کرتے آئے ہیں مگر کما حقہ کوئی نہیں کر سکا۔ الخ آزاد نے آب حیات لکھ کر ادب اردو میں ایک جدید طرز کا اضافہ کیا جو مثل حالی کے سادہ اور عاری اور زریں زینت نہیں اور نہ مولوی نذیر احمد کی طرح ثقیل اور وزنی ہے وہ ایک رداراد سب سے جدا رنگ رکھتی ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس میں کچھ ایسی خوبیاں ہیں جو احاطہ بیان سے باہر ہیں اور صرف دل ان سے لطف اٹھاتا ہوگا اسی کے ساتھ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مولانا نے اپنے جوش و شوق میں تاریخی مواد کو غور و خوض سے نہیں دیکھا غیر موثقی اور غیر معتبر حوالوں کی بنیاد پر صرف ایک عماد میں گھڑی کر دیں۔ اور بعض جگہ کتاب میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے واقعات میں کمی دہشی اور تبدیلی تک کو جائز رکھا۔ مگر زمانہ حال کے تجسس و تلاش اور تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ آب حیات کے اکثر بیانات غلط یا کم از کم مشکوک ضرور ہیں اکثر جگہ جانب داری کا الزام بھی مصنف پر عائد ہوتا ہو۔ مثلاً اپنے استاد ذوق کی بیحد تعریف و توصیف ادا ان کے حالات میں شغف اور مرزا خاں کے کمالات سے نسبتاً بے پردائی بلکہ جگہ جگہ پر پردہ چوہیں پر پردہ و تیر کے خاندان کو کم کر کے دکھانا انشا کے آخری زمانے کے عبرت انگیز غیر موثقی حالات غیر ادرسی قسم کی باتیں جو اب افنی مطالعہ پر نظر آئی ہیں۔ آب حیات کے اکثر بیانات کے متضاد اور مخالف واقع ہیں پھر بھی اگر اس قسم کی اد بھی غلطیاں کل آئیں تو اس سے ہماری رائے میں کتاب کی اصلی خوبی اور قدر و قیمت میں کوئی زیادہ فرق

نہیں آتا۔ اسی کتاب تنقید کا صحیح معیار اردو میں قائم ہوا۔ حالی کی یادگار غالب کو اسی کتاب کے مطالعہ کا
 نتیجہ سمجھنا چاہئے مختصر یہ کہ بحیثیت ایک قدیمی تذکرہ کے بحیثیت ایک خزانہ واقعات و حکایات کے بحیثیت
 غیر قابل تقلید ہونے کے یہ کتاب اپنے جواب کا ادراک آئندہ بھی اس کا جواب مشکل معلوم ہوتا ہے۔
 نیرنگ خیال [یہ بھی ایک جدید رنگ کی کتاب ہے جس میں خیالی افسانوں اور خواب وغیرہ کے پردہ میں
 عمدہ اخلاقی نتائج نکالے ہیں۔ یہ دو حصوں میں مشتمل ہے تھینف ہوئی تھی۔ اس قسم کے فرضی افسانے
 اور حکایات ہر زمانہ اور ہر قوم میں لوگوں کے مطبوع خاطر رہے ہیں۔ یونانی اور رومی لوگوں کو ان کا بہت
 شوق تھا۔ انگریزی میں ایڈلین جان نین اور اسپنسر کے ایلگری (خیالی قصے) مشہور ہیں اور اسی شیخی
 مولانا روم اور آذر شہلی سنسکرت میں ہتو اپدیش اور عربی میں اخوان الصفا وغیرہ۔ سہارن خیال میں آزاد
 نے اپنے قصوں کی بنیاد یونانی قصوں پر رکھی ہے اور اس سے ان کی یونانی علم الاصنام کی واقفیت کا
 بہت کچھ پتہ چلتا ہے۔ ڈاکٹر ٹریٹرنے ان کو اس کتاب کے لکھنے کی ترغیب دی تھی اور اس کا خاکہ تیار کر دیا
 تھا۔ مگر یہ بڑی قابل تعریف بات ہو کہ مولانا آزاد باوجود انگریزی کم جاننے کے اسلا تباع میں کامیاب ہوئے
 یہ کتاب ان کے خاص طرز تحریر میں لکھی گئی ہے مگر نفس مضمون سے زیادہ طرز بیان بہت دلچسپ ہے۔
 سخندان فارسی ادب فارسی کے متعلق یہ کتاب بھی بہت دلچسپ ہے۔ دراصل یہ ایک قیمتی رسالہ علم فلاوہی پر
 ہے جس میں فارسی اور سنسکرت زبانوں کو متحد اصل ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسماعیل ایران کے
 رستم در فاج کا بھی ذکر ہے ان کا مقابلہ سندوستان سے کیا ہے۔ خود مصنف کے سفر ایران اور ان کے
 علمی کاشفات کے حالات بھی درج ہیں۔ مثل مولانا شبلی کی شعراجم کے یہ ایک مکمل کتاب نہیں کہی جاسکتی
 مگر پھر بھی بہت مفید اور ایک ذخیرہ معلومات ہے۔

تذہارسی اور نصیحت کا کرن بھول [تذہارسی ایک مفید کتاب ہے جس سے زمانہ حال کی فارسی کے حاصل
 کرنے میں بہت کچھ مدد مل سکتی ہے۔ ان میں مولانا کے سفر ایران کے بھی بہت کچھ حالات درج ہیں
 نصیحت کا کرن بھول جو ایک مکالمہ اور نصائح کے پیرایہ میں ہے بچوں اور عورتوں کے لیے بہت
 ہے۔ اس کی عبارت بہت صاف و سلیس ہے۔

دیوان ذوق | اس کتاب کی ترتیب تالیف سے مولانا آزاد نے ادب کی پیش ہا خدمت انجام دی ہو اور اپنے استاد کے کلام کو گمنامی سے بچایا ہے۔ تذکرہ آب حیات میں انھوں نے نہایت مؤثر اور زندہ لکھنؤ سے اور تفصیل کے ساتھ استاد کے کلام کا ضائع ہو جانا اور پھر ان اجروائے پریشاں کو بڑی محنت اور دقتوں سے جمع کرنا بیان کیا ہو۔ دیوان کے شروع میں ایک مختصر دیباچہ ہے اور بعض بعض غزلوں کے ساتھ ان کے حالات تصنیف پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اور بیشتر کے مکتوب کلام سے ایک تین اضافہ بھی آیں موجود ہے ان دلچسپ نوٹوں سے نہ صرف اشعار کی قدر و قیمت بڑھ گئی ہے بلکہ اس میں ایک دیوان کی سی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ بعض لوگوں نے الحاق کلام پر تنقید بھی ظاہر کیا ہے مگر ہمارے نزدیک قسم کے شکوک بے بنیاد ہیں اور ان پر زیادہ نہ خیال کرنا چاہئے۔

دربار اکبری | یہ اہم بالشان تصنیف اکبر شاہ کے عہد اور ان کے اراکین سلطنت کے حال میں ہے اس کتاب کی عبارت اپنے رنگ میں لاجواب ہے۔ افسوس ہو کہ اس پر نظر ثانی نہ ہو سکی۔ اس کتاب میں عہد اکبری کی جتنی جاگتی تصویریں ہیں۔

دیگر تصانیف | پاس دندانک، روز جانورستان، اُس زمانے کی تصانیف میں جبکہ مولانا صحیح الدماغ نہ رہا تھے۔ اول الذکر ایک غمزدہ مجموعہ مقصودانہ خیالات کا جو اُس عالم میں لکھے گئے تھے۔ اس سے کتنا بڑا شوق تصنیف و تالیف کا پایا جاتا ہے کہ باوجود تپن دماغ کے بھی جب کبھی چند لمحے سکون کے ملتے تھے تو وہ اُن کو ادبی کاموں میں صرف کرتے تھے۔ اسی زمانے اور اسی حالت کی تصنیف "جانورستان" بھی ہے جس میں کچھ جانوروں کے حالات اور ان کی آوازوں کا بیان ہو، نگارستان فارس جو بعد ان کے انتقال کے شائع ہوئی ایران، ہندوستان کے فار کا شعراء کا ایک مختصر تذکرہ جو جیس ڈک کی سے لے کر جوہر اور واقف داندو تک تقریباً ۲۷ شعراء کے حالات مع ان کے نمونہ کلام کے درج ہیں۔ اس کی زبان بہت صاف و سادہ مگر مثل آب حیات کے پُر لطف نہیں ہے۔ شاید اس وجہ سے کہ یہ ان کے ابتدائی تصنیفات میں سے ہو۔ آخری کتاب جو ان کے نام سے ان کے پوتے نے شائع کی ہے "آب حیات" ہو۔

آزاد کا مرتبہ، آزاد خانوں میں، آزاد نگاروں میں آزاد کی ایک بہت وقیع اور بہت نمایاں ہستی ہو، بحیثیت

بانی تحریک جدید ہونے کے بحیثیت جدید طرز کے شاعر کے بحیثیت ایک فارسی اسکالر کے جو قدیم رنگ کے ساتھ جدید رنگ کے بھی بڑے ماہر تھے۔ بحیثیت ایک مروج تعلیم کے۔ جن کی وجہ سے پنجاب میں انگریزی کے ساتھ اُردو فارسی کی تعلیم نے بھی بڑا رواج پایا۔ بحیثیت ایک اعلیٰ مصنف نگار کے بحیثیت ایک نثر بردست ناقد کے۔ بحیثیت ایک مشہور پردفیسر اور مصنف کے۔ بحیثیت حاجی اُردو کے۔ بحیثیت ایک نثر بردست مقرر کے اُردو اپنے زمانہ میں عظیم المثال تھے۔ مگر وہ چیز جس نے اُن کو زندہ جاوید کر دیا وہ اُن کا خاص طرز تحریر ہے جو لائقِ ثناء ہے اور جس کی تقلیدِ کمال ہو۔ زبان اُردو نے اُن کی ذات میں اپنا ایک بہت بڑا ردِ گار اور حامی پایا تھا۔ اُن کے طرزِ تحریر کی یہ خاص صفت ہو کہ فارسی اور عربی کے غیر مانوس لفاظ اور ترکیبیں اور دورِ راز کارِ صنائعِ بدائع جن کا آجکل بہت رواج ہو اس میں نہیں پائے جاتے اُن کی عبارت کی خاص شان ہو کہ بھاشا کی سادگی اور بے تکلفی۔ انگریزی کی صاف گوئی اور فارسی کا حسنِ خوبصورتی اس میں ملتی جلتی ہوتی ہے۔ وہ تصنیفات اور تکلفات سے گو کہ عاری ہے مگر لطیف استعارے اور خوبصورت تشبیہیں اُس کے حسن کو دوبالا کرتی ہیں۔ وہ ایک موسیقیت رکھتی ہے۔ آزاد کا مقابلہ انگریزی انشا پر اذدیں میں وی کوٹنسی۔ لیمب اور ایڈنسن سے جو صاحبانِ طرز خاص تھے بخوبی ہو سکتا ہے اپنے زمانے میں بھی آزاد بہت ہر دل عزیز اور مقبول ہو چکے تھے اور اُن کے معاصرین ان کو بہت قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے چنانچہ حالی نے اب حیات اور نیرنگ خیال کی تقریظوں میں اُن کی بہت تعریف کی ہے اور شاعری کے طرزِ جدید کا ان کو بانی قرار دیا ہو۔ اسی طرح مولانا شبلی اُن کو اُردو کا ایک بہت بڑا ہیرہ سمجھتے تھے اور ان کی موت پر ان کو خدائے اُردو کہہ کے یاد کیا۔ مولوی نذیر احمد اور مولوی ذکاء اللہ بھی اُن کے بڑے مداح اور قدردان تھے۔

آزادِ طریقِ لطیف۔ نہایت ہندو متین اور تعصب سے بالکل آزاد تھے۔ وہ سریع الغیظ مگر جلد معاف کر دینے والے تھے۔ بعض معاصرین سے چشمِ برہمی تھی جس کا انجام بحث و مناظرہ کی صورت اختیار کر لیتا تھا۔

حالی | خواجہ الطاف حسین حالی کا ذکر بحیثیت شاعر کے حصہ نظم میں ہو چکا ہے۔ یہاں بحیثیت معزز و متحرک

اُن کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اُن کی تصانیف حسبِ ذیل ہیں۔ تریاقِ مسموم مطبوعہ ۱۸۶۲ء، علم طبقات الارض کی ایک عربی کتاب کا ترجمہ۔ مجلسِ النساء (۱۲ حصوں میں) مطبوعہ ۱۸۶۴ء، حیاتِ سعدی مطبوعہ ۱۸۶۶ء، مقدمہ شعر و شاعری، یادگارِ غالب مطبوعہ ۱۸۹۶ء، حیاتِ جاوید یعنی سرسید مرحوم کی سوانح عمری مطبوعہ ۱۹۰۷ء، مضامینِ حالی یعنی ان مضامین کا مجموعہ جو وقتاً فوقتاً اخبارات و رسائل میں چھپے ہیں۔

ابتدائی تصانیف | "تریاقِ مسموم" پانی پت کے ایک شخص کے اعتراضات کا جواب ہو جو مسلمان سے عیسائی ہو گیا تھا اور جس نے اسلام پر اعتراضات کیے تھے۔ ایس کوئی ادبی خوبی نہیں بعض اس لیے دلچسپ ہے کہ اس سے ان کی ذکاوت اور طباطبائی کا پتہ چلتا ہے و طبقات الارض "ایک عربی کتاب کا ترجمہ ہو جو خود فرانسسی سے کیا گیا تھا۔ یہ کتاب ڈاکٹر طلیح کے زمانے میں پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہوئی تھی، مجلسِ النساء، ایک انعامی رسالہ ہے جس کے صلہ میں مولانا کو مبلغ چار سو روپیہ کا انعام لاڈلہ نار تھ بروک والیئر نے مندر نے عطا کیا تھا۔ یہ عورتوں کے واسطے بہت مفید ہو اور لڑکیوں کے اسکولوں میں ایک عرصہ تک بحیثیت درسی کتاب کے داخل رہی ہے۔ اس میں بہت ایسے الفاظ و محاورات ہیں جو شریف گھرنے کی عورتیں بولتی ہیں۔

حیاتِ سعدی | حیاتِ سعدی یعنی شیخ سعدی شیرازی کی سوانح عمری اس سے مولانا نے اردو قارئین کی صفِ اول میں جگہ پائی اور ان کی سوانح نگاری کی قابلیت اور اسلوب بیان کا پتہ چلا۔

مقدمہ شعر و شاعری | مولانا کے دیوان کے شروع میں یہ معرکہ الاسرار مقدمہ ہے جس نے اردو کی ادبی دنیا میں ایک انقلابِ عظیم پیدا کر دیا۔ اور مولانا کی شہرت کا یہی سنگِ بنیاد ہے۔ ہمیں دوسرے زیادہ صفحات ہیں اور گو کہ دیوان کے ساتھ چھپا ہو مگر اس کو دیوان سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ ایک نہایت قابلہ تنقیدی مضمون نفسِ شاعری کے اُمڈیل (انتہائی نقطہ خیال) پر ہے۔ اسکی تصنیف سے بڑے تجسس و تلاش اور وسیع النظری کا پتہ چلتا ہے۔ ہمیں یونانی اور رومی انگریزی و عربی نقادانِ فن شعر کے خیالاتِ شریکِ بابت قلبند کیے گئے ہیں ہر چند کہ نہایت محلِ اور غیر مربوط طریقے سے اُن کا ذکر کیا گیا ہو مگر وہ بینِ شاعری میں مولانا حالی سے تک غوطہ نہیں لگا سکتے کیونکہ اس بحر کے وہ شاعر نہیں ہیں سنسکرت کی شاعری کو بوجہ عدم واقفیت زبانِ بالکل

چھوڑ دیا ہے۔ مگر باوجود ان سب کے کتاب ایک ذخیرہ معلومات ہو اور اس وجہ سے کہ اس قسم کے فن تنقید میں سب سے پہلی تصنیف ہے نہایت قابل قدر ہے۔ اس کی بڑی خوبی یہ ہو کر ایک ایسے شخص کے قلم سے نکلی جو مغربی تعلیم سے بالکل نا آشنا تھا۔ اس کے مطالعہ سے قدیم طرز کے شعرا کے سامنے جدید معلومات اور تخیل کے دروازے کھل گئے ہیں۔ مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس کتاب کی تقلید میں زمانہ موجودہ کے اکثر ادیب کے ساتھ اکثر نقدمات لا طائل شائع ہوتے رہتے ہیں جن کا خدو و حقیقت یہی مقدمہ شعر و شاعری ہو اور کسی جدید بات کا اضافہ نہیں کیا جاتا۔

یادگار غالب مولانا کی سب سے زیادہ ہر دل عزیز تصنیف یادگار غالب ہے جس سے بہتر کوئی کتاب اس طرز کی اب تک نہیں نکلی۔ اس میں مرزا غالب کی زندگی کے حالات و واقعات ان کے لطائف و غزلیات وغیرہ نہایت عمدہ اور دلچسپ پیرایہ میں بیان کیے ہیں اس کے بعد ان کے ہر قسم کے کلام پر باقدار نظر ڈالی گئی ہے۔ بڑی خوبی یہ ہو کہ چونکہ مصنف مرزا صاحب کے شاگرد تھے لہذا اکثر واقعات چشم دید لکھے ہیں مکمل اشعار کے معانی بھی سمجھائے ہیں اور ان مواقع کا بھی بیان ہو جب اشعار لکھے گئے تھے جس سے اشعار کا لطف دو بالا ہو جاتا ہے اور اس تصنیف کے ذریعہ سے حالی نے اپنے استاد غالب کی شاگردی کا حق اسی طرح ادا کر دیا جس طرح کہ آزاد نے دیوان ذوق کو ترتیب دے کر ذوق گوشت و جاہید بنا دیا۔ دونوں نے اپنے استادوں کے شاگرد و شاہدوں سے چاہنے والے تھے۔ یادگار غالب، تنقیدی کتابوں میں ایک ممتاز درجہ رکھتی ہے تنقید گو کہ اعلیٰ درجہ کی ہو مگر پھر بھی جو ش عقیدت مندی کہیں کہیں جاوے انصاف سے ہٹا دیتا ہو۔

حیات جاوید حالی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ کتاب ہے جس کی وجہ سے خود انھوں نے حیات ابدی پائی۔ یہ ایک بہت مفصل اور جامع ضخیم کتاب ہے۔ اس میں ہر شے درج کی گئی اور مختلف احوال کثیر الاشغال زندگی کے حالات اس قدر تفصیل کے ساتھ درج ہیں کہ اس کو زبان اردو میں ہی مرتبہ حاصل ہو گیا ہے۔ باسویں کی مشہور کتاب ڈاکٹر جانسن کی لائف، کو انگریزی میں ہوا ہے۔ یہ سید بحیثیت ایک لیڈر اور درویش اور اہل قلم کے دکھائے گئے ہیں۔ یہ سید کے ساتھ ان کے اکثر شرکائے کار کے بھی حالات اس میں درج ہیں۔ ایک مہتمم بالشان تصنیف ہے۔ اس میں ہر دیکھنے والے کی تعریف میں مبالغہ کیا گیا ہے اسی وجہ

مولانا شبلی کا یہ اعتراض بالکل صحیح ہے کہ اس کتاب میں تصویر کا صرف ایک رخ دکھایا گیا ہو معائنہ
یا ترجمہ پوشی کی گئی ہے بیان کی کوئی توجیہ کر دی گئی ہے مگر ہادی رائے میں اس زمانے کی تصانیف
کو اتنی سختی کے ساتھ جانچنا مناسب نہیں ہے۔ اس وجہ سے کہ سوانح نگاری اور فن تنقید ہمارے یہاں
ابھی ابتدائی حالت میں ہیں اور زیادہ تر قطع و برید سے بجائے نفع کے نقصان کا احتمال ہے۔
مضامین عالی ارہ مضامین ہیں جو مولانا نے وقتاً فوقتاً اخبارات و رسائل میں علی انحصار مصلحتیں لایا
میں چھپوائے ہیں۔ ان کے علاوہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے مکاتیب کا ایک مجموعہ بھی انھوں نے
ترتیب دے کر چھپوایا ہے

طرز تحریر | مولانا کی عبارت نہایت صاف سادہ اور زبردست اندر در اندر ہوتی ہو گی اگر اس میں زیادتی
مسی شرمی اور رنگینی اور مولانا نذیر احمد کی سی نازک اور لطیف طرائف نہیں ملتی۔ حال گو کہ صاحبِ ذہن نہیں
مگر بہترین شاعر ہیں۔ وہ اسلوب بیان سے زیادہ نفس مطلب کا خیال رکھتے ہیں بدائع بدائع کی زبان کے
یہاں کثرت سے اور زبان کا بیجا استعمال وہ کرتے ہیں بعض تغاضی اور عبارت آرائی وہ کبھی نہیں کرتے
اور عبارت کی ظاہری آرائش سے وہ قطعاً احتراز کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کی عبارت بہت سلیس ہوتی
اور صاف ستھری ہوتی ہے۔ گو کہ وہ بلند پروازی نہیں کرتے مگر زور بیان اور فصاحت ان کی عبارت
بالا مال ہوتی ہے۔ جدید نثر اردو نے ان کو اپنا بہت بڑا حامی اور مددگار پایا اور انھوں نے مرنا غا
اور سرسید کے طرز تحریر کو زندہ رکھا۔ ان کی تصانیف آئندہ نسلوں کے واسطے بہترین نمونہ بھی جاسکتی ہیں۔

مولانا نذیر احمد ^{۱۸۳۱ء} شمس العلماء خان بہادر مولانا نذیر احمد وضع ریسرٹ بجنور میں ۱۸۳۱ء میں
لغایت ^{۱۹۱۲ء} پیدا ہوئے ان کا خاندان علم و فضل کے لیے مشہور تھا۔ والد کا نام مولوی سعادت علی

تھا۔ اور انھیں سے انھوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی اس کے بعد مولوی نصر اللہ ڈپٹی کلکٹر بجنور سے بھی کچھ
پڑھا اور دہلی میں اگر ۱۸۷۳ء میں مولوی عبدالغنی الن کے شاگرد ہوئے جن کی پوتی سے انھوں نے عقد بھی کیا
دہلی کلکٹ کے مشہور پروفیسر عربی مولوی ملوک علی کے اصرار سے وہ دہلی کالج میں داخل ہوئے اور وہاں
ادبِ بی اور فلسفہ دریاغی وغیرہ میں تکمیل حاصل کی۔ کالج کے پرنسپل مسٹر ٹیلر کی ترغیب سے انگریزی بھی شروع کی

مگر والد کی مخالفت کی وجہ سے چھوڑنا پڑی۔ اس زمانہ میں ان کے ہم سبق حالی آزاد انشی کویم الدین مولوی
 ذکا واللہ اور پیارے لال اشوہجے لائل اس زمانہ کے ادر بڑے لوگوں کے مولوی نذیر احمد نے بھی
 زندگی کی ابتداء ایک چھوٹی سی ملازمت سے کی یعنی وہ پنجاب میں کسی مقام میں میسٹریس روپیہ ہوار کے
 پیچھے مقرر ہو گئے تھوڑے دنوں کے بعد ڈپٹی انسپکٹر مارسس بمشاہرہ سوڈ پیہ ہوار مقرر ہوئے۔ غدر کے
 زمانے میں انھوں نے کسی میم کی جان بچائی تھی جس خدمت کے صلہ میں ایک تمغہ اور کچھ زر نقد سرکار سے ملا
 اور انسپکٹر مارسس کے درجہ پر ترقی ہوئی۔ اس کے بعد ان کا تبادلہ الہ آباد میں ہو گیا اور یہیں انھوں
 نے تھوڑی سی انگریزی سیکھ لی۔ کیوں کہ ان کو نہایت شرم و حجاب معلوم ہوتا تھا کہ جو زبان حاکم و محکوم کے
 درمیان تبادلہ خیال کا ذریعہ ہے اس سے وہ محروم ہیں۔ اپنی طبائی اور ذہانت انھوں نے چھ مہینے کے
 اندر انگریزی میں کافی مہارت پیدا کر لی اور بعد کو کتب بینی سے وہ اس قابل ہو گئے کہ ۱۸۷۱ء میں نڈا
 بنیل کوڈ کے ترجمہ کی خدمت پر منجملہ دیگر اشخاص کے وہ بھی مقرر ہوئے۔ ان کا ترجمہ (مجموعہ تعزیرات)
 ایسا مقبول ہوا اور پسند آیا کہ اس کے بعد وہ تحصیلدار اور پھر افسر بندوبست ہو گئے۔ انھوں نے نجوم کی
 بھی ایک کتاب کا ترجمہ کیا تھا جس کو اس زمانہ کے نڈیٹ کشمیر نے لکھا تھا۔ اور مبلغ ایک سو اڑھائی
 پانچ اٹھان کی قابلیت کا شہرہ سن کر سر سالار جنگ اول نے ان کی خدمات کو رمنٹ سے اپنے یہاں منتقل
 کرالیں اور افسر بندوبست بمشاہرہ آٹھ سو روپیہ ہوار مقرر کیا۔ اسی عرصے میں انھوں نے قرآن شریف بھی
 حفظ کیا۔ اور بعد کو سر سالار جنگ کے ایسا سے انگریزی ملازمت چھوڑ کر حضور نظام کی مستقل ملازمت اختیار
 کر لی جس میں وہ ترقی کرتے کرتے اعلیٰ ممبرل بمشاہرہ ستر سو روپیہ مقرر ہوئے اور ان کے بیٹے اور
 اعزہ کو مستقل سبکیں اچھے اچھے عہدوں پر دی گئیں۔ سر سالار جنگ کے حکم سے انھوں نے ایک نصاب
 تعلیم تیار کیا تھا۔ اور سر سالار جنگ کے صاحبزادہ ذوالائق علی خاں ان کے شاگرد تھے۔ ایک قصہ تک
 اپنے عہد کے فرائض منصبی انجام دے کر ملازمت سے دست کش ہو گئے اور بقیہ عمر اپنے وطن ٹونڈی میں
 یاد آگئی اور تصنیف و تالیف کے مشغول میں بسر کی۔ ۱۹۱۷ء میں ایک نہایت کامیاب مصروف زندگی کے
 بعد اس جہان فانی سے عالم جادوئی کی طرف رحلت کی اور ملت قوم کو اپنا سوگوار چھوڑ گئے۔

مولانا دھون سرسید کی اس جماعت کے ایک مؤثر زبردست تھے کہ جنہوں نے اپنی تصنیف و تالیف اور اپنے لکھنؤ کے ذریعہ سے اپنے ہم مذہبوں کی ترقی میں بڑی امانت کی تھی۔

تصانیف مولانا کی تصانیف بہ کثرت ہیں جن میں سے حسب ذیل بہت شہور ہیں (از قسم ناول و حکایات) مراۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصور، ابن الوقت، محسنات، ایامی، روایۃ عہد، منتخب حکایات (کتب سندھی و اخلقی) ترجمہ قرآن شریف، ادبیۃ القرآن، مہ سورہ الحق و القرآن، مطالب القرآن، امہات الامة، رحمتاد (مترق کتابیں) صغر صغیر، رسم الخط، موعظہ حسنہ، اقتصاد غدر، نصاب خسرو، چند پند، مبادی الحکمت، مائینیک فی الصغر، مجموعہ لیکچر اول انگریزی قانونی کتابوں کے ترجمے مثلاً تعزیرات ہند قانون شہادت وغیرہ۔

مولانا کثیر التصنیف اور سریع التصنیف دونوں تھے ان کی اکثر کتابیں تلامذہ مائینیک فی الصغر، مبادی الحکمت، منتخب حکایات، رسم الخط وغیرہ اسکول کے طلباء کے واسطے لکھی گئیں اور واقعی ان کے واسطے بہت مفید ہیں سرکاری اسکولوں کے ترجمے گورنمنٹ کے حکم سے کیے گئے مجموعہ تعزیرات ہند یعنی پائل کوڈ کے ترجمہ کو ان کا ایک کارنامہ سمجھنا چاہیے اس شہر قانون کے تربی کے واسطے پہلے مولوی کریم بخش اور مولوی عظمت الشیر مقرر ہوئے تھے پھر سر ولیم مورلینٹ گورنر کے حکم سے مولوی نذیر احمد ان کے کام کی نگرانی اور نظر ثانی کے لیے مقرر ہوئے اور انہوں نے بڑی محنت و جانفشانی ادبی قابلیت سے یہ کام انجام دیا۔ ان کے تمام قانونی تراجم نہایت عمدہ اور صحیح ہیں جس میں اکثر جگہ نہایت مناسب اور ٹھیک لفاظی مشکل الفاظ انگریزی کیلئے اردو میں ضائع کیے گئے ہیں جو اب باطنی اظہار ہو گئے ہیں قانون شہادت یعنی ایوی ڈنس ایکٹ کا ترجمہ لپرون کی کتاب سے کیا گیا ہے "افادہ غدر" ایڈورڈ صاحب کی ایک کتاب کا ترجمہ ہے جس میں انہوں نے غدر، عداوت، بعض دہسپ، مسوختات کو مذکور کیا ہے۔ ان کے علاوہ سات آٹھ چھٹی چھٹی مختصر کتابیں اور رسائل میں جو قیام حیدر آباد کے زمانے میں وہاں کے مال کے لیے بطور ہدایت نامہ لکھے گئے تھے گہے نہیں۔

کتب منظرہ و متعلق مذہب اس زمانے میں مسلمانوں اور عیسائی و اہل مذاہب سے جن میں سے بعض دین اسلام

چھوڑ کر بھی ہو گئے تھے اکثر مباحثے رہتے تھے اور بڑے بڑے لوگ مثلاً مسرید مولوی چرخ علی
 زاب حسن الملک وغیرہ ان میں بڑی دلچسپی لیتے تھے۔ ایک عیسائی مبلغ احمد شاہ نامی نے اہمات المؤمنین کے
 مہم سے ایک کتاب لکھی تھی جس میں مغیر اسلام کی اذواج طہرات کی نسبت کچھ بیجا الزامات قائم کیے تھے
 مولوی نذیر احمد نے اس کے جواب میں اہمات الائمہ لکھی جس کی بعض لوگوں نے توہمت قدس کی مگر
 بعض نے سخت برا سمجھا اور اس کے بارے میں تنازعہ اعلان کر دیا کہ اس کی جلدیں آخر میں جلادی گئیں
 اور وہ دوبارہ بعد ترسیم چھاپی گئی مولانا کا سب سے بڑا کارنامہ ان کا اردو ترجمہ قرآن شریف ہے جو
 نہایت آسان اور بجا دورہ زبان میں کیا گیا ہے۔ اس سے ان لوگوں کو ٹرانسلیٹ ہو چکا جو قرآن شریف کو
 ازبر بلا منہ سمجھ یا ذکر کیا کرتے تھے۔ اس سے پیشتر جس قدر ترجمے قرآن شریف کے ہوئے تھے ان کی زبان
 قدیم تھی اکثر الفاظ مترک ہو گئے تھے اور ترجمہ تحت اللفظ تھا اسی وجہ سے مقبول عام نہ تھا۔ مولانا
 نے چار عالموں کی مدد سے پورا ترجمہ نہایت محنت و جان کا اہی سے تین برس کے عرصہ میں پورا کر دیا
 مگر اس میں بھی اتنا نقص ضرور ہے کہ بعض جگہ ترجمہ کی متانت قائم نہ رہی اور اصل الفاظ کا مطالبہ وہ
 الفاظ و عبارات کے یہاں تصرف سے جانا دیتا ہے اور نیز یہ کہ کثرت تشریح اور اضافہ تفسیلات کی وجہ سے
 ترجمہ ترجمہ نہیں رہتا بلکہ ایک تفسیر کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ آخر عمر میں انھوں نے ادعیۃ القرآن
 وہ سورہ اور الحق والذالض تعریف کیس جن میں سے آخر الذلک ایک بہت جامع اور مکمل کتاب ہے
 ان کی آخری تصنیف جو نا مکمل رہی مطالب القرآن ہے یہ اب چھپ گئی ہے مولانا کے پاس ایک
 مطبع بھی تھا جس کا نام شمسی پریس تھا اسی میں ان کی تصانیف چھپا کر تھیں۔

اخلاق ناول | سب سے پہلی کتاب جس سے مولانا کی شہرت کو ترقی ہوئی ان کا ناول "مرآة العروس" ہے
 جو ایک معتز مسلمان خاندان کی پرائیوٹ زندگی کا ایک قصہ ہے۔ اس کی تصنیف دس وقت ہوئی تھی
 جب مولانا ڈپٹی کلکٹر تھے قصہ کا ماحصل صرف اس قدر ہے کہ ایک جاہل بے پڑھی لکھی لڑکی ایک
 شریف گھرانے کی تعلیم کے ذریعہ سے کیونکر بدل گئی۔ یہ کتاب مسلمانوں اور ہندوؤں میں مقبول
 اور عورتیں اس کو بہت ذوق و شوق سے پڑھتی ہیں۔ اس کی زبان نہایت سلیس و بامحاورہ ہے

تعب معلوم ہوتا ہے کہ مصنف عورتوں کی خاص زبان اس قدر صمیم اور بامحاورہ لکھنے پر کیونکر قادر ہوئے۔
 اس کتاب کو ہر ملک میں بھی بہت مقبولیت حاصل ہوئی اور گورنمنٹ نے بھی ایک ہزار جلدیں خریدیں اور
 ایک ہزار روپیہ لائق مصنف کو انعام دیا۔ اس کا ترجمہ ہندوستان کی اکثر ڈسٹریکٹوں میں ہو گیا ہے
 دوسری کتاب نباتات اقدس ہے جو مرآۃ العروس کے بعد اس طرز پر عورتوں کی تعلیم کی غرض سے
 لکھی گئی۔ اس میں بھی نہایت مفید اور دلچسپ باتیں عام معلومات اور مبادی سائنس کے متعلق
 جگہ جگہ کی صورت میں درج ہیں اس کی بھی پہلا ورگڈنٹ دونوں نے بڑی قدر کی۔ اس کے بعد
 توبہ النصوح کا نمبر ہے جو مولانا کا سب سے بہترین ناول سمجھا جاتا ہے اس میں مختصر طور پر انھوں نے
 تقصیر کے طریق پر یہ دکھلایا ہے کہ ایک ناسق و فاجر شخص جس کا نام نصوح ہے سخت سہمنہ میں مبتلا ہوتا ہے
 اور ایک خواب دیکھتا ہے اس کے بعد یہ ارہو کر خوف خداوندی سے لرز جاتا ہے اور پابند شرع ہو کر
 تمام منہیات سے توبہ کر لیتا ہے۔ اس کی بیوی اور بعض اور اعزہ بھی اس کے عیال ہو جاتے ہیں گلاسکو
 پڑاؤ کا اس کی راہ پر نہیں آتا اور مصائب میں مبتلا ہوتا ہے۔ اس میں مولانا نے ضمناً اولاد کی بڑی
 اٹھان کے بڑے نتیجے اور گمنی میں ان کی سخت گیری اور نگرانی کی اہمیت کو بڑی خوبی سے دکھلایا ہے
 ابن الوقت میں ایک ہندوستانی شخص کا حال لکھا گیا ہے جو غدر کے زمانے میں اپنی خدمات کے
 صلے میں ایک بڑے عمدہ تکر ہو چکا تھا۔ اور انگریزوں کے ساتھ میل جول کی وجہ سے انھیں کی
 طرز معاشرت اختیار کر لیتا ہے اور برہمن سوسائٹی میں شامل ہو کر اپنے ہندوستانی عزیزوں اور دوستوں
 کو نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔ پھر بعد کو جب اس کے انگریز دوست سب چلے جاتے ہیں
 تو وہ کہہ سکتا ہے کہ میں رہتا اور آخر کار بڑی دقت سے بچھ اپنی ہی قوم و جماعت کے لوگوں میں ملنے لگتا ہے
 کرتا ہے۔ اس کتاب کی نسبت بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ اس میں مصنف نے خود اپنی ہی سرگزشت
 ایک فرمانہ کے پیرایہ میں بیان کی ہے۔ گویا میں انھوں نے میرہ عورتوں کی شادی پر بہت غصہ دیا ہے
 اور ہندوستان میں ان کی افسوسناک حالت کو بیان کر کے شرعاً ازواج ثانی کے جواز کو ثابت کیا ہے
 محصولات میں تعدد ازواج کا نقصان دکھایا ہے نہ عیال بے صافہ میں ان کے کچھ عیال کی

محکم دلائل پر مبنی ایک صورت میں کی گئی ہے مذکورہ بالا کتابیں نہایت اخلاق آموز اور نصیحت مندر ہیں
 لیکچر اور تقریریں لازمت سے کنارہ کشی کے بعد مولانا نے اپنی تقریریں اور لیکچر شروع کر دیے تھے
 ہمارے خیال میں ان کا پہلا لیکچر ۱۹۳۷ء میں ہوا تھا۔ وہ آجمن حمایت الاسلام لاہور اور مدرستہ طبرہ دہلی
 اور محمدان ایجوکیشنل کالفرنس کے سالانہ جلسوں میں پرتزد رتقریریں کرتے تھے سیر سیر مروجہ کے اثر سے
 وہ ہر اسلامی اہم اجتماع میں شریک ہوتے تھے اور سامعین کو اپنی پر مغز تقریروں سے محظوظ کرتے تھے
 وہ نہایت خوش بیان اور طبعی اللسان منتر تھے اور یہ بھی ان کا قاعدہ تھا کہ اپنی وسیع معلومات اور
 دلچسپ حکایات اور علی الخصوص اپنے ظرفیت آئینہ طریقیان سے سامعین کو بہت محظوظ کرتے تھے
 ان کا مجموعہ لیکچر چھپ گیا ہے اور مختلف انواع مضامین پر مشتمل ہے اس میں عقائد مذہبی تعلیم و
 حریت نسواں وغیرہ پر نہایت بسط بحث کی گئی ہے۔

بحیثیت شاعر کے آخر عمر میں شاعری نے بھی طبیعت کو گدگد لیا تھا اور شعر بھی کہہ لیتے تھے کبھی
 کبھی اپنے لیکچر میں کو اپنے اشعار سے دلچسپ بنانے کی کوشش کرتے تھے مگر ہم نہایت ادب سے اس
 بات سے گنہ پریمور میں کہ وہ محض تبرک ہی تبرک ہوتے تھے اور شعریت ان میں مطلق نہ تھی تدریجاً کچھ
 کلام میں اتنی ضرورت پڑی مگر اصلی جذبات شعریہ سے وہ ہمیشہ دور رہے ان کا منظوم کلام چھپ گیا ہے
 اور مجموعہ مبنیظیر کے نام سے منسوب ہے مگر اس سے ان کی قابلیت میں کسی قسم کا اضافہ نہیں ہوتا۔

اخلاق و عادات مولانا نہایت سادہ حراج، منہاد بہت ظریف الطبع تھے زندگی نہایت سادگی بلکہ
 عسرت سے بسر کرتے تھے اسی وجہ سے حجاز میں مشہور تھے مگر پھر بھی بعض غریب طلباء کی امداد بہت
 فراخی سے کرتے تھے آخر عمر میں روپیہ جمع کرنے کے مقوق میں تجارت شروع کر دی تھی جس سے ان کی
 آمدنی میں بہت کچھ اضافہ ہوا تھا تعلیم و تعالیم کے وہ اس قدر سابق تھے کہ مرتے دم تک یہی شغف جاری
 رکھتے تھے علیحدہ کالج کے وہ پہلے سے سرپرست اور معاون تھے ۱۹۴۷ء میں خطابت سیمینار ۱۹۵۲ء
 میں یونیورسٹی آف ایڈنبرا کی طرف سے ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری اور ۱۹۵۱ء میں پنجاب
 یونیورسٹی کی طرف سے ایل ایل ایل یعنی ڈاکٹر آف لٹریچر اور ٹیل آفنگ (عالم علوم مشرقیہ) کی ڈگری حاصل کی تھی اور

نواب لفظ کے گوشت پنجاب نے جو کیفیت چاند علیہ کا نو دیکش کے صدر تھے ڈگری تھے وقت
ان کے علم و فضل اور طباطبائی و ذہانت کی بہت تعریف کی تھی۔

طرز تحریر مولانا کی عبارت بہت آسان اور صاف صاف ہوتی ہے البتہ کمی بھی بڑے بڑے عربی
حفاظی کے غیر مألوس الفاظ لے آتے ہیں اور کہیں کہیں عبارت اور صفا لعل سے اور بعض مواضع پر
انگریزی الفاظ سے بھی کام لیتے ہیں جن سے ہمارے نزدیک عبارت میں بجائے جستی اور خوبصورتی کے
بھونڈاپن اور خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔ آزاد کی سی لطافت اور شیرینی ان کے یہاں نہیں ہے البتہ
خاص چیز جو ان کی نثر کا جوہر اعلیٰ ہے وہ ان کا ظریفانہ رنگ ہے جو ان کے نادر لکچر اور مضامین سب
میں بدرجہ اتم موجود ہے ان کی ظرافت بہت ہلکی اور لطیف ہوتی ہے اور اس میں لکچر کوین مطلق نہیں
ہوتا مولانا اپنے تمام معاصرین پر بلحاظ شہرت سبقت لے گئے ہیں۔ یہ اس لیے کہ قوانین کے تراجم سے
وہ گورنمنٹ اور سپیک میں روشناس ہوئے قرآن شریف کے ترجمے سے مسلمانوں کی شہرت
ہوئی اور ناولوں وغیرہ کی وجہ سے ہر گھر میں ان کا نام پہنچ گیا۔

مولوی ذکا، شمس العلماء مولوی محمد ذکا، اللہ تعالیٰ دلی کالج کے مشہور انگریزوں میں تھے اور
عقلمند تھے۔ خود انہوں نے اپنی زندگی بچوں کی تعلیم و ترقی کے لیے وقف کر دی تھی۔
میں دلی میں پیدا ہوئے والد کا نام حافظ شمس اللہ تھا اور مرزا کچک سلطان بہادر شاہ کے سب سے چھوٹے
بیٹے کے اتالیق تھے مولوی ذکا، اللہ بارہ برس کی عمر میں کالج میں داخل ہوئے جہاں مولوی براہمہ
اور مولوی محمد حسین آزاد بھی پڑھتے تھے لہذا ان تینوں میں عمر بھر رابطہ اتحاد و محبت قائم رہا اور انہوں نے
شمس العلماء کے خطا رب سے مرزا زہور کے جب مولوی ذکا اللہ کالج سے پیوہ کر نکلتے تو پھر انہیں کالج میں
ریاضی کی تعلیم پر مقرر ہوئے جس کے بعد انہوں نے کالج میں فارسی اور اردو کے پروفیسر ہو گئے صلت انھیں
تک تعلیمی لائن میں رہ کر ۱۸۵۸ء میں ڈپٹی انسپکٹر اور اس مقام بلند شہر و مراد آباد ہو گئے جس جگہ تقریباً
گیارہ سال تک رہے۔ ۱۸۷۹ء میں دلی نارمل اسکول کے مدرس اعلیٰ ہوئے اور ۱۸۸۰ء میں ریٹائر ہو گئے
انہوں کی پروفیسری کے واسطے نامزد ہوئے مگر قتل اس کے کہ اس نے عہدہ چارٹریڈ جلیں میں ریٹائر ہو کر کالج

اللہ آباد میں عربی و فارسی کی پچھ دیسری اُن کو مل گئی جہاں سے ۳۶ برس کی ملازمت کے بعد پشپتی پانی
لور تقریر پاپو بمیں پچیس برس پشپتی سے پہرہ یاب ہو کر سن ۱۹۱۷ء میں انتقال کیا۔

تصانیف تصانیف کثرت سے ہیں اور متعدد مضامین پر مشتمل ہیں۔ مثلاً ریاضی تاریخ جغرافیہ ادب
اخلاق طبعیات کیمیا بیایات وغیرہ مطبوعہ و غیر مطبوعہ کتابوں کی تعداد تقریباً ڈیڑھ سو سے کم نہ ہوگی
تصانیف کی کیفیت یہ کہ زیادہ تر اسکولوں کے طلباء کے لیے لکھی گئی ہیں۔ لہذا ان کی دھاریت آرائی
اور ایک دلنی شان ان میں بالکل نہیں ہے۔ مولوی صاحب بحیثیت ایک ریاضی دال اور مترجم اور
مورخ کے مشہور ہیں۔ مگر ریاضی میں اُن کا پایہ بلند نہ تھا اور ان کی کوشش صرف انگریزی کتابوں
کے ترجمے اور ان کی شرحیں لکھنے تک محدود رہی۔ البتہ تاریخ میں انہوں نے ایک کار نمایاں ضرور کیا
ان کی تاریخ ہندوستان دس جلدوں کی ایک ضخیم کتاب در قابل د تصنیف ہے گو اس میں ریسرچ
سے کم کام لیا گیا ہے اور علمہ الناس کے لیے ہے۔ جماعت عظیم میں اُن بڑی لڑائیوں کا ذکر ہے جو
انگلستان اور دوسرے ملکوں میں کوئین و کٹوریہ کے عہد میں ہوئی تھیں۔ ان کی ایک دیکھی عمدہ تصنیف ہے
جس میں کوئین و کٹوریہ کے عہد کے حالات اور ترقیاں درج ہیں جو تین جلدوں میں ہے۔ آئین قسری
میں کوئین و کٹوریہ کے عہد کی انتظامی تبدیلیاں جو ہندوستان میں ہوئیں اور فرہنگ فرنگ میں
یورپین شائستگی کی تاریخ اور کوئین و کٹوریہ اور اُن کے ختم ہونے کی زندگی کے حالات درج ہیں۔ مولوی
سیح اللہ خان بہادر سی ایم جی کی سوانحی بھی اُن کی تصنیف ہے آخر عمر میں ایک سماجی اسلام
لکھنے میں مشغول تھے مگر وہ ناممور رہی۔ ان تمام کتابوں کا طرز تحریر نہایت صاف سلیس اور عبارت آرائی
اور تصنیف سے بالکل پاک ہے اور وہ سب اسکولوں میں پڑھانے کے قابل ہیں۔

مولوی صاحب میں ایک بڑی مصفت یہ تھی کہ وہ اکثر مشہور اور انداز رسالوں کے قاعدہ مضمون نگار
بھی تھے۔ مثلاً تہذیب الاخلاق سائنٹیفک گزٹ علیگڑھ۔ رسالہ حسن ادیب فیرونا ہلو۔ مخزن زمانہ
خاتون وغیرہ۔ ان کی کثیرہ تصانیف بر مولانا حالی نے یہ کہتی تھی کہ مولوی ذکار اللہ کا دماغ ایک
بیکہ دوکان ہے جس میں ہر قسم کی جنس موجود ہوتی ہے۔ مگر ہے اس میں یہ بھی لطیف اشارہ جو

کہ بننے کے یہاں عمدہ اور قیمتی چیزیں کہاں ملتی ہیں۔
گورنمنٹ نے ان کے علمی خدمات کی بڑی قدر کی تھی ترقی تعلیم نسواں کی کوششوں سے مسلمہ میں انکو
ایک خلعت عطا ہوا اور دیگر علمی خدمات کے واسطے پندرہ سو روپیہ کا انعام اور خطاب خان بہادر و
شخص العلماء اعزایت ہوا مولوی صاحب سر سید مرحوم کے گھر سے دوستوں میں تھے اور ان کے تمام
تعلیمی کاموں میں ہاتھ بٹلاتے تھے۔

مولوی سید احمد دہلوی مولوی سید احمد دہلوی اپنی مشہور و معروف اردو لغت فرہنگ آصفیہ کے مصنف
ہونے کی حیثیت سے اردو ادب میں ایک خاص شہرت رکھتے ہیں دہلی میں ۱۲۸۵ھ میں پیدا ہوئے
باپ کا نام حافظ سید عبدالرحمن تھا جو مستند ادا سے تھے اور ایک بڑے خاندان سے تعلق رکھتے تھے
مولوی صاحب کی ابتدائی تعلیم رواج زمانہ کے موافق دی گئی مکتبوں میں ہوئی جب کچھ حرف شاہس ہو گئے
تو سرکاری اسکول اور زاریں سکول میں تحصیل علم کیا اسکے بعد اپنی فطری طباعی اور شاہیر اہل علم کی صحبت سے
بہت کچھ فائدہ اٹھایا پچھن ہی سے تصنیف تالیف کا شوق تھا چنانچہ طالب علمی ہی کے زمانے میں
ایک چھوٹی سی فارسی نظم مطلق نامہ کے نام سے اور ایک نثر کی کتاب تقویۃ الصبیان لکھ ڈالی۔
۱۲۹۵ھ میں ان کی کتاب کنز الفوائد نقلی جس پر سرکار سے دوسو روپیہ انعام ملا۔ ۱۳۰۶ھ سے
انہوں نے اپنی جلیل القدر تصنیف فرہنگ آصفیہ کے واسطے مال جمع کرنا شروع کر دیا تھا۔ ۱۳۱۵ھ
میں ان کی دوسری کتاب وقائع و ردیہ شائع ہوئی جس پر ان کو مبلغ ڈیڑھ ہزار روپیہ انعام ملے اس
رقم سے ان کی فرہنگ آصفیہ کی تیسری میں کچھ آسانیاں ہو گئیں۔ اس اثنا میں ڈاکٹر فیلن صاحب نے
جو صوبہ بہار میں انسپکٹر مدارس تھے ان کو بلا بجا اور اپنی اردو اور انگریزی کی لغت کی تیاری میں ان سے
مدد لینا چاہی مولوی صاحب راض ہو گئے اور فیلن کی دکنی سات برس کی محنت مشلتہ کے بعد ختم کی
مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ اپنا کام بھی کرتے رہے ۱۳۱۵ھ میں انہوں نے ہمارا جہ اللہ کا ایک
مختصر مترجم کیا اس کے بعد گورنمنٹ پنجاب کے سرکاری بلڈ پریس نائب مترجم کی حیثیت سے مقرر ہوئے
فیلن صاحب کی دکنی کی تیاری کے زمانے میں انہوں نے اپنی کتاب ہادی النساء مشلتہ کا جو

بہت مقبول ہوئی۔ اس کے بعد ان کی حسبِ میل تصنیفات شائع ہوئی رہیں جو اپنے طرزِ سبب نہایت عمدہ اور مفید ہیں۔ تکمیل الکلام، پیشہ وندوں کے اصطلاحات میں تحقیق الکلام، اردو زبان کے نکات کے متعلق رس کھان، وجس میں کچھ ہندی دہے اور پھیلیاں اور گیت ہیں۔ ریت بکھان، اہل ہندو کے رسم و رواج کے متعلق، نارس کی کتھا، ہندو عورتوں کی بولی، قواعد اردو، تعلیم نسواں اور عہدہ نول کے متعلق ان کی حسبِ میل کتابیں بہت مشہور ہیں۔ لغات النساء و تحریر النساء (انکسوں کی ریڈر) اپنی راحت زمانی کا قصہ، عورتوں کو وقت کی قدر قیمت سکھاتا ہے۔ اخلاق النساء، بچوں کی پرورش اور تربیت کے متعلق، علم النساء زبان اور اُس کی ترقی کے متعلق، رسومِ دہلی، جس میں دہلی کے مروجہ رسوم و رواج کا ذکر ہے، غیر مطبوعہ کتابوں میں یہ شملہ جس میں شملہ کی تاریخ، بھی داخل ہو، اردو ضربِ لامثال، رومرہ، مہلی، رسومِ اعلیٰ ہندو اعلیٰ دہلی، ان میں سے بعض قابلِ شائع ہو رہی ہیں۔

فرنگِ مصفیہ | اس کتاب کی تیاری اور طباعت کی دقتوں اور پریشانیوں کے متعلق مصنف نے دیا چہ میں بہت طول دے کر لکھا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ مولوی صاحب کو اتنی بڑی تصنیف چھاپنے کے لیے ایک ذکرِ کثیر کی ضرورت تھی جس کی فراہمی سخت مشکل تھی۔ بالآخر خوش نصیبی سے ۱۸۸۵ء میں سرآسمان جاہ بہادر شملہ آئے جہاں مولوی صاحب بھی کسی اسکول میں ملازم تھے مولوی صاحب نے دیگر اعظم حیدر آباد کی خدمت میں حضور کی حاصل کر کے اپنا مسودہ بطورِ نذرانہ گزارنا جو بد علی بلگرامی کے معائنہ کے بعد منظور کر لیا گیا اور انعام کا وعدہ کیا گیا۔ جب ۱۸۹۲ء میں کتاب ختم ہوئی تو اس کا نام فرنگِ مصفیہ رکھا گیا۔ اور اس کے سلسلے میں مصنف صاحب نے حیدر آباد کے متعدد دفتروں میں جاننا بڑا آخر کار وہ اپنی امیدوں میں کامیاب ہوئے اور پچاس روپیہ ماہوار بطورِ پیش پانچ ہزار انعام دیا گیا۔ اسی طرح گورنمنٹ پنجاب نے بھی اُس کی قدر افزائی میں کچھ جمعہ لیافنی حقیقت کے انعام کی کتب میں ایک خاص رجبہ امتیاز رکھتی ہے اور ایک بڑی تحقیقات اور جانکاہی کی یادگار ہے۔

شہلی نعمانی ۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۱ء مولانا شہلی نعمانی اپنے زمانے کے مشہور ترین و قابل ترین بزرگوں میں تھے تعلیم اور ابتدائی مشاغل نہایت کثیر الاوقات اور بامحاذ و اذواق تھے اگر کوئی شخص ایشیائی فلسفی و منطق

ماقدہ ماہر تعلیم، معلم و اعظم رفارمر، جریدہ نگار نقیہ، محدث سب کچھ ہو سکتا ہے تو وہ مولانا ہی کی ذات تھی کہ انھوں نے ان سبکیات مختلفہ اور علوم و فنون متنوعہ کا اپنی ذات میں اجتماع کر لیا تھا اور اس شعر کے صحیح مصداق بن گئے تھے۔ وَلَیْسَ عَلَی اللّٰهِ بِمُسْتَنْکِرٍ اَنْ یَّجْمَعَ الْعَالَمُ فِیْ مَا فَا جَدِ بِکَ
ان سب میں ادب، تاریخ اور لیرج میں ان کا رتبہ بہت بلند تھا۔ ۱۳۵۷ء میں موضع بندول ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے اور اپنے والد شیخ حبیب اللہ جو وکیل تھے، کے سایہ عاطفت میں تربیت پائی۔ ابتدائی کتابیں مولوی شکر اللہ نامی ایک شخص سے پڑھیں اور جب عربی و فارسی میں کچھ دستگاہ ہو گئی تو مولانا فاروق چڑیا کوٹی کے سامنے جو اس وقت غازی پور میں ہیڈ مولوی تھے فلسفہ و ریاضی ادب وغیرہ کے استاد بنے جاتے تھے زانوے شاگردی نہ کیا انھیں سے انھوں نے عربی ادب اور معقولات پڑھی تھیں۔ پھر جذبہ شوق نے ابھارا اور تلاش علم کے واسطے وہ گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ اعظم گڑھ سے رام پور پہنچے جہاں استاد مانہ مولوی عبدالحق خیر آبادی سے معقول اور مولوی ارشد حسین صاحب محدث سے حدیث و فقہ کے اہل علم سے ملا۔ لاہور میں ادیب کامل مولوی فیض الحسن صاحب سے حماسہ پڑھا۔ وہاں سے سہارن پور آئے اور وکیل حدیث مولوی احمد علی صاحب سے کی۔ ۱۳۵۷ء میں جبکہ ان کی عمر صرف ۹ سال کی تھی عازم حج بیت اللہ ہوئے اور راستے میں دفر شوق اور جوش عقیدت سے ایک پُرزد و قصیدہ فارسی کہا۔ بعد فراغت حج اعظم گڑھ واپس آئے اور سلسلہ درس و تدریس جاری رکھا شوق کتب بینی کا یہ حال تھا کہ کتب فروشوں کی دوکان پر بیٹھ کر اکثر کتابیں دیکھا کرتے تھے۔ اس زمانے میں رد و بابیہ میں

لہ مولانا سر محمد علی پریک خاص نظر عنایت و شفقت رکھتے تھے۔ ان کے اس استغراق کتب بینی کا ایک چشم دید احوال یاد ہے جس کا ذکر اس موقع پر دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔ منشی نثار حسین مرحوم ایڈیٹر پیام یار مولانا کے ایک بہت مختلف دوست تھے انکی چوک میں عطر کی دوکان تھی جب مولانا لکھنؤ میں قیام کرتے تو سبزی منڈی میں خواجہ عزیز الدین صاحب عزیز کے مکان پر فوج کش ہوتے اور سب کو منشی نثار حسین کی دوکان پر جو قریب ہی تھی آ بیٹھتے تھے یہاں اکثر ارباب کمال کا مجمع ہوتا تھا جس میں مولوی مولیٰ علی صاحب شوق مندوانی، لدن صاحب خورشید، ابو صاحب علیس، بیہ شہنشاہ حسین، ضوی وکیل مرحوم اور اور ربیعہ مکلف جلیب جی ہوتے۔ وہ گھنٹہ بیٹھ کر خوش گپیاں کرتے۔ دیر تفریبی کی خوش ذائقہ گویوں اور حسین کش سانی کے سطر حق سے اجاب کی صیان کیجاتی کبھی کبھی میٹھ دن نامہ سرشار کوٹ بٹوں داتے عینک لگائے آنکھیں پچکاتے (بانی حاشیہ صفحہ ۶۶ پر ملاحظہ ہو)

بھی کچھ رات لکھے جس میں اسکات المعتدی سہو عربی میں ہے زیادہ مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے امتحان کالت بھی پاس کیا تھا اور اعظم گڑھ اور جی میں کچھ دنوں کالت بھی کی تھی اور آخر کار حبس میں سے جی بھر گیا تو سرکاری ملازمت بھی چند دنوں کی تھی اور کہیں کے امین ہو گئے تھے چند دنوں کے بعد یہ ملازمت چھوڑ دی اور اب ہم تن خدمت علم کی طرف متوجہ ہو گئے۔ سلامۃ میں اپنے چھوٹے بھائی حمیدی سے ملنے کے لیے جو علی گڑھ کالج میں پڑھتے تھے علیگڑھ جانے کا اتفاق ہوا یہاں بنو سلا خان بہادر محمد کریم ڈپٹی کلکٹر مولوی سمیع اللہ خاں سے ملے جن کے ذریعہ سے سریدھرم کی خدمت میں باریاب ہوئے اور ایک درخواست فارسی پروفیسری کی جگہ کے واسطے جو اس وقت خالی تھی گزرائی۔ درمختار ہو گئی اور کچھ دنوں شہر میں قیام کے بعد خوش نصیبی سے سید صاحب کے بنگلے کے قریب رہنے کو جگہ مل گئی۔ قیام علیگڑھ علیگڑھ کالج کی اس زمانے کی فضا اس گل سرید کی شگفتگی کے لیے بہت مفید ہوئی۔ ارباب کمال مثلاً سر سید اور مولانا صائی وغیرہ کی صحبت اور سر سید کے کتب خانے کی قریب سے مولانا نے بہت کچھ فائدہ اٹھایا علیگڑھ کے مشہور اسلام دوست پروفیسر آرتھر سے ملاقات ہو گئی مولانا نے ان سے فریج سیکھی اور ان کو عربی سکھائی جس طرح سے مولانا نے نکات تنقید حضرت اہل مغرب رٹلہ صاحب سے حاصل کیے ہوں گے اسی طرح انصافاً یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ پروفیسر صاحب اپنی کتاب پریکٹک آف اسلام کی اکثر باتوں کے لیے مولانا کے ممنون ہیں۔

اجتہاد فی تصانیف اغانی علیگڑھ ہی میں مولانا کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اسلام کی قدیم شان و شوکت اور اکابر ملت کے ترین کارنامے قلمبند کیے جائیں۔ اس بابرک کام پر سر سید نے بھی ان کی ہمت افزائی کی یہاں سر سید کا کتب خانہ موجود ہی تھا جس میں دوسرا مقامات مصر و شام تک کی مطبوعہ کتابیں

اصغر کا بقیہ اور ہنسے اس جلسے میں شریک ہو جملہ ادیبوں نے اس کو محفوظ کرتے ایک دن جبکہ یہ سارا دن ولایت تھے مولانا بھی تشریف فرما تھے شاید قسطنطنیہ یا ساؤنہ یا بیروت کی تھی وقت، یہ بیچے تمام جگہ میں پڑا تھا قسطنطنیہ میں بطور امتیاز اور غیر کے نقل ہے جسے خود غل اور جمع کی کوئی حد تھی سر سید اس میں مشغول مگر مولانا دکان کی کوٹھی میں بند کسی کتاب کے مقابلے میں جو کسی کا ترسے لکھا لکھی گئی تھی اس قدر مشغول اور تنہا تھے کہ یاد دہندہ سوں کے صراحت کے بھی سر نہ اٹھا کر نہ کھلا اور اپنا کام کرتے رہے یہاں تک کہ پوری کتاب ایسی حالت میں دس گیارہ بجے تک ختم کر دی۔ مترجم

دستیاب ہو سکتی تھیں۔ ۱۸۷۷ء میں شروی صاحبہ کا ستارہ مولانا کے افتخار تصنیف پر جلوہ گر ہوا جس میں اسلام کی شان و شوکت، موجودہ مسلمانوں کی نیکست و فلاح اور ان کا بھانسنے کے لیے سرپرستی کی کوششوں کا ذکر نہایت پُر زور طریقے سے کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ایک زمانے میں اس قدر مقبول اور علیحدہ کا لچ کے طلباء کو اتنی پسند تھی کہ اکثر اوقات وہ اس کو اسٹیج پر خوش آوازی سے پڑھتے اور لوگوں کے دلوں کو بے چین کرتے تھے۔ یہ مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم جو ۱۸۷۷ء کی ایکویشنل کانفرنس میں بطور ایڈریس پڑھی گئی تھی ۱۸۷۷ء میں چھپ کر شائع ہوئی جس سے لوگوں کو مولانا کی تاریخی معلومات اور تہذیبی علمی کا پورا پورا معلوم ہوا۔ اب دنیا کے تصنیف میں ان کی شہرت بہت بڑھ گئی تھی۔ ان کے دل میں خیال آیا کہ ایک مکمل اور مفصل تاریخ بلاد اسلام اور خلفائے عباسیہ کی مرتب کی جائے اور اس کا نام "سیرۃ النبی" اور "اسلام" (شاہیر اسلام) انگریزی کی تقلید میں رکھا جائے اس سلسلے میں انھوں نے "الماسون" اور "سیرۃ النبی" لکھی اور الفاروق مشرک کرنے والے تھے کہ ۱۸۹۲ء میں سفر دوم دھام اختیار کیا۔ جس میں پروفیسر آرنلڈ بھی ان کے ہمراہ تھے اور انھوں نے قسطنطنیہ اور ایشیائے کوچک اور شام و مصر کے بڑے بڑے شہروں کی سیر کی۔ اس سفر کی زیادہ تر یہ غرض تھی کہ الفاروق کی تیاری کے واسطے صحیح اور مسترماخذ کا پتہ لگایا جائے نیز یہ بھی کہ بلاد اسلامی کی شان و شوکت اپنی آنکھ سے دیکھی جائے سفر سے واپسی کے بعد ان کا "سفر نامہ دوم دھام" نکلا جس میں پورے سفر کے حالات نہایت دلچسپ طریقے سے قلمبند ہیں۔ ۱۸۹۵ء میں جب کہ سر سید کا انتقال ہو گیا تو مولانا بھی دل برداشتہ ہو گئے اور اپنا سلسلہ کالج سے منقطع کر لیا اور اعظم گڑھ گئے۔ اب وہ الفاروق کی تیاری میں بھرپور مصروف ہو گئے اور ایک قومی انگریزی اسکول کی ترقی میں بھی بہت کوشش کی جس کا افتتاح ۱۸۹۷ء میں ہو چکا تھا۔ ۱۸۹۹ء میں سفر کشمیر میں پیش آیا۔ مگر اتفاق سے وہاں مولانا بیمار ہو گئے اور اسی حالت میں ۱۹۰۰ء الفاروق اختتام کو پہنچی۔

قیام حیدر آباد مولانا کا سفر حیدر آباد و نواب قالا لالہ کی وزارت کے زمانے میں ہوا تھا۔ سب سے پہلے وہ مولوی سید علی بگڑی کی کوشش سے ناظم محکمہ تعلیم بشاہرہ دوسو پیر ماہوار مفت تر ہو گئے جو بعد کو

تین سو روپیہ ہو گیا تھا مولانا یہاں چار برس رہے اور اس زمانے میں انھوں نے محکمہ تعلیم میں بہت کچھ
 ترقیاں کیں اور اس کے ساتھ اپنا سلسلہ تالیف و تصنیف بھی برابر جاری رکھا یہ علی بگڑھی نے جو
 سلسلہ کتب صفیہ کا جاری کیا تھا اس میں مولانا کی بھی بعض کتابیں شامل ہیں۔ اسی قیام حیدر آباد
 کے عرصہ میں جب کہ مولوی عہد زمر ز صاحب کا وہ دورہ تھا مولانا نے حیدر آباد میں ایک مشرقی
 یونیورسٹی کھولنے کی اسکیم تیار کی تھی اور انگریزی "سوانح مولانا روم" "الکلام" "معلم الکلام" اور
 "سوانح انیس و دہیر" یہ سب اسی زمانے کی تصانیف ہیں۔

ندوة العلماء اندوۃ العلماء کا قیام سلسلہ مطابقت میں ہوا تھا اس کے قیام کی غرض اصلی یہ
 تھی کہ عربی مدارس کے لیے ایک مفید نصاب تعلیم ضروریات زمانہ کا لحاظ رکھ کر بنایا جائے نیز یہ کہ
 مسلمان ہندوستان کے آپس میں یا ان کی جماعتوں میں جو اختلافات ہیں وہ رفع کیے جائیں۔ اس عہد
 خیال کے محرک مولوی عبد الغفور صاحب ڈپٹی کلکٹر تھے مگر اس کی تکمیل مولوی سید محمد علی صاحب کانپوری
 خلیفہ حضرت مولانا افضل رحمن صاحب مراد آبادی کے مبارک ہاتھوں سے ہوئی جو اس کے بانی اور
 ناظم اول تھے مولانا شبلی اور مولوی عبدالحمید صاحب تفسیر حقانی نے اس کے قواعد و ضوابط مرتب
 کیے اکابر قوم مثلاً سر سید نواب حسن الملک اور نواب وقار الملک وغیرہ نے بھی اس کے اغراض و مقاصد کے
 پسند کیا اور تحریروں و تقریر کے ذریعہ سے اس کا خیر مقدم کیا کہا جاتا ہے کہ نواب وقار الملک تو روپیہ ماہانہ
 ندوہ کو اپنے پاس سے دیتے تھے پھر مولانا شبلی کی تجویز ہوئی کہ اس جماعت کے تحت میں ایک مدرسہ
 کھولا جائے جو ضروریات وقت کا لحاظ رکھ کے طلباء کو تعلیم دے سکے چنانچہ سلسلہ مطابقت میں

۱۔ مقاصد ندوۃ العلماء جو مودہ دار العلوم ندوۃ العلماء کے آخری صفحہ کے پشت پر درج ہیں حسب ذیل ہیں:-

- (۱) نصاب تعلیم کی اصلاح اور علوم دین کی ترقی اور تہذیب اخلاق اور شائستگی اطوار۔
- (۲) علماء کے باہمی نزاع کا دفع اور اختلافی مسائل کے بعد و قدرح کا پورا پورا امداد۔
- (۳) عام مسلمانوں کی اصلاح و فلاح اور اس کے تلامذہ گریسی اور ملکی معاملات اس سے علاوہ ہیں
- (۴) ایک عظیم الشان اسلامی دارالعلوم قائم کرنا جس میں علوم و فنون کے سوا اعلیٰ منافع کی بھی تعلیم ہوگی۔
- (۵) دینی امور میں فتوے دینے کے واسطے محکمہ افتاء کا ہونا جس میں بڑے بڑے عالم اہل فقہاء ہوں گے۔

اسی تجزیہ کے موافق دارالعلوم کے کچھ ابتدائی درجے کھول دیے گئے۔ اور ۱۹۵۹ء میں روسا راجا پنورکی
 نیا ضلع سے کچھ زمین لاری بطریق وقت ندوۃ العلما کو حاصل ہوئی جس کو ندوۃ العلما نے عسک پر دیہا
 اور مبلغ سات سو روپیہ سالانہ اس کی آمدنی سے ملتا رہتا ہے ایک عظیم الشان کتب خانہ کی بھی بنیاد
 ڈالی گئی جس میں تقریباً ۱۵ ہزار کتابیں داخل ہو چکی ہیں اور علاوہ مطبوعات اور پمصر مصلحتیہ لٹریچر
 طران وغیرہ کے تقریباً ایک ہزار کتابیں فلمی اور اکثر نادرا وجود ہیں جو مصنفین کے ہاتھ کی فلمی ہوئی ہیں یا
 مصنفین کے قریب زمانہ میں لکھی گئی ہیں اور ان پر نامور علماء کے دستخط موجود ہیں۔ اس نوبت پر
 ایک نمونہ کا نمونہ یہ پیش آیا کہ سرینوئی میگزین جو اس وقت مالک متحدہ کے لکھنؤ گورنر تھے
 ندوہ کے سمت مخالف ہو گئے اور اس کو سیاسی سازشوں کا ایک آلہ کار سمجھ کر نگاہ شک سے
 دیکھنے لگے۔ مولوی احمد رضا خاں بریلوی کے بعض رسائل بھی جو بہت پر جوش لہجے میں لکھے گئے تھے اسی
 وقت نکلے اور ندوہ کے مقابلے پر ایک جنگجو جماعت ندوہ قائم کی گئی جس کے اجلاس کلکتہ میں ہوئے تھے
 غرض کہ جب لائٹ صاحب ولایت پٹنہ لگے تو مولانا شبلی حیدر آباد سے لکھنؤ آئے اور ندوۃ العلما کے اکثر
 انتظامات کو اپنے ہاتھ میں لیا اور پبلک اور گورنمنٹ کے دل میں جو بدگمانیاں اور شکوک اس کی طرف سے
 پیدا ہو گئے تھے ان کے رفع کرنے میں بڑی کوشش کی۔ اس کام میں کرنل عبد المجید خاں صاحب نے
 بھی ان کی بڑی مدد کی ندوہ کی مالی حالت اس وقت ایسی خراب ہو گئی تھی کہ اس کے ٹوٹ جانیکا اندیشہ
 تھا۔ مولانا نے اس کو درست کرنے کے لیے اکثر دیسی رہبانوں کا سفر کیا اور رام پور سے مبلغ پانچ سو روپیہ
 سالانہ اور بھوپال سے مبلغ ڈھائی سو روپیہ ماہانہ اعانتی رقمیں مقرر ہوئیں اسی طرح ہریانہ میں آغا خان
 پانچ سو روپیہ سالانہ اور زاب صاحب بھادل پور کی جدہ ماجدہ نے پچاس ہزار روپیہ تعمیر عمارت کے واسطے
 عنایت کیے۔ گورنمنٹ نے ایک وسیع اور خوشنما قطعہ اراضی دریا سے گومتی کے کنارے لکھنؤ میں

۱۰۔ دارالعلوم ندوۃ العلما کی گزشتہ تاریخ "مطبوعہ مطبوعات ندوۃ العلما کی جومالی حالت بیان کی گئی ہے اس سے
 ندوۃ العلما کی آمدنی حسب ذیل معلوم ہوتی ہے ۱۰۰ (بھوپال سے تین ہزار روپیہ سالانہ جوامہ ماہ ملتا ہے (۲) بھلو پور سے
 نظامت کی مدد میں تین سو روپیہ سالانہ (۳) مسلمانان مدراس سے تقریباً دو ہزار روپیہ سالانہ اس رقم سے طلباء وغیرہ مستطیع کو
 دی جاتی ہے (۴) دولت آصفیہ حیدر آباد کن سے تقریباً سو روپیہ ماہوار دفتر کے خرچ کے لیے۔

دارالعلوم کے واسطے عطا فرمایا نیز چھ ہزار روپیہ سالانہ کی امداد تکریری زبان اور عظیم دنیوی کے لیے دنیا
منتظر فرمایا۔ سر جان میوٹ صاحب بہادر لکھنؤ گورنر ممالک متحدہ نے دارالعلوم کا ننگ بنیاد ۲۰ نومبر ۱۸۹۷ء
کر رکھا۔ اس طرح مولانا کی کوششیں بار آور ہوئیں مگر آپس کی نزاعیں ہوتی قائم رہیں کیونکہ علماء کا آپس
میں متحدہ انجیال ہونا سخت مشکل کام تھا وہ لوگ مولانا پر وجہ ان کی آرزو خیالی کے پورا اعتماد نہیں رکھتے
تھے اسی وجہ سے مولانا کچھ بد دل ہو کر ۱۳۱۳ھ میں لکھنؤ سے چلے گئے۔ اور اعظم گڑھ میں دارالافتاء کی بنیاد
ڈالی۔ اسی اثنا میں ایک نہایت افونک واقعہ پیش آیا کہ مولانا کی ٹانگ ایک اتفاقیہ گولی کے
لگ جانے سے زخمی ہوئی اور آخر کار مجبور ہو کر اس کو کاٹا پڑا۔

مندوہ نے جو خدمات ملک کی انجام دیں گو کہ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ابھی وہ تکمیل کو پہنچیں مگر اس
میں شک نہیں کہ وہ بہت قابل توفیق ہیں۔ سب سے بڑا کام اُس نے یہ کیا کہ قدامت پت عالموں میں جو
ضروریات زمانہ سے بے خبر تھے ایک بیداری پیدا کر دی اور ان کو بھی اس کی ضرورت محسوس ہونے لگی کہ کما
قدیم نصاب بدل کر موجودہ زمانے کی ترقیوں کے حسب حال بتایا جائے۔ اگر تکریری زبان بھی داخل نصاب
کی جائے غیر مفید کتابیں اور علوم موقوف کئے جائیں اور ادب عربی و فارسی اور حدیث و تفسیر کی
تحصیل پر زیادہ زور دیا جائے۔ مندوہ نے یہ بڑا کام کیا کہ علوم عربیہ و اسلامی تہذیب کو دنیا کے
سامنے صحیح طور پر پیش کیا قیمتی قلمی اور تہذیبی ہر اس با مقصد و مطبوعہ کتابیں جمع کر کے ایک اعلیٰ درجے کا

کتاب خانہ مرتب کیا۔ اس کے علاوہ دارالعلوم میں کتب خانہ ہر ادب و فن میں کتب و رسائل کا مجموعہ ہے۔ دارالعلوم میں
ایک گھنٹہ بہت بڑا تھا اور ادب عربی کی نظر سے یہ خصوصیت گورنر کا ہے فرماتے تھے کہ "قیام دارالافتاء کے متعلق میں مولانا
کو یہ بات یاد تھی کہ انھوں نے لکھنؤ میں کھڑا کیا ہے کہ ان کی خواہش تھی کہ اُس کا تعلق مندوہ سے نہ ہو اور نہ یہ ایک بالکل علیحدہ چیز
اس کے واسطے بعض مواقع لکھنؤ میں دیکھے گئے اور مولانا نے دیکھا کہ ان کو پسند بھی کیا پھر مولانا کو یہ بات یاد تھی کہ ان کی خواہش تھی کہ اُس کا تعلق مندوہ سے نہ ہو اور نہ یہ ایک بالکل علیحدہ چیز
موجود تھا وہاں سے اپنے چھوٹے بھائی مولوی محمد اسحاق کی اچانک موت کی خبر سن کر دفعتاً اور آباد ان کا سہارا یہاں سے
وہ ضرورت اعظم گڑھ گئے اور جگہ کو لکھا کہ دارالافتاء میں یہاں قائم کرنے کا ارادہ ہے اس کے افتتاح میں تم بھی شریک
ہو بی گئے تو معلوم ہوا کہ مولانا نے اپنا باغ وغیرہ اُس کے واسطے وقف کر دیا ہے اور بعض ادب و فن گول نے اپنی جائیدادیں
دی ہیں میں نے کہا کہ بہت بہتر ہو تا کہ دارالافتاء میں لکھنؤ میں قائم ہوتا ہنس کر فرمایا کہ کیا مصالحت ہے یہاں اُس کو یا افضل
سب سے دیکھتے ہیں جب موقع آئے گا تو لکھنؤ میں منتقل ہو جائے گا۔

کتب خانہ قائم کیا۔ قرآن شریف کے صحیح انگریزی ترجمہ کا بھی کام ہاتھ میں لیا تھا۔ مسلمانوں کے عہد حکومت ہندوستان کے متعلق جو تاریخی غلطیاں ناواقفیت سے لوگوں میں شہور ہو گئی ہیں ان کو مستحکم کیا اسی طرح مسلمانوں کے قانون و دقت و میراث کے متعلق جو پیچیدہ مسائل قانونی اکثر پیش آجاتے ہیں ان پر روشنی ڈالی۔ اسلامی علوم اور تمدن کا ایک مرکز قائم کیا جس کا اثر ملک کے رد دراز تک پڑا۔ ایک خاص رسالہ "الندوۃ بہ ادارت مولانا شبلی دہلوی حبیب الرحمن صاحب شہدائی نکالا گیا جس میں مندرست عہدہ اور قابلیت کے مضامین شائع ہوئے۔ مگر حق یہ ہے کہ مولانا کے انتقال سے ندوہ کو جو نقصان عظیم پہنچا اس کی تلافی اب بہت مشکل ہے۔

دارالمصنفین اعظم گڑھ لکھنؤ کے راہبی کے بعد مولانا ہمہ تن اپنی محبوبہ ادبیہ ناز تھنیت "سیرۃ النبی" کی تکمیل میں مصروف ہو گئے اور شعر اہم کا پانچواں حصہ بھی اسی وقت تمام کیا۔ مولانا چونکہ تالیف و تصنیف کے عاشقوں میں تھے لہذا مصنفین کی ایک جماعت قائم کرنے کا خیال جو بہت عرصہ سے ان کے دل میں جاگ رہا تھا خدا کر کعبہ اب پورا ہوا جس کے واسطے انھوں نے اپنی ذاتی جائیداد یعنی ایک مکمل اور بارغ اور نیز اپنا قیمتی کتب خانہ وقف کر دیا۔ اس کے علاوہ ندوہ میں ایک درجہ تکمیل بھی کھولا جس میں عربی و فارسی کے مثنوی طالب علم ریسرچ کی خدمات انجام دیتے ہیں۔

قابلیت اور خدمات کا اعتراف | ۱۹۲۷ء میں سلطان ترکی نے محمد مجیدی ان کو عنایت کیا تھا اور اسی کے قریب برٹش گورنمنٹ نے خطاب شمس العلماء عطا کیا۔ وہ الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو اور مختلف کمیٹیوں کے ایک معزز رکن تھے۔ مثلاً ترقی علوم مشرقیہ کی کمیٹی جو بہ مقام شہسوار گورنمنٹ بنگلہ کی صدارت میں منعقد ہوئی تھی کمیٹی یا بہت نواسع ملین زبان اردو و ہندی اور کمیٹی اتحاد ہندو مسلم جس کو گورنمنٹ نے منعقد کیا تھا۔

اخلاق و عادات | مولانا شبلی لایک نہایت سچے اور استیلاز خلق و متواضع آدمی تھے۔ ان کی ایک تہ بہت شخصیت تھی لکن نہایت شرس اور دلہیز پر باز معلومات ہوتی تھی۔ حافظہ بہت زبردست پایا تھا۔ رویہ کا مطلق خیال نہیں کرتے۔ ہر جو کچھ ملت تھا نہایت آزادی سے خرید کرتے تھے۔

ہندو مسلم اتحاد کے دل سے خواہاں تھے۔

تصانیف مولانا کی تصانیف بہت کثرت سے ہیں۔ جن میں حب ذیل مشہور ہیں سیرۃ النبی (صرف دو جلدوں کی تکمیل کر سکے)، شعر العجم پانچ حصے، الفاروق، المامون، سیرۃ النعمان، الغزالی، الکلام، علم الکلام، سوانح مولانا رحمہ، موازنۃ انیس و سیرۃ سرفرانہ دوم و مصر و شام، اردنگ زیب عالمگیر، البحر یہ، مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم، تاریخ اسلام و فلسفہ اسلام، حیات خسرو، تنقید جرجی زیدان، مقالات شبلی، مکاتیب شبلی، رسائل شبلی (نظم میں) ویران شبلی اور دستہ نگل، ثنوی صبح امید بحرۃ نظم ارد۔

مولانا بحیثیت مؤرخ کے مولانا کا بڑا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اسلام کی قیم شان و شوکت کی تاریخ کو طرز جدید میں پیش کیا اور ایسے دلچسپ طریق سے لکھا کہ عوام و خواص سب اس سے مستفیض ہو سکتے ہیں اور ہر نظر میں وہ نہایت دلچسپ معلوم ہوتی ہے پھر یہ کہ اس کی تالیف میں انتہا کے تجسس و تلاش اور علمی مطالعہ سے کام لیا اور جدید طریق تنقید کے موافق غیر معتبر اور بیکار چیزوں کو ترک کیا۔ الفاروق، المامون، الغزالی، سیرۃ النعمان، مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم، اور علی الخصوص ان کی معرکۃ الکلاہ تصنیف یعنی سیرۃ النبی جس کو انھوں نے ناتمام چھوڑا ایسی یادگار تصانیف ہیں جو ان کے تبحر علمی و وسیع تحقیق، عمیق مطالعہ اور بیدار دماغ کا دوش کا پتہ دیتی ہیں۔

مولانا بحیثیت ناقد کے مولانا علاوہ جلیل القدر مؤرخ کے ایک زبردست ناقد بھی تھے شاعر شیریں مقال ہونے کے ساتھ قوت انتخاب، ذوق سلیم، رائے صائب بھی اعلیٰ درجے کی رکھتے تھے۔ اگر کسی شخص کو زمانہ حال کی کوئی ایسی تصنیف دیکھنا ہو جو دہشت مطالعہ اور تحقیق کے ساتھ فصاحت و بلاغت اور سلاست زبان کا ایک بہترین نمونہ کہی جا سکے تو اس کو شعر العجم دیکھنا چاہیے جس کی یکسانی پر فیض برون ایسے مشہور زمانہ مستشرق کی شہادت موجود ہے۔ یہ سچ ہے کہ مولانا کے انتقال کے بعد اس کی اکثر غلطیاں نکال گئیں اور وہ لیک جارج خانہ نظر سے دیکھی جا رہی ہے مگر کچھ بھی ہمارے نزدیک کتاب کی قدر و قیمت اور مولانا کے تجربہ علمی میں اس سے کوئی فرق نہیں آسکتا۔ کتاب مذکور نظم فارسی کی

ایک مکمل تاریخ ہے اور نہایت سلیس اور دلچسپ زبان میں ہے۔ مرازہ آئیں و پیرہ بھی ایک بہت
 بیش بہا تصنیف ہے۔ اور گوکہ اس سے بھی اختلاف کیا گیا اور بعض کتابیں اس کے جواب میں نکلیں
 مگر پھر بھی اس کی اکثر باتیں کارآمد اور صحیح ضروری ہیں۔ آرٹیکل اور مضمون نگاری میں بھی مولانا ایک
 یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ ان کی اس قسم کی تحریریں نہایت دلچسپی اور شوق سے پڑھی جاتی ہیں کیونکہ اس
 میں نہایت مفید اور کارآمد باتیں پائی جاتی ہیں۔ ان کے مکاتیب بھی بہت دلچسپ ہیں جس سے ان کے
 ذاتی حالات اور نیز ان کے معاصرین اور اس زمانے کے حالات پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ ”مقالات شبلی“
 اور ”رسائل شبلی“ ان کے اخباری مضامین کا اور ”مکاتیب شبلی“ ان کے خطوط کا مجموعہ ہے۔
 طرزِ تحریر مولانا ہمیشہ صفائی اور سادگی اور وضاحت کلام کو بہت پسند کرتے تھے۔ ان کی
 عبارت میں کبھی گنگناہٹ نہیں ہوتی۔ اس میں ایک خاص جگہ اور تڑپ ہوتی ہے۔ سرتیروں میں مولانا کو ان کے
 طرزِ تحریر پر مبارکباد دیتے تھے اور کہتے تھے کہ تم تو گفتگو اور دلی دلوں کے لیے باعثِ رشک ہو۔ مولانا
 کے یہاں صحابیہ بدایع اور عبارت میں تکلف بہت کم ہوتا ہے۔ اور گوکہ اکثر جگہ فصاحت اور زبیرین
 مضمون میں چارچاند لگا دینا ہے پھر بھی نفسِ مطلب نہایت واضح رہتا ہے۔ یہی قابلِ تعریف بات ہے کہ
 مختلف انواعِ تحریر کے لیے مولانا اسی کے مناسب جملے انداز بیان بھی اختیار کرتے ہیں بعض تکلف پسند
 طبیعتوں کو مشغلہ حین کی زبان کو آنسو کا چھوٹا مہر ہے مگر مولانا کا رنگ روکھا پھیکا اور
 بے مزہ معلوم ہو مگر کاروباری نشر کا وہ بے دخل نمونہ ہے جو کہ دورِ موجودہ کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔
 جیسا کہ لکھا گیا مولانا کا مرتبہ حیثیت ایک مؤرخ اور ناقد کے بہت بلند ہے انھوں نے اسلامی
 تمدن کی وسیع و اشاعت میں بڑا حصہ لیا۔ ان میں ہم غیبتِ م کی نئی روح جلوہ گرد دیکھتے ہیں اور
 یہ ان میں سب سے بڑا کمال ہے کہ علومِ مشرقی کو وہ مغربی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ وہ ندوۃ العلماء کے
 روحِ رواں اور دارالمصنفین کے بانی تھے۔ اپنے زمانے کی نمایاں ستیوں اور بلند شخصیتوں میں
 تھے اور دراصل انھیں کی روحانی برکت سے جو دارالمصنفین کی مساعی جلیلہ کی کامیابی کا باعث
 ہے۔ ان کے لائق شاگردوں سے ابدًا آباد تک ان کا نام روشن رہے گا۔

سید سلیمان ندوی | مولانا سید سلیمان صاحب مولانا شبلی کے جانشین علوم مشرقی اور عربی و فارسی کے
جلیل فاضل ہیں مولانا شبلی مرحوم اُن سے اپنی زندگی میں بہت محبت کرتے اور ایک خاص نظر
شفقت و عنایت اُن پر رکھتے تھے۔ اور اُسی وقت وہ اپنی ذہانت و قابلیت و طباعی سے اُنکے
لہور کی گردنوں سے ممتاز تھے۔ انھوں نے مولانا مرحوم کی روایات کو جاری رکھا اور پافضل انھیں کی
انگریزی اور اہتمام میں حلقہ دار المصنفین عربی اور فارسی کی نایاب کتابوں کے ترجمہ تالیف کی پیش ہوا
خدمت انجام دے رہے مودۃ المعارف کے ایڈیٹر بھی ہیں جو زبان اردو کا مشہور مجلی علم اہل اسلام کی
اشاعت کے لیے مخصوص ہے اور اس کے مضامین سے اُن کی مضمون نگاری اعلیٰ قابلیت اور تحقیق
علمی کا پتہ چلتا ہے مولانا دار المصنفین اور معارف دونوں کی روح رواں ہیں۔ انھوں نے
بلاد اسلامی اور یورپ کا سفر بھی کیا ہے۔ اور سیرۃ النبی کا بقیہ حصہ اُسی شان و شوکت سے ختم کیا ہے
سیرۃ العائشہ۔ ارض القرآن۔ لغات جدیدہ وغیرہ آپ کی مقبول اور مفید تصانیف سے ہیں۔

مولانا سلیمان صاحب کے علاوہ مولانا حمید الدین مولانا عبد الہاری۔ مولانا عبد الماجد
دریا آبادی پروفیسر نواب علی ایدہ مولانا عبد السلام۔ دار المصنفین کے پرجوش اور معزز اراکین ہیں۔
مولانا حمید الدین صاحب علاوہ انگریزی کے زبان فارسی و عربی کے مستند فاضل اور علم القرآن
اور ادب عربی میں ایک خاص بصیرت رکھتے ہیں مولوی عید الباری نے سکلے کے فلسفہ کا بہت سیر
ترجمہ اردو میں کیا ہے اور بعض اور فلسفہ تصانیف بھی اُن کی ہیں۔ مولوی عبد السلام اور مولوی
عبد الماجد کے مختصر حالات حسب ذیل ہیں۔

اس موقع پر یہ لکھنا بہ محل نہ ہو گا کہ شعبہ دار المصنفین اپنے سامنے ایک خوشہ متقبل رکھتا ہے
اور اگر اس نے اپنی موجودہ رفتار ترقی جاری رکھی تو اس میں کوئی شک نہیں کہ زبان اردو کی تکمیل میں
یہ بہت بڑا حصہ لے گا مگر ضرورت یہ ہے کہ وہ اپنی تصانیف میں عربی اور فارسی الفاظ کی بہت سی
احتیاز کرے تاکہ تمام ہی خواہان اردو کو اُس سے سچی ہمدردی رہے۔ اور اس طرح یہ بھی چاہیے کہ
تمام مغربی و دیگر علوم مشرقیہ سے قطع نظر کہ اپنی توجہ صرف علوم اسلامی کی نشر و اشاعت پر محدود رکھے

مولوی عبدالسلام مدوی | مولوی عبدالسلام صاحب کی ذات پر دارالمصنفین کو جس قدر ناز ہو کم ہے وہ وقتاً فوقتاً معارف میں نہایت اعلیٰ درجے کے مضامین لکھتے رہتے ہیں۔ سیرت عمر بن عبد العزیز اسوہ صحابیات شعر المندھ اول و دوم۔ ابن سین وغیر ان کی تصانیف ہیں سنا ہے کہ سلطان اشلی کی زندگی کے حالات بھی مرتب کر رہے ہیں مگر وہ اب تک شائع نہیں ہوئے شعر المندھ میں جو نظم اردو کی ایک متوسط تالیف ہے اُن اثرات و حالات کو جو مختلف اوقات میں نظم اردو پر مرتب ہوئے ہیں مفصل اور نہایت خوبی سے بیان کیا ہے۔ اپنی نوعیت میں یہ کتاب بہت عمدہ اور قابل تعریف ہے اور اس کتاب کو تصنیف کر کے مصنف نے فی الحقیقت زبان اردو کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔ مگر یہ کتنا پرتلاش کہ کتاب کا نام اسم غیر معنی ہے نیز اس میں بعض ضروری باتوں میں فروگزاشتیں بھی ہو گئی ہیں اور اکثر اُن لوگوں کا ذکر بھی نہیں جنہوں نے زبان اردو کی ترقی میں بہت کوششیں کی ہیں ان اعتراضات کا یہ جواب دیا جاسکتا ہے کہ اس کتاب میں نظم اردو کو ایک خاص نقطہ نظر سے دیکھا گیا ہے حال کچھ بھی ہو کہ کتاب کا رآمد مفید ضرور ہے اور ش مولوی حکیم عبدالحی صاحب مرحوم کے گل رعنا کے جو قدیم طرز کا تذکرہ اس میں بعض خاص خاص باتیں ایسی ہیں جو دوسری کتابوں میں نہیں ملتیں۔

مولوی عبداللہ جلدیاد | مولوی عبداللہ صاحب بی اے دیا آبادی خلفہ الصدق مولوی عبداللہ جلدیاد ۱۹۵۲ء میں آپ کا سال ولادت ہے ابتدائی عربی اور فارسی گھر پر فراغت کیے دوپٹی کھٹکڑ مرحوم ۱۹۵۲ء میں آپ کا سال ولادت ہے ابتدائی عربی اور فارسی گھر پر فراغت کیے زبان انگریزی سیتاپور ہائی اسکول میں پڑھنا شروع کی اور انٹرنس پاس کر کے کیننگ کاٹی کھٹکڑ میں داخل ہوئے جہاں سے علیحدہ میں بی اے کی ڈگری حاصل کی پھر درجہ تکمیل پوسٹ گریجویٹ سینڈنگ کے لیے علیگندہ کالج میں داخل ہوئے مگر والد کے انتقال کے سبب سے وہاں زیادہ عرصہ تک قیام نہ کر کے لکھنؤ چلے آئے اور یہاں مگر تصنیف و تالیف کے سلسلے میں مشغول ہو گئے ۱۹۵۲ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کے دارالترجمہ سے تعلق ہو گیا تھا مگر کچھ عرصہ بعد تعلق ترک کر دیا گو اب بھی گورنمنٹ نظام کے وظیفہ خواہ ہیں اور عثمانیہ یونیورسٹی کے واسطے کچھ نہ کچھ ادبی کام کرتے رہتے ہیں۔ مولانا سیاسیات سے بھی بڑی دلچسپی رکھتے ہیں اور سیاسی حلقوں میں ایک خاص عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں

ہفتہ وار اخبار پرچم آپ کی ادارت میں نکلتا ہے۔

مولانا کراچی دنیا میں ایک خاص شہرت حاصل ہے۔ کتب فیل آپ کی تصانیف سے شہرہ میں
 فلسفہ جذبات فلسفہ اجتماع تاریخ اخلاق اور پرمکالمات برکھ یعنی برکھ کی مشہور کتاب
 مڈائیل گز کا اردو ترجمہ پیام امن بحر المحبت (مثنوی مصحفی) زد و پیشان (نامک) سائیکالوجی
 لیڈر شپ (انگریزی میں) تصوف و اسلام فلسفیانہ مضامین (اس میں وہ چھ مضامین داخل ہیں جو
 الناظر میں چھپے تھے) مولانا کا مطالعہ فلسفہ بہت عمیق ہوا فلسفیانہ کتابیں اور مضامین نہایت
 سلیس اور دلچسپ ہیں لکھنے کا آپ کو خاص ملکہ حاصل ہے آپ کے انگریزی کے ترجمے نہایت صفا
 با محاورہ اور شیریں ہوتے ہیں مصحفی کی مثنوی بحر المحبت جو غیر مطبوعہ تھی آپ نے نہایت محنت اور عرق بڑی
 سے چھپوائی اور اس پر ایک عقیدہ اور یلغ مقدر لکھا ہے۔ آپ کبھی کبھی اپنے مقررہ ملکات معنی فلسفہ اور
 تصوف اور نیکی احسان سخن سے ہٹ بھی جاتے ہیں اور تفتنی طبع کے طور پر ملکی اور بیگ چیزوں کی
 طنز ستوحیر ہو جاتے ہیں اسی آخر الذکر صنف میں آپ کا ڈراما زد و پیشان ہے جو ہر چہ کہ اسٹیج کے لائق
 نہیں مگر پڑھنے میں بہت لطیف اور دلچسپ ہے اگرچہ شکر گوئی میں بھی کافی شہرت حاصل ہے گو کہ کم کہتے
 ہیں مگر جس قدر کہتے ہیں زیادہ تر متصرفانہ رنگ میں ہوتا ہے۔ موجودہ اخبارات و رسائل مثلاً معارف
 الناظر اردو ہندوستان ریویو ماڈرن ریویو وغیرہ سب آپ کے اعلیٰ مضامین کے مہمون منت ہیں
 آپ کے مضامین معلومات سے پر ہوتے ہیں اور اسی کے ساتھ اعتدال پسندی اور یکجہلی اور علمیت
 آپ کے کلام کا خاص جوہر ہے۔ قوت تقید آپ کو خدا نے تعالیٰ نے بہت اعلیٰ درجے کی دی ہے۔
 سنا جاتا ہے کہ بالفعل آپ ملفوظات مولانا روم کو شائع کرنے کی تیاری کر رہے ہیں آپ کی ذات
 ادبی رود کے لیے باعث فخر ہے اور آپ کی تصانیف سے زبان کو خاص فوائد پہنچتے رہتے ہیں۔

جدید علوم کی ترویج | دلی کالج کے قیام سے جدید علوم و فنون کی ترویج و ترقی میں خاص مدد ملی
 دلی کالج کا قیام | بقول سرائند ریوز کے انیسویں صدی کے شروع میں جو ایک عجیب و غریب علمی ادبی

چکی تھی اُس کی وجہ زیادہ تر نئے نئے انگریزی علوم و فنون تھے جنکی تعلیم نے ہندوستان میں کے واسطے
ایک بالکل نئی منظر پیش کر دیا تھا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ آئندہ پرودہ غیرت کے کیا ظاہر ہوگا۔ دلی کالج
میں جو کمیسری اور فرکس (کیمیا و طبیعیات) کے نئے نئے تجارب طلباء کو دکھائے جاتے تھے اُن سے وہ
نفاذیت مسرور بلکہ بہت ہو جاتے تھے اور انہیں کہہ سکتے تھے کہ آئندہ وہ کیا دیکھیں گے۔ وہ بے تکلف
تخیال کرتے تھے کہ ہم لوگ ایک جدید دور کے پانی ہیں اور ترقی اور انکشافات کے وہ خواب دیکھ کر تے
تھے۔ اس جدید علمی فہم نے اُنہیں ہمد کو متحرک کر دیا تھا جس میں سلطنتِ غلیبہ کے دوسرا ترکا کر و فرادر
شامل مشکوہ بھی کچھ شامل تھے مگر یہ روشنی تھوڑے سے عرصہ تک قائم رہ کر بجھ گئی اور اُس کے منہ پر
کے اسباب میں غدر سے لے کر کو بھی بڑا دخل ہے۔

دلی کالج میں ۱۸۵۷ء میں ایک درجہ انگریزی کا بھی کھل گیا تھا اور دیا و جو انگریزی سے
معنی الف کے طلباء کی تعداد کم نہ تھی۔ ۱۸۵۷ء کے رجسٹروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت بھی کالج
میں تین سو طالب علم انگریزی پڑھتے تھے۔ اسکولِ اجمیری دروازہ کے قریب تھا مگر جب ترقی
کر کے کالج ہوا تو کشمیری دروازہ اور دیا سے جتنا کے قریب گیا۔ ۱۸۵۷ء میں اسکولِ اجمیری اور دیا سے
منتقل ہو کر شاہی کتب خانہ میں آگیا چونکہ جدید تعلیم سے لوگوں میں متافرت اور مخالفت ہو
لہذا اس وقت طلبہ سے کوئی نفیس نہیں لی جاتی تھی بلکہ اچھے اچھے وظائف اُنہیں انگریزی کا شوق پیدا
کرنے کے واسطے انگودیے جلتے تھے۔ کالج میں مغربی علوم کے ساتھ ایک شرعی صیغہ بھی تھا ریاضی کی
تعلیم نہایت اعلیٰ درجے کی ہوتی تھی۔ ادب اور زبانِ انگریزی کو لوگ زیادہ پسند نہیں کرتے تھے مگر مغربی
علوم اور ریاضی کے بہت گرویدہ تھے تعلیم زیادہ تر لکچروں کی مدد سے ہوتی تھی نہ کہ کتابوں کی۔ کیرنگ کتابیں
دور دراز مقامات سے آتی تھیں اور وقت سے ملتی تھیں اور ظاہر ہے کہ اس وقت جدید علوم کی کتابوں
کے ترجمے بھی نہیں ہوئے تھے۔ لکچروں کو طلبہ نہایت شوق سے سنتے تھے۔ نئے نئے ریاضی کے مسائل
میکر کر اور جدید تجارب کیمیاوی اور فنی و فنیسی اپنی آنکھوں سے دیکھ کر ان کو خیال پیدا ہوتا تھا کہ
ہم بالکل ایک نئی علمی دنیا میں قدم رکھ رہے ہیں۔ پروفیسر محمد زبور دستِ شفقت رکھتے تھے اور

مشہور پرنسپل کلج اور پرنٹرز اجمودھیا پر شاہجودتی کے کشمیری پرنٹرز اور اسسٹنٹ پروفیسر تھے
 طلبہ کی تعلیم دہاتی میں نمایاں حصہ لیتے تھے۔ مشرقی صیف میں عربی و فارسی کی تعلیم زبان اردو کی ماسطت
 سے ہوتی تھی اور صیف علیہ میں بہت اردو عزیز تھا مولوی امام بخش صہبائی فارسی کے بڑے باندوں میں
 ماہر کلج میں فلسفی پڑھاتے تھے سید صاحب مولوی امام بخش صہبائی دونوں مدرسوں میں مارے گئے۔
 دلی کلج سے پندرہ کر مشہور مشہور لوگ بکھلے جھیل نے زبان اردو کی تاسد تویسہ دہاتی بہت بڑا اثر
 ڈالا مولوی نذیر احمد۔ ماسٹر پیارے لال آشوب مولانا آزاد۔ مولانا حالی۔ اور مولوی نوکاشہ
 کے نام پیش کیے جاسکتے ہیں۔ دنیاوی ترقیاں بھی ان میں سے بعض نے بہت کچھ جتنا پچھو مولوی
 شہادت علی ریاست اندور کے وزیر اعظم ہو گئے اور ڈاکٹر کندل لال شمالی ہند میں نہایت مشہور و زمانہ حال
 کے طرنکے ڈاکٹر گزیرے ہیں ڈاکٹر جن لال عسائی ہو گئے تھے اور غلام میں مارے گئے۔ مولوی دلی کلج
 کی سرپرستی میں ایک دینی انجمن کھولی گئی جس کی روح رواں پروفیسر امجد اور مولانا صہبائی تھے
 اس انجمن کی قابل شایع کوششوں سے اکثر مفید کتابیں تیار ہوئیں جو دلی میں چھپیں اور طلبہ کے
 بہت کام آئیں ان میں سے اکثر کتابیں انگریزی سے اور بعض فارسی سے ترجمہ ہوئی تھیں دلی کی
 تقلید میں اور شہر دلی میں بھی مثلاً آگرہ اور لکھنؤ اور بنارس میں اسی قسم کی کتابیں تیار ہوئی تھیں جو
 اہلیا آفس کے کتب خانے میں موجود ہیں اور ان کے نام بلوم ہارٹ سے اپنی مرتبہ فرست میں دیے ہیں۔ اسی
 قسم کے تراجم اور تالیفات سے یہ بہت بڑا فائدہ ہوا کہ نشر و دو بہت صاف ساوہ اور بے تکلف ہو کر
 اس قابل ہو گئی کہ اس میں کادوباری دنیا کی باتیں لکھی جائیں اور غیر زبانوں سے کارآمد ترجمے کیے
 جاویں۔ مولوی دلی کلج کے بہادر ماسٹر پیارے لال آشوب نے دلی میں ایک اور ادبی سوسائٹی کی
 بنیاد ڈالی تھی جس کے وہ خود سکریٹری تھے۔ اس سوسائٹی کے انتظام میں بہت سے مفید لکچر دیے گئے
 اور تشرار و مدکا چوراع گو کہ نمٹا تاہا مگر کچھ نہیں۔ آشوب سی کی ترجمہ اور مدد سے مولانا آزاد اور حالی
 نے جدید رنگ کی شاعری اختیار کی اور انھیں مولانا حالی کو اکثر انگریزی چیزیں ترجمہ کر کے دیں
 تاکہ وہ ان کو اردو کا جامہ پہنائیں۔ پروفیسر امجد اور مولانا صہبائی کے مختصر حالات علمی لکھے جاتے ہیں

پروفیسر راجندر پر قلم دہی کلچر میں ریاضی کے مشہور پروفیسر تھے۔ بیل صاحب پرنسپل کلچر کے
میل جول اور اثر سے عیسائی ہو گئے تھے۔ یہ ان لوگوں میں ہیں جنہوں نے قدیم دہی کلچر کے انگریزی
اسکول میں سب سے پہلے تعلیم پائی تھی۔ بہت ذکی اور ذہین آدمی تھے انہوں نے ریاضی کا ایک نیا
مسئلہ دریافت کیا تھا جس کی وجہ سے ان کو اہل یورپ کے مشہور ہندوؤں میں شہرت حاصل ہو گئی تھی
مولوی نذیر احمد مولانا آزاد مولوی ذکا احمد وغیرہ ایسے مشہور لوگ تھے شاگرد تھے۔ مولوی ذکا
کو علم ریاضی سے خاص مناسبت تھی اس وجہ سے وہ پروفیسر راجندر کے بہت محبوب شاگرد تھے
اور اسی وجہ سے ان دونوں میں ایک فنی محبت اور ارتباط برقرار رہا۔

پروفیسر راجندر کی نسبت لکھا ہے کہ نہایت بے خون۔ راست بانہ۔ راسخ الاعتقاد شخص تھے
چونکہ ہندو مذہب چھوڑ کر عیسائی ہوئے تھے لہذا تمام تعلقات ذات و برادری کے منقطع ہو گئے تھے اور
بڑی تکفیفیں اٹھا پا رہی تھیں اور اسی وجہ سے مزاج میں ایک قسم کی سختی اور حسرت پیدا ہو گئی تھی
جو کبھی کبھی مباحثے اور مناظرے کی صورت میں ظاہر ہوتی تھی مگر کبھی بھی رحم دل اور معاملے کے پلے تو
غدار کے زمانے میں ان کی جان خطرے میں پڑ گئی۔ ایک شاگرد نے اس سے ان کو مطلع کیا۔ چنانچہ
وہ کچھ دن ایک مکان میں چھپے رہے بعد کو بھیس بدل کر نکل گئے کچھ دنوں بعد جب شہر میں اس
امان ہو گیا تو واپس آئے اور اپنی کوشش سے اپنے بعض دوستوں کو بھی شہر میں بلا دیا۔ کہا جاتا ہے
کہ پروفیسر صاحب دیانت پٹیل کے ڈاکٹر تعلیمات ہو گئے تھے۔ "کرۃ الکاملین" کے مصنف

ہیں جس میں رزم اور یونان کے مشہور مشہور فلاسفروں اور شعراء کے مندرجہ حالات انگریزی اور عربی
کتابوں سے اخذ کیے گئے ہیں یہ کتاب سیکے پہلے ۱۹۳۹ء میں چھپی تھی بعد کو ۱۹۴۸ء میں مطبع
منشی نو کھنور میں چھپی اس میں بعض انگریزی شعر اور فلسفی بعض فارسی شعراء اور بعض مشہور اہل ہند
مثلاً دلیک فنکار اچارج اور بھاسکر جوتشی کے حالات بھی درج ہیں۔ پروفیسر صاحب "اصول علم ہیئت"
اور "عجائب روزگار" کے بھی مصنف ہیں یہ کتابیں ۱۹۳۹ء، ۱۹۴۰ء میں تیار ہوئی تھیں انکی زبان بہت
صاف و امین ہے اور ان کے نشر کے لئے مولوی غلام محی صاحب تہلہ نے اپنی کتاب

سیر المصنفین میں دیے ہیں۔

مولوی امام بخش صہبانی صہبانی قدیم ہوتی کالج میں فارسی اور عربی کچھ پروفیسر بہت روشن خیال اور اخلاقی جرأت کے آدمی تھے۔ زبان فارسی میں ان کو کمال حاصل تھا اور اُس زمانے میں بھی جبکہ فارسی کا دور دورہ تھا اگر خاص عزت اور قدر کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ انہوں نے سپہ مرحوم کو آثار العنادید کی تصنیف میں بہت مدد دی تھی طلبہ میں بہت ہوئے عزیز تھے اور ان کی قابلیت اور شہرت کا طلبہ کے دل پر بڑا اثر تھا بن شہر میں مانتا و مشہور تھے اور قلعہ کے اکثر شاہزادے اور متوسلین اُن سے اصلاح لیا کرتے تھے متعدد کتابیں اُن سے یادگار ہیں۔ زمانہ غدر میں مارے گئے اور اُن کا مکان کھود کر زمین کے برابر کر دیا گیا۔



مولوی غلام امام شہید مولوی غلام امام شہید شاہ غلام محمد کے بیٹے ایٹھی ضلع لکھنؤ کے رہنے والے تھے لکھنؤ کے نام برآوردہ شاعروں میں ہیں چونکہ نعت بہت کہتے تھے اس وجہ سے مداح بنی اور عاشق رسول کے لقب سے مشہور ہیں قتیل مصوفی سے اصلاح لیتے اور فارسی نظم و نثر میں فائز و توفیق مانند اُن کے شاگرد تھے الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ ملازمہ دوش ہونے کے بعد ریاست حیدر آباد سے ایک معقول رقم بطور وظیفہ کے آخر تک ملتی رہی فوارح لکھنؤ حیدر آباد دکن۔ مراد آباد۔ رامپور اور آگرہ میں اکثر سے شاگرد چھوڑے۔ سسرالاجنگ دل۔ نواب کلب علیاں اور دیگر دوسرا احمد ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ مجموعہ میلاد شریف افشائے بہار بے خزاں اور چند قصائد غزلیات ان سے یادگار ہیں۔ تاج گنج اگرہ کا حال پُرانے رنگ کی نثر میں انہوں نے خوب لکھا ہے منشی غلام غوث پتھر خواجہ غلام غوث پتھر کا اصل وطن کشمیر تھا جہاں ان کے بزرگ معزز عہدیں پر مستقر تھے۔ ان کے والد خواجہ حفص الرحمن کشمیر سے تھے اور وہاں سے نیاپال آئے جہاں خواجہ غلام غوث کی ولادت منسلک ہے۔ یہ اپنے والدین کے ساتھ بہت کم سنی میں جبکہ انکی عمر صرف چار برس کی تھی مناسبت سے یہاں کچھ قدیم رنگ کی تعلیم حاصل کر کے منسلک میں اپنے ماموں خان جہاں

مولوی سید محمد خاں کی ہانتھی میں جو نواب لغٹ گورنر مالک مغربی و شمالی کے میزبانی تھے ملازم ہو گئے وہ
 لکھنؤ گورنر جنرل کی ہمراہی میں قلعہ گوالیار کی جنگ میں بھی شریک ہوئے تھے اور بعد اختتام جنگ
 ایک اعزازی خلعت سرکار سے عنایت ہوا تھا۔ اپنے ماموں کے انتقال کے بعد ان کے عہدہ
 میزبانی پر فائز ہوئے جہاں عرصہ دراز تک نہایت قابلیت کے ساتھ خدمات منصبی انجام دے کر
 عہدہ میں ملازمت سے کناراہ کش ہوئے خواجہ صاحب کو علاوہ خطاب خان بہادری کے
 بہت سے انعامات اور خلعت اور طلائی تمغہ قیصر ہند سرکار سے عنایت ہوا تھا مرزا غالب کے
 بڑے دوستوں میں تھے چنانچہ مرزا کے اکثر لکچر خطوط ان کے نام "اُر درے علی" اور "عود ہندی"
 میں موجود ہیں "فغان بیخبر" اور "خونناہ جگر" ان کی گرانبہا تصانیف ہیں۔ ۱۹۰۵ء میں بہت کبیری
 میں انتقال کیا۔ ان کی تقریظ شہید کی "ہمارے بھڑاں مہر پڑانے طرز اور خوشامدانہ رنگ میں ہے
 خواجہ صاحب عام طور پر صاف اور سلیس لکھتے تھے مگر تقریظوں وغیرہ میں وہی قدیم رنگ برہتے
 تھے بعضی متفقہ اور مستحجہ عبارت فارسی کی تقلید میں۔

۱۰
 شمس العلماء سید علی بلگرامی | شمس العلماء ڈاکٹر سید علی بلگرامی۔ ایک مشہور خاندان کی آپ
 یادگار تھے جو علم و فضل کے لحاظ سے بہت عزیز و ممتاز تھا ڈاکٹر صاحب مصروف ہندوستان میں
 ایک نمایاں شہرت اور قابلیت سے تعلیم ختم کر کے تملیل کے لیے انگلستان گئے جہاں آپ نے ہندوستان
 سے بھی زیادہ شہرت اور کلمیائی حاصل کی۔ آپ کے اخراجات سفر کے متعلق سرالار جنگ بہادر
 تھے آپ کو مختلف زبانیں سیکھنے کا خاص شوق تھا چنانچہ عربی و فارسی و سنسکرت میں کامل مہارت
 حاصل کرنے کے علاوہ یوہپ کی مختلف زبانیں اور نیز ہندوستان کی اکثر زبانیں مثلاً بنگلہ و سہیلی
 خوب جانتے تھے۔ آپ کی شہرت زیادہ تر آپ کی مشہور کتب "تذکرہ عرب" اور "تذکرہ ہند" سے ہے جس میں
 اول الذکر فریب و متشقی لیان کی مشہور کتاب کا ترجمہ ہے۔ آپ نے ایک ڈاکٹری کتاب کا بھی ترجمہ کیا ہے
 علاوہ تصنیف و تالیف کے آپ علی گڑھ کلہ کے معاملات میں بھی بہت دلچسپی لیتے تھے، آپ

مذکور بالا دونوں کتابوں کی وجہ سے مصنفین زبان اردو کی صفت اول میں جگہ پانے کے مستحق ہیں
 کیونکہ یہ دونوں کتابیں علمیت اور قابلیت کے علاوہ آپ کی قدرت زبان پر پوری گواہی دیتی ہیں۔
 سید حسین بلگرامی انگریز سبب اور عبدالملک سید حسین بلگرامی سی سی سی۔ اسی ڈاکٹر سید علی بلگرامی مذکورہ
 بالا کے برادر بزرگ ہیں اور گوکہ علمی اور ادبی قابلیت میں پھر بڑے بھائی بڑے بھائی پر فوقیت رکھتے ہیں
 مگر سبک ادب و سبب اس زندگی میں از اب صاحب کو ڈاکٹر صاحب موصوف پر بھائی افضلیت حاصل ہو آپ
 ایک عرصہ دراز تک حیدر آباد کن میں دولت آصفیہ کے اکثر محضرہ عہدوں پر ممتاز رہ کر سیکریٹری آن
 اسٹیٹ ہند کی کونسل میں منتقل ہو گئے افسوس ہے کہ آپ سے تصنیف و تالیف کے میدان میں کوئی
 حرکتہ آرا یا دیگر نہیں چھوڑی صرف چند مضامین اور وہ ایڈریس جو علی گڑھ ایکویشنل کانفرنس میں
 پڑھے گئے تھے اور رسالہ امداد الملک کے نام سے چھپ گئے ہیں ادبی دنیا میں شہرت رکھتے ہیں
 یہ سب تقریباً چار سو صفحہ کی ہے اور اس کے اکثر مضامین سے علی انھوں صوف ترقی تعلیم کے مضامین سے
 آپ کی قیمتی رائیں بخوبی ظاہر ہوتی ہیں۔ ہوا اور پانی کا محضون علی انھوں صوف بہت عمدہ اور قابل قدر
 اور متفک ہونے کے باوجود غیر ضروری اصطلاحات سے پاک ہو۔ دائرۃ المعارف کا قیام جس کا
 مقصد کیا اب اور مفید عربی کتابوں کا شائع کرنا تھا آپ ہی کی مبارک کوششوں کا نتیجہ ہے آپ نے
 بہت کچھ وقت قرآن شریف کے انگریزی ترجمے پر بھی صرف کیا مگر افسوس ہے کہ وہ ناتمام رہا
 مولوی سربز مرزا مولوی عزیز مرزا سی سی اس زمانے کے نہایت قابل اور شہور مشاہدوں میں شمار
 کیے جاتے تھے عہدہ اعلیٰ علی گڑھ کالج سببی۔ اے کی ڈگری حاصل کر کے حیدر آباد میں ملازمت
 اختیار کی یہاں مختلف جگہوں پر رہنے کے بعد پور سکرٹری کے جلیل القدر عہدے پر فائز ہوئے
 یہ نہایت قابل تعریف بات ہو کہ وہ اپنے عہدے کے اہم فرائض منصبی کی انجام دہی میں بھی اتنا
 وقت بھلا لیتے تھے جس کا بیشتر حصہ تصنیف و تالیف اور شافل علی میں صرف ہوتا تھا تصانیف
 حریف ہیں (۱) نواب فتح نواز جنگ مراد علی سی کے انگریزی سفر نامہ انگلستان کا ترجمہ جو
انگلستان فرنگ کے نام سے مشہور (۲) شالین سی کے مشہور و خواجہ جہاں عماد الدین محمد گداواں کے

حالات زندگی موسوم بہ "سیر المحمودہ" (۲۷) کالی واس کا مشہور ڈراما "دکرم اردسی" کا اردو ترجمہ جس کے شروع میں ایک فاضلانہ مقدمہ ہے جس میں سنسکرت ڈراما کی اصل اور نوعیت کے متعلق بہت سی مفید باتیں لکھی ہیں۔ ان کو پڑانے کے جمع کرنے کا بھی شوق تھا چنانچہ ان کا مجموعہ کتب جات بہت اعلیٰ درجے کا خیال کیا جاتا تھا۔ اکثر جرائد اور اخبارات میں جو مضامین لکھتے تھے وہ "حیالات عزیز" کے نام سے شائع ہو گئے ہیں۔ ان کو بھی علیگڑھ کالج کی ترقی بلکہ نواسلمانوں کی ترقی تعلیم سے بڑی دلچسپی تھی۔ یہ خدمت میں ملازمت سے کنارہ کش ہو کر آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سکرٹری ہو گئے تھے جس میں نہایت ہوشیاری اور قابلیت سے اپنے فرائض منصبی انجام دیے تھے۔ ان کا انتقال ۱۹۱۲ء میں ہوا۔ طرز تحریر نہایت سلیس اور دلکش ہے۔ بیجا الفاظ اور لطوئل سے بہت بچے ہیں۔ اپنے زمانے کے مشہور شنگار دل میں خیال کیے جاتے تھے۔

مولوی عبدالحق سکرٹری | زمانہ موجودہ کے مشہور افاضی اور مصنفین میں مولوی عبدالحق صاحب انجمن ترقی اردو | قابل مدیر رسالہ "اردو" اور "آئینہ سکرٹری انجمن ترقی اردو" کا اہم کاری خاص طور پر نمایاں ہے۔ سچ بوجھ ہے جو جس قدر نہاں اردو کی ترویج و ترقی اس وقت دکن میں ہے وہ آپ ہی کی ذات ہار کات کی بدولت ہے آپ ہی انجمن مذکور کے روح رفاں اور بانی ہیں ہاتھ میں اس کے کل کاروبار کی عنان ہے انجمن نے آپ ہی کے زیر ہدایت و سرپرستی نہایت مفید اور عمدہ کتابیں خواہ از قلم یا لغات یا تراجم بکثرت شائع کی ہیں اور اکثر مطبوعات انجمن پر مفید اور فاضلانہ مقدمے اور دیباچے ہیں وہ آپ ہی کے اشاعت قلم کے نمونے ہیں جن سے آپ کی تحقیقات علیہ اور معلومات کا پورا پورا پتہ چلتا ہے۔ ان کے علاوہ جو مضامین آپ رسائل وغیرہ میں لکھتے رہتے ہیں وہ بھی نہایت موقر اور پُر اثر معلومات ہوتے ہیں الحق آپ کی ذات ہمارے لیے بہت غنیمت اور یقیناً آپ کی شخصیت بہت نیرودہ رہے آپ نے تمام عمر ادب اردو کی خدمت میں لے اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن ملکی تصاویر اور نقوش کے ساتھ مصنف مرحوم کے لائق فرزند کی طرف سے

نظامی پریس بیاؤں سے حال میں شائع ہوا ہے ۱۲

صرف کردی اور اسی کی بدولت ہم کو آج یہ دن نصیب ہوا کہ صد ہائے ظلمی فسق جو گوشہ انکساری میں
پڑے پڑے ضالچ ہو جاتے آج زیب قرطاس ہو کر ہماری آنکھوں کو روشن کر رہے ہیں و قدیم
تاریخ نظم و نثر اردو سے جس قدر ہم اس وقت بہر مند ہیں وہ بھی زیادہ تر آپ ہی کی ماسعی جمیلہ کا نتیجہ
ہے ایک عرصہ دراز تک آپ نے نظام گو و منت کے محکمہ تعلیم میں کام کیا مثل اکابر سلف کے آپ محدود
منکر المزاج اور خاموش کام کرنے والوں میں ہیں اور اسی وجہ سے اپنی زندگی کے حالات تک
دینے سے گریز فرماتے ہیں قوت نقد آپ میں بہت زبردست ہے اور آپ کی تنقیدات ہمیشہ
غیر جانبدارانہ اور منصفانہ ہوتی ہیں۔ اردو نثاروں میں آپ کا مرتبہ بہت بلند ہے اور سب سے بڑی
خوبی آپ کی تحریر میں یہ ہے کہ آپ کبھی عمدہ ہندی الفاظ کو نہیں پھوڑتے بلکہ ان کو اپنی عبارت
میں نہایت خوبی اور اتادی کے ساتھ کھیلتے جاتے ہیں البتہ آپ کی عبارت کا مثل مولانا آزاد
وغیرہ کے کوئی خاص طرز نہیں۔ جو لوگ آزاد کے طرز ادیان کی شیخوں کو پسند کرتے ہیں ان کو ضرور
آپ کی عبارت رکھی چھکی ادب بجز معلوم ہوگی۔ مگر اس سے کسی کو انکار نہ ہو گا کہ آپ کو زبان پر پوری
طرح قدرت حاصل ہے۔ ہمارے نزدیک آپ کی تحریر کارنگار کسی سے ملتا ہے تو وہ مولانا حالی ہیں
بلکہ زمانہ حال کی ضروریات اور جدت طرازیوں کا لحاظ رکھا جائے تو ان پر آپ بوقت لے گئے ہیں
علاوہ دیگر کمالات کے جس سے آپ نصف میں سب سے بڑی صفت آپ میں یہ ہے کہ آپ نے
اس عہد میں اپنے اثر سے لوگوں کے دلوں میں زبان کا خاص شوق پیدا کر دیا ہے۔

مولوی وحید الدین سلیم | مثل مولوی عبدالحق صاحب کے مولوی سید وحید الدین صاحب سلیم بھی زمانہ
مروجہ کے نامور شاعر اور محققین زبان اردو میں ہیں۔ آپ مشہور خاندان سادات ہیں جنھوں نے
پانی پت میں توطن اختیار کر لیا تھا جہاں آپ کے پد بزرگوار حاجی مولوی فرید الدین صاحب کے شاہ شرف
یوعلی قلندر کے مزار پر انوار کی تربیت کا شرف حاصل تھا۔ مولوی صاحب موصوف ابتدائی تعلیم
سے فراغت حاصل کر کے لاہور گئے جہاں آپ نے ادب عربی کی تکمیل مولانا فیض انھن سہانچوری
سے کی اور معقول و مقبول مولانا عبدالرشید ٹونکی سے پڑھا۔ زبان انگریزی میں انٹرنس کا امتحان

پاس کیا اور فارسی میں مثنوی فاضل کا درجہ حاصل کیا۔ ابتدائیں قانون کی طرف کچھ میلان خاطر تھا مگر اس خیال کو ترک کر کے ریاست بھارپور میں صیفہ تعلیم میں کوئی جگہ حاصل کی جہاں کچھ عرصہ تک قیام کر کے رام پور ہائی اسکول کے ہیڈ مولوی ہو گئے مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد آپ کے قدر دان و مربی جنرل عظیم الدین خاں کے قتل کا ناگوار واقعہ پیش آیا تو ترک قتل کر دیا۔ کچھ دنوں اپنے وطن پلانی پت میں مطب بھی کھولا تھا اور ایک خانہ بھی قائم کیا تھا اس کے بعد مولانا حاتی کی وساطت سے سرسید مرحوم کی خدمت میں باریابی ہوئی وہ آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور آپ کی وجاہت اور قابلیت کا ان کے دل پر بہت اثر ہوا اسلیم صاحب سرسید کے پرائیویٹ سکرٹری ہو گئے اور عام طور پر ان کی تصنیفات اور مضمون نگاری میں اعانت کرنے لگے یہ صاحب کے ساتھ ان کے مرتے دم تک رہے۔ اس کے بعد اپنا رسالہ معارف نکالا جو کچھ عرصہ تک کامیابی سے چلا پھر نواب محسن الملک کے اصرار سے علیگڑھ گزرتے کے ایڈیٹر ہو گئے مگر تھوڑے دنوں بعد وجہ علالت کے اس کو ترک کر دیا اس کے بعد مسلم گزٹ لکھنؤ کے ایڈیٹر ہو گئے مگر مجدد کانپور کے ہنگامے کے متعلق کچھ تیز مضامین لکھنے کی وجہ سے یہ جگہ بھی چھوڑنا پڑی پھر اخبار زمیندار کے اسٹان میں ہمیشہ صحیفہ ایڈیٹر داخل ہوئے لیکن جب اس کی ضمانت ہو گئی تو ان کو بھی اپنے تعلقات اخبار سے منقطع کرنا پڑے۔ ان کی مضمون نگاری اور ترجمہ کی شہرت نے حیدرآباد کے دارالترجمہ کی طرف ان کو گھسیٹا جہاں انکی مشہور کتاب موضحہ اصطلاحات تصنیف ہوئی جب عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام ہوا تو پہلے وہ اسسٹنٹ پروفیسر اور مقرر ہوئے مگر چار برس کے بعد پورے پروفیسر ہو گئے۔

آپ کا طرز تحریر نہایت زوردار سلیس اور معنی خیز ہے کہیں کہیں آپ جذبات نگاری سے بھی کام لیتے ہیں۔ آپ اس زمانے کے اکثر مشہور و نامور رسائل میں مفید مضامین لکھتے رہتے ہیں انکی مختصر آپ کے مضامین "تلسی داس کی شاعری" اور دیوالا اور عرب کی شاعری "جو رسالہ اردو" میں چھپے تھے نہایت اعلیٰ درجے کے اور قابل پڑھنے کے ہیں۔ ایک بڑی مصنفہ ابکی تحریر میں یہ کہ آپ غیر مانوس فارسی اور عربی الفاظ کے زیادہ شائق نہیں بلکہ مثل مولانا حاتی کے ہندی کے شیریں اور

نشریۃ الفاظ اپنی تحریروں میں بے تکلف استعمال کرتے ہیں۔ آپ کی قابل قدر تصنیف "وضع اصطلاحات" نہایت مفید اور عملی اور جہ کی کتاب ہے جس سے آپ کے تبحر علمی اور تحقیق کا پتہ چلتا ہے۔ اس میں زبان اردو کی اصل کا نہایت خود سے مطالعہ کیا گیا ہے اور جدید سائنس شک اور ٹیکنیکل الفاظ اور محاورے وضع کرتے کے لئے نہایت مفید قواعد قائم کیے ہیں۔

شیخ عبدالقادر شیخ عبدالقادر صاحب زبان اردو داد پور کے منتقل محسنوں میں سے ایک تھے۔ بابر آباد میں ۱۹۰۳ء میں پشتر لدھیانہ میں پیدا ہوئے جہاں آپ کے اسلاف قانون گویوں کے محرز خدمات انجام دیتے تھے۔ آپ کے والد شیخ فتح الدین لدھیانہ کے محکمہ مال میں ملازم تھے۔ جس وقت ان کا انتقال ہوا شیخ صاحب کی عمر صرف پندرہ سال کی تھی۔ زمانہ طالب علمی نہایت نامور سی اور کامیابی سے ختم کر کے ۱۹۰۶ء میں قورمیں کرپسین کالج لکھنؤ سے بی اے کی درگزی اول درجے میں حاصل کی جس کے بعد پنجاب آکر لاہور کے ایڈیٹریل اسٹاف میں داخل ہوئے اور ۱۹۰۹ء میں چیف ایڈیٹر ہوئے۔ ۱۹۱۰ء میں اخبار سے تعلق ترک کر کے برٹری کی واسطے انگلستان روانہ ہوئے جہاں حسب معمول تین برس رہے اور اسی عرصہ میں ولایت کے اکثر مشاہیر سے ملنے اور بڑے کامیابیوں کے حصول کا خوب موقع ملا بعد حصول دلری اکثر ممالک یورپ اور بلاد اسلامی کا سفر کیا جس سے معلومات میں اضافہ اور خیالات میں بہت کچھ ترقی ہوئی۔ ہندوستان واپس آکر پہلے دہلی میں کام شروع کیا تھا اگر وہ برس بعد لاہور آگئے۔ ۱۹۱۱ء میں لائل پور میں سرکاری وکیل اور پبلک پراسیکیوٹر مقرر ہوئے۔ ۱۹۱۲ء میں عیسوی ترک کر کے لاہور میں پھر برٹری شروع کی اور اب ان کا شمار درجہ اول کے برٹروں میں ہوتا ہے۔ ۱۹۲۱ء میں ہائی کورٹ کے جج عارضی طور پر ہوئے اور پھر ایک سال تک ڈسٹریکٹ جج بھی رہے۔ ۱۹۲۳ء میں ایسٹ کونسل پنجاب کے ممبر منتخب ہوئے اور پھر ڈپٹی پریسیڈنٹ اور پریسیڈنٹ بھی ہو گئے۔ ۱۹۲۵ء میں پنجاب کے ذریعہ تعلیمات مقرر ہوئے اور ۱۹۲۶ء میں لیگ اقوام کے ساتویں اجلاس میں مقام جنیو میں ہندوستان کی طرف سے کمیشنٹ ڈی لیگٹ شریک ہوئے ان مناسب جلیلہ اور ادنی خدمات سے اسے انوس ہے کہ وہی صاحب موصوف کا ابھی تھوڑا عرصہ رہا کہ انتقال ہو گیا۔

۳۰ ولادت ۱۸۸۰ء وفات ۱۹۵۰ء

صاف ظاہر ہے کہ جس قدر امیدیں آپ کے کامیاب زمانہ تعلیم میں آپ کی ذات سے وابستہ تھیں وہ سب پوری ہوئیں۔

شیخ صاحب کو زبان اردو کے ساتھ ایک خاص عشق ہے جب آپ انڈرگریجویٹ تھے تو آپ نے اسی زمانے میں ایک سلسلہ لکچر زبان انگریزی میں زبانہ حال کے اردو شعرا و شاعروں پر چنا شروع کیا تھا جو ۱۹۰۸ء میں کتاب کی صورت میں شائع ہوا ادیبانک میں بہت مقبول ہوا پندرہ بشن نرائن درآبخانی نے بھی اس کی بڑی تعریف کی تھی گو کہ اس کے بعض نتائج اور رایوں سے ان کو اختلاف بھی تھا۔

۱۹۰۱ء میں اردو کا مشہور و معروف ماہوار رسالہ مخزن البھاری نے ادب اردو کی نہایت پیش بہادر قابل قدر خدمات انجام دیں اور فی الحقیقت ہماری زبان پر اس نے اپنا سنگ بنیاد دیا اس رسالہ کے اکثر مضمون نگاروں کو خاص شہرت حاصل ہوئی۔ ۱۹۱۰ء تک شیخ صاحب ہی اس کے ایڈیٹر تھے بلکہ ۱۹۱۲ء تک وہی اس کے انگریزی ایڈیٹر رہے۔ اس رسالہ کی یہ خصوصیت تھی کہ اس کے اکثر مضامین اس قدر مشہور و مقبول ہوئے کہ کتاب کی صورت میں شائع ہو کر داخل کورس ہوئے ۱۹۱۰ء میں شیخ صاحب نے "اردو کانفرنس" کے اجلاس گلکٹ میں صدرانہ کی تھی اور بالفعل آپ "انجمن ادب عالم لاہور" کے صدر ہیں۔

پندرہ منبر لال زنتی | پندرہ صاحب ۱۹۰۸ء بمقام فیض آباد پیدا ہوئے جہاں آپ کے والد پندرہ کنتیا لال زنتی بیگم رکن چارمنٹ میں ملازم تھے آپ کے والد کا انتقال ۱۹۰۸ء میں ہو گیا ۱۹۰۸ء میں آپ نے بی۔ اے کی ڈگری کیننگ کا لکھنؤ سے حاصل کر کے ۱۹۰۹ء میں امتحان ٹریننگ نہایت عزت کے ساتھ پاس کیا۔ پہلے کسی اسکول میں ٹیچر رہے پھر ۱۹۰۲ء میں امتحان ایم اے سے فراغت کر کے جس میں آپ اول ہوئے تھے، ۱۹۰۳ء سے ۱۹۰۷ء تک ٹریننگ کالج آباد کے پروفیسر رہے اور اسی عرصہ میں آپ اکثر مضامین انگریزی ہندستان ریویو

اور اردو مضامین زمانہ، ایسٹ اور کٹیمیری دہلیں کو بھیجے رہے ہیں ۱۹۱۶ء میں ہبیڈ مارٹری کے بعد
ایکسپریس ہاربرس ہونے سے ایک سال بعد جیٹار بنارس یونیورسٹی اور ایک سال پرنسپل ٹرننگ کالج الہ آباد بھی
آپ وہ چکے ہیں ۱۹۱۹ء میں لوکل گورنمنٹ کے ایڈسکریٹری اور ۱۹۲۱ء میں ایک سال کے واسطے
قائم مقام اسسٹنٹ ڈائریکٹر صحت تعلیم رہے۔ بالفعل آپ چوبلی کالج لکھنؤ کے پرنسپل ہیں۔ گلدستہ ادب
اور ایجوکیشن ان برٹش انڈیا میں تعلیم برٹش انڈیا میں، آپ کی تصانیف سے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ
نے مرزا غالب اور چکیت وغیرہ پر نہایت فاضلہ مضامین بھی لکھے ہیں اور اکثر ادبی مباحثوں میں نہایت
ذوق و شوق سے حصہ لیا ہے آپ کو کتب بینی کا بے حد شوق ہے اور ناقد بھی آپ اعلیٰ درجے کے ہیں۔
آپ کے ریویو نہایت متصفانہ اور غیر جانبدار ہوتے ہیں کبھی کبھی آپ نظم اردو کے پُر اسے
رنگ سے ناراض ہو کر زمانہ حال کے زبردستی کے شاعروں کی خوب خبر لیتے ہیں۔



۱
منشی دیانتر این نغمہ دنیا کے جدید نگاری میں منشی دیانتر این نغمہ کے نام سے کون ناواقف ہے۔
میں بمقام کانپور ایک معزز کالیستہ خاندان میں آپ پیدا ہوئے۔ آپ کے دادا منشی شیو سائے صاحب
ایک مشہور وکیل اور وائس چیئرمین ڈسٹرکٹ بورڈ تھے۔ نغمہ صاحب ۱۸۹۹ء میں کرائسٹ چرچ کالج کانپور
میں داخل ہوئے اور ۱۹۰۱ء میں بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ اور اسی سال اپنا مشہور پچھڑ زمانہ
نکلا جواب تک لفصلہ نہایت کامیابی سے جاری ہے۔ ۱۹۰۳ء میں آزاد جاری کیا جو چند روز
رفتہ رہ کر اب ہفتہ وار ہو گیا ہے۔ ۱۹۱۵ء میں آپ آنریری مجسٹریٹ ہوئے۔

بالفعل آپ مختلف مصروفیتوں کے مرکز ہیں جس میں معاشرتی، سیاسی، علمی، ادبی، تعلیمی
اخباری، مغز شکہ ہر قسم کے مشاغل اور مصروفیتیں شامل ہیں۔ سیمونل رفارم (اصلاح معاشرت)
کے معاملات میں آپ نہایت روشن ضمیر اور آزاد خیال۔ اور سیاسیات میں آپ اعتدال پسند تعلیمی
اور ادبی مشاغل میں خاص کر آپ کو توغل ہے اور بحیثیت ایک مدیر اور جریدہ نگار کے تو آپ ہمارے
نوجوانوں کے لیے غمخیز لکھتے ہیں کہ وہ آپ کی مثال کو دیکھیں اور آپ کی کامیابی سے سبق حاصل کریں

آپ نے اپنی پوری عمر اپنے پیارے "زمانہ" کی بیوہ اور ترقی میں صحت کردی اسی وجہ سے یہ عرصہ زائد بیس سال سے اس نمایاں کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔ "زمانہ" ہمارے صوبہ کا بہت پرانا نامور رسالہ ہے اور اس کا شمار اب اردو کے اُن مخصوص چند پرچوں میں آجونی الواقعہ زبان کی سچی خدمت کرتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں قابل ہندو اور مسلمان دونوں بلا تفریق مذہب ملت مضامین لکھتے ہیں اس کی تنقیدیں نہایت اعلیٰ درجے کی ہوتی ہیں اور اس میں معاشرتی اور سیاسی مضامین پر ایسے اہل قلم کے مضامین درج ہوتے ہیں جو اپنے اصابت لائے کے واسطے مشہور ہیں۔ خود منشی صاحب کے مضامین جب کبھی نکلتے ہیں نہایت چمکے تلے انگلیاں بندھ کر اُڑا رہتے ہیں مگر ہم کو انہیں اور شکایت ہے کہ اُن کے مضامین سے پرچہ زیادہ تر فہیبا نہیں ہوتا منشی صاحب ہندوستانی اکاڈمی کے ایک پرچہ جوش اور سرگرم ممبر بھی ہیں۔

لالہ سری رام دہلوی ایم بی اے لالہ سری رام صاحب ایک مشہور خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جس کی شہرت اور عظمت کے واسطے یہ کیا کم ہے کہ اس کا سلسلہ جا کے اکبر کے مشہور وزیر راجہ ٹوڈر مل سے ملتا ہے۔ لالہ صاحب کے آباؤ اجداد سلاطین مغلیہ کے عہد میں ہمیشہ معزز و ممتاز رہے ہیں۔ آپ کے پد پڑ گوار آئیں میں رائے بہادر مدن گوپال صاحب ایم بی اے بیرسٹر ایٹ لا کے اسم گرامی سے دلی اور لاہور کا کچھ بچہ واقف ہے اور آپ کے عم نامہ اور رائے بہادر ماسٹر پیارے لال صاحب ثوب کو کون نہیں جانتا ایک مشہور و معروف استاد اور ماہر فن تعلیم صوبہ پنجاب میں گزرے ہیں اور خواجہ الطاف حسین حالی اور مولوی محمد حسین آزاد کے معاصر اور دوست تھے۔ لالہ صاحب موصوف رحمتیہ دلی میں پیدا ہوئے اور وہیں ابتدائی تعلیم سے فراغت کر کے بارہ برس کی عمر میں والد کے ہمراہ لاہور گئے۔ ۱۸۹۵ء میں بی اے کی ڈگری حاصل کی اور ۱۸۹۷ء میں ایم اے اور منصفی کا امتحان پاس کر کے منصف مقرر ہوئے اور لاہور امرتسر دلی وغیرہ کی کرسی منصفی کو چند سال تک ذمیت دیتے رہے مگر وہ کے موزی مرض میں مبتلا ہو جانے سے ۱۹۰۶ء میں سرکاری ملازمت ترک کرنا پڑی اور علمی شاغل اور اپنی

دیسع ریاست کے اہتمام و انتظام میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ آپ ایک اعلیٰ درجے کی علمی قابلیت رکھنے کے علاوہ نہایت خوش تقریر خلیق اور ملنسار واقع ہوئے ہیں اور آپ کا خاندان ہمیشہ علم و فضل و امارت و سخاوت اور پبلک خدمات کے واسطے ضرب المثل ہے اور اس پر مولانا جامی کا یہ شعر پوری طرح صادق آتا ہے

ایں سلسلہ از طلائے نابست ایں خانہ تمام آفتابست

تذکرہ ہزار داستان | لالہ سری رام صاحب من عظیم المثال تذکرہ کے مصنف ہیں جو انوس پچھکے
المعروف یہ نغمہ خانہ ہاوید | اب تک تمام کو نہیں پہنچا یعنی اس کی چار ضخیم جلدیں چھپ گئی ہیں اور
تقریباً چار ہی ابھی باقی ہیں یہ شعراء اردو کے حالات کا خزانہ اور ان کے منتخب کلام کا مجموعہ ہے اور
اس کو بالامستیغاب مطالعہ کرنے سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ اس کے ترتیب دینے والے میں کس قدر وقت
اور روپیہ صرف ہوا ہوگا اور کس قدر تحقیق و تلاش بلور کس قدر محنت کرنا پڑی ہوگی۔ اسکی ابتدا کے حالات
فیاض مصنف نے جلد اول کے دیباچہ میں مفصل طور پر بیان کیے ہیں اس کی چار جلدیں سنین قبل میں شائع
ہوئیں یعنی جلد اول ۱۹۰۷ء جلد دوم ۱۹۱۰ء جلد سوم ۱۹۱۵ء اور جلد چہارم ۱۹۲۲ء میل مس لاجواب
تذکرہ کو اگر معلومات کی کان کہیں تو بجا ہے اور اگر اس کو تاریخ الشعر کی جان سمجھیں تو زیبا ہے اس نے
صد ہا بھونے جیسے شاعروں کو رد شناس خلق کیا جس میں بعض ایسے بھی ضرور ہیں کہ جن کا کلام ہم تک
نہ پہنچتا تو کوئی زیادہ حرج نہ تھا۔ انداز بیان اس کا اس قدر متین اور مہذب ہے کہ اچھوں کا تذکرہ
کیا بڑھل کو بھی اچھا کر دکھایا ہے۔ بعض جگہ کچھ غلط بیانیوں بھی ہو گئی ہیں مثلاً شاہ ولی اللہ صاحب کو
شاعر دکھایا ہے اور ان کا تخلص اشتیاق بتایا ہے جس کی غلطی سے مولانا حاتی نے متنبہ کر دیا۔ اسی
طرح نقشبوت کو افس کا بیٹا بتایا اور اس غلطی کو منشی احسن مرزا شرر لکھنوی نے اپنی فاضلہ تقریظ
میں درست کر دیا مگر انسان انسان ہے اور انسان مرکب من الخطاء والسیان مشہور ہے فاضل
نے انتخاب کلام میں واقعی کمال دکھلایا ہے کہ ہر شاعر کے صرف چوٹی کے اشعار منتخب کیے جو فی الواقع

بڑی سلامتی مذاق اور اصابت رائے کی دلیل ہے عبارت اس قدر سلیس اور بامورہ فصیح و بلیغ کہ چہرہ پر
 کئے کو جی چاہتا ہے اور مضامین اس درجہ اعلیٰ و ارفع کہ قوط علی نور کئے کو جی چاہتا ہے اتمام خیر
 کے بعد یہ تذکرہ بے نظیر ہے عدیل الحق ہو گا اور نظم اور رد کا انسا یہ بی بی یعنی قاضی الامم کہلانے جا
 کا بے شک مستحق ہو گا اور کیوں نہ قابل مصنف لالہ سری رام صاحب کی عمر بھر کی محنت اور ہمارے
 عہد کی بہترین ادبی خدمت سے تمام تذکرہ نویس سن مانے کے اسکے مرہون منت اور خوشامد
 ہیں اور سب سے بڑھ کر مؤلف کتاب ہذا بالیقین ہے۔ اگر کسی کو تقریظوں کی بہار اور ریویو کے بی آبدار
 دیکھنے میں توجہ اس کی جلدوں کے آخری صفحات پڑھے اور دیکھے کہ کن کن لوگوں نے کس کس
 انڈا اور کس کس ادا سے نظم و نثر دونوں میں کیا کیا کلفشائیاں اور سحر بیانیاں کی ہیں۔ ہمارے نزدیک
 اتنی کثرت سے اور اتنے اعلیٰ درجے کے ریویو کسی ایک کتاب پر ہرگز نہ ہوئے ہوں گے لالہ سری رام
 صاحب نے ۱۸۹۷ء میں دیوان اور ۱۹۰۷ء میں کتاب داغ اور ضمیمہ یادگار داغ بھی نہایت عمدگی
 سے شائع کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے جامع تذکرہ کی فراہمی کے واسطے کتنی کتابیں کتنے صرف کثیر سے
 جمع کرنی پڑی ہوں گی اور وہ نظم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا۔ اسی وجہ سے مصنف کا کتب خانہ جس میں
 اکثر نادر قلمی کتابیں اور تصاویر بھی ہیں دیکھنے کے قابل ہے۔ اور آپ بالفصل اسی ادبی فن میں بکمال
 فراغت ایک قابل رشک زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور خواجہ حافظ کے اس شعر کے کم از کم دوسرے
 مصرعے کے حضور در مصداق ہیں۔

دو یا نزدیک داز بادہ کہن دہیت فراغت و کتابے دگرستہ چھنے

دیگر خاران اور دما موجدہ زمانے میں اردو نثر اور ناول اور ناولین سخن کی اتنی کثرت ہے کہ ان تمام اصحاب
 کے مختصر حالات لکھنا بھی تطویل کا باعث ہو گا لہذا یہاں بعض ارباب ادب کے صرف نام بتائے
 جاتے ہیں۔ ان کے مفصل حالات مع موجودہ شعرا کے ذکر کے ایک دوسری کتاب میں جو ہم تیار
 کر رہے ہیں انشاء اللہ ضرور جگہ پائیں گے۔

لے نہایت فوری سے جاتا ہے کہ تھوڑے عرصہ سے لالہ سری رام صاحب سخت علیل ہیں خدا ان کو صحت جلد عنایت کرے۔

(۱) پنڈت بشن ناراین درآجھائی۔ اردو کے بڑے مبصر موعظ کے علاوہ شاعر شیریں سخن۔ بھی تھے ادب اردو پر اردو اور انگریزی دونوں میں نہایت فاضلانہ تنقیدی مضامین لکھتے رہتے تھے۔ علی الخصوص وہ مضامین جو شرار کے متعلق ہیں۔ اور شیخ عبد القادر کی کتاب ”نیواسکو“ اردو لٹریچر“ (جدید ادب اردو) پر جو فاضلانہ تقریظ لکھی ہے نہایت دلچسپ اور معلومات سے پُر ہے۔

(۲) مرزا جعفر علی خاں صاحب شکر لکھنوی ڈپٹی کلکٹر زمانہ حال کے نہایت خوشگوش شاعر اور قابل سخن سنج ہیں۔ ان کے مضامین میر و سہو داسے ہم نے بھی بہت کچھ فائدہ اٹھایا۔ کلام نہایت سلیس صاف اور زوردار ہوتا ہے۔

(۳) احسن مارہروی فن تنقید میں بلند مرتبہ رکھتے ہیں دیوان دلی کو نہایت قابلیت سے ایڈٹ کیا کتاب اردو شکر بھی ان کی تصنیف ہے جس میں نظم اردو کی درجہ بدرجہ ترقی کو نہایت بخوبی سے دکھایا ہے خیالات آزاد اور زبان ندرہ اور ہوشی ہے مگر بعض اوقات ذاتیات کی بحث سے بدمزگی پیدا ہو جاتی ہے جس سے ہمارے نزدیک احتراز کرنا چاہیے۔

(۴) حامد اشرف رشید احمد صدیقی۔ ریٹو و حسن لکھنوی اور جلیل احمد قدوائی صاحب زبان اردو کے اعلیٰ درجے کے ادیب اور ناقد ہیں۔

(۵) اسی طرح پروفیسر نامی پروفیسر ضامن علی آبادیونیورسٹی کے لکچرار اردو بھی ادب اردو میں بڑی بصیرت رکھتے ہیں۔

(۶) حسرت موہانی نظم اردو اور فن تنقید کے ایک استوار ستون ہیں۔ مضامین اگر مختصر لکھتے ہیں مگر ادیرجھل اور بہت طبیعت وادری کے ہوتے ہیں۔

(۷) خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب کثیر التصانیف ہیں مختلف مضامین پر صفائی اور سلاست سے مگر عام رنگ میں لکھتے ہیں۔

(۸) سلطان حیدر جوش ایک مخصوص رنگ کے نہایت عمدہ لکھنے والے ہیں جن کے مضامین سے الناظر کے صفحات کو زرب و زینت ہوتی ہے۔

(۹) سید سجاد حیدر یلدرم نہر افسانہ نما بہت خوب لکھتے ہیں۔ عبارت بہت دل فریب اور سہل و سلیس لکھی ہے۔ شہرت ہوتی ہے۔ ترکی جانتے ہیں۔ اور ایک کی ناول اور ایک سی ڈرامہ موسوم بہ خوارزم شاہ کا اردو میں ترجمہ بھی کیا ہے ان کا مجموعہ مضامین "خیالستان" مشہور ہے۔

(۱۰) مولانا ظفر علی خان ادبی اور اخبار نویس کی دنیا میں خاص شہرت رکھتے ہیں۔ دست مضمون اور سخن زبان ہیں۔ ان کے اکثر تصانیف انجمن ترقی اردو ذریعہ سے چھپ چکے ہیں۔ سیاسی مضامین لکھنے کا ایک خاص انداز ہوتا ہے۔

(۱۱) مولانا ہاشمی فرید آبادی۔ ادبائے دکن میں خاص طور سے ممتاز ہیں۔ تصانیف بہ کثرت ہیں۔

(۱۲) مہدی حسن بہت اچھے لفظی معرور اور صاحب طرز تھے۔ ان کی کتاب افادات مہدی مشہور ہے۔ انیسویں نو جوانی کی موت نے ان کی ہونہار زندگی قطع کر کے آئندہ امیدوں کا خاتمہ کر دیا۔ جدید نثر اردو کے دو طرز ازمانہ حال میں نثر اردو اتنی کثیر الاشکال ہے اور ایسوں نے اس قدر علیحدہ علیحدہ طرز انشاء اختیار کئے ہیں کہ ان سب کا استقصا اور ان پر رائے زنی کرنا دشوار ہے لہذا ہم یہاں صرف دو طرزوں کا مختصر ذکر کرتے ہیں۔

پہلا طرز۔ عربی اور اردو اس کے اکثر لوگوں کا میلان طبع اس طرز ہے کہ عبارت میں شکل شکل اور مقابلہ میں بھاشا آمیز اردو غیر مانوس فارسی عربی الفاظ بالقصد استعمال کیے جائیں تاکہ عبارت

مشاعر اور وقیع معلوم ہو۔ لیکن ہے کہ اس طرز کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ سرسید اور ان کے رفقاء اور عقیدین ان کی تقلید میں نہایت سیدھی سادی گزردہ عبارت لکھنے کا ہی ہو گئے تھے۔ بعد کے بعض ہوتے پنداریہ کو جب وہ بھی پھلکی بڑھ کر معلوم ہو گئی تو اس میں رنگینت اور ٹیلیٹ کی جاشی پیدا کرنے کے لیے عربی فارسی الفاظ کا بکثرت استعمال کیا جانا ضروری سمجھا گیا۔ گویا اس طرز کو سرسید مرحوم کے طرز کا رد عمل کہنا چاہیے۔ چارے خیال ہیں اس طرز کے خسر مولانا ابوالکلام آزاد ہیں جنہوں نے اپنے مشہور اخبار الاملا میں اس کو بہت بڑا مولائے موصوف مذہب اور بیاریات پر بڑے زبردست لکھنے والوں میں ہیں اور وہ ان کی تحریروں میں اس قسم کی خرابیاں اور لغزشیں مطلق نہیں ہوتیں جو ان کے عقیدین کے یہاں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ جنگی

عبارتیں سوائے قسمل الفاظ کے کوئی خوبی نہیں رکھتیں یہ طرز تحریر اس جماعت کو نہایت پسند آیا جو چاہتے ہیں کہ اہل اسلام کے مختص علوم مثلاً فقہ تفسیر حدیث وغیرہ کی نشر و اشاعت ہو اور اس ذریعہ سے لوگوں میں مذہبی جذبات پیدا ہوں۔ اس کے بالمقابل اور اسی کے جواب میں ایک فرقہ نے سفاکت اور ہندی کے الفاظ بکثرت استعمال کرنا شروع کیے۔ مگر غنیمت ہے کہ اس قسم کی تحریریں خواہ وہ کیسی ہی نیک نیتی پر محمول ہوں ایک مختصر جماعت تک محدود ہیں اور یہی خواہاں اُردو نے اس بدعت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے۔

دوسرا طرز خیالی یعنی ٹیگوری اُردو | طرز مذکورہ بالا کے ساتھ ساتھ ایک دوسرا طرز بھی مروج ہو چو خیالی اُردو کہا جا سکتا ہے۔ اس کو ٹیگوری اُردو بھی کہہ سکتے ہیں اس وجہ سے کہ یہ راہ برداشت ٹیگور کے اس طرز کا نتیجہ ہے جو انھوں نے اپنی تصانیف گیتان جلی وغیرہ میں اختیار کیا ہے۔ پچ پچھے تو یہ ٹیگور اور بعض مشہور انگریز دانشور ان دونوں کا حقیقی نتیجہ نہیں بلکہ ان کے کلام کی محض نقل ہے جس میں ان لوگوں کے محاسن کلام مطلق نہیں پاسے جاتے۔ یہ مثال نہ تو اصلی تصورات سے واقف ہیں اور نہ ان میں حقیقی تخیل کی روح ہو ایسے لوگوں کی افراطی موزوں چیدستان کے عام طور پر بالکل خام ہوتی ہے۔ اس میں کسی قسم کا ادبی حسن نہیں ہوتا بلکہ زیادہ تر مبالغہ آمیز اور مطلق العنان اور سطحی ہوتی ہے۔ اور بعض اوقات تودہ مجذوب کی بڑے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ ان غیر منسلک باتوں کو بااقتات ان کے صنائع قیمتی سمجھے جاتے ہیں۔ بعض وقت اس قسم کی تحریریں غیر مذہب بلکہ نمش و جہ تک پہنچ جاتی ہیں۔ اس قسم کی نثر کی ابتدا افانہ نویسی سے ہوئی اس سے لوگوں کو بہت لطف آنے لگا اور نئی معلومات کے راستے کھل گئے مضامین میں وسعت اور تنوع اور عبارت میں ایک خاص شان اور رنگینی اس سے پیدا ہوئی صاحب تحریر بے تکلف صاحب طرز بن بیٹھے اور اپنے مفروضہ شعرائہ خیالات اور شعائر انہوں کو بلا عود و من کے تھجھٹ کے نثر کی صورت میں اکر اکر دکھانے لگے تاکہ لوگ ان کو نثر شاعر سمجھنے لگیں اور یہ اس طرح ہوا کہ کبھی تو عبارت عربی الفاظ اور ترکیبوں کا مجموعہ بن گئی کبھی جدت کے واسطے نئے نئے الفاظ اور ترکیبیں تراشی گئیں اور کبھی ایک خاص زور اور انداز پیدا کرنے کے واسطے

محمولی صوفی نحوی ترکیبیں اُلٹ پلٹ کر عبارت ایک طرف مجنون بنائی گئی مضافین میں بھی ملتی ہیں القیاس
بمحبت غریبہ تغیرات ہوئے کبھی ان میں جدت اور نیکیتی پیدا کرنے کے واسطے مشرقی اور مغربی (رومی
اور یونانی) دیوالا بھائی گئی انچر کی بے جان چیزیں جاندار تصور کر کے اس قدر جوش و خروش و رایہ
مصنوعی شاعرانہ جذبات کے ساتھ اُن سے مخاطب کیا گیا کہ بعض افقائے اُس کو پڑھ کر یا سُن کر
بے اختیار ہنسی آتی ہے اور وہ ایک جھوٹی نمائش اور شعبہ بازی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی
ایسے مضافین اور ایسی عبارت البتہ ایک استاد کے قلم سے توفی الواقع رنگِ حسن و مصیقت کا جلوہ زار
بن سکتی ہے مگر نوآموزوں کے ہاتھ میں وہ محض ایک گھروند بن کر رہ جاتی ہے جس میں سوائے الفاظ
کے حسنی کا کہیں پتہ نہیں ملتا۔

پُرانی اخباری دُنیا | ۱۳۳۷ء میں پریس کو آزادی ملی ۱۳۳۸ء میں مولوی محمد حسین آزاد کے والد مولوی
باقر حسین نے اُردو اخبار دلی سے جاری کیا جو حقیقت میں اخبار یعنی خبروں کا مجموعہ نہیں ہوتا تھا بلکہ
ایک دینی پرچہ تھا جس میں اکثر اوقات ذوق و غالب مومن اور دیگر معاشرہ کی غزلیں اور کبھی کبھی
ہم طرح غزلیں بھی درج ہوتی تھیں کبھی اس میں زبان اور عادات کی بحث ہوتی تھی ذوق کی وفات
کی تائید تھیں اور شہیدی کی شاعری پر مباحثہ بھی اس میں پھیپھا تھا گو منتظ اس کی سرپرستی کرتی تھی ۱۳۳۷ء
میں منشی مرکھ رائے نے جو ایک بہت نگرانی کا بیٹھ تھے لاہور سے کوہ نور نکالا۔ یہ پرچہ برفش اٹیا اور
ایسی بیاتیں دونوں میں بہت مقبول تھا ہمارا جگان کشمیر دہلیا اس پرچہ کی اور نیز اس کے مالک
کی بڑی قدر کرتے تھے۔ پہلے وہ ہفتہ وار تھا مگر بعد کچھ تین میں دو مرتبہ اور پھر تین مرتبہ نکلتے لگا آخر
میں اس کا نڈال ہو گیا اور انھیں لوگوں کے ہاتھوں ہوا جنہوں نے اس میں کام سیکھ کر
انہیں کے رقیب سرے پہلے مکان شروع کیے۔ منشی نوکشور صاحب بھی اس کے ارٹان میں کام
کرتے تھے پھر شعاع طوڑا اور مطلع نور کانپور سے پنجابی اخبار اور انجم الاخبار لاہور سے اشرف الاخبار
دلی سے دکنیہ اخبار ریالکوٹ سے قاسم الاخبار بنگلور سے کشف الاخبار بمبئی سے کارنامہ لکھنؤ سے
اور جریدہ روزگار مدراس سے نکلے اور چندوں کے بعد اکثر ان میں سے بند ہو گئے اور اخبار

جس کو منشی نو لکھنؤ صاحب نے شہداء میں جاری کیا تھا اب بھی نکلتا ہے بلکہ اس کا شمار ہمارے
صوبے کے اعلیٰ درجے کے اور مشہور روزانہ اخباروں میں ہے۔ شروع میں جب منشی صاحب موصوف کے
زمانے میں یہ اخبار نکلتا تھا تو یہ زیادہ تر ان خبروں کا مجموعہ ہوتا تھا جو انگریزی اخباروں کے تادیوں یا
نوٹوں سے ترجمہ کر کے چھپائی جاتی تھیں اور اس کی کوئی معیت پالیسی بھی نہ تھی مولائے اس کے کہ سیاسی
مشورے کے یہ ہمیشہ خلاف تھا۔ پہلے یہ ہفتہ وار تھا اس کے بعد روزانہ ہوا۔ اس کا ساز و سامان اور
اثران اعلیٰ درجے کا تھا۔ اس کا ہمعصر شمس الاخبار تھا جو مدراس سے نکلتا تھا اور زیادہ تر مسالوں کے
واسطے مخصوص تھا یہ کوئی میسر ہو چہ نہ تھا اور تھوڑے عرصہ کے بعد بند ہو گیا۔ ایک دوسرا مشہور پریچہ اخبار
عام لاہور جس کو بندت مکند رام نے نکالا تھا جو کہ نور میں ملازم تھے اور ایک منشی یافتہ سرکاری عہدہ
اس کے معادن تھے یہ ایک خاص خبروں کا پرچہ تھا اور نہایت ارزاں تھا کچھ دنوں کو نمٹ اسکی
سرپرست رہی اور ہر اسکول میں اس کے پرچے جاتے تھے مگر یہ سرپرست اب موقوف ہو گئی پہلے یہ
بھی ہفتہ وار تھا اس کے بعد ہر روزہ اور درود روزہ ہوا۔ اس کی زبان اخباری زبان تھی یعنی اس
میں کوئی ادبی خصوصیت نہ تھی۔ مگر یہ بات قابل تعریف ضرور ہے کہ اس کی اندانی قیمت نے
لوگوں کے دل میں اخبار بینی کا شوق پیدا کر دیا اور دھنچ لکھنؤ شہداء میں وجود میں آیا یہ ایک
ظرافت کا پرچہ تھا اور اپنے غزلان شباب میں نہایت کامیاب۔ لگو کہ اس کا انداز اس قدیمند آبا کے
ملک میں اسکے اکثر قتال پیدا ہو گئے۔ اس کی خاص خوبیاں یہ تھیں کہ آزادی سے لکھتا تھا ظرافت و رنگ میں
لکھتا تھا جس کی ملک میں بڑی ضرورت تھی۔ انشا پر داری اعلیٰ درجے کی ہوتی تھی اور سب سے بڑھکر
یہ کہ کسی خاص فرقہ یا جماعت یا کسی خاص مذہب کا طرفدار یا مخالف نہ تھا۔ منشی ہجادیں مرحوم کے
قابل ایشیہ تھے اور اکثر اس عہد کے قابل ظرافت الطبع اصحاب اس کے نامہ نگار تھے ہندوستانی
کی ابتداء لکھنؤ میں پہلے میں ہوئی یہ سب سے پہلا روزہ پرچہ تھا جس نے سیاسیات اور واقعات
حاضرہ پر بالاسیاحت بحث کی یہ ایک نئی درجے کا پرچہ تھا اور کبھی چھوٹی چھوٹی باتوں اور جزئی
مناشیوں میں اپنا وقت ضائع نہیں کرتا تھا۔ چلے ہفتہ وار تھا پھر روزہ ہو گیا اس کی زبان میں

ادبیت نہ تھی ممکن ہے کہ ترجمہ وغیرہ کی جلدی اس کا باعث ہو اسی شان کا پرچہ رفیق ہند تھا جو
لاہور سے نکلتا تھا۔ چیمہ اخبارات میں نکلا مثنیٰ محبوب عالم صاحب اس کے ایڈیٹر تھے اس کی ازاد
قیمت اور مضامین کی عمدگی سے لوگ اس کو بہت زیادہ پڑھتے تھے اور اسی وجہ سے اس میں اشتہار
بکثرت نکلتے تھے۔

دینی اور دنیوی رسالے | اس قسم کے رسالوں میں مولانا شہر مرحوم کا ڈلگداز بہت پرانا رسالہ ہے جو
اب بھی نکلتا رہا ہے۔ زمانہ کا پور کا ذکر مثنیٰ دیار میں صاحب نگم کے ذکر میں گزر چکا۔ ادیب آباد
بھی نہایت عمدہ رسالہ تھا مگر افسوس ہے کہ تھوڑے دنوں میں اسکی عمر ختم ہو گئی۔ الناظر جس کے قابل
ایڈیٹر مولانا ظفر الملک صاحب علوی ہیں نہایت آزاد خیال اور بڑی قابلیت کا پرچہ ہے۔ ہزار داستان
لاہور میں صرف چھوٹے افسانے اور ناول نکلتے ہیں۔ ہمایوں لاہور اور شباب امدولہ ہوبکی اچھی
میں عمدہ پرچہ ہیں نگار کھنڈ (جو پہلے بھوپال سے نکلتا تھا) ایک اعلیٰ درجے کا ادبی پرچہ ہے اور اپنے
خاص ایڈیٹر نیاز فتح پوری کی شخصیت کا پتہ دیتا ہے معارف اعظم گڑھ اور اردو ادب نگار بادیہ دور
زمانہ مجددہ کے بہترین ادبی رسالے ہیں جن کے اکثر مضامین نہایت اعلیٰ درجے کے ہوتے ہیں شہیل
علی گڑھ کو کہ حال ہی میں طلوع ہوا نہایت ہونا رسالہ ہے اس کے مقاصد بہت اعلیٰ ہیں اور اگر ترقی
کرتا ہے تو اس کا شمار بہترین اردو رسائل میں ہو جائے گا۔ مولانا حسرت موہانی کا امداد علی ایڈیٹر
میں بہت مشہور تھا مگر ان یا نہیں ہے مرقع کھنڈ اور کبر الہ آباد سے نکلتے ہیں مخزن ادب دور کی بہت
میش بہ خدمات انجام دی ہیں مختصر یہ کہ سب رسائل کو نام بنام گونا گونا بہت مشکل ہے مگر ان پرچوں میں
جو ایک زمانے میں شہرت رکھتے تھے اور اب بند ہو گئے دکن ریویو جس اور المعقول ذکر ہیں۔

اکثر اخبار نویسوں کے حالات ان کے نام کے تحت میں درج کیے گئے ہیں مولانا ظفر الملک مولوی
میشراہ بن ایڈیٹر البشیر اور تابویر نجیب آبادی خاص طور پر قابل ذکر ہیں اس وجہ سے کہ یہ حضرات ادب
کی بہت قیمتی خدمات انجام دے رہے ہیں مگر کسی کو اردو زمانہ اخباروں کے ایڈیٹر نہ کہ نام و کھنا
تو ایک حق کتاب اخبار نویسوں کے حالات مولفہ محمد الدین فوق ایڈیٹر کشمیری میگزین کا مطالعہ کریں

باب اُردو ناول کی ابتدا شعر اور سرشار کا زمانہ

اُردو کے پُرانے قصے | افسانہ گوئی کا شوق دنیا میں بہت قدیم اور انسان کے دل میں اس کا بہت گہرا اثر ہے۔ پُرانے اُردو قصے یا تو فارسی سے ترجمہ ہوئے یا سنسکرت سے بذریعہ فارسی تراجم کے لیے لکھے یا انھیں دونوں چیزوں کو گھٹا بڑھا کر کچھ نئے قصے گڑھ لیے گئے تھے۔ یہ سب اپنی نوعیت میں مختلف ہیں بعض بہت دشجاعت کے قصے ہیں بعض میں دیووں اور پیروں کا ذکر ہے۔ بعض اخلاقی ہیں اور بعض نہایت مخرب خلاق۔ انداز بیان سب کا وہی ٹکا بندھا مسمولی ہے۔ واقعات کا بیان قریب قریب یکساں ہے جن کو باسبار پڑھ کر طبیعت اکتا جاتی ہے عجائب غرائب کا ذکر عام ہے انسان دیووں اور پریوں کے ساتھ بے تکلف ملتے جلتے ہیں۔ طلسم سحر جادو ہر قصے میں کسی نہ کسی صورت سے موجود ہے بلکہ اکثر اسی پر قصے کا دار و مدار ہوتا ہے۔ انداز بیان عام طور پر رسدہ اور سب آواز ہوتا ہے مگر کٹر فوجی کا کسی جوتہ نہیں۔ اور نہ کوئی داخلی دلچسپی۔ کسی پلاٹ کی تعمیر ہوتی ہے زیادہ تر حسن و عشق کے حالات ساحروں اور جادو گروں کی لڑائیاں، جادو گروں کے شاہزادوں سے مقابلے، اور آدمیوں کا جانوروں کی صورت میں بدل جانا دکھایا جاتا ہے یہ سب کچھ ہے مگر روزمرہ کے واقعات سے وہ خالی ہیں۔

اقام قصص | اخاص اقام قصص حسب ذیل ہیں (۱) الف لیله (۲) برتان خیال (۳) داتان لیچرہ مع اس کے فردعات طلسم ہر شر باغیرہ کے (۴) قصہ حاتم طائی و باغ و بہار وغیرہ (۵) ہندوستانی قصے مثلاً پچیس، کلیہ دمنہ سنگاسن پتیس، گل بکاولی طوطا کہانی وغیرہ۔

مطبع منشی نذیر لکھنؤ | اکثر اس قسم کے قصے مطبع منشی نذیر لکھنؤ میں چھپے ہیں جس کے مالکی نوذ منشی نذیر لکھنؤ صاحب سی آئی۔ اسی قصے اس مطبع نے زبان اُردو کی بڑی خدمت کی اور اس کی رتی پر بہت بڑا اثر ڈالا۔

مادہ قدیم کتابوں کی شاعت، مشہور کتب فارسی ہونے کی ترانیم جدید کتابوں کی پبلک مذاق کے موافق
 تیار کی۔ اور نیز اس کو لی کتابوں کی تیاری سے ادب اُردو پر بہت بڑا احسان کیا۔ منشی صاحب بوضوح
 ۱۳۳۷ء میں بمبئی ضلع علیگندھ میں پیدا ہوئے اُن کے دادا منشی بابا ملنگد اگرہ میں سرکاری خزانچی تھے
 اور والد منشی حمزہ اس بھی کاروبار کرتے تھے۔ منشی نو لکھنویک خود ساختہ آدمی تھے اور بچپن ہی سے
 تجارت کی اعلیٰ قابلیت رکھتے تھے ان کو اخبارات سے بڑا شوق تھا منشی ہر کھد رائے کی ماتحتی میں
 اخبار کہہ نور لاہور میں کچھ عرصہ تک رہے جہاں اُن کو پھارپہ خانہ دغیر کے حالات کا بہت وسیع تجربہ ہو گیا۔
 غدر کے بعد ملازمت ترک کر کے لکھنؤ آ گئے جہاں ۱۳۵۷ء میں سر رابرٹ منگلری اور کرنل مایمٹ کی سرپرستی
 میں اپنا مطبع کھولا۔ تقدیر نے یاد دہی کی اور ان کے کام کو روز افزوں کرتی ہوئی گئی۔ اُن کی قابلیت اُن کی
 حمایت دہی اُن کی پابندی اصول سے یہ مطبع تھوڑے ہی عرصہ میں ہندستان کی بلا انیشیا کے سب سے
 بڑے مطابع میں شمار کیا جانے لگا منشی صاحب نے زکریا قمی نادر قلی کتابوں کی خرید میں صرف کیا جن
 میں سے اکثر کو شائع کہہ کے پبلک کو بہت بڑا فائدہ پہنچایا۔ اس مطبع سے ہزار ہا عربی فارسی سنسکرت اُردو
 ہندی کتابیں بڑے صرف اور بڑے تکلف سے چھپ کر شائع ہوئیں مختلف قسم اور مختلف ہدیوں کے
 قرآن شریف شائع ہوئے جن سے اہل اسلام کو بہت بڑا نفع پہنچا اور دھانجا بھی ۱۳۵۷ء میں انھوں
 نے جاری کیا تھا جس کا اخبارات کے ذکر میں بیان ہوا اُن کی موت ۱۳۹۹ء میں واقع ہوئی اور وفات
 کے وقت انھوں نے تقریباً ایک کروڑ پینے کی جائداد اور کاروبار چھوڑا ان کے بعد ان کے لائق فرزند
 رائے بہادر منشی راگ نرائن صاحب آنجانی نے ادب اُردو و ہندی کی بڑی خدمت کی۔ اسباب
 لگن کے ہونہار فرزند منشی شن نرائن صاحب بھارگو اپنے والد کے قدم چل رہے ہیں اور نو لکھنوی
 پریس آپس کی کوششوں سے نہایت کامیابی سے ترقی کر رہا ہے۔

دستان ایر حمزہ صاحب قرآن | ایک حجم اور ضخیم کتاب متعدد جلدوں میں ہے۔ اصل کتاب فارسی میں
 شیخ ابوالفیض فیضی نے اس کی تفسیر طبع کے واسطے تیار کی تھی اس کے آٹھ دفتر ہیں اور ہر دفتر میں صد ہا
 صفحات کی کسی کسی جلد میں جن کی مجموعی تعداد سترہ اور تعداد صفحات سترہ ہزار سے کم نہ ہوگی

سب سے مشہور دفتر اولیٰ موسوم بہ نوخیزان نامہ دو جلدوں میں اور دفتر ہجتم موسوم بہ طلسم ہوشربا نامہ
جلدوں میں ہے اور نوخیزان ذکر بہت مقبول عام ہے۔ طلسم ہوشربا کی اول چار جلدوں کا ترجمہ میر محمد حسین
جاہ اود آخر میں جلدوں کا ترجمہ احمد حسین قمر گاہے ایک منظم ترجمہ طارم شایان نے بھی کیا تھا۔
نوخیزان نامہ کا ترجمہ منشی نوکشور صاحب کی فرمائش سے شیخ تصدق حسین داتان گئے کیا تھا۔
اس کتاب میں ایک فرضی طویل افسانہ امیر حمزہ کا ہے جو بغیر اسلام صلوٰۃ اللہ علیہ وسلم کے پانچ گوار
تھے جس میں ایک قصہ سے سیکڑوں قصے پیدا ہوتے چلے گئے ہیں۔

بوستان خیال اس کی نو ضخیم جلدیں ہیں اور اس کے مصنف میر تقی خیال سمجھے جاتے ہیں جو اصل میں
گجرات کے رہنے والے تھے مگر آخر میں ٹکی میں گئے تھے یہ قصہ مصنف نے اپنی معشوقہ کی دلچسپی کے لیے
داتان امیر حمزہ کے رنگ میں تصنیف کیا تھا۔ اس کتاب کو محمد شاہ رنگیلے نے بہت پسند کیا اور وہ
آئینے کے زینے میں اور انھیں کے حکم سے اختتام کو پہونچی اس کے تقریباً چار ہزار صفحات میں
پانچ جلدوں کا ترجمہ اُعدہ میں خواجہ میرالدین معروف بن خواجہ امان دہلوی نے امدود جلدوں کا
ترجمہ لکھنؤ میں چھوٹے آغانے کیا اور پوری کتاب پر نظر ثانی بھی کی۔

ان سب کتابوں میں راز عجیب یہ ہے کہ صحیح جذبات نگاری اور کیکڑ نویسی ان میں مفقود ہے
کوئی معین پلاٹ بھی نہیں ہے چند مشہور لوگوں کے بعد ان قیاس افانے ہیں جن میں جنات اور
دیونا دور سے لڑائی اور سحر و سحر و طلسم میں کھنس بھی جاتے
ہیں مگر آخر میں فتیاب ٹپکتے ہیں اور اپنی محبوبہ کھٹالوں کے پیچھے سے نجات دلاتے ہیں قصہ کے تمام
واقعات میں ایسی یکسانی ہے کہ جی اگنا جاتا ہے کوئی تنوع اور ہمدردی نہیں اور روزانہ واقعات
زندگی کی کاتر کہیں ذکر نہیں ہے۔ اکثر یہ قصے فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے شائع ہوئے اور اب منشی
نوکشور کے مطبع میں بڑی آہ و تاب سے شائع ہوتے رہتے ہیں۔

ہذا دور ناول کی بجائے کڑی | مرزا رحیب علی بیگ سردار نے ناول کی آفرینش میں بہت کچھ مدد دی
اپنی مشہور کتاب راز عجیب کی تصنیف سے لوگوں کے دلوں میں افسانہ کا خفق پیدا کر دیا یہ ضرور ہے کہ

اس کی مصنوعی مقفی اور مستح عبارت نے کہیں کہیں مطلب کے گنجاگ کر دیا۔ اور قسلس بیان میں فرق ڈال دیا ہے۔ واقعات معمولی اور مذہبان نہایت پر نقشے اور پیرہیدہ ہے۔

البیہ صوری نذیر احمد صاحب کے بعض نقشے موجودہ ناول کی حدود تک پہنچ جاتے ہیں گوکہ ان میں بھی موجودہ اصول ناول نمسی کی پوری پیروی نہیں پائی جاتی۔ وہ اول سے آخر تک نصیحت آمیز ہیں اور کسی معاشرتی یا تعلیمی مقصود یا کسی مذہبی مسئلہ پر ایک زبردست و عفا کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دیوائے صلوٰۃ، توتہ النصوح، مراۃ العروس وغیرہ کی شے میں کوئی نہ کوئی اخلاقی سبق ضرور جو بہت زور کے ساتھ کھایا گیا ہے۔ بیشک اسی صاحب نے یہ بہت بڑا کمال کیا کہ مافوق العادات اور حیرت انگیز چیزوں کو اپنی تصانیف سے ایک قلم خالص کر دیا اور معمولی واقعات زندگی کو ایک منظم پلاٹ کی صورت میں دیکھی سے بیان کیا۔ ان کی قابل قدر تصانیف جو اس زمانے کے رسم و رواج اور طرق و عادات کی جتنی جاگتی تصویریں ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی قوت استدلال و مشاہدہ کے شاہر ناول ہیں۔ زبان پر انکو پوری طرح قدرت حاصل ہو اور گوکہ اس میں کہیں کہیں ثقات پیدا ہو جاتی ہے مگر پھر بھی سلامت و مدانی ان کے ناولوں کی خاص مایہ الامتیاز چیز ہے سلسلہ واقعات بھی وہ خوب قائم رکھتے ہیں گو کہ کہیں کہیں اس قاعدے کی خلاف ورزی سے نقشے کے تناسب میں فرق پڑ جاتا ہے۔ کیرکٹر ڈیپک مگر ضرورت سے زیادہ ادب آموز ہیں۔

اودھ پنچ اور اس کی ادبی خدمات | منشی سچو حسین مرحوم نے لکھنؤ سے ۱۹۰۷ء میں اودھ پنچ نکال کر ہندوستانی اخبار نویسی اور ادب اردو پر احسان عظیم کی شہر کی ایک خاص شان پیدا کی مذاق و ظرافت جس سے اب تک ہمارا ادب خانی تھا داخل شرموتے زبان میں بلیغ الفاظ شامل کیے گئے نقدی پیدا کی پندرہ طریقہ سے کتابوں کی تنقید کی ناول نمسی میں ترقی کی۔ اودھ پنچ سب سے پہلا اخبار ہے جس نے ایک مقررہ وقت پر ہر ایسی اختیار کی جو ہنر خبر سانی نہیں کرتا تھا بلکہ ہر ایک معاملات میں اپنی آزادانہ رائے رکھتا اور قومی حقوق کا تحفظ کرتا تھا اور ہندوستانی رسد کا تاصع اور محنت بھی تھا وہ اصول کا نگریں کا حامی ہندو مسلم اتحاد میں ساعی، البرٹ بل کی تحقیر اور ایکٹ انکم ٹیکس کے پاس ہونے کا سخت

مخالف تھا لیکن اس کے ساتھ سوشل معاملات میں بہت قدامت پرست سرپرستوں کی تجاویز کا دشمن اور تسلیم نواں اور پردہ کے قائل کا بھی سخت مخالف تھا۔ غرض کہ اس اعتبار سے جدید و قدیم رنگ کا ایک عجیب مجموعہ تھا اس کے اکثر نکتہ نگار ضامیت قابل اور فاضل لوگ تھے۔ مثلاً علاوہ خود منشی محمد حسین مرحوم کے مرزا بھیج بیگ عاشق (جو ستم ظریف کے نام سے لکھ چرخ میں مضامین لکھتے تھے) ترجمان ناقد و قلم منشی چراغ شاہد برحق۔ احمد علی کسمپاشی، اکبر الہ آبادی، نواب سید محمد آزاد۔ جن میں سے بعض کے کچھ حالات ضمیمہ بھی لکھے جائیں گے۔

اصغر بیچیل و ایک طرف لفظ مرقع اخبار تھا مگر کبھی کبھی اس کی ظرافت کا رنگ بدل جاتا تھا اور

اس زمانے میں لوگ اس قدر شمس ہو گئے ہیں اور طاق و ظرافت کا ان میں اس قدر فقدان اور اس شے لطیفہ کی ان میں اتنی کمی ہو گئی ہے کہ وہ بیچیل ایسا بے شے ہونے والا ہے جو حدائق کے پیرایہ میں طبیعت اور ظرافت کے ساتھ محبت رکھتا اور انشا پر دہائی کا بھی بہترین نمونہ تھا جانا تھا کہ نے سابق ایڈیٹر منشی سجاد حسین صاحب کے ساتھ خود بھی کرکھا تھا۔ مگر اجملا کے حکیم ممتاز حسین عثمانی مجددہ ایڈیٹر کا کہ انھوں نے اس کلمہ کیا اور اس کے تن پہ جان میں نے سور سے جان ڈالی ایک سہی میں نرم حکیم صاحب پر صوف کہ منشی محمد حسین مرحوم پتہ بند ہو چکے اس وجہ سے کہ منشی صاحب مرحوم کثرت میں تو بہت سے قابل اہل سخن ہاں کے ہم خاق مایہ دار مددگار موجود اور ان کا ہاتھ بلند کہ بہ وقت تیار تھے بلکہ کبھی قدر دہن تھی احساس تھی با حیرت تھی اصغر بیچ کے تازیانہ ظرافت سے لوگ اسی طرح فضا تھے جیسے شمس کے دھندے بالامولی سے ڈرتے ہیں۔ اکثر یہی امر تھا کہ ایک بزرگوار شخص جب اپنا بڑا چہرہ صفات سے پرچم کے نیچے آئینہ میں دیکھتا تو اپنی ڈانٹنی صورت سے غصہ کر کے لٹا لٹا کر لیتا اور لکھ چرخ کا نظیر پر چڑھتا تھا۔ اس طے ہم خزانہ نام نہاد کے حمل پر غصہ لکھ چرخ کا بھی فائدہ تھا اور وہ صبر و تحمل کے اخلاق بھی نہایت ہو جاتے تھے۔ جی ذرا بھی کہے ہے وہ ہاں لٹا لٹا کر اب وہ باتیں نہیں دیتے لوگوں کے اخلاق بدل گئے اطوار متغیر ہو گئے۔ ظرافت کے قدر داں اور اس سے فائدہ اٹھانے والے مرقع نے رہے لوگوں سے جس اور شے پر یا کامادہ جاتا رہا۔ اور ظرافت کا ان زبھی بدل گیا۔ مگر کبھی بڑی بھلی جیسی ہے ایسی ہے کہ اس وقت ہندوستان میں اور معنی کا نظیر و عدیل نہیں۔ وہ اپنی آپ مثال اور فکر و ظرافت میں حاکم علی الاطلاق ہے۔ بڑا کوفہ ہے اس کے فاضل ایڈیٹر کہ انھوں نے اس کی رعایات قدیرہ کو قائم رکھا بلکہ مرقع حال اور ضروریات کے مطابق مضامین کا معیار بلند کر دیا۔ پورا پرچہ ہمارے قلم تھا نکالتے ہیں اور ٹھیک وقت پر نکالتے ہیں جو محنت دار اصحاب ہمارے سالوں کے لیے قابل فخر اور قابل تقلید بات ہے۔ (باقی بر صفحہ ۱۳)

دہ طعن و تشنیع اور ذاتی حملوں پر اُترتا تھا بعض مضامین کے پڑھنے سے مثلاً وہ فسانہ آزاد
 حالی۔ داغ۔ گلزارِ رحیم وغیرہ کے متعلق لکھے گئے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ اردو پریس کے صفحات ہندیا
 سنجیدہ ظرافت سے گزر کر پھٹکا کا ایک سچل بن گئے ہیں مگر اقسام ذیل کے مضامین نہایت قابلیت اور
 شستگی کے ساتھ اُس کے صفحات میں درج ہوتے رہتے ہیں انھوں کی معاشرتی زندگی کی جیسی جانتی
 تصویریں محرم۔ چہلم۔ عید بقرعید۔ شبِ بلات۔ ہولی۔ دیوالی۔ ریت۔ عیش باغ کے میلے۔ ناچ رنگ
 جلسے اور دعوتیں مشاعرے۔ اجلاسائے عدالت۔ مرغ و بیکری پائیاں۔ انکشن کے مقابلے وغیرہ۔
 منشی سجاد حسین ایڈیٹر اردو پریس | منشی سجاد حسین مرحوم منشی منصوبہ علی ڈپٹی کلکٹر کے بیٹے تھے جو گورنمنٹ
 سے پنشن لے کر حیدر آباد دکن گئے اور وہاں سول جج ہو گئے تھے منشی سجاد حسین ۱۹۵۷ء میں کاکوری
 میں پیدا ہوئے۔ انھیں اس کا امتحان کیننگ کا لے سے پاس کر کے اور کچھ دنوں مختلف ملازمتیں کر کے

(بقیہ صفحہ ۱۰۲) اس موقع پر ہم ایک بات کہنے کا قائل دوست کے ضرور گزارش کریں گے وہ یہ کہ اپنے بچے سے
 سوا انھیں سب کا ذکر خیر اور ان کی بات چیت کا اطلاع درکارم کریں بلکہ اگر بالکل خارج کردیں تو اور بھی اچھا ہے۔ یہ
 سمجھئے کہ بعض مقالات پر اس کی بھی ضرورت پڑتی ہے اور اس میں بھی مانگ ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ لاہور میں
 سزا محمد علی اپنی لکھنؤ شریف دہلی عبادت گاہ۔ مدام چاندپور شرم کے قاعدے سے چن کر اسمبلی کے اجلاس میں شمولیت گئے
 پنڈت مدن موہن بالوی مان کی اس نئی دھج کو دیکھ کر کہنے لگے کہ آغا مولانا محمد علی ہیں ہم تو سمجھتے تھے کہ یکم صبر پل
 آ رہی ہیں مولانا نے جواب دیا کہ اُس جگہ جہاں عہد میں ہی عورتیں ہیں اگر آپ مجھ کو یکم صاحب سمجھتے تو اس میں حیرت
 کی کیا بات ہے۔ بہر طور یہ اصول کہ عہد پینچ کے بعض ناظرین عورتوں سے کم یا زیادہ مرتبہ نہیں رکھتے انہیں سننے سے
 ہلکا مچھوٹے کے لیے بھی "بونا نصیبین کی ضرورت پڑتی ہے ایک حد تک ضرور سمجھ اور قابل تسلیم ہے۔ مگر جب اس میں جملہ
 جو جاتا ہے اور سیاسی و علمی و معاشرتی جملہ معاملات میں جملہ بے جا بونا نصیبین یا ان کی سبیلی منظر آ کر یکم دیکھنے لگتا ہے
 کی بی نور کی طرح آن کر کو پڑتی ہیں اور دوسرے لکھتے۔ ارعدن سے لے کر شیخ حبیب خیر صاحب تک سیاسی اور علمی
 مسائل میں اپنے خاص انداز میں محکوم ہونے لگتی ہیں سبھی میں نہیں آتا کہ یا اللہ ان باتوں کے واسطے کیا کئی اور دیکھتے
 تھیں جو اتنا کہ نور کی طرف سے اور ان کی زبان میں یہ مطالب اور کہے گئے۔ اور اس سے نفس مسئلہ اور اخبار کے
 طرفانہ انداز میں کیا اضافہ ہوا۔ ہمارے ملک میں تعلیم تو ابھی اس دسے کو نہیں ہو چکی کہ ایسی عورتیں پیدا ہو سکی ہیں
 جو سیاسی اور علمی معاملات میں کوئی صاحب رائے رکھتی یا اس کا اظہار کر سکتی ہیں پھر اس نئی آواز سے اور اخبار پر
 اپنی منثور کا الزام عائد کرنے سے کیا فائدہ؟

معلومہ میں اپنا مشہور اخبار اودھ پنچ نکالا ان کی ذاتی قابلیت طبیعت داری اور وسیع الاطلاق
سے ان کے بہت سے دوست ہم مذاق و ہم مشرب پیدا ہو گئے تھے کچھ عرصہ تک ہندو رتن ناتھ سرشار
بھی ان کے اخبار میں مضمون نگاری کرتے تھے۔ مگر جب کے کہ وہ خود اودھ اخبار کے ایڈیٹر ہوئے اودھ پنچ
کی نامہ نگاری چھوڑ دی جس کا ذکر کسی قدر تفصیل سے آگے آئے گا۔ منشی سجاد حسین پہلے شخص ہیں جنہوں نے
ہندوستان میں ایک نظریانہ رنگ کا اردو اخبار نکالا جس نے کہ ملک اور زبان دونوں کی معقول خدمت
انجام دی۔ منشی صاحب نہایت نیک دل صاف باطن اور غیر متعصب شخص تھے اور کبھی نہ ہی رنگ کے
مغایین کو اپنے اخبار میں جگہ نہیں دیتے تھے ان کی تحریر کا ایک خاص انداز تھا جس میں واقفیت
اور معلومات کے ساتھ مذاق و ظرافت اور لطائف و ظرائف بکثرت ہوتے تھے عبارت میں بیباکی
اور سبکی بہت نمایاں تھی۔ ان کے وہ فرضی خطوط جو ہندوستانی رسا کے نام ہیں ایک عجیب انداز
کے ہیں اور ان میں ایک خاص طریقہ سے فصاحت کی گئی ہے۔ منشی صاحب ایک زبردست ناول نگار
بھی تھے چنانچہ ان کے ناول حاجی بنگلول، طر حدار لونڈی، پیاری دنیا، احمد الدین، میٹھی چھری،
کا یا پلٹ حیات شمع چلی مشہور ہیں اور ان سب کی عبارت نہایت بلیغ اور پُرچرب نظریانہ انداز میں ہے
۱۹۰۷ء میں مرض فالج میں مبتلا ہوئے اور ایک عرصہ دراز تک جسمانی تکالیف اور آلام و مصائب
میں مبتلا رہ کر ۱۹۱۵ء میں انتقال کیا۔ اور اودھ پنچ سابق سلاطین میں ان کی زندگی میں بند ہو گیا تھا۔
مرزا تجو بیگ عاشق | مرزا محمد رفیع، مرزا مجھ بیگ عاشق، مخلص مرزا، اصغر علی بیگ کے بیٹے
شرفا لکھنؤ میں ایک ممتاز درجہ رکھتے تھے بچپن میں وراثت کا برا شوق تھا اور ہانک بناؤ غلطیوں
سے بکھا تھا۔ شاعری کا شوق فطری تھا۔ نیم دہری سے تلذذ تھا۔ بہت خوشگوار اور رنگین طبع شاعر تھے مگر
نظم سے زیادہ شعر میں ان کو شہرت حاصل ہوئی جس میں وہ صفائی زبان، صحت محاورہ اور بندہ سنجی کے
لیے مشہور تھے۔ آخر عمر تک ستم ظریف کے لقب سے اودھ پنچ میں مضمون نگاری کرتے رہے ان کے
مضامین پر حسن کے قابل ہیں اور محاورہ اور صفائی زبان کے لیے اپنی آپ مثال ہیں مطبوعہ تصانیف
نظم و شعر حسب ذیل ہیں۔ گزارِ نبات، میلاد شریف، مظلوم، آفتابِ قیامت، کچھ کے انداز میں ایک نظریانہ نظم

جوان آباد میں پڑھی گئی تھی، بہار ہند (بعد غاوارات کی ناسلامت) مشرقی نیرنگ خیال بعض مضامین
جو اردوہ بن میں نکل چکے تھے اور چشم بصیرت کے نام سے علیحدہ شائع ہوئے ہیں۔ ان کا اردو دیوان
اُن کے صاحبزادہ مرزا محمد صدیق کے پاس ہے جو اُنہ شائع نہیں ہوا۔ قش بالکنہ گستاخ سابق بیٹیر
بھارت برتر کلکتہ اُن کے ایک مشہور شاگرد تھے۔ مرزا صاحب نہایت مشاعرہ بشارت اعلیٰ و متواضع
اور وسیع الاحیاء تھے۔ مزاج میں ظرافت اور بذلہ سخی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی جو عوامی اور آزادی
یہاں تک تھی کہ ملازمت سے ہمیشہ کنارہ کش رہے اس وجہ سے کہ اس میں پابندی عائد ہوتی تھی یہاں
سے بھی شوق تھا چنانچہ ایک مرتبہ انڈین نیشنل کانگریس کے ڈیلی گیت کی حیثیت سے کانگریس میں شریک
ہوئے تھے۔ مختصر یہ کہ صفائی زبان اور بذلہ سخی آپ کے خاص جوہر ہیں۔

زہون ناٹھ آکر | پندت تر بھون ناٹھ پسر و تخلص بہ ترجمہ پندت بشبر ناٹھ پسر کے بیٹے تھے ۱۸۵۵ء میں
پیدا ہوئے کیننگ کالج لکھنؤ میں تعلیم انگریزی سے فراغت کر کے اخبار نویس کا شغل اختیار کیا کچھ
دنوں تک لکھنؤ میں وکالت بھی کی تھی۔ نہایت شریف الطبع ملنا سا اور ہر دعوے پر تھے۔

فارسید محمد آزاد | نواب سید محمد آزاد آلی بایں احمد علی شاہ ۱۸۵۵ء میں بمقام دھاکہ پیدا ہوئے۔ مشرقی بنگال کے
ایک محرز اور دولت مند خاندان سے آپ کا تعلق تھا۔ ابتدائی تعلیم آغا احمد علی اصفہانی سے حاصل کی اور
یہ وہی شخص ہیں جن سے مرزا غالب سے زبان قاطع کے بارہ میں معرکہ لڑے ہیں انگریزی گو کہ پرائیوٹ
طور پر پڑھی مگر اس زبان میں ان کو مہارت کامل حاصل تھی۔ ابتدائے ملازمت سبب راجستھانی سے ہوئی
اور اسی لائحہ میں ترقی کرتے کرتے الپ کٹر جنرل رجسٹری کے محرز عہدہ تک پہنچے۔ بنگال کونسل میں
دو دفعہ کرسی نمبر کی کورینٹ بخشی اور امپیریل سروس آرڈر (آئی۔ ایس۔ او) کا نشان اعزازی آپ کو
عطا ہوا۔ ۱۹۱۵ء میں سرکاری ملازمت سے کنارہ کش ہوئے۔ پہلے آپ ایک فارسی اہل ذہن میں
زبان فارسی مضامین لکھتے تھے مگر اُس کے بعد اردو اخبارات اور دورِ پرخ، اگر اخبار وغیرہ مختلف اخبارات
اور رسائل میں زبان اردو میں لکھتے رہے۔ شائع میں ان کا ناول "نوابی دربار" نکلا جس میں کہ مذاق
کے سیراب میں پڑنے رنگ کے فاقہ مست زبوں کا خوب خاکہ اُٹایا گیا تھا اور بہت مقبول عام

ہوا۔ آپ انگلستان بھی گئے تھے اور وہاں سے جو خط لکھیں ہیں وہ نہایت دلچسپ ہیں آپ کی کتاب
مردم پر نئی لغت 'ظرفانہ سنگ کی مقفی نہایت دلچسپ کتاب ہے۔

مولانا ابوالحسن علی عثمانی علامہ لاہور متخلص یہ بہت ہی ایک نہایت ذہین اور قابل شاعر و شارح و نوں تھے
۱۸۷۷ء میں بمقام سیتا پور پیدا ہوئے۔ انٹرنس کا امتحان کھیری سے پاس کر کے ۱۸۸۰ء میں کیننگ
کالج لکھنؤ میں داخل ہوئے۔ ۱۸۸۷ء میں بی اے اور ۱۸۹۰ء میں قانون کی ڈگری حاصل کی ۱۸۹۷ء
تک کالج کے نصف ہو گئے جس میں ترقی کر کے سر تقاوم مقام ڈسٹرکٹ و سشن جج کے طبقے
تک پہنچے۔ ۱۹۰۹ء میں گورنمنٹ کالجی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۱۷ء میں بھارتیہ ہلیک اس دار فانی سے کوچ
کیا۔ نہایت طبیعت دار و مدد دین شخص تھے فسانہ آنا کی عبارت کے اس قدر دلدادہ تھے کہ خود بھی
وہی طرز ایک حد تک اختیار کیا آپ کی مثنوی بہار ایک نہایت اعلیٰ درجے کی تصنیف ہے جو سر سید
مردم کو بہت پسند تھی برتن علامہ شاعر و شکر ہونے کے مترجم بھی اعلیٰ درجے کے تھے انکم چند چتر جی کے
اکثر مشہور ناولوں کے ترجمے آپ کے قلم سے نکلے ہیں مثلاً بنگالی دوطن، پرتاب، بدھنی، ہرنانی، ناتھین
وغیرہ آپ کا ترجمہ اس قدر صاف سلیس با محاورہ اور شیریں ہوتا ہے کہ مطلق ترجمہ نہیں معلوم ہوتا
کتب مذکورہ بالا بہترین اردو ناول خیال کیے جاتے ہیں ان کے علامہ شیکسپیر کے بعض ڈراماؤں
کا بھی ترجمہ آپ نے کیا تھا مگر انھوں نے ان میں سے اکثر شائع نہ ہو سکے۔

احمد علی شوق عثمانی احمد علی شوق قدوائی امیر مردم کے سوز و گم و دل میں تھے۔ غزل اور مثنوی طرز
کے تھے۔ چند نامک نثر نظم بھی آپ کی یادگاریں جمیں قاسم و زہرا اور سیکر من وادی زیادہ مشہور
ہیں مثنیاں آپ کی بہت اعلیٰ درجے کی ہوتی ہیں اعلیٰ انھوں عالم خیال جس کی زبان نہایت
لطیف و شیریں ہے۔ یہ مقبول مثنوی یہ کتاب ایک تم ریدہ عورت کی دکھ بھری داستان ہے جو اپنے
بکھرے ہوئے شوہر کی واپسی کا انتظار بڑے شوق و ذوق سے کر رہی ہے۔ اس کی عبارت فارسی
اضافوں سے خالی ہے ویران بھی آپ کا شائع ہو گیا ہے اور نہایت اعلیٰ درجے کا ہے۔ آپ فن جوش
اور نکات ادبیہ سے پوری طرح واقف تھے اور نثر کے مضامین بھی صفائی اور صحت زبان کا بہت خیال

رکھتے تھے آخر عمر میں ریاست رام پور سے تعلق ہو گیا تھا۔ آپ کی وفات حسرت آباد کے متعلق ہوئی۔
 کی صف میں ایک جگہ خالی ہو گئی جس کی خانہ رُئی منسلک ہے
 ہندو زمانہ سرشماری پندت رتن ناتھ و متخلص بہ سرشار گزشتہ صدی کے آخر میں ایک عجیب و غریب
 بالکل ال شخص گزرتے ہیں ایک معزز کشمیری خاندان سے تھے ۱۷۷۷ء یا ۱۷۸۲ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے
 صوبہ چاند برس کے تھے کیا کیا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ اُن کے چھوٹے بھائی پندت بشمیر ناتھ درہنہ کی کلکتر
 تھے جن کے بیٹے ریاست بلرام پور میں ملازم ہیں۔ سرشار کے صاحبزادے پندت رنجن ناتھ درہنہ کی
 خزانے میں ملازم تھے مگر جوانی میں انتقال کر گئے سرشار عربی فارسی انگریزی تینوں زبانوں سے
 واقف تھے انگریزی انھوں نے کیننگ کا لکچر میں پڑھی تھی مگر اس میں کوئی ڈگری انھیں حاصل کی جس
 پہلے ضلع امکول کھیری میں ٹیچر ہوئے اور یہیں سے وہ "مراسد کشمیری" میں جو اس زمانہ میں کشمیری پڑھنے
 کا ایک ہمارا رسالہ نکلا کرتا تھا اذادہ پہنچا "میں اپنے مضامین بھیجا کرتے تھے یہاں تک کہ کوئی شخصیت
 نہیں رکھتے تھے مگر پھر بھی اُن کی آئندہ تصانیف اور شہرت کا ایک سنگ بنیاد ضرور تھے سرشار ترجمہ
 بھی بڑی جہارت رکھتے تھے اذادہ اپنا اس قسم کا کام سرشتہ تعلیم کے کسی رسالہ میں بھیجا کرتے جہاں وہ
 بڑی اندر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا ڈاکٹر سرشتہ تعلیم اس کو بہت پسند کرتے اور اُن کی قابلیت کی مدح
 دیتے تھے مشارک بھی کہیں "مرآۃ السند" اور ریاض الماخبات میں بھی اپنے مضامین بھیجتے۔ ۱۸۵۷ء میں انھوں نے
 ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ کیا اور اس کا نام "شمس الضحیٰ" رکھا۔ اس میں انھوں نے اکثر اس کی اصطلاحات
 کا ترجمہ اور سلیس اردو میں کیا ہے۔ اسی رسالہ وہ اذادہ اخبار کے ایڈیٹر مقرر ہوئے اور یہ اس
 طور پر ہوا کہ ڈاکٹر گرفتہ ڈاکٹر سرشتہ تعلیم نے ان کا تعارف منشی نوکھو صاحب بالک اخبار سے
 کر لیا جن کو اس وقت اخبار کے لیے ایک قابل آدمی کی ضرورت تھی سرشار نے اپنی مشہور و معروف
 تصنیف "فانۃ اذادہ" کا سلسلہ اسی اذادہ اخبار میں شروع کر دیا جو دیرپہ سرشتہ تک قائم رہا اور سرشتہ
 میں "فانۃ اذادہ" بصورت ایک علیحدہ کتاب کے چھپا اور بہت مقبول ہوا اس عرصہ میں اذادہ پنج اذادہ
 اخبار میں وہ مشہور ہو کر شروع ہوا اور عرصہ دراز تک قائم رہا۔ اذادہ اخبار اس اذادہ

اس کے ایڈیٹر کو اپنے ظلیفانہ انداز میں سیکڑوں مسلوں میں مناتا تھا اور اس کا جواب بھی ٹکریہ کھاتا تھا
 آخر بعض دوستوں کی کوشش سے مصداقیت ہو گئی اور معاملہ سدقہ ہو گیا سرشار دود اور مباحثوں میں
 بھی شریک ہوا۔ یہ ایک بیان یزدانی میرٹھی لائبریری میں ملتا ہے اور دوسرا خواجہ الطاف حسین حالی کے ساتھ
 سرشار کا تصانیف سیرکساز جام سرشار کا سنی اور خدائی فوجدار بہت مشہور ہیں آخر لکڑی کا ایک
 انگریزی ناول ندان کوئی ازد کا ترجمہ ہے ۱۸۹۷ء میں انھوں نے ایک سنڈے مورننگ یہ خاکہ سرشار شروع
 کیا تھا اور اسی زمانے میں ان کے ناول کرم دھم بھڑی دھولن طوفان سے تیزی اپنی کہاں اور
 ہشتو بھی شائع ہوئے مگر ان میں ان کا نو بر بیان کم ہے حیدر آباد جلسے سے قبل کچھ مہینے وہ الہ آباد
 ہائیکورٹ میں مترجم بھی ہو گئے تھے مگر قواعد دفتر کی سختی کے وہ محفل نہ ہو سکے اور تھوڑے ہی دنوں میں لاٹس
 ترک کر دی ۱۸۹۵ء میں وہ حیدر آباد گئے اپنے قیام حیدر آباد کا حال لیک خط میں جو کشمیری
 درپن ما۔ ۱۸۹۶ء میں شائع ہوا تھا اور جس کا ایک حصہ پینت برس نرائن چکیت صاحب
 نے اسی سے نقل کیا ہے اس طرح بیان کرتے ہیں:-

تقریباً چار برس ہوئے کہ میں بمبر کانگریس کی حیثیت سے مدد اسٹیٹ یا تھا میری خوش نصیبی مجھ کو
 حیدر آباد لائی جہاں ہندو مسلمان امیر غریب سب نے نہایت گرمیوشی سے کھ کھایا اور میرے اوپر بڑی
 عنایتیں کیں۔ ہمارا یہ سرکشن پر شاد نے اپنے کلام نظم و نثر کی اصلاح کے لیے دو سو روپیہ ماہوار مقرر کر دیا
 ہے اس کے علاوہ خلعت خوشنودی اور نفی شعر جو پند خاطر ہو جاتا ہے ایک شرفی عنایت فرماتے ہیں
 حضور نظام مجھ سے پہلے ہی سے واقف تھے چلند ان سب میں حاضر خدمت ہوا تو نذر گزرائی اور
 اپنی کچھ کتابیں بھی پیش کش کیں اعلیٰ حضرت نے ذرہ نوازی کی کہ ایک ٹکڑا دیوار کے بیان کا میرے سیرکساز
 سے اور ایک مقام تمام سرشار سے سماعت فرمایا۔ میں نے ایک تاریخ شاہزادے کی ولادت کی

کہ ہم کو بلو پڑتا ہے کہ یہ بڑے شرفار سے نہیں بلکہ اودھ پنچ ہوئے کہیر لکڑا دھ پنچ میں ایک سلسلہ اعتراضات
 حالی پر ایک عرصہ دراز تک اس سرخی سے چھپتا رہا ہے اب ہمارے حلوں سے حالی کا حال ہے بد میدان وانی پت کی طرح
 پائمال ہے۔ اور آخر میں کچھ مفاد میں حالی کی تقریریں بھی اس سرخی سے نکلتے ہیں عجب حالی کے بہت قہقہے نکلتے
 ہے پنچ + اشک شنی کرد دو چار ہنر بھی کہ دو

میاں کیاد میں بندگان عالی کی خدمت میں پیش کی جس کو اس شخص نے ہمیشہ سے فرمایا۔ میرا نام سحر
دہا بدلا کی عزت میں شامل ہو گیا ہے اور کوشش کی جا رہی ہے کہ منصب بھی ملے۔ اگر خدا نے
چاہا تو میرا جہد ناول گدغریاں ایک ہفتے کے عرصے میں شامل ہو جائے گا
کچھ عرصہ تک سرشار ویدہ آصفیہ کی ادارت کرتے رہے۔ اُن کا ناول قبل اسی اخبار میں نکلتا
تھا، مگر وہ انہیں برا گورغریاں جس کا ذکر ان کے خط میں شائع نہ ہو سکا اور پہل کر لی، بادقت
تصنیف نہیں ہے۔ آخر عرصے میں سرشار نے دوستی کی بڑی کثرت کر لی تھی اور یہی اُن کی بلال وقت
موت کا باعث ہوئی چنانچہ ان کا انتقال حیدرآباد ہی میں مسئلہ میں ہوا۔

سرشار نہایت خوشگو شاعر تھے اسیر کا گردے تھے اور خوب لکھتے تھے۔ مسئلہ میں انہوں نے
اپنا ایک قصیدہ کشمیری کاغذس میں لکھا تھا اور ایک تنوی تھہ سرشار بھی لکھی ہے جو اُس موقع پر
لکھی گئی تھی جبکہ پنڈت بشن داس کی دایسی انگلستان پر پراسا خیالی کے کثیر پینڈتوں میں ایک
قسم کی برہمی پیدا ہو گئی تھی۔ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی اور اس کی کچھ باتوں سے لوگوں کی برہمی
سفر ولایت کی نسبت ایک حد تک فروغ ہو گئی۔

عام عادات و اخلاق | سرشار حقیقی معنی میں آزاد مزاج تھے۔ قوتِ حافظہ بہت قوی پانی تھی اور منصب
اور مذہبیت سے بالکل بری تھے۔ باتیں بہت چھپ اور مزے کی کیا کرتے تھے اور طبیباً ظریف
واقع ہوئے تھے۔ شراب خواہی نے اُن کے ساتھ بھی اور ہی کیا جو درگاہاے سرور کے ساتھ کیا تھا
یعنی ایک ہونہار زندگی کا جلد خاتمہ کر دیا اور وہ ناول کو انگریزی طرز پر لکھنے کا خواہش کو حاصل ہوا اور
اسی کے ساتھ وہ ایک زیر دست جرنلسٹ ایک مشہور مصنف۔ اُن کے ذہن و دست نہایت ظریف
اور بندہ سنج اور ایک طرز خاص کے موجد بھی تھے۔ مگر انہوں نے کتنا پڑنا ہے کہ اُن کی شہرت کو کچھ تو لوگوں
کے تعصب نے اور کچھ اُن کی ذاتی بے پروائی اور لالچالی بننے کی بنا پر کیا۔ اُن کی سنانہ آزادانہ دیگر
قصائیف میں اکثر جگہ جو طبیب یا بس اور درجہ سے گری ہوئی باتیں پانی جلتی ہیں اُس کی وجہ زیادہ
ان کے مزاج کی جلدبانی اور بے پروائی گئی جاسکتی ہے۔ اُن کی شراب نوشی کبھی اُن کے تخیل میں

برنگا دیتی اور کبھی اُس کے خمار سے ان کا دماغ سطل اور بیکار ہو جاتا تھا۔ انھیں دھومے نہ کبھی اپنے
 سودہ پر نظر ثانی کرتے اور نہ کبھی پردہ پڑھنے کے عادی تھے۔ ہمیشہ برجستہ اور قلم برداشتہ لکھے
 اور اگر کسی وقت پر قلم نہ تھا تو تنکے سے کام نکال لیتے تھے۔ اسی بے پروائی اور بے اصولی سے اُن کے
 قائم کیے ہوئے پلاٹ اُن کے دکھائے ہوئے کیرکٹر اُن کے بیان کیے ہوئے واقعات میں اکثر جگہ جگہ
 بے ربطی اور عدم تسلسل پایا جاتا ہے۔ جب کبھی اُن سے کوئی مضمون لکھوانا ہوتا تو مالک مطبع شریف
 کی ایک برتن پیش کرتے اور وہ اس مضمون کو فوراً لکھ ڈالتے۔ مگر اس طبعی کمزوری کے ساتھ ان میں
 خود داری اور آزار دہی بھی اتنی تھی کہ کبھی کسی ایسے دور میں کی خوشامد نہیں کی، اور اپنی شہرت
 کے واسطے کسی دوسرے کے شرمندہ احسان نہیں ہوئے خود ان کی قابلیت اور طبعی اہلیت و اہلیات
 اُن کی شہرت کا حقیقی باعث تھی۔ آخر عمر میں البتہ وہ زمانے کے ہاتھ سے تنگ گرد حیدر آباد گئے
 تاکہ دولت اصفیہ کے زیر سایہ کچھ دنوں بغراغت زعمی بسر کرسں۔ مگر بد نصیبی نے پُرانی علالت کی طرح
 وہاں بھی اُن کا ساتھ نہ چھوڑا۔ اور آخر کار وہیں ہی خفاک و غائب کے اس قطعہ کے مصداق ہوئے۔

رہے ایسی جگہ جل کر جہاں کوئی نہ ہو
 ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہر باں کوئی نہ ہو
 پڑے گریہ تو کوئی نہ ہو تیار دار
 اور اگر چاہے تو زخموں کوئی نہ ہو

تصانیف اُن کے حسب ذیل تصانیف بہت مشہور ہیں۔ وہ فسانہ آزاد سیر کوہسار، جام سرشار،
 کامنی، خدائی، فوجدار، گرم دم، بکری، دھن، ہشو طوفان، بے تیزی، رنگے، سیاہی، کہاں،
 شمس الضحیٰ، دالیش کی کتاب، ریشا، کاتوجہ، اردو میں لارڈ ڈفرن کی کتاب لیٹر تو رام ہائی، الیش
 ٹڈس، کاتوجہ اردو میں۔

فائدہ آنا داجیہ کہ ادب پر بیان ہو فاسلہ آزاد شروع میں دو اخبار کے کالموں میں نکلتا تھا۔ اسکی
 سلف سرفراز کنزری دالیش، فاسلہ اور مار کوئس آف اینڈ فن کے پرائیوٹ لکچری نہایت قابل اوصاف
 تصنیف اور بے بیجا تھے۔ اسکی پٹیا بٹیا کی دسویں ایڈیشن کے ڈاکٹر رہ چکے ہیں۔

اشاعت نے دنیا سے اردو میں ایک عجیب بلبل ڈال دی جب یہ اخبار میں نکلتا تھا تو لوگوں کو
اس اشتیاق ہوتا تھا کہ دوسرے پرچہ کے لیے حجاب رہتے تھے۔ پندرہ لکھ نرائن در آنکھ لانی
اس کتاب کی نسبت یوں رقم طراز ہیں:-

قصہ کا پلاٹ تو بہت سادہ بلکہ حد درجہ بے مزہ ہے مگر ڈھائی ہزار کھان صنعتی پڑھتے چلے جاتے
ذرا بجزہ نہیں بریجے گا بلکہ سطر سطر اشتیاق بڑھتا جائے گا محض اس وجہ سے کہ عبارت آسانی
غضب کی ہے۔ طرز ادا نہایت بے تکلف اور آسان تازہ اندیز چل تھیل اور واضح پھر اس کتاب
جا بجا پر لطف ظرافت پھرتے ہوئے فقرے۔ مزید شوخیوں۔ ترکیب۔ ترکی جواب۔ حماقت۔ اسیر
مضحک باتیں جن کو پڑھ کر ہنسنے ہنسنے پیٹ میں بل پڑ جائیں گے۔ آندھ اعلیٰ قمر کا بیرونی کتہ
نوجوان دنیا دار شخص بہت حسین اور طرز ادا تعلیم یافتہ کئی زبانوں سے واقف۔ سپاہی پیشہ ظریف
شاعر عاشق مزاج۔ لکھنے والے باتیں کرنے والا۔ اور ہر اچھی صورت پر مرنے والا۔ ایک طوطا علی
سراسی کی زیر پر زینت۔ دوسری طرف ایک بھٹیاری کا عاشق جاں باختہ میگات کی بھی لچائی
ہوئی نظروں سے گھورنے والا۔ اتفاقاً یہ میاں آرزو ایک حسین و دلکش عورت آدھام پر مگر ہوشیاری
اس سے عشق باریاں کرتے ہیں۔ آخر وہ ان کے ساتھ اس شرط پر عقد کرنے کیلئے راضی ہوتی ہو کہ
پچھلے وہ شکی جائیں مگر اسلام میں نام گھائیں۔ روسیوں سے جو آزمانی کریں آندھ اپنی مشق
کے حکام کی بجا آوری خوش خوش کرتے ہیں۔ اور قبول شمع بند ما خوب اسکا تانے بل اکتے
کو دوں پھانکتے ٹکی جاتے ہیں روسیوں سے لڑتے ہیں اور مظفر منصور واپس آتے ہیں۔ اپنی
جان بازیوں کے بدلے اپنی مشق سے ایفائے وعدہ چاہتے ہیں اور اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے
ہیں۔ یہ ہے اصل قصہ اور جہاں تک قصہ کے پلاٹ کا تعلق ہے۔ اس سے بدرجہا بجزہ و تشبیہ
بی کرنی قصہ انسانی دماغ سے نکلا ہو گا۔ مگر اسی قصہ کو رنگ و روغن نہانے کی نہانے سے نیچے تو سلیم پڑا
کہ ہم ایک نگار خانہ چین میں چلے جا رہے ہیں مکی دلکش جیتی جاگتی تصویریں ان کا کلا جلا جلا
کی کثرت مناظر کی چوچالی دایسی ہے کہ جیسا کہ آئینہ خانے سے گزرتے ہیں تو کچھ عین کچھ شک

کرتے ہوئے ایک فلم کہ ہماری نظروں کے سامنے آجاتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی ذریعہ
بازگرنے اپنے کسی ڈنڈے سے یہ سارا سماں ہمارے سامنے کھینچ کر لے لے۔

مندرجہ بالا لایہ لفظاً لفظاً صریح ہے۔ فسانہ آزاد کو پلاٹ کے تناسب کی کٹر نگاری کے اسلوب
اور قصہ کی تعبیری ارتقی اور دلچسپی کے لحاظ سے بڑھا چاہیے اصل قصہ کو ایک کھوتی سمجھنا چاہیے
جس پر ہزاروں واقعات ٹپکتے ہوئے ہیں۔ انہیں علیحدہ علیحدہ واقعات کے پٹھن میں لطف
آتا ہو۔ وہ ان کا مذاق و ظرافت وہ دلچسپی کی کڑوہ و تریاں اور حاضر جوابیوں ہی سہ یاں کتاب
کی جان ہیں فسانہ آزاد میں مثل ڈوٹا کے ناولوں کے ساری عمدگی اور دلچسپی اشخاص قصہ کی باتوں
میں ہے نہ کہ نفس قصہ کے بیان میں سرشار کمال کے استاد ہیں اور کٹر نگاری کی خوبیاں طول طویل
بیان سے نہیں بلکہ خود ان اشخاص کی گفتگو سے نہایت کامیابی سے دکھلاتے ہیں۔

سرشار کی مرتع نگاری | سرشار میں ملا جب ملی ریگ سرد کے پڑ نکلت اور مقفی اعمار ت نہیں پسند
کرتے نہ بلایوں کو چھپاتے اور اچھا نہیں کو چھکاتے ہیں بلکہ ہو ہو تصور یہیں کھینچتے ہیں اعلیٰ اشخاص
اشخاص کھنڈ اعلیٰ و اعلیٰ امیر و غریب سب کے بڑے مثل مرتع اپنے اس لاجواب کتاب میں کھینچ دیے
ہیں۔ ان کے اشخاص قصہ سایہ کی طرح ہمالی آنکھوں کے ملتے نہیں گزرتے بلکہ وہ ہمارے
آپ کی طرح گشت و دوست کہتے ہوئے چلتے پھرتے جیتے جاگتے معلوم ہوتے ہیں نہ پندت شین نمایاں
ہیں کی نسبت لکھتے ہیں۔

”اگر تمہان کے بھوں کے اندر جلد غل غپائے دل طوفان بے تیزی کے کھنڈے تو تم کو بڑی احتیاط
سے جانا ہو گا کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگوں کی دھکا دھکی سے تم خود نہ گربڑو اور اس کی احتیاط کرنا ہوگی کہ
تمہاری گھڑی یا کئی اور چیز جو تمہاری حیب میں ہے کہیں نکل نہ جائے یہی حال ان کے محترم، محترم اور
عیش بلوغ کے میلوں کا ہے کہ تم وہاں اپنے تئیں ایک عجیب بھڑ میں پاتے ہو جس میں بیڑ باز پتنگ باز

اس نام کے ناولسٹ بابا دیپتیغرافس میں گزشتہ صدی میں بہت مشہور سردن گزشتہ صدی میں ان کے
اکثر ناول نہایت دلچسپ ہیں۔“

انہی۔ زرق برق نواب مع اپنے ڈیو خیمے زرد و مصاحموں کے۔ رتھیاں گاڑیوں میں سوار کسی بدرے
فیل سوار تاشین سے آنکھیں لٹا رہی ہیں۔ فقیر گاڑیوں کے پیچھے دوڑتے دعائیں دیتے جا رہے ہیں اور
اگر کچھ نہیں مٹا ہو تو چپکے چپکے میکرٹوں صلوامیں سناتے ہیں۔ فاقہ مست عاشق۔ رنیکے بیکار عورتیں بھرت
بد صورت۔ کوئی اپنے کھوئے ہوئے بچے کو آواز دے رہی ہو۔ کوئی اپنے یار سے لڑ رہی ہے۔ کوئی کسی
نواب کے صاحب خاص سے ناروا انداز کی باتیں کر رہی ہو۔ پولیس کانسٹبل۔ چور۔ اچکے چنگی کے محرر
ریوے بالو۔ ٹھاکر صاحب کسی قریب کے گاؤں سے میلادیکھنے آئے ہیں لالہ بھائی کسی تنبولی یا تنبول
سے فارسی لغت چھانٹ رہے ہیں۔ انگریز ناگر بچوٹ سگرٹ منہ میں دیا ہوا۔ نیوفیشن کے مسلمان بڑ کی
ٹوپی ڈاٹے بنگالی بابو میں نرم دھوتیاں ہو ایس اڑاتے ہوئے۔ یہ ہو وہ مجمع جس کی سرشارم کو سیر کر
ہیں جس میں ہزاروں مختلف آوازیں تھامے کانوں میں آ رہی ہیں اور چاروں طرف زندہ چلتے پھرتے باتیں
کرتے غل چاتے انسانوں کا ایک سمندر موجزن ہوا دیکھ ان سب پر طرہ یہ کہ اس عظیم الشان مجمع میں ہر
آدمی کو اس کی بات چیت اور اس کے حرکات و سکنات سے تم بخوبی پہچان سکتے ہو۔

فسانہ آزاد بلکہ سرشار کی اکثر ناولوں کی خاص خصوصیات یہ دو چیزیں ہیں۔ یعنی (۱) لکھنؤ کی اس
زمانے کی سوسائٹی کی ہو ہو تصویریں کھینچنا اور دوم شوخی و ظرافت۔ ہمارے نزدیک کسی شاعر یا اثر نے
اس سے قبل لکھنؤ کے آخری دور تمدن اور سوسائٹی کی صحیح تصویریں اس قدر جزئیات کے ساتھ کھینچ نہ کیں
ہوں گی۔ سرشار پرانے رنگ کے نوابوں ان کے افعال و اشغال ان کے مصاحبوں اور ہم جلسوں کے سچے
نقشے کھینچنے میں کمال رکھتے ہیں اور باوصف اس کے کہ وہ ہندو تھے مگر سخت حیرت ہو کہ مسلمانوں کے گھر
گھرانوں کے اندر ذہنی حالات اور سکنات کی طرز معاشرت اور بول چال سے وہ اس طرح واقف ہیں کہ

لے یہ کوئی حیرت کا مقام نہیں۔ یہ اس زمانے کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول اور ملی اتحاد کا بین ثبوت ہو
دوسری مثال اس کی نظیر اکبر آبادی کی ہے جنہوں نے ہندوؤں کے تہوار میلے ٹھیلے یہاں تک کہ ان کے مذہبی
معتقدات تک کو کس قدر وقیف و تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اب جبکہ دونوں قوموں کے درمیان نفاسیت
اور تعصب کی ایک آمی دیوار قائم ہے تو یہی باتیں تعجب اور حیرت کی معلوم ہوتی ہیں۔

کوئی مسلمان بھی ان سے بہتر نہیں جان سکتا۔ انھوں نے ہماری آنکھوں کے سامنے سے پردہ اٹھا دیا ہے اور ہم ہندو اور مسلمان حرم سراؤں کے اندرونی حالات نہایت صفائی سے بالکل بے پردہ دیکھتے ہیں۔ ان کو مختلف پیشہوروں کی خاص خاص اصطلاحیں مختلف جماعتوں کی خاص خاص بولیاں اور ان کا طرزِ ادا، دیہاتی بولی، بیگات اور ان کی مغلائیوں اور پیشہ خدمتوں کی بات چیت، بھٹیاریے اور بھٹیاری۔ انہی۔ خٹہ۔ باز۔ شرابی۔ چوراہوں کی زبان۔ دیہاتی گو کہ ٹھاکروں اور پرٹھے لکھے لالہ بھائیوں کا طرزِ تکلم۔ ان سب پر ان کو کامل عبور حاصل ہے۔

شرشار کی شوخی اور ظرافت ان کا مذاق کامل، مہذب اور آزادانہ ہے۔ البتہ اس میں غالب کی سی لطافت اور نیکی نہیں ہوتی اور الفاظ کی رُو میں اور محاکات کے شوق میں کبھی وہ اس قدر بڑھ جاتے ہیں اور ان کا سہ طبع اس قدر بے قابو ہو جاتا ہو کہ وہ غش سے بھی پرہیز نہیں کرتے۔ مگر باوجود اس کے اس خاص چیز یعنی شوخی اور ظرافت میں کوئی ان کے قریب تک نہیں پہنچتا۔ مکالمات لکھنے میں وہ کمال رکھتے ہیں علی الخصوص ادنیٰ طبقے کی بول چال ان کے ہلکے بندھے فقرے ان کے ضلع جگت کو وہ من و عناد کر دیتے ہیں اس رنگ زمانہ کو بے نقاب کرنے کی نسبت پنڈت لشن نرائن دراپنے اسی مضمون میں جس سے بعض مقامات اور نقل کیے گئے اس طرح رقم طراز ہیں!۔

”بے ادبی دگستاخی“ پرانے رسوم و خیالات کا استیصال، دنیاوی لذتوں سے تمتع، موجودہ چیزوں کی ناپسندیدگی یہی سب خیالات ان کے زمانہ میں لوگوں کے دلوں کو مسخر کیے ہوئے تھے اور وہ خود بھی یہی خیالات رکھتے تھے۔ بس کوئی شخص ان کی سچائی اور راست بیانی پر اعتراض نہیں کر سکتا جبکہ وہ اپنے کلام کو اس رنگ میں ڈالتے ہیں اور اس کو طرح طرح کی خوبیوں سے آراستہ بھی کرتے جاتے ہیں مگر اسی ساتھ وہ اس آزادانہ تحریک کے بڑے حامی ہیں کہ جو پرانے خیالات اور قدیم رسم و رواج کو توڑنا چاہتی تھی۔ ہر سوسائٹی کے منازل ارتقا میں ایک ایسا درجہ ضرور آتا ہو کہ جب عیوب و غلطیوں کی اصلاح کے واسطے ظرافت اور استہزاء مثل و غلط نصیحت کے مفید ہوتا ہو بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ۔ اور جب بیکاری کی برائی دکھانے کا یہی بہترین طریقہ ہو کہ وہ عریاں کر کے دکھائی جائے۔ بہت سی غلطیاں جو وعظ

نصیحت اصلاح نہیں پاسکتیں اکثر دیکھا گیا ہے کہ وہ ایک اقیہ جملہ سے بالکل مل جاتی ہیں اور ایک طرز آئینہ تفرقہ کی گولی عیوب کی تیز پرواز چڑیا کو فوراً گرا دیتی ہو۔ رتن ناتھ سے جب کسی خلاق آموز دعا یا مولوی سے کسی پڑنے نیال کے چھوٹ بھاتے ماننے والے سے کسی دولت مند پرکھنے والے یا کسی نسب پر فخر کرنے والے سے ملد بھٹھرتی ہو۔ اور وہ ان کی پسند نصیحت کو ان کی ڈینگوں اور شہنی کی تو کو سنتے ہیں تو وہ ان سے محبت و مباحثہ نہیں کرتے نہ کبھی ان سے لڑنا بھگڑنا چاہتے ہیں بلکہ صرف ان کا مذاق اڑانے لگتے ہیں۔ اور گو کہ متانت پسند لوگ ان کی اس ادا کو ناپسند کریں مگر باقی اور لوگ جو اس تماشے کو دیکھتے اور ان کی باتوں کو سنتے ہیں سنہی کے مارے لوٹ جاتے ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسخرہ نے اپنی باتوں سے ان کے دلوں کو موہ لیا اور اس کے بعد سے وہ لوگ جو مسخرہ کے ساتھ ہنس چکے تھے کسی دعا عظمیٰ کی تعلیم و تلقین پر نہیں روتے۔ پس رتن ناتھ کی نصیحت کا یہی طریقہ ہے۔ دو مسخرہ کرتے ہیں سنتے ہیں اور فتح پاتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہم ان کو سوسائٹی کی برائیوں کا ایک بہت بڑا مصلح سمجھتے ہیں مگر وہ کسی خاص اصلاحی تحریک سے تعلق نہیں رکھتے انھوں نے کسی پیغمبر یا مصلح قوم کی طبیعت نہیں پائی تھی وہ دل سے مسخرے اور سنہی میں اڑا دینے والے تھے؟

سرشار کی کیر کڑنگاری | سرشار کیر کڑنگاری کے استاد ہیں مگر وہ ہو ہو لقمے نہیں کھینچتے بلکہ اصلیت کے ساتھ مبالغے سے کبھی کام لیتے ہیں اسی وجہ سے ان کے کیر کڑوں میں ڈگنس اور تھیکے لے دلوں کا مجموعی رنگ پایا جاتا ہے۔ وہ اپنے تمام کیر کڑوں میں جو خاص اور تمیز باتیں ہوتی ہیں ان کو چن لیتے ہیں اور انھیں میں وہ وہ شگوفے پیدا کرتے ہیں جن کو پڑھ کر آدمی ہنستے ہنستے لوٹ جاتا ہو ان کے کیر کڑوں کو اس نظر سے نہ دیکھو کہ وہ بالکل خیر کے مطالبی نہیں بس ان کو پڑھو اور سنو اور یہی کافی ہے۔

خوجی | خواجہ بدیع الزماں معروف بہ خواجہ بدیع اعظم خوجی۔ وہ پرانا بیوقوف مسخرہ آزاد کا مہر

لہ اٹھتان کے گزشتہ صدی کے در مشہور زاولست گزرے ہیں

۳۰ دنیا کے افسانہ کے اس عجیب غریب کیر کڑ کا سرشار نے جو خاک اپنے خاص رنگ میں کھینچا ہو حسن نہیں ہو۔ یہ کیرکڑوں کے قلب گاہ پیروں کے پشت پناہ گاؤں کی جان بلکہ روح نساں۔ دیوانہ حاکم کے لپٹی بان اچھے پہلو ان میاں (باقی صفحہ ۱۱۶)

یار غار، کمزور اہل کو جانے والا، زنگیلا، عیاش، زہریلا، برعاش، جسمانی اور دماغی کمزوریوں کا پوٹ، بونا
جو اپنے تئیں ہرگز بونا نہیں سمجھتا بلکہ بونا کہنے سے سخت برا مانتا، اپنے گوشہ کا زناموں پر جو سراسر لغو اور
جھوٹ ہیں، تنگیں مانے والا جہاں جائے تنگی اس پر آواز سے کہیں اور پھٹیاں اڑائیں، ہمیشہ اس

(بقیہ صفحہ ۱۱۵) خواجہ بدیع الزماں صاحب بدیع (آنجان) غرقِ بوندانی نہایت حیرانی اور غایت پریشانی میں تھا
دل میں.... ٹھٹھا سا سنسن پھرتے شہ گام جانے لگے اور چونکہ ماشاء اللہ ڈنڈیل جوان دکان میں پہلوان تھے یہ کیفیت
کہ دس قدم چلے اور تورا نے لگے۔ اللہ ری طاقت، اول تو بے قیامت، ماشاء اللہ کا قدم دوسرے قطع طریقہ از بس سوز
اور طے کی طرح کوئی گل درست نہیں اس پر طرہ یہ کہ مدت کے بعد ایک بی بی قرونی جو کسی استاد بخار نے پیر مرد کو بطریق مذ
دی تھی ذریعہ دست تھی مثل مشہور ہو، اُدھے کے گھر تیر۔ باہر سے نہ بھرتا، کبھی دایں ہاتھ میں لی بازو، الوں کی طرف
دیکھ کر چپکائی گھسی بائیں تھیں لی اور اکلے چلنے لگے۔ اب میں پر قدم ہی نہیں رکھتے۔ داغ فلک لاغلاک پر ہو۔ اللہ ری
نخوت اور گویوں نہ ہونے والے جن یا تو گوسوز، نور تھا کیا تو عالم افزو۔ ایک تو گراں ٹیل جو ان دسے فن سے گری میں ق
کشتی کے پہلوان، بابک، بٹے، بانے، بنوٹ میں شاق۔ اور خانہ جنگی میں شہرہ آفاق اور سب صفوں سے بڑھ کر یہ صفت
جناب باری نے عطا کی تھی کہ میدان جنگ میں بھاگوں کے مقدمہ ہمیشہ۔ یہ سالاد نامہ ادا بنتے تھے۔ کوئی اور بھاگے
یا نہ بھاگے یہ سب کے پہلے میدان چھوڑنے کی فکر کرتے تھے۔ اللہ ری بہادری، بازو میں اس عجیب الخف پر جس کی نظر
پڑتی ہے اختیار نہیں دیتا تھا کہ وہ ماشاء اللہ کیا قطع ہو اور اس بونے پن پر اگر ناما اور تن تن کر چلتا اور اپنے ناما
شگام جانا اور مہنوی قرونی سے بھڑک کر کھٹانا اور بھی لطف دیتا تھا۔ فقرہ بار آپ جانے زمانہ بھر کے بے فکر
ان کو شگوفہ ہاتھ آیا جس گلی کو چپے کی طرف سے خوشی نکل جاتے تھے لوگ نگلیاں ٹھاتے تھے پھٹیوں پھیرے چلتے جاتے تھے

(۱) ذریعہ سنبھل ہوئے حضرت دیکھے میں ٹھوکر نہ لگے۔

(۲) آدمی کیا بیکو کا ٹانگن ہو کیا کھٹ پٹ جادو ہے۔

(۳) ہم کو تو جھٹ دل معلوم ہوتا ہے (تقریر لگا کر)

(۴) اچھک کے باون اونٹار کے ذریات میں سے ہو۔

(۵) اگر طے تو بہت جاتے ہو کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی چیت دے قرونی ورونی چھین لے۔

(۶) ہاتھ پاؤں ماشاء اللہ کہنے۔ سڑ دل ہیں۔

(۷) ایسے میاں جہن ذری ادھر تو دیکھو یہ بھڑپے کے بھٹ نکالے گئے ہیں نا ابھی تک آدمی کی بونی نہیں لے سکتے۔

خیال میں کہ دنیا جان بوجھ کر اس کی بڑائیوں اور خوبیوں پر خاک ڈالتی ہے اس کا مسخرہ اپنا، اس کی دل لگیا
اس کی آزادی کے ساتھ محبت و وفاداری، اس کا اپنی چھوٹی سی تلوار سے کرسمتیرے بدلنا، اس کا بات بستر
قبم کھانا اس کی اپنی نزدیکی چھپانے کی ترکیبیں، انھیں سب باتوں سے وہ لوگوں کے دلوں میں گھر کیے
ہوئے ہے اس کے اکثر فقرے اور جملے اردو میں ضرب اشل ہو گئے ہیں۔ اس عجیب و غریب کیرکٹر کی
آفرینش سے مرثاں ہمیشہ یاد رہیں گے۔ تمام ادب اردو اس کا مقابل اب تک پیدا نہیں کر سکا۔ وہ
ادب نظریانہ کی سب سے زیادہ اور بھل اور سب سے زیادہ عجیب مخلوق ہے۔

مرثاں نے اپنے نادلوں سے ایک خاص صفت ان کی تصانیف کی یہ ہو کہ انھوں نے غیر فطری جزو کو
ان بچرل چیزوں کو خارج کر دیا۔ اپنے نادلوں سے خارج کر کے انسانی زندگی کے معمولی معمولی واقعات میں
ایک غیر معمولی دلچسپی پیدا کر دی۔ مولوی نذیر احمد کا بھی یہی قصیدہ ہو۔ مگر ان میں اور مرثاں میں یہ فرق ہو
کہ ان کے قصے صرف اخلاقی اور نصیحت آموز ہیں جن کی غرض صرف یہی معلوم ہوتی ہے کہ ان کو عورتیں
پڑھیں اور ان سے فائدہ اٹھائیں اور اسی وجہ سے ان میں دل چسپی اور حیرت انگیزی کم ہے ساری
رائے میں مرثاں سب پہلے شخص ہیں جنہوں نے زندگی کے معمولی معمولی واقعات کو قصہ کے پیرایہ میں
دل بہلانے کی غرض سے لکھا جو زمانہ حال کی نادلوں کی اصلی اور صحیح غرض ہے۔

فناں کلام مرثاں کے قصوں میں مندرجہ ذیل نقائص بتائے جاتے ہیں (۱) پلاٹ مربوط اور منظم
نہیں ہوتے۔ فناء آزاد ایک باقاعدہ پلاٹ کا قصہ نہیں لہذا مصنف جب واقعات میں ایک ترتیب
و نظام قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ناکام رہتے ہیں وہ تمام متفرق واقعات کو کبھی یک جا نہ کر
سکے اور ان سے کبھی باقاعدہ اور مرتب پلاٹ تیار نہ کر سکے۔ یہی کمزوری ان کے دوسرے نادلوں میں
بھی نمایاں ہو۔ اس کی وجہ بظاہر ان کی بے پردائی اور بے قاعدگی معلوم ہوتی ہے سب کی وجہ سے
وہ کوئی چیز مستقل باقاعدہ طور پر نہیں کر سکتے تھے۔ وہ ایک سچے آرٹسٹ کی طرح محنت اور شوق کے
ساتھ کام کرنے سے گھبراتے تھے اور اخبار کی ایڈیٹری یا اس کے واسطے قصے تیار کرنا ان کو ایک

لے غوجی کے جملے ضرب اشل نہیں ہوئے بلکہ وہ خود ضلع جگت کی طرح خٹیل بھی بولنے کا بہت شائق ہے ۱۱

مگر اہل معلوم ہوتا تھا۔ افسوس ہو کہ ایسے طباع اور ذہین آدمی نے بوجہ اپنے دانشگری مزاج اور
 پابندی قواعد سے کھرانے کے اپنی خلقی طبعی و ذہانت سے پوری طرح کام نہیں لیا اور اس کی
 قدر نہیں کی (۲) یہی سبب ان کے واقعات میں عدم تسلسل اور ابواب میں بے ربطی کا بھی ہوا شاید
 اسی وجہ سے ان کے کیرکٹروں میں ہمواری اور یک رنگی نہیں ہو جو قصے کے سلسلے میں سیکڑوں رنگ
 بدلتے رہتے ہیں۔ وہ وقتی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہیں اور کیرکٹروں کے خصائص ان کے دماغ میں
 قائم نہیں رہتے اسی وجہ سے وہ ان کو نباہ نہیں سکتے۔ فطری بے صبری اور جلد بازی کی وجہ سے ان کا
 اعظم سرسٹ گھوڑے کی طرح دوڑنے لگتا ہے۔ وہ لکھتے رہتے ہیں خواہ طبیعت حاضر ہو یا نہ ہو جس کا
 نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب ان کی فکر میں قوت پرواز نہیں رہتی تو وہ زمین پر گھسٹنے لگتے ہیں (۳) ان میں
 فلسفیت اور اخلاق آموزی کی کمی ہے۔ اسی وجہ سے فسانہ آزاد کی آخری جلد اور مٹھو کے کھلی خری
 ابواب جن میں تعلیم نسواں، تہا سو فی، اور ترک منوشی وغیرہ کے متعلق وعظنا تقریریں ہیں بنایت
 بے مزہ اور بے اثر ہیں۔ جب وہ اس کوچے میں قدم رکھتے ہیں تو پھر وہ سرشار نہیں رہتے (۴) ان میں
 جذبات کی کمی بھی ہے اسی وجہ سے ان کی تصانیف میں تصاویر درد و غم کا پتہ نہیں۔ ان کی جذبات
 نگاری جہاں کہیں ہوتی ہو مصنوعی معلوم ہوتی ہے اور ادھر ادھر کے اقوال و اشعار سے اس کمی کو
 وہ پورا کرنا چاہتے ہیں (۵) بعض جگہ اخلاق سے گری ہوئی اور غیر مہذب باتوں کا بھی ان پر الزام
 لگایا جاتا ہے اور فی الحقیقت انھوں نے بعض جگہ غیر مہذب اور سوتیانہ الفاظ استعمال کیے ہیں جن سے
 ہمارے اخلاقی احساسات کو ضرور صدمہ پہنچتا ہے۔ مگر اس کے جواب میں ان کی طرف سے دو ہذر پیش
 ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس زمانے کا جس میں وہ تھے رنگ ہی یہ تھا۔ دوسرے یہ کہ کسی عیب کی خرابی صرف
 اُن وقت بخوبی ظاہر ہو سکتی ہے جبکہ اس کو اس کو عریان کر کے دکھایا جائے ورنہ لوگ اس کی اصلی حقیقت سے متاثر
 نہ ہوں گے (۶) ان کے قصوں میں کیرکٹروں یعنی اشخاص قصہ کی اتنی کمزرت ہو کہ ان کے کھینچے ہوئے مرقعے اکثر گھچ پچ ہو
 گئے ہیں اور واقعات کی بھی اتنی کمزرت ہو کہ مناسب قائم نہیں رہتا اور پڑھنے والے کی طبیعت میں دفر
 واقعات پریشانی پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر سچ پوچھئے تو یہ سب اعترافات اگر صحیح بھی مان لیے جائیں تو اس

عظیم الشان خدمت کے مقابلے میں بیچ میں جو انھوں نے اپنی تصانیف سے ادب اور ادب و ادب و ادب کی دی۔ اور ان کے جزوی تقاضے سے ہم کو اغراض کرنا لازم ہے۔

سرشار کا بحیثیت ایک ہر زبان اور ایک صاحب طرز کے بہت بڑا مرتبہ ہو صاحب

سلیس۔ با محاورہ اور زوردار عبارت لکھنے میں ان کو اپنے ہم عصروں پر فوقیت حاصل ہے اور بحیثیت ایک صاحب طرز کے گو وہ آزاد سے دوسرے ممبر پر یوں مگر اور سب سے وہ ضرور بڑھے ہوئے ہیں۔ انھوں نے ایک ایسا طرز اختیار کیا تھا جو افسانہ نویس کے واسطے نہایت موزوں تھا اور ان کی تصانیف میں لوگ نفسِ قصہ سے زیادہ عبارت سے دل چسپی لیتے ہیں۔ ہر چند کہ بعض آدمیوں نے ان کی زبان اور محاورات پر بھی اعتراض کیے مگر اس قسم کے اکثر اعتراضات غیر منصفانہ اور حسد و تعصب پر مبنی معلوم ہوتے ہیں۔ زبان میں وہ ضرور بے روک ٹوک ہیں اور کبھی ضرورت کے زیادہ صرف محاورات و اصطلاحات کرتے ہیں مگر اس کی وجہ و فواریات اور قدرتِ زبان کوئی جاسکتی ہے۔

سرشار اور سرور کا مقابلہ | مرزا رجب علی بیگ سرور کے یہاں تکلف اور آواز بہت اور سرشار کی عبارت واضح بے تکلف اور نیچرل ہوتی ہے۔ سرور چیزوں کا بیان کرتے ہیں اور سرشار آدمیوں کا سرور آئیڈیل (خیالی) تصویریں کھینچتے ہیں اور تصویروں کے محاسن کو ابھارتے اور معائب کو پھاتے ہیں برخلاف اس کے سرشار کی تصویریں بالکل سچی اور ہو بہو ہوتی ہیں۔ اور اچھائیاں اور برائیاں سب بے تکلف ظاہر کر دیتے ہیں۔ سرور کے یہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک باغ میں کھڑے ہوئے ہیں۔ اسکے ایچوں بیچ میں ایک خوبصورت نہر جاری ہو جس میں صاف موتی سا پانی بہتا ہے اور اسکے کناروں پر برگلاب در ترشائے کے پھول ہلکے ہیں۔ سرشار ہم کو ایک عظیم الشان دریا کے پاس کھڑا کر دیتے ہیں جس میں آواز کے زور سے لہریں اٹھ رہی ہیں اندھیا کے قریب آس پاس کے جنگل سے شائے کی آوازیں آ رہی ہیں کبھی کبھی دریا کے صاف پانی پر کوئی ٹخنہ درخواب چیز بھی بہتی ہوئی چل آ رہی ہو۔ سرور کے مقعے اس وجہ سے دلچسپ و حسین ہیں کہ وہ ان چیزوں سے جن کو وہ بیان کرتے تھے خود بڑی محنت رکھتے تھے اور ان میں کوئی عیب نہیں دیکھتے تھے۔ سرشار برخلاف اسکے جس سوسائٹی کا خاکہ کھینچتے ہیں اس کو پسند نہیں کرتے بلکہ

اکثر موقوف پر تو اس سے نفرت ظاہر کرتے ہیں۔ اور اس نفرت ناراضی کو وہ کیس چھپاتے نہیں۔ پس
کہا جاسکتا ہے کہ سرد قدامت پسند ہیں اور زمانہ قدیم سے تعلق رکھتے ہیں اور سرشار اس نئی تحریک کے
حاجی ہیں کہ جو فنون لطیفہ کو کلف اور قدامت پسندی کے پنجے سے چھڑا کر آزاد کرنا اور اس کو نیچر کا منہج
دیکھنا چاہتی ہے اور اسی وجہ سے وہ زمانہ حال اور مستقبل دونوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

اس مضمون کے اختتام پر ہم شمسی سجاد حسین مرحوم ایڈیٹر اودھ پنچ اور نڈت رتن ناتھ سرشار کی
عبارت کے نمونے پیش کرتے ہیں تاکہ ناظرین کو دونوں کے رنگ طبیعت سے آگاہی حاصل ہو شمسی سجاد حسین
کے مشہور ناول حاجی بخلول سے وہ مقام لیا جاتا ہے جہاں "حاجی صاحب" اپنی معشوقہ کنڈے والی
کو یاد کر کے اُسی کے تصور سے اپنے دل ہی دل میں باتیں کر رہے ہیں۔ اور فسانہ آزاد جلد چارم سے
اسی کے قریب قریب وہ مضمون نقل کیا جاتا ہے جس میں خوجی بیٹی پونچھنے سے کچھ پہلے جازیر اپنی معشوقہ
شاب جان درزن سے ملنے کے خیال میں بے چین ہو رہے ہیں اور اسی کے متعلق آزاد سے باتیں ہو رہی ہیں
(ماخوذ از حاجی بخلول) ناظرین ذرا چلیے اس وقت تنہائی میں حاجی صاحب ٹپے کر رہے ہیں کان
لگا کر سننے تو کیا کہہ رہے ہیں۔ گرد دیکھیے وہاں رہے نزدیک گئے اور سارا کھیل بگڑ گیا۔ آپ کہہ رہے ہیں۔

اے نیک بخت! انسوؤں تجھ کو خبر نہیں کہ کوئی حاجی جان دیتا ہو۔ یوں تم توڑنا ہو۔ آپ تو کھیتی باڑی
میں جی بھلائی ہوگی یا گھر کے چکی چولے میں ٹھوس ہوگی دل سے تو بے صرف ہوگی یا ایلیاں پیاری پیاری بناتی
ہوگی۔ مگر یہاں سوکھ سوکھ کر عشق کی دھوپ میں ہم کٹا ہوا ہوئے جاتے ہیں تم کو کیا نام کہ جانتا جاسکے ہم بنو
کنڈے جس کی آغ ایسی تیز موتی ہے کہ تپال خنجر میں عرق اور تیل اسی سے نکل سکتا ہے۔ کیمیا کے نسخے اسی
سے تیار ہوتے ہیں۔ ہائے انسوؤں! کیا نام کہ حضور کی محبت میں کیسے کیسے محضے اٹھائے۔ لوگوں کا ادھر
کے کھیت میں لے جانا۔ گھوڑی پر سے گرنا۔ عمل خانی میں کر دی سہارا یہ سب واقعات ہیں جن کا مادل میں
ذکر ہو ہر حاجی عاشق صادق ہے جو تسلیم و رضا کی سرنگائے سب چوٹیں کھاتا ہے۔ مدد کیا نام کہ
بحال تھی کسی کی انگلی تو دکھائے مارے جو بیوں کے تھراؤ کر دیا ہوتا۔ مگر نہیں عاشق کے ضابطہ کے خلاف
یہ بات تھی جس گاؤں کو تم اپنے جلوہ سے رشک اوم نہاؤ۔ وہاں کا گدھا اور سورجرات اور دنبہ اور آدمی تو

ہماری آنکھ میں حورا و غلمان ہیں دم بھر کو کوئی سسرال جانا ہے چٹکی کھلی جاتی ہے۔ بھلا ہے
کوئی مرد آج اس میدان میں جو عشق بازی میں آپ کے حاجی کا مقابلہ کر سکے۔ ہائے میں آج کو کو آہوتا
اور جہاں تم ہو میں وہاں بھیجے کے قاذب قاذب کی صدا سنانا۔ تم بھگانے آئیں اور ہم تمہارے سر پر
آ بیٹھتے۔ ہائے تمنا ہو کہ ہم تمہارے گائے بھیجیں ہوتے اور کیا نام کہ تم ہمارے گلے میں اسی باندھ کر چلنے
لے جاتیں۔ بھوں پر تمہارے نازک ہاتھ پھرتے۔ تم دودھ دہتی ہو میں اور ہم تم کو چاٹتے ہوتے کیا نام
کر اگر کہو تو بھی چلیں اب تو ہم آپ کے عاشقوں میں ہو گئے۔ آج تک کبھی یہ چوٹ ہمیں اٹھائی مگر
قسمت کا کھلا ہوا اب تو ہم دنیا میں تمہارے عاشق مشہور ہو گئے۔ سب پر بھیجہ کھل گیا ہے کے دل کے
مونڈھے پر بیٹھو عزم تم بہت زیادہ گھٹ کر ٹھیکڑا ہوا ہے۔ آہ یہ کمر کا درد تمہارے عشق کی چوٹ ہو جو
سارے جسم و جان میں پھیلی ہوئی ہے افسوس ہے

سو ختم و سوزش، کسے ظاہر نہ شد

چوں چراغاں در شب قہاب بے جا سو ختم

ہائے سینے میں الاؤ لگا ہوا ہے۔ بھس کی آگ کی طرح اندر ہی اندر سلگ رہا ہو۔

(ماخوذ از فسانہ آزاد جلد ۱) اتنے میں ملاحوں نے کہا اب بھی سامنے سے نظر آتی ہے سنتے ہی
خوجی کی باجھیں کھل گئیں۔ چلا کر کیا یاد دہرا دیکھنا بی شتاب جان صاحب کی نفس تو نہیں آتی ہے
کہم بخش نامے مہری ساتھ ہوگی۔ اٹلس کا چھٹکا ہوا در کھاروں کی پگڑیاں در دی رنگی ہوئی ہیں۔
پھیلیاں ضرور تنگ ہی ہوں گی۔ بی شتاب جان بہت۔ لے بی شتاب جان صاحب۔ آزاد پاشا آؤ
آئی ارے یار آؤ آئی ہو تو خدا کا واسطہ تباد۔ بی شتاب جان۔ لے کہم بخش مہری۔ مہری کیا بھری ہو۔
لوگوں نے سمجھا یا کہ صاحب ابھی بندرگاہ تو آنے دیجئے بی شتاب جان اور کہم بخش یہاں سے کیونکر
سہا لیں گی۔ کہا جی ٹو بھی تم کیا جانا بھی کسی پر دل آیا ہو تو سمجھو۔ اسے نادان عشق کے کان دکوس
تک کی خبر لاتے ہیں۔ اور کون کوس کر ہی منزل کے کوس۔ کیا شتاب جان نے آواز نہ سنی ہوگی واہ بھلا کوئی باہر
مگر جو بکیر نہ دیا۔ یہ پوچھو اس میں ایک لم ہو پوچھو وہ کیا وہ یہ کہ معشوق پن نہیں اگر اتنی کجی نہ ہو۔

اگر آواز کے ساتھ ہی آواز کا جواب نہیں تو سب سے کی نظروں سے گرجائیں۔ مگر جب کہ ہم بوکھلائے ہوئے ادھر ادھر دھونڈتے اور آوازیں دیتے ہوں کہ بی شتاب جان صاحب اجی بی صاحب اور وہ بے خبری میں پیچھے سے ایک دھول جھول جائیں اور تنک کر کیس موندی کاٹا آنکھوں کا اندھا نام نہیں سکھ خل مچاتا پھرتا ہے۔ بشتاب جان شتاب جان اے بی صاحب تیری بی کو کیا کہوں۔ موئی کیس چرخہ کات رکھا ہوگی۔ اور ہم دھول کھا کر کہیں کہ دیکھیے سر کاہ انجی دھول لگائی تو خیر جواب دھول لگائی نہ تو بگڑ جائے گی۔ پس کہہ دیا ہو۔ اور وہ جھٹلا کر ایک اور جائیں لاس جانب کی ٹوپی گھورے پر جا کر گرے اور ساتھ ہی اس گھٹی ہوئی کھوپڑی پر تڑا تڑا دو چار اور جادیں تب سنس کر کہوں۔ جان میں خدا گواہ ہو اس وقت پرٹ پڑا ہوا در نہ مارے بھوک کے آنتیں قل ہوا لٹ پڑا رہی تھیں۔ سفر اور چوہیں لسی چاند بازہ سر پارہ کہاں ملتی جو بے دھوک دھول پر دھول جاتی۔ اور ابھی کیا پڑی ذرا تھ دل ہو کر بیٹھیں تو پھر دو ایک جوتے ضرور لگانا۔ ہاں بے پاپوش کاری کے طبیعت بے چین رہتی ہے۔

آزاد۔ بالفعل کیسے تو خاکسار ہی لگا دے۔

خوجی (مسکرا کر) اے نہیں حضرت آپ کو تکلیف ہوگی۔

آزاد۔ واللہ کس مردود کو اپنے حساب تکلیف ہو۔ دو جوتوں میں آپ اس درجے کو پہنچ جائیں کہ پھر عمر بھر آرام سے سوئے جانے غم زدہ نہ غم کالا۔ یا کیسے نقطہ نگاہی دوں۔ گو تکلیف ہو کچھ پردا ہ نہیں۔ اس کا کہاں تک خیال کروں گا۔

خوجی۔ میاں پہلے منہ دھو آؤ۔ دل لگی نہیں ہو۔ ان کھوپڑیوں کے سہلانے کے لیے پریوں کے ہاتھ چاہئے نہ کہ تم ایسے دیوانوں کے۔

آزاد۔ خدا کرے جس وقت آپ پر پاپوش کاری کریں اس وقت ہم بھی ہوں۔ کہتا جاؤں کہ ہمارا خاطر سے ایک اور پھر پڑے۔ اب کی رنجک چاٹ گئی۔ اب کے خوب چاخنے سے آواز آئی۔ ہاں ذرا ایک اور اور ذرا اور تک آواز نہ جائے۔

تاصح کے سر پر ایک جھائی چاخنے سے پھر ہاتھ مل رہے ہیں کہ ابھی پڑی نہیں

اتنے میں ساحل بحر نظر آیا۔ تو خواجہ صاحب نے غل چایا شتاب جان صاحب اچھی حضور کا غلام فرزند
آداب عرض۔ اس قدر کہ چکے تھے کہ لوگوں نے تہقہ لگایا۔ اور غوجی متحیر ہوئے کہ یہ کیا اسرار ہے
آزاد سے پوچھا اس خندہ بے محل کا کیا سبب۔ آزاد بولے آپ کی حماقت اس کا سبب گدھا پن خود
کو تے ہو اور ادب سے ہم سے پوچھتے ہو کہ اس کا کیا سبب کیا فقرہ کہا تھا آپ نے ذرا پھر فرمائیے گا۔
خواجہ صاحب نے طیش کھا کر پھر وہی فقرہ سنایا۔ اچھی حضور غلام فرزند آداب عرض کرتا ہے۔

آزاد۔ تو آپ شتاب جان کے صاحبزادہ فرزند دلہند ہیں۔

خوجی۔ یہ کا ہے سے۔ صاحبزادہ ہیں یا میاں ہیں شوہر خاص۔

آزاد۔ پھر یہ فرزند آداب کیسا ہوتا ہے۔ جو رد کو کوئی فرزند آداب عرض کرتا ہو تو
آپ کی بیوی کیا آپ کی والدہ شریفہ ٹھہریں؟

خوجی۔ اگالوں پر تھپڑ مار کر اور رررر غضب ہو گیا برا ہوا اللہ ستم ہو گیا۔ سخت مصیبت میں
مگر قرار ہو گئے۔ ایسے خفیف ہوئے کہ توبہ ہی کھل۔ اے ہو خفت سی خفت ہو۔ مگر چمڑے کی زبان
پھسل گئی لیکن تشفی یہ ہے کہ بدحواسی کے وقت ایسا کلمہ زبان سے نکلا۔ اور وہ بھی اپنی پیاری شتاب جان
کی نسبت۔ جی پھر وریں چہ مضائقہ باشد۔ اب تو صاف صاف فتنہ نظر آتی ہے وہ دیکھئے ہوا سے
زلف درہم درہم ہوئی جاتی ہے۔

سمجھ کر چھپڑا دشاٹھ اس کی زلف پر غم کو

خدا کے واسطے برہمنہ کر اباب عالم کو

وہ مہری سامنے ڈٹی کھڑی ہے۔ آٹھا اب تو بی کر بخش بھی اڑھ پر ہیں۔ سر و قامت
رکشا شاد۔ اس جو کردار کی مہری بھی پری زاد ہے۔ وہ سنی اودھو ہو ہو۔ دہندہ لے مار دلا

کیا پیارے دانت ہیں سے

چمک لعل بدخشاں کی مٹا دے ترے ہونٹوں پہ اپنا رنگ پاں ہو
یاد ان شردہ باد کہ عروس مانوس من ذکا و کلفدار من و صبیہ من بی شتابی جان و امت حسنہ

از جھڑ کہ ز رنگارمرا می بنیدوی گوید ہے

یار نام خدا ہے کشتی میں ناخدا آج پار ہیڑا ہے

آزاد۔ یار عمر بھر میں رحمتہ شعر آج ہی صاحب حال۔

خوجی۔ درست اور وہ شعر جو کانس کے نام ہم نے لکھا تھا۔

اے قبائے بادشاہی راست برالائے تو

(مصرع ثانی حذف شد) والائے تو

آزاد۔ مگر ایک غنچہ بھر کہا یا پہلے شتاب جان کو اپنی اور مرہبان بنایا۔ اب کے ایک یا کلمہ
کہا کہ پھر چھپ چلاؤ گے زبان سے کہنا ہی نہیں۔

خوجی۔ کیا طاقت ہم نے کہا کیا تھا۔ یہی کہا تھا کہ عروس من و کازن و صبیہ من بانشاب جان
پھر کیا عروس نہیں یا صبیہ نہیں ہے۔

آزاد۔ اے لعنت خدا۔ ارے کم محنت بری میں صبیہ لڑکی کو کہتے ہیں۔ بے اب سر ہٹو۔ کبھی
ماں بناتا ہو کبھی لڑکی۔ اور پھر اوپر سے غزانا ہے۔

خوجی۔ (سر ہٹ کر) زبان تراش ڈالنے کے قابل ہو۔ لیکن خیر گزشتہ راصلوۃ آئندہ ردا اختیار
آزاد۔ یاد وہ دیکھو سامنے کیا نور کا بکا نظر آیا۔

خوجی۔ یہی ہوا ہی شتاب جان ہیں۔ کیا صورت ہو۔

چہرہ گلوں ہے گلشن۔ قامت موزوں ہو سرور
گوش نازک ہیں گل تر غنچہ و گل ناک ہے
جلوہ گر خال سیہ ہے، روئے آتش ناک پر
چشمہ و خورشید میں زنگی مگر تیرا ک ہے

مولوی عبدالحکیم شرر ایک دوسری زبردست ہنسی جس نے اردو ناول کی اشاعت ترقی میں بڑی اہمیت
کی۔ مولوی عبدالحکیم شرر ہیں۔ انھوں نے سب سے پہلے اردو میں رنجی ناول لکھے قصہ کے پلاٹ اور کیرکٹروں کی

ترقی پر توجہ کی اور تیز اپنے ہر زحمت پر سے ثابت کر دیا کہ صاف بے دانش کی ہوئی زبان ہی نادر
نویسی کے واسطے نہایت موزوں ہو۔ انھوں نے نادر کو غیر مذہب اور نحیف الفاظ و مضامین سے
پاک کیا اور اپنی وسیع معلومات سے وہ مواد فراہم کیا جو ان کی تصانیف کے کام آیا۔ وہ صرف نادر
ہی نہ تھے بلکہ مؤرخ، دوا، نگار، ادیب اور ایک زبردست جرنلسٹ بھی تھے۔

دیہات سے صفحہ ۳۲ تک خود مولانا شری صاحب مرحوم کے بیان کردہ حالات زندگی باجوانوں نے
بعد نظر ثانی بغرض اشاعت کچھ کو عنایت فرمائے تھے اور تیسرے پاس موجود ہیں درج کیے جاتے ہیں۔
چونکہ یہ حالات کم و بیش مختلف عنوانات سے مصنف صاحب نے بھی اس کتاب میں بیان کیے ہیں لہذا
(میں مضمون کتاب کے بجائے اسی پر استفا کی گئی مترجم)

جمادی کے دن ۲۰ جمادی الثانی ۱۲۸۷ھ کو غدر شہاء کے تین سال بعد لکھنؤ میں پیدا ہوئے
نانا چونکہ دربار اودھ میں السوخ اور معزز حیثیت رکھتے تھے لہذا اودھ کے شاہی خاندان کے ساتھ
انگلتان گئے اور وہاں سے واپس آکے بیارنج کلکتہ میں قیام پذیر ہو گئے۔ تمام خاندان کو چونکہ اگلے
شاہی دربار سے وابستگی تھی لہذا مولانا کے دیگر بزرگ اور والد بھی انھیں رشتوں میں بندھے ہوئے بیارنج
کلکتہ پہنچے مولانا کے والد حکیم تفضل حسین صاحب عربی و فارسی میں کامل بصیرت رکھنے کے ساتھ ایک
پختہ مغز طبیعت تھے ۱۲۸۷ھ میں جبکہ ۹ سال کی عمر تھی کلکتہ گئے اور اسی وقت سے گویا تعلیم شروع ہو گئی گو
ایک ناقص طریقے پر لکھنؤ میں بھی ابتدائی تعلیم ہوئی رہی تھی۔

بیارنج میں ابتدائے پندہ والد صاحب سے اور حیدرآباد سے ابتدائی کتب فارسی و عربی انھیں
مولوی سید علی حمید صاحب اور مولوی محمد حمید صاحب کے معقوی دادی کا بی بی پڑھیں مولوی مرزا احمد علی
صاحب مجتہد سے چیدہ اور کی منطق کا بی بی پڑھیں حکیم محمد مسیح صاحب سے بعض کتب طبیعت پڑھیں کچھ انگریزی
بھی پڑھی مگر پراپیوٹ طور پر اور بالکل ناقص۔ اخبارات کا ذوق اسی زمانے سے پیدا ہو گیا تھا۔ کیونکہ
ان دنوں اودھ اخبار میں بحیثیت کارپانڈنٹ خبریں لکھ لکھ کر بھیجا کرتے تھے
انیس سال کی عمر میں کلکتہ سے تعلق ترک کر کے لکھنؤ کی سکونت اختیار کی اور مولوی محمد عبدالحی صاحب

مرحوم سے کتب درسیہ عربی ختم کیں۔ بیس برس کی عمر میں ماموں کی بیٹی سے شادی ہوئی اور شادی کے بعد ہی حدیث کا شوق ایسا غالب ہوا کہ دہلی چلے گئے اور مولوی محمد نذیر حسین صاحب بحث دہلوی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے مدرسہ میں رہ کر حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ پھر ان کے بعد انھیں انگریزی کا شوق ہوا۔ اور انگریزی جاننے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ خانگی طور پر بے انتہا محنت شروع کی اور چند روز میں بقدر ضرورت دستگاہ پیدا کر لی۔

اسی زمانہ میں انھیں منشی احمد علی کسندوی مرحوم سے صحبت ہوئی۔ جو بعض اخبارات اور خصوصاً اودھ پنج میں مضامین لکھا کرتے تھے۔ اور ان کا فارسیت کا مذاق بہت بڑھا ہوا تھا۔ ان کے شوق دلانے سے بعض اخبارات میں مضامین لکھنے لگے۔ جن میں بجائے پائٹکس میں منہک محوئے کے انشا پرداز کا مذاق بڑھا ہوا تھا۔ چنانچہ ۱۸۸۷ء میں منشی نول کشور صاحب نے انھیں اودھ اخبار کے ایڈیٹر میں لے لیا۔ یہ نو عمری کا زمانہ تھا طبیعت زوروں پر تھی اعلیٰ خیال آفرینی کے ساتھ فلسفیانہ معنی آفرینی اور لٹری مذاق بڑھا ہوا تھا۔ اسی رنگ کے مضامین اس زور و شور سے لکھنا شروع کیے کہ ہر جگہ شہرت ہو گئی اور ایسی شہرت ہوئی کہ حیدر آباد میں اور بعض اور چھوٹی ریاستوں میں طلب کیے گئے مگر ناپسند کیا۔ سرسید سے گوشت سائی نہ تھی مگر انھوں نے "روح" کے سبکٹ پر لانا کا ایک مضمون اس قدر پسند کیا کہ منشی نول کشور کو لکھا "میں اس مضمون میں سے کچھ اخذ کرنا چاہتا ہوں۔ لہذا صاحب مضمون سے اس کی اجازت چاہتا ہوں۔"

اسی زمانہ میں انھوں نے اپنے ایک دوست مولوی عبدالباسط کے نام سے محشر نام ایک مہفتہ وار رسالہ نکالا جس کا رنگ عبارت اس قدر دلکش اور میل فریب تھا کہ ہر طرف دھوم مچ گئی۔ اس میں ٹھانڈے امیں نمبروں میں انھوں نے مسلسل صبح کا سماں دکھایا تھا جس نے تمام صاحبِ دق لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا۔ یہ رنگ اور وہیں کبھی نہیں دیکھا گیا۔ اس میں فارسی کے تشبیہات و استعارات بھی بے بند و بار تھیں۔ گویا انگریزی عروس سخن کو فارسی وارد کا لباس پہنا دیا گیا تھا۔ اسی ضرورت کا قافیہ بندی و معایت لفظی بالکل چھوڑ دی۔ اور اس سے بہت پرہیز کیا کہ نثر میں جا بجا اشعار شامل کیے جائیں۔

اس رنگ کے بنا ہنے میں اکثر جگہ عبارت الجھ جاتی تھی جس کی کچھ تو یہ وجہ تھی کہ اردو نثر میں انگریزی کی طرح علامات اوقاف دیکچو لیشن مارکس نہیں ہیں۔ اور کچھ یہ کہ مولانا کا ایجاد کیا ہوا رنگ اکھی پننگل کو نہیں پہونچا تھا۔ مگر چند ہی روز کے بعد ایسا اعتدال پیدا ہوا کہ ان کی عبارتیں خاص رنگ پر لیا۔ اور ایسا مقبول رنگ کہ یہی طرز عبارت آج ساری اردو انثار پر دازی کا مد اخبارات کی عام زبان پر حکومت کر رہا ہے۔

یہ ہی عبارت کی شان تھی کہ جس نے ایک دفعہ دیکھا بے انتہا گرویدہ ہو گیا۔ اور فوراً اس کو اختیار کر لیا۔ افسوس کہ شرر کے وہ اودھ اخبار اور محشر کے مضامین کسی نے علمیہ نہیں چھاپے اور وہ اصل پرچے کہیں دستیاب نہیں ہوتے۔ ورنہ شاید اب ہندوستان بہ نسبت سابق کے ان کی زیادہ قدر کرتا۔ ۱۸۸۲ء میں مٹی نول کشور کے تعلق کو چھوڑ دیا جس کا سبب یہ تھا کہ مطبع اودھ اخبار نے اپنل کارپانڈنٹ بنا کے حیدر آباد بھیجا تھا۔ مولانا کے مگر چھ مہینے رہ کر واپس آنا چاہا۔ مطبع نے اس کی اجازت نہ دی۔ اور آپ خود ہی چلے آئے۔

اس زمانے میں انھوں نے اپنا سب سے پہلا ناول ”دھچپ“ لکھا جس میں قوتوں اور حالتوں کا سیاسیاں دکھایا ہو کہ اردو زبان میں بالکل نیا اور حیرت انگیز ہے۔ مگر چون کہ اس رنگ کا پورا ڈولمنٹ (رداج) ہنوز نہیں ہوا تھا لہذا جا بجا الجھا ہوا اور پیچیدہ ہو اور اخلاق پسندی کی شان دکھاتا ہے وہ ایک ہندوستانی معاشرت کا ناول ہو جس میں عشق کو دھچپی کے ساتھ دکھایا گیا ہو کہ ہندوستانی خاندان زیادہ تر کن اسباب سے تباہ ہوتے ہیں۔ سال بھر بعد اس کا دوسرا حصہ شائع ہوا جو انشا پر دازی کے اس نقص سے پاک تھا جو پہلے حصے میں ہو۔ اس میں نہایت پننگلی حاصل ہو گئی ہے۔

اس کے دو سال بعد مولانا نے بنکم چندر چٹرجی کے ناول درگیش تندنی کو اس کے انگریزی ترجمہ سے اردو میں ترجمہ کر کے شائع کیا۔ اور اس کے دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہو کہ ایک اچھا انشا پر داز ترجمہ کرے تو اس میں کیسی خوبیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔

اب پبلک مولانا کے کلام کی بے انتہا مشتاق تھی۔ ہر طرف دست شوق پھیلا ہوا تھا کہ مولوی

سیر اندیش صاحب نے سیر لیسر در نشی خا حین صاحب شاد مالک پیام یار کے اصرار سے ۱۸۸۷ء
 میں مولانا نے اپنا مشہور رسالہ دل گداز جاری کیا۔ اس کے شائع ہوتے ہی شوق نے ساہوکار
 میں ایک سرگرمی پیدا کر دی اور اس کی اشاعت ہزار سے زیادہ ہو گئی۔ اس میں خاص قسم کے ایسے
 مضامین تھے جن کے تو نے اگر کوئی ڈھونڈھے تو صرف انگریزی اعلیٰ سرسچر میں مل سکتے ہیں۔ اردو
 کا خزانہ اس وقت تک اس سے خالی تھا۔ کسی تریاں کو ٹوڑنا نا اور بغیر شبیہ استعارہ کے اور
 بغیر قافیہ بندی کے کسی مطلب کو دلکش و دل فریب بنا دینا دل گداز کے معجز نگار ایڈیٹر کا خاص
 قصہ تھا۔ اس کے مضامین اس قدر پندیدہ اور ایسے دلکش رنگ میں بنائے گئے تھے کہ سر رشته تعلیم
 کو بھی بغیر سوس کے کہ مولانا کو اس کے سے کوئی بھی لگاؤ نہ ہوا کہ کے مضامین لینے پرے۔ اور اب مولانا
 میں آدھ کوئی کورس نہیں جس میں وہ ایک مضامین شریک نہ ہوں۔

۱۸۸۷ء میں دل گداز میں ناول نویسی کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ اور اس وقت سے مسلسل وہ ناول
 شائع ہونے لگے جن کے نام کے اعزیز ارجا میں انجلیا۔ منصور مہنا وغیرہ ہیں جن میں درخانہ شیان
 سے قدیم تہذیبی اعتبارات کو اعلیٰ سرسچر کا لباس پہنایا گیا ہے۔ یہ ناول اس قدر مقبول ہوئے کہ اس وقت
 بنگال کے میسوں ایڈیشن شائع ہوئے ہیں اور مانگ دس ہی باقی ہے۔ بلکہ زیادہ ہے۔

ترک کے ناولوں اور سیر مضامین کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے تاریخ کو اور خصوص
 تاریخی تاریخ کو حد سے زیادہ اڑا دیا ہے۔ اور اسی وجہ سے مضمونوں اور ناولوں میں رد و برد
 خیال آزادی کا رنگ چڑھا گیا۔ اور تہذیبی و رقیب کے ساتھ صرف سادے الفاظ میں خوش پیدا کرنے
 اور ادوات کو انتہائے زیادہ دلکش بنانے کی شان یہ تھی گئی۔ ان کے آخری ناولوں میں ایک
 "ایام عرب" ہے جس میں جاہلیت سے قبل کا زمانہ سوسائٹی انسی اندگی و خوبصورتی سے دکھائی گئی ہے
 کہ زمانہ حیرت کرتا ہے۔ اقلو و اقلو نڈا اور "اندلس" وغیرہ میں اسپین کے اسلامی دور کو ایسی
 خوش اسلوبی سے دکھایا ہے کہ لوگ بار بار پڑھتے ہیں اور جی نہیں بھرتا۔

انھیں آخری ناولوں میں ناول "فردوس بریں" بھی ہے اس کا پلاٹ ایران میں اور اس نے مانے میں

دکھایا گیا ہو جبکہ خیال طاقتاں اور التوتوں میں باطنیوں (ایسین لوگوں) کا زور تھا۔ اور ہزار ہا زندگان ان کے خنجر سے مارے جاتے تھے۔ ان کے بادشاہ نے پہاڑوں میں ایک جنت بنا رکھی تھی۔ جس میں وہ سب ماں فراہم کیا تھا جو مسلمانوں کے خیال میں جنت میں ہونا چاہیے۔ اس ناول میں عجیب حیرتناک طریقے سے دکھایا گیا ہے کہ وہ لوگ کیونکر لوگوں کو فریب دے کر اپنا گرویدہ بناتے اور اپنی فلسفیانہ تقریروں سے انسان کو کیونکر اپنا فریفتہ کر لیتے تھے۔

تاریخی مذاق کے بڑھنے کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ مولانا شرر نے ۱۹۰۷ء میں مہذب نام ایک اخبار جاری کیا جس میں مسلسل علمائے اسلام کے سوانح عمری ہوا کرتے تھے۔ اس پرچے کی اشاعت بڑھتی جاتی تھی اور مسلمانوں میں نہایت مقبول تھا کہ یکا یک ۱۹۰۷ء میں انھوں نے دل گداز اور مہذب دونوں کو بند کر کے حیدر آباد کا سفر کیا۔ اور وہاں ریاست میں دوسرے پیر ہوا اور کا تعلق پیدا کر لیا جس کی وجہ سے ایک مدت تک وہ ملک کی نظر سے غائب رہے۔ اتفاقاً نواب وقار الامراہاد سابق مدد اللہ مرحوم کے چھوٹے صاحبزادے نواب لی الدین خاں انگلستان میں ٹین کالج میں تعلیم پاتے تھے اور خود کہ بچپن سے بھیجے گئے تھے لہذا مذہب بالکل آشنا نہ تھے۔ مولانا شرر کو وقار الامراہاد نے اس خط کے لیے منتخب کیا۔ اور ۱۹۰۷ء میں وہ انگلستان گئے۔ جہاں چودہ پندرہ مہینے قیام رہا۔ اور مریبو کو مین نام ایک فرانسیسی محقق سے فریج زبان شروع کی۔ جس میں اتنی دستگاہ ہو کہ دکن شری کی مدد سے ترجمہ کر سکتے ہیں ۱۹۰۷ء کے آخر میں ہندوستان واپس آئے۔

۱۹۰۸ء میں اپنے حیدر آباد سے دل گداز کو از سر نو جاری کیا۔ مگر گیارہ ہی مہینے تک جاری رکھ کے خود ہی بند کر دیا۔ جس کی وجہ یہ ہوئی کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی صاحبزادی جناب سکینہ کی لائف آپ نے شائع کرنا شروع کی تھی۔ اس میں چونکہ تاریخی تحقیقات کر کے اصلی واقعات لکھے تھے وہ عام مسلمانوں میں اور خاصہ شیعہ لوگوں کے خلاف ہوئے۔ اور ایک قسم کی شورش پیدا ہوئی۔ بعض عہداران گورنمنٹ نظام نے پرائیوٹ طور پر آپ کو ہدایت کی کہ اس مضمون کا سلسلہ دوسرے دیں۔ مگر آپ نے جب یہ رنگ دیکھا تو بجائے اس مضمون کے خود پورچہ بند کر دیا۔ اور اسے ۱۹۰۸ء میں لکھنؤ

جاری کیا جس میں سب کے پہلے اسی سکنہ بزت حسین کی لائف کا بقیہ تھا۔

اس زمانے میں ریاست دکن کے قطعات قائم تھے۔ صرف مدارالمہام مرحوم کی فیاضی اور سابق
یوم سکرٹری مولوی محمد عزیز مرزا صاحب کی کوشش سے آپ کو لکھنؤ میں رہنے کی اجازت مل گئی
تھی۔ ۱۹۰۷ء کے درمیان میں آپ واپس طلب کیے گئے نتیجہ یہ ہوا کہ دکن از بند کر کے آپ پھر حیدرآباد
آئے۔ اس مرتبہ جانے میں یکایک ایسے انقلابات ہو گئے کہ آپ کے تعلقات ریاست کو نقصان پہنچا۔
دقار الامر بہادر سادات سے علیحدہ ہوئے اور چند روز بعد انتقال بھی کر گئے۔ مولوی عزیز مرزا صاحب
جن کو آپ سے خاص ہمدردی تھی اضلاع میں ڈپٹی کمشنری کی خدمت پر بھیج دیے گئے۔ نئے
مدارالمہام ہمسایہ راجہ کشن پرشاد بہادر کو آپ کے کوئی خاص ہمدردی نہ تھی۔ اور مشروراکر جو فائس کا
انتظام کرنے کے لئے آئے تھے ان کے نزدیک ریاست کو مولانا کی ضرورت نہ تھی۔ غرض ریاست کے
جو تعلق تھا جاتا رہا۔ اور جو تعلق دقار الامر بہادر کے صاحبزادے نواب سلطان الملک بہادر کی سرکار
سے تھا اسے اپنے خود ہی چھوٹ دیا۔ اور ۱۹۰۷ء میں لکھنؤ واپس آئے پھر پبلک کی خدمت شروع کر دی
جب سے دل گداز پھر جاری ہوا اور اس وقت تک جاری ہے۔

مولانا کا رنگ عبارت اسٹڈی کیا جائے اور اس میں خاص حیثیت کے انسان منہک ہو تو پتہ چلتا ہو
کہ آپ نے اردو میں کیا چیز پیدا کی ہے۔ اردو کے پرانے نمونے دو وضع کے تھے۔ ایک تو میر اسلمی
کی سادی عبارت۔ اور دوسری مرزا رجب علی بیگ سردار کی فارسی مذاق کی رنگین اور مسجع و مقفی عبارت
اس کے بعد جو اردو کے نئے مجتہد پیدا ہوئے وہ حسب ذیل ہیں۔ سر سید احمد خاں۔ مولوی محمد بن
آزاد۔ مولانا نذیر احمد صاحب۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار اور مولانا محمد عبدالحلیم شرر۔ سر سید نے
سادگی اور وہ شان اختیار کی جو کبھی مولانا شاہ اسماعیل کے قلم نے دکھائی تھی۔ یعنی ہر مضمون اس
طرح ادا کیا جائے کہ عامی سے عام شخص اس کو سمجھ جائے۔ مولوی محمد حسین کی شائستگی کہ زبان میں
بے تکلفی و روانی ہو اور روانی کے ساتھ شاعرانہ تشبیہات و استعارات بھی بہت ہی معتدل حد تک
ہوں مولوی نذیر احمد صاحب نے روانی چاہتے تھے اور بے تکلفی میں معتدل حد سے بڑھ گئے ہیں زبان کو جب

متین بنا جاتے ہیں تو سو اس کے کہ عربی یا انگریزی جملے اور لغات داخل کر دیں ان کا کچھ زور نہیں چلتا
بندشیں وہی رہتی ہیں اور عبارت بھی وہی باقی رہتی ہے۔ پٹتے تین ناتھ میں کوئی ایجاد ہی مادہ نہیں ہو
اور اگر بچے تو صرف اتنا کہ ان میں ظرافت کا مادہ بڑھا ہوا ہو۔ ان کی عبارت دو طرح کی رہتی ہے ایک تو
وہ جہاں وہ خود کوئی سماں کھینچا پاتے ہیں یا کسی کیفیت کو بیان کرتے ہیں وہاں ان کی عبارت میں اور دوسری
عبارت میں کوئی فرق نہیں۔ وہی قافیہ پیمائی ہے۔ وہی مبالغے ہیں۔ وہی پرانی تشبیہات و استعارات ہیں
اور وہی جابجا اور ضرورت دے ضرورت اشعار کا بھرتی کرنا ہو۔ بلکہ الفاظ بھی وہی پرانے فارسی و سنسکرت
کے ہیں۔ دوسری عبارت وہ جہاں عورتوں کی زبان سے وہ ان کے خیالات ادا کرتے ہیں۔ اس میں سوا
خاص خاص لغز بشوں کے وہ کھنکھناتی عورتوں کی زبان اچھی اور بے کلفت لکھتے ہیں خلاصہ یہ کہ سرشار
کی زبان میں کوئی جدت نہ تھی سو اس کے کہ خلاف قیاس مضامین کو چھوڑ دیا پرانی عبارت اور ان کی
عبارت میں کوئی فرق نہ تھا۔ سر نے ان سب لوگوں سے علحدہ ہو کر یہ کمال دکھایا کہ انگریزی انشا پرانی
کی خوبصورت بندشوں کو اردو میں داخل کیا مگر تشبیہات و استعارات ہی پرانے الٹائی رکھے۔ انھوں نے
خیالی مضامین کو دیا۔ اور ان میں بالکل انگریزی جادو نگاروں کی سی خیال آفرینیاں کیں اور عجیب خوبصورت
کے ساتھ انھیں اردو میں کھپا دیا۔ اردو پبلک میں ابتدا میں بیزارنگ تھا۔ انگریزوں کو اردو میں وہ چیز
مل گئی جسے وہ ڈھونڈ رہے تھے۔ اور صرف اردو جاننے والوں کو تھوڑی دھشت کے بعد جب اس کی چال
پڑی تو ان کے نزدیک اس سے زیادہ دلچسپ کوئی رنگ عبارت تھا ہی نہیں۔ سرشار کا رنگ ان کے
چند مبتدائی ناولوں پر محض رہا اور وہ بھی جن میں پلاٹ نہیں۔ نکلان اسکے شرکاء رنگ زلیخہ تران کے مضامین
میں نظر آتا ہے جو اپنا جواب نہیں دیتے۔ اور جن کے سامنے کسی کو قلم اٹھانے کی جرأت نہیں ہو سکتی۔
سرشار ہی نے درحقیقت وہ زبان شروع کی جس کی نسبت سب کو اتفاق ہو۔ کہ وہی جدید اردو ہو اور
وہ زبان ہے جو فی الحال ملکی لٹریچر پر حکومت کر رہی ہے۔ اور جو بیزارنگ چمکا اور ابھرتا جائے گا
اسی قدر زیادہ نمایاں طور پر سرشار کا سکہ اردو لٹریچر پر نظر آتا جائے گا۔ سادی حیثیت میں وہ مبین محققانہ
بلکہ فلسفیانہ ہو۔ شعراء خیال آفرینی کی حیثیت میں وہ شاعری کے رنگ میں اتنا سے زیادہ دہنی ہوئی ہو

جس چیز کی تصویر کھینچتے ہیں اُسے اسکاٹ کی طرح ناظرین کی نظر کے سامنے لاکھڑا کر دیتے ہیں۔ انسانی جذبات پر اس طرح اور اتنا تصرف کرتے ہیں کہ جس قسم کے جذبات چاہتے ہیں اپنے نادل پر ہٹھنے والے کے دل میں پیدا کر دیتے ہیں۔ اپنا ذوق دیکھانے کے لیے انھوں نے ایسے ایسے سبکدوش لیے جن پر ان سے مشیر کسی نے قلم نہیں اٹھایا تھا۔ مثلاً "غریب کا چراغ"، "صحبت برہم"، "نہیں" "ہاں" "لالہ خود درد"، "یاد رنگاں"، "دیہات کی لڑکی"، "نواب دوشیں"، وغیرہ وغیرہ۔ ایسے مضامین کو اردو میں پہلے پہل انھیں نے انگریزوں سے کیا۔ اور سچ یہ ہو کہ آج تک ان سے بہتر کوئی نہیں لکھ سکا۔ شہر پرچہ یہ ہو کہ اردو لٹریچر کی دنیا میں ایک چابکدست مصنف ہیں۔ اور جذبات انسانی پر حکومت کرنے والے بادشاہ۔ تاریخی ذوق بڑھانے کی بدولت مولانا جامی سے ایک مضمون بن گئے۔ اپنے دگلہ زبانی میں جو تاریخی مضامین لکھے ہیں ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف سائنس تاریخی اور اکثر نامور ان سلف کی سوانح لکھ کے آپ نے ہندوستانی سبک کی واقفیت بہت بڑھا دی ہے۔ مگر ان کے علاوہ آپ نے دو تاریخی بھی لکھی ہیں جو بہت بڑے پیمانے پر ہیں۔ ایک تاریخ سندھ جس میں آپ نے اسلامی عہد کو عام مسلمات کے خلاف کچھ اور بھی ثابت کر دیا ہے اور اس کی تکمیل کے لیے عربی اور انگریزی تاریخوں کی بہت درجہ گردانی کی ہے۔ دوسری تاریخ ارض مقدس ہو۔ جس میں یہود کے ابتدائی زمانے سے رسول آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک کے حالات بڑی تنقیح و تحقیق سے لکھے ہیں۔

مولانا کا کیریکچر یہ ہے کہ رسم و رواج کے اکثر خلاف رہتے ہیں۔ اور تحقیق و تنقید کی دھن ہے۔ تعلیم سے گریز۔ اور اہل حدیث کے اصول مذہب کی طرف رجحان ہو۔ اگرچہ بعض مسائل میں اپنی تحقیق کی بنا پر اہل حدیث سے بھی علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ آزادی کا خیال غالب ہو۔ اور جو چیز صحیح ثابت ہو جائے اس کے تسلیم کرنے اور اعلائیہ اس کا اعتراف کرنے میں باک نہیں کرتے۔ علمائے زمانہ کی اکثر شکایت کرتے ہیں۔ انھیں اسباب سے اکثر عوام الناس اُن سے سخت مخالفت دیکھتے ہیں۔ پہلی ناراضی لوگوں کو ان سے یہ تھی کہ مستند تاریخوں سے نقل کر کے شائع کر دیا کہ حضرت شہر بانو کا عقد جناب امام حسین کی وفات کے بعد آپ کے صاحبزادے امام زین العابدین نے اپنے غلام ذبیحہ سے کر دیا۔ دوسری مخالفت یہ تھی کہ

بنت حسین کی لائف کی بنیاد پر تھی مگر سب سے زیادہ اختلاف اُس وقت ہوا جب آپ نے سنہ ۱۹۰۷ء میں پردہ عصمت نام ایک رسالہ لکھنے سے شائع کیا جس کی غرض یہ تھی کہ مسلمانوں میں سے پردے کا رسم اٹھا دیا جائے۔ آپ کا دعویٰ تھا کہ پردہ اسلام میں صرف ایک ساتر اور مہذب لباس کا نام ہونا گھر کی چار دیواری میں بند کر دینے کا۔ یہ رسالہ برس دن تک نکلا۔ ہر جگہ سخت اختلاف ہوا۔ مگر اس نے اپنا کام پورا کر دیا۔ اس لیے کہ اُس وقت تک اس مسئلے کو علانیہ کوئی بیان نہیں کر سکتا تھا۔ اور اب ہر جگہ ایک جماعت اس کی طرفدار ہو اور پردے کو توڑنے کی کوشش کر رہی ہے۔

اپریل سنہ ۱۹۰۷ء سے آپ نے ایک نیا پندرہ روزہ رسالہ جاری کرنا شروع کیا جس کا نام "اتحاد" رکھا اور اس کی غرض یہ تھی کہ ہندو مسلمانوں کے باہمی تعلقات صاف کیے جائیں۔

مولانا کے آخر عمر یعنی تقریباً سنہ ۱۹۰۷ء سے سنہ ۱۹۲۶ء اُن کے سال وفات تک کے مزید حالات مختصراً اس طرح پر تقسیم ہو سکتے ہیں (۱) دنگداز اس زمانے میں کئی دفعہ بند ہوا اور پھر جاری ہوا اور بالافعل ان کے صاحبزادے مولوی محمد صدیق حسن صاحب منیر انجمن ترقی اردو اور دنگ بادرکن کی اڈمیری میں لکھنؤ سے نکلتا ہے (۲) جب مولانا محمد علی سنہ ۱۹۱۲ء میں اخبار "ہمدرد" دہلی سے نکالنے والے تھے تو مسکے پہلے انھوں نے اس کی ادارت کے واسطے مولانا کو دس روپیہ ماہوار پر مقرر کیا تھا مگر بعض وجوہ سے مولانا چند ماہ دہلی میں قیام کر کے قبل اخبار نکلنے کے لکھنؤ چلے آئے اور اخبار نہ کر سके کوئی تعلق نہیں رکھا (۳) سنہ ۱۹۱۸ء میں حضور نظام فرماں دہلی دکن خلد اللہ ملکہ نے مولانا کو طلب کر کے ان کو اپنی سوکھنا تیار کرنے کا حکم دیا تھا مگر بعد کو یہ خیال ترک کیا گیا اور بجائے اس کے مولانا "تاریخ اسلام" لکھنے کا امر کیے گئے جس کے واسطے ایک معتد بہ رقم ماہوار اُن کو لکھنؤ گھر بھیجی جاتی تھی۔ یہ کتاب تین جلدوں میں تیار ہوئی جس کی پہلی جلد شائع ہو گئی اور عثمانیہ یونیورسٹی کے نصاب تعلیم میں داخل ہو۔

مولانا کی چھوٹی اور بڑی تصانیف اتنی کثرت سے ہیں کہ وہ اس خاص صفت میں اپنے تمام معاصرین پر گئے سبقت لے گئے تھے اور اُن کی اس کثرت سے تصانیف وہ زمانہ قرونِ ادلی کا یاد آ جاتا ہے

جبکہ تصانیف کی کثرت مختلف طریقوں سے کتب تارنخ و سیر میں بیان کی جاتی تھی مثلاً کسی مصنف کے تراشہ تعلم سے اس کے غسل میت کے واسطے پانی گرم کیا جانا۔ یا کسی شخص کی مصنفہ کتب کا بارگاہی کسی اونٹوں پر ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہلایا جانا وغیرہ۔ غرض کہ مولانا کی تمام تصانیف کی اہم نوبت اس جگہ تفصیل حاصل ہے اس کے واسطے کوئی فہرست کتب یا دل گداز کے آخری اشتہاری صفحات دیکھنا چاہیے۔ یہاں پر ہم ان کے جاری کردہ اخبارات و رسائل اور ان کی تصانیف کی مجموعی تعداد باعتبار ان کے مضامین کے بتا دینا کافی سمجھتے ہیں۔

اخبارات و رسائل

۱۸۸۲ء غایت

۱۸۸۶ء

(۱) محشر ہفتہ وار

(۲) دل گداز ماہوار

(۳) مہذب ہفتہ وار

(۴) پردہ عصمت پندرہ روزہ

(۵) اتحاد " "

(۶) العرفان ماہوار

(۷) دل افروز " "

(۸) ظریف ہفتہ وار

آخر میں چند سال ہوئے ایک ماہوار پرچہ "نورخ" کے نام سے بھی نکالا تھا۔

تصانیف

۲۱

سوانح عمریاں مثلاً "ابوبکر شبلی" "جنید بغدادی" وغیرہ

۲۸

تاریخی ناول مثلاً "ایام عرب" "بابک خرمی" وغیرہ

خیالی ناول حسن کا ڈاکو، غیب داں دو لہن وغیرہ ۱۴
تاریخ مثلاً تاریخ سندھ، عصر قدیم وغیرہ ۱۵
تظم و دراما مثلاً شہید وفا، شب غم، شب وصل وغیرہ ۶
متفرق ۱۸ کل ۱۰۲

مولانا کے مضامین جو "دل گداز" میں چھپے ہیں سید مبارک علی شاہ تاجر کتب لاہور نے اٹھ جلدوں میں "مضامین شرع" کے نام سے حال ہی میں شائع کیے ہیں یہ سب کتابیں نہایت دلچسپ اور پڑھنے کے لائق ہیں مگر علی الخصوص وہ جلد جس میں قدیم لکھنؤ کے حالات جو ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ کے نام سے دل گداز میں چھپتے رہے دیکھنے کے لائق ہو۔ اور ان لوگوں کے لیے جو لکھنؤ کی پرانی تاریخ اور دلچسپیوں کے جوہر ہیں نہایت مفید اور پُر از معلومات ہو۔

مرزا محمد ہادی رسوا ^{۱۸} مرزا محمد ہادی بی اے۔ پی ایچ اڈی۔ متخلص بمزاد رسوا فن شعر میں مرزا ادب مرحوم کے شاگرد ہیں۔ مرزا صاحب جوانی میں مرزا غالب کے رنگ کو بہت پسند کرتے تھے اور دیوان غالب ان کو قریب قریب کل حفظ تھا۔ مگر غالب کی نازک خیالیاں اور عبارت آرائی ان کو زیادہ مرغوب نہیں بلکہ کلام نہایت صاف سادہ اور لطیف تخیل سے معمور ہوتا ہے۔ اس صفائی اور سادگی میں وہ مومن کے مزاج البتہ کے جاسکتے ہیں۔ مرزا صاحب کی معرکہ آراء تصنیف ان کی ناول "امراؤ جان ادا" ہی جس کو لکھے ہوئے تقریباً پچیس تیس برس ہوئے ہوں گے۔ یہ نہایت اعلیٰ درجے کا ناول ہے اور اس کی عبارت نہایت اسی درجے کی ہے۔ سب سے بڑی صفت اس میں یہ ہے کہ جو ارد کے بہت کم ناولوں میں ملی جاتی ہے کہ اس کا پلاٹ یعنی ترتیب قصہ نہایت باقاعدہ اور منظم اور اس کے کیرکٹر (شخصات قصہ) صاف واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ ہم نے کسی ناول میں اتنی دلچسپی اتنی کثرت واقعات اور فطرت انسانی کی اتنی صحیح تصویر نہیں دیکھی۔ اس میں اس زمانے کی طرز معاشرت اور سماجی کے ہوئے نقشے کھینچے گئے ہیں جن میں کسی قسم کا سرائے یا آدرش نہیں ہے۔ مرزا صاحب کی دیگر تصانیف ان کے شہزادی بہار و صبح امید مرقعہ لیلیٰ جنوں دراما اور ذات شریف (ناول) وغیرہ ہیں۔ مرزا صاحب بالفعل شہانہ یونیورسٹی کے دارالترجمہ میں ٹیچر ہیں۔

حکیم محمد علی | حکیم محمد علی تخلص بہ طبیب جن کا تھوڑا عرصہ ہوا کہ انتقال ہو گیا ایک مشہور ناول نگار تھے۔
مذہبہ ذیل ناول ان کی تصنیف سے ہیں۔ عبرت جن سردار۔ دیول دیوی۔ گودا۔ رام پیادی جعفر
عباس۔ اختر حسینہ۔ وغیرہ بعض ناول انگریزی کتابوں کے ترجمے ہیں۔ مثلاً نیل کا سانپ جو ڈاکٹر سکرڈ
کی کلو پیٹر کا ترجمہ ہو۔ اور دیول دیوی اور جعفر عباسہ تارخی ناول ہیں۔ حکیم صاحب کو اپنے اقران اشراف
میں ممتاز تھے مگر اعلیٰ درجے کے ناول نگار نہیں کہے جاسکتے اس وجہ سے کہ وہ زمانے کے رنگ سے بھر
تھے اور نہ وہ اُس زمانہ یا اُس سوسائٹی کے حالات سے واقف تھے جس کی وہ تصویریں کھینچتے تھے فطرت
انسانی سے وہ پوری طرح باخبر نہیں اور لطیف جذبات کے بھی ماہر نہ تھے عبارت میں یک رنگی ہو اور
پند و نصائح سے اور ہی اُسے غیر دلچسپ بے اثر کر دیتے ہیں۔

باشداغیری^۱ | ناول نویسی میں مولانا نذیر احمد صاحب کے صحیح جانشین کہے جاتے ہیں۔ ان کی توجہ زیادہ
غوروں کی تعلیم ارتقی اور ان کے مصائب زندگی پر مبذول ہو۔ چونکہ عبارت نہایت درد انگیز اور
تاثیر سے لبریز ہوتی ہے لہذا مصوّر غم کے لقب سے مشہور ہیں۔ کثیر التصانیف ہیں۔ بعض مشہور تصانیف
کے نام حسب ذیل ہیں۔ صبحِ زندگی۔ شامِ زندگی۔ نوحدِ زندگی۔ عروسِ کو بلا۔ زہرہ مغرب وغیرہ۔

نیا ذنجیوری^۲ | اردو کے مشہور و مشاق ادیب جرنلسٹ نیا ذنجیوری۔ وطن فتنہ (یو اے پی)
سال ولادت ۱۸۸۰ء۔ ابتدائی تعلیم فارسی و عربی گھر پر ہوئی پھر مدرسہ اسلامیہ فتنہ و مدرسہ عالیہ ساہیوال
مدرسہ العلماء کے دارالعلوم میں فراغت حاصل کر کے حدیث مولانا عین القضاۃ صاحب لکھنؤ سے
پڑھی۔ انگریزی تعلیم ایف اے تک پرائیوٹ طور پر حاصل کی اور ترکی زبان ایک تہک سے پڑھی مختلف
روزانہ اخبارات میں کام کیا اب سات سال سے نگار، ایک ادبی علمی رسالہ جاری کیا ہو جو پہلے بھوپال
اور اب لکھنؤ سے جاری ہے۔

تصانیف۔ صحابیات گوارہ تمدن، نگارستان، بعض ادبی مضامین کا مجموعہ ہوا جذبات بھاشا
شہاب کی سرگزشت اشعار کا انجم، المسئلۃ الشرعیہ، عرضِ نعمہ، ترجمہ گیتانِ حلی
ہر زنجیور | آپ کا طرزِ تحریر سب سے علمودہ جو ادراپ معمولی سیدھی سادی عبارت سے نظم و نثر کو زیادہ

پسند کرتے ہیں مگر بعض موقعوں پر جب یہ رنگ حد اعتدال سے بڑھ جاتا ہو تو عبارت بالکل اور بے لطف معلوم ہونے لگتی ہے۔ عبارت اور مضمون میں چولی دامن کا ساتھ ہے لہذا اس قسم کی عبارت کو صرف انھیں مضامین پر صرف کرنا چاہئے جو اس کے شعل ہو سکیں مگر یہ بات ضرور قابل قدر ہو کہ آپ نے قدیم طرز انشا پر ازلی کو چھوڑ کر اپنے واسطے ایک نئی شاہراہ قائم کی ہو۔ آپ نے ٹکد کی گینان جلی کا اردو میں ترجمہ کیا ہو اور رومی اور یونانی علم الاضنام سے بھی آپ کبھی کبھی فائدہ اٹھانے ہیں۔ کیو پٹر اور سائیکل اور مریخ سیاہ کی ڈاری انگریزی کے ترجمے معلوم ہوتے ہیں آپ کی بعض کتابیں مثلاً "شاعر کا انجام" اور "گہوارہ تمدن" جس میں ترقی تمدن میں محدثوں کے حصہ لینے کی بحث ہے نہایت عمدہ اور عجیب کتابیں ہیں۔ آپ کا رسالہ "گار" ایک نہایت ممتاز ادبی رسالہ ہو جس کے اکثر مضامین جو آپ کے زور قلم کا نتیجہ ہوتے ہیں نہایت اعلیٰ درجے کے اور پڑھنے کے قابل ہوتے ہیں۔

خواجہ حسن نظامی خواجہ حسن نظامی دہلی میں سنہ ۱۲۹۹ھ میں پیدا ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کی ولادت درگاہ فلک باد گاہ حضرت نظام الدین اولیاء میں ہوئی۔ خواجہ صاحب ابتداً بچپن سے اخراجات میں مضامین لکھا کرتے تھے۔ کچھ عرصہ تک گورنمنٹ ان کو بطور شریک دیکھتی رہی اور ایسٹن کی نگرانی کرتی تھی وہ بوجہ اپنے مرتبہ اور نیز بوجہ صوفی صافی ہونے کے بہت با اثر شخص ہیں۔ پچاس سے زیادہ کتب اور رسائل کے مصنف ہیں جن میں سے بعض بہت اچھے ہیں۔ آپ کی یہ خصوصیت ہو کہ معمولی معمولی مضامین اور خیالات کو نہایت دلکش اور مؤثر طریقے سے ادا کرتے ہیں اور الفاظ نئے نئے اور عجیب وضع کرتے ہیں۔ آپ کی عبارت نہایت سادہ سلیس اور دل کش ہوتی ہے مگر خیالات میں گہرائی نہیں ہوتی آپ نے تقریباً دس کتابیں غزل کے بارے میں ضائع کی ہیں جس میں سے بعض ترجمے ہیں اور بعض معنی دہا شاہ دہلی کی اولاد کی پریشان گردیوں کے افسوسناک اور مہربان حالات ہیں۔ آپ کی کتاب کرشن مہتی کو اہل اسلام اور خصوصاً ارباب تصوف بہت پسند کرتے ہیں۔ بعض دیگر تصانیف حسب ذیل ہیں مثلاً "محرر نامہ" "یزید نامہ" "بیوی کی تعلیم" "اولاد کی شادی" "جگ مٹی کی کھانیاں وغیرہ۔"

۱۔ یہ ترجمے نہیں ہیں بلکہ طبع ازاد مضامین ہیں۔

پیریم چیتل میدان قصہ گوئی کے مشہور شہسوار ہیں۔ اصلی نام دھپنت رائے ہو۔ پیریم چند کے لقب سے مشہور ہیں ۱۹۳۷ء سمیت سن ولادت ہو۔ آپ کے والد منشی عجبائے لال بنارس کے قریب موضع پاندوہ کے رہنے والے تھے فارسی کی تعلیم تقریباً سات آٹھ برس حاصل کر کے انگریزی شروع کی اور بنارس کالجیٹ اسکول میں داخل ہوئے جہاں سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ سات برس کی عمر میں ماں کا اور پندرہ برس کی عمر میں باپ کا یہ سر سے اٹھ گیا۔ شروع میں اپنے صیغہ تعلیم میں ملازمت کرتی تھی مگر درس و تدریس کا سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رہا۔ آپ کی ادبی زندگی ۱۹۰۱ء سے شروع ہوتی ہے جب تک آپ نے زمانہ میں مضامین لکھنا شروع کیے ۱۹۰۷ء میں ایک ہندی ناول ”پرپا“ لکھا جو ان پریس الہ آباد سے شائع ہوا۔ ۱۹۱۲ء میں جلوہ ایشاد اور ۱۹۱۸ء میں بانا حسن ہر دو حصہ تصنیف کئے۔

عمل اردو کے آپ کو ہندی میں بھی کمال حاصل ہو چنانچہ سیواسدن، پیریم آشرم، رنگ بھوم اور لایا مشہور پ کے مشہور ناول ہیں جن کے اردو ترجمے بھی سنا گیا ہو کہ عنقریب شائع ہوں گے۔ رنگ بھوم علی گڑھ ایک نہایت دلکش ناول ہو۔ آپ کا تاریخی ڈراما کرلار سال زمانہ میں باقراطھکٹارہ منشی صاحب موصوف چھوٹے چھوٹے قصے لکھنے میں یدِ طولی رکھتے ہیں۔ اور حق یہ ہو کہ آپ کے اس قسم کے افسانے اس زمانہ کے کثیر التعداد نام نہاد ناولوں کے ساتھ ہی نسبت رکھتے ہیں جو بچے نگیںوں کو چھوٹے پتھروں کے ساتھ ہوتی ہو۔ آپ کو دیگر ناول نگاروں پر یہ فوقیت حاصل ہو کہ آپ نے ہندوستانی دیہات کے مہوہ نقشے اور یہاں کے کسانوں کے سچے سچے واقعات نہایت عمدہ طریق سے اپنے ناولوں میں بیان کیے ہیں۔ آپ کبھی مبالغے کو اپنی تصانیف میں پاس نہیں لے دیتے اور نہ کبھی حق اور سچائی سے انحراف کرتے ہیں۔

آپ کی عبارت میں سید آمد اور ذور معلوم ہوتا ہے لطیف استعارات اور تشبیہوں سے عبارت کی خوبی اور بڑھ جاتی ہے جیسا کہ اوپر لکھا گیا آپ کو اردو ہندی دونوں زبانوں پر عبور حاصل ہو اور ساتھ ہی اس کے جذبات و نفسیات انسانی کے بھی پورے ماہر ہیں آپ کے کلام میں کہیں ظرافت اور کہیں درد و مہم رنگ دکھاتا ہو

سیواسدن کا ترجمہ بانا حسن کے نام سے شائع ہو گیا ہے رنگ بھوم کے ترجمہ کا پلا حصہ چوگان ہستی کے نام سے شائع ہوا ہے دوسرا حصہ بھی عنقریب شائع ہو گا ۱۲۔

جیسے کہ دھوپ اور چھاؤں۔ آپ کے کیرکٹرنائٹ مخصوص جتنی جاگتی تصویریں ہوتی ہیں۔ آپ کا ناول
 بازار حسن جو دو جلدوں میں ہے ایک طویل کتاب ہے مگر دل چسپی میں کم نہیں ہے۔ اگر آپ کے اس قسم
 کے ادبی اشتغال جاری رہے تو کچھ عرصے میں آپ بڑی ترقی حاصل کریں گے تھوڑے عرصہ سے بوجہ
 اردو کی ناقصی کے آپ ہندی کی طرف زیادہ توجہ فرما رہے ہیں۔ آپ کے خیالات شہل اور پرنسپل
 معاملات میں بہت اعلیٰ درجے ہیں۔ آپ کے مضامین منہ و مسلم اتحاد اور دو وجد بد جو زمانہ میں نکلے
 تھے خاص طور پر پڑھنے کے قابل ہیں۔ آپ کی تصانیف علاوہ مکتبہ مذکورہ بالا کے پریم پبلیشرز حصہ
 اول و دوم اور پریم پبلیشرز حصہ اول و دوم چھوٹے چھوٹے قصوں کا مجموعہ ہیں۔ خواب خیال بھی عالی
 میں پنجاب سے شائع ہوا اور فردوس بریں انڈین پریس شائع کر رہا ہے۔
 سدرشن آپ بھی ایک مشہور افسانہ نگار ہیں اور پنجاب کے تعلق رکھتے ہیں۔ منشی پریم چند کی بعض خصوصیات
 آپ میں بھی موجود ہیں مگر ان سے کم دیر پر۔ آپ میں وہ استاد ادبی کمال نہیں ہوا اور نہ عبارت
 میں اس قدر ادمیت اور صحت ہو۔ آپ کی تصانیف حسبِ میل ہیں (۱) محبت کا انتقام ایک انعامی
 رسالہ جس پر پنجاب گورنمنٹ نے پانچ سو روپیہ انعام دیا۔ پہلے ہندی میں لکھا تھا اس کے بعد اس کا
 ترجمہ اردو میں ہوا (۲) چندن اس پر خواجہ حسن نظامی نے دیباچہ لکھا ہو۔ پندرہ چھوٹے چھوٹے قصوں
 کا مجموعہ ہو (۳) بہار شان اس پر منشی پریم چند نے دیباچہ لکھا ہو۔ یہ بھی چھوٹے چھوٹے قصوں کا مجموعہ ہے۔
 (۴) و (۵) تہذیب کے تازیانے اور بہر بلا آب حیات بنکچندر چٹسری کے بعض مضامین و ناول کے ترجمے ہیں
 (۶) ہورت کی محبت ایک بنگالی مصنف کی کتاب کا ترجمہ ہو (۷) بے گناہ مجرم، بنگالی اور فرنچ ناول
 سے لیا گیا ہے (۸) سدا بہار پھول مختصر قصوں کا مجموعہ ہے۔

دیگر ناول نویس انی زمانہ ناول نگاروں اور چھوٹے چھوٹے قصے لکھنے والوں کی اتنی کثرت ہو گئی ہو
 کہ ان سب کے نام بتانا بھی ایک امر محال معلوم ہوتا ہو۔ بہر طور اصحابِ میل ان سب لوگوں میں زیادہ شہور
 و ممتاز ہیں (۱) حامد اللہ آفسر میٹھی۔ جو علاوہ ایک عمدہ شاعر اور نقاد ہونے کے ازلے لکھنے میں بھی
 بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ ان کی اکثر کتابیں سرشتہ تعلیم میں بھی داخل ہیں۔ ایک مجموعہ قصوں میں ان کی کا جو

اور دیگر قصص شامل ہیں تیار ہو رہا ہے۔ (۲) بمبؤں کو رکھو دی (۳) احمد خاں اید میر شاہ اردو
(۴) سید عابد علی (۵) حکیم شجاع الدین (۶) مولوی ظفر عمر صاحب پیر نڈنٹ پولیس ممالک متحدہ۔
جاسوسی کے قصے لکھنے میں خاص مہارت رکھتے ہیں۔ آپ کے ناول نیلی چھتری، بہرام کی گرفتاری بہت
مشہور و مقبول ہیں۔ ان کے علاوہ بعض قابل خواتین نے بھی اس فن کی طرف توجہ کی ہے اور صوبہ
پنجاب سے بعض بہت دلچسپ قصے عورتوں کے لکھے ہوئے شائع ہوئے ہیں۔

باب

اردو ڈراما

اردو ڈراما اردو ڈراما ایک غیر ملکی پودھا ہو جو سرزمین اردو پر انیسویں صدی کے وسط میں نصب
کیا گیا اور اب خوب چوہا پکڑا گیا اور نہایت تندرست اور تنومند معلوم ہوتا ہے۔
ڈراما کی عمر بیسٹھ یا کمات یعنی نقالی کا شوق ہر قوم میں فطری ہو عام اس سے کہ وہ قوم ترقی کی معراج پر
ہو یا بریت اور گمراہی کے گڑھے میں پڑی ہو۔ نقالی انسانی فطرت میں داخل ہو۔ البتہ بعض ممالک
میں یہ جوش و بادیا گیا اور بدعت کہلایا۔ اہل سلام اسی چیز یعنی نقالی کو جس میں ڈراما بیت تراشی،
تصویر کشی، رقص اور موسیقی سب داخل ہو ممنوع سمجھتے ہیں۔ پس ان کے ممالک میں فن فن لطیفہ کی نشوونما اور
ترقی کو گویا بدعت یا انحراف سنت کی تاریخ سمجھا چاہئے۔ اسی وجہ سے فارسی سے اس قسم کے کوئی نمونہ
اردو کو نہیں ملے۔ مگر خود فارسی اس نقالی کے جذبے سے محفوظ نہ رہ سکی وہاں ڈراما نے پیش پلے (مرثیہ)
کی صورت اختیار کر لی جس میں میدان کر بلا میں حضرت امام حسینؑ کی شہادت پر اظہارِ رنج و غم کیا جانے لگا رہا ہے
زمانہ قدیم میں عصر غالب تھا اب ڈراما اور دیگر اصناف ادب کو ذریعہ تبلیغ قرار دینے لگا۔ اہل یورپ اور اہل انگلستان
کے مرکل پلے (ایسے سین جن میں معجزات دکھائے جاتے ہیں) اور ہیکل پلے (ایسے سین جن میں اسرار دکھائے جاتے
ہیں) جو قدیم کلیائے عیسائی کے رسوم اور طریقہ عبادت کے منظر ہیں اسی طرح مسکرت اور ہندی کے

مذہبی ڈراما جو پُرانوں اور دیگر مذہبی کتب ہنود سے اخذ کیے گئے ہیں اور ادھر امر کے پیشین پے ان سے کیا
 اخذ وہی قدیم مذہبی اعتقادات ہیں۔ ہندوستان میں اب تک مذہب کا بہت بڑا اثر ڈراما پر ہو چکا ہے۔ پُران اور دیگر
 مذہبی کتب کے قصے ڈراما کی صورت میں آکر اپنے خوبصورت پردوں پر دلچسپ موسیقی اور اخلاقی نتائج
 سے اب بھی ہزاروں آدمیوں کے دلکشی اور تفریح کا باعث ہوتے ہیں۔

سنسکرت اور ہندی ڈرامے ہندوستان میں دھاما اور جہ کمال تک پہنچ گیا تھا پس قدیم سنسکرت ڈراما کو
 اردو پر کیوں نہیں اثر کیا جو اپنے عروج تک پہنچ گیا تھا اور ڈراما پر کچھ نہ کچھ ضرور اثر کرنا چاہیے
 تھا۔ مگر نہایت افسوس ہو کہ جس طرح اردو فن نظم سنسکرت کے اثر سے محفوظ رہا اسی طرح فن ڈراما بھی
 اس کا کوئی اثر نہ پڑا۔ سنسکرت کے ان دونوں خزانوں سے اردو نے کوئی نام نہ نہ اٹھایا جن کی وہ حقیقی
 وارث تھی۔ اس کی وجہ یہ ہو کہ سنسکرت ڈراما کا زین دور گزر چکا تھا اور اب ایک تن بے جان اور محض
 کتابوں میں محفوظ تھا۔ اس کے شاہکار ہندوستان کی دیسی زبانوں میں محفوظ تھے اس کا گھل (ایکٹنگ) بھی
 معروف ہو چکا تھا شروع میں بودھ مت اور جینی ڈراما کو اپنا پسند کرتے تھے مگر اُس کی بنا کو دیکھ کر وہ ان کے
 دینی مسائل کے پھیلانے کا ایک اچھا ذریعہ ہو کہ بھی اس کی قدر کرنے لگے اور بودھ مت کا ڈراما تو راجہ
 ہرش اور اشوک کے زمانے میں بڑی ترقی کر گیا تھا جب بودھ مت کو زوال اور برہمنوں کی ترقی ہوئی
 تو ڈراما اپنا پرانا عروج حاصل نہ کر سکا۔ اس وجہ سے کہ غیر اقوام کے حملوں اور قوم کی مفلسی سے ملک میں
 ایک بے اطمینانی کی حالت پھیل گئی تھی۔ اب ڈراما کی طرف لوگوں کی توجہ کم ہو گئی اور وہ اُس کی بُرائی
 نشان و شوکت جاتی رہی۔ اور جب ادنیٰ درجہ کے لوگوں نے نائک کی کینیاں کھول لیں تو ڈراما کی رہی
 سہی عورت جاتی رہی۔ اکیڑ لوگ قدر کی نگاہوں سے نہیں دیکھے جاتے تھے اور مضمون بھی ادنیٰ درجے
 کے بعض وقت فحش کی حد تک پہنچ جاتے تھے۔ اس زمانے میں اردو اپنا جنم لے رہی تھی سنسکرت ڈراما محض
 لہ اور امر گوبرنی میں ایک مقام ہے جہاں مقررہ اوقات پر حضرت مسیح کے حالات زندگی ٹالک کی صورت میں
 اسی طرح دکھائے جاتے تھے جس طرح ہمارے یہاں رام لیلہ ہوتی ہے۔ ہزاروں آدمی اس مذہبی تماشے کو دیکھنے کو وہ
 دور سے آتے تھے معلوم نہیں کہ اس تہذیب تمدن کے زمانے میں بھی اس قسم کا اجتماع ہوتا ہو یا نہیں۔

ایک کتبہ چیز یہ گیا تھا اور ہندی ڈراما ادنیٰ درجے کا اور ذلیل ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ اردو زبان ابتدا ہی سے فارسی کے آغوش محبت میں آگئی تھی اس کی تسلی حال نے سگی ماں کو گونے میں بٹھا دیا تھا۔ فارسی روایات فارسی محاورے فارسی نثر اور دیرغالب تھے فارسی ادیب اس فزائیدہ بچے کو پیار کرتے تھے اور وہ فارسی تہذیب تمدن کے سرچشمہ سے سیراب ہوتا تھا۔ سنسکرت ادیبوں کی غفلت اور بے توجہی کے سبب طفل زبان مسلمانوں ہی کی گود میں پلنے لگا فارسی زبان دان سنسکرت سے ناواقف تھے۔ اسی وجہ سے سنسکرت ڈراما اور فن نظم و نثر بے اثر رہا۔ اگر یہ لوگ بھاشا اور سنسکرت کی قدر کرتے یا اگر پڑت لوگ اردو کی پردکش زیادہ محبت سے کرتے تو کج یہ حالت نہ ہوتی۔ اور اردو زبان اپنے اکثر نکتہ چلیوں کو دندان شکن جواب دیتی۔

اردو ڈراما کے عناصر خمسہ | مہر علی شاہ یوسف علی آئی، اسی، ایس۔ نے ایک فاضلانہ مضمون میں اردو ڈراما کے عناصر ترکیبی حسبِ میلِ قائم کیے ہیں:- (۱) قدیم سنسکرت ڈراما (۲) اہل ہندو کے خالص مذہبی ناکم یا مریکل پلے اور دیوتاؤں اور دیویوں کے حالات (۳) وہ چیزیں جو ادنیٰ درجے کے لوگوں میں جہاوری ہیں۔ مثلاً سو اچک نو ٹنگی نقیض وغیرہ (۴) اسلامی نقیض اور قدیم روایات (۵) زمانہ موجودہ کا انگریزی ڈراما اور یورپین ایلیج کی ترقیاں۔

سنسکرت ڈراما | ہر چند کہ قدیم سنسکرت ڈراما کا اردو ڈراما پر بہت کم اثر پڑا مگر پھر بھی بعض مشہور ناٹکوں کا ترجمہ اردو میں ہو گیا ہے اور وہ کھیلنے کے قابل کر دیے گئے ہیں۔ تھوڑے عرصہ سے ڈراما کے پرانے قواعد بھی استعمال میں آ رہے ہیں خاص کر وہ جو ہندی سین کے متعلق ہیں مثلاً ناٹک شروع ہونے سے پہلے ایک شخص جو سو تر دھار کہلاتا ہے مع اپنی بیوی کے ایلیج پر آتا ہوا در تماشہ کے تمام واقعات کو مختصر طور پر بتلا دیتا ہے اور لوگوں کو آگاہ کر دیتا ہے کہ اب اصل کھیل شروع ہونے والا ہے۔ بدو یعنی مسخرے کا پاٹ بھی ضرور ہوتا ہے مگر اچھے تماشوں میں یہ بالکل علیحدہ رہتا ہے اور تماشہ کے اصل واقعات سے اس کو تعلق نہیں ہوتا۔

ہندو مریکل پلے وغیرہ | اس قسم کے ناٹکوں نے بھی موجودہ اردو ڈراما کے واسطے بہت کچھ مواد فراہم کر دیا ہے۔

ان کی نسبت اردو ڈراما کے ساتھ وہی ہے جو بالنتیض اردو ہال کے پرانے قصوں اور مورخ ہلوٹارک کے
 کی قدیم یونانی مشہور لوگوں کی سوانح عمریوں کی شکسیر کے ناٹکوں کے ساتھ ہے اگر غور سے دیکھا جائے تو
 اردو ڈراما کی ابتدا ہی اس قسم کی ہندی چیزوں سے ہوئی تھی، قدیم زمانہ سے ہندو لوگ رام اور کرشن
 کے مشہور واقعات زندگی کو تیار کرنے کے موقع پر مندروں میں ناٹک کی صورت میں لوگوں کو دکھایا
 کرتے تھے تاکہ وہ اپنے مذہبی روایات سے واقف ہوں ان سے ابھی ابھی بانیں کھینچیں اور اپنے دیوتاؤں اور
 سوامیوں کے واقعات زندگی سے مفید سبق حاصل کریں رامائن کے واقعات دسہرہ کے زمانے میں جب کہ
 رام چندر جی اپنے حریف راوَن پر فتح پاک بھارت درخس میں واپس آئے تھے، اسی قسم سے ہیں اور اس جگہ پر
 ناٹک رام ناٹک اور رامائن کے نام سے مشہور ہیں اور ہندی لوگوں اور علی الخصوص عورتوں کو بہت پسند
 آتے ہیں۔ اسی طرح کرشن جی کے عاشقانہ گیت بھی اردو ڈراما کا جز ہیں۔ سچ پوچھئے تو جس قدر عاشقانہ
 اور جذباتی شاعری ہندی اور بنگالی میں بالفعل ہے اس کا زیادہ تر حصہ کرشن اور رادھا کے عشق پر مبنی
 بہت سی ایسی کہانیاں جو منڈلی کہلاتی ہیں مہار اور بندر بن وغیرہ متبرک مقاموں سے چل کر راتے ہیں
 اپنے مذہبی گانوں اور تماشوں سے لوگوں کے دلوں کو مغلطہ کرتی ہیں۔ ناج اور گانا ان تماشوں کی
 جان ہوتی ہیں۔ اس قسم کی کہانیاں دو تہہ اور تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے نہیں بلکہ عوام الناس کی دیکھی کے لیے
 ہیں۔ یہ لوگ جگہ جگہ کی سیر کرتے پھرتے ہیں جہاں پہنچتے ہی فوراً ایک بیچ تیار کر لیتے اور کپڑے اور دھڑ
 سے مانگ جانچ کر مٹیا کر لیتے ہیں اپنے چہروں کو رنگتے اور چراغوں یا شعلوں کی روشنی میں اپنے تماشے
 دکھاتے ہیں اور آخر میں دودھ چار چار پیسے لوگوں سے وصول کرتے ہیں۔ مولانا غنیٹ کشمیری نے اپنی مشہور
 شہرہ آفاق شہر نگ عشق، میں ان جماعتوں کا جن کو وہ بھگت باز کہتے ہیں خوب کارا ایا ہو۔ غالباً انھیں جماعتوں
 سے ماہر علی شاہ نے جو اپنی پیش پرستیوں کے لیے مشہور تھے، ناٹک کا پہلا سبق سیکھا ہو گا۔ اودہ ان کو
 ان کے ذہنی مغلطوں کے قدیم مورخ سولہویں صدی عیسوی میں گزرتے ہیں ان کے ذہنی قصوں کو جن کو انیکل کہتے ہیں شکسیر نے
 اپنے مذہبی ڈراموں میں بہت مدد کی ہو گی۔ مشہور یونانی مورخ جو ظالم شہزادہ نیر کا معاصر تھا۔ آفریقا میں پیدا ہوا
 اس کی کتاب انوار سوانح عیساں زمانہ قدیم کی ایک مشہور اور مستند تاریخ سمجھی جاتی ہے جس میں جھانپیں بڑے شے یونانی
 اور رومی شاعری کے حالات بمقامہ نہایت وضاحت سے لکھے گئے ہیں اس کی دوسری کتاب مورخا توحی رساؤں کا مجموعہ ہے۔

بہت پسند کیا ہوگا پھر انھوں نے ہلک اور برس خود قائم کر لیے جس میں وہ خود گنہگار اور ان کے محل کی عورتیں
 نہایت قیمتی اور زرق برق لباس میں گویاں بنا کرتی تھیں۔ ہمارے نزدیک نیچ اور گناہ اور
 ڈراما کا جزو دلائل تک ہو نہیں سکتا لیوں سے لیا گیا ہو اور ممکن ہے کہ فریج اور پکا بھی اس پر کچھ
 اثر ہو کہ نہ واحد علی شامہ کے عہد میں ان کے یورپین دوستوں کی وجہ سے یہ وہاں متروک ہو گیا تھا۔
 سوانگ نقییس وغیرہ اسوانگ کی ہندوستان میں وہی حیثیت ہو جو پنچبٹ کی انگریزی ڈراما کی
 ترقی کے پیشتر انگلستان میں تھی۔ سوانگ ہندو تہواروں کے موقع پر جلوس اور باجوں کے ساتھ مہکتے
 ہیں۔ ان کو ابتدائی بھٹی نقالی سمجھا جاتا ہے مگر عنصر ظرافت (کامک) ان میں ضرور پایا جاتا ہے اور اپنے
 زمانے کے نقال یا مسخرے امیر لوگوں کی صحبت یا ملازمت میں رہتے تھے اور اپنی ظریفانہ باتوں اور نقلوں
 سے اپنے مالکوں کا دل خوش کیا کرتے تھے۔ نقالی اس زمانے میں ایک مشکل فن تھا جو خاص تربیت اور
 محنت سے آتا تھا اور اس کی تکمیل کے واسطے گانا ناچنا بھی ضروری سمجھا جاتا تھا۔ نقالوں کی وہی
 حیثیت تھی جو انگلستان میں ملکہ ایلزبتھ کے زمانے میں مرے دربار کے مصاحبین اور ملازمین کی تھی جو جانا
 میں نکلا کرتے تھے اور اپنے گانے بجانے اور مسخرے پن سے لوگوں کو خوش کرتے تھے۔ لوگوں کا خیال ہو کہ یہی
 پھر نے دلی نقال کینیاں عہد الزبتھ کے ترقی یافتہ ڈراما کی اصلی پیشرو تھیں۔ ہندوستان میں نقالوں کی حیثیت
 طائفہ کلام سے مشورہیں جو شاہی بیا کے موقعوں پر بہ اجرت بلائے جاتے ہیں اور اپنے ناچ گانے اور مذاق کی
 باتوں سے سامعین کو محظوظ کرتے ہیں انھیں پرانے زمانے کی نقلوں سے آجکل کے تماشاؤں کے کام اور نقلیں خود ہیں
 اسلامی نقییس اور دایات | یہ اور ڈراما کا عنصر غالب ہیں۔ نظم اور عاشقانہ رنگ اور ڈراما نگاری کے لیے
 ایک خاص استعداد اور موزونیت رکھتی ہو۔ قدیم ڈراما نہایت موثر پردہ اور پختہ سوزی کی عاشقانہ نظموں
 میں ہوتے تھے۔ ان کی ترنم تھی اور شعر دونوں موثر ہیں۔ زبان اردو بڑی زوردار چیز ہے اس کا طرز ادا
 اس کے منافع بدائع نہایت دلکش اور قابل تعریف ہیں۔ وہ دردم دہم دونوں موقعوں کے لیے موزوں
 اور جذبات نگاری کے لیے بھی پوری طرح مناسب ہو۔

انگریزی پیش | اس کا اثر زمانہ حال کے اردو ڈراما پر سب سے زیادہ ہو۔ اردو اسٹیج آج کل انگریزی انھوں کے

ترجموں سے بھری ہوئی ہے۔ ایسے کی وضع ٹھیکر کی ساخت پر دیے لباس نشستوں کا طریقہ متاثرہ کے
تقسیم یاد آؤں کا انتظام یہ سب بالکل انگریزی اصول کے مطابق اور اسی کے زیر اثر ہیں۔
اردو ڈراما کے اقسام (۱) اردو ڈراما مستقل تصانیف اور تراجم پر مشتمل ہے۔ اول الذکر کی تعداد نسبتاً کم
ہے اور جو ہیں وہ کسی پولیٹیکل یا سوشل مبحث پر مبنی ہیں۔ تراجم کے ماخذ حسب ذیل ہیں:-
(۱) سنسکرت (۲) انگریزی یا اردو کوئی یورپی زبان بذریعہ ترجمہ انگریزی (۳) فارسی فقے (۴) دہلی
زبانیں علی الخصوص بنگلہ، مرہٹی اور زیادہ تر ہندی۔

قصوں کے مضامین حسب ذیل چیزوں سے ماخوذ ہیں:-

(۱) اپوران اور سندھ و لومالا (۲) فارسی اور عربی قصے (۳) ہندوستان کے مشہور قدیمی روایتیں اور
قصے (۴) انگریزی قصے (۵) مسائل حاضرہ یعنی کوئی پولیٹیکل مسئلہ یا سوشل خرابیاں۔
اردو ڈراما پر شاہی دربار کی اثر اسب سے پہلا اردو ڈراما اندر سمجھا ہے جس کو امانت شاگرذناخ نے
تصنیف کیا تھا جو عہد احمد علی شاہ میں دربار شاہی سے تعلق رکھتے تھے اور مشہور ہے کہ یہ کتاب بادشاہ
ہی کے حکم سے تیار کی گئی تھی۔ ایک ہندی شاعر فاذا نای نے فرخ سیر بادشاہ دہلی کے عہد میں مشہور
مصدق شگنٹلا ناک کا زبان برج بھاشہ میں ترجمہ کیا تھا مگر خود اس ترجمہ کو ڈراما سمجھا غلطی ہو اس وجہ
سے کہ ذریعہ ترجمہ ایک صحیح ترجمہ ہو کیونکہ وہ ہوں کی صورت میں ہو اور نہ اس میں ڈراما کی جہان باقی رہی
کیونکہ اشخاص قصہ جس طرح کہ ڈراما میں دستور ہوتے جاتے نہیں اور نہ اس میں گیر کٹر اور ایکشن کا کہیں پتہ ہو
اس وجہ سے نہ تو وہ ڈراما ہو اور نہ اس کا تعلق اردو سے ہو سکتا ہو جیسا دیرند کو وہ زمانہ شاہی۔
نقالوں اور ہر روپوں کا بڑا رواج تھا ان کی نقلوں سے لوگ خوش ہو کر ان کو افعام و کرام میں لایا
کرتے تھے مشہور ہے کہ محمد شاہ بادشاہ دہلی جو اپنے ناک رنگ اور عشرت پرستیوں کی وجہ سے محمد شاہ
کے نام سے مشہور ہیں اپنے اسی قسم کے اشتغال میں مصروف تھے کہ نادر شاہ کا حملہ دہلی پر ہوا محبت شاہی
میں غنی ہونے کے ڈر سے کوئی شخص اس بُری خبر کو اپنے منہ سے نہیں لے سکتا تھا عموماً ایک نقال کے

اسے دیکھ کر زبٹ صفحہ ۱۴۷۔

ذریعہ سے یہ خبر بادشاہ کو پہونچائی گئی۔ نقادوں کی کوئی کتاب تب نہیں ہوتی تھی بلکہ وہ حسبِ قیاس فی البدیہہ
 یا فرمائش سے فوراً تیار کر لی جاتی تھیں۔ لیکن جو بادشاہان اودھ کا دار السلطنت تھا عیش و عشرت کا مرکز
 بنا ہوا تھا اور علی الخصوص ابد علی شاہ کا زمانہ تو دولت و ثروت، شوکت و عشرت کا بہترین دور تھا۔ اس
 زمانے کی ان الفاظ میں کیا بھی تصویر کشی گئی ہے۔ "وہاں دولت و خوش حالی، نادرغ البالی، نایاب رنگ،
 حکانے سجانے کے ہر طرف چلے عاسق، مزاج خوش و جوانوں اور حسین ترین نازنینوں کے گلے تلے تھے
 زندگی اس مزہ سے گزرتی تھی جس طرح پھولوں کے تختے پر باد بہاری چلتی ہے۔ ہر طرف سُریلی آوازوں
 سے کان لطف اندوز ہوتے تھے۔ وہ خیالی پریشان جس کو کہ قاف کہتے ہیں اس سے مجھ کے پرستان کے
 آگے جہاں ہزاروں لاکھوں آدمی اپنی زندگی نہایت بے فکری اور عیش و عشرت میں گزارتے تھے
 تھا شاہزادے اور دُسا، امرا و جنودمانی اور کافرانی کے مجسم تصویریں تھے اُن کو دیکھ کر دنیاوی جاہ و
 جلال اور مال و منال کا سبب نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا تھا۔ اسی دربار میں اردو ڈرامائے جنم لیا۔
 بادشاہ اودھ کے وزیر اور مصاحبین اپنی مسرت اندوزیوں کے بہت نئے طریقے سوچا کرتے تھے چنانچہ
 ایک فراموشی نے جو دربار شاہی سے متوصل تھا ادراکی تجویز پیش کی جس اُس نے میں یورپ میں
 خروج ہو رہا تھا جو فوراً منظور کر لی گئی اس وجہ سے کہ اس میں صدیاحسین و عین کائنات کے لئے جو
 دربار بھرا ہوا تھا ایک اچھا شغلہ نکل آیا اور امانت کو اسی قسم کا ایک تماشا لکھنے کا حکم ہوا۔
 اندوہ امانت | امانت نے سترہ مطابق ۱۸۵۷ء میں اپنی کتاب اندوہ امانت کی جو کامیڈی ہے،
 اور چونکہ اس میں گانا اور ناچ بھی شامل ہے لہذا موسیقی دار کا میڈی ہے جو ادراکی ایک قسم ہے،
 جو نہی یہ کتاب تیار ہوئی۔ اس کے واسطے لکھنے کے مشہور محل قیصر باغ میں ایک طبع آراستہ کیا گیا مشہور
 ہے کہ بادشاہ خود تماشا میں شریک ہوتے اور راجہ اندوہ بنتے تھے اور پلوں کا پارٹ خوبصورت حسین
 عورتیں کرتی تھیں جو پُر تکلف اور قیمتی لباس اور جوہرات سے آراستہ ہوتی تھیں۔ ان تماشوں میں کسی
 غیر آدمی کے جانے کی اجازت نہ تھی۔ یہ سلسلہ کہ آیا اردو ڈراما کی ترقی میں یورپ والوں نے کوئی حصہ
 لیا یا نہیں ہنوز مابہ النزاع ہے مولوی عبدالحلیم شرر مرحوم اس کو نہیں مانتے تھے ان کا خیال تھا

کہ کسی یورپین نے اردو ڈراما کی ترقی میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ یہ معاملہ تاریکی میں چھپا ہوا ہے اور اس زمانہ کی کوئی معتبر تاریخ ایسی نہیں ملتی جس سے اس پر کافی روشنی پڑ سکے۔ اسٹن افرو معلوم ہوتا ہے کہ یورپینوں نے اردو ڈراما کو زمانہ حال کے مطابق بنانے اور سیٹج کے ڈراماں اور تیاری میں کچھ نہ کچھ حصہ ضرور لیا ہو گا۔ ذرا انہی اور محمد عمر صاحبان نے اپنی کتاب ناکام کریں بہت سے دلائل مولانا شرمہ جوم کے جواب میں پیش کیے ہیں مثلاً واجد علی شاہ کے دربار میں یورپین لوگوں کی موجودگی خود واجد علی شاہ کو انکی چیزوں کا شوق اندر سبھا کی اندر فی شہادت وغیرہ وغیرہ اور اس کے علاوہ خورشید جی بالی والا جو اُس زمانے میں ایک مشہور ایکٹر تھے ان کا قول بھی اس کی تائید میں نقل کیا ہے۔ مگر خفی یہ ہے کہ باقی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ واجد علی شاہ تماشے میں کچھ حصہ لیتے تھے یا کہ اندر سبھا کا تماشہ قصیر بارغ میں ہوا تھا یا امانت نے یہ کتاب بادشاہ کے حکم سے لکھی تھی یا نہیں۔

اندر سبھا کا پلاٹ بہت معمولی ہے۔ کتاب اجا اندر کی سبھا یعنی دربار کے سینے سے شروع ہوتی ہے اور قصہ اس قدر مشہور ہے کہ اس کے یہاں لکھنے کی ضرورت نہیں۔ وہ عجیب ہونے ہی بہت مقبول ہوئی۔

اے کرمی سید مسعود حسن صاحب ضوی ایم اے اردو لکچرار کھنڈو پورہ نے اپنے ایک اعلانہ مضمون میں جو رسالہ "اردو میں چھپ چکا ہو یہ ثابت کر دیا ہے کہ اندر سبھا تو واجد علی شاہ کے حکم سے لکھی گئی نہیں بلکہ کبھی قصہ عام میں ہو اور واجد علی شاہ انجمنی اس میں ترمیم ہوئے۔ وہ لکھتے ہیں کہ امانت نے اس کتاب کی سرچ میں (جو ان کے پاس موجود ہے) یہ لکھا ہے کہ اس کتاب کے (امانت کے) ایک ساگرد کے کہنے سے لکھی گئی اور اس کے ایکٹنگ کا طریقہ نہایت عجیب اور مفصل طریقے سے بیان کیا ہے بادشاہ کا راجہ اندر بنا بالکل بے اصل ہے اس وجہ سے کہ بادشاہ کو کبھی کا شوق تھا چنانچہ ان کی تصانیف میں اس طرح کی چیزیں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ وہ مختلف پارٹ مختلف لوگوں کو تقسیم کرتے تھے جن کے نام بھی بتائیے گئے ہیں مگر یہ بات خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ درہسوں میں کہنیا کا پارٹ بچانے مرد کے سپرد ہے کسی عورت کو دیتے تھے اور خود کبھی نہیں دیتے تھے جبکہ اس میں کہنیا کا پارٹ خود انہوں نے کبھی نہیں لیا تو یہ بعد از عقل ہے کہ وہ راجہ اندر دیتے ہوں۔ اندر سبھا پر یورپین اثر کے متعلق مولانا شرمہ جوم اور سید مسعود حسن صاحب دونوں کی قطعی رائے جو کہ فرانسیسیوں نے اس کو نہیں کیا اگر لفظ پردہ سے اس کا ثبوت دیا جائے تو تصویر دار پر ہے جو سین کھلاتے ہیں اور تھپڑوں میں رنج ہیں اور جو جنگ وارب کی شکل ہیں۔ درہسوں یا اندر سبھا میں کبھی استعمال نہیں ہوتے تھے البتہ مٹوئی پر ہے چادروں کی وضع کے ڈال دیے جاتے تھے تاکہ تماشائیوں کو آتشاگردوں میں ایک قسم کا پردہ ہو جائے اور یہ بہت قدیم رسم ہے اس کو اربین اثر سے کچھ تعلق نہیں ۱۲ مترجم

اور اس کی مقبولیت کا سبب ظاہر ہو یعنی یہ کہ ابتدائی دھین اس کے شعروں اور گیتوں کی بڑے بڑے استادوں نے قائم کی تھیں اور اس کا سامان ظاہری یعنی پردے لباس وغیرہ نہایت پر تکلف تھا اس کی کامیابی دیکھ کر ماری لال نے ایک دوسری اندر بھاگھی جو ادبی حیثیت سے تو امانت کی اندر بھاگھی برابر نہیں ہے گو ڈراما کی حیثیت سے اس کے برابر یا اس سے بڑھ کر ہو۔ بعد کے زمانے میں جب تھیٹر کل کمپنیوں کا رواج ہوا تب بھی اندر بھاگھی مقبولیت میں کسی قسم کا فرق نہیں آیا اور اس کو لوگ اور تماشوں سے ہمیشہ بہتر سمجھتے تھے۔ اس کی مقبولیت اس سے ظاہر ہو کہ وہ دیوناگری۔ گجراتی۔ گورکھی اور مختلف زبانوں میں ترجمہ کی گئی اور اس کے کم سے کم چالیس ایڈیشن ٹائپ یا آفس کے کتب خانہ میں موجود ہیں اگر ترجمہ جرمن میں بھی ہوا جو مقام لینن گرسٹا میں شائع ہوا۔ اب سنا جاتا ہو کہ ایک نہایت عمدہ اور تنقیدی ایڈیشن اندر بھاگھی لاہور سے نکلنے والا ہے۔ اردو ڈراما اور پادری | ابتدا میں ہندو دیوالا کے قصبے بطور تماشے کے دکھلائے جاتے تھے ان کو دیکھ کر خیرا زبانون کے دل میں خیال آیا کہ کچھ قدیم ایرانی تھے جس میں ستم دہر وغیرہ کا ذکر ہو عجلت کے ساتھ تیار کیے جائیں اور جھوٹ موت کے سیٹج پر لوگوں کو دکھائے جائیں۔ ان تماشوں کو ایسے لوگوں نے بھی دیکھا جو یورپی تھیٹر دیکھ چکے تھے اور ان کی نسبت اچھے وائے ظاہر کی چند امیر یادیوں نے جو کامیابی قابلیت رکھتے تھے اس کام کی اہمیت کبھی کبھی چند کمپنیاں ٹپے بڑے شہروں میں مثلاً دہلی۔ کلکتہ اور بمبئی میں انگریزی تھیٹر کی نقل میں قائم کیں۔ سب سے پہلی کمپنی سیٹھ بسپن جی فرام جی کی تھی جن کو اودو سیٹھ کا ابراہا سمجھا جاتے۔ یہ اردو خوب جانتے تھے بلکہ شعر بھی کہتے تھے رنگ اور پردہ میں مخلص کرتے تھے اور نواب علی نفیس سے اصلاح لیتے تھے اور بھل تھیٹر کل کمپنی رونق بناری | ان کی کمپنی کا نام اور بھل تھیٹر کل کمپنی تھا جس میں خود بھی بہت عمدہ ایکٹ کو لکھے اور عمدہ شید جی بانی والا کاؤس جی کہتا دھرا ب جی اور جہانگیر جی مشہور ایکٹر تھے۔ تماشوں کی زبان اردو تھی مگر لکھنؤ اور دہلی کی خالص اور عمدہ اردو نہیں بلکہ ایسی زبان جو عام لوگوں کی سمجھ میں آ سکے۔ کمپنی چونکہ تاجرا غرض سے قائم ہوئی تھی لہذا تماشوں میں ہی زبان استعمال کی جاتی تھی جو بمبئی۔ گجرات۔ بنگال وغیرہ تمام صوبہات ہندوستان میں بخوبی سمجھ میں آ سکے۔ تماشے اندر بھاگھی تقلید میں نظم ہوتے تھے نیز اس وجہ سے کہ کانون کو خوش آئند معلوم دیں نہ ماننے کے ڈراما نگار رونق بناری اور مایا حسینی مخلص بطور لطف تھے۔ رونق بھی میں

رہتے تھے اور انگریزی تائید سے بھی ترجمہ کرتے تھے۔ لکن ایک تماشہ "انصاف محمد شاہ زبان گجراتی
میں شہداء میں بھی سے چھپ کر شائع ہوا تھا۔ ظریف کے ہمت تماشے میں جن میں متوجہ عصمت خدا دست
چاند بی۔ بلبل ہمارے غیر زیادہ مشہور ہیں۔ جب فرام جی بانی کپسٹی کا انتقال ہو گیا تو بالی والدہ کاؤس جی
نے اپنی اپنی کپسٹیاں علیحدہ قائم کر لیں۔

دکٹوریہ ٹانگ کپسٹی طالب بنارسی | یہ کپسٹی خورشید جی بالی والدہ کی قائم کردہ تھی اور اس کا تھیرپسٹاء کے
مشہور دربار دہلی کے موقع پر موجود تھا۔ خورشید جی خود ایک بہت بڑے مشہور ڈاکٹر تھے اور اس فن میں ان کو
کمال حاصل تھا۔ اور کامک پارٹ علی انخصوص خوب کرتے تھے۔ ان کی ایکٹنگ میں کسی قسم کا بازاری پن نہ تھا
اور آواز نہیں معلوم ہوتی تھی اور ان کو شرم اور جھجک تھی جس سے شکسیر بھی مرعوب ہو جاتا تھا۔ ان کا ریج
ہم دیکھتے ہی لوگ ہنستے ہنستے لڑ جاتے تھے۔ ان کی کپسٹی میں اور مشہور ایکسٹریہ تھے۔ رستم جی اس خورشید
س متاب اور ایک اور میں میری سنس جو منہ و ستانی چیزیں بھی خوب لگاتی تھی۔ یہ کپسٹی ایک زمانہ
میں انگلستان بھی گئی تھی مگر اس کا وہاں بہت بڑا نقصان ہوا۔ جو آخر میں بھی میں پورا کر لیا گیا۔

طالب بنارسی | انٹی بنایک پرشاد طالب بنارسی اس کے ڈراما نگار تھے۔ طالب شرعی کہتے تھے اور راسخ
دہلوی کے شاگرد تھے انھوں نے فن ڈراما کو ترقی دی اور اس کی زبان اور مضامین کو بھی درست کیا۔ ان کا
انتقال ۱۹۱۴ء میں ہوا۔ ان کا ڈراما لیل دہناد ہی جو لارڈ لٹن کی اسی نام کی ایک کتاب کا ترجمہ ہو اس
مترجم نے اصل کتاب کی خوبصورتی کو بہت کچھ قائم رکھا ہو ان کی دیگر تصانیف یہ ہیں۔ دگر م ولاس۔
دیرول شیر۔ نازاں۔ نگاہ غفلت۔ ہر شچندر۔ گوپی چند۔

الفرد تھیرپسٹ کپسٹی۔ حسن لکھنوی | دکٹوریہ کپسٹی کے مقابلے میں الفرد تھیرپسٹ کپسٹی قائم ہوئی جس کاؤس جی
کساؤ نے قائم کیا تھا۔ برخلاف خورشید جی کے جو ایک بڑے کامک ایکسٹریہ تھے۔ کاؤس جی ایک مشہور راجا ایکسٹریہ
تھے یعنی جذبات زد و غم دکھانے کے استاد تھے۔ ان کو لوگ ہندوستان کا ادونگ کہتے تھے جو حق بجانب ہو
شکسیر کے دیو دادا بیٹلے کا پارٹ خوب کرتے تھے اور نل خورشید جی کے یہ بھی کامل الفن تھے۔ مرض
ذیابٹس میں بخام لاہور ۱۹۱۵ء میں انتقال کیا۔ ان کی کپسٹی کے مشہور ایکسٹریہ پنیر شاہ۔ گلزار خاں

مادھو رام ماسٹر موہن ماسٹر منچرجی۔ مس زہرہ ادیس گوہر تھیں۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے
جہانگیر جی نے تھیں چار بیچ سال تک چلایا اور پھر کلکتہ کے مشہور تاجو مسٹر میڈن کے ہاتھ فروخت
کر ڈالا۔ میڈن کا انتقال ۱۹۳۰ء میں ہوا۔

حسن لکھنوی | الفرفر دیکھنی کے سب سے پہلے ڈراما نگار حسن لکھنوی تھے جن کا نام سید مہدی حسن ہے اور
حکیم نواب مرزا اتوق مشہور مصنفہ شہر عشق و بہار عشق وغیرہ کے نو اسے میں۔ حسن صاحب صرف ایک
کامل ڈرامہ نکالا بلکہ ایک شاخ خوش گو اور بہت اچھے مرقعی داں بھی ہیں۔ ان کی ڈراماؤں کی زبان نہایت
فصیح اور با محاورہ ہوتی ہے اور کیوں نہ ہو کہ زبان داں ہیں۔ ان کی ایک مشہور تصنیف دانتوں آتش
ہے جس میں میرزا میں مرحوم کے حالات زندگی نہایت صحت اور عمدگی کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں ڈرامہ محکم
تصانیف یہ ہیں۔ فرد و گلزار۔ چند راوی۔ دلفرش۔ بھول پھلیاں۔ بکاؤنی۔ چلتا پرزہ۔

بیاب دہلوی | حسن کے بعد الفرفر دیکھنی کی ڈراما نگاری کی خدمت بہت نرا حسن پر شاہ بیتاب دہلوی کو پیر
ہوئی جو بہت ڈراموں کے بیٹے اور فن شریں سردار محمد خاں کاکب شاگرد غالب کے شاگرد تھے۔ کبھی
کبھی ان کا کلام نظیر حسین بٹا کو بھی دکھاتے تھے۔ یہ کہنی میں باقاعدہ کام کرنے اور بیٹی میں رہتے تھے۔ ایک سال
موسم بہ سپر کالیتے تھے جسیرا تادنا کے مشہور ڈراموں کا ترجمہ چھپتا تھا۔ یہ اب بند ہو گیا ہو تھا
حب ذیل ہیں۔ قتل نظیر۔ مہا بھارت۔ زہری ساپ۔ زریب محبت۔ رامین۔ گورکھ دھند۔ مٹی تراب
کرشن سدا۔ قتل نظیر۔ پلا تاشہ تھا جو بتا بے کہنی کے واسطے تیار کیا تھا اس کی مقبولیت کی شاید جو
بھی ہو کہ اس زمانے میں دلی کی ایک ٹی نظیر نامی مار ڈالی گئی تھی جس کا چرچا لوگوں میں پھیل گیا تھا۔ مہا بھارت
کا تماشہ سب سے پہلے ۱۹۱۷ء میں مقام دہلی دکھلایا گیا جو بہت مقبول ہوا اور اب بھی لوگ اس کو بہت پسند
کرتے ہیں۔ بیتاب میں بڑی مہارت لکھتے ہیں کہ مہا بھارت وغیرہ ہندوؤں کے مذہبی کتابوں سے جو دلچسپ
دانتوں کا خزانہ ہیں ضروری ضروری اور عجیب قعات جن لیتے ہیں اور انکو نہایت عمدہ اور دلچسپ طریقے سے لکھا
کا جامہ پہناتے ہیں۔ ان کی ہندی میں بھی ڈراموں کا جو کچھ ان کے ہندی دوہے اور گیت نہایت شیرازہ روتے ہیں انکو
نے محمد و تاریخی واقعات کو مثلاً درویدی کا ہزاراج سری کرشن جی کی خون بہتی مگلی باندھنے کے واسطے اپنی

ساری پھاڑ ڈان اور سیوا اور چیتا چاروں کا قصہ وغیرہ نہایت اسادی اور جس سے اپنے ڈراموں میں
باندھا ہے۔ وہ سین جس میں ساری پھاڑ نادکھایا گیا ہے بعض نکتہ چیں اس کو خلاف قواعد فن اور خلاف
تہذیب خیال کرتے ہیں مگر اس میں کوئی قباحت نہیں بلکہ اس سے انتہا درجے کا اعتقاد اور محبت اور مری
ہمارے کی عظمت کا ثبوت ہم پر پہنچتا ہے۔ ایک اور اعتراض ان کے تماشوں پر یہ کیا جاتا ہے کہ جنت و
دوزخ وغیرہ نہایت بھونڈے پن اور دقتیادوسی طریقے پر دکھلائے جاتے ہیں۔ ان کے ڈراموں کی زبان بھی
ایک حکیم ضرور قابل صلاح و ترقی ہو۔ ان کے یہاں شریفی کی بہتات ہو جو بعض وقت بہت بڑی معلوم ہوتی
ہے اس طرح ہندی اور سنسکرت الفاظ فارسی اور عربی الفاظ کے ساتھ بہت بڑے اور بے میل معلوم ہوتے ہیں
کانوں پر گواں گزرتے ہیں اشعار بھی موقع و بیوقع مکالمے میں استعمال ہوتے ہیں اور بعض وقت لہجہ و غصہ کے
موقع پر بھی شعری پڑھے جاتے ہیں بالکل خلاف فطرت چیز ہو۔ مگر باوجود ان سب کیوں کے تھیاب ڈراما نگار
میں توسیع اور ترقی ضرور کی بعض غافلین یہ بھی کہتے ہیں کہ تھیاب جو کہ آریہ سماج سے تعلق رکھتے ہیں ایسی باتیں لکھ
جاتے ہیں جو نہایت دھرمیوں کو ناگوار اور نا پسند ہوتی ہیں۔ مگر ہمارے نزدیک اس کی کچھ اصل نہیں ہو ان کی تماشوں
کی شہرت زیادہ تر اس وجہ سے بھی ہوئی کہ مشہور حسین عورتیں اس میں تماشہ کرتی تھیں۔ مختصر یہ کہ تھیاب کے
جذبات عیش اور ان کے گیر کٹرز بدست ہوتے ہیں اور وہ اصول ڈراما کو خوب سمجھتے ہیں۔

نیوا نفر ڈکینی۔ (آغا شہر کشمیری) ایک شخص محمد علی ناخدا نانی نے ایک دوسری کپنی انفر ڈکینی کے طرز پر
کھولی اور اس کا نام نیوا نفر ڈکھا۔ مشہور کا ملک بکٹر سہراب جی اس کے منبر تھے جو بعد کو شریک بھی ہو گئے
یہ کپنی اوہڑا دھر پھر پھر کے آخر کار احمد آباد میں مستقل طور سے قائم ہو گئی۔ عباس علی جو بعد کو جوہلی کپنی میں
جیل گیا اور امرت لال کپنی اس کے مشہور ایکٹر تھے۔ امرت لال کا مس گوہر کے ساتھ تعلق ہو گیا تھا اور یہ دونوں
آدمی آخر میں پارسی نامک مٹلی میں چلے گئے جس کے ملک فرام جی اپنے امرت لال کو اپنی کپنی کا منبر
بنالیا اور امرت لال نے چند اور آدمیوں کی شرکت سے اپنا ڈراما امرت کالا۔ امرت لال کا انتقال اپنی
بے اعتدالیوں کی وجہ سے عین جوانی میں ہو گیا۔

آغا شہر کشمیری^{۲۱} | آغا شہر کشمیری اصل ہیں۔ مگر عرصہ سے ان کا خاندان بنارس میں مقیم ہوا اور لال کی

تجارت ہوتی ہے جس کی ولادت ام ترس میں ہوئی۔ وہ نہایت ذکی الطبع آدمی ہیں۔ انھوں نے بہت سے
 تماشے نیوالفریڈ کے واسطے تحریر کیے جن کے پلاٹ زیادہ تر یورپی ڈراموں سے لیے گئے اور کچھ ڈرامے انکی
 مستقل تصنیف بھی ہیں۔ نیوالفریڈ سے ترک تعلق کے بعد انھوں نے اپنی ذاتی کمپنی موسوم بشیگر ہتھریکل
 کمپنی کھول جو نقصان اٹھا کر تھوڑے ہی دنوں میں بمقام ریا کوٹ بند ہو گئی۔ اس کے بعد حشر کلکتہ چلے
 گئے اور میڈن کے یہاں ایک مغول تنخواہ پر فلم ایکٹر ہو گئے۔ مگر اب بھی وہ کبھی کبھی کھتے رہتے ہیں۔ بعض
 مشہور تصانیف حسبِ لی ہیں: شہید ناز، مرید شک، اسیر حرم، ترک کی حور، خوبصورت بلا، سفید خون
 وغیرہ بعض ہندی ڈرامے بھی لکھے مثلاً سورج سیتا بن باس، گنگا اترن وغیرہ
 آغا حشر کو لوگ اُردو ڈراما کا مار لکھتے ہیں۔ کیوں کہ ان کے یہاں رول کا رنگ بہت ہے۔ وہ اپنے
 کیرکڑوں میں دُور جذبات دکھاتے ہیں ان کا عشق بہت گہرا اور ان کے جذبات بہت عمیق ہیں۔ وہ تہذیب
 نظم و نون کے استاد ہیں اور ان کا انداز بیان اُس جگہ خوب معلوم ہوتا ہے جبکہ دو کیرکڑوں سے جو ایک دوسرے
 کی ضد ہوتے ہیں آپس میں محاکمہ کرتے ہیں۔ اس قسم کے سین آپ کو اسیر حرم، خوبصورت بلا اور دُور
 میں ملیں گے۔ آغا حشر کی ڈراما نگاری میں عیب بھی دی ہے جو مار لیں ہیں۔ یعنی جذبات کی شدت کہ
 لطافت۔ اور فوق البھوک رنگ بھائی اس کے کہ رنگ بھکے ہوں اور ان میں لہلہ کا خیال ہو۔ ان چیزوں کا
 اثر نازک اور حساس مائع پر بہت پڑتا ہے علی الخصوص ایسے سین جن میں فکس غارت گوی وغیرہ دکھائی جاتی ہے
 آغا حشر پر یہ بھی اعتراض ہو کہ ایک ہی تماشے میں مختلف پلاٹ قائم کرتے ہیں جس سے توجہ منتشر ہو جاتی
 ہے اور خاتمہ میں کمزوری اور بے راہ روی پیدا ہو جاتی ہے۔ اکثر جگہ شعر کو اکٹھا کر کے پڑھتے ہیں انشاء
 کو محض حسن بیان کے طور پر لکھتے ہیں جو اصول ڈراما نگاری کے خلاف ہے کبھی کبھی دوا بیات اور سقیانہ
 دل لگی اور مذاق شامل کیا جاتا ہے جس سے سین کا اثر جاتا رہتا ہے بعض اوقات بیان اُتھات میں
 جملت کی جاتی ہے جس سے آئینہ پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ مگر باوجود ان تمام عیوب کے آغا صاحب ایک مشہور
 شخص ہیں اور ان کی تصانیف اُردو ڈراما میں اعلیٰ درجہ رکھتے ہیں۔

دوسری کمپنیاں | مذکورہ بالا کمپنیوں کے علاوہ جو کمپنیاں قائم ہوئیں ان میں سے بعض مشہور کے نام یہ ہیں

لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ (۱) اولڈ پارسی تھیسٹر کل کمیٹی، گزشتہ صدی کے آخر میں قائم ہوئی تھی ۱۹۰۱ء میں لاہور میں چل گئی۔ مگر اپنے مالک آرڈر شیری کی قابلیت اور حسن انتظام کی وجہ سے پھر دوبارہ قائم ہوئی (۲) جو بلی کمپنی دہلی۔ اس کو دلی کے ایک میر کادی نے عباس علی ایکٹر کے زیر اہتمام قائم کیا تھا۔ اس میں علی گلر و زمیندار جام جہاں نماں پارت کرتے تھے (۳) بھارت ویا کل کمیٹی میرٹھ اس میں بدھ بھگوان کا تماشہ خوب ہوتا تھا تھوڑے عرصہ کے قیام کے بعد احمد آباد میں ختم ہو گئی (۴) اپریل کمیٹی اور (۵) لائٹ آف انڈیا۔ ان میں حافظ محمد عبداللہ اور مرزا انظیر بیگ کبر آبادی تماشہ کرتے تھے۔ حافظ عبداللہ کے بعض تماشوں کے نام یہ ہیں۔ جشن پرستان، انجام تم، ستم ہا مان وغیرہ۔ اور مرزا انظیر بیگ نے نلد من، بہار عشق، فسانہ عجائب، ماہی گیر وغیرہ لکھے۔

آخر انیسویں صدی کے علاوہ مذکورہ بالا ڈراما نویسوں کے اس زمانے کے بعض ڈراما نویس جن کی تصانیف مشہور ڈراما نویس کتب خانہ انڈیا آفس میں محفوظ ہیں یہ ہیں غلام حسین ظریف مصنف انجام سخاوت ۱۸۹۹ء محمد عبدالوحید قیس جھنوں نے انجام نیک و بد اور جلسہ پرستان لکھا فقیر محمد تنبیج مصنف انجام لفت و بنظیر بد مینر فیروز شاہ خاں مصنف بھول بھلیاں ترجمہ شکیبیر احمد حسن و آفر مصنف بلبل بیمار، میر عبد الماجد مقصود علی امراؤ علی مصنف البسٹ بل (۱) اور (۲) میں سبھی پلاسما سی (۱) جہانگیر ترجمہ ہیلٹ شروع بیسویں صدی کے بعض (۱) غشی غلام علی دیوانہ انگلینڈ تھیسٹر کل کمیٹی میں ہیں۔ تاہم بزرگانی اور دیگر چلا ان کے تماشے ہیں۔ (۲) غشی محمد ابراہیم حشر انبلاوی حشر کے شاگرد ہیں اور تیلنگ

لگا ڈانز۔ خود پرست وغیرہ کے مصنف ہیں (۳) غشی رحمت علی مصنف دو جگہ، بادشاہ قاتل وغیرہ بے البرٹ تھیسٹر کل کمیٹی کے منبر تھے۔ اپنی پارسی تھیسٹر کل کمیٹی کے ڈائرکٹر ہیں (۴) دار کا پرشاد افق مصنف رام نانک جٹ ایک بہت طویل ڈراما ہو (۵) مرزا عباس مصنف نور جہاں شاہی فرمان وغیرہ (۶) آغا شاعر دہلوی شاگرد داغ۔ مصنف جو رحمت (۷) (۸) لاکرشن چند زیاد لالہ نانک چند تار۔ یہ دونوں پنجابی ہیں اور اکثر ڈراموں کے مصنف ہیں جن میں غیر نوس ہندی الفاظ کی کثرت ہو (۹) لالہ کنور سین ٹایم اے چیف جسٹس انیکور کشمیر سابق پرنسپل لاکانج لاہور۔ ڈراما کے مشہور نقاد ہیں۔ ان کا ڈراما برہانہ نامک

بہت عمدہ ہے اس میں سمانی تیاروں کے کیرکٹر دکھائے گئے ہیں۔ (۱۱) بشمیر سہائے بیاکل مصنف مدظلہ
جو بہت مقبول ہوا اس میں شانتی دس یعنی قلبی اطمینان کی بہترین تصویر کھینچی ہے۔ یان عیوب کے پاک
جو اردو کے اکثر ڈراموں میں پائے جاتے ہیں۔ بیاکل بھارت بیاکل کہیں کے دوح ردال تھے جو میرٹھ
میں قائم ہوئی تھی اور ایک زمانے میں شمالی ہندوستان کی کہینوں میں بہت مشہور تھی اور اس کی خصوصیت
یہ تھی کہ اس کے اکثر ایکٹریز بھگت اور اچھے طبقے کے لوگ تھے۔ علی اطر اس کہیں کا ایک مشہور ایکٹری
تھا مٹھی جانیٹر پرشاد مال دہلوی انڈیٹر سالہ زبان نے اس کہیں کے واسطے دو تماشے چند رنگت اور
تجسم تیار کیے تھے (۱۲) حکیم احمد شجاع بی، اسے سسٹنٹ سکریٹری یوبلیو کو نسل پنجاب انڈیٹر
ہزارہاں ایک اچھے انسان تھا اور ڈراما نویس ہیں۔ باب کا گناہ، بھارت کالال۔ جانا دودھ
کے مصنف ہیں۔ نگران کے ڈراما اسٹیج پر اچھے نہیں معلوم ہوتے۔ (۱۳) سید امتیاز علی بی، اسے مصنف
انارکلی، دولہن وغیرہ، بافضل ریسین کے انگریزید کا ترجمہ کر رہے ہیں (۱۴) سید دلاور علی شاہ۔
مصنف پنجاب میل۔ معمولی ڈراما بود (۱۵) خان احمد حسین مصنف حن کا بازار وغیرہ (۱۶) رادھے نام اکثر
نڈھی ڈراما لکھتے ہیں جو اہل ہند میں بہت مقبول ہیں (۱۷) سدرشن جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔
ادبی، سیاسی اور سوشل ڈراما اردو میں ادبی ڈراموں کی بہت قلت ہو مگر پھر بھی حسبِ قیاس قابلِ ذکر
ہیں سیکرین ادبی۔ اور قاسم وزہرہ ٹولف شوق قدوائی۔ شہید وفا مولانا شرمہ حرم درم اور سی
ترجمہ مولوی عزیز زام حرم۔ دس جاپان ٹولف مولوی طغر علی۔ نتیجہ فرانس جو شکسیر کے سنری خاص
ترجمہ ہوا اور جو لیس یوزر ترجمہ سید فضل حسین نصیر مٹھی جو لاپر شاد برق کے شکسیر کے اکثر ناٹکوں کے ترجمے
جس میں مشوقہ فرنگ دیو جو لٹ کا منظوم ترجمہ ہو۔ بیداری ٹولف حکیم انظر صاحب انڈیٹر تحریکات
نشی محمد عمر صاحب مترجم ہائیکورٹ جوں کشمیر اور نشی نور افغانی نے جو ناٹک ساگر کے مشہور مصنف ہیں
جو تمام ملکوں کے ڈراما کی ایک بسوٹا گو کسی قدر نامکمل تاویخ ہے اور اس سے اس باب میں بہت کچھ
مدد لی گئی ہے۔ اکثر مفید اور دلچسپ ڈراموں کا ترجمہ اردو میں کیا ہے۔ ان کی یہ کوشش نہایت
قابلِ تعریف ہے اور ان دونوں اصحاب کو اس فن میں خاص مہارت ہو گئی ہو۔ اور ہم کو امید ہو کہ

زیادہ تجربہ کے ساتھ یہ زبان پر پوری قدرت اور فن ڈرامہ نگاری میں عبور حاصل کر لیں گے۔ ان کی بعض تصانیف حسبِ ذیل ہیں (۱) روحِ یاست جس میں امریکہ کے مشہور پریسیڈنٹ ابراہام لنکن کی زندگی کے حالات اور مقصد نہایت خوبی سے ڈرامے کی صورت میں دکھایا گیا ہے (۲) جان طرافت فرانس کے مشہور ڈراما نویس مولیر کی ایک کتاب کا ترجمہ ہے جس میں گنہگاروں کی بہت خبریں دی گئی ہیں (۳) قزاق مشہور جرمن شاعر اور ڈراما نویس شلر کی کتاب کا ترجمہ ہے (۴) بگڑے دل۔ مولیر کی ایک دوسری کتاب کا ترجمہ (۵) ظفر کی موت۔ میٹرلنک کے ایک ڈراما کا ترجمہ ہے۔

شوش ڈراموں کے ذیل میں مولوی عبدالمجید ریابادی کا زود پشمال جیسے کم عمری کی شادی کی حاجت دکھائی ہیں قابلِ ذکر ہو۔ پندت بزمِ بوہن، تارِ کیفی ایم ایے جو ایک خوش گو شاعر و بہت بڑے مضمون نگار ہیں ڈرامہ سے بھی ایک خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔ بالفعل کشمیر میں سسٹنٹ قارئین بکری کے عہد سے پرتما ہیں۔ راجِ دلاری اور مراری دادا آپ کی مشہور تصانیف ہیں۔ راجِ دلاری پنجاب اینڈ پٹی کی طرف سے منظور ہو گئی ہے ستر کنور سین شمسہ نقاد ڈراما ان دونوں کتابوں کی نسبت لکھتے ہیں یہ دونوں نثر ڈرامے ہمارے موجودہ شوش اور خانگی زندگی کے بہترین نمونے ہیں ان کے لکھنے کی غرض صلیح حکما ہے، وہ تعلیم یافتہ منہ ستائیوں کو چاہئے کہ ان کو پورا اُسیہ اخلاق سمجھیں ان میں طبقہ متوسط کے مردوں، عورتوں دونوں کے صحیح خیالات جذبات اور نیراز کے نقائص اور کمزوریاں اور ان کے عادات نہایت کامیابی سے دکھلائے ہیں طرزِ تحریر بہت شہر، زبان بامحاورہ اور خیالات بہت ہائِ صاف ہیں ان پر پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حسین اسٹن کے نادلوں کو برنارڈ شاؤ نے ڈرامہ کا جامہ پہنا دیا ہے البتہ لائق میں اتنی کمزوری ضرور ہے کہ اپنی آزاد خیالی کو اس کی منطقی حد تک نہیں پہنچا یا ہے، مولانا شرر مرحوم نے جو تلخ پردہ کی سختی کی خرابیوں پر لکھا، غرض کہ نہ مانہ موجودہ میں متعدد ڈراما نویس معاشرتی مسائل پر لکھتے جاتے ہیں جن میں ضمنیاً ماحضاً مغربی تہذیب کی حد سے زیادہ تقلید کا خاکہ اڑایا جاتا ہے۔

سیاسی صنف میں منشی امر دعلی کا ڈراما البرٹ بل جو ۱۹۰۷ء میں بمقام لاہور شائع ہوا تھا مبنی آخر جبکہ مشہور البرٹ بل پر بحث مباحثہ ہو رہا تھا اور نیز ایک اور ڈراما جیسٹن ٹنٹنل کا نگریس کے مقابلہ

بیان کیا ہے سیاسی ڈرامے کہے جاسکتے ہیں مگر یہ کوئی دلچسپ اور قبیح تصانیف نہیں ہیں یہی طرح
 ترک موالات کے عروج کے زمانے میں بہت سے نام نہاد ڈرامے سیاسی سائل پر لکھے گئے اور ممنوع
 ہو گئے ان میں سے کوئی قابل ذکر نہیں الا وہ جو منشی کشن چند زربان نے زخمی پنجا کے نام سے لکھا تھا۔
 اردو ڈراما کی ترقی میں مختلف اچھا اور بریاں ہوا اندر سمجھا سے اردو ڈراما کی بنیاد پڑی مگر یہ سب کے طرز پر
 لوگوں نے کیا حصہ لیا لکھی گئی نہ تو اس میں کوئی منظم پلاٹ ہوا اور نہ صحیح معنوں میں کیرکٹر ہیں۔ اس کے
 بعد ظریف نے جدید رنگ کے ڈراما کی بنیاد ڈالی کم سے کم اس کی ترقی و اشاعت میں کوشش کی ان کی
 تصانیف کی وجہ سے زبان ہندوستانی یعنی اردو کی ہندوستان کے مختلف حصوں میں جہاں ان کے ڈراما کھیلے
 گئے اُشہرت ہوئی لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو ظریف کی غرض صرف دلچسپی اور تفریح تھی ان کے ڈراما
 ادبی حیثیت سے ممتاز نہیں ان کے پلاٹ اور کیرکٹر بہت کمزور ہیں ان کی تحریریں سادہ نہیں پائی جاتی۔
 نثر و نظم دونوں ابتدائی رنگ کی ادا تص ہیں۔ حافظ عبداللہ اور مرزا ظفر بیگ نے ظریف کی پیروی میں
 اپنے تاشوں میں دو دو پلاٹ الگ الگ قائم کیے ان کے بعد طارق حسن نے اس فن کو ترقی دی اور زبان کو
 بھی ایک حد تک بہت دست کیا انھوں نے دو پلاٹوں کو ایک کر دیا۔ اور اسی پلاٹ میں بعض کیرکٹروں
 سفرے کا کام لیا یعنی کو میڈی کو بھی اسی قصہ میں لایا گیا معمولی گفتگو شریفی تھی اور نظم گیتوں
 کے واسطے مخصوص کی گئی کبھی کبھی گفتگو میں بھی اس کو زور دار اور زور کرنے کے لیے شعر استعمال کیے گئے
 گیت زیادہ ہندوستانی زبان میں ہوتے تھے اور ادا پر ان کی حد سے کل صحیح ڈراما کی حد میں گیا کیرکٹر سادہ
 اکیشن اور اختتام قصہ پر زیادہ توجہ کی گئی۔ طالع نے سب سے پہلے فارسی الفاظ کی ہندی میں میزبانی کی
 حشر نے پھر وہی طریقہ یعنی ایک قصہ میں دو پلاٹوں کا اختیار کیا ان کے خصوصیات کا بیان ان کے حالات میں
 مختصراً ہو چکا ہو۔ بیاب کی شہرت ان کے دو مشہور ڈراموں مہا بھارت اور رامائن سے ہوئی جس کے
 کیرکٹر مشہور سنسکرت شاعر پر اس سے لیے گئے جن کی تصانیف اپنی مجموعیت اور نگینیت سے بہترین
 کہی جاسکتی ہیں۔ بیاب کے نقائص کو بشمر سہائے نے اپنے ڈرامہ جہاں میں دہرایا اس کی زبان کو
 اعلیٰ درجہ کی با محاورہ اور دہندہ نہیں ہے مگر پھر بھی بہت زوردار زبان ہو جس میں ہندی الفاظ کی کثرت ہے

خیالات بہت پاکیزہ اور انداز بیان بہت دلکش۔ سرگزشت میں نے اپنی کتاب بدھانڈ نامک میں علم ہیئت
یعنی قاعدے سے کام لیا اور واقعی بڑی استادی اور خوبی سے ترتیب یا یعنی صاحب نے سوشل سائنس
ڈراما لکھے اور وطن اور اتلاق بلاشبہ سیاسی ڈراما ہیں رینی ڈراما کا بھی اب آج ہر چلا پروا دینے
زیادہ تر مشہور شہر بنگالی ناٹکوں کے ترجمے ہیں ان کے علاوہ ہندو دیوالا اور ہندوستانی ہائیک بھی
بہت کچھ مواد آجکل فراہم کر رہا ہے اور مغربی ڈراموں کے ترجمے بھی بکثرت ہو رہے ہیں۔ اسی بنا پر
کہا جاسکتا ہو کہ اردو ڈراما بہت کچھ ترقی کر رہا ہے۔

اردو ڈراما کے دیرینہ ظاہر ہونے کے اسباب ہم اور پر بیان کر آئے ہیں یعنی یہ کہ سنسکرت اور ہندی
ماٹرنل ال میں کر متر وک ہو چکے تھے اس کے علاوہ سنسکرت ناٹکوں کے جو ترجمے بڑے بڑے قابل
انگریزوں مثلاً ٹولیم جونسن۔ پروفیسر دلس اور مورس نے کیے تھے وہ انگریزی زبان میں ہونے کی وجہ
سے ان لوگوں کی سمجھ سے باہر تھے جو اردو ڈراما لکھتے تھے اور یہ لوگ انگریزی کے ساتھ سنسکرت بھی نادر
تھے اور اس کے جاننے کے خواہشمند تھے۔ لہذا یہ کہنا بالکل بجا ہو کہ اردو ڈراما کا مجموعہ جو در اوقت ہوا جبکہ
اہل مغرب کا اثر اس ملک پر ہونے لگا۔ اس کے بعد البتہ سنسکرت ڈراموں کے بذریعہ انگریزی تراجم فائدہ اٹھایا جانے لگا
ابتداءً ڈراموں کے نقائص شروع ہو گئے کی بالکل ادبی حیثیت نہ تھی بلکہ وہ محض فائدے کی غرض سے
کھیلے جاتے تھے اور کھیلے بھی جاتے تھے۔ ایسی لوگوں نے جو عجارت کا خاص مذاق رکھتے ہیں اس کام کو ایک
کاروبار کی حیثیت سے اختیار کیا اور حباب ان کی کچنیوں کو کامیابی ہوئی تو تماشے بھی بکثرت لکھے جانے لگے
جن کے ماتخذ جیسا اور زند کو روچکا ہو، ہندو دیوالا۔ پرائے تھے اور ان سے انگریزی ڈراموں کے ترجمے بھی
کچھ تھے تماشے کی عمدگی اور کھیل کا خیال مطلق نہیں کھا جاتا تھا کسی پرائے تھے کے واقعات کو توڑ پڑ
کر اور کچھ اشعار بطور گیت کے اور کچھ مذاق کی باتیں میں جوڑ کر تماشیاں کر لیا بس یہی کافی تھا ڈراما نگار کی بات
کچھ زیادہ بڑے کچھ نہیں تھے زیادہ تر اکیڑوں میں سے یا ان لوگوں میں جن کو اس قسم کے تماشے دیکھنے کا
شوق ہوتا تھا یہ لوگ منتخب کر لیے جاتے تھے کبھی کبھی ایسے لوگ لکھے جاتے تھے جو بیچروں کی ہوا سے بڑی
جلد جلد تماشے تیار کر دیا کرتے تھے۔ بعض ڈراما نویس یہ خیال پائی تھیں ان کی عبادت بہت سست ہو گئی تھی

اشخاص کا بجائے معمولی طریقے کے اشعار میں گفتگو کرتے تھے اور بعض اوقات غزلوں کی غزلیں اس قسم کی
گفتگو میں شامل ہوتی تھیں اور اشعار بھی اسی درجہ کے نہ ہوتے تھے بلکہ نہایت معمولی اور بے مزہ بشرط
انتہا درجہ کی مصنوعی اور غیر ممکن۔ پلاٹ اور کمر کا کہیں پہنچ نہیں سکتی نہایت نامور مسکڑی خواہی
یہ تھی کہ طربجڑی اور کاٹی جن کا کھلی میل نہیں ہو سکتا ایک ہی پلاٹ میں شامل کر دی جاتی تھیں اخلاقی
نقطہ نظر سے بھی ڈرامے نہایت ہی ادنیٰ درجہ کے ہوتے اور مذہب اور متین لوگوں کے دیکھنے کے لائق
ہرگز نہیں ہوتے تھے دوسرے بازی ہگلے بول اور خوش گفتگو بے تکلف جائز تھی۔ بلکہ اس سے ۴۰ کے ٹکٹ والے
بہت خوش ہوتے تھے۔ ایک مڑس عورتیں زیادہ تر ادنیٰ درجہ کی رنڈیاں ہوتیں قیل و خول یزی کے سین
بے تکلف اسٹیج پر دکھائے جاتے تاکہ پارٹ اور نقلیں غیر نہایت ادنیٰ درجہ کی ہوتی تھیں۔ غرض کہ فنکار
جن اعلیٰ عناصر سے مرکب ہو بالکل ناپید تھے۔

کچھ عرصے بعد انگریزی ڈراموں نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا اور شکسپیر کے تماشے لوگوں کو
بہت پسند کئے ان میں سے اکثر ترجمہ کے ذریعہ سے اسٹیج پر دکھائے جانے لگے۔ مگر حقیقت یہ ہو کہ ایک میں بھی
اصلیت کی جھلک نہیں معلوم ہوتی تھی۔ فن کی مقبولیت اس درجہ ہوئی کہ بعض تماشوں کے چار چار پانچ پانچ
ترجمے کیے گئے جن میں سے اکثر کا ذکر انڈیا آفس لائبریری کی فہرست میں موجود ہوا ان میں سے ایک خاص قصہ
کے نام بدل کر ہندوستان کی مناسبت سے لکھا اور دکھائیے گئے ہیں مگر اصل کیرکٹر مترجموں کی سمجھ میں مطلق نہیں
آئے۔ مثلاً شکسپیر کے مشہور تماشے ہیملٹ میں وہ سین جس میں ہیملٹ اپنے دل سے باتیں کرتا ہو مترجم صاحب نے جو ترجمہ
دیا جانے کے اس کا صحیح مطلب بالکل نہیں سمجھ سکے۔ عسکر عبداللہ یوسف علی قرأتی ہیں انگریزی اسٹیج کا
ہندوستان اسٹیج پرائس کی بناوٹ اسکے ساز و سامان اسکے پردوں وغیرہ سے پوری طرح ظاہر ہے۔ اردو
نے انگریزی ڈراما کی اندھا دھن تقلید و طریقے سے کی۔ پہلے یہ کہ ابتدا میں وہ انگریزی ڈراما جو پانچ
کہلاتے تھے اور جن کی غرض اصلی یہ تھی کہ سوسائٹی کے تمام پرانے رسم و رواج اور اخلاق و عادات کو
خاک اڑا دیا جائے ان کی تقلید میں تبدیلی اور ڈراما بھی اس معاملے میں تمام پرانی چیزوں کی بہت
اندھا دیکھ ہو گیا۔ پس اس معاملے میں انگریزی ڈراما نے اردو ڈراما کے ساتھ دی کیا جو اعلیٰ درجہ کے

فریخ ڈراما کے ساتھ اور فریخ ڈراما نے عمدہ سٹوڈیشن کے انگریزی ملازم کے ساتھ کیا تھا۔ دوسرے کہ اسی تقلید کی وجہ سے انگریزی دھنس ہندوستانی تھیٹروں میں رائج ہو گئیں مگر نہایت بھونڈے طریقے سے رائج ہوئیں اور بڑی خرابی یہ ہوئی کہ اس قسم کی نئی دھنوں کے واسطے معمولی شعرائے قلیں بھی اسی انداز کی لکھنا شروع کیں جس کا نتیجہ نہایت متضاد انگیز ہو گیا۔ یہ ایسا ہی ہو جیسے کوئی شخص کسی اردو شعر کو انگریزی دھن میں اور چونکہ اس کوشش میں الفاظ ضرور ٹوٹ پھوٹ جاتیں گے لہذا ان کا مطلب کچھ سمجھ میں نہیں آئے گا۔

مگر کوہسین نے بھی اس خیال کی تائید کی ہو۔ مگر ہادی رائے میں یہ خرابی انگریزی اثر کے علاوہ اور چیزوں کا بھی نتیجہ ہو جن کا ذکر اوپر ہو چکا۔ یعنی ایکڑوں کا ادنیٰ طبقہ سے تعلق رکھنا۔ ڈراما لیسوں کی معمولی دیانت تماشائیوں کا اچھے بُرے میں امتیاز نہ کرنا۔ اور مالکان تھیٹر کا اپنے لفع کی غرض سے اُن لوگوں کو خوش کرنا جن سے انھیں زیادہ آمدنی ہوتی ہو۔ دوسری بات جو انگریزی دھنوں کے متعلق اوپر بھی گئی یہ بالکل صحیح ہے اس نے قلمی ہندوستانی موسیقی کو جو نہایت سائنٹفک اور اعلیٰ درجہ کی ہی بہت بڑا نقصان پہنچا۔

موجودہ ڈراموں میں اصلاح و ترقی موجودہ زمانے میں اردو ڈراما میں ایک نمایاں تغیر و ترقی دیکھی جاتی ہے۔ اردو ڈراما بہت تیز رفتاری سے ترقی کر رہا ہو۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ اردو ڈراما پر یورپین ڈراما اور سنسکرت ڈراما اور انگریزی اور فریخ ڈراموں کے ترجمے نیز ہنگالی گجراتی اور مرہٹی ٹاکوں کا بہت بڑا اثر پڑا۔ ایک شخص بنارس میں تھے جن کا نام بابو ہریش چندر تھا یہ بھارت اندر کے لقب سے مشہور تھے اور نہایت نامک لکھنے میں لگے تھے۔ سینسکرت پوری طرح واقف تھے اور مشہور کالمیڈ اس اور بھاد بھوتی کے رنگ میں اُن کا کلام دو با ہوا تھا۔ یہ اپنے قصوں کے پلاٹ زیادہ تر پوراٹوں سے لیتے تھے جو دھچپ قصوں اور افسانوں ایک عظیم الشان ذخیرہ ہیں۔ اور اب یہ سب کو مسلم ہو کر پلاٹ کی درستی اور قصے کو خوبصورت بنا دینے میں وہ عجیب کمال رکھتے تھے۔ چونکہ یہ ہندی میں لکھتے تھے لہذا ان کی تصانیف پر اس کتاب میں کوئی رائے زنی نہیں کی جا سکتی مگر اتنا ہم ضرور کہیں گے کہ ان کے تصانیف کا اثر بالبعد کے ڈراموں پر بہت کچھ ہوا۔ مثلاً راجہ رنجیت سنگھ کی "بلو منگل" وغیرہ بالفضل اردو ڈراما کے مضامین میں بہت توسیع کی جا رہی ہے علاوہ اُن پر لائے قصوں کے جن کا رواج اب تک تھا اب نہایت دھچپ دھچپ قصے ایسے پڑائے جاتے ہیں۔

پولیکل اور سوشل ڈراما بھی اب ترقی کر رہا ہے۔ قصوں کی عمدگی اور اخلاق آموزی میں بھی بہت کچھ فرق ہے۔ عشق و عاشقی جو اسٹیج پر دکھائی جاتی ہے نیزہ جذبات اور واردات قلبیہ جو ایکشن ڈرامے سے دکھلائے جاتے ہیں بہت اعلیٰ ہوتے ہیں۔ نفسیات کی طرف زیادہ توجہ ہو۔ ڈراما کے مضامین اور سطح نظر بہت وسیع ہو گئے ہیں۔ کیرکٹر اور پلاٹ میں بھی ترقی ہے۔ ایکٹرڈ کو اپنے افعال پر کافی قابو ہوتا ہے اور اب وہ پہلا سائے تکاپن ان میں نہیں ہر خیالات اور الفاظ دونوں میں شستگی اور ثنات کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ نتیجہ کی عمدگی پر بھی کافی توجہ کی جاتی ہے۔ نقلوں اور کامپٹوں میں وہ پہلے کی سی بد تمیزی اور پھکڑپن جو نفیس طبائع کو ہمیشہ ناپسند تھا اب نہیں ہو۔ مختصر یہ کہ قدیم اور جدید اردو ڈراموں میں اب زمین و آسمان کا فرق ہو گیا ہے۔

اصلاح و ترقی کی ضرورت | اگر با اہتمام اب بھی اصلاح و ترقی کی بہت کچھ ضرورت ہو خیالات اور زبان دونوں اب بھی بہت کچھ محتاج اصلاح ہیں۔ الفاظ میں ڈینگ نہ ہونا چاہیے بلکہ معنویت اور اصلیت کا خیال رکھا جائے۔ تکلف اور تصنع سے عبارت بالکل خالی ہو۔ گفتگو کے موقع پر بعض عبارت کو معین حافظہ سے مگر بے معلوم ہوتی ہے اس کی جگہ بے تکلف سیدھی سادہ بات چیت کا کام لیا جائے جیسا کہ موقع و محل کا تقاضا ہو۔ پلاٹ کی ترتیب و تنظیم میں بھی ابھی بہت اصلاح کی گنجائش ہو۔ اس کے واسطے بہت ہوشیار اور چابک دست قلم چاہئے۔ مسعود و مذاق کے موقعوں پر فحش اور بھانڈ پن سے بچنا چاہئے اور ترقی نہایت ستمرا اور شائستہ ہونا چاہئے۔ اصلاح زبان پر بھی توجہ کی بہت ضرورت ہو۔ اصلی فن ڈراما نگاری سے ہمارا دورا نہیں ابھی آشنا نہیں ہیں اور ہادی رائے میں یہ بات اسی وقت نصیب ہوگی جبکہ اس کام کو دہی لوگ کریں گے اس کام کے اہل ہیں اور جن کا قدرتی میلان طبع اس طرف ہو۔ اردو ڈراما کی ترقی کا واحد طریقہ یہی ہے کہ اس کا میدان عمل وسیع کیا جائے اور قابل اور اہل لوگوں کی ہمت افزائی کی جائے نیز یہ کہ بہترین یورپین اور انگریزی ڈرامے اور پرانے سنسکرت نامک ترجمہ کرائے جائیں جن سے ہمارے اہل وطن کو اصلی ڈراما کی حقیقت اور اعلیٰ آئینہ میں کا حال معلوم ہو گا۔ اور وہ دیکھیں گے کہ یہ فن شریف گزشتہ زمانے میں کس طرح تک پہنچ گیا تھا اور آج کل کی زندہ قوموں اور ملکوں میں اس کی ترقی کی کیا حالت ہو۔ اسی میں سے

ان کو اپنے ملک اور اپنی سوسائٹی کے حسب حال جو چیزیں مناسب معلوم ہوں اخذ کرنا چاہئے مگر یہ ضرور ہے کہ ترجموں کی کثرت سے طبع و تصانیف دہش جائیں۔ زیادہ حال کی خرابیوں کی اصلاح کے واسطے دیکھنا اور سوشل تماشے مرتب کیے جاویں اور سوسائٹی ہی سے اس قسم کے مضامین اخذ کیے جائیں۔ اس فن کو بہ نظر حقارت نہ دیکھا جائے اور ہمارے علماء و فضلا اس کی تصحیص و تذلیل کے لیے انہوں ایکٹروں پر بھی ذلت کی نگاہیں نہ ڈالی جائیں۔ ان کاموں کے واسطے زیادہ محنت اور زیادہ سرپرستی کی ضرورت ہو پردہ کی موجودگی سے ہمارے نادلوں اور ڈراما میں جو بعض ایک اور ذلیل باتیں پائی جاتی ہیں وہ یقیناً دم پردہ اٹھنے کے ساتھ دور ہو سکتی ہیں کیونکہ موجودہ صورت میں سچے جذبات عشق کا اظہار ناممکن ہے۔ اگر کوئی شخص ایکٹری کا پیشہ اختیار کرے تو وہ ذات برادری سے خارج کی جائے۔ اسی طرح ڈراما نویس اور ایکٹر بھی اپنے اپنے پیشوں اور کاموں کو معزز سمجھیں۔

اردو ڈراما کا مستقبل | ہر چند کہ مشین گو سچے نہیں سمجھے جاتے اور ان کی رائے کو معتبر نہیں مانا جاتا مگر با اینہم ہم یہ کہنے کے لیے تیار ہیں کہ اردو ڈراما اپنے لیے ایک روشن مستقبل رکھتا ہو جس طرح اس باب کی ابتدا مرشد عبداللہ یوسف علی کے فاضلانہ مضمون سے کی گئی تھی اسی طرح اس کا اختتام بھی اُن کے الفاظ میں کیا جاتا ہو۔ وہ فرماتے ہیں کہ اردو ڈراما بہت زوردار ترقی کے آثار پیدا کر چکا ہے تعلیم یافتہ اور ذی وجاہت لوگ یقیناً اس میں ایک نیا دوست و سیدہ قومی ترقی کا دیکھتے ہیں اور اس کی آئندہ منزل ترقی ہماری رائے میں وہی ہوگی جو ایران ایسے ملک میں ہوئی کہ جہاں صحیح فن ڈراما کوئی واقعہ نہ تھا یعنی تادیبی اور سیاسی ڈراما نگاری۔ مگر یہ ضرور ہو کہ ایسے شاہکار جو شکسیر نے کئے ہیں ان کی تصنیف کے واسطے ابھی ایک زمانہ درکار ہو اور یہ یاد رکھنا چاہئے کہ انھیں کی سچی تقلید سے ہندوستان میں صحیح ڈراما نگاری کا مادہ پیدا ہو گا اور اسی وقت اردو ڈراما دنیا کے بہترین دراموں کی صف میں ایک ممتاز جگہ پانے کا مستحق ہو گا۔

باب

زبان اردو کی خاصہ بیانیہ اس کے متعلق بعض اہل راگوں کی قیمتی رائیں

پورے ادب اردو کا ایک کلا بابت کو رہ بالا میں کھینچا گیا۔ اس باب میں زیادہ تر زبان اردو سے بحث ہوگی نیز یہ کہ ادب اردو کا یہ مقابلہ دوسری دیسی زبانوں کے کیا مرتبہ ہو۔ اس باب کی ترتیب میں مولیٰ علیہ الرحمہ صاحب کے اس فاضلانہ مضمون سے بہت مدد لی گئی ہو جو ماڈرن ریویو میں شائع ہوا ہے۔

اردو ایک فصیح اور شیریں زبان ہو اردو بالاتفاق ایک ایسی زبان ہو جو فصاحت و بلاغت شیریں اور اظہار مطلب کے لیے بڑی شہرت رکھتی ہو یہ تہذیب تمدن کی زبان ہو اور اس میں خیالات و حیات کے نازک و نفیس فرق ہو سکتے ہیں۔ چونکہ اس میں کثرت دوسری زبانوں کے مخصوص الفاظ و حروف شامل ہیں مثلاً عربی، فارسی، ترکی، سنسکرت وغیرہ، لہذا یہ نسبت دوسری دیسی زبانوں کے ذریعہ تعلیم بننے ادبی خیالات کو اچھی طرح ظاہر کرنے اور تمدن و شائستگی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے زیادہ تر موزوں ہے۔

ہندو مسلم اتحاد کی علامت ہے ہندو اور مسلمان دونوں نے اپنی اپنی قومی اور ملی زبانوں کو چھوڑ کر اور ایک تیسری زبان اختیار کر کے اتحاد کی ایک بین الاقوامی پیش کی اور زبان گو کو ہندوستان میں پیدا ہوئی مگر غیر ملکی ذرائع اس کی ترقی اور نشوونما کے باعث ہوئے لہذا اس سب سے عملی طور پر اتحاد کا تین ثبوت نہ کوئی اہم وقت تھا اور نہ اس کے۔

ہندوستان کی زبان عام ہے اردو صحیح معنوں میں ہندوستان بھر کی۔ لہذا فرینیکا، یعنی زبان عام ہو کیونکہ ان

مقامات میں بھی جہاں یہ بولی نہیں جاتی بخوبی سمجھی جاتی ہے۔ اردو زبان کا یہ حال ہو کہ صرف اپنے اپنے ملک میں نہیں لی اور سمجھی جاتی ہیں مگر دوسری جگہ ان کو سمجھا دشوار ہو۔ مثلاً کشمیر میں گورمٹی بولی جائے بہار میں گجراتی اور سندھ میں تاملی تو بھلا ان کو کون سمجھے گا۔ مگر وہ زبان جس کو ہندوستانی یا اردو کہتے ہیں ہر شخص اپنے اپنے وطن و تہذیب سے تعلق رکھتا ہو کہ ہندوستان کے گوشہ گوشہ اور چنے چنے میں بلکہ دور و دراز تک اس سے باہر بھی مثلاً عدن بندر سعید و غیرہ تک میں یہ بے تکلف سمجھ لی جاتی ہے۔ ہم اپنے برادران وطن سے معافی کے خواہش

ادکسی ایسی زبان کی توہین یا بڑائی نہیں کرنا چاہتے مگر اصل یہ ہے کہ تمام دیگر ایسی زبانیں زیادہ سے زیادہ کسی ایک صوبے کی مخصوص زبان کہی جاسکتی ہیں اور اردو ایک بین الاقوامی اور ہر صوبہ کی زبان بنائی جائے گی۔ اور چونکہ تمام ایسی زبانوں میں بہت سے اردو الفاظ شامل ہیں اور اب در زیادہ ہوتے جاتے ہیں لہذا ان الفاظ کے رہنے والوں کو بھی جہاں اردو عام طور پر نہیں بولی جاتی اس کے سمجھنے میں کوئی تکلف نہیں ہوتا۔

ایک سچ زبان ہے اردو ایک نہایت وسیع زبان ہو اور اس میں متعدد زبانوں کے الفاظ بکثرت شامل ہو گئے ہیں جس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ نئے الفاظ در صہلاحات کیے جانے میں سانی ہوتی ہو مثلاً بجھل کے اردو لکھنے والے اگر مغربی سنس پر کچھ لکھنا چاہیں تو وہ عربی فارسی سنسکرت اور ہنگش وغیرہ سے بے تکلف الفاظ لے سکتے ہیں اور ان کو ایک ضروری تغیر اور مناسبت زبان کے ساتھ اپنا کر سکتے ہیں۔ مگر افسوس ہو کہ آجکل عربی سے زیادہ استعارہ کیا جا رہا ہو جس سے کسی قدر زبان اردو مورد الزام اور غیر مطبوع ہوتی جاتی ہو بعض یورپین محققین کی رائیں | جے سمیس صاحب مصنف "انڈین فلاو جی" حسب ذیل رائے دیتے ہیں: میں

اردو کو ایک نہایت ترقی کرنے والی اور شائستہ صورت اس بڑی وسیع زبان کی سمجھتا ہوں جو ہندوستان میں رائج ہو۔ اردو نہ صرف ایک وسیع، فصیح، معنی خیز اور جامع زبان ہو بلکہ یہی صرف ایک صورت ہو کہ جس میں دریائے گنگ کے قریب کی رہنے والی قومیں اپنی زبان کی ترقی ایک صحیح طور پر دکھلا سکیں (دیکھو جنرل بنگال ایشیاٹک سوسائٹی جلد ۲۵ متعلق صفحہ ۸۶۷)

مشہور فرینچ مستشرق "گارسن ڈی ماسی" لکھتے ہیں "اردو کی ہندوستان بھر میں ہی پوزیشن ہو جو فرینچ (فرانسیسی زبان) کی یورپ میں ہو۔ یہی وہ زبان ہو جو ملک میں بکثرت مستعمل ہو عدالتوں اور شہروں میں جاری ہے اور اب اپنی تصانیف اسی زبان میں لکھتے ہیں جو سبقی دال اپنے راگ راگنیابی زبان میں تصنیف کرتے ہیں اور اہل ریچ گفتگو بھی اسی میں کی جاتی ہو۔ بعضوں کا خیال ہو کہ اردو کو ہر مقام کے ہندو لوگ نہیں سمجھ سکتے مگر یہاں حالت ہر ملک میں ہر زبان کی ہو مثلاً برٹنی کے کسان عام اس سے کہ اردو نہیں سمجھ سکتے۔ پس کیا یہ وجہ معقول ہو سکتی ہے کہ اردو عدالتوں اور شہروں و قروں سے اٹھادی جائے؟

جارج کیمبل مصنف "انڈیا ایز اٹ ماٹ بی" تحریر کرتے ہیں میرے نزدیک یہ بہت مناسب ہے کہ تمام سرکاری اسکولوں میں ہندوستانی زبان ایک عام زبان کر دی جائے اور ایسی زبانیں بھی بشرط ضرورت رکھی جائیں۔ میں اس کو بالکل ناممکن سمجھتا ہوں کہ کوئی عام زبان ذریعہ کے بغیر کام چلا یا جاسکتا ہو۔ چونکہ انگریزی کو ہندوستان کی زبان عام بنانا محال معلوم ہوتا ہو لہذا ہندوستانی ہی کو یہ فخر ملنا چاہیے جیسا کہ دیکھا جا چکا اردو ہندوستان بھر کی زبان عام (ملگو انفرنیکا) کسی جانے کی مستحق ہے کیونکہ یہ وہ زبان ہے جس کو دینی و اعلیٰ ادبیات کے انگریز بھی بولتے ہیں اس میں ایک خاص خوبی یہ ہے جو کسی دوسری زبان میں نہیں پائی جاتی کہ دوسری زبانوں کے الفاظ بلا کسی تغیر کے یا خفیف تغیر کے ساتھ اپنے میں بکر لیتی ہے اور پھر وہ لفظ اُن کے ہو جاتے ہیں۔

مسٹر ہنسٹ اسمتھ مصنف "سٹری آف انڈیا" اپنی کتاب کے آخر باب میں لکھتے ہیں زبان اردو جو ہمارے زبان انگریزی سے باعتبار اپنی سادگی اور قواعد صرف و نحو کی نرمی اور کثرت الفاظ کے بہت مشابہ ہو ضرورتاً قابل ہو کہ تمام مطالب عام اس سے کہ وہ ادبی ہوں یا فلسفیانہ یا سائنٹفک اس میں دیکھے جائیں۔ اردو کی نام نہاد کم مانگی ایہ عام طور پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ زبان اردو کوئی ایسا سٹریٹ ادب اپنے پاس نہیں رکھتا جس پر فی الحقیقت اس کو نامزد ہونا اپنے ارتقاء و ترقی کی کوئی خاص تاریخ رکھتی ہو۔ یورپین محققین اس کی طرف کم متوجہ ہوئے اور ہندوستانی ان سے بھی کم۔ بعض لوگوں کے نزدیک اس میں کوئی چیز قدیمیت کی نہیں پائی جاتی اور جب اس کا مقابلہ کلاسیکل (قدیم) اور تمدن مغربی زبانوں کے ساتھ کیا جاتا ہے تو اس کی بے حقیقی پوری طرح معلوم ہو جاتی ہے۔ ان اعتراضات کے دو جواب دیے جاسکتے ہیں ایک کہ جہاں تک اردو ادب تعلق ہے وہ کوئی قدیم چیز نہیں ہے اور کسی جدید ادب سے یہ توقع رکھنا کہ وہ قدیم زبانوں کی طرح بیش ہا ادبی خزانوں سے معمور ہو خلاف عقل ہے۔ اس کی ادبی زندگی فارسی سے علیحدہ کر بہت کم گزری ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ بہت ہونا زبان ہے اور اگر یہی رفتار ترقی رہی تو تھوڑے ہی عرصے میں یہ ایک ایسے ادب بالا مال ہو جائے گی جو دنیا کے بہترین ادبوں سے مقابلہ کر سکے گا اور اب بھی ہندوستان کی اور مرد و بھر زبانوں میں اس کا کوئی تدریجی مقابلہ نہیں ہے۔

اقسام ادب | اردو ادب دو بڑی قسموں پر منقسم ہو سکتا ہے (۱) مستقل تصانیف (۲) تراجم۔ ترجمے زیادہ تر زبان انگریزی فارسی عربی اور شاہ زادوں اور ہندی اور سنسکرت کے اردو لسانی زبانوں میں نیگالی، مرہٹی اور گجراتی سے بھی کیے جاتے ہیں۔

تصانیف | مستقل تصانیف نظم، نثر، ناول، ڈراما پر مشتمل ہیں۔ نظم اردو مختلف اقسام کی ہو اور نہایت پرکھنے والی اور مزے دار ہو۔ اس میں پسند و نفاق، اخلاق حسن و عشق کے افسانے، ایشیہ احمد نعت، بادشاہ وقت کی تعریف، ہجو طرانت اور زمانہ حال کی پھر نظمیں مختلف مضامین پر سب کچھ موجود ہیں۔ مشہور شعرا اردو دہلی و حالی، میر، اسودا، درو، ناسخ، آتش، ذوق، غالب، امیر، داغ، حالی، اقبال، احمر، اکبر کے نام نامی نہایت فخر کے ساتھ پیش کیے جاسکتے ہیں جن کے کلام کے سمجھنے کیلئے ایک خاص ذوق سلیم اور مناسب طبع کی ضرورت ہو۔ بالفعل نظم اردو کا بہترین انتخاب مولوی محمد ایاز برنی پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن نے ایک جدید اسلوب سے تین حصوں میں کیا ہے اور ہر حصہ (سٹاکا علیحدہ نام رکھا ہے یعنی (۱) معارف ملت (۲) جذبات فطرت (۳) انصاف قدرت۔ یہ تینوں حصے یا سٹاک بارہ جلدوں پر مشتمل ہیں۔ مؤلف نے ارادہ کیا ہے کہ ان میں نظم اردو کے صرف بہترین انتخابات پیش کیے جائیں اور اس غرض سے اکثر شعرائے اردو قدیم و جدید کا بہترین کلام باعتبار مضمون منتخب کیا ہے۔ بہر طور یہ ایک اعلیٰ درجہ کا مفید مجموعہ ہو اور کیا اچھا ہو کہ اس میں وقتاً فوقتاً اضافہ ہوتا رہے۔ مشہور نثاروں میں مرزا ادیب علی بیگ سرحد، سر سید، مولوی نذیر احمد، مولانا شبلی، مولانا آزاد، پروفیسر ذکا، اللہ مولانا صالحی کے نام گنائے جاسکتے ہیں اور سرشار، خسرو، مرزا اسو، راشد الخیری اور پرچم سے دنیا کے افسانہ نویسوں میں کون ایسا شخص ہو جو واقف نہ ہو گا۔

تراجم | تراجم کے ذیل میں بھی زبان اردو بہت مایہ دار ہے۔ دنیا کی اکثر مشہور مشہور کتابیں نظم اور نثر کی اردو میں ترجمہ ہو گئی ہیں مثلاً ہومر کی ایلیڈ، مہابھارت، راماین، شکنتلا، میگھ دوت، دکنم اردو کی رولنگھار، ملن کی ہیرا، ایزلاٹ ٹیگور کی گیتان جلی، چترمالی، اسی طرح ٹیگور کے اکثر ڈراموں سے اردو وال پہلک نذر علیہ ترجمہ کے خوب واقف ہیں۔ شیرڈین کے بعض ڈرامے اور ڈینیٹ، گوٹے، لانگ فلو

سوئے ایشی باؤن در دسورتھ، اور مین کی بھی اکثر مشہور شہروں نے اردو کا جا رہا ہے
 افسانوں اور دلوں میں ریناڈس، اسکاٹ امیری کالیری۔ اور کانڈیل کی تصانیف وہ لوگ بہت
 پسند کرتے ہیں۔ بنکم چندر چٹرجی کے قریب قریب سب دلوں اور نیگور کے بھی بہت سے قصبے اردو
 میں آگئے ہیں۔ ابھی تھوڑے عرصہ سے اسی دین رائڈہ میگرو، اسکرویلڈ، برنڈشا۔ اور پچ جی
 ویس کو بھی لوگ پسند کرنے لگے ہیں۔ نثار دس میں مکالمے، کارلائل، اسمائیس اور یک کی مشہور
 تصانیف ترجمہ ہو گئے ہیں۔ فلسفہ اور نفسیات میں فلاطون، ارسطو کی اکثر کتابیں نکلیا کے اقوال سنیکا کے
 فلسفیانہ خیالات، ریکے کے مکالمات، اسی طرح سکیں۔ ہیوم۔ کینٹ۔ مل۔ سین جیمس اور شادٹ کی بھی
 بعض تصانیف اردو میں موجود ہیں۔ تاریخ اور سوانح عمریوں میں پلوٹارک کی مشہور مشہور یونانیوں اور رومنوں
 کی سوانح عمریوں، ایلن کی تاریخ یونان، امیری کی تاریخ یونان، ڈوڈی کا اسپین اہل سلام کی حکومت
 دایس کی تاریخ دس، ایٹ کی سوانح عمری ہولین، بونا پارٹ گرین کی تاریخ انگلستان، ڈنسٹ
 کی تاریخ ہندوستان، قدیم فلسفین کی تاریخ ہندوستان، المکم کی تاریخ ایران، گرین کی تاریخ زوال
 سلطنت، ام۔ اور اسی طرح اور بھی مشہور مشہور کتابیں اردو میں جو ہیں۔ سیاسیات اور معاشیات میں حبیل کی
 قابل ذکر ہیں۔ ارسطو کی پالیٹکس، مل کا رسالہ بیرٹی اور پوٹیکل کا مانی وغیرہ بل کے قوانین، دولت، امور لی کا
 میکیاولی۔ لارڈ کرزن کا پریشا، مزینی کا فرائض انسان، شوستر کا اعتقاد ایران، یلیٹ کا مستقبل اسلام
 اسی طرح سیلی، دس، پالک، سوک، جونس، مارشل اور مارش کی بھی بعض بعض کتابیں۔ سیاسیات کے علاوہ
 بعض فلسفیانہ تاریخیں بھی ترجمہ ہو گئی ہیں مثلاً گیزر کی تاریخ تمدن، بکل کی تاریخ تمدن انگلستان،
 لیبان کی تمدن عرب اور تمدن ہند، بلی کی تاریخ اخلاق یورپ۔ ڈریپر کی تاریخ ارتقاء یورپ
 کی تاریخ قدیم تمدن ہند۔ فلسفہ تعلیم میں بھی اردو ساتھ ذیل کی تصانیف سے ناواقف نہیں ہو سہ
 بین۔ فردوسی۔ اشا، ڈوڈی، ہیریٹ۔ مانی سوری، سانس میں ڈیپر کی معرکہ اندھ ہٹ سانس، اڈ
 ڈارون، مہکل، ہکسلی، لایل، گیلی، ٹنڈل۔ بوس۔ کیلون، میکولی۔ کروک۔ اور سر آئیور لاج کی
 جدید تحقیقاتیں اردو میں آچکی ہیں۔ قانون اور طب کا ذکر بیکار ہے اس وجہ سے کہ اس کی اکثر کتابیں

بصورت ترجمہ ہو گئی ہیں۔

مذہبی لٹریچر اہل عرب فارس کا پورا اسلامی ادب اور سنسکرت ہندی کا ایک معتد بہ حصہ ترجمہ ہو گیا ہے۔ مذہبی کتابوں میں قرآن شریف۔ گیتا پران۔ مہابھارت۔ رامائن کے ایک نہیں بلکہ متعدد ترجمے موجود ہیں۔ اسی طرح اکابر دین مثلاً پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔ سری کرشن۔ سری رام چندر۔ گوتم بدھ۔ گوداناک اور کبیر کے بھی مفصل حالات زندگی۔ نیز متحدہ ایمان دین اور بڑے بڑے اہل دل صوفی اور رشی اور حکماء و شعراء اور نامی مورخین کے بھی حالات موجود ہیں مثلاً جوگیوں میں لہشت متصوفین میں مولانا رام اور حاکم اخلاق فلسفہ میں مغزالی اور سعدی شعراء میں فردوسی حکماء میں بوعلی سینا۔ مورخین میں بن خلکان ابن خلدون اور فرشتہ وغیرہ۔ ادب اردو کے سرچشمے [بالفصل ایسے سرچشمے جن سے ادب اردو کا ہر بھر باغ سیراب ہو رہا ہو حسب ذیل ہیں] عثمانیہ یونیورسٹی جس میں دارالترجمہ قائم ہو (۱) انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن (۲) اراکین اعظم گڑھ ان تینوں جامتوں کے حالات اپنی اپنی جگہ پر لکھے جا چکے ہیں اور یہاں ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہو۔ ان کے علاوہ بہت سی چھوٹی چھوٹی انجمنیں اور سوسائٹیاں ادب اردو کی اشاعت و ترقی کے واسطے دلی، لکھنؤ اور لاہور میں قائم ہیں۔

ہندوستانی اکیڈمی گورنمنٹ مالک متحدہ نے صوبہ کی کونسل کی دلچسپیوں سے مطمئن ہو کر اپنے صوبہ میں قائم شدہ ۱۹۲۷ء [ایک ہندوستانی اکیڈمی قائم کی ہو تاکہ اردو ہندی ادب کو ایک نمایاں ترقی کرنے کا موقع مل سکے۔ اسی اصول کو مد نظر رکھتے ہوئے اور اسی پر کاربند ہو کر اکیڈمی نے جو اغراض و مقاصد اپنے واسطے متعین کیے ہیں ان میں سے بعض حسب ذیل ہیں:-

- (۱) خاص خاص مفید مضامین پر بہترین کتابوں کے واسطے مقابلہ کے انعامات بخویر کرنا۔
- (۲) اچھی اچھی اور فائدہ مند اردو ہندی کتابوں کا ترجمہ اپنے تنخواہ و مسترجحوں سے کرانا اور ان کو اپنی طرف سے چھپوانا اور شائع کرنا۔
- (۳) اردو ہندی کی ترقی کی فرض سے عمدہ تصانیف اور تراجم کے واسطے ہندوستانی یونیورسٹیوں

ادبی انجمنوں یا دیگر مستحق اور قابل اشخاص کو مالی امداد دینا۔

(۴) قابل قابل اہل قلم کو اکیڈمی کی فیلوشپ (اعزازی مہتری) کے واسطے منتخب کرنا۔

اکیڈمی کے موجودہ نظام میں ایک کونسل اور ایکزیکوٹو کمیٹی داخل ہیں لیکن اصلی اختیارات فیلوں کے ہاتھ میں ہیں جن کا انتخاب کونسل سے ہوا کرے گا کونسل میں بالکل ایک پریسڈنٹ چھ کس نشینو ممبر اور تین معمولی ممبر شامل ہیں (ان میں جنرل سکریٹری داخل ہو) جن کو شروع میں گورنمنٹ نے نامزد کیا تھا۔ اور گورنمنٹ سے ابتدا میں مبلغ پچیس ہزار روپیہ بطور امداد کے اکیڈمی کو عنایت ہوا تھا۔ اور گورنمنٹ ہی نے سر تیتھ بہادر پیر کے بی۔ ایس۔ آئی کو اکیڈمی کا پریسڈنٹ اور ڈاکٹر تارا چند پی۔ ایچ۔ ڈی کو اس کا سکریٹری مقرر کیا تھا۔

اکیڈمی کا قیام سچ پچھے تو اس عہد کے گورنر صاحب شہنشاہ کا لراؤ ذاتی ہذا کلسنی سروریم میرس کی خاص اہلی مدد تھی اور مدد ہی۔ ان کے دشمن خیال جو ان بہت اور موقع شناسانہ تعلیم آریل رائے راجیشور علی صاحب کی ان تھک کوششوں دریش بینوں اور نریش دیار ترائی صاحب نگم کی سعی ملطف کا معقول نتیجہ ہو کہ یہ مبارک اسکیم انھیں حضرات کی محنت و جانی اور حقیقی دلچسپی کی وجہ سے درجہ تکمیل کو پہنچی اور انھیں کی آبیاری سے یہ تنخم سرسبز ہوا۔ اکیڈمی اپنے جدید العصر حلق و متواضع پریسڈنٹ اور اپنے فاضل سکریٹری اور نیز اپنے قابل ممبروں کی کوششوں اور گورنمنٹ صاحب کی نظر عنایت سے ضرور ایک درختانہ مستقبل اور ایک باسوئی طمع نظر اپنے سامنے رکھتی ہے۔

اردو کا رسم الخط | شاہجہاد اورنگ آباد اور حیدر آباد میں اردو کے رسم الخط کی درستی اور ترمیم کے واسطے بڑی کوششیں ہو رہی ہیں۔ اسی غرض سے اکثر کمیٹیاں قائم ہوئی ہیں جنہوں نے اپنی تجاویز ہلکے سامنے پیش بھی کیں مگر سنا جاتا ہو کہ یہ جدید رسم الخط نو آموزوں کے واسطے نہایت پیچیدہ شکل اور پریشان کن ہو اور اس خطا پڑھنے اور غلط لکھنے دونوں کا قوی احتمال ہو ممکن ہو کہ بعض رسم قسم کے نقصان کے اظہار میں غلط یا غلط فہمی ہوئی ہو مگر اتنا ضرور صیح معلوم ہوتا ہو کہ جو خط لکھتے تحریر میں جو نقصان در کیاں ہیں ان پر ہر بین فن کی توجہ ضرور مبذول ہوئی اور یقیناً اس قسم کی خرابیاں کبھی نہ کبھی ضرور دفع ہو جائیں گی۔

ضمیمہ تاریخ ادب اردو

بعد تیاری کتاب اصحاب فیل کے حالات دستیاب ہوئے جو ضمیمہ کی صورت
میں درج کیے جاتے ہیں
نظر لکھنؤی

ذہبت رائے نظر ایک معزز سکینہ کا بیٹا خانہ دان سے تعلق رکھتے تھے جس کے افراد زائد ذیلی
میں لکھنؤ میں معزز و ممتاز سمجھے جاتے تھے۔ نظر لکھنؤ میں ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے غیر
معمولی ذہانت کے آثار ان کے چہرے سے نمایاں تھے، اردو فارسی اور انگریزی کی ضروری تعلیم سے
فراغت حاصل کر کے ہمہ تن شعر و شاعری میں مہمک ہو گئے جس سے کہ اس وقت فضائے لکھنؤ
ہو رہی تھی۔ ستمبر ۱۸۹۶ء میں اپنا مشہور ادبی رسالہ "خندنگ نظر" لکھنؤ سے جاری کیا۔ جو شروع
میں تو صرف مجموعہ مغزلیات ہوتا تھا مگر بعد کو کچھ نشر کے مضامین بھی اس میں شامل ہوتے تھے
شاعری میں آغا نظر لکھنؤی سے تلمذ تھا جن کی کوشش سے مشاعرے منعقد ہوتے تھے اور
انہیں مشاعروں کی غزلیں "خندنگ نظر" میں درج ہوتی تھیں۔ یہ رسالہ تھوڑے عرصہ تک
جاری رہ کر بند ہو گیا۔

۱۔ "خندنگ نظر" پیام یار کے بعد لکھنؤ کا سب سے قدیم اور مشہور مکتبہ تھا اس کی اشاعت
اصفی پریس نانچنگ لکھنؤ سے ہوتی تھی اور حضور نظام سابق میر محبوب علی خاں حوم کے نام نامی کے ساتھ منون تھا۔
پہلے اس کے ٹائٹیل پر یہ شعر دیا جاتا تھا "ماں میں گرنگ فتنہ گر سے آپ : بہلائیں لکھنؤ خندنگ نظر" آپ
کچھ عرصہ کے بعد یہ شعر دیا جانے لگا۔ نکلا ہو بن سنو کے خندنگ نظر : نظر : یاں دل دھڑکے اب کسی کی نظر :
۲۔ غالباً سنہ ۱۹۰۱ء میں بند ہوا۔

۱۹۰۲ء میں نظر رسالہ زمانہ کے سب ایڈیٹر مقرر ہوئے اور اپنی خدمات نہایت قابلیت و استعداد سے انجام دیتے رہے جیسا کہ اُس وقت کے رسالہ نگاروں کے مضامین کی عمدگی سے ظاہر ہوتا ہے۔ ۱۹۰۳ء میں ایڈیٹر پریس الکاہاد کی طلبی پر الکاہاد گئے اور رسالہ ادیب کی ایڈیٹری پر فائز ہوئے جو اُس وقت نیا نیا جاری ہوا تھا اور اردو رسالوں میں یہ اول درجے کا اور موثر پرچہ سمجھا جاتا تھا۔ نظر نے اس نوازش کا ائیدہ پچے کو اپنے سائے عاطفت میں لیا اور انھیں کی تربیت میں پروان چڑھا اور اس کو وہ شہرت حاصل ہوئی کہ جو کسی اردو رسالے کو نہ اُس وقت تھی اور نہ اب ہے۔ نظر کا تعلق ادیب کے ساتھ تقریباً ڈیڑھ دو سال تک رہا جس کے بعد اُن کو پھر کانپور آنا پڑا اور وہ زمانہ کے اسٹاف میں دوبارہ داخل ہوئے۔ اب کی مرتبہ تقریباً دو سال تک کانپور میں رہے اور ہفتہ وار "آزاد" کی نگرانی بھی اب اُن سے متعلق ہو گئی۔ ۱۹۱۱ء میں وہ لکھنؤ آ گئے اور یہاں زبان اردو کے مشہور محسن اور شعرو شاعری کے دلدادہ مسٹر حامد علی خاں بیرسٹر مرحوم کی وساطت سے طے ہمارے منشی پراگ نراین بھارگو مالک نول کشور پریس دادوہ اخبار سے ملے اور منشی صاحب موصوف ہی کی نظر عنایت سے نظر کو اخبار تفریح کی ایڈیٹری اور تھوڑے عرصہ کے بعد لکھنؤ کے سب سے قدیم اور مشہور ادب اخبار کی ایڈیٹری بھی مل گئی۔ اس میں انھوں نے اس قدر محنت اور جہاں فتانی سے کام کیا کہ آخر صحت خراب ہو گئی اور اسی کے ساتھ روحانی آلام کا بھی سامنا ہوا یعنی اُن کا پیارا نواسہ جس سے وہ بہت مالوس تھے چل بسا اور کچھ عرصہ بعد اس بچے کی ماں یعنی اُن کی اکلوتی بیٹی بھی داغ مفارقت دے گئی جس سے کہ اُن کا جو رخ شادمانی گل ہو گیا اور ان جانفز ساحادوں کی بددلتی کو اپنا تعلق ادب اخبار سے بھی قطع کرنا پڑا۔ انھیں حادثات اور مالی دشواریوں کی وجہ سے اُن کی زندگی کا آخری حصہ بہت تلخ ہو گیا تھا۔ آخر کار دوسرے کے موذی مرض میں ایک عرصہ تک مبتلا رہ کر ۵۷ برس کی عمر میں ۱۰ اپریل ۱۹۲۳ء کو اس جہان فانی سے رحلت کی اور دنیا سے ادب کو اپنا سوگوار چھوڑ گئے۔ لکھنؤ کا گلشن شاعری اس بلبل خوش الحان کے اٹھ جانے سے سونا ہو گیا۔ تمام شعراء لکھنؤ کو جن کو اُن سے دوستی اور محبت کا بیونہ تھا اس

واقعہ جانگداز سے دلی صدمہ ہوا۔ اکثر نے تاریخیں کہیں جن میں مرزا کاظم حسین محشر لکھنوی نے ادوہ تاریخ خوب نکالا ہے۔

شاعر کامل نظر سے چھپ گیا

کلک محشر نے نکھا سال وفات

نظر ایک فطری شاعر تھے اور یہی قدرتی میلان طبع اور کہنہ مشقی اُن کی قدرت زبان اور کمال شاعری کا راز تھے۔ تلخ بھی اُن کو لکھنؤ کے ایک مشہور اور مستند استاد سے ملا تھا۔

رسالہ زمانہ ستمبر ۱۹۱۹ء میں نظر نے اپنے ابتدائی شوق کا حال نیز یہ کہ شش ماہ میں اُن کو انظار سے شرف تلخ کیونکر حاصل ہوا تھا نہایت دلکش طریقے سے قلمبند کیا ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا مصائب آلام کی گھنگھو گھنگھو گھنگھو نے اُن کی آخر عمر کو تیرہ دن دیا تھا جس کا اثر حزن و ماتم کی صورت میں اُن کے کلام پر بھی چھا گیا تھا جیسا کہ ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے۔

نظر اب چل کے کرنا چاہیے آباد مرقد کو
موت سے کیا ساز کر دکھا ہو اُس نے اے نظر
زندگی کی کشمکش سے مر کے پائی کچھ نجات
میت سے ڈھونڈتا ہوں ملتا مگر نہیں ہو
دل تھا تو ہو رہا تھا احساس زندگی بھی
آہیں بھریں بہت کچھ دم توڑنا ہے باقی
تو ایک ہو گئی ہے دنیا ہی جب نظریں
دنیا سے جا رہے ہو کیا لے کے اے نظرم
طول غم سے مختصر غم کی کہانی ہو گئی
ختم و بچھی تری اے دایہ فانی ہو گئی
ہر قدم پر ایک نالہ ہر قدم پر ایک آہ
بھر میں لکھوں بھاری ہو برابر بل اشک

بہت ہے منظر اپنی زمیں گود غریباں کی
میتیں گزریں سبب گھلتا نہیں تاخیر کا
اس سے پہلے اے نظر فرصت کبھی ایسی نہ تھی
وہ اک سکون خاطر جو بیشتر نہیں ہے
زندہ ہوں اب کہ مر وہ مجھ کو خبر نہیں ہے
اس آہ میں بھی دیکھوں ہے یا اثر نہیں ہے
پھر کوئی امتیاز شام و سحر نہیں ہے
زاد سفر نہیں ہے۔ رخت سفر نہیں ہے
جب بھری اک آہ دل کی نوحہ خوانی ہو گئی
ہم بھی زندہ تھے کبھی وہ زندگانی ہو گئی
زندگی کیا ایک شرح سخت جانی ہو گئی
بند دو کو زردوں میں دریا کی ردانی ہو گئی

مے کو دنیا آتش سٹیاں کستی ہے نظر
لیکن اپنے جام میں آتے ہی پانی ہو گئی

کچھ اندر وہ یاس ہی پر موقوف نہیں نظر کے کلام میں سلاست زبان لطف بیان اعلیٰ تمیز
غرض کہ جملہ محاسن شاعری علیٰ انخصوص وہ سب چیزیں جو غزل گوئی کی جان ہیں پوری طرح موجود
ہیں وہ غزل ہی خوب کہتے تھے اور اسی صنف میں وہ اپنے امثال و اقربان میں ممتاز تھے اور وہ لوگ
اُن کی بڑی قدر و عزت کرتے تھے۔ اُن کے چند اشعار غزل جو رسالہ زمانہ اور دیگر رسالوں میں
چھپ چکے ہیں منتخب کر کے بطور نمونہ یہاں دیے جاتے ہیں۔

خودش دہر بھی اک گز دش پہانہ ہو
اک طبیعت کی اُداسی کا اثر اتنا ہے
حالت محفلِ عشرت ہے رقم سب اس میں
پُر تو ہر کجا ذرہ ناچیس نہ کجا
بترے ملنے کا وہ تقریب جو ہے یاد اب تک
ذرہ ذرہ میں ترا جلوہ مستانہ ہے
ساری دنیا نگہ یاس میں دیرا نہ ہے
ایک دفتر کے برابر پُر پروانہ ہے
کیوں یہ دل حسرتی جلوہ جانا نہ ہے
جس سے کہتا ہوں کہ کتاب ہے اک افسانہ ہے

دل کی حالت نہیں سنہلنے کی
دیکھ لو سیر دم نکلنے کی
دل سوزاں کو شمع کیا کہئے
اب یہ دنیا نہیں بدسننے کی
یہ ہوا پھر نہیں ہے چلنے کی
اُس کو حسرت کہاں ہے چلنے کی

مردس بھی نہایت عمدہ کہتے تھے۔ وہ مردس جو بطور مرثیہ اپنے پیارے نواسے کی موت پر
کہا تھا نہایت درد انگیز و مؤثر ہے۔ دو بند ملاحظہ ہوں۔

ہوا تمام اُمیدوں کا خاتمہ تم پر
جہاں میں اپنا ہوا انجام کیا نہیں ہو خبر
کسی سے اب نہ توقع نہ ہے کسی پہ نظر
مڑے پہ دیکھئے ملنا ہے اب کفن کو نہ کر

کہاں گئے مر کا بگڑی سنوائے والے
پکارو مجھے لا لہ پکارنے والے

تھو تھو کہ اس اُجڑے مکان کا تھا یہ چراغ
ہو گا اب مجھے حاصل کبھی جہاں میں نرساغ

بہار پر تھا اسی زونہاں سے یہ باغ
تمام عمر دل ناؤاں ہے اور یہ واغ

نغان بیل جاں دل کے پار ہوتی ہے
نظر کے باغ سے رخصت بہار ہوتی ہے

اسی طرح اُن کا وہ مسدس بھی جو جنوبی افریقہ کی سستیہ گڑھ کے موقع پر کہا تھا دل ہلا دینے والا ہے۔ آخر عمر میں جدید رنگ میں بھی طبع آزمائی کی شروع کی تھی مگر اس میں زیادہ کامیاب نہ ہو سکے کیونکہ جب کبھی اس رنگ میں کہنا چاہتے تھے وہ پُرانا رنگ بھٹکتا تھا اور وہ کلام بھی غزل ہی معلوم ہونے لگتا تھا۔

علاوہ شعر و شاعری کے وہ فن تنقید اور شری نگاری میں بھی بہت ممتاز تھے۔ عرصہ تک رسالہ زمانہ میں نقاد لکھنوی کے نام سے کتابوں پر ریویو لکھتے رہے۔ معرکہ چلبست و شر میں جو شہسوی گلزار نسیم کے متعلق چھڑ گیا تھا انھوں نے نمایاں حصہ لیا اور اُن کی رائے ہمیشہ بہت اچھی لگی غیر جانبدارانہ اور مصفاانہ ہوتی تھی جس سے اُن کی ذاتی قابلیت اور شاعرانہ مہارت کا پتہ چلتا ہے

اس بات پر نظر رکھتے ہوئے کہ وہ جدید طریق تنقید سے کما حقہ آگاہ نہ تھے اُن کے ریویو اور ادبی تنقیدیں حیرت انگیز معلوم ہوتی ہیں۔

مختصر یہ کہ نظر ایک اعلیٰ درجہ کے غزل گو اور نقاد تھے ہر چند کہ اُن کا کلام کسی نئے پیام کا حامل نہ تھا۔ اُن کا کلام سلاست و روانی و پاکیزگی میں درگاہ سہائے سُرور کے کلام سے بہت مشابہ ہے۔ بافضل نشی بیشیر، رشاد سنو، نظر کے شاگردوں میں لکھنوی میں موجود ہیں۔ انھوں نے نظر کا کلام علاوہ اُس کے جو رسالوں اور گلدستوں میں شائع ہوا جمع نہ ہو سکا۔ بہارے نزدیک اگر کوئی بہت شخص اُن کا پورا کلام کجا کہ کے اس کو شائع کر دے تو اُس سے ادب اردو میں ایک مفید اور قیمتی اضافہ ہو جائے گا۔

چلبست لکھنؤی

تحریک جدید کے مشہور لیڈر۔ روش تازہ کے صحیح راہبر، زمانہ حال کی شاعری کے رکن، کس روش قدیم و جدید کے جامع۔ پنڈت برج نرائن چلبست فیض آباد میں ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے۔ اوائل عمر ہی میں اپنے وطن اصلی لکھنؤ میں آگئے جہاں ابتدائی تعلیم سے فراغت کر کے ۱۹۰۵ء میں کیننگ کالج سے بی۔اے کی ڈگری اور ۱۹۰۸ء میں قانون کی ڈگری حاصل کی۔ لکھنؤ ہی میں دکالت شروع کر دی اور تھوڑے ہی عرصہ میں اپنی قابلیت ایمانداری، استعداد اور سب سے زیادہ اپنی خوش اخلاقی سے دکلاؤ کی صف اول میں آگئے۔ اور ان کی ذات سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ ہو گئیں مگر افسوس ہے کہ عنفوان شباب میں ایک عجب حسرتناک طریقے سے انتقال کیا یعنی ۱۲ جنوری ۱۹۲۶ء کو جبکہ وہ کسی مقدمہ کی پیروی میں رائے بریلی گئے ہوئے تھے۔ واپسی کے وقت ریلوے اسٹیشن پر ایک شدید دورہ فالج کا ہوا جس سے کہ بے حس و حرکت ہو گئے اور زبان بند ہو گئی اور قریب سات بجے شام کے اسٹیشن ہی پر روح مفارقت کر گئی۔ جب یہ وحشتناک خبر ان کے بڑے بھائی رائے بہادر پنڈت ہماراج نرائن چلبست کو پہونچی تو وہ فوراً آگئے اور لاش موٹر پر لکھنؤ لے آئے۔ اس سانحہ عظیم سے لکھنؤ بھر کو جو صدمہ و قلق ہوا لائق بیان نہیں، حد امیتیں بند کر دی گئیں۔ سر لوئی اسٹوارٹ چیف جج اور مسٹر کینڈل ڈسٹرکٹ جج لکھنؤ نے اپنے اپنے اجلاس پر اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے مرحوم کے قلب و دماغ کے صفات عالیہ کی بہت تعریف کی اور ان کی اس ناگہانی موت پر بے حد رنج و قلق کا اظہار کیا۔ دنیا نے ادب بھی اظہار رنج و دلال میں کسی سے پیچھے نہیں رہی۔ تعزیتی جلسے منعقد کیے گئے جن میں مختلف مذاہب کے لوگوں نے مؤثر اور دردناک تقریریں کیں۔ بڑے بڑے شعراء اور ادباء نے در داگیر اشعار اور مضامین سپرد قلم کیے تاہم انہیں کہیں جن میں سے بعض چیدہ چیدہ اشعار جو اس موقع پر کہے گئے تھے نذر ناظرین کیے جاتے

ہیں۔ صنفی صاحب فرماتے ہیں کہ

شیخ بزم شعرا برج نرائین چکبست داغِ فرقت سے تمھارے ادبِ اردو پر شورِ ماتم ہے بپا حلقہٴ احباب میں آج ماتے بتیابی دل اور وہ بے تابی دل	بے وفا عمر نے تم سے نہ وفا کی افسوس دہر سفاک نے اک تازہ جفا کی افسوس شان اس بزم میں ہے بزمِ عز کی افسوس جب زباں بند ہوا کہ بکتہ سرا کی افسوس
----------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------	-------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------

عزیز لکھنؤی فرماتے ہیں کہ

شاعرِ نکتہ سرا برج نرائین چکبست حادثِ قوم صفا کیش مر بخان و مرغ سبق آموز ہے ہر نظم مرصع اس کی	جس کو قدرت نے دیا ذوقِ سخن و ذراست ساقیِ میکدہٴ نکتہ رسی حجام بدست صاف ترشے ہوئے ہیرے ہیں کہ لفظوں کی نشست
-----------------------------------------------------------------------------------------------------	------------------------------------------------------------------------------------------------------------------

ان کے علاوہ محشرِ محروم اور سحرِ ہنگامی نے بھی مؤثر نظمیں لکھیں علی الخصوص آخر الذکر کا کما
ہوا مرثیہ نہایت مؤثر اور حسرت انگیز ہے۔ مگر محشر صاحب نے کمال کیا کہ مرحوم ہی کے ایک مشہور
مصرع سے لفظ عزا (۷۸) کا قہمیہ کر کے ایک نہایت عمدہ تاریخ بنائی ہے

ان کے ہی مصرع سے تاریخ ہے ہمراہ حرا	موت کیا ہے ابھیں اجڑا کا پریشاں ہونا
-------------------------------------	--------------------------------------

چکبست کو شعر و شاعری کا شوق بچپن ہی سے پیدا ہو گیا تھا کہا جاتا ہے کہ انھوں نے نو برس
کی عمر میں غزل کہی تھی۔ طالبِ علمانہ زندگی میں بھی وہ اس شغل سے بے پروا نہیں رہے۔ بلکہ
کالج کے مشاعروں میں شریک ہو کر خراجِ تحسین کے علاوہ انعام اور تحفے بھی حاصل کرتے رہے۔
مگر شاعری کو وہ ان مرتبہ سمجھ کر یا شہرت طلبی سے عار کرتے ہوئے کبھی انھوں نے کوئی تخلص
نہیں اختیار کیا۔ ضرورت کے موقع پر صرف لفظ چکبست پر جو ان کا خاندانی نام تھا اکتفا کرتے
تھے۔ خود کہتے ہیں کہ

ذکر کیوں آئے گا بزم شعرا میں اپنا	میں تخلص کا بھی دنیا میں گنہ گار نہیں
-----------------------------------	---------------------------------------

شروع میں معمولی غزل کہتے تھے مگر کچھ عرصہ بعد قومی، سیاسی، سوشل اور نیچرل نظموں پر

آ رہے جن میں انھوں نے کمال حاصل کیا۔ مسدس کا شوق اُن کو بہت تھا۔
تخلص کے ساتھ انھوں نے فرسودہ طریقہ استادِ و شاگردی کو بھی خیر باد کہا تھا یعنی کسی کے
شاگرد نہیں تھے اور صحیح معنوں میں تلمیذ الرحمان کہے جانے کے مستحق تھے۔ اساتذہ قدیم مثلاً میر و
غالب ایسے دانش و غیرہ کے سرچشموں سے سیراب ہوتے اور انھیں بزرگوں کے کلام کو سامنے رکھ کر
طبع آزمائی کرتے تھے۔ نثر میں مولانا محمد حسین آزاد کے پیرو تھے۔

چکبست کا مطلع نظر بہت وسیع تھا۔ چنانچہ مثنوی گلزارِ نسیم کے دیباچہ میں لکھتے ہیں "یاد رہے
کہ محض عیارتِ سادہ نظم کرنا شاعری نہیں ہے۔ شاعری کی عام تعریف یہ ہے کہ نثر سے زیادہ دلکش
ہو اور پُرناثرب ہو..... برخلاف نثر کے شاعری میں یہ اصول مد نظر رہتا ہے کہ جو مضمون باندھا
جائے اور محض ایک حالت کا اشارہ کرے۔ ترکیب الفاظ ایسی ہو کہ اُس حالت کی نسبت مختلف
نقشے پر مصنف دلوں کی آنکھوں کے سامنے گور جائیں؛ بندش الفاظ پر بہت زور دیتے تھے گویا
یہ شعر آتش کا اُن کے پیش نظر تھا۔

بندش الفاظ جوڑنے سے نگوں کے کم نہیں	شاعری بھی کام ہے آتشِ رصع سا ذکا
-------------------------------------	----------------------------------

بندش الفاظ کے ساتھ مناسب ہندی الفاظ بھی موقع موقع سے خوب صرف کرتے تھے اور
جدید رنگ کے مضامین اور خیالات کو صاف سادہ اور سلیس طرز میں کہنے پر قدرت رکھتے تھے۔
چنانچہ خود کہتے ہیں۔

نیا مسلک نیا رنگِ سخن ایجاد کرتے ہیں	عروسِ شعر کو ہم قید سے آزاد کرتے ہیں
--------------------------------------	--------------------------------------

چکبست کا مطبوعہ منظوم کلام بہت مختصر ہے۔ اس کی وجہ شاید یہی ہو کہ آخر میں اپنے پیشہ کے
کام میں مصروف رہنے کی وجہ سے شعر کہنے کا وقت بہت کم نکال سکتے تھے۔ اُن کا مجموعہ نظم و نثر اندین
پریس الہ آباد میں چھپ گیا ہے جس پر ادبِ اردو کے دلدادہ محسن سر تیج بہادر سپرو نے ایک
فاضلانہ مقدمہ بھی اضافہ کیا ہے۔ اُن کی تنقیدات اور دیگر مضامین بھی اُسی پریس سے شائع ہوئے
ہیں۔ چکبست نے خود ایک ماہِ امد سالہ "صبحِ امید" کے نام سے شاعری میں جاری کیا تھا۔ جو

سرورٹ آف انڈیا سوسائٹی کا پرچہ تھا اس میں وہ اکثر لکھتے رہتے تھے مگر ان کے مضامین زیادہ تر سیاسی رنگ کے ہوتے تھے۔ ہمارے خیال میں یہ مضامین کتابی صورت میں اب تک شائع نہیں ہوئے ہیں۔

بحیثیت غزل گو | بحیثیت غزل گو چکیت پرانے رنگ سے بالکل علیحدہ رہنا چاہتے تھے۔ انھوں نے صنف غزل میں ایک خاص جدت اور ترقی کی اور قدیم طرز سے علیحدہ رہے۔ پرانے فرسودہ تشبیہات و استعارات اور لوازمات غزل گوئی کو یک قلم خارج کر دیا اور شیرینی اور صفائی کا خاص طور پر خیال رکھا اور یہی چیزیں ان کے کلام کے ماہر امتیاز جوہر ہیں۔ ان کے مجموعہ نظم میں بمشکل پچاس غزلیں نکلیں گی اور ان میں بھی اکثر نامعلوم ہوتی ہیں مگر انھیں میں انھوں نے اپنی سحرکاری اور جادو نگاری کا پورا کوشش دکھا دیا ہے۔ کہیں کہیں فلسفہ اور اخلاق اور نصیحت آمیز شعر بھی خوب کئے ہیں۔ ان کے اکثر اشعار دار الضرب کے سنگہ شاہی ہیں اور بقا و دوام کے مستحق ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا
اجل کیا ہے خار بادہ ہستی اُتر جانا
دین کیا ہے کسی کا دل کی پرستش کرنا
اگر تھوڑی سی ہمت ہو تو پھر کیا ہو نہیں سکتا
نہیں تو کون قطرہ ہے جو دریا ہو نہیں سکتا
مرنے کا الم ہوتا نہ جینے کا مزا ہوتا
یہی جنت ہے میری اور یہی باغ ارم میرا
نہیں تو ہے بہت آسان اس جینے سے مر جانا
کہ جیسے عکس گل رہتا ہے آب جوئے گلشن میں
جیسے گنگا میں جھلکتی ہے چمک تاروں کی

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب
فنا کا ہوش آنا زندگی کا دردِ سر جانا
آبرو کیا ہے تنائے وفا میں مرنے
کمالِ بزدلی ہو پست ہونا اپنی آنکھوں میں
اُبھرنے ہی نہیں دیتی ہیں بے مانگی دل کی
اگر دردِ مبتلا سے نہ انسان آشنا ہوتا
دلِ اجاب میں گھر ہے شگفتہ رہتی ہے خاطر
وہ سودا زندگی کا ہے کہ غم انسان ہوتا ہو
جہاں میں روکے یوں قائم ہوں اپنی بے ثباتی پر
دل میں اس طرح سے ارباب ہیں آزادی کے

ہمارے اور داغظوں کے مذہب میں فرق اگر ہے تو اس قدر ہے
کہیں گے ہم جس کو پاس انسان وہ اُس کو خوف خدا کہیں گے

طویل نظیں

ان کی طویل نظیوں میں علاوہ مذکورہ بالا خوبیوں کے مقامی رنگ اور مندی الفاظ کا
بھی بہت خوشگوار اضافہ ہے جس سے کلام کا اثر دہ بالا ہو جاتا ہے ان نظیوں کا ملکی رنگ قدم ملکی
روایات، رسم و رواج کا شمول انہیں نے تشبیہات و استعارات، اعلیٰ آئینہ ان کی نظیوں کو ادبی
جو اہر و پرے بنادیتے ہیں چکیت کی اس قسم کی نظیں پانچ قسموں پر تقسیم ہو سکتی ہیں (۱) مراشی جو
ہندوستان کے مشہور لیدروں کی وفات پر کہے گئے (۲) قومی و سیاسی نظیں جو ملک کے اہم سیاسی
مضامین پر لکھی گئیں جن سے اعلیٰ تخیل کے ساتھ شاعر کے سیاسی آئینہ کا بھی پتہ چلتا ہے بلکہ اگر
غور سے دیکھا جائے تو وہ درحقیقت تمام تعلیم یافتہ فوجانان ہند کی بلند خیالیوں کی حقیقی ترجمان
ہیں (۳) سوشل نظیں (۴) مذہبی نظیں (۵) انجیل نظیں۔

مراشی اس صنف میں وہ پر زور اور درد انگیز نظیں شامل ہیں جو ملک کے جاں نثار لیڈروں
اور آزادی کے علم برداروں کی وفات پر شاعر کے قلم سے نکلیں۔ یہ عموماً مسدس کی شکل میں ہیں اور
جوش و تاثیر میں ڈوبی ہوئی ہیں بلکہ فی الحقیقت یہ وہ آزادی اور حریت کے خیالات ہیں جو کسی
علمبردار آزادی کے اس دنیا سے رخصت ہونے پر شاعر کے دل میں موجزن ہوئے اور زبان قلم
سے آنسو کی طرح ٹپک پڑے۔ چند بند یہاں بطور نمونہ دیے جاتے ہیں وہاں کہ سن گو کھلے
کے متعلق ۷

اصل کے دام میں آنا ہیوں تو عالم کو
ہاٹ کہتے ہیں دنیا میں ایسے ہی غم کو
مگر یہ دل نہیں تیار تیرے ماتم کو
مٹا کے تجھ کو اجل نے مٹا دیا ہم کو

جنازہ ہند کا در سے ترے نکلتا ہے
سہاگ قوم کا تیری چتا میں جلتا ہے

بال گنگا دھرتی کے متعلق ۷

<p>اتھ گیا دولت ناموس وطن کا وارث جاں تشار اذنی شیر و کن کا وارث</p>	<p>قوم مرحوم کے اعزاز کمسن کا وارث پیشواؤں کے گرجے تھے رن کا وارث</p>
<p>تھی سائی ہوئی بونا کی بہا سائیکھوں میں آخری دور کا باقی تھا خمار آنکھوں میں</p>	
<p>ہنڈٹ لبٹن نرائن در کی دائمی مفارقت پر سہ</p>	
<p>ہم نے دیکھے ہیں ترے اشک محبت اکثر دو نیگینے تھے حقیقت کے ترے قلب جگر</p>	<p>جن پہ صدقے ہیں زباں اور قلم کے جوہر ہوئی غیردوں کو نہ اس پاک خزانہ کی خبر</p>
<p>ظاہری حسنِ لیاقت کے یہ دیوانے ہیں شمع دیکھی نہیں فانوس کے پردانے ہیں</p>	
<p>تری تھیں ان میں بھی سب دہی انداز میں اور دہی پتے جذبات جلوہ گر ہیں جو مرثیوں میں نمایاں ہیں وہی شنگی الفاظ وہی اعلیٰ اور اچھوتے خیالات۔</p>	
<p>لے خاک ہند تیری عظمت میں کیا گمان ہے تیری جبین سے طور حسن ازل عیاں ہے</p>	<p>دیائے فیضِ قدرت تیرے لیے رواں ہے اللہ ای زریب زینت کیا اوج عرشاں ہے</p>
<p>ہر صبح ہے یہ خدمت خورشید پر ہنسنا کی بکریوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیا کی (از خاک ہند)</p>	
<p>جو دل سے قوم کے نکلی ہے وہ دعا ہو یہی دلوں کو مست جو کرتی ہے وہ ادا ہو یہی</p>	<p>کھا جس پہ ناز مسیحا کو وہ صدا ہو یہی غریب ہند کے آزار کی دوا ہے یہی</p>
<p>نہ چین آئے گا بے ہوم دل پائے ہوئے فقیہ قوم کے بیٹھے ہیں کو لگائے ہوئے</p>	
<p>یہ جوشِ پاک زمانہ دبا نہیں سکتا یہ آگ دہ ہے جو پانی بجھا نہیں سکتا</p>	<p>رگوں میں خوں کی حرارت مٹا نہیں سکتا دلوں میں آگ کے یہ ارمان جابھن سکتا</p>

(وطن کا راگ)	طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بے نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بے	
آبرو قوم نے پائی ہو وہ دن آیا ہے مرنے والوں کی دفا کا بھی سرا یا ہے	تو نے پودا جو لگا یا تھا وہ پھل لایا ہے ہم نے بھولے ہوئے درخت کا نشان یا ہے	
	دل تڑپتا ہے کہ سورج کا پیغام ملے کل ملے آج ملے صبح ملے شام ملے	
دل کی بہتی ہوئی گنگا کی روانی رک جائے پر یہ ممکن نہیں اب جوش جوانی رک جائے	حکم حاکم کا ہے فریاد زبانی رک جائے قوم کہتی ہو ہوا بند ہو پانی رک جائے	
(سربست کی نظر بند کیا پر)	ہوں خبر داد جنہوں نے یہ ذیت ہی ہو کچھ تماشا نہیں یہ قوم نے کر ڈالی ہو	
جب علماء میں مہاتما گاندھی ہندوستانی باشندوں کی حالت پر غور کرنے اور اس کو سدھارنے کے لیے جنوبی افریقہ گئے تو چکیت نے ایک پرتماشیر نظم "فریاد قوم" کے نام سے لکھی جس میں مہاتما جی کو مخاطب کر کے کہتے ہیں ۔		
دطن سے دُور ہیں ہم پر نگاہ کر لینا	ادھر بھی آگ لگی ہے ذرا خبر لینا	
۱۹۱۷ء میں جب انڈین نیشنل کانگریس میں کچھ نفاق و شقاق پیدا ہوا تھا جس سے بعض لیڈر کانگریس سے علیحدہ ہو گئے تو انہوں نے "نالہ درد" کے نام سے ایک نظم تیار کی اسی طرح لکھنؤ کے اجلاس کانگریس منعقدہ ۱۹۱۷ء میں ایک زوردار نظم پڑھی تھی جس کا ایک شعر اس وقت یاد ہے ۔		
برطانیہ کا سایہ سر پر قبول ہو گا	ہم ہوں گے عیش ہو گا اور ہوم وِل کا	
جگ عظیم میں شرکت کے لیے جب ہندوستانی سپاہی یہاں سے روانہ ہونے لگے تو وہ ان سے اس طرح مخاطب ہوتے ہیں ۔		
ہاں دیرانِ وطن دھاک بٹھا کر آنا	ظن ہے جو من خود میں کا مٹا کر آنا	

ندیوں خون کی برسن میں بہا کر آنا	قیصری تخت کی بنیاد ہلا کر آنا
	یہی گنگا ہے سپاہی کے ہنار کے لیے دھار تلوار کی ہے یار لگانے کے لیے
سوشل نطیس سوشل معاملات کی اصلاح میں بھی مثل سیاسی معاملات کے ان کا مسلک میانہ ردی اور اعتدال پسندی تھا۔ ان کی نظم "پھول مالا" جو ہندوستانی عورتوں کے واسطے ہو عورتوں کو بہت زیادہ آزادی اور تفریح (انگریزیت) کی خرابیوں سے متنبہ کرتی ہے، کہتے ہیں ۵	
داغِ تعلیم میں اپنی نہ لگانا ہرگز تم اس انداز کے دھوکے میں نہ آنا ہرگز ایسے پھولوں سے نہ گھرا اپنا سجانا ہرگز خاک میں غیرتِ قومی نہ ملانا ہرگز پردہ شرم کو دل سے نہ اٹھانا ہرگز اُس کو تفریح کا مرکز نہ بنانا ہرگز	روشِ خام پر مردوں کے نہ جانا ہرگز نام رکھا ہو غائش کا ترقی و رفارم رنگہ ہو جس میں مگر بوئے دفا کچھ بھی نہیں نقلِ یورپ کی مناسب ہو مگر یاد رہے رُخ سے پردے کو اٹھایا تو بہت خوب کیا پوچھنے کے لیے مندر جو ہے آزادی کا
بہاؤدوج بیوہ کے بھی مؤید تھے اور علامہ اعلیٰ میں ایک نظم "برقِ اصلاح" کے نام سے اپنی خاص جماعت (کشمیریوں) کے واسطے اسی بحث پر لکھی تھی۔ ذہبی نطیس اس صنف میں انھوں نے بڑا درد قلم دکھایا ہے رمان کا وہ منظر جہاں سری راجندر جی بن باس سے بیشتر اپنی ماں سے رخصت ہونے جاتے ہیں نہایت مؤثر اور درد انگیز الفاظ میں دکھایا ہے کشل کنہیا "سری کرشن جی کی پیدائش کے متعلق چھوٹی سی ایک نہایت دلکش اور مقدس نظم ہے۔ اور سب سے زیادہ دلچسپ پُر زور اور مؤثر نظم گائے پر ہے جس کے وہ بند یہاں دیئے جاتے ہیں ۵	
بے پئے جیسے کسی کو ہو جوانی کا خار	دیکھ جنگل میں کوئی شام کو تیری رفتار

مست کردتی ہو شاید تجھے قدرت کی بہار
وہ اتنی ہوئی دھوپ اردوہ سبزہ کا کھلا

ایک اک گام پہ شوخی سے چلتا تیرا
پی کے جنگل کی ہوا جھوم کے چلتا تیرا

صاحبِ دل تجھے تصویرِ وفا کہتے ہیں
چشمِ فیضِ خدامِ و خدا کہتے ہیں
درد مندوں کی سیسا شعرا کہتے ہیں
اں تجھے کہتے ہیں مند تو بجا کہتے ہیں

کون ہو جس نے ترے درد سے منہ پھیرا
آج اس قوم کی رگ رگ میں ہو تیرا

بچرل نظمیں ان کی تعداد گو کم ہے مگر جس قدر ہیں سب اعلیٰ تخیل اور حسنِ بندش سے لبریز
ہیں، پرانی تنبیہیں اور تخیلیں ان میں مطلق نہیں، پھول، "کنیر"، "جلوہ صبح"، "سیرِ دہرہ دن"
اسی قبیل کی نظمیں ہیں جن میں آخر الذکر لطافت و عمدگی میں سب پر فوقیت رکھتی ہے۔
رباعیات | چند رباعیات بھی کسی میں حسب ذیل رماعی اپنے حسب حال ہے:-

بیکارِ تعلیٰ سے ہے نفرت مجھ کو
کس واسطے جستجو کروں شہرت کی
لوں دادِ سخن نہیں یہ عادت مجھ کو
اک دن خود ڈھونڈ لے گی شہرت مجھ کو

چکیت کی زبان اُن کی زبان نہایت صاف شستہ اور شیریں ہے۔ الفاظ نہایت مناسب، روزمرہ،
آوردہ و دار استعمال کرتے ہیں۔ کلام میں لکھنؤ کا رنگ ہے مگر بہترین قسم اور اعلیٰ درجہ کا ایک خاص
خصوصیت یہ بھی ہے کہ مناسب مہدی الفاظ کلام میں لا کر کلام کی شیرینی اور اثر کو دو بالا
کر دیتے ہیں۔

چکیت بخیت نقاد | بسبب اعلیٰ انگریزی دانی کے چکیت مشرقی اور مغربی دونوں قسم کی تنقید
سے بخوبی آگاہ تھے۔ اسی وجہ سے اُن کی رائیں ادبی معاملات میں بہت عجیب تلی منصفانہ اور غیر
جانب دار تھیں کبھی کسی کی تعریف یا تنقید انھیں بند کر کے یا مبالغہ کے ساتھ نہیں کرتے
تھے۔ ذاتی حلوں سے ہمیشہ بچتے اور اشتغال میں پڑھنے اور مبالغہ کرنے کو ہاتھ سے نہیں

رہتے تھے۔ یہاں مناظرہ اور تو تو میں سے بہت گریز کرتے جیسا کہ خود کہتے ہیں۔

اُلجھ پڑوں کسی دامن سے جس وہ خارج نہیں | وہ پھول ہوں جو کسی کے محلے کا ہار نہیں

ان کے مضامین داغ اور سرشار اور اردو شاعری پر نہایت اعلیٰ درجہ کے ہیں اور بڑی واقفیت اور معلومات کا پتہ دیتے ہیں۔ وہ مشہور مناظرہ جو معرکہ چلبست و شر کے نام سے مشہور ہے اُن کی اعتدال پسندی و تسنن اور فنی قابلیت کا شاہد عادل ہے۔ اور اس معاملے میں اُن کی تعریف اکثر مشہور اہل فن و اہل قلم نے کی ہے۔ جو انتحابات غالب آتش وغیرہ کے کلام کے عطر سخن کے نام سے رسالہ صبح امید میں چھپا کرتے تھے وہ اُن کی سخن فہمی اور نہایت سنجی کا تین ثبوت ہیں۔

چلبست بھیت تیار | نثر میں بھی مثل نظم کے اُن کا پایہ بہت بلند تھا۔ علاوہ "صبح امید" کے وہ

اکثر موقر رسالوں میں مثلاً کشمیری درپن، خندنگ نظر، زمانہ وغیرہ میں مضامین لکھا کرتے تھے۔ اُن کی عبارت نہایت متن معنی خیز زوردار اور روشن ہوتی ہے۔ منشی سجاد حسین سابق اڈیٹر اردو دھنچ، مہتمم ظریف درزا، محبوبیگ عاشق لکھنوی (ازاب سید عطاء ادا جوالا برشاہ برقی ایشن) زائن درزا، دیبا سکر کول، اتر بھون ناتھ، سحر وغیرہ پر جو مختصر مضامین انہوں نے لکھے ہیں وہ پڑھنے کے قابل ہیں۔

۱۔ رومان کے سین سے چند بند بطور نمونہ یہاں پیش کیے جاتے ہیں جن سے چلبست کی قدرتِ بیا اور چستیِ بندش کا حال بخوبی معلوم ہو گا اور یہ بھی ظاہر ہو گا جیسا کہ حالات مصنفین خوشنود میں کتاب صبح وطن میں دیئے ہوئے ہیں لکھا ہے کہ وہ انیس کے کلام کے شیدا تھے۔

انجست ہوا وہ باپ کے کو خدا کا نام | واہ وفا کی منزلِ اول ہوئی تمام
منظور تھا جواں کی زیارت کا انتظام | دامن سے اشکِ پُنجہ کے دل سے کا کلام

اظهار بے کسی سے ستم ہو گا اور بھی
دیکھا ہمیں ادا اس تو غم ہو گا اور بھی

<p>دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ نہال دیکھا تو ایک درمیں ہو بیٹھی وہ غمِ حال</p>	<p>خاموشیوں کے پاس گیا صورتِ خیال سکتہ سا ہو گیا ہے یہ ہر شدتِ طلال</p>
<p>تن میں لہو کا نام نہیں زرد رنگ ہے گو یا بشر نہیں کوئی تصویرِ رنگ ہے</p>	
<p>یہ عجیب بات ہے کہ غالب اور انیس کا اثر زمانہ حال کی شاعری پر اس درجہ چھایا ہوا ہے کہ اس زمانے کے اکثر شعرا جب کسی چیز کو ٹوڑا اور دردا انگیز بنا نا چاہتے ہیں تو یہی صنف اختیار کرتے ہیں۔ اسکا وجہ سے حکمت کی تقریباً دو ثلث نظمیں جو مجموعہ صبح و ظن میں تھیں ہیں اسی سہ س کی صورت میں ہیں۔ مگر انھوں نے بعض نظموں میں مثلاً مرقعِ عبرت جو کسی قوی انجمن کے سالانہ جلسے کے واسطے لکھی گئی تھی اس سہ س جالی کے متبع اور اسی رنگ میں قوم کی حالت اور جوانوں کی حالت مذہب، دولت، آزادی و اصلاح وغیرہ کے عنوان سے آٹھ آٹھ دس دس بند کہے ہیں چنانچہ جوانوں کی حالت کے متعلق کہتے ہیں ے</p>	
<p>موجود ہو جن باروؤں میں زرد جوانی پڑ ہوئے غفلت سے سڑیں میں یہ گرامی</p>	<p>طوفان سے انھیں گشتی قوی ہے بچانی آرام پسندی میں یہ رکھتے انہیں ثانی</p>
<p>پہلو میں کسی کے دل دیوانہ نہیں ہے ہیں مرد مگر ہمتِ مردانہ نہیں ہے</p>	
<p>عبرت نہیں دیتا انھیں نیزنگِ مانہ تعلیم کہاں اور کہاں صحبتِ دانا</p>	<p>عمران کی فقط لہو و لعب کا ہو زمانہ بس پیشِ نظر رہتا ہے آئینہ دشانہ</p>
<p>خمرِ رخ پہ گئے سوے پریشاں پہ نظر ہے اک شغلِ بھی اُن کے لیے شام و سحر ہے</p>	
<p>ہمت نہیں لیکن دل پر جوشِ پنازاں بہ شکل ہوں پر چشمِ دلِ گوشِ پنازاں</p>	<p>بے ہوش و خرد ہیں خرد و ہوشِ پنازاں کم ظرف کوئی اپنے تن و گوشِ پنازاں</p>

	<p>یہ نگی افلاک کا ڈران کو نہیں ہے فرعون ہیں موسیٰ کی خبر ان کو نہیں ہے</p>	
<p>مذہب کے متعلق ہے</p>		
<p>خود بینی سے خالی نہیں مذہب کے ہیں حای ہے نفس کے منظور حقیقت میں غلامی</p>	<p>سودائے محبت میں نہیں ان کے ہوا حای عرفان کی خبر لاتی ہو جو طبع گرامی</p>	
<p>کچھ قوم کی پر دہ ہے نہ فکر کہ دہ ہے ہو جائے نجات اپنی تنہا ہے تو یہ ہے</p>		
<p>دھمکے ہو کہ ہم مالک فردوس ہیں ہیں گو یا کہ یہی راز الہی کے امیں ہیں</p>	<p>عالم کے دکھانے کے لیے خاک نہیں ہیں دنیا کی ترقی پہ سدا چیں نہ جیں ہیں</p>	
<p>جو اور ہیں وہ معرفت حق سے جدا ہیں بس ایک ہی بندہ مقبول خدا ہیں</p>		
<p>ذمت شراب کے متعلق۔ جو آب انگور کے نام سے بھی گئی۔</p>		
<p>وداع ہوش کا سامان ہے ظہور اس کا سیاہ قلب کو کرے جو ہو وہ نور اس کا</p>	<p>رفیق اس کی ہے سستی حد و شعور اس کا خمار مرگ جو لائے وہ ہے نر اس کا</p>	
<p>لگائے آگ کیلچے میں جو وہ آب ہے یہ کرے جو طرہ قیامت وہ آفتاب ہے یہ</p>		
<p>تمام قلب یہ صورت پیدا ہو تو سوز آتش پہناں جگر میں پیدا ہو</p>	<p>خیال بادہ کشی دل میں گر ہو پیدا ہو زباں مزے پہ جو آب طرب کے شید ہو</p>	
<p>زباں کے واسطے گو و شک انگلیں ہو یہ مگر جگر کے لیے آب آتشیں ہو یہ</p>		

ڈاکٹر اقبال

ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال زمانہ حال کے فلسفی شعراء میں ایک بہت ممتاز درجہ رکھتے ہیں ان کی شہرت حدود ہندوستان سے نکل کر بلاد اسلام افغانستان ایران بلکہ یورپ اور امریکہ تک پہنچی ہے۔ وہ زمانہ موجودہ میں ایک زبردست اور نمایاں ہستی ہیں اور ان کا نام اور کلام شعرائے حال کی صف اول میں بھی سب سے آگے ہو۔ سال ولادت ۱۸۸۷ء اور مقام ولادت سیال کوٹ ملک پنجاب ہے، مگر بزرگوں کا اصلی وطن کشمیر ہے جیسا کہ ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے۔

ہندوستان میں آئے ہیں کشمیر چھوڑ کر
بلبل نے آستانہ بنایا چمن سے دور

کشمیر کا چمن جو بھی پسندیر ہے اس باغ جاں فزا کا یہ بلبل اسیر ہے
درخت میں ہم کو آئی ہے آدم کی جائداد جو ہے وطن ہمارا وہ جنت نظیر ہے

تسلیم ابتدائے عمر میں ایک مکتب میں پڑھا پھر تھوڑے عرصہ کے بعد جب انگریزی کا شوق ہوا تو سیالکوٹ کے اسکول میں داخل ہوئے جہاں اپنے ساتھ داروں میں بہت ممتاز تھے اور برابر انعام اور اسکا لرشپ پاتے رہے۔ میٹرک کیولیشن کا امتحان پاس کر کے اسکالرشپ کا بج سیالکوٹ میں نام لکھا یا جہاں عربی و فارسی کے مشہور پروفیسر اور علوم مشرقیہ کے باکمال عالم سید میر حسن صاحب کے زیر تعلیم و نگرانی رہے اور انھیں بزرگ کی بدولت شعر و شاعری و ادبیات کا ذوق ان میں پیدا ہوا۔ انٹرمیڈیٹ کا امتحان اول درجے میں پاس کر کے گورنمنٹ کالج لاہور کے درجہ بی۔ اے میں داخل ہوئے اور فلاسفی بمحلہ مضامین ممتاز کے لی۔ یہیں سے نہایت نیک نامی اور عزت کے ساتھ بی۔ اے کی ڈگری لی جس میں زبان عربی اور انگریزی میں اپیل پر دفتنی راقیاد خصوصی حاصل کیا اس کے بعد جب ایم۔ اے کا امتحان دیا تو یونیورسٹی بھر میں اول آئے

مٹر آئلڈ سے تلمذ | لاہور میں علی گڑھ کالج کے مشہور سر دل عزیز پروفیسر مٹر آئلڈ سے فخر تلمذ حاصل ہوا جس سے اقبال کو بہت فوائد حاصل ہوئے۔ اس کا اثر جاہلین پر بہت گہرا اور دیر پا تھا چنانچہ جب صاحب موصوف انگلستان جانے لگے تو اقبال نے ایک نہایت خوش نظم "نالہ فراق" (آئلڈ کی یاد میں) اس موقع پر لکھی تھی۔ اب لاہور ہی میں انہوں نے وطن اختیار کر لیا اور بعد فراغت تعلیم پہلے اور نیل کالج میں تاریخ و فلسفہ و معاشیات کے پروفیسر پھر گورنمنٹ کالج میں انگلش اور فلسفہ کے پروفیسر مقرر ہوئے۔

قیام انگلستان | ستمبر ۱۹۰۸ء میں بھارت میں تعلیم انگلستان روانہ ہوئے جس کے تمام مصارف کے کفیل ان کے بھائی تھے۔ کیمبرج یونیورسٹی میں داخل ہو کر ڈاکٹر میک ٹیگرڈ کے زیر تعلیم مغربی فلسفہ پڑھنا شروع کیا اور کتب بینی بکثرت کی اور یہیں انگلستان کے مشہور مستشرقین پروفیسر برنٹن ہیکس اور سادلی سے استفادہ کا موقع ملا۔ اٹھکس (اخلاقیات) میں ڈگری حاصل کر کے جرمنی گئے اور یونک میں کچھ عرصہ تک قیام کر کے اپنا تھیسس (مضمون) متعلق بلفلسفہ ایران تیار کیا۔ یونک ہی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری ان کو ملی اور مضمون مذکور انگلستان میں میٹافرکس آف پریشار فلسفہ کے نام سے شائع اور ان کے قدیم دوست مٹر آئلڈ (جو اب سٹامس آئلڈ ہیں) کے نام سے معنون ہوا۔ جرمنی سے انگلستان واپس آکر بیرسٹری کی ڈگری حاصل کی جب مٹر آئلڈ جو

اسے یہ مختصر نظم سندس کی صورت میں اب بند کی ہے پہلا بند یہ ہے۔

جا بسا مغرب میں آخر اسے مکان یترا کیوں

آہ! مشرق کی پسند آئی نہ اس کو سرزمین

آگیا آج اس صداقت کا رے دل کو یقیں

ظلمت شب سے ضیائے روزِ فرقت کم نہیں

تا زانو غم و داغِ حسرت چید است

ہمچو شمع کشتہ در چشم نگہ خواہید است

لندن یونیورسٹی کے عربی پروفیسر مقرر ہو گئے تھے رخصت پر گئے تو ڈاکٹر اقبال ہی نے کچھ عرصہ تک ان کی قائم مقامی کی تھی۔ بعد واپسی انگلستان لاہور میں ان کا پُر جوش خیر مقدم ہوا اور یہیں پرائیمنٹوں نے اپنی پریکٹس شروع کی اور باوقات فرصت شعر شاعری کے مشغلے میں بھی مصروف رہے۔ ان کی قابلیت اور شہرت کے سبب ایک زمانے میں لوگوں کا خیال تھا کہ دنیا کا سب سے بڑا انعام نوبل پرائز ان کو یقیناً ملے گا۔ ۱۹۲۲ء میں درجہ نائٹ ہڈ یعنی سر کے معزز لقب سے ممتاز ہوئے۔

اقبال ایک وسیع منظر شاعر ہیں انھوں نے فلسفہ مشرق و مغرب دواں کا عمیق مطالعہ کیا ہے۔ وہ علاوہ ایران کے فلسفہ کے ہندوستان کے فلسفے سے بھی بخوبی واقف ہیں اور زبان و ادب فارسی میں ان کا تجربہ ان کے فارسی کلام سے بخوبی ظاہر ہے۔

تصانیف | تصانیف حسب ذیل ہیں :-

(۱) علم الاقتصاد۔ اردو اقتصادیات پر ایک سالہ جو ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا تھا جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اس فن میں اردو میں پہلی تصنیف ہے۔

(۲) فلسفہ ایران۔ اس کا ذکر ادھر ہوا۔

(۳) اسرار خودی۔ ثنوی فارسی جس میں فلسفہ خودی کی بحث ہے اس کا ترجمہ انگریزی میں پروفیسر نکلسن نے مع دیباچہ اور نوٹوں کے شائع کیا ہے اور یارپ و امریکہ میں وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

(۴) رموز بے خودی۔ یہ بھی مثل نمبر ۳ کے فارسی میں فلسفہ ثنوی ہے جس کی خاص غرض مسلمانوں میں روح حیات پیدا کرنا ہے۔

(۵) پیام مشرق۔ جواب جو سن شاعر گیتے کے "سلام مغرب" کے۔ یہ بھی فارسی میں ہے اور بہت مقبول ہے۔

(۶) بانگ درا۔ مجموعہ نظم اردو مطبوعہ ۱۹۲۳ء۔ اسی طرح کا ایک دوسرا مجموعہ کلیات اقبال کے

نام سے مولوی عبدالرزاق نے ایک طویل مقدمہ کے ساتھ حیدرآباد سے شائع کیا ہے۔ اقبال کا فارسی کلام ہماری کتاب کے مبحث سے خارج ہے لہذا اس پر خصوصاً کوئی رائے زنی نہیں کی جاسکتی البتہ اُن کے کلام اُردو پر کی جائے گی۔

اقبال کی شاعری | اقبال کو شعر کا ذوق ابتداً عمر ہی سے تھا جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ جب وہ سیالکوٹ اسکول میں پڑھتے تھے تب ہی سے فطرتاً گونے لگے تھے۔ لاہور کے قیام میں اس شوق نے اور بھی ترقی کی اور آخر ایک شاعر سے انہوں نے اپنی ایک غزل پڑھی جس میں اتفاقاً اُردو کے شاعر مشاعر مشہور زبان داں مرزا ارشد گورگانی بھی تھے جنہوں نے اس شعر کی خاص طور پر بڑی تعریف کی ہے

موتی سمجھ کے شانِ کریمیں نے چن لیے	قطرے جو تھے رے عرقِ انفعال کے
------------------------------------	-------------------------------

اسی عرصے میں اقبال کو ارشد سے ملنے بھی ہو گیا مگر کچھ دنوں بعد وہ داغ کے باقاعدہ شاگرد ہوئے جیسا کہ خود کہتے ہیں

نیمِ دشتِ ہی اقبال کچھ اُس پر نہیں نازاں	مجھے بھی فخر ہے شاگردیِ داغِ سخنِ نازاں پر
------------------------------------------	--------------------------------------------

مگر افسوس ہے کہ یہ سلسلہ تلخ کا بہت دیر قائم نہ رہا۔ شروع میں اقبال اپنا کلام صرف مجمعِ احباب اور مخصوص مشاعروں تک محدود رکھتے تھے۔ بلکہ میں ان کی شاعری کا آغاز اُس وقت ہوا جبکہ اُن کی ٹوٹ اور دلکش نظم "نالہ یتیم" انجمن حمایت الاسلام لاہور کے پندرہویں سالانہ اجلاس ۱۹۰۹ء کے عظیم الشان اجتماع میں پڑھ کر سنائی گئی اور اس کے بعد ان کی دوسری نظم "ہمالہ" اسی انجمن کے کسی دوسرے سالانہ جلسے میں دوستوں کے اصرار سے پڑھی گئی۔ جو رسالہ خزن لاہور کے سب سے پہلے پرچے میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد تارخ ادب انگلی دلائی وہ برابر بہت شوق سے کہتے رہے اور ان کا کلام متعدد اُردو پرچوں اور رسالوں اور کانفرنسوں کے اجلاسوں کی ذمیت سمجھا جاتا تھا اور نہایت اشتیاق اور محنت کے ہاتھوں سے لیا جاتا تھا۔ اس زمانے میں انہوں نے بہت کچھ کہا اور بہت جلد کہنے کی مشق ہم پونچائی۔ حافظہ ایسا

زبردست پایا تھا کہ اکثر پوری پوری نظمیں بغیر کاغذ دیکھے پڑھ سکتے تھے۔ وہ تقریباً ہر سال اپنی ایک یا ایک نظم انجمن حمایت الاسلام کے سالانہ جلسے میں سناتے تھے۔ جس سے اُن کی شہرت دنیا بے آرد و میں پھیل گئی۔ تصویر درد، فریاد اقامت، ہمارا دیس، نیا سوال، ترانہ اور اسی قسم کی دوسری نظمیں اسی موقع پر پڑھی گئیں اور اسی زمانے سے تعلق رکھتی ہیں۔

قیام یورپ کے زمانے میں اقبال نے شعر گوئی ترک کر دی تھی یہاں تک کہ اس سے بالکل تائب ہو جانا چاہتے تھے مگر اپنے بعض مخصوص دوستوں مثلاً پروفیسر آرنلڈ اور خان بہادر شیخ عبدالقادر کے اصرار سے اس ارادے سے باز رہے اور زبان فارسی کو اپنے اظہار خیالات و جذبات کا ذریعہ قرار دیا۔ ہندوستان واپس آ کر فارسی اُردو دونوں میں کہنے لگے مگر زیادہ تر

شیخ عبدالقادر صاحب پیرسٹریٹ لاسابق مدیر مژدن نے جو فاضلانہ دیباچہ، بانگ واہ پر لکھا ہے اس میں وہ اس خاص موقع کی نسبت یعنی جب اقبال اپنا شوق شاعری ترک کرنا چاہتے تھے مگر شیخ صاحب موصوف اور مسٹر آرنلڈ کے اصرار سے وہ باز رہے اپنے خاص دلکش انداز میں لکھتے ہیں، "اس زمانے میں دو بڑے تغیران کے خیالات میں لے ان تین سالوں میں سے دو سال ایسے تھے جن میں میرا بھی وہی قیام تھا اور اکثر ملاقات کے موقع ملتے رہتے تھے۔ ایک دن شیخ محمد اقبال نے مجھ سے کہا کہ ان کا ارادہ مصمم ہو گیا ہے کہ وہ شاعری کو ترک کر دیں اور قسم کھالیں کہ شعر نہیں کہیں گے اور جو دہشت شاعری میں صرف ہوتا ہے اُسے کسی اور مفید کام میں صرف کر لیا گے میں نے ان سے کہا کہ ان کی شاعری ایسی شاعری نہیں ہے جسے ترک کرنا چاہئے بلکہ ان کے کلام میں وہ تاثر ہے جس سے ممکن ہے کہ ہر اسی درمیانہ قوم اور ہمارے کم نصیب ملک کے امراض کا علاج ہو سکے۔ اس لیے ایسی مفید خدا داد طاقت کو بے کار کرنا درست نہ ہو گا۔ شیخ صاحب کچھ قائل ہوئے کچھ نہ ہوئے مگر قرابا کہ آرنلڈ صاحب کی رائے پر آخری فیصلہ چھوڑا جائے اگر وہ مجھ سے اتفاق کریں تو شیخ صاحب اپنے ارادہ ترک شعر کو بدل دیں گا اگر وہ شیخ صاحب سے اتفاق کریں تو ترک شعر اختیار کیا جائے میں سمجھتا ہوں کہ علمی دنیا کی خوش قسمتی تھی کہ آرنلڈ صاحب نے مجھ سے اتفاق رائے کیا اور فیصلہ یہاں تک اقبال کے لیے شاعری کو چھوڑنا جائز نہیں اور جو وقت اس شخص کی زندگی میں تھا وہ ان کے لیے بھی مفید ہو اور ان کے ملک و قوم کے لیے بھی مفید ہو ایک تغیر جو ہمارے شاعر کی طبیعت میں آیا تھا اس کا تو یوں غائب ہوا اگر دوسرا تغیر ایک چھوٹے سے آغاز سے ایک بڑے انجام تک پہنچا یہی اقبال کی شاعری نے فارسی زبان کو اُردو زبان کی جگہ اپنا ذریعہ اظہار خیال بنالیا۔

ان کا رجحان قیمت (ہیں اسلامزم) کی طرف ہے شکوہ، جواب شکوہ اور اسی قسم کی پرجوش نظمیں اس زمانے کی یادگار ہیں۔

اقبال کی شاعری کے تین دور اقبال کی شاعری کے تین دور صاف طور پر نظر آتے ہیں۔ پہلا دور ۱۹۰۹ء سے ۱۹۰۵ء تک کا یعنی جب تک کہ وہ ولایت نہیں روانہ ہوئے تھے۔ یہ دور اُن کی تیاری کا زمانہ کہا جاسکتا ہے۔ اس زمانے کے کلام میں جو زیادہ تر غزلوں کی صورت میں اُن کی طباعی کی جھلک اور ان کی سحرگاری کی ابتدا نظر آتی ہے مگر بسبب ابتداء شقی کے الفاظ مُبَدَش میں کسی قدر بھونڈاپن ہو اور وہ موسیقیت و مصوری الفاظ الہی درجہ کمال کو نہیں پہنچی مگر اس کا جو ضرور پایا جاتا ہے اور ایک درخشاں مستقبل کا پتہ دیتا ہے۔ اقبال اس دور میں ایک نئی شاعر نہیں، بلکہ ایک نئی شاعر نظر آتے ہیں یعنی وہ تمام ہندوستان اور تمام مختلف المذاہب اور مختلف خیالات ہندو کے شاعر ہیں۔ ان کی نظمیں ہمالہ، ترانہ ہندی، ہندوستانی بچوں کا تو می گیت، نیا شو الہ وغیرہ اسی زمانے کی تصنیف ہیں جنہوں نے اقبال کو تمام ہندوستانیوں کے دلوں میں عزت کی جگہ دی اور اُن کی شہرت کو تمام ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پہونچا دیا۔

دوسرا دور ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۷ء تک کا اُن کے قیام یورپ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس زمانے میں ان کی تصانیف کی تعداد بہت ہی کم ہے اور تین چیزیں اس دور کے ساتھ مخصوص ہیں۔ ایک یہ کہ اقبال کو اس عرصے میں فاضل کا بہت شوق ہو گیا اور اسی زبان کو انہوں نے اپنے اظہار خیالات کا ذریعہ بنایا۔ دوسرے یہ کہ وہ ایک سخت نئی شاعر ہو گئے اور تمام اُن کے خیالات اسی ایک مرکز پر جمع ہو گئے۔ تیسرے یہ کہ اس زمانے کی اُن کی نظمیں گو کہ عشق خیال کے اعتبار سے بڑھ گئیں مگر فلسفیت اُن پر غالب آ گئی جو اقبال کے فلسفہ مشرق و مغرب پڑھنے کا نتیجہ تھا، ترانہ ملی وغیرہ۔

۱۔ اقبال کی شاعری کے یہ تین دور غالباً اُن کے محبوب کلام اردو (بانگ درا) کے تین حصوں پر مبنی ہیں۔ ان حصوں کی تقسیم اس طرح پر ہے۔ حصہ اول ۱۹۰۵ء تک۔ حصہ دوم ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۷ء تک۔ حصہ سوم ۱۹۰۷ء سے۔

اسی انداز اور اسی دور کی نظمیں ہیں۔

تیسرا دور اُس وقت سے شروع ہوتا ہے جب کہ اقبال مشرق میں ہندوستان واپس آئے اس میں اُن کی شق شاعری درجہ کمال کو پہنچ گئی۔ اس میں اُن کا کلام پُر زور اور شیریں الفاظ کا ایک خزانہ ہے مگر یہ الفاظ زیادہ تر فارسی ہیں۔ طبیعت کا عنصر غالب ہے مگر وطنیت کا جذبہ کم ہو اسی سبب سے وطن کی زبان (اردو) پیش پیش نہیں ہے یعنی اس دور میں اُس کو وہ مرتبہ نہیں حاصل ہے جو دور اول میں تھا اور جس کی وہ اب بھی یقیناً مستحق ہے۔ فارسیت کا غلبہ اُن کے فارسی الفاظ اور فارسی ترکیب اور اساتذہ عجم کے کلام کی تصنیف سے ظاہر ہے۔ تمام عشاق اردو اُس دن کے منتظر ہیں کہ جب اقبال کی شاعری شل سابق کے ایک وطنی اور خالص اردو شاعری کی حیثیت سے پھر جلوہ نما ہوگی۔

اقبال کی اردو غزلیں اور نظمیں | مثل دیگر شعراء اردو کے اقبال کی شاعری کا آغاز بھی تغزل سے ہوا جیسا کہ اوپر لکھا گیا پہلے وہ ارشد گورگانی کے پھر داغ کے شاگرد ہوئے۔ داغ کا ذکر انھوں نے نہایت محبت اور شکر گزاری کے ساتھ اُس مرثیہ میں کیا ہو جو اُن کی وفات پر لکھا تھا نیز اکثر مقطعوں میں بھی اُن کی طرف اشارہ ہے۔ مگر یہ سلسلہ تلمذ عرصہ تک قائم نہ رہ سکا۔ اُن کی ابتدائی غزلوں میں کوئی غیر معمولی اور خاص بات نہیں پائی جاتی مگر آئندہ برقیوں کا پتہ ضرور چلتا ہے، کہیں کہیں بندش بھونڈی مگر تخیل اعلیٰ ہے۔ جو جو تجربہ بڑھتا گیا اسی قدر کلام میں پختگی کے ساتھ حسن بندش اور نشست الفاظ کی خوبصورتی بھی ترقی کرتی گئی اور اسقام کم ہوتے گئے۔ غزلوں کی تعداد گو کہ صرف ۲۲ ہو مگر متانت کلام مبنی خیال اور فلسفیت میں وہ مرزا غالب کی غزلوں سے حکم رکھاتی ہیں اسی وجہ سے اگر اقبال جانشین غالب کے معزز لقب سے یاد کیے جائیں تو کچھ بیجا بات نہیں ہر چند کہ غالب کی سی نزاکت خیال اور اُن کی مخصوص ترکیبیں اقبال کے یہاں نہ سہی پھر بھی کلام کا جذبہ بات سے لبریز ہونا اور فلسفہ اور تصوف کے رنگ میں مٹی اور ہونا اُن کے کلام کو غالب کے کلام بہت قریب پہنچا دیتا ہے۔ بعض جگہ فارسیت کی کثرت اور تصنع و آوردہ کے معائب

کلام کی روانی، موسیقیت الفاظ، اثر ملبندی خیال اور ارتقاع نظر کے محاسن سے دور ہو جاتے ہیں، اہل دہلی دیکھو چھوٹی چھوٹی لفظی لغزشوں پر ککتہ چینی کیا کریں پرانے رنگ کے استاد عرضی غلطیاں نکالیں یا کہیں کہ فلاں لفظ غلط یا بے موقع ہے مگر اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اقبال کے ہر شعر پر ان کی طباعی اور ذہانت کا ٹھپہ لگا ہوا ہے جس سے ان کا کلام بہت سی چیزوں میں پنا جو انہیں کھتا چھوٹی نظمیں اہل اور صاف عبارت میں مثل حالی اور اسماعیل کی نظموں کے ہیں یہ زیادہ تر اسی زمانے کی تھی ہوئی ہیں جبکہ اقبال پر فارسیت کا غلبہ کم تھا۔ اکثر نظمیں بچوں کی درسی کتابوں میں شامل ہیں اور ان سے کوئی نہ کوئی عمدہ اخلاقی نتیجہ نکالا گیا ہے بعض نظموں کے نام یہ ہیں ہمدی، ایک مکرہ اور مگھی، ایک گائے اور ایک بکری، ایک پہاڑ اور گھری، بچے کی دعا، ماں کا خواب وغیرہ چونکہ یہ چھوٹے بچوں کے واسطے تھی گئیں لہذا ان کی زبان بہت صاف اور سلیس ہے۔

طویل نظمیں اقبال کی شہریت کا داد مداران طویل نظموں پر مہرجن میں ان کا خاص رنگ اور تخیل پایا جاتا ہے۔ انہیں نظموں میں انہوں نے اپنے خاص شاعرانہ جوہر دکھائے ہیں اور فلسفہ و تصوف اور حب وطن کے جذبات کے ساتھ بہترین شستہ و رفته زبان سلاست بیان از در تخیل اجذب اثر اور نئے نئے استعارے اور تخیلیں بھی ان میں پائی جاتی ہیں۔ "ہمالہ"، "خضر راہ"، "شمع و شاعر"، "شکوہ"، "جواب شکوہ" اسی صنف سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کو رسمی اور معمولی نظمیں نہ سمجھنا چاہئے بلکہ یہ سچے جذبات کا صاف و شفاف آئینہ اور طرز بیان اور ملبندی خیال کا بہترین نمونہ ہیں۔

"ہمالہ" میں موضوع کی ملبندی کے ساتھ مضمون کی ملبندی بھی داد طلب ہو۔ ہمالیہ ہندوستان کا اصلی محافظ ہے شاعر کو چونکہ اپنے وطن ہندوستان سے عشق ہو لہذا وہ اس کے محافظ کا بھی عاشق ہے۔ "والدہ مرحومہ کی یاد" میں اقبال نے جو موثر نظم لکھی ہے وہ سچے جذبات سے مملو ہو۔ "خضر راہ" شاعر کے ملی جذبات کا نتیجہ ہے اس میں وہ جدید مغربی ترقیوں کو اپنے اہل وطن کے واسطے شک و بے اعتباری کی نظر سے دیکھتا ہے "شکوہ" میں ایک نہایت لطیف اور شاعرانہ پیرایہ میں تمام مصائب اور پستیوں کا ذکر ہے جو بد نصیبی سے اس زمانے کے مسلمانوں کے حصہ میں

آگئی ہیں "جواب شکوہ" میں انہیں سب باتوں کا معقول جواب دیا ہے اور ان کے اسباب بتائے ہیں "ترقی اسلام" میں بھی ایسے ہی جذبات کا اظہار ہو "شمعِ درودانہ" نہایت اعلیٰ درجے کی ایک خیالی نظم ہے۔

دعوتِ نظمیں | اقبال کی وہ چیز جس نے ان کا تخمِ محبت تمام ہندوستانیوں کے دلوں میں بُو دیا، ان کا جذبہٴ خفِ وطن ہے جس کا اظہار نہایت جوش اور سچائی کے ساتھ انہوں نے اپنی بعض نظموں میں کیا ہے جو فی الحقیقت اپنا جواب نہیں رکھتیں اسی نظمیں جو کسی خاص مقصد یا غرض سے لکھی جاتی ہیں اتنی جاذب اور مؤثر ثابت نہیں ہوتیں جتنی کہ خیالی اور بے غرض نظمیں ہوا کرتی ہیں۔ جگنو، چاند حسن و عشق وغیرہ اسی قبیل کی نظمیں ہیں جن کو ہر شخص دل سے پسند کرتا ہے۔ "ہندوستانی بچوں کا قومی گیت" "ہندوستان کا مقبول ترین گیت" ہو "نیا نوالہ" "ہندو مسلم اتحاد کی ایک بیش بہا نظم" ہو "علی ہذا جو مختصر نظمیں داغ، غالب، اسوامی رام تیرتھ، شبلی دھالی، شکبیر، عرفی، نانکھ وغیرہ پر ہیں۔ نیزہ جو مناظر قدرت پر لکھی ہیں نہایت اعلیٰ درجے کی نظمیں ہیں۔

اقبالِ حیثیت ایک ہندوستانی شاعر کے | اقبال نے شاعری کی دنیا میں ایک ہندوستانی شاعر کی حیثیت سے قدم رکھا اور ان کی شاعری نے نوجوان ہندوستانیوں کے دلوں کو موہ لیا۔ اُس زمانے کی ان کی شاعری کا عنصر غالب وطن کی محبت ہو اور اسی وجہ سے ان کی پہلی نظم "ہمالہ" میں یہ عنصر تمام جذبات پر غالب ہے۔ "ہدائے درد" میں یہ خیال اور بھی تقویت پکڑ گیا ہے اور اس میں وطن کے تمام مصاب اور خرابیوں کے اسباب کا ذکر نہایت پُر جوش طریقے سے کیا گیا ہے۔ "سید کی لوحِ تربت" میں بھی یہی جذبہٴ وطنی جلوہ نما ہے اور اس میں مذہبی تعصب اور فرقہ بندی کی سخت مذمت کی گئی ہے۔ تصویرِ درد کو ہندوستان کا نہایت پُر اثر اور پُر جوش مرثیہ کہنا بجا ہے۔ "ہندی ترانہ" اور "قومی گیت" سے مادرِ ہند کی محبت ہمارے دلوں میں موجزن ہو جاتی ہے۔ "ترانہٴ ہندی" کو بنگال کا بندہ ماتر سمجھنا چاہئے جس سے بظہر کہ ہندوستان میں شاید کوئی دوسرا قومی گیت مقبولیت اور ہر دل عزیز میں نہ ہو گا یہ ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں تروج اور ہر شخص کی زبان پہ ہے

اس جذبہ وطنیت کا، ملتہاے عروج اُن کے "نیا شوالہ" میں پہنچ گیا جس میں وہ خاکِ وطن کے ذرہ ذرہ کو ایک دیوتا سمجھتے ہیں چو کہ یہ مختصر مگر نہایت ہی نثر اور جذبہ وطنیت میں ڈوبی ہوئی نظم ہو لہذا پوری یہاں دی جاتی ہے۔

سچ کہدوں اے برہمن گرتو بڑا زمانے اپنوں سے بیرو کھنا تو نے بتوں سے سیکھا تنگ آکے میں نے آخر دیر دھوم کو چھوڑا	یرے صنمکھوں کے بت ہو گئے پڑانے جنگ و جدل سکھایا دا غلط کو بھی خدا نے دا غلط کا دغظ چھوڑا چھوڑے ترے فنا نے
--------------------------------------------------------------------------------------------------------------------	-----------------------------------------------------------------------------------------------------------------

پتھر کی مودتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں سوئی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی دنیا کے تیر تھکوں سے ادبچا ہوا اپنا تیر تھکے ہر صبح اٹھ کے گاؤں منتر وہ میٹھے میٹھے	بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقشِ دلیٰ مٹا دیں آباک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں دا ان آساں سے اس کا کلس ملا دیں سارے بجا دیوں کوئے پریت کی پلا دیں
---------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------	-------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------

شکنتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے بایسوں کی مکتی پریت میں ہے

مگر یہ ان کا جذبہ وطنیت و انگلی انگلستان کے ساتھ مدھم پڑ گیا یہاں تک کہ ان نظموں میں جو قیام انگلستان کے زمانے میں لکھی گئیں یہ جذبہ قریب قریب معدوم ہو جاتا ہے۔ بہر حال ہم کو پوری امید ہے کہ اقبال اردو کی طرف پھر رجوع کریں گے اور ہندوستان کے قومی شاعر کا معرذہ لقب ان کو پھر حاصل ہو گا۔

اقبال بحیثیت پین اسلامسٹ کے | یہ پین اسلامزم (دخوتِ ملی) کا رنگ اقبال میں قیام یورپ کے زمانے میں پیدا ہوا تھا جبکہ ان کی آمدِ رفت لندن کی پین اسلامک سوسائٹی کے جلسوں میں بہت تھی اور اس سوسائٹی کا نام بھی انھیں کے ایما سے بدل کر صرف اسلامک سوسائٹی رکھا گیا تھا۔

جس کے واسطے اُن کی دلیل یہ تھی کہ چوں کہ اسلام میں عنصر اجتماعیت پہلے سے موجود ہے لہذا فقط یہی جو اجتماعیت کے معنی دیتا ہے زمانہ ہے اور اس کو نام سے خارج کر دینا چاہئے۔ اس سے دماغ سے اُن کے میلان طبع کا پتہ چلتا ہے۔ انھوں نے یہ خیال لوگوں کے دلوں میں جاگوس کرنا چاہا کہ تمام دوسرے زمین کے مسلمان ایک عالمگیر سوسائٹی کے رکن ہیں عام اس سے کہ وہ اس بات سے واقف ہوں یا نہ ہوں۔ زمانہ حال کے سیاسی معاملات نے اُن کا یہ خیال پوری طرح ثابت کر دیا۔ ڈاکٹر لطیف لکھتے ہیں:-

نوا صدی کے آغاز سے مسلمانوں کے سیاسی نقطہ نظر میں ایک عظیم الشان انقلاب رونما ہوا۔ اُن کا سیاسی تحفظ اور آزادی کی جدوجہد صرف ہندوستان ہی تک محدود نہ رہی بلکہ جہاں اسلام کے نام لیوا تھے یعنی ترکی، ایران، پاکستان، مصر، طرابلس، مراکش، یہاں تک کہ دور دراز ملک چین بھی اُن کے دائرہ عمل میں شامل ہو گیا۔ یہ عالمگیر اتحاد اسلامی کی خوش جس کا دوسرا نام بین اسلامزم تھا، سلطنتِ ترکی کے مٹ جانے سے اور زور پکڑا گئی۔ اس کی ابتدا ۱۹۱۱ء کے اطالوی حملہ طرابلس سے ہوئی تھی جس کے بعد جنگِ بلقان میں اس کی شرافت افشانی اور بڑھی مگر جنگِ عظیم میں اس کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کے متعلق بے شمار پمفلٹ، رسائل، اخباری مضامین، نظمیں، سیمینار، ہر قسم اور ہر حالت کے لوگوں کی زبان و قلم سے نکلیں جن میں اقبال، شبلی، ابوالکلام آزاد، حضرت مولانا، انور علی خاں اور علی برادران بہت ممتاز ہیں۔۔۔ اس احساسِ کافور میں مختلف طریقوں سے ہوتا تھا دارالریخ و الم کسی اسلامی قوم یا ملک کے سلبِ آزادی پر حامی اس سے کہ یہ گزشتہ زمانہ کا واقعہ ہو یا زمانہ موجودہ کا (۲) ایسے اسلامی ممالک کے مستقبل کی فکر جو دولِ یورپ کے برابر ہیں (۳) شک اور بے اعتباری پورے بین الاقوام کے ساتھ جو بقول ان لوگوں کے ہر مقام پر ذوالاسلامی کی ذمہ دار ہیں۔ ڈاکٹر اقبال کچھ حصہ تک اس بین الاقوامی اخوت کے خاص علمبردار سمجھے جاتے تھے اور انھوں نے اس معاملے میں اپنے دلی جذبات کا اظہار اس زمانے کی نظموں میں نہایت جوش و خروش کے ساتھ کیا تھا۔

اقبال تمام دنیا کے مسلمانوں سے ملتی ہیں کہ اگر تم کو اپنی ہستی قائم رکھنی ہے تو جوئی جوئی
 مذہبی اختلافات ترک کر دو اور ایک عالمگیر اتحاد و اخوت پیدا کر دو۔ ان کو بخوبی معلوم ہے کہ دنیا
 اسلام چونکہ موجودہ زمانے میں منقرض و منقشت ہے لہذا وہ مغرب کے باقاعدہ حلقوں سے مقابلہ کی
 تاب نہ لاسکے گی اور بہت جلد ان کا شکار بن جائے گی۔

حکمت مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی | لکھوٹے لکھوٹے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گا

اُن کی دلی خواہش ہے کہ اسلام کا بکھرا ہوا شیرازہ محبت و یکجہتی کی مضبوط رسی سے بندھ جائے
 اور مسلمان اپنے مذہب کے ضروری احکام و ارکان کے دل سے پابند ہو جائیں۔ مسلمانوں کو یہ خیال
 ترک کر دینا چاہیے کہ ہم ہندی ہیں یا ترک، مصری ہیں یا افغانی۔ اُن کو اپنے تئیں ایک عظیم الشان
 زنجیر کی کڑیاں سمجھنا چاہیے۔ ملک قوم، قرب و بُعد کے فرضی خیالات دل سے یک قلم نکال دینا
 چاہیے اور اپنے تئیں ایک برادری کے افراد سمجھنا چاہیے۔

یہی مقصود فطرت ہے یہی ریز مسلمان | اخوت کی جہانگیری محبت کی فرادانی
 بتان رہی ہے خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا | نہ تو رانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

ان کا قول ہے۔

پر دنیا ایک ہی بشیر میں ان بکھرے دالوں کو | جو مشکل ہو تو مشکل کو آساں کر کے چھوڑوں گا

جب اقبال یورپ جا رہے تھے تو راستے میں جہاز سے جزیرہ سرسل نظر پڑا جو ایکے ماہ میں
 عربوں کے اقتدار اور تہذیب و شان و شوکت کا مرکز تھا اس کو دیکھ کر عجب پُر اثر طریقے سے
 فریاد کرتے ہیں۔

دوے اب دل کھول کر اسے دید کہ خوشامیاد | وہ نظر آتا ہے تہذیب مجازی کا مزار
 تھا یہاں ہنگامہ اُن صحرا نشینوں کا کبھی | بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی
 زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے | بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے
 اک جہاں تازہ کا پیغام تھا جن کا لہو | کھانگی عصبر کہن کو جن کی تیجِ ناصبور

مردہ عالم زندہ جن کی شورش تم سے ہوا	ادمی آزاد زنجیر تو ہم سے ہوا
غفلوں سے جس کے لذت گیر ابلک گوش ہے	کیا وہ تنکیر اب ہمیشہ کے لیے خواہش ہو؟
یہ اسی بین اسلام کی برکت ہے کہ اقبال کی شہرت ممالک اسلامی کے علاوہ یورپ و امریکہ میں بھی پھیل گئی ہے۔	
اقبال کا فلسفہ اقبال محض خوشگوشا عری نہیں بلکہ ایک زبردست فلسفی بھی ہیں۔ ان کا کلام فلسفہ حقائق سے معمور ہے۔ ان کا فلسفہ مختصر اوجھلوں کا ترجمان ہے (۱) اپنی ہستی پہچان (۲) اپنی ہستی ثابت کر۔ اسی ہستی میں بانہر ہونے میں قوموں کی ترقی کا راز مضمر ہے۔ اہل مشرق کے دلوں سے وہم و گمان جو ان کے کیر کڑ کا عطر غالب ہے نکل جانا چاہئے اور اس کی جگہ یقین اور اعتبار کو ملنا چاہئے۔	
خدا کے علم یزوں کا دست قدرت تو زیاں تو ہے	یقین پیدا کر اے غافل کہ مغلوب گان تو ہو
اقبال مغربی مادیت کے دشمن ہیں اہل مغرب کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔	
دیا و مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہو	کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زردم عیار ہو گا
تھلاری تہذیب اپنے خیر سے آپ ہی خود کشی کر گئی	جوشاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہو گا
"طلوع اسلام" میں بھی اسی کی طرف اشارہ ہے۔	
نظر کو بغیرہ کرتا ہے چمک تہذیب ماضی کی	یہ صنائی مگر چھوٹے ٹنگوں کی ایزہ کا دی ہے
ان کے کلام میں ایسے اشعار بکثرت ملتے ہیں جن میں انسان کو خوش حالی اور خودداری کی تلقین کی گئی اور اس کو اس کی اصلی عظمت و شان یاد دلانی لگتی ہے۔	
تو راز کن نکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا	خودی کا راز داں ہو جا خدا کا ترجمان ہو جا
ہوس نے کر دیا ہو کڑے ٹکڑے نوح انسان کو	اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا
یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی	لوے شرمندہ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا
اس قسم کے اشعار بکثرت ہیں لہذا ان کے بحر سخن میں غوطہ مارنا اور فلسفہ کے تمام زبیر شاہوار باہر	

برکات ان اس مختصر مضمون کے مقصد سے باہر ہے۔

بعض یورپی نقادوں کا خیال ہے کہ ڈاکٹر اقبال اپنے مضامین کے لیے بعض مغربی فلسفیوں مثلاً نیشتر اور برکسٹن وغیرہ کے مضمون احسان ہیں۔ خود ڈاکٹر صاحب اس خیال کی تکذیب کرتے ہیں مگر اتنا ضرور صحیح معلوم ہوتا ہے کہ ان پر اکابر مذکور کے فلسفہ کا اثر بہت گہرا ہے۔

اقبال کا پیغام کیا ہے [جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا اقبال کی دلی خواہش ہے کہ ان کے ہمارا دین دینی میں اپنی ہستی سے واقف ہونے اور اپنے تئیں پہچاننے کا مادہ پیدا ہو جائے اور کوشش و عمل کی شدید ضرورت کا احساس ان کے دلوں میں بٹھ جائے۔ اقبال کے نزدیک عملی جدوجہد زندگی اور ہستی اور مہم کاری موت ہے۔ ان کا پیغام نہایت اعلیٰ سچا اور پُر جوش ہے۔ وہ اپنے ہم مذہبوں کو بیابانِ دل نشانا مچاتے ہیں کہ غفلت و سستی ترک کرو۔ ان کی غرض کوئی ملکی توسیع یا سیاسی ترقی نہیں بلکہ وہ بچاتے ہیں کہ مسلمانوں میں سادگی، بے ریائی، شجاعت، ہمت و اشتغال اپنے اوپر بھروسہ کرنے کی قوت غرض کہ وہ جملہ خصائل و فضائل جو کسی زمانے میں ان کے اسلاف میں پائے جاتے تھے ان میں بھی پیدا ہو جائیں۔ اس پر معترض یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ تو پرانے افسانوں کو یاد کرنا اور ترقی کی گھڑی کی سوئیاں اٹھانا ہو اگر درحقیقت یہ اعتراض سطحی اور غیر واجب ہے۔ اصل یہ ہے کہ اقبال آج موجودہ کی تصویر تاریک رنگوں میں اور زیادہ آگوشہ کا مرقع نہایت چمکتے ہوئے رنگوں میں کھینچتے ہیں معض اس غرض سے کہ مسلمان اس سے ایک مفید سبق حاصل کریں اپنی غفلت شعاری چھوڑیں اور سچی کوشش لیں مختصر یہ کہ اقبال کا پیغام عمل و کوشش کا پیغام ہے۔

یہی آئینِ قدرت ہے یہی اسلوبِ فطرت ہے | جو ہے راہِ عمل میں گامزن محبوبِ فطرت ہے

اقبال کے کلام میں امید و محنت | اقبال محزون و مایوس شاعر نہیں ان کے کلام میں امید و محنت عکس ہو رہا ہے بلکہ یہی چیز ان کو ان کے معاصرین سے ممتاز کرتی ہے۔ وہ اس تاریک فضا سے کبھی مایوس نہیں ہوتے بلکہ ان کا عقیدہ ہے کہ مصائب اور نا کامیاں انسان کے کیر کڑ کو سنجیدہ اور مضبوط بنا کرتی ہیں۔ جس طرح سونا گھریا کی تیز آگ سے پاک و صاف ہو کر چمک جاتا ہے اسی طرح تو میں بھی

ناکامیوں اور نامرادیوں کی کسوٹی پر چڑھ کر قوت پکڑاتی ہیں۔ وہ تاریک درمیانوں کو رفتہ
بشرق کے لیے ایک روشن مستقبل دیکھتے ہیں اور کبھی افسرہ دل نہیں ہوتے بلکہ ناکامیوں کے بادل
کے پیچھے شعاع اُمید جلوہ گر دیکھتے ہیں۔

اقبال علی شاعر ہیں ابا جو خیالی شاعر ہونے کے اقبال بہت بڑے علی شاعر بھی ہیں۔ وہ اشیاء کا علی
پہلو کبھی نظر انداز نہیں کرتے۔ گو اُن کے خیالات فلک پیا ہیں مگر وہ خود مادر زمین کے ساکن ہیں ان کے
انسانی کمزوریوں کا بخوبی احساس ہے۔ اُن کی دنیا علی دنیا ہے جس میں خوشی و غم اور اُمید و یاس
کا چوٹی دامن کا ساتھ ہے۔ وہ کبھی اس حقیقت کو نظر انداز کرنا نہیں چاہتے۔

اقبال کی نیچر نظمیں اس صنف میں بھی اقبال کا کلام لا جواب ہمواد ان کی وہ نظمیں جو نیچرل چیزوں اور
قدرتی مناظر پر ہیں اپنا نظیر نہیں رکھتیں مثلاً جگنو، احساند، صبح کا ستارہ، ایک پرندہ اور جگنو، ابرو غیرہ
اعلیٰ تخیل، صحت بیان اور شیرینی زبان کے واسطے یہ نظمیں لا جواب ہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ انگریزی
شاعر درڈس ورتھ کے یہاں جو سادگی، طفلانہ مسرت اور اصلیت کا جوش و خروش پایا جاتا ہے۔
وہ اُن کے یہاں نہیں۔ مگر یہ چیز تو کسی اُردو شاعر کے یہاں نہیں پائی جاتی پس اقبال کے یہاں
جس قدر بھی ہے بہت غنیمت ہے اور اوردل سے بہت زیادہ ہے شعراء مشرق کے یہاں مناظر
قدرت کا بیان اظہار جذبات کے لیے وہی کام دیتا ہے جو تصویر کے واسطے اس کا بیک گراؤنڈ
یعنی بالذات اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی صرف تصویر کو ابھارنے کے کام آتا ہے ہمارے
شاعروں کا اصلی مقصد کسی جذبہ یا تخیل کا اظہار ہوتا ہے اور وہ کسی منظر کو بطور ٹریل یا تشبیہ کے
ضمناً پیش کر دیتے ہیں برخلاف شعراء مغرب کے کہ وہ حین مناظر کے بیان میں جو اُن کے پیش نظر
ہوتے ہیں محو ہو جاتے ہیں اور انھیں کامن سن بیان اور انھیں سے لطف اندوزی اُن کی مقصود
بالذات ہوتی ہے۔ اقبال کا مقابلہ دوسرے شعراء اردو کے اس معاملے میں شعراء مغرب سے
بہت قریب تر ہیں اور انھوں نے پُرانے فرسودہ طریقوں کو چھوڑ کر اپنے واسطے ایک نیا
راستہ اختیار کیا ہے۔

اقبال کی خصوصیات شاعری (۱) پہلی خصوصیت یہی ہیں اسلام پر جس کا ذکر اوپر ہوا (۲) اسلام کی ترقی و ادنیٰ کی سادگی پر جو براثر عجمی تکلف و تصنع کی تہذیب نے ڈالا تھا اس کے وہ بہت شاکاکی ہیں اور اسی کو وہ اسلام کے انحطاط و زوال کا اصلی سبب ٹھہراتے ہیں (۳) ان کا پیغام نہایت سچا اور پرجوش ہو مگر چونکہ بعض باتیں مبہمت و غلامیہ طور پر کہنا نہیں چاہتے لہذا تمثیل و تشبیہ کے پردے میں ان کو کہنا پڑتا ہے (۴) وہ حقیقی شاعر ہیں کیونکہ نہ تو وہ کسی کی فرمائش سے کہتے ہیں نہ کسی کی ہجاء اور خوشامد نہ تعریف میں کہتے ہیں (۵) ان میں ایسا نواختصار کی صفت ہے یعنی چھوٹے چھوٹے لفظوں میں معنی کے دریا بھرے ہوئے ہیں۔ مثل غالب کے ان پر بھی یہ مقولہ صادق آتا ہے کہ پہلے الفاظ کی کیمیائی تجلیل کر لو اس کے بعد معنی کا خالص سُونا ہاتھ آئے گا (۶) ان کے مضمون اکثر فانی الفاظ و محاورات کے تہ میں ہوتے ہیں مگر کبھی راز سر نہ نہیں ہوتے غور کرنے سے بخوبی سمجھ میں آجاتے ہیں (۷) وہ بالکل رمانہ حال کے شاعر ہیں۔ ہر طرح کے حقائق سائنٹفک، فلسفیانہ مذہبی سب لُن کے کلام میں موجود ہیں جس طرح تصوف و اخلاق کے بیش ہا معنایں بہترین اور حسین ترین الفاظ میں ان کے کلام میں جلوہ گر ہیں اسی طرح علوم مغربی مثلاً کیمیا و طبعیات وغیرہ کے رموز بھی لطیف تشبیہوں اور استعاروں کے پردے میں پائے جاتے ہیں (۸) ان کی بعض تشبیہیں نہایت لطیف و نادر ہیں مثلاً "ہلالِ عید" روشنی کا حجاب ہے، جگنو کی نسبت کہتے ہیں۔

جگنو کی روشنی ہے کاشانہ چمن میں	یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں
آیا ہے آسمان سے اُڑ کر کوئی ستارہ	یا جان پر گئی ہے کتاب کی کرن میں
یا شب کی سلطنت میں دن کا سیر آیا	غربت میں آ کے چمکا گناہ تھا وطن میں
تکمر کوئی گرا ہے کتاب کی قبا کا	ذرہ ہے یا نایاں سورج کے پیر میں

(۹) ان کے کلام کا خاص طرز امتیاز جوش و سچائی اور قوت ہے۔ ان کی نظموں میں وہی زور ہے جو بہتے ہوئے دھاروں میں ہوتا ہے یہ زور و قوت اور اردو شعرا کے یہاں بہت کم ہے۔

اقبال کی شہرت | ہمارے خیال میں کسی اردو شاعر کو یہ شہرت اور نرل عزیزی نصیب نہیں گئی جو اقبال کو

ہوئی۔ ان کی شہرت ہندوستان کے علاوہ درپردہ ملکوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ ہندوستان میں وہ ایک قومی شاعر مانے جاتے ہیں۔ بڑے بڑے شعرا اور اہل قلم مثلاً شبلی نعمانی، اکبر، خواجہ حسن نظامی، سرزاد افتخار علی خاں وغیرہ نے ان کو باج تھیں دیا ہے۔ انگلستان کے مشہور مستشرق ڈاکٹر مکلس نے ان کی کتاب "اسرار خودی" کا ترجمہ انگریزی میں کیا۔ یورپ د امریکہ کے مشہور ناقدوں نے ان کی تصانیف پر نہایت عمدہ عمدہ دیولویکھے ہندوستان میں وہ ترجمان حقیقت کے لقب سے مشہور ہیں۔ اسی علمی دادی خدمات کے صلے میں اس کا معزز خطاب اُن کو دیا گیا۔ نوبل پرائز کے مستحقین میں ایک زمانے میں اُن کا نام بھی لیا جاتا تھا۔

وہ جوانان ہند کے بہترین شاعر ہیں کیونکہ انھیں کے جذبات و احساسات کو وہ عمدہ طریقے سے ادا کرتے ہیں۔ ایک زمانے میں وہ اپنی بیش بہا نظموں کی بدولت پورے ہندوستان کے دلوں پر حکومت کرتے تھے اور ملک کا ہر طبقہ ان کو مادر وطن کا حقیقی شاعر مانتا تھا مگر کچھ عرصہ سے وہ اُن لوگوں میں اس قدر ہر دلعزیز نہیں رہے جو جذبات و وطن کو دیگر جذبات پر مقدم سمجھتے ہیں اور اُن کی کمی شہرت کا باعث یہ بھی ہوا کہ وہ اردو کو زبان فارسی کے ماتحت کر دینا چاہتے ہیں۔ مگر باوجود ان سب باتوں کے اقبال کا مرتبہ زمانہ حال کے دیگر اردو شعرا میں بہت بلند ہے۔ بلکہ وہ تو دنیا کے بڑے بڑے شعرا کے ہم پلہ ہیں۔

انڈکس حصہ نثر

آبجیات ۴۸	انخوان الصفا (ترجمہ) ۱۳۔
ابن الوقت ۵۹	اُردو اخبار (دقی) ۹۶
اثر (مرزا جعفر علی خاں) ۹۲	اُردو اخبارات ۹۶ - ۹۷
آثار الصنادید ۳۸ - ۸۰	اُردو رسائل ۹۷ - ۹۸
آریح (مسطر) ۳۶	اُردوئے معلیٰ ۲۹۔
آرائش محفل (افسوس) ۹۔	اسپرننگ (ڈاکٹر) ۱۱۔
آرائش محفل (حیدری) ۱۰۔	اسد علی (حکیم سید) ۲۲
آزاد (اخبار) ۸۸ - ۱۷۰۔	اسرار التوحید ۲۔
آزاد (سید محمد نواب) ۱۰۲ - ۱۰۵ - ۱۸۳	اسکاٹ (کر نل) ۸ - ۱۱
آزاد (مولانا ابوالکلام) ۹۲	اسماعیل (مولوی - شہید) ۱۶ - ۳۵
آزاد (مولوی محمد حسین) ۲۲ تا ۵۳ - ۱۷۶	اشک (خلیل علی خاں) ۱۵
آفتاب (دیکھو پیادے لال - ماسٹر)	آقا منظر ۶۹ - ۱۷۱
آئین قیصری ۶۲۔	افسر (حامد اللہ) ۹۳ - ۱۴۹
احسن مارہروی ۹۲	افسوس زمیر شیر علی ۸۔
احمد حسین قمر ۱۰۰۔	اکبر ال آبادی ۱۰۲۔
احمد رضا خاں (مولوی بریلوی) ۶۹	اکرام علی (مولوی) ۱۳۔
احمد علی کسٹڈی ۱۰۲ - ۱۳۸	اقبال (ڈاکٹر - سر شیخ محمد) ۱۸۶ - ۱۸۹ - ۱۹۱
آخبار نویسوں کے حالات ۹۷	۱۹۷ تا ۲۰۲
اخلاق ہندی ۹ - ۱۰۔	انغزالی ۶۸۔

پردہ عصمت (رسالہ) ۱۳۳

پریم چند (فشی) ۱۳۸۔

پند نامہ (ترجمہ) ۱۲۔

پیارے لال آشوب (اسٹرا) ۴۶ - ۴۸

۶۸ - ۸۹

پیام یار (رسالہ) ۱۶۹۔

نادر چند (ڈاکٹر) ۱۶۸۔

نادر بیخ آسام (ترجمہ) ۹۔

نادر بیخ شیر شاہی (ترجمہ) ۱۳۔

نادر بیخ فرشتہ (ترجمہ) ۱۱۔

نادر بیخ نادری (ترجمہ نادری نامہ) ۱۰۔

نادر بیخ ہندوستان (مولوی ذکا و اللہ)

۶۲

نعمین (عطا حسین خاں میر محمد) ۳۔

تحفہ الفشن ۱۹۔

تذکرہ جہان ۱۱۔

تذکرہ الکاملین ۷۹۔

ترجمون ناتھ ہجر ۱۰۲ - ۱۰۵۔

ترجمہ بایبل ۱۹۔

تریاق سموم ۵۳۔

تصانیف شرر ۱۳۴

تصدق حسین داستان گو ۱۰۰۔

تعزیرات ہند (مجموعہ) ۵۶۔

تمدن عرب ۸۱۔

تمدن ہند ۸۱۔

آبنیہ الغافلین (ترجمہ) ۱۴ - ۳۵۔

تواریخ قاسمی ۴۔

توبہ النصوح ۵۹۔

شیخ بہادر پیر (ڈاکٹر۔ سر) ۱۶۸ - ۱۷۶۔

ٹیلر دکنان ۱۴۱۔

ٹیلر (سٹر۔ پرنسپل دلی کالج) ۷۹۔

جامع الاخلاق (ترجمہ اخلاق جلالی) ۱۵۔

جامع القواعد ۱۹۔

جاذبستان ۵۱۔

جل ترنگ ۲۔

جوالا پرشاد (دیکھو برق)

جوان (کاظم علی جوان) ۱۱۔

جوش سلطان حیدر ۹۲۔

جیس ماؤنٹ (دکنان) ۱۵۔

خرد افروز (انشا) ۱۳
 خلاصۃ التواریخ ۹ -
 خلیل (علی ابراہیم خاں - نواب) ۹ -
 خنمانہ جاوید ۹۰ -
 خواجہ امان دہلوی ۱۰۰ -
 خوچی ۱۱۵ - ۱۱۸

دارالمصنفین اعظم گڑھ ۴۰ - ۴۱ - ۱۶۷ -
 داستان امیر حمزہ ۹۹ -
 دربار اکبری ۵۱ -
 درگیش تندنی ۱۲۷ -
 دریائے لطافت ۳ - ۱۹ -
 دلچسپ (نادل) ۱۲۷ -
 دلگداز (رسالہ) ۱۲۹ -
 دلی کالج ۷۶ -
 دہ مجلس فضلی ۲ -
 دیوان انور ۹۱ -
 دیوان ذوق ۵۱
 دیارِ اُتریں نگم ۸۹ - ۱۶۸

ڈراما (اردو) ۱۴۰

چار گلشن ۱۲
 چراغ علی (مولوی) ۲۵ -
 چشمہ فیض ۱۹
 چکبست (دیکھو برج تراشیں)
 چھاپے خانے ۳۵ - ۳۶

حاجی بفلول ۱۰۴ - ۱۲۰
 حالی ۵۳ تا ۵۵
 حدائق البلاغت (ترجمہ) ۱۹
 حسرت موہانی ۹۲
 حسن نظامی (خواجہ) ۱۳۷
 حسینی (بہادر علی) ۹ -
 حفیظ الدین احمد ۱۳ -
 حمید الدین (مولوی) ۷۴
 حیات جاوید ۵۴ -
 حیات سعدی ۵۳
 حیدری ۹ -
 حیران (میر حید علی) ۸

خندنگ نظر (رسالہ) ۱۶۹ - ۱۸۳

دوما (فرینج نادسٹ) ۱۱۲

ذکاء اللہ (مولوی) ۶۱۔

ذوق (اتاد) ۴۶۔

راجیشور ملی (آزیریل رائے) ۱۶۸۔

راشد الخیری ۱۳۶۔

راچندر (پروفیسر) ۶۸-۶۹۔

رتن ناتھ سرشار (دیکھو سرشار)

رجب علی بیگ سرور (مرزا) (دیکھو سرور)

رسالہ گلہ سٹ ۹۔

وسم الخط اردو ۱۶۸۔

رسوا (مرزا محمد ہادی) ۱۳۔

رشید احمد صدیقی ۹۲۔

رصد خان شاہی ۳۶۔

رداں (سید جعفر علی) ۱۵۔

ردہنی (ناول) ۱۰۶۔

ردیائے صادقہ ۵۹۔

زمانہ (رسالہ) ۸۸-۱۶۱-۱۶۵-۱۸۳۔

زود پشیاں (ڈراما) ۷۶۔

سائینٹفک سوسائٹی علی گڑھ ۳۹۔

سب اس ۲۔

سپاک دناک ۵۱۔

ستم ظریف (مرزا چھو بیگ) ۱۸۳۔

سجاد حسین (سابق اڈیٹر ادھر پنچ) ۱۸۳۔

سجاد حیدر (یلدرم) ۹۳۔

سختان فارس ۵۰۔

سرشار ۱۰۷ تا ۱۲۴۔ ۱۳۱۔

سرور (مرزا رجب علی بیگ) ۲۱ تا ۲۸۔ ۱۰۰۔

۱۱۲۔ ۱۱۹۔

سرور سلطانی (ترجمہ شمشیر خانی) ۲۳-۲۷۔

سرور شمعون ۲۶۔

سنگاسن بیٹی ۱۱۔

سوانح مولانا روم ۶۸۔

سید احمد خاں (سر) ۷۱-۳۲-۳۸ تا ۴۲۔

۸۶۔

سید احمد ہلوی ۶۳-۶۴۔

سید احمد شہید ۳۲-۳۵۔

سید سلیمان ندوی ۷۴۔

سید محمد خاں (خان بہادر مولوی)

سیرت العائشہ ۷۴

سیرۃ البنی ۷۱ -

سیرۃ النعمان ۶۷ -

شیدا (دیکھو امانت اللہ مولوی)

شیرنگہ (سردار ۳۵ -

شیر علی (میر) (دیکھو افسوس)

صحیح امید (ثنوی) ۶۷ - ۱۷۶ - ۱۸۳ -

صرف اردو ۱۵ -

صہبائی (مولوی امام بخش) ۷۸ - ۸۰ -

ضامن علی (پروفیسر) ۹۲ -

ضوابط انگریزی ۴ -

طلسم حیرت ۲۶ -

طلسم ہوشربا ۱۰۰ -

طوطا رام شایان ۱۰۰ -

طوطا کہانی ۱۰ -

طیش (حکیم مرزا جان) ۱۵ -

ظفر علی خاں (مولوی) ۴۴ - ۹۳ -

ظفر عمر (مولوی) ۱۲۰ -

ظفر الملک (مولانا) ۹۷ -

شاہ محمد قادری (سید) ۲ -

شاہ میر (سید) ۲ -

شبستان سرود ۲۳ - ۲۷ -

شبلی نعمانی ۶۵ تا ۷۳ -

شرح مرغوب القلوب ۲ -

شرر (مولوی عبدالحکیم) ۲۴ تا ۱۳۵ - ۱۳۶ -

شرر عشق ۲۳ - ۲۷ -

شرق الدین میرٹھی ۲۱ -

شعر ابھم ۷۳ -

شعر المند ۷۵ -

شکستہ نامک (ترجمہ) ۱۱ -

شکوہ و محبت ۲۳ - ۲۷ -

سائل الانقیاد و دلائل الاتقیاء ۲

شمس العشاق (دیکھو میر انجی بیجا پوری شاہ)

شوق قدوائی (احمد علی) ۱۰۶ -

شہرت (افتخار الدین) ۱۵ -

شہید (مولوی غلام امام) ۸۰ -

عبدالباری (مولوی) ۷۴

عبدالحق دہلوی (مولوی) ۶۹

عبدالحق (مولوی سکریٹری کچن ترقی اُردو)

۱۵ - ۸۴ -

عبدالرزاق (مولوی) ۸۹ -

عبدالسلام ندوی (مولوی) ۷۵ -

عبدالعزیز (شاہ) ۳۴ - ۳۵ -

عبدالغفور (مولوی) ۶۸ -

عبدالقادر بی. اے (آئریبل مولوی) ۸۷ -

عبدالله یوسف علی ۱۴۲ - ۱۵۸ - ۱۶۱ -

عبدالماجد ریال آبادی (مولوی) ۷۵ -

عبدالمجید (مولوی) ۱۶۲

عبدالمجید خاں (کرل) ۶۹

عثمانیہ یونیورسٹی ۱۶۷ -

عزیز مرزا (مولوی) ۸۲ -

عطا حسین خاں (سیر محمد دیکھو تھین)

علی ابراہیم خاں (نواب) (دیکھو خلیل)

علی گڑھ ایسی میٹروپولیٹن کورپوریشن ۸۵ - ۴۰ -

عمومندی ۲۹ -

عیان (پیر کاظم علی جواں) ۱۱۱ -

عین الدین محمد العلم (شیخ ۲)

غالب (مرزا) ۲۱ - ۲۸ تا ۳۳ - ۳۸ - ۴۶ -

۱۸۴

غازی الدین حیدر ۲۱ - ۲۲ -

فخر الدین حسین (خواجہ) ۲۲ (فٹ نوٹ) ۲۶

فردوس بریں (ناول) ۱۲۸

فرخ (ریاں) ۲۰ -

فرنگ آصفیہ ۶۴ -

فسانہ آزاد ۱۰۸ - ۱۱۱ - ۱۲۱ تا ۱۲۴

فسانہ عجائب ۲۴ - ۲۶ تا

فطرت (مرزا محمد) ۱۵ -

فقیر محمد خاں (دیکھو گویا)

فلر (بیمبر) ۴۷ -

فورٹ ولیم کالج کلکتہ ۱ - ۴ - ۲۵ -

فیلن (ڈاکٹر) ۸ - ۱۸ -

قرآن شریف (ترجمہ) ۱۱ - ۱۶ -

قصہ لقمان ۹ -

قند پارسی ۵۰ -

قواعد المبتدی ۱۹ -

گلکرسٹ (ڈاکٹر) ۴ - ۵ - ۶ - ۹ - ۱۸.

گنجینہ خوبی ۸ -

گورغریباں ۱۰۹ -

گویا ۲۰ -

لطف (مرزا علی) ۸ - ۱۴ -

لطف (دیکھو اتن دہلوی - میر)

لطائف ہندی ۱۴ -

نغات اردو ۱۹ -

نولال جی ۱۴ -

نگوشک سرے آف انڈیا (مصنفہ ڈاکٹر

گریسن) ۶ -

لیلی مجنوں (قصہ) ۱۰ -

مادھونل و کام کھلا ۱۲ -

ماداسیتن ۱۰۶ -

مجلس النساء ۵۳ -

محسن الملک (نواب) ۲۲ - ۲۴ - ۲۸ -

معصنات ۵۹ -

محمد حسین جاہ ۱۰۰ -

مختر (رسالہ) ۱۲۶ -

کاظم حسین (مختر مرزا) ۱۷۱ -

کاظم خاں (میر محمد) ۷ -

کاظم علی (مرزا) (دیکھو جوان)

کان پور ۲۱ -

کریم (عبدالکریم خاں دہلوی) ۱۰ -

کریم الدین (فشی) ۸ -

کلیات سودا ۹ -

کوچک سلطان (مرزا) ۶۱ -

کورت آف ڈاکٹر کپڑ ۴ -

کیمبل (جارج) ۱۶۴ -

گلارسن دیاسی ۱۴ - ۱۸ - ۳۹ - ۱۶۳ -

گلزار ابراہیم (تذکرہ) ۱۱ - ۱۵ -

گلزار دانش (ترجمہ بہار دانش) ۱۱ -

گلزار سرد ۲۳ - ۲۷ -

گلشن بے خار ۱۱ -

گلشن فیض ۱۹ -

گلشن ہند (تذکرہ) ۱۵ -

گلشت فرنگ ۸۲ -

گل مغفرت (معروف بہادر مجلس) ۱۰ -

محمد علی (حکیم) ۱۳۶
 محمد علی کاپنوری (مولوی سید) ۶۸
 مخزن (رسالہ) ۸۷
 مذہب عشق ۱۲۷
 مراۃ العروس ۵۸
 مراسلہ کشمیر ۱۰۷
 مرند خانی کو تو ال دہلی ۱۷
 مسعود حسن رضوی (سید) ۹۲
 مسکین (میر عبداللہ) ۱۵
 مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم ۶۷
 مطبع ٹائپ ۳۶
 مطبع مصطفائی ۳۶
 مطبع میر حسن ۳۶
 مطبع نول کشور ۲۲-۹۸
 مظہر علی خاں (دیکھو دلا)
 معارف (رسالہ) ۸۵
 معراج العاشقین ۲
 معراج القلوب ۹
 "مقدس شعروشاعری" ۵۳
 ممتاز (پسر کاظم علی جواں) ۱۱
 ممتاز حسین عثمانی (حکیم) ۱۰۲ (نٹ نوٹ)

من پھول (نپڈت) ۵۷
 منو ہر لال زتشی (پڈت) ۸۷
 موازنہ انیس و دیر ۶۸
 مہدی حسن ۹۳
 مہذب (اخبار) ۱۲۹
 مہر دہاہ (قصہ) ۱۰
 میر انجی بے جا پوری (شاہ) ۲
 میران یعقوب ۲
 میر تقی (مصنف بوستان خیال) ۱۰۰
 میر تقی (ولد سر سید احمد خاں) ۳۸
 میر مہدی (خطبام) ۳۰
 میکڈائل (سرانٹونی) ۶۹

نئی لغت ۱۰۶
 نامی (پر دفسیر) ۹۲
 نثر بے نظیر ۹
 نثر نثرہ آثار ۲۷
 ندوۃ العلماء ۶۸
 نذیر احمد (مولوی) ۱۲-۵۵ تا ۷۱-۱۰۱
 ۱۱۷
 نشاۃ العشق ۲

۶۸-۴۵ (نواب) وقار الملک	نصیحت کا کرن پھول - ۵۰
دکرم اردھی - ۸۳	نصیر (شاہ) - ۱۶
دستخط اسمتہ ۱۶۸	نکار (رسالہ) - ۱۳۶
دلا (منظر علی خاں) - ۱۶	نوابی دربار - ۱۰۵
	نوبت رائے نظر ۱۶۹ - ۱۶۰ - ۱۶۱
	۱۶۳ -
ہاراکٹ (کرغل) - ۴۰	نوازش (آغا) - ۲۱
ہاشمی فرید آبادی - ۹۳	نوشیرداں نامہ - ۱۰
ہدایت الاسلام - ۱۵	نوطر زمر صغ - ۳
ہریشچندر - ۱۵۹	نول کشور (منشی) ۹۸ - ۱۶۶
ہفت پیکر (جواب ہفت پیکر نظامی) - ۱۱	تہال چندلاہوری - ۱۲
ہندوستانی اکیڈمی ۱۶۷ - ۱۶۸	نیاز فتنچوری - ۱۳۶
ہندوستانی گرامین - ۱۶ - ۱۸	ہزنگ خیال - ۵۰
ہیوٹ (سرجان) - ۷۰	
یادگار غالب - ۵۴	واقعات اکبر (ترجمہ اکبر نامہ) - ۱۶
بلدرم (دیکھو سجاد حیدر - سید) - ۹۳	وزیر (خواجہ) - ۲۰



ضروری اعلان

خدا کے فضل و کرم سے ہمارے کتب خانہ رنجھارتی میں
جملہ علوم و فنون کی کتابیں بزبان عربی، فارسی، اردو، ہندی
و سنسکرت کافی تعداد میں ہمیشہ موجود رہتی ہیں جن کی مفصل فہرست
صرف اطلاع یا سنے پر روانہ کی جاتی ہے۔ کتابوں کی تصحیح کا اس قدر
خیال کیا جاتا ہے کہ جو کتاب اسٹاک میں ختم ہو جاتی ہے اور دوبارہ
چھاپنے کا ارادہ کیا جاتا ہے تو وہ کتاب پہلے صحیح کرائی جاتی ہے
اور اس کی اصل اگر کسی دوسرے کتب خانہ میں دستیاب ہو جاتی ہے
تو اس اصل سے مقابلہ کرایا جاتا ہے اور باعتبار کاغذ و چھپائی و سائز
پہلی اصل سے بدرجہا اچھی حالت میں پیش کی جاتی ہے باوجود گرائی
کاغذ و اسباب طباعت قیمت نہایت مناسب رکھی جاتی ہے اس لیے
استدعا ہے کہ اگر آپ ہمارے قدیم خریدار ہیں تو آپ سے کسی سفارش
کی ضرورت نہیں اور اگر آپ کو اب تک ہمارے کتب خانہ سے کسی
کتاب کے طلب کرنے کا اتفاق نہیں ہوا تو براہ مہربانی کوئی
فرمائش بھیج کر ہمارے کارخانہ کی صفائی و معاملہ کتب کی عمدگی
اور قیمت کی مناسبت کا اندازہ ضرور فرمائیں۔

المنہ

مینجریج کمٹاریس صیفہ بکڈپولکنہ

